بیادِ حکیم الامّۃ مجدّدُ الملّۃ

حضرۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ

المتوفی ۱۳۶۲ھ

جلد اوّل

اشاعتِ خاص

ماہنامہ

الحسن

جامعہ اشرفیہ لاہور

اپیل

برائے جدید دارالاقامہ

جامعہ اشرفیہ لاہور

جامعہ اشرفیہ کو عوام و خواص میں اور اندرون و بیرونِ ملک جو مقبولیت حاصل ہے اور مسلسل ہو رہی ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان، فضل اور اُن بزرگوں کی نیم شبی دعاؤں کا ثمرہ ہے جنھوں نے اخلاص، توکل اور للّٰہیت پر اس کی بنیاد رکھی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

الحمد للہ ثم الحمد للہ!

اس وقت جامعہ اشرفیہ میں ملکی اور غیر ملکی مہمانانِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کثیر تعداد علمِ دین کے حصول میں شب و روز مصروف ہے اور اس میں بفضلہٖ تعالیٰ روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً غیر ملکی طلبہ بکثرت جامعہ میں داخلے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ طلبہ ہیں جو چین، ترکی، ہالینڈ، فجی لینڈ، امریکہ، اور بنگلہ دیش وغیرہ سے آئے ہیں۔

جامعہ ان غریب الدیار مہمانانِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم (طلبہ) کی رہائشی سہولت کے لیے ایک جدید دارالاقامہ تعمیر کروا رہا ہے جس کی بنیاد توکلاً علی اللہ رکھ دی گئی ہے۔ اس پر اخراجات کا ایک کروڑ روپیہ تخمینہ ہے۔

جامعہ کی مجلسِ منتظمہ خصوصاً حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے مخیر بالخصوص صدقۂ جاریہ کے متمنی حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ اس کارِ خیر میں (بصورتِ نقد، سریا، سیمنٹ، بجری و دیگر تعمیری سامان) حسبِ استطاعت زیادہ سے زیادہ حصہ لے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

رابطہ: **جامعہ اشرفیہ** ۔ فیروز پور روڈ لاہور
فون ـ ۲۲۵۱۱۹ ـ ۲۱۰۵۳۳ ـ ۲۱۱۰۲۲

جامعہ اشرفیہ لاہور کا ترجمان

ماہنامہ الحسن لاہور

بیاد حضرت مفتی محمد حسن امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور

صفر۔ ربیع الاول۔ ربیع الثانی
۱۴۰۸ھ

اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر
۱۹۸۷ء

اشاعت خاص

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مجلس منتظمہ

سرپرست: حضرت مولانا محمد عبید اللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور
نائب: حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور
منتظم: حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور

مدیر مسئول

محمد اکرم کاشمیری

○

○

پبلشر : حافظ فضل الرحیم جامعہ اشرفیہ لاہور
پرنٹر : لیسالین پریس لاہور
خط وکتابت : مدیر "الحسن" جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور
فون : ۴۱۱۰۲۲ - ۳۲۵۱۱۹ - ۳۲۳۵۲۳ پوسٹ بکس ۱۳۶۸

○

مینجر : مولانا عبدالدیان سلیمی
معاونین : عبدالمتین قاسمی ، محمد امجد کاشمیری ، شبیر احمد نفیسی
ناظم کتابت : محمد جمیل حسن تلمیذ حضرت سید نفیس الحسینی صاحب

قیمت -/۱۲۵ روپے

ترتیب

۱۔ تصاویر خانقاہ اشرفیہ ______

۲۔ " جامعہ اشرفیہ ______

۳۔ عکس تحریر حکیم الامتؒ ______ ٭ مشمولات نمبر ۹

۴۔ اعتذار و اعتراف ______ محمد اکرم کاشمیری " ۱۱

۵۔ حکیم الامت کا نسخہ کیمیا ______ ہارون سعد " ۱۳

۶۔ وقت کی موثر آواز ______ علامہ ڈاکٹر خالد محمود " ۱۷

۷ قصبہ تھانہ بھون ______ مولانا ثناء الحق ایم اے (سیریل نمبر) ۴۱

سوانح

۸ ایامِ زندگانی ______ مولانا خلیل احمد تھانوی مشمولات نمبر ۱۹

مختصر سوانح ______ مولانا وکیل احمد شروانی سیریل نمبر ۴۸

از گروہ اولیاء ______ مولانا نجم الحسن تھانوی سیریل نمبر ۱

۹۔ خصوصیات زندگانی ______ ماخوذ از مآثر حکیم الامت ۸۱

۱۰۔ خانگی حالات ______ حضرت ڈاکٹر عبدالحی رح ۹۱

۱۱۔ خانقاہ اشرفیہ ______ پروفیسر مسعود احسن علوی ۹۹

۱۲ آثار علمیہ ______ سید سلیمان ندوی رح ۱۱۴

۱۳۔ فیضان تصانیف ______ حضرت ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ ۱۳۷

۱۴۔ تعلیم و تربیت

صفحہ

طریقہ تعلیم و تربیت ———— مولانا محمد میاں صدیقی ۱۵۰
نظریہ تعلیم و تربیت ———— مولانا محمد امجد کاشمیری ۱۶۶
تعلیمات حکیم الامت ———— حضرت حکیم محمد اختر کراچی ۵۴۸
ملفوظات ———— مرتب۔ مولانا فضل الرحیم صاحب لاہور ۵۷۰

۱۵ شخصیّت

ذکر حکیم الامتؒ ———— شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ ۱۹۱
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ———— مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۰۲
حضرت تھانوی اور حضرت مدنی ———— حافظ ریاض احمد اشرفی ۲۱۲
حضرت تھانوی بحیثیت مصنف ———— پروفیسر لطیف اللہ ۲۱۶
حضرت تھانوی بحیثیت مفسّر ———— حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی ۲۲۷
حضرت تھانوی بحیثیت محدث ———— حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی ۲۳۵
حضرت تھانوی بحیثیت فقیہہ ———— پروفیسر انوار اللہ اسلام آباد ۲۴۲
حضرت تھانوی بحیثیت مجدّد ———— نواب عشرت علی خاں قیصر ۲۵۶
حضرت تھانوی بحیثیت مجوّد ———— ڈاکٹر ظہور احمد اظہر ۲۷۶
حضرت تھانوی بحیثیت اصول پسند ———— حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دیوبند ۲۸۰
حضرت تھانوی بحیثیت مصلح اعظم ———— حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹ ۲۸۹
حضرت تھانوی بحیثیت ماہر نفسی طب ———— پروفیسر اظہر رضوی گورنمنٹ کالج لاہور ۳۴۹
حضرت تھانوی اور حبِ رسولؐ ———— ڈاکٹر حافظ محمد یونس اسلام آباد ۳۷۷
تربیت گاہ اشرفیہ ———— پروفیسر مسعود احسن علوی ۴۲۶
مقامات سلوک ———— ماخوذ آثار حکیم الامت ۴۳۴

تصوّف و سلوک ـــــــــ ماخوذ از حکیم الامت ۴۵۷

تصنیفات و تالیفات ـــــــــ مفتی عبدالرحمٰن خاں ملتان ۴۶۶

سلسلہ چشتیہ صابریہ ـــــــــ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۷۶۱

اسنادات

حضرت تھانوی کے شیخ طریقت شیخ العرب و العجم ـــــــــ حضرت سید نفیس الحسینی شاہ صاحب ۷۸۰

پیشگوئیاں ـــــــــ مرتب: مولانا وکیل احمد شروانی ۴۸۹

حکیم الامت اور خواتین اسلام ـــــــــ حکیم محمود احمد ظفر ۴۹۴

آفتاب تھانہ بھون کی کرنیں ـــــــــ حضرت صوفی محمد سرور صاحب ۷۲۴

اتہامات اور ان کا جواب

رضاخانی ـــــــــ مولانا محمد سرفراز خاں صفدر ۶۰۷

قادیانی ـــــــــ علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب ۶۳۶

سیاسیات

حکیم الامت کے سیاسی افکار ـــــــــ جسٹس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی ۶۷۷

پانچ نکاتی خاکہ ـــــــــ مفتی عبدالرحمٰن خاں ۷۰۸

حضرت تھانوی اور انڈین نیشنل کانگرس ـــــــــ پروفیسر احمد سعید ۷۱۷

حسرت کے چند آنسو ـــــــــ مولانا محمد موسیٰ صاحب استاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ ۷۶۳

حضرت تھانوی ماہ و سال کے آئینہ میں ـــــــــ مولوی محمد امجد کاشمیری ۷۶۷

پیغامات

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اکوڑہ خٹک ، حضرت مولانا ابوزاہد محمد سرفراز خاں صاحب مدظلہ گوجرانوالہ
جناب قاضی حسین احمد صاحب ، جناب سید سجاد حیدر صاحب وفاقی وزیر تعلیم ، جناب مخدوم سجاد حسین قریشی گورنر پنجاب

تصویروں
کے
آئینہ میں

تھانہ بھون اور جامعہ اشرفیہ

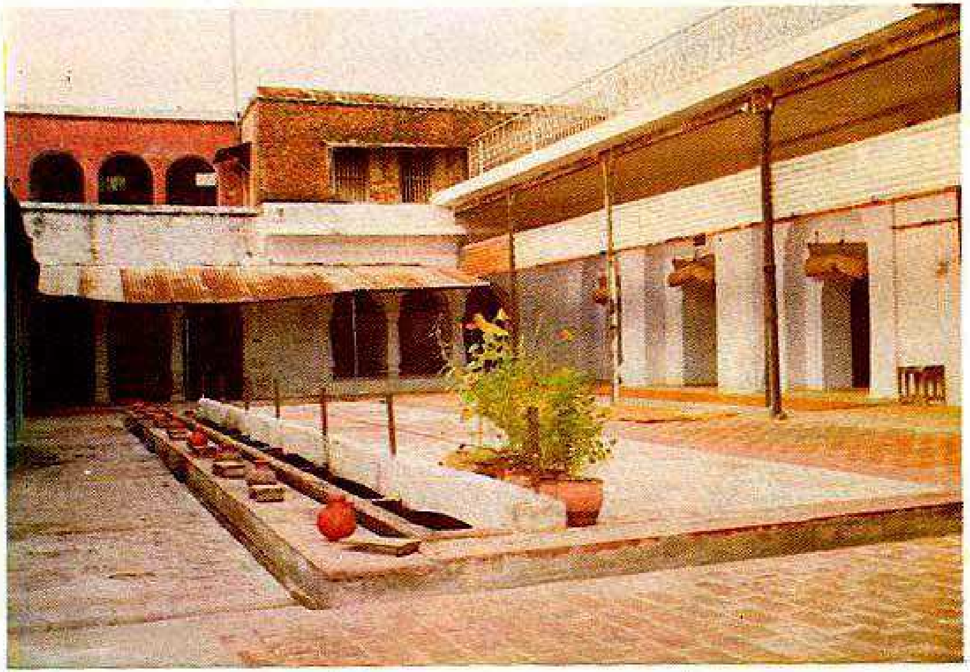

دائیں جانب مسجد۔ بیچ میں حوض اور سامنے خانقاہ کا جنوبی حصّہ

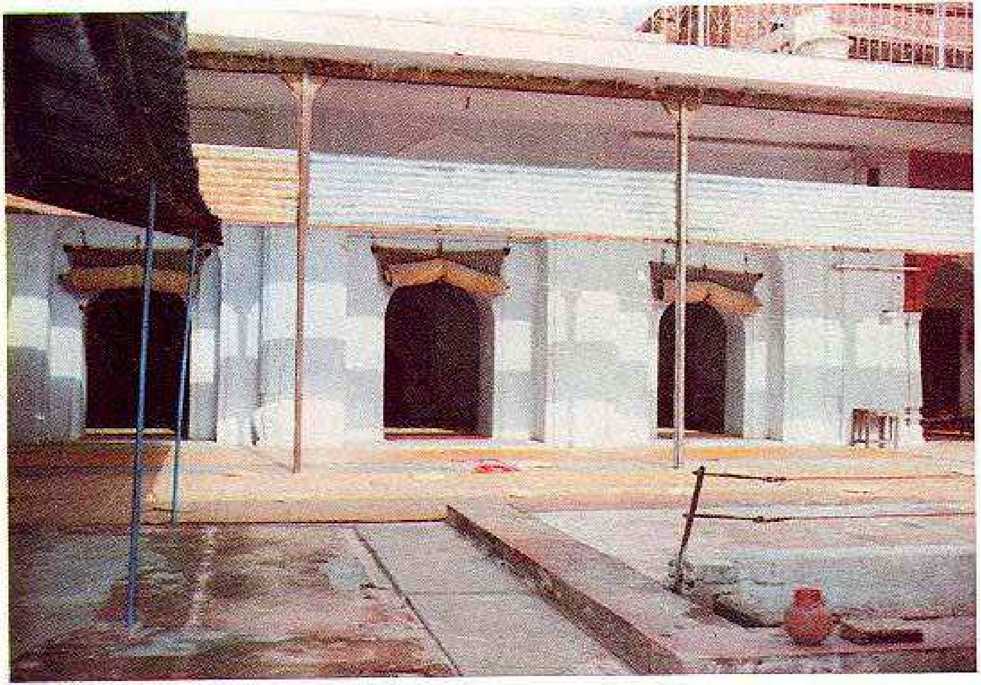

مسجد کے سامنے والے حصہ کا ایک منظر

مسجدِ خانقاہ کے محراب و منبر

؎ یہ چھوٹی سی مسجد خدا جانے کیا تھی

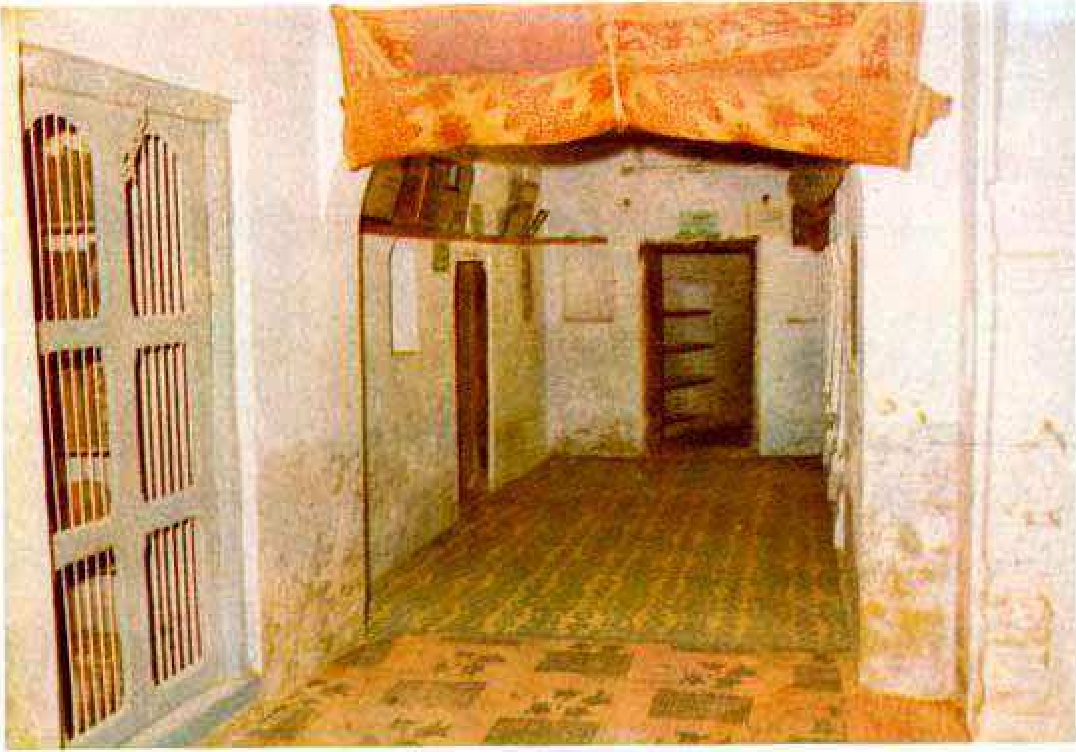

خانقاہ کے جنوبی حصّہ میں حضرتؒ کی نشست گاہ
کا اندرونی منظر

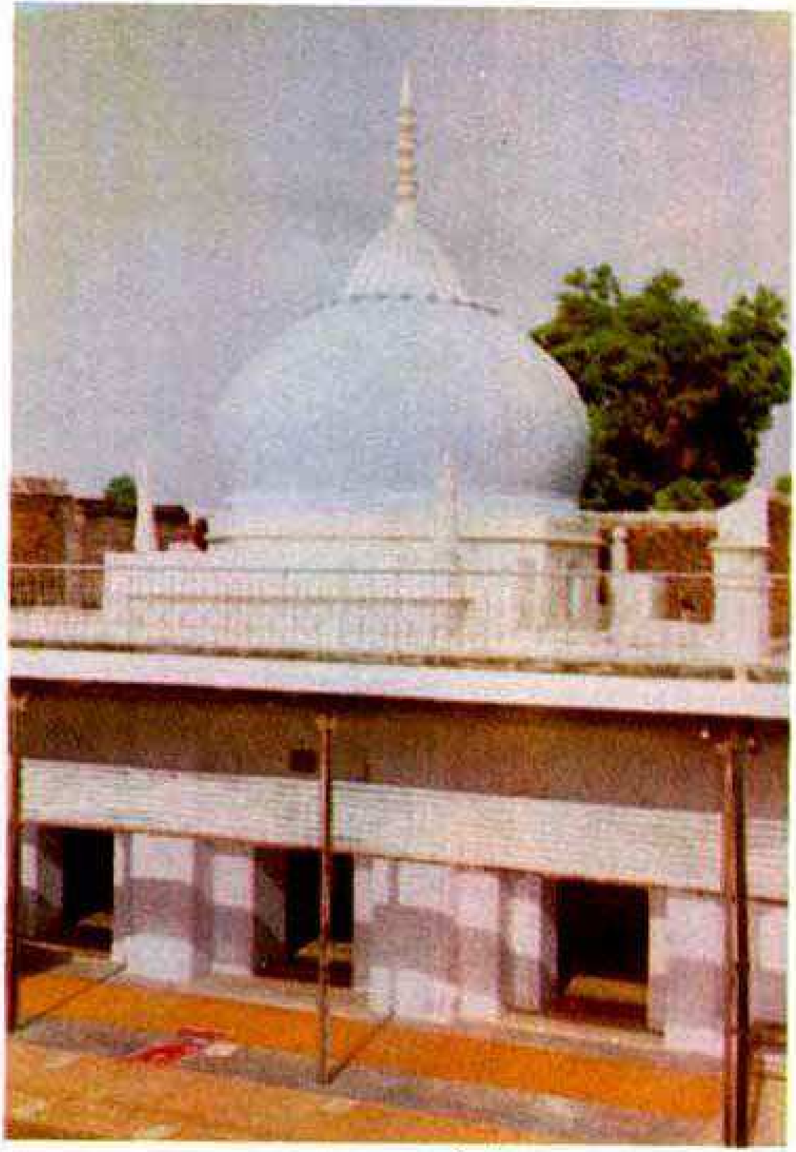

خانقاہ کی مغربی جانب!
خانقاہ کی مسجد اور اس کے باہر سائبان

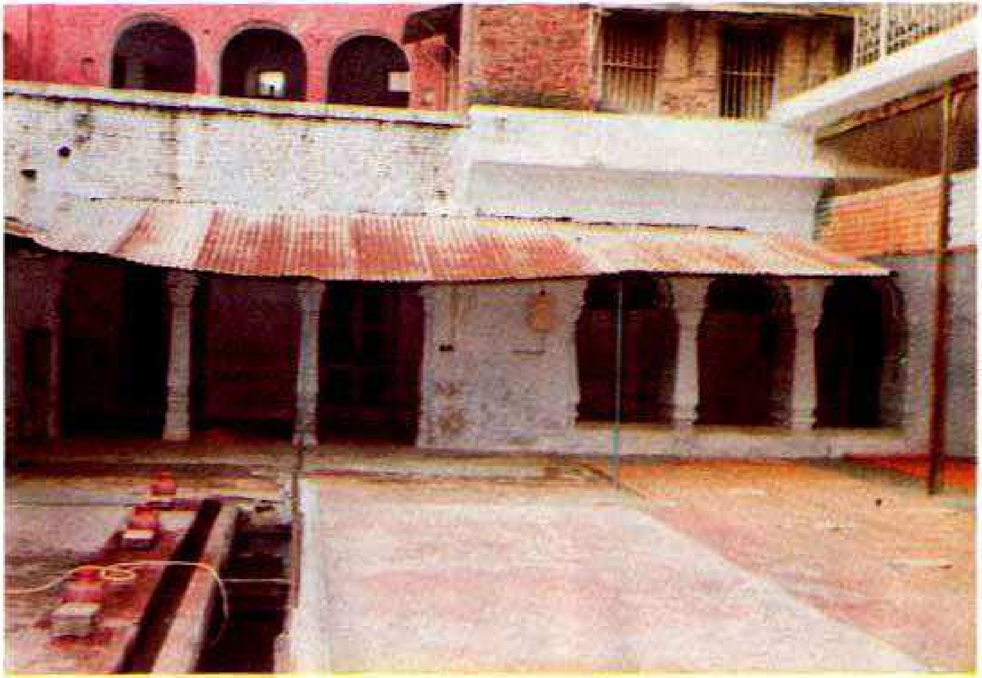

اندرون خانقاہ کا جنوبی حصّہ شش دری
و حضرتؒ کی نشست گاہ

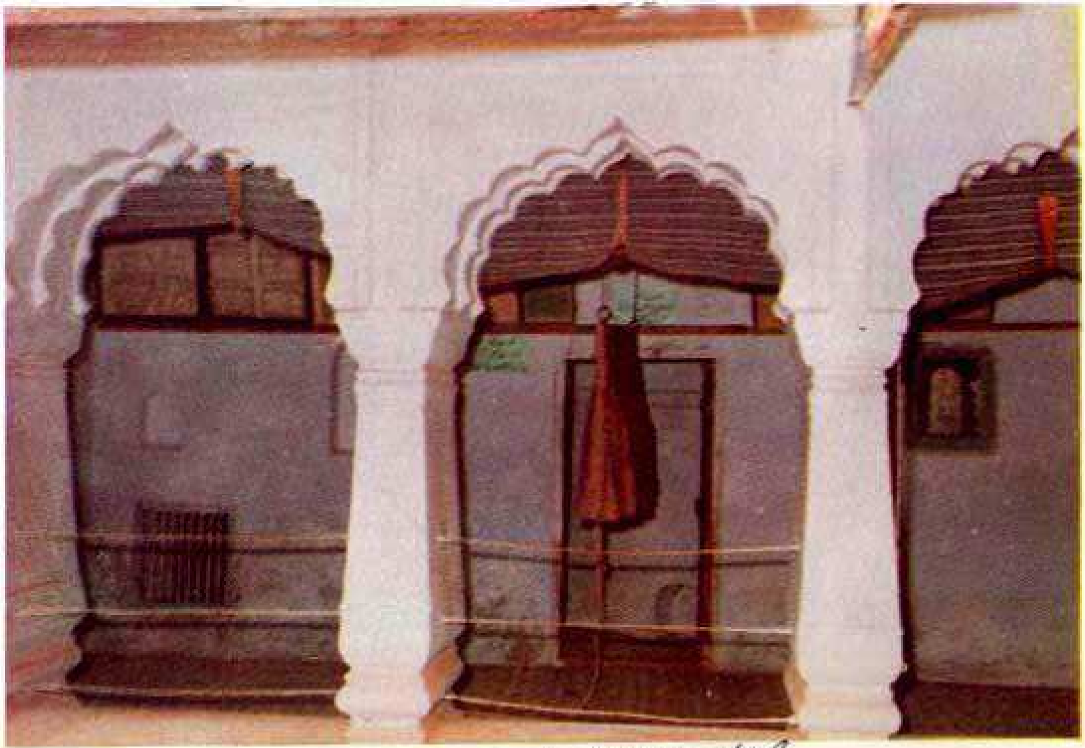

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است
خاص نشست گاہ حضرت قدس اللہ سرہ

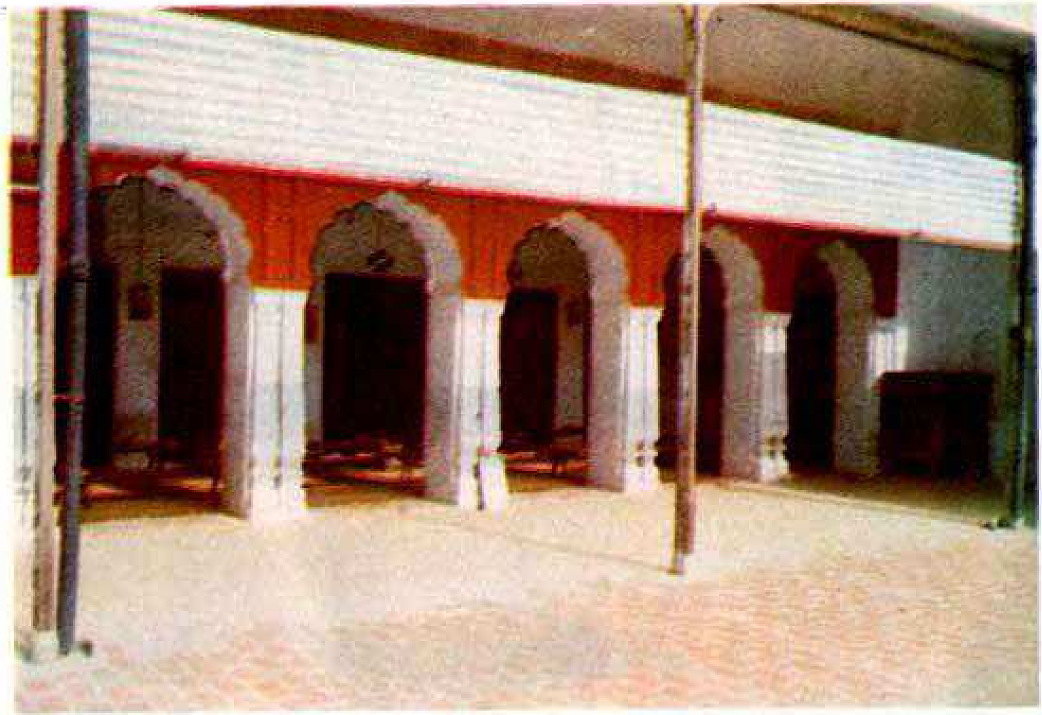

شش دری ۔ داہنی جانب کتب خانہ مولانا شبیر علی مرحوم
بائیں جانب مدرسہ نمایاں ہے

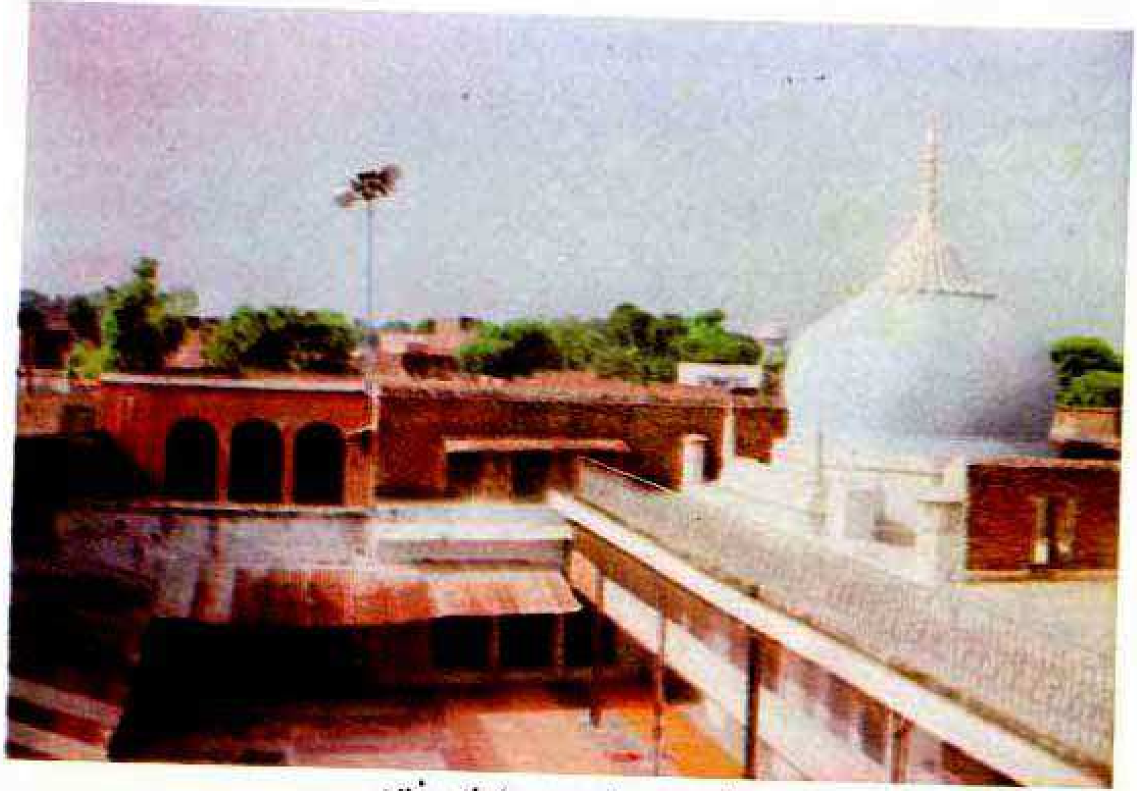

خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کا نظری نقشہ
دائیں جانب مسجد کا گنبد نمایاں ہے

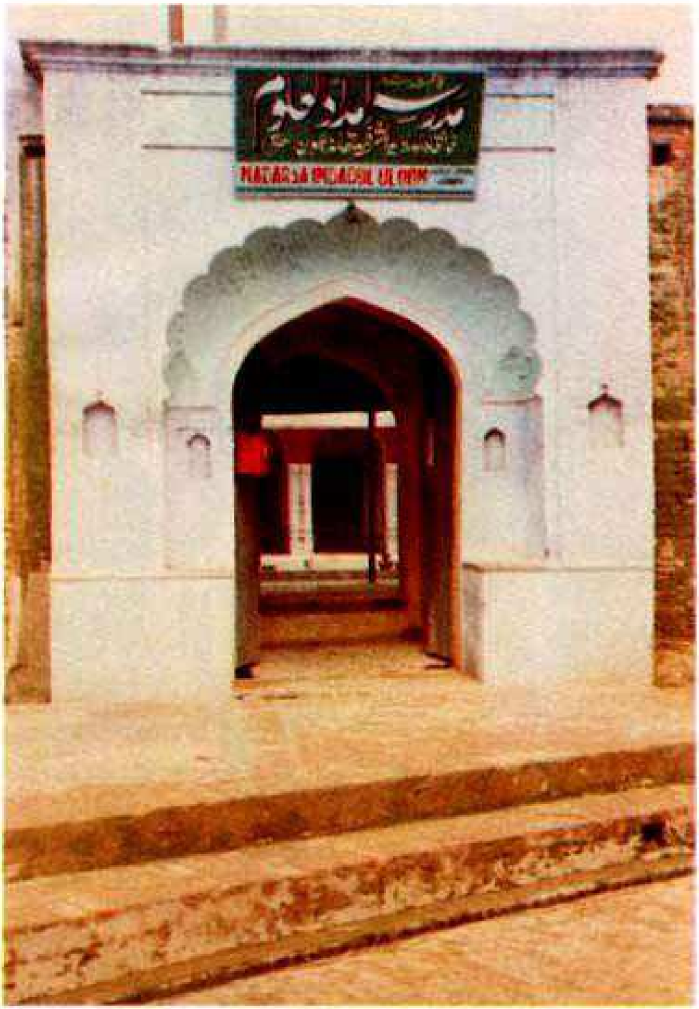
مدرسہ امداد العلوم

صدر دروازہ خانقاہ تھانہ بھون

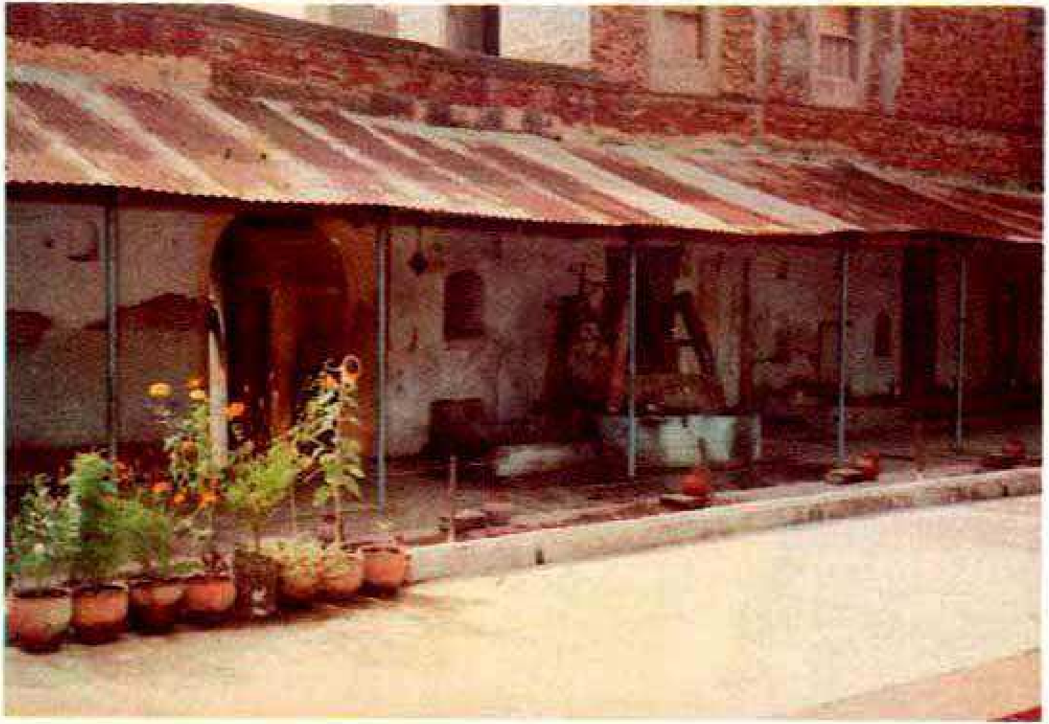

مشرقی حصہ اندرون خانقاہ
خانقاہ کا کنواں

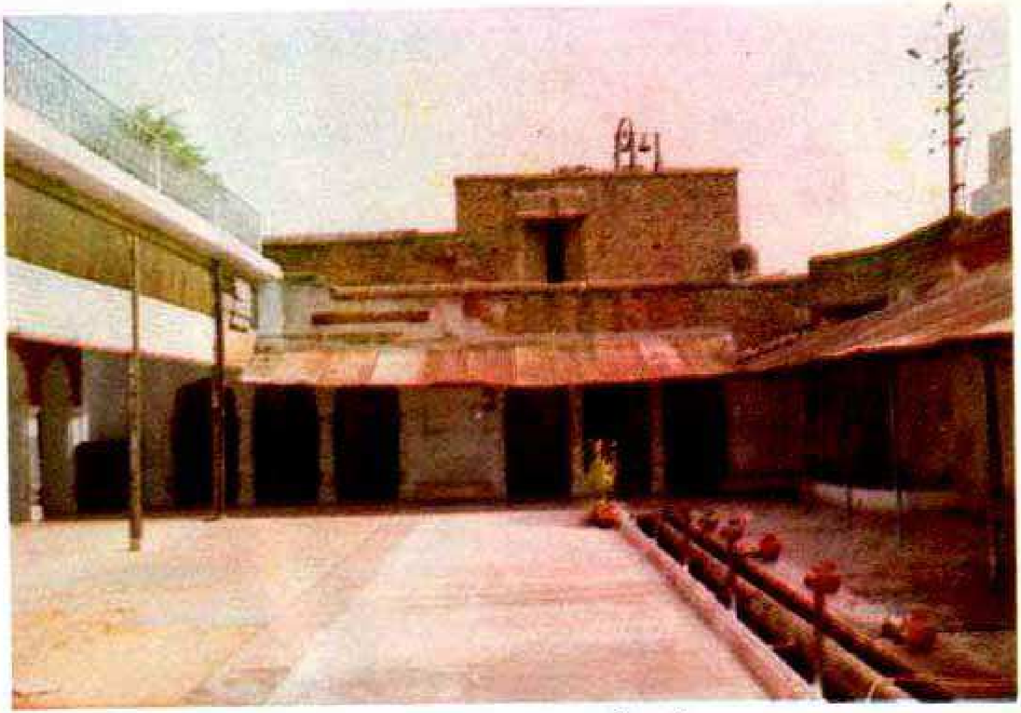

دھوپ گھڑی۔ گھنٹہ برائے سحر وافطار۔ سہ دری دفتر النور
بالائی مہمان خانہ (خانقاہ کے شمالی حصے کا ایک منظر)

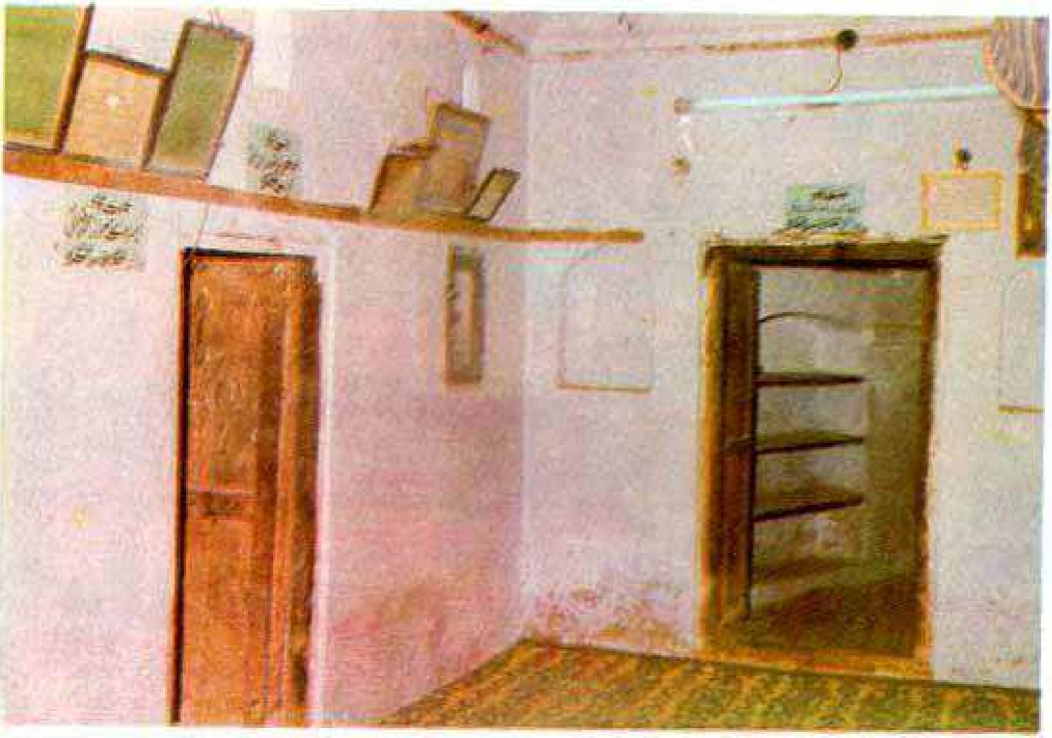

بائیں جانب حضرتؒ کی مجلس کی جگہ۔ اس کے برابر میں حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا حجرۂ مبارک اور
دائیں جانب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا حجرۂ مقدسہ

خلوت گاہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ

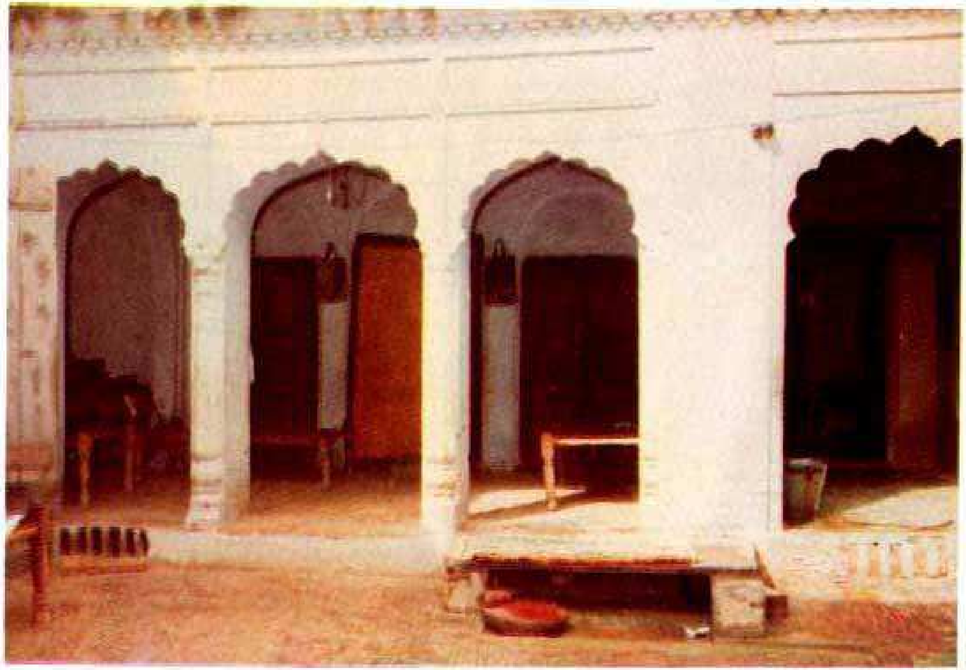

حضرت تھانوی قدس سرہ کے وقف کردہ مکان کی تصویر

مولانا شبیر علی صاحب مرحوم کا کتب خانہ

منظر جميل لمسجد الجامعة

صورة لخارج قاعات الدرس فى مدرسة الفيصل للبنات

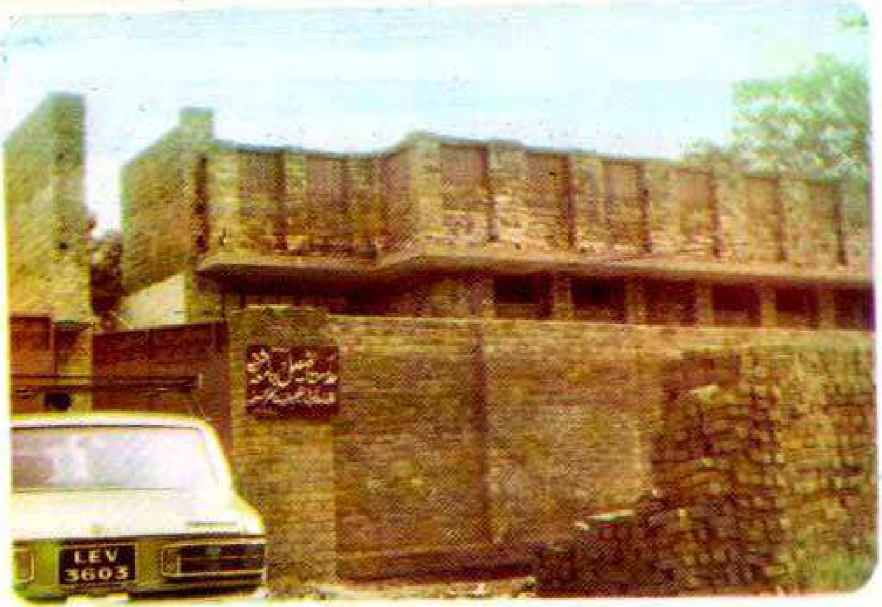

مدرسة الفيصل للبنات صورة من الخارج

جامعہ اشرفیہ

باب رئیسی لبناء الجامعة القدیم فی داخل البلد

مساكن الأساتذه

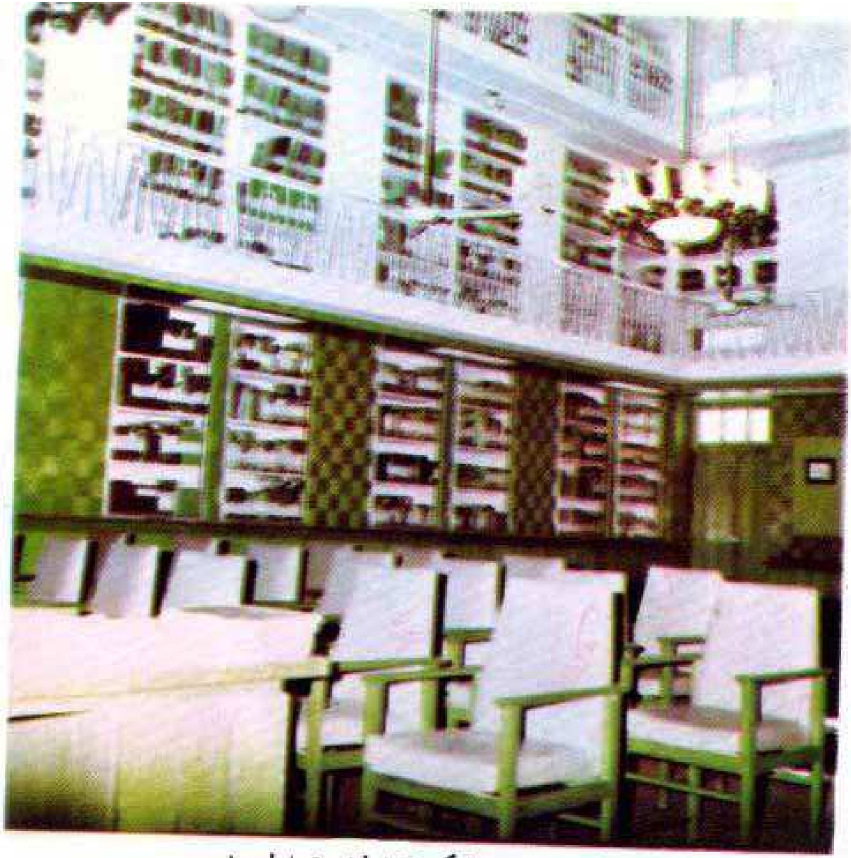

وهذه صورة لمكتبة الجامعة الجميله

هذه صورة للجامعة من الخارج وبداخلها دار الاهتمام
ومكاتب الجامعة ودار الافتاء

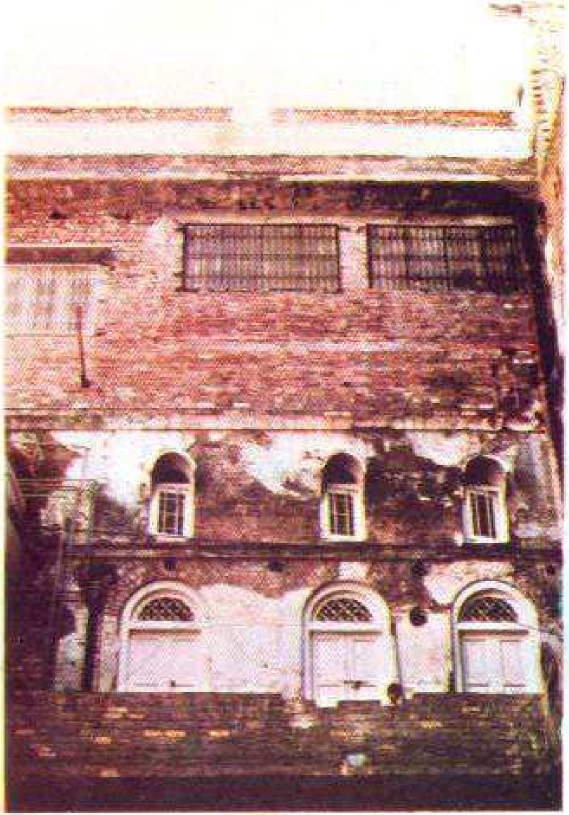

صورة اخرى لبناء الجامعة القديم فى داخل البلد

عکسِ تحریر

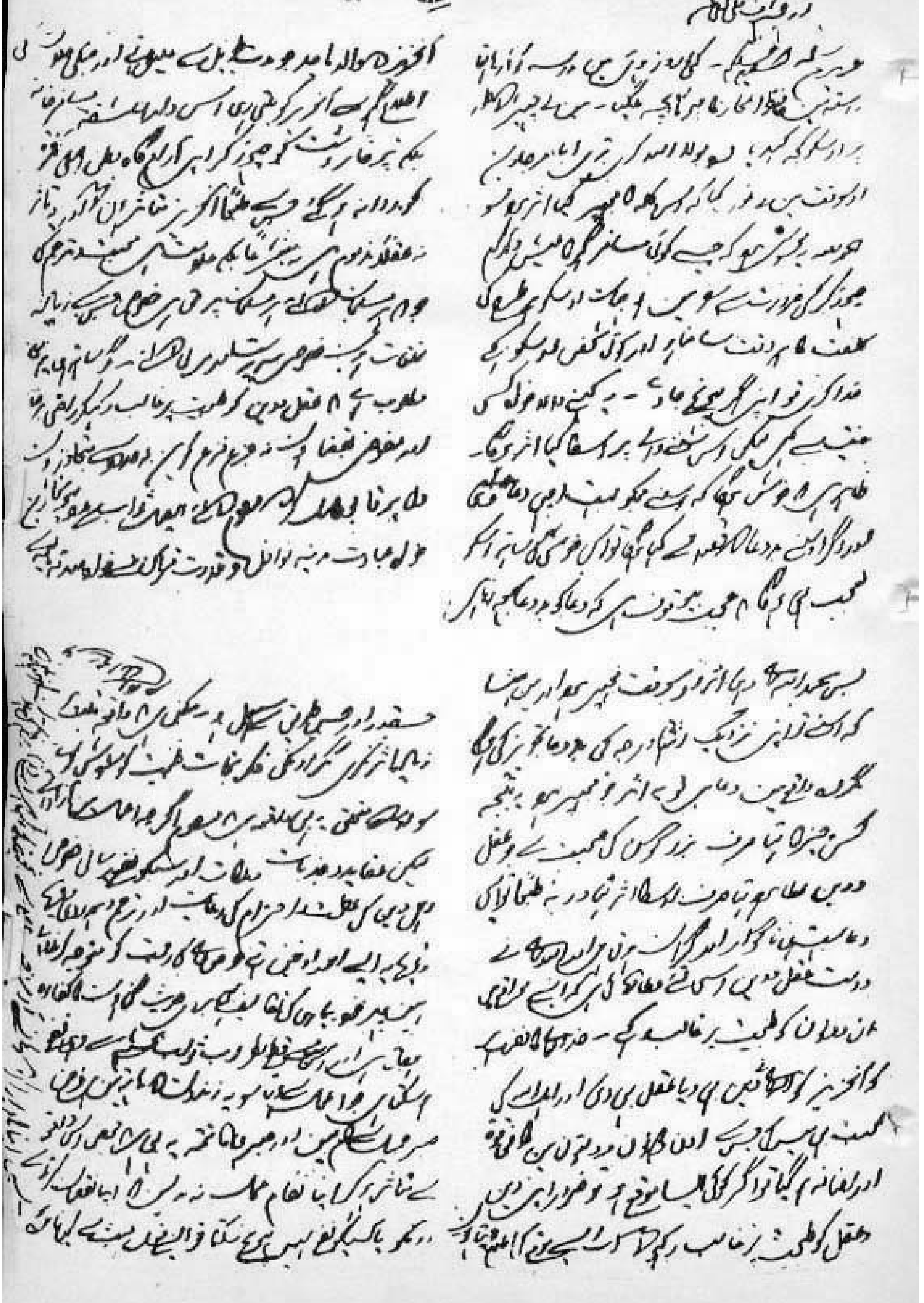

اعتذار و اعتراف

الحمدللہ حکیم الامتؒ کانفرنس (منعقدہ ۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۸۷ء) کے موقع پر "الحسن" کے حکیم الامتؒ نمبر کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ انشاء اللہ العزیز دوسری جلد بھی عنقریب ہی پیشِ خدمت کر دی جائے گی۔ نمبر کی تیاری اچھا خاصا مشکل کام ہوتا ہے اور پھر اگر کسی اہم شخصیت پر شائع کیا جائے تو اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے کام کے لیے مہینوں نہیں سالوں کی محنتِ شاقہ درکار ہوتی ہے۔ شومئی قسمت کہ ہمیں اس نمبر کی تیاری کے لیے بہت ہی کم وقت ملا، صرف پندرہ دن جس میں کماحقہ تیاری کا تصور کرنا بھی محال ہے تاہم اسے حکیم الامتؒ مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی کرامت ہی سمجھیے کہ اس قدر قلیل وقت میں اتنا ضخیم نمبر (گو اس کی پہلی قسط ہی سہی)، شائع کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔

راقم السطور بھی بوجہ علالتِ طبع و دیگر مصروفیات پوری توجہ نہیں دے سکا۔ تاہم اُمید ہے کہ انشاء اللہ قارئینِ کرام اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ دورانِ مطالعہ نظر سے کسی قسم کی غلطی (جس کا ایسے عجلت کے مواقع پر ہو جانا کچھ بعید نہیں) گزرے تو اس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ادارے کو آگاہ بھی فرما دیں تاکہ آئندہ کی اشاعت میں اس کو درست کیا جا سکے۔ اگرچہ "الحسن" کی اس اشاعت کے لیے ہمارے کرمفرماؤں اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین نے بڑے قیمتی مقالات سے نوازا تھا، مگر وقت کی کمی اور اشاعت کی عجلت ان کو اس جلد میں شامل کرنے سے مانع رہی۔ انشاء اللہ العزیز ان مقالات کو حکیم الامتؒ نمبر کی دوسری جلد میں شائع کیا جائے گا۔ ان مقالہ نگار حضرات میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی، حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری (دیوبند) حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب لاہور اور اس طرح دوسرے بہت سے اکابرین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ہم ان تمام حضرات کے بھی ممنون ہیں جن کی شبانہ روز انتھک محنت سے حکیم الامۃؒ

نمبر کی جلد اول تیار ہو کر آپ تک پہنچی۔ اس سلسلے میں "محسن" کے عملہ کے علاوہ امام الخطاطین حضرت سید نفیس الحسینی صاحب کے مشکور ہیں جن کی سرپرستی میں ان کے رفقاء نے کتابت و طباعت کے مراحل میں بھرپور ساتھ دیا۔ علامہ ڈاکٹر خالد محمود، جناب ہارون سعد (سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ امروز لاہور) اور برادرِ محترم جناب مولانا محمود اشرف عثمانی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے قلمی تعاون کے علاوہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا اور پروف ریڈنگ جیسے کٹھن کام میں بھرپور تعاون فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر سے نوازے۔ ؎ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد اکرم کاشمیری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ

حکیم الامّت کا نسخۂ کیمیا

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانفرنس کے موقع پر "الحسن" کا خصوصی شمارہ بحمد اللہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یوں تو "الحسن" شائع ہی صرف اس مقصد سے ہو رہا ہے کہ حکیم الامّت کی تعلیم اور تلقین کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور پاکستانی معاشرہ کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی معاشرہ کی شکل دینے کے لیے اُس نسخۂ کیمیا کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے جو حکیم الامّت قیامِ پاکستان سے پہلے ہی اُمّت کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے تجویز کر گئے تھے۔

برِّصغیر پاک و ہند کی مُسلم تاریخ بلند پایہ صوفیائے کرام، مشائخ عظام اور علمائے گرامی کے ناموں سے بھری پڑی ہُوئی ہے اور حقیقت یہی ہے کہ برِّصغیر میں آج اہلِ ایمان کی جو اتنی بڑی تعداد نظر آتی ہے وہ انہی بزرگوں کی جُہد و مشقّت کے طفیل ہے۔ جہاں تک بادشاہوں کا سوال ہے وہ تو بالعموم حکمرانی کی مصلحتوں میں ہی مشغول و منہمک رہے اور انہی مصلحتوں کے تحت کبھی دینِ الٰہی کا شوشہ چھوڑتے رہے تو کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کی ناز برداریوں کے لیے شریعتِ اسلامی کے تقاضوں کو پامال کرتے رہے۔ حضرت علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، فرید الدین گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاؒ اور ایسے ہی سینکڑوں بزرگوں کی کاوشیں نہ ہوتیں تو ہزار سالہ مُسلم دورِ حکومت کے باوجود آج برِّصغیر میں مسلمانوں کا وجُود بھی شاید ہی برقرار رہا ہوتا، بالکل اُسی طرح جس طرح سپین میں طویل مسلم حکومت کے باوجود آج مسلمانوں کا کوئی وجُود نہیں — مُسلم دورِ حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی یہ ہمارے صُوفیاء، مشائخ اور عُلماء ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کی ڈوبتی ہُوئی کشتی کو سہارا دیا اور ایک طرف انگریزوں اور دُوسری طرف ہندو ابنائے وطن کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی یلغار سے اُنھیں بچایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، حضرت سیّد احمد شہید، حضرت شاہ اسمٰعیل شہید، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں نے انگریزی اقتدار کے قیام سے بیسویں صدی کے اوائل تک ایک طرف انگریزی اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بھی سربلند رکھا اور مسلمانوں کو اُن کی مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی پستی سے نکالنے کے لیے بھی جُہد آزما رہے۔ انہی اکابرین کے نقشِ قدم پر جس بزرگ ہستی کا نام نامی ہمیں بیسویں صدی میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اُنھیں بجا طور اس صدی کا مجدد تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اُنھوں نے ایک خانقاہ نشین مُرشد کی حیثیت سے ہزاروں اور لاکھوں مُریدوں کے تزکیۂ نفس اور رُوحانی تربیت کا اہتمام ہی نہیں کیا بلکہ اپنی سینکڑوں تصانیف کے ذریعہ ہندی مسلمانوں کے عقائد، رُسوم و رواج اور آداب و معاشرت پر صدیوں کی پڑی ہوئی گرد کو صاف کیا اور اسلام کو اس کے اوّلین سرچشموں یعنی قرآن و سُنّت کی روشنی میں اس کی صاف، پاکیزہ اور نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا۔ اس کی صرف ایک مثال "بہشتی زیور" ہے — تین چوتھائی صدی سے مسلم گھرانوں کی تربیت میں جو کردار اُن کی اس مشہور و معروف تصنیف نے ادا کیا ہے اتنا شاید ہی کسی اور مصنف کی کسی کتاب نے ادا کیا ہو۔

دین و معاشرت میں تجدیدی کردار کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور آزادی کے میدان میں بھی حکیم الامتؒ نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی تصانیف اور تربیت کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوؤں اور دُوسری اقوام سے علیحدہ اپنے ملی تشخص کا احساس دلاتے رہے بلکہ جب مسلم لیگ مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم پر منظم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہوئی تو حکیم الامتؒ نے اپنا پورا وزن تحریکِ پاکستان کے پلڑے میں ڈالا اور دیگر علماء اور عام مسلمانوں کو بھی منطقی استدلال سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے لیے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت کیوں مناسب نہیں ہے اور مُسلم لیگ میں شمولیت کیوں ضروری ہے۔ اتنا ہی نہیں جب قیامِ پاکستان کی تحریک شروع ہُوئی تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ابتداء سے اپنی تائید و حمایت سے قائدِ اعظمؒ کی پوری معاونت کی اور یہ اُن ہی کے جرأت مندانہ موقف کا نتیجہ تھا کہ کانگریسی علماء کی مخالفت کا زور ٹوٹا اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں علمائے حق کا ایک ایسا دستہ تیار ہو گیا جس نے مذہبی رُخ سے تحریکِ پاکستان کی عمومی پُشت پناہی کی اور بالخصوص سرحد اور سلہٹ کے استصواب میں کانگرس اور نیشلسٹ مسلمانوں کی مشترکہ تنظیم کی طاقت کو نیچا دکھایا۔ حکیم الامتؒ کی تحریک و تائید کے ساتھ کام کرنیوالے اِن علمائے حق کی خدمات کا اعتراف ہی تھا کہ قائدِ اعظم علیہ الرحمۃ نے مغربی پاکستان میں پاکستان کی پہلی پرچم کشائی

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مشرقی پاکستان میں مولانا ظفر احمد عثمانی کے ہاتھوں سے کرائی۔ تاریخ کے ساتھ آج یہ کیسا ظلم اور مذاق ہے کہ جن حضرات نے قائدِ اعظمؒ کو کافرِ اعظم کے خطاب سے نوازنے اور پاکستان کے حامی جمہور مسلمین کو غلط اور گمراہ ثابت کرنے میں زبان و قلم کا پورا زور صرف کر دیا اور جن کی تصنیفات آج بھی اس کی گواہی دے رہی ہیں۔ آج وہ اپنے آپ کو اور اپنی جماعتوں کو تحریکِ پاکستان کا مجوز اور محرک ثابت کر رہے ہیں اور حقیقت میں جن علماء نے تحریکِ پاکستان کی آبیاری کی، ان کو دیدہ و دانستہ پس پُشت ڈالا جا رہا ہے۔

پاکستان آج جن حالات سے گزر رہا ہے ان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی فکر اور تعلیمات کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، سیاسی میدان میں بھی اور مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی میدان میں بھی۔ ہماری ریاست آج جس درجہ کی بدعقیدگی، گمراہی اور نظریاتی سطح پر اسلام دشمنی کی زد میں ہے، اتنی پہلے کبھی نہیں تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طرف سے مغربی طاقتیں، دوسری طرف سے اشتراکی قوتیں، تیسری جانب سے ہمارے ازلی دشمن ہندوستان نے تہیہ کر رکھا ہے اور شاید وہ سب اس بارے میں متحد و متفق بھی ہو چکے ہیں کہ پاکستان کو برقرار نہیں رہنا چاہیئے اور اگر مجبوراً برقرار رکھنا ہے تو وہ بھی صرف اس صُورت میں کہ یہ کسی طرح بھی حقیقی معنوں میں ایک اسلامی مملکت نہ بن سکے۔ امریکہ، رُوس یا ہندوستان میں سے کسی کے بھی مطیع و فرمانبردار اور باجگزار ملک کی حیثیت سے تو شاید ان طاقتوں کو پاکستان کے زندہ رہنے پر اعتراض نہ ہو لیکن ایک آزاد، خُودمختار اور طاقتور مُسلم مملکت کی حیثیت سے ہماری بقا نہ اُنھیں منظور ہے جو اپنے آپ کو ہمارا دوست کہتے ہیں اور نہ اُنھیں جو اعلانیہ ہمارے مخالف ہیں۔ ہمارے دوست اور دشمن اپنے اس مقصد کے حصُول کے لیے ایک طرف براہِ راست سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی یلغار کیے ہیں تو دوسری جانب بدعقیدگی گمراہی اور مذہب کے نام سے طرح طرح کے فتنوں کی پرورش کر کے ہمیں اندر سے کمزور اور کھوکھلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ــــ افسوس یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں اور ہمارے اہلِ اقتدار کی کمزور، بودی مرعوب اور خوف زدہ فکری سطح کی وجہ سے ہمارے دشمنوں کی کوششیں ایک حد تک کامیاب بھی ہوتی نظر آ رہی ہیں ــــ اور اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ حکومت اور دانشوروں کے اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ تک ہر ایک قوم کو یہ مشورہ دیتا نظر آ رہا ہے کہ اسلام کو زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ گویا اسلام نہ ہُوا زمانہ کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہو گیا۔ کیا سُود، کیا زکوٰۃ۔ کیا عُشر، کیا نفاذِ حدُود کا مسئلہ، کیا عائلی قوانین، کیا عورتوں کی آزادی، کیا انصاف، کیا تجارت اور کیا معیشت، ایک نئی شریعت

کو جنم دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ستم یہ ہے کہ یہ سب کچھ بھی قرآن و سنّت کے نام پر کیا جا رہا ہے مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حکمرانوں کو نہ طورِ حکمرانی بدلنے پڑیں، نہ افسروں کو افسر شاہی کی قربانی دینی پڑے، نہ امیروں کو اپنی امارت ترک کرنی پڑے، نہ جاگیرداروں کو اپنے جاگیردارانہ مظالم ختم کرنے پڑیں، یہ سارے مزے جاری رہیں، ناچ گانے جاری رہیں، طرب و نشاط کی محفلیں جاری رہیں، عیش و عشرت جاری رہے، بس یہ کہ ان سب کے جاری رہتے ہوئے بھی ہماری پیشانیوں پر اسلام کا لیبل لگ جائے بقول شاعر ؎

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

حکیم الامتؒ کی تعلیمات کو یاد کرنے، اُنھیں پھیلانے اور دُنیا کی نہ سہی تو کم از کم پاکستان کی ہر زبان میں اُن کا ترجمہ کرکے انھیں پھیلانے کی ضرورت اس لیے بہت زیادہ محسوس کی جا رہی ہے کہ انھوں نے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا تھا، انھوں نے ساری ملاوٹوں اور آمیزشوں کو چھان کر اسلامی شریعت کو اپنی خالص شکل میں ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔

اس ہفتہ جامعہ اشرفیہ میں جو حکیم الامتؒ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ وہ وقت کی اس اہم ترین ضرورت کی ادائیگی کی طرف ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے صدرِ مملکت بھی شریک ہو رہے ہیں، اس لیے اس موقعہ پر اُن کی خدمت میں یہ حقیر سی گزارش بے جا نہ ہوگی کہ اگر آپ کے دل میں واقعی اسلام کی محبت موجزن ہے اور آپ پاکستان میں کسی مصنوعی اسلام نہیں بلکہ حقیقی اسلام کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں تو جرأت مندی سے حکیم الامتؒ کی تعلیمات کو خود بھی اپنائیے اور عوامی سطح پر بھی اُنھیں پھیلانے کی کوشش کیجیے۔

ہارون سعد

وقت کی مؤثّر آواز

پاکستان کے بہت سے دانشور وقت کے بین الاقوامی حالات میں اس سوچ میں گھرے ہوئے ہیں کہ پاکستان عالمی افق پر ہر ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے کیا کوئی چمک رکھتا ہے؛ شمالی راستے سے خطرے کی گھنٹی مسلسل سننے میں آ رہی ہے جس نے بہت سے ذہنوں کو ماؤف کر رکھا ہے یہاں تک کہ اب بعض دینی حلقے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ موجودہ وقت میں اسلام کے نام پر کوئی آواز لگانا وقت کی نبض سے ہاتھ اُٹھانا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وہ نابغۂ روزگار ہستیاں تھیں جنھوں نے پاکستان کے خاکے میں اسلام کا رنگ بھرا قائد اعظم نے اس حقیقت کا پورا اعتراف کیا۔ اور انھوں نے پاکستان بنتے ہی اس کا جھنڈا علماؒ کے ہاتھ میں دیا اور بتلایا کہ جس طرح یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے یہ ان علماؒ کی دینی بصیرت کے مطابق ہی چل سکتا ہے۔

حکیم الامت اس شخصیت کا نام ہے جس کی بات امت میں محکم ہے اس میں تسلسل ہو تزلزل نہ ہو۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے پاکستان کی حمایت محض عقیدت سے نہیں دیدہ بصیرت سے کی تھی ہمیں پاکستان کے نقش محکم ہونے پر پورا الیقین ہے لیکن آپ نے کیا کبھی اس کے سیاسی تقاضوں پر بھی غور کیا ہے؟ اگر پاکستان ایک محکم اسلامی ریاست ہے اور یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی بہار آئے تو پھر یہ صرف ایک اسلامی ملک نہیں اس کے ساتھ اسلامی ممالک کا ایک وسیع سلسلہ متصل ہوتا ہے جو عرب ممالک تک پھیلتا چلا جاتا ہے اس صورت میں یہ صرف ایک محدود اسلامی خطہ نہیں ایک غیر محدود اسلامی طاقت ہوگا اور اگر یہ ملک حضرت حکیم الامت کی بتائی اسلامی راہ پر نہیں چلتا تو پھر یہ ایک محدود خطۂ ارضی ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں اور اس کی اپنی راہ ہے۔

آسان لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ پاکستان اگر ایک اسلامی سلطنت نہیں بنتا محض ایک سیکولر سٹیٹ ہو تو یہ ہندوستان کا چھوٹا بھائی ہے اور اگر یہ نظام شریعت کے ساتھ ایک اسلامی سلطنت بنتا ہے تو یہ ہندوستان کا بڑا بھائی ہوگا اور اس سے کہیں بڑھ کر ایک عظیم اسلامی طاقت ہوگا اب آپ ہی غور کریں بڑا بھائی بننے میں ہماری بہتری یا چھوٹا بھائی بننے میں ۔

اس صورت حال میں آپ یہ بھی سوچیں کہ ہندوستان کی خوشی کس بات میں ہوگی ؟ پاکستان اس کا چھوٹا بھائی بن کر رہے یا بڑا بھائی بن کر —— ظاہر ہے کہ ہندوستان کبھی یہ پسند نہ کرے گا کہ یہ خطہ ارضی ایک عظیم اسلامی طاقت بنے (جو لوگ مسلمانوں کو دو قوموں میں تقسیم کرنے کے ہیرو کہلاتے ہیں وہ اس ملک میں نفاذ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں) یہاں مسلمانوں کو آپس میں جوڑنے ان کے اختلافات کم کرنے اور انہیں ایک قوم کے طور پر اٹھانے کی ضرورت ہے حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ نے پاکستان کی حمایت اس لئے کی تھی کہ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا عملاً نفاذ ہو اب ظاہر ہے کہ ہم پاکستان کے اس مرتبہ کے حصول میں تبھی کامیاب ہوسکیں گے کہ جس طرح حکیم الامتؒ نے کسی مسلمان فرقے کو کافر نہیں کہا ہم بھی امت میں جوڑ پیدا کریں اور اس پر پوری نظر رکھیں کہ جو شخص مسلمانوں کے کسی طبقے کو محض الزامات کے سہارے کافر کہتا ہے اور اس کی لوگوں میں تحریک چلاتا ہے کیا اسے کسی ہمسایہ ملک نے تو یہاں اکسپورٹ نہیں کیا ۔ جس نے بعد میں پاکستان کی قومیت حاصل کرلی ہو ؟

یہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے جملہ معتقدین و متوسلین سے گذارش کریں گے کہ پاکستان آپ کے بزرگوں نے بنایا ہے قائد اعظمؒ نے اکابر دیوبند سے اس کی پرچم کشائی کرائی ہے اب یہ آپ کا فرض کہ اس کی وحدت سالمیت اور عظمت پہ کوئی آنچ نہ آنے دیں اور اس عقیدہ کے بنیانِ مرصوص بنے کہ سب مسلمان بلا لحاظ رنگ و نسل ایک قوم ہیں انہیں کسی قیمت پر بھی دو قومیں نہ بننے دیں کونوا عباد اللہ اخوانا " —— ادارہ الحسن تاریخ پاکستان کے اس نازک موڑ پر حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے نام پر اس خاص نمبر کی اشاعت کو وقت کی ایک اہم آواز سمجھتا ہے مبارک ہیں وہ جو ہماری اس آواز پر لبیک کہیں اور وحدت ملت اور استحکام پاکستان کے لئے دل و جان سے کوشاں ہوں —— (ڈاکٹر علامہ) **خالد محمود** عفا اللہ عنہ

ایامِ زندگانی سیدنا اشرف علی درآیاتِ قرآنی

۱۹۴ ۱۲۵ ۶۹۱ ۹۷۷

۱۹۸۷ء

مولانا خلیل احمد تھانوی صاحبزادہ مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب

◆

ہندوستان پاکستان میں اگر دیکھا جائے تو صوبہ یوپی کو یہ فخر حاصل ہے کہ جس قدر علمائے دین اس خطہ میں پیدا ہوئے اور کسی صوبہ میں شاید ہی ہوئے ہوں اور پھر اس صوبہ میں سے کاندھلہ دیوبند۔ سہارنپور اور خاص طور پر تھانہ بھون ایسے علاقے ہیں جن میں بڑی بڑی ذی علم و عرفاں ہستیاں پیدا ہوئیں تھانہ بھون جس کا پرانا نام تھانہ بھیم تھا اور جس کو محمد پور بھی کہتے تھے اس میں تین بزرگ بہت مشہور ہوئے۔ جن میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ حافظ ضامن صاحب شہیدؒ اور شیخ محمد صاحب محدث تھانویؒ

یہ حضرات موجودہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں قیام پذیر تھے جس کا نام اس وقت "دکان معرفت" زبان زد ہو گیا تھا۔

جنگ آزادی کے جہاد شاملی میں حافظ ضامن صاحب تو شہید ہو گئے اور ناکامی کے بعد حضرت حاجی صاحب مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے اور شیخ محمد محدث تھانوی کا انتقال ہو گیا اور یہ دکان معرفت جو لوگوں کے لیے اصلاح باطن کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور مرجع خلائق تھی ویران ہو گئی۔

پھر مشیت ایزدی سے اسی قصبہ تھانہ بھون میں ۱۲۸۰ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا جس نے اس دکان معرفت کو پھر سے آباد کیا اور اس خانقاہ کے در و دیوار جو ذکر الٰہی کرنے والوں کو ترس گئے تھے ان میں پھر سے ہر طرف ذکر کرنے والوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ملک کے گوشے گوشے

سے علم و عرفان کے متلاشی پروانہ وار اس خانقاہ کی طرف امنڈے چلے آتے اور اس میں جو علم و عرفان کے خزانے لٹائے جا رہے تھے۔ ان سے اپنے پیاسے دلوں کو سیراب کرنے لگے۔

یہ مبارک ہستی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی تھی۔ اسلاف سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ لوگ بزرگوں کی تواریخ پیدائش اور تواریخ وفات خوبصورت اشعار اور جملوں کی صورت میں نکالتے چلے آئے ہیں جہاں یہ ایک علمی مشغلہ ہے وہاں اس کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں۔ اس طریقہ پر بزرگوں کی پیدائش کے سن کو یاد رکھنے میں بھی سہولت رہتی ہے۔ چنانچہ کسی صاحب نے حضرت تھانویؒ کا سن پیدائش "کرم عظیم" نکالا ہے۔ حضرت جیسی عظیم ہستی کو پیدا فرمانا واقعی اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم عظیم ہے۔ اس تاریخ کو دیکھ کر احقر کو بھی خیال ہوا کہ حضرت تھانویؒ کی زندگی کے اکثر اہم واقعات کی تاریخ قرآنی آیات یا احادیث مبارکہ اور اگر ان سے نہ ہو سکے تو کسی خوبصورت مقولے یا جملے کی صورت میں نکالی جائے تاکہ اس کو یاد رکھنے میں آسانی بھی ہو اور پھر اگر آیت اس قسم کی ہو کہ جو اس واقعہ پر نشاندہی بھی کر رہی ہو تو کیا ہی خوب ہو۔ میں نے والد محترم حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ کی خدمت میں اپنے اس خیال کو پیش کیا تو فرمایا کہ ہاں ضرور نکالو اور میں تمہیں اس تاریخ گوئی کے ایک دلچسپ پہلو سے اور آگاہ کرتا ہوں۔ خواب اگرچہ کوئی حجت شرعیہ نہیں لیکن اس خواب سے تم پر تاریخ گوئی کا ایک خوبصورت پہلو واضح ہو جائے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کا جب انتقال ہوا تو مومن خاں مومن جو شعراءؒ کے استاد تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کی تواریخ وفات پر ایک بہت عمدہ قطعہ کہا۔

جب مومن خاں مومن کا انتقال ہوا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ کیسے گزری تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اس لیے بخشش کر دی کہ میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تواریخ وفات نکالی تھیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے سانحہ ارتحال پر بھی حضرتؒ کے اکثر خدام جن میں بڑے بڑے اکابرین کے اسمائے گرامی ہیں جیسے حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ حضرت مولانا ادریس صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی و دیگر اکابرین نے حضرت کی تواریخ وفات اردو عربی فارسی نظم و نثر میں مرتب فرمائی ہیں۔

احقر نے بھی ان حضرات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے اکثر واقعات کی تاریخیں قرآنی آیات میں لاحقے لگا کر نکالی ہیں اللہ تعالےٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت و نجات کا باعث بنائے اور مجھے ان حضرات کے کفش برداروں میں شمار فرمائیں

نتیجہ فکر بے حد خلیل احمد تھانوی

۷۹۲　　　۱۱۹۵

۱۹۸۷ء

۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی پیدائش کا بھی عجیب واقعہ ہوا والد محترم کے آپ سے پہلے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی دردگردہ کے علاج کے طور پر آپ کے والد محترم نے ایک دوا کھائی جو قاطع النسل مشہور تھی حضرت کی نانی کو جب خبر ہوئی تو فکر ہوگئی حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی مجذوب جن سے کچھ قرابت بھی تھی تشریف لائے تو ان سے عرض کیا کہ میری اس بچی کے بچے زندہ نہیں رہتے آپ دعا فرمائیں انہوں نے دعا فرمائی اور پیشگوئی فرمائی کہ دو بیٹے ہوں گے۔ نام بھی خود ہی تجویز فرمایا کہ اشرف علی ہوگا۔ اور حافظ قاری مولوی ہوگا۔ چنانچہ ۱۲۸۰ھ میں حضرت کی ولادت باسعادت ہوئی کسی نے مادہ تاریخ ولادت ”کرم عظیم“ نکالا ہے۔ حسب ذیل آیت سے بھی حضرت کی ولادت کی تاریخ نکلتی ہے۔

قد قال اللہ جل علمہٗ رَبِّ ھَب لِی مِن لَدُنکَ ذُرِّیَّۃً طَیِّبَۃً

۴۷۹　　　۱۳۸۴

۱۸۶۳ء

۱۲۸۵ھ حضرت تھانویؒ کی والدہ محترمہ کا سایہ پانچ سال کی عمر میں سر سے اٹھ گیا مادہ تاریخ ہے۔

۱۸۶۸ء قال جل قولہٗ اِرجِعِی اِلیٰ رَبِّکِ رَاضِیَۃً

۲۰۵　　　۱۵۶۳

۱۸۶۸ء

۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء حضرت حکیم الامت نے دس سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا بس حفظ کی

تاریخ اس آیت سے نکلتی ہے .

حکم النھی ابدًا   وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْن

۱۲۲   ۱۱۶۸

۱۲۹۰ھ

لقال اللہ جل امرہ   لَا تُحَرِّكْ بِہٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِہٖ

۵۰۶   ۱۳۶۷

۱۸۷۳ء

۱۲۹۲ھ حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانویؒ نے ۱۲ سال کی عمر ہی سے رات کو اٹھ کر تہجد
۱۸۷۵ء پڑھنے کا معمول بنا لیا تھا۔ سن تاریخ اس آیت میں ہے

وقد قال اللہ جل اسمہٗ ، وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِہٖ نَافِلَةً لَكَ

۳۸۰   ۹۱۲

۱۲۹۲ھ

۱۲۹۲ھ قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد حضرت تھانویؒ نے دینی علوم کی تحصیل شروع فرمادی
۱۸۷۵ء ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دیوبند تشریف لے گئے
مادہ تاریخ ہے .

قال النبی فداہ جدی   مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللہ

۳۳۱   ۱۵۴۴

۱۸۷۵ء

۱۲۹۴ھ حضرت تھانویؒ نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل تھانہ بھون میں اپنے ماموں مولانا واجد علی
۱۸۷۷ء صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب سے کی تقریباً چودہ سال کی عمر تک ابتدائی تعلیم
مکمل فرمائی جس کی تاریخ حسب ذیل آیت سے نکلتی ہے .

لقد قال اللہ جل علمہٗ   وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا

۵۰۹   ۱۳۶۸

۱۸۷۷ء

سنہ ۱۲۹۸ھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بچپن ہی سے وعظ کہنے کا شوق تھا تقریباً چار سو سے زائد حضرت
سنہ ۱۸۸۱ء کے وعظ چھپ چکے ہیں سب سے پہلا وعظ اٹھارہ سال کی عمر میں زمانہ طالب علمی
میں تھانہ بھون میں کہا جس کا سن تھا ۱۸۸۱ء جو اس آیت میں ہے۔

وقال اللہ جل اسمہٗ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ

۳۴۲ ۱۵۳۹

قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ، ۱۸۸۱ء

سنہ ۱۲۹۸ھ اٹھارہ سال کی عمر میں اصلاح باطن کے لیے مثنوی زیر و بم تحریر فرمائی
سنہ ۱۸۸۱ء فقد قَالَ اللہ جَلّ امرہٗ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا

۶۶۰ ۱۲۲۱

۱۸۸۱ء

سنہ ۱۳۰۱ھ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہ الامت
سنہ ۱۸۸۴ء مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے علوم و معارف سیکھنے کے بعد دار العلوم دیوبند سے
سنہ ۱۳۰۱ھ میں سند فراغت حاصل کی، سن فراغت کے عدد اس آیت میں ظاہر ہوتے ہیں
فقال اللہ جل قولہٗ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

۳۸۵ ۹۱۶

۱۳۰۱ھ

سنہ ۱۳۰۱ھ دار العلوم سے فراغت کے فوراً بعد اسی سال اپنے والد ماجد کی معیت میں پہلا سفر
سنہ ۱۸۸۴ء حج فرمایا۔
فانما قال جل مجدہٗ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

۳۸۸ ۹۱۳

۱۳۰۱ھ

سنہ ۱۳۰۱ھ علم ظاہری کی تکمیل کے بعد علم باطنی کو حاصل کرنے کے لیے سید الطائفہ حضرت
سنہ ۱۸۸۴ء

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے درخواست بیعت کی جو قبول ہوئی۔ غائبانہ بیعت تو بذریعہ خط پہلے ہی ہو چکی تھی۔

حکم الٰہی حکم ازلی   اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ

۲۳۰   ۱۶۵۴

۱۸۸۴ء

۱۳۲۰ھ حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے تفسیر
۱۹۰۲ء بیان القرآن ۱۳۲۰ھ میں لکھنی شروع کی۔ جس کا مادہ تاریخ ہے۔

فقد قال اللہ جل قولہٗ   وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ

۵۵۵   ۷۶۵

۱۳۲۰ھ

۱۳۲۶ھ بیان القرآن مکمل ہونے کے بعد پہلی مرتبہ طبع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔
۱۹۰۸ء لقال اللہ جل امرہٗ   ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ

۵۰۶   ۸۲۰

۱۳۲۶ھ

۱۳۳۴ھ حضرت مولانا تھانویؒ نے دو شادیاں فرمائیں آپ کی دوسری شادی ۱۳۳۴ میں
۱۹۱۶ء ہوئی اور دوسری اہلیہ صاحبہ مدظلہا تادم تحریر حیات ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور ان کے فیوض سے ہمیں مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے لاہور میں والد محترم حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ کے ہمراہ ۲۰ سی ماڈل ٹاؤن میں قیام پذیر ہیں حضرت کی دوسری شادی کی تاریخ حسب ذیل آیت مبارکہ سے نکلتی ہے۔

قال اللہ جل وحیہ   فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی

۱۳۳۴ھ

۱۳۳۹ھ جب تحریک خلافت چلی تو حضرت تھانویؒ پر بہت اعتراضات کئے گئے حضرتؒ
۱۹۲۰ء

نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ایک مختصر مضمون شائع فرمایا جس میں حضرت نے اپنے مسلک وموقف کو واضح فرمایا۔ اس کی تاریخ کے لیے حسب ذیل آیت سے عدد نکالے گئے ہیں۔

انما قال جل وحیه	فانما علیك البلاغ وعلینا الحساب
۲۸۵	۱۶۳۵

۱۹۲۰ء

۱۳۴۰ھ حضرت تھانوی نے تحریک خلافت کے بارے میں ایک رسالہ الروضة الناضرہ

۱۹۲۱ء فی المسائل الحاضرہ لکھ کر اپنے موقف کی مزید وضاحت فرمائی

وقال الله	اِنَّ هٰذا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا
۲۰۳	۱۷۱۸

۱۹۲۱ء

۱۳۴۱ھ جب اطراف آگرہ سے ۱۹۲۲ء میں فتنۂ ارتداد کی خبر آئی تو حضرت نے مولانا عبدالکریم

۱۹۲۲ء صاحب گمتھلوی اور مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی کی اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے

روانہ کیا۔

انما قال جل وحیه وامرہ	وأعدوا لهم ما استطعتم من قوۃ
۵۳۰	۱۳۸۵

۱۹۲۲ء

۱۳۴۶ھ الور میں جب مدارس دینیہ پر پابندی لگائی تو حضرت مولانا اشرف علی صاحب رح

۱۹۲۶ء نے مولانا عبدالکریم صاحب کو ۱۰۰/ روپے عنایت فرما کر بھیجا کہ اس قانون کے خلاف

رسائی کی جائے الحمد للہ اس میں کامیابی ہوئی اور پابندی اٹھ گئی یہ واقعہ ۴۷-۴۶-۴۷ء

میں پیش آیا اس لیے دونوں سنوں سے اس کی تاریخ نکالی۔

لقد قال الله جل کلامه	والله مُتِمُّ نورِهٖ ولو كَرِهَ الكافِرُون
۴۶۰	۱۴۶۸

۱۹۲۸ء

۱۳۴۷ھ قال جل حکمہٗ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہٖ

۱۹۲۹ء ۲۳۷ ۱۶۹۲

۱۹۲۹ء

۱۳۴۹ھ مجلس صیانۃ المسلمین کے نام سے ایک جماعت قائم فرمائی جو مسلمانوں کی سیاسی طور

۱۹۳۰ء پر دینی رہنمائی کرتی۔

حکم الٰہی عطا ہوا ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر

۲۰۶ ۱۷۲۴

۱۹۳۰ء

۱۳۵۲ھ جب وقف کا خلاف شریعت قانون بنانے کی کوشش کی گئی تو حضرت کی زیر نگرانی

۱۹۳۳ء مفتی محمد شفیع صاحبؒ مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ اور مولانا عبدالکریم صاحبؒ

نے ایک مسودہ شریعت کے مطابق تیار کیا جس کو حضرت نے دیکھ کر خود بھی اس پر

دستخط فرمائے اور دیوبند غور و خوض کے لیے بھیج دیا وہاں کے علمانے بھی اس پر غور و

خوض کیا اور اس کو بالاتفاق منظور فرمایا اور ترمیمی مسودہ کونسل کو بھیج دیا گیا کہ وہ اس کے

مطابق اپنے بنائے ہوئے قانون وقف میں ترمیم کر کے اسکو شریعت کے مطابق کرے۔

اس واقعے کی تاریخ اس آیت سے نکلتی ہے

تد قال جل وعدہٗ ادخلوا فی السلم کافۃ

۳۵۳ ۹۹۹

۱۳۵۲ھ

۱۳۵۷ھ قیام لاہور کے دوران حضرت تھانویؒ سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار

۱۹۳۸ء پر تشریف لے گئے فاتحہ پڑھی اور پھر دوسرے روز بادشاہی مسجد قلعہ اور جہانگیر کے

مقبرے پر تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھی۔

حکم داد کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

۸۷ ۱۸۵۱

۱۹۳۸ء

۱۳۶۲ھ
۱۹۴۳ء

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بروز چہار شنبہ بوقت صبح صادق واقع ہوئی اور اس سرائے فانی اور قیام گاہ عارضی کو بیاسی سال تین ماہ گیارہ دن اپنے وجود مسعود سے مشرف فرمانے کے بعد بالآخر قصبہ تھانہ بھون (ضلع مظفرنگر یوپی ہند) میں ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ شب سہ شنبہ یعنی ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء بوقت نماز عشاء اپنی دائمی آرام گاہ جنت الفردوس کو رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون اور اللہ تبارک وتعالے کا یہ قانون پورا ہوگا

قد قال عز وجل	کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوت
۳۵۱	۱۵۹۲

۱۹۴۳ء

۱۳۶۲ھ
۱۹۴۳ء

نتیجہ فکر بے حد	خلیل احمد تھانوی
۷۹۲	۱۱۹۵

۱۹۸۷ء

یکے از خدام	دار العلوم دینیہ
۶۸۳	۳۶۱
حمایت اسلام	لاہور
۷۶۱	۲۴۲

۱۹۸۷

حکیم الامۃ حضرۃ مولانا اشرف علی تھانویؒ

تُو چراغِ رہِ ایماں تھا رسالت کا نقیب
تیرے افکار تھے بیمار تمدّن کے طبیب

بے بصر عہد کی یُوں تُو نے مسیحائی کی
کُھل گئی راہ ہر اِک ذہن پہ دانائی کی

گُل کھلائے تیرے انوار نے ویرانے میں
تُو نے تکبیر پڑھی ہند کے بُتخانے میں

حرفِ حق تُو نے اُتارا ہے دلوں کے اندر
ہم گنہگاروں کو بخشا ہے "بہشتی زیور"

تیرا اندازِ سُخن پھولوں کی خوشبُو جیسا
تیری تحریر کا ہر حرف ہے جگنو جیسا

تیری پوروں میں قلم صُورتِ قندیلِ حرم
مشعلِ نُورِ ہدایت ہے تیرا نقشِ قدم

نُورِ قرآں سے منوّر تیرا سینہ ایسے
صُبح کے نُور میں ہنستا ہو مدینہ جیسے

تیری رفتار تھی یا وقتِ گریزاں کا سفر
نُور کی مَوج تھی یا تیری اُٹھتی سی نظر

اپنے کردار سے یُوں رنگ بکھیرا تُو نے
کر دیا گھور اندھیروں میں سویرا تُو نے

کم نہیں ہو گی کبھی تیرے مواعظ کی مہک
راہ دکھلاتی رہے گی تیری سیرت کی دھنک

کلیم عثمانی

انوارِ خانقاهی

عجب فرحت گہے ایں خانقاہ است
عجب نزہت گہے ایں خانقاہ است
یکے ساقی و مے خواراں ہزار اند!
دو چشم مست او در مشغول کار اند
دل ایں جا می کند اللہ اللہ!
کہ ہر دم بشنود اللہ! اللہ
چہ صحت بخش ہست ایں جا فضائے
دل ایں جا بے دوا یابد شفائے

تعالے اللہ چہ عالی بارگاہ ہے
کہ ایں جا ہر گدائے بادشاہ ہے
(حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب)

عارفی مجھ سے پوچھئے رازِ حیاتِ میکدہ
پیرِ مغاں کے در پہ ہوں عمر بسر کئے ہوئے

(عارفی)

جذبۂ بے اختیار

محفل سوز و گدازِ غم کو گرمائے گا کون
اہلِ دل کو اپنے دردِ دل سے تڑپائیگا کون

موجزن ہے کس کے دل میں آتشِ سیّالِ غم
مستئ خونِ جگر آنکھوں سے برسائے گا کون

کس پہ طاری ہے جنونِ شوق کی وارفتگی
یوں زباں پہ والہانہ رازِ دل لائے گا کون

عارفی میرا ہی دل ہے محرمِ ناز و نیاز
بعد میرے رازِ حسن و عشق سمجھائے گا کون

باریابِ مجلسِ اشرف رہا ہوں عارفی
یہ شرف میرے لئے سرمایۂ صد ناز ہے

دیکھتے ہیں مجھ کو عزت کی نظر سے اہلِ دل
اللہ اللہ ان کی نسبت میں بھی کیا اعجاز ہے

(عارفی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وأحسن منك لم تر قط عيني
وأجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرأً من كل عيب
كأنك قد خلقت كما تشاء

[illegible]

میری آنکھوں نے کبھی آپ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا
عورتوں نے آپ سے زیادہ کوئی صاحب جمال نہیں جنا
آپ کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے
جیسے آپ اپنی مرضی کے مطابق پیدا کیے گئے ہوں

بسم الله الرحمن الرحيم

إن الله يغفر الذنوب جميعا

إنه هو الغفور الرحيم

از گروہ اولیاء اشرف علی قدس سرہٗ

حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی۔ تھانہ بھون

زیرِ نظر بلند پایہ مقالہ ہمارے فاضل دوست حضرت مولانا نجم الحسن صاحب تھانوی مظاہری مدظلہ ابن حضرت مولانا سید ظہور الحسن صاحب کسولویؒ کا ہے جو آپ نے ماہنامہ "الحسن" کے حضرت تھانویؒ نمبر کے لیے ارقام فرمایا ہے۔

ان دنوں موصوف تھانہ بھون میں مدرسہ امداد العلوم اور خانقاہ امدادیہ کے ناظم ہیں اور ماشاءاللہ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی سرپرستی میں بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہے ہیں۔

الحسن کے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نمبر کی ترتیب کے وقت وہ بھارت سے جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اُنکے خصوصی تعاون اور مفید مشوروں سے اہلِ ادارہ کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اراکین ادارہ ان کے تہِ دل سے شکر گذار ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل اور عمرِ عزیز میں برکت عطا فرمائیں اور ان کے ذریعہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون کی سابقہ روایات اور زیادہ روشن ہوں۔ آمین

(شبیر احمد نفیسی)

حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو بدھ کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی۔ مادۂ تاریخ "کرم عظیم" ۱۲۸۰ اور لقب حکیم الامت ہے۔ ایک عالم نے آپ کا سجع "از گروہِ اولیاء اشرف علی" کہا تھا۔

حضرت کے والد شیخ عبدالحق صاحب کے یہاں اولاد نرینہ زندہ نہیں رہتی تھی۔ ان کی خوشدامن صاحبہ نے اس کا ذکر ایک مشہور صاحب خدمت مجذوب بزرگ حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی سے

کیا۔ جس پر حافظ صاحب نے فرمایا۔

"انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔"

چنانچہ مجذوب بزرگ کی پیشگوئی کے مطابق شیخ عبدالحق کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے اور انہیں کے ارشاد کے مطابق بڑے صاحبزادے کا نام اشرف علی اور چھوٹے کا نام اکبر علی رکھا گیا۔

خاندان

حضرت حکیم الامت کے حسب و نسب کا تعلق قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر یوپی کے ایک مقتدر خاندان سے ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد صاحب علم و وجاہت و اہل منصب تھے۔ آپ ددھیالی اجداد کی طرف سے نسباً فاروقی تھے۔ اور ننھیالی اجداد کی طرف سے علوی۔ ابھی اپنی عمر کی آپ پانچ ہی منزلیں طے کر پائے تھے کہ والدہ ماجدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور اس کے بعد آپ اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہنے لگے۔ والد ماجد کو آپ سے خاص انسیت و محبت تھی۔ وہ ایک مقتدر رئیس اور صاحب جائیداد آدمی تھے۔ میرٹھ کی ایک ریاست کے مختار عام بھی تھے۔ اور بڑے صاحب فراست تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادوں کی استعداد و صلاحیت کو بچپن ہی میں بھانپ لیا تھا۔ اور اسی بنا پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو دینی تعلیم کی طرف لگا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے اس ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت بڑی محنت و مشقت اور فراخدلی سے کی۔

تعلیم و تربیت

حضرت حکیم الامت ؒ کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں اور حافظ حسین علی مرحوم ——— سے کلام پاک حفظ کیا پھر تھانہ بھون آکر حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی ؒ سے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں اور اس کی سب انتہائی کتابیں اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو فارسی ادب کے کامل استاد تھے۔ اس کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل و تکمیل کے لیے ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ کے اواخر میں آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۳۰۱ھ میں آپ کی دستاربندی قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ کے دست مبارک سے ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔

دارالعلوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ؒ اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی توجہات خصوصی آپ کے اوپر مبذول رہیں۔

پہلی تصنیف

زمانہ طالب علمی میں جبکہ حضرت تھانوی کی عمر ابھی ۱۸ سال تھی ان کو مرض خارش لاحق ہوا۔ اس لیے وطن آگئے اور بطور مشغلہ فارسی اشعار پر مشتمل مثنوی زیر و بم تحریر فرمائی جو آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

طالب علمی کے احوال

دیوبند میں حضرت حکیم الامت کے بعض اعزہ اور رشتہ دار بھی تھے۔ لیکن والد ماجد کی ہدایت کے مطابق زمانہ طالب علمی میں سب سے الگ تھلگ رہے۔ طلباء سے بھی اختلاط نہ رکھتے تھے۔ مطالعہ کتب سے فرصت ملتی تو اپنے استاد خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پہنچ جاتے۔ انہی کی زیر تربیت آپ نے مشق افتاء بھی کی۔

اس زمانہ میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو مناظرے سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ آریوں کے مقابلہ میں کئی معرکے سر کئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی آپ پر خصوصی شفقت فرماتے اور آپ کی محبت و محنت اور صلاحیت کے پیش نظر حقائق و معارف اور نکات و دقائق علمیہ کثرت سے بیان فرماتے تھے اور حضرت تھانوی بھی خوب خوب استفادہ فرماتے آپ کے متعلق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ

"جہاں جاؤ گے تم ہی تم نظر آؤ گے"

مسند تدریس

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اساتذہ کی تجویز اور والد ماجد کی اجازت سے آپ صفر ۱۳۰۱ھ کانپور کے مدرسہ "فیض عام" میں بمشاہرہ ۲۵/ روپے ماہوار تشریف لے گئے۔ اور صدر مدرس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ تین چار ماہ کے قلیل عرصہ میں تمام علماء و مدرسین میں آپ کے علم و فضل کا چرچا ہوگیا۔ دوسری طرف آپ کے مواعظ حسنہ اور تقاریر عامہ نے سارے کانپور کو حضرت اقدس کا فریفتہ بنا دیا آپ کی اس شہرت و مقبولیت سے اہل مدرسہ نے فائدہ اٹھانا چاہا اور حضرت سے خواہش ظاہر کی کہ اپنے وعظوں اور تقریروں میں مدرسہ کیلئے اپیل بھی کر دیا کریں۔ حضرت حکیم الامت چونکہ اس طرح چندہ مانگنے کو نامناسب اور غیرت دینی کے خلاف سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس طرح وعظ کہہ کر چندہ کی اپیل کر دینے سے وعظ کا سارا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اہل مدرسہ کی اس خواہش کی حضرت کس طرح تکمیل فرما سکتے تھے؟ اس پر اہل مدرسہ میں حضرت

اقدس کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ اہل کانپور کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کو اس کا شدید صدمہ پہنچا۔ انہوں نے آپ کی تنخواہ کا بندوبست کر کے محلہ ٹپکا پور کی جامع مسجد میں درس و تدریس کا نظم کر دیا۔ حضرت حکیم الامت نے جامع مسجد کی مناسبت سے اس نئے مدرسہ کا نام جامع العلوم تجویز فرمایا۔ ۱۴ سال تک آپ کانپور میں درس تدریس افتاء اور تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپ کا طرز تعلیم اتنا نفیس، سلیس اور سہل تھا کہ جو طالب علم آپ سے دو چار سبق بھی پڑھ لیتا پھر دوسرے استاد سے اس کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ آپ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکیوں میں حل فرما دیتے، چنانچہ بہت جلد طلبہ اور اساتذہ میں آپ کے علم و فضل کا سکہ بیٹھ گیا۔

طریقہ درس

حضرت حکیم الامت کے اصول تعلیم مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) استاد کو محنت سے مطالعہ کر کے شاگردوں کے سامنے سبق کو سہل ترین صورت میں پیش کرنا چاہیئے۔

(۲) مشکل اور پیچیدہ مقام کو پہلے سہل ترین انداز میں شاگرد کو سمجھایا جائے بعد ازاں اس مقام کا تعارف شاگرد سے کرایا جائے۔ اور اگر پہلے ہی یہ بتا دیا کہ یہ مقام اس کتاب کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔ تو طالب علم نفسیاتی طور پر اس سے مرعوب ہو جائے گا۔ اور پھر سمجھنے میں دقت ہو گی۔

(۳) طلباء کے سامنے محض اظہار قابلیت کی خاطر زائد از ضرورت تقریر کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔

(۴) ہفتہ واری تقریروں اور مناظروں سے بھی حضرت کو شدید اختلاف تھا۔ فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے طلباء کی توجہ ہفتہ بھر ایک ہی موضوع تقریر و مناظرہ کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل سبق میں اس سے شدید حرج واقع ہوتا ہے اور فرماتے تھے کہ جب کتابیں اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آ جاتا ہے۔

طلبہ کو خصوصی ہدایت

(۵) فرماتے تھے کہ اگر طلبا تین باتوں کا التزام کر لیں تو علمی استعداد پیدا ہو جائے گی۔

(ا) آئندہ سبق کا مطالعہ ضرور کریں اور مطالعہ میں کتاب کا حل کرنا ضروری نہیں بلکہ معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا ہو جانی چاہیئے۔

(ب) استاد سے پڑھتے وقت بلا سمجھے ہوئے آگے نہ بڑھیں۔

(ح) جب سمجھ جائیں تو بعد میں ایک بار خود اسی مطلب کی تقریر کر لیں۔

فرماتے تھے کہ استعداد پیدا کرنے کے لیے یہ تین چیزیں تو واجب ہیں اور ایک چیز درجہ استحباب میں ہے اور وہ یہ کہ روزانہ پچھلے پڑھے ہوئے حصہ میں سے کچھ حصہ کا مطالعہ کر لیا کریں۔

طالب علم کی عظمت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ابتداء ہی سے طلباء کے ساتھ خاص محبت و تعلق اور انسیت رہی برابر ان کا لحاظ فرماتے رہتے خود ہمیشہ اپنے کو طالب علم ہی کہتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ

> مجھے پیرجیوں والی درویشی نہیں آتی، میں تو ایک طالب علم ہوں مجھ سے تو قرآن و حدیث کی باتیں پوچھی جائیں۔ مجھے تو سادہ سیدھا قرآن و حدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں۔

اور فرماتے کہ

> صوفیاء سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے۔

اسی وقعت علمی کا نتیجہ تھا کہ طلباء کے ساتھ ہر سطح کی رعایت فرماتے اور ان کی ہر طرح کی امداد کرتے تھے۔ ان کے وقار کا خاص لحاظ رکھتے اور دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے اور خود طلبہ کو نامناسب چیزوں کی طرف سے موڑ کر ان کے مقام اعلیٰ اور منصب جلیل پر فائز کرنے کی پوری سعی فرماتے تھے۔

اس چودہ سالہ عرصہ میں آپ کے دریائے علم سے ہزاروں افراد سیراب ہوئے جن میں سے حضرت مولانا اسحٰق بردوانی، مولانا محمد رشید کانپوری، مولانا احمد علی فتحپوری، مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، مولانا صادق الیقین کرسوی مولانا شاہ لطف رسول بارہ بنکی، مولانا حکیم محمد مصطفےٰ بجنوری، مولانا فضل حق بارہ بنکی کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بیعت وسلوک

چونکہ حضرت حکیم الامت کی پیدائش ایک مشہور اور صاحب خدمت مجذوب کی دعاؤں کا نتیجہ تھی، اس لیے پیدائشی طور پر آپ کے اندر عشق الٰہی کی حرارت شعلہ زن تھی۔

ایک بار قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تو حضرت حکیم الامت اشتیاق سے معانقہ کے لیے آگے بڑھے، شوق نے بے قابو کر دیا تھا، دار العلوم کے مشہور نودرہ کی تعمیر چل رہی تھی، پڑی ہوئی اینٹوں پر سے پاؤں بے اختیار پھسل پڑا، حضرت گنگوہی نے آپ کو تھام لیا

اگرچہ اس وقت بیعت اور اس کی حقیقت سے آپ ناآشنا تھے، مگر کشش اس درجہ بڑھی کہ آپ نے بیعت کی درخواست کر ہی دی۔ حضرت گنگوہی نے دوران تعلیم اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرمادیا۔ لیکن حضرت حکیم الامت کے قلب میں یہ خیال بصورت حسرت پرورش پاتا رہا اور رجب ۱۲۹۹ھ میں حضرت گنگوہی عازم حج ہوئے تو آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا کہ

"آپ مولانا (گنگوہیؒ) سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کرلیں۔"

لیکن جواب میں حضرت حاجی صاحب نے خود ہی غائبانہ طور پہ بیعت فرمالیا۔ اس وقت حضرت حکیم الامت کی عمر ۱۹ سال تھی۔

حضرت حاجی صاحب نے بیعت فرمالینے کے بعد آپ کے والد ماجد کو کہلا بھیجا کہ

"تم حج کو آؤ، اور جب آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو لیتے آؤ۔"

پہلا سفر حج

شوال ۱۳۰۱ھ میں جبکہ حضرت حکیم الامت کانپور کے اندر اشاعت علوم میں مصروف تھے سفر حج کے سامان پیدا ہو گئے۔ اور بمعیت والد ماجد آپ کو سفر حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ بصد اشتیاق مکہ معظمہ پہنچے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور دست بدست نعمت بیعت سے سرفراز ہوئے حج سے فراغت کے بعد حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ میاں اشرف علی تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔ لیکن لیکن حضرت والا کے والد ماجد نے مفارقت گوارا نہ کی اس لیے حضرت حاجی صاحب نے پھر فرمایا کہ

"والد کی اطاعت مقدم ہے۔ اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا۔"

دوسرا سفر حج اور اجازت بیعت

چنانچہ حضرت شیخ کے اس حکم اور خواہش کی تعمیل و تکمیل کیلئے سفر حج ۱۳۱۰ھ میں کیا اور مکہ مکرمہ تشریف لے جاکر صحبت خاص کی اس نعمت بے بہا سے مشرف ہوئے، جو عرصہ سے مرشد اور مسترشد کے دلوں میں ایک تمنا بنکر پرورش پا رہی تھی۔ ایک طرف حضرت حاجی صاحب کی قوت افاضہ اور دوسری طرف حضرت حکیم الامت کی قابلیت استفادہ بس تھوڑے ہی دنوں میں باہم اس درجہ مناسبت پیدا ہو گئی کہ حضرت حاجی صاحب یہ فرمانے لگے کہ

"بس تم میرے پورے پورے طریق پر ہو۔"

حضرت حاجی صاحب کے بیان علوم و معارف اور تقریر کے دوران اگر سامعین میں سے کوئی صاحب کچھ دریافت کرنا چاہتے تو حاجی صاحب حضرت تھانوی کی طرف اشارہ فرمادیتے کہ ان سے معلوم کرلینا یہ

اچھی طرح سمجھ گئے، اور حضرت حاجی صاحب کو جب حضرت تھانوی کی کوئی تحریر دیکھنے یا تقریر سننے کا اتفاق ہوتا تو خوش ہو کر فرماتے کہ جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینہ کی شرح کر دی۔ حضرت حاجی صاحب نے ایک دفعہ یہ بشارت دی تھی کہ

"تم کو تفسیر اور تصوف سے خاص مناسبت ہوگی"۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت کی ان دونوں سے مناسبت "تامہ اظہر من الشمس ہے۔

مکہ مکرمہ کے قیام میں آپ نے مشہور عالم مجود قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکی سے فن تجوید سیکھا، اور اس میں مہارت و کمال حاصل کیا۔ اور حاجی صاحب کے درس مثنوی شریف میں بھی شرکت فرماتے رہے۔ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں حضرت حاجی صاحب نے ہر طرح مطمئن ہو کر اور اپنے ذوق و مسلک سے ہم آہنگی کے آثار نمایاں دیکھ کر خلعت خلافت اور منصب رشد و ہدایت سے سرفراز فرمایا اور خلق خدا کی رہنمائی کیلئے تعلیم و تلقین کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد جب حضرت حکیم الامت نے واپسی کی اجازت چاہی تو بکمال شفقت آپ کو ہندوستان جانے کی اجازت دی اور دو وصیتوں کے ساتھ رخصت فرمایا۔

حضرت حاجی صاحب کی دو وصیتیں

۱ ، "دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت (باطنی) پیش آئے گی، عجلت مت کرنا مجھے مطلع کرتے رہنا۔

۲ ، کبھی "کانپور" کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا، توکل بخدا "تھانہ بھون" جا کر بیٹھ جانا۔"

حضرت حکیم الامت مکہ معظمہ سے ہندوستان واپس آکر پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مصروف درس و تدریس ہو گئے اور اس عرصہ میں تصنیف و تالیف کے علاوہ آپ کے عارفانہ و عالمانہ مواعظ و ملفوظات اور تہذیب و تربیت باطنی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جس کو اہل ذوق و بصیرت قلم بند کرتے رہے اور ۱۴ سالہ قیام کانپور کے دوران ہی یہ سلسلہ دور دور تک پہنچ گیا۔ اس زمانہ میں ابتدا ہی سے آپ کے علوم ظاہری اور باطنی کے فیوض سے عوام و خواص میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت پیدا ہو گئی تھی۔

مستقل قیام تھانہ بھون

اب کی مرتبہ مکہ معظمہ سے واپسی پہ کانپور کے زمانہ قیام میں آپکو ایسے حالات باطنی اسے سابقہ پڑتا رہا کہ تعلقات سے وحشت ہونے لگی۔ سارے مشاغل سے دل اُچاٹ ہوگیا۔ اور اس میں دن بدن ترقی ہوتی چلی گئی۔ درس و تدریس سے دلچسپی ختم ہوگئی۔ اور آپ ملازمت سے بھی دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۳۱۵ھ میں خود اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ایماء اور منشاء سے مدرسہ کانپور کی ذمہ داری دوسرے معتبر ہاتھوں میں سونپ کر نہایت حسن تدبیر سے سبکدوش ہو گئے۔ اپنے وطن اور اپنے پیر و مرشد کی یادگار "خانقاہ امدادیہ"[1] میں تشریف لے آئے اور تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ حضرت حاجی صاحب کو جب اس کا علم ہوا تو انتہائی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے تحریر فرمایا۔

---

[1] یہ وہی خانقاہ تھی جہاں کچھ زمانہ پہلے اللہ تعالیٰ کے تین برگزیدہ خلوت گزیں بندے درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ یعنی حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ، حضرت مولانا شیخ محمد صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (ایک ہی وقت میں یہ اقطاب ثلٰثہ اس مبارک مقام پر اقامت گزیں تھے۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ کا مرکز و مرجع ہونے کی وجہ سے یہ خانقاہ "دکان معرفت" کہلاتی تھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت حکیم ضیاء الدین رامپوری کے علاوہ دیگر علماء کرام اور حضرات مشائخ اکثر و بیشتر یہاں تشریف لاتے تھے۔ ان اکابر سے استفادہ کرتے اور کم و بیش کچھ عرصہ قیام بھی فرماتے۔ یہ تینوں حضرات میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کے خلفائے راشدین تھے اور اپنے علوم ظاہری و باطنی کے فیوض و برکات سے خواص اور عوام کو فیض رسانی میں مشغول تھے۔ پھر جب انقلاب آیا تو ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حضرت حافظ ضامن صاحب شہید ہو گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا انتقال ہوگیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکہ مکرمہ ہجرت فرما کر چلے گئے۔ کچھ مدت کے لیے یہ خانقاہ ضرور غیر آباد ہو گئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ان مقبول بندوں کی یادگار کو قائم رکھنا اور مستقبل میں اس خانقاہ کو ایک عالمگیر رشد و ہدایت و علوم ظاہری و باطنی کی نشر و اشاعت کا جلیل القدر مرکز بنانا منظور تھا۔ اور اس اہم و عظیم کام کو سرانجام دینے کیلئے حضرت حکیم الامت مجدد ملت محی السنت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ارشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو ازل ہی سے منتخب فرما لیا تھا۔

بصائر حکیم الامت صفحہ ۳۲ و ۳۳۔

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ (امداد العلوم) و مسجد کو از سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے (مکتوبات امدادیہ ص۳۶)

خانقاہ امدادیہ اور دینی خدمات

حضرت حکیم الامت نے اپنے شیخ کی تمنا اور ہدایت کے مطابق "خانقاہ امدادیہ" میں سکونت اختیار فرمائی اور توکلاً علی اللہ اپنے بزرگوں کی مقدس مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوگئے اور اپنے مذاق فطری اور نصب العین کے موافق ایک ایسا مکمل و منضبط لائحہ عمل تیار کیا جس کے مطابق اپنے پیش نظر عظیم الشان دینی و اصلاحی خدمات کے سرانجام دینے میں مشغول ہو گئے۔ پھر انفرادی اصلاح اور تربیت باطنی کے کام کو بہت فروغ ہوا اور یہ جگہ مریضان باطنی کے علاج کا مرکز بن گئی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی اصلاح و تربیت، تصنیف و تالیف، درس و تدریس، افتاء و تبلیغ، مواعظ و ملفوظات ہی میں بسر ہوئی۔ اور تقریباً نصف صدی تک خدمت و اصلاح خلق کے جتنے شعبے ہو سکتے تھے ہر شعبہ اور ہر راستہ سے تن تنہا وہ خدمات انجام دیں کہ بڑی بڑی جماعتیں اور ادارے اس کا عشر عشیر کرنے سے بھی عاجز ہیں۔

وقت گزرتا رہا اور اس خانقاہ کی اہمیت اور خصوصیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یہی خانقاہ ایک ایسا شہرۂ آفاق ہمہ گیر ادارہ بن گئی جو ایک ہی وقت میں دینی علوم و فنون کا ایک معیاری جامعہ بھی تھی۔ جہاں سے دین متین کے اہم اور دقیق مسائل کی تنقیح و تحقیق کا زبردست کام ہوا اور یہی خانقاہ ایک بے مثال دینی درسگاہ بھی تھی۔ جہاں علوم قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تہذیب اخلاق کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ خانقاہ برصغیر کی ایک مستند و معتبر دارالافتا رہی تھی۔ جہاں سے حالات حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کے فقہی مسائل میں رہنمائی بھی ہوتی۔ اور یہی خانقاہ تعلیم و تربیت روحانی اور تزکیہ نفس و تہذیب اخلاق باطنی کی ایک ممتاز و منفرد تربیت گاہ بھی تھی۔ جہاں بڑے بڑے جید علماء سے لیکر عوام کے ہر طبقہ کے طالبین حق و سالکین طریق تھوڑے سے عرصہ میں تربیت باطن اور تہذیب اخلاق سے آراستہ ہو کر حقیقت تصوف اور سلوک کا عرفان حاصل کر کے مشائخ طریق بنے اور اس شمع ضیا پاش سے اپنی اپنی بساط کے موافق روشنی حاصل کر کے اور منصب رشد و ہدایت پر فائز ہو کر ملک

کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ جن کا فیضان روحانی اب تک جاری و ساری ہے۔ بالآخر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی دلی تمنا اور پیش گوئی اسطرح پوری ہو کر رہی۔

ع۔ می دہد یزداں مراد متقین — ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

تصانیف

آپ کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں۔ ایک ہزار کے قریب ہیں۔ یہ تصانیف متحدہ ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پہنچیں اور متعدد کتابوں کے عربی انگریزی کے علاوہ ملک کی مختلف زبانوں میں تراجم ہوئے۔ ان تصانیف کے دینی و علمی موضوعات کو دیکھا جائے تو وقتی ضرورت کا کوئی موضوع بھی ایسا سامنے نہیں آتا۔ جس میں آپ کے قلم نے رہنمائی نہ کی ہو۔

حضرت اقدس اپنی تصانیف میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے کہ جس طبقہ کے لیے کتاب لکھی جارہی ہے انداز بیاں بھی اسی کے مناسب ہو۔ اس کا اندازہ عامی اور سہل کتابوں میں آپ کی مقبول عام اور بہنایت عظیم النفع تالیف بہشتی زیور اور دوسری طرف علمی تصانیف میں بیان القرآن کو دیکھکر ہو سکتا ہے۔

مواعظ

حضرت تھانوی کا جذبۂ تبلیغ ان کو متحدہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں لے گیا اور مختلف موضوعات پر بعض اوقات مسلسل ۵، ۵ گھنٹہ تک آپ کے وعظ ہوئے ہیں جو دین کے اجزائے خمسہ پر مشتمل اور آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ پر مبنی ہیں۔ تقریباً ۴۰۰ وعظ قلمبند ہو کر شائع بھی ہوگئے اور ان کی اشاعت اپنی مقبولیت و افادیت کے پیش نظر برابر جاری ہے۔

ملفوظات

مواعظ کے علاوہ حضرت حکیم الامت کے افادات و علوم کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ ان کے روزمرہ کے ملفوظات ہیں جو تقریباً ساٹھ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مجموعہ حضرت کی نظر سے گذار کر شائع کیا گیا ہے۔

یہ مواعظ و ملفوظات احکام اسلامی، رد بدعات، تعلیم اخلاق، درستگی اعمال، اصلاح معاشرت اور نصائح دلپذیر پر مشتمل ہیں۔ شریعت و طریقت، دنیا و آخرت اور ہر شعبۂ زندگی کے مسائل و معاملات میں جو دشواریاں اور اشکالات پیدا ہوتے ہیں ان کا آسان حل، مناسب و مفید تدابیر اور علاج انمیں موجود ہے

رشد و ہدایت اور احسان و سلوک

حضرت اقدس کے یہاں دین و دنیا کے تمام امور میں توازن اعتدال تھا۔ افراط و تفریط سے احتراز اور حفظ حدود کا خاص اہتمام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقی معنی میں حکیم الامت بنایا تھا۔ مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی فکر آپ کی حوائج طبعیہ میں داخل اور عمر کے بیشتر اوقات کا مشغلہ ہوگئی تھی۔ دین کے ہر رخنہ پر نظر اور اس کی اصلاح کی فکر، امت کی ہر ضرورت کا خیال اور اس کی صحیح و سہل تدبیریں حق تعالیٰ نے آپ پر القاء فرمادیں۔

اکثر اطباء علاج میں صرف مرض کا خیال کرتے ہیں مریض کا نہیں۔ شخصی حالات یا زمان و مکان کے اختلاف پر بہت کم نظر جاتی ہے۔ حضرت کے یہاں روحانی معالجہ میں دونوں باتوں کا پورا پورا لحاظ تھا۔ طالب کی قوت برداشت، اس کے مذاق اور دلچسپی کی بھی خاص رعایت رکھی جاتی تھی۔ سب کیلئے ایک ہی نسخہ نہیں بتایا جاتا تھا آپ اکثر شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا مقولہ نقل فرماتے تھے کہ شیخ ایسا ہونا چاہیے جیسے دین انبیاء کا سا ہو تدبیر اطباء کی اور سیاست بادشاہوں کی سی ہو۔

تربیت باطنی کا امتیاز

اصلاح و تربیت کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے اپنے مواعظ و ملفوظات اور عام مجالس میں عقائد و عبادات کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی صحت پر بے حد زور دیا ہے اور لوگوں کو شیخ کامل کی رہنمائی کی خود اپنی اصلاح کی طرف خصوصیت سے متوجہ کیا ہے۔

ان کے یہاں کسی سلسلہ کی روایات تھیں نہ رسوم، تعلیم و تربیت کے نہ وہ کورانہ تقلید کے انداز تھے نہ روائتی حلقے، توجہ نہ مراقبے، بس اہتمام تھا تو شریعت کے احکام کی بجا آوری کا اور دھن تھی تو ہر انداز زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے اتباع کی۔ فکر تھی تو نفس و شیطان کے مکائد سے بچنے کی۔ ان کے یہاں کیفیات، مکاشفات، مقامات اور کرامات پر اتنا زور نہیں تھا، جتنا کہ عقائد و عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست اور طریقت کی درستگی پر تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ

"بھائی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا چاہتا۔ آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں۔"

اور فرماتے

"میں تو کہا کرتا ہوں کہ نہ بزرگ بننا ہو، ولی بننا ہو، قطب بننا ہو تو کہیں اور جاؤ، اگر انسان بننا

ہو تو میرے پاس آؤ۔"

اسی سلسلہ میں فرماتے کہ انسان بننا فرض ہے۔ بزرگ بننا فرض نہیں اس لیے کہ انسان نہ بننے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ اور بزرگ نہ بننے سے اپنے ہی کو تکلیف ہوگی۔

مقصود بیعت

آپ چاروں سلسلوں (چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ) میں بیعت فرماتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی بیعت کو لازم و ضروری خیال نہ فرماتے بلکہ طالب کے ذہن میں اول ہی مرحلہ میں یہ بات ذہن نشین کرا دیتے کہ تزکیہ نفس اور ترقی باطن بیعت پر موقوف ہے نہ اوراد و وظائف پر، بلکہ اصل شے جس سے معرفت، تقویٰ، شرافت نفس حاصل ہوتی ہے اور تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے وہ صرف ظاہر و باطن کے اوامر و نواہی پر عمل اور اتباع سنت ہی پر منحصر ہے جو ہر شخص پر فرض و واجب ہے اور یہی حاصل تصوف و سلوک ہے۔ عام ذہنوں میں جو یہ بات جم گئی ہے کہ صرف زبانی معاہدہ کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک ہاتھ میں ہاتھ لے کر بیعت نہ کیا جائے حضرت فرماتے تھے کہ غلو فی العقیدہ ہے۔ اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ یہ ہاتھ میں ہاتھ دینا ظاہری بیعت ہے اصل بیعت تو کام کرنا ہے اور فرماتے کہ

> "میں تو عملاً یہ دکھا دینا چاہتا ہوں کہ نفع بیعت پر موقوف نہیں بلکہ تعلیم اور اس کی اتباع پر موقوف ہے اصل چیز یہی ہے۔ آپ سالکین کے لیے تمام کیفیات، انفعالات باطنی کو نظر انداز کر کے دو باتوں کی خاص طور پر تلقین فرماتے۔ ایک یہ کہ غایت طریق پر نظر رکھی جائے کہ وہ رضائے حق ہے۔ جس کا حصول محض ادائے حقوق واجبہ پر منحصر ہے۔ دوسرے معاملات و تعلقات میں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ یہی شرافت نفس اور صحیح احساس انسانیت کی علامت اور غایت سلوک ہے۔

آپ بہت اہتمام سے تاکید فرماتے تھے کہ حقوق العباد کا ادا کرنا اوراد و وظائف سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا۔ اور ترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں یہ تو مستحب ہے۔ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر غیر ضروری اختیار کرتے ہیں۔

اسی لیے حضرت کے یہاں سب سے زیادہ اہتمام تہذیب اخلاق و دیانت پر تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ

میری تعلیم و تربیت کا سارا مدار اس پر ہے میں طریق میں تہذیب اخلاق کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتا ہوں۔ چنانچہ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں اور جب تک اصلاح اعمال و اخلاق نہ ہو اس وقت تک ذکر و اذکار سے کوئی نفع نہیں ہوتا اس لیے کہ اخلاق و اعمال کی خرابی ایسا حجاب ہے جو ان کے اثرات و انوار کو روح میں سرایت کرنے سے روک دیتا ہے۔

شاہی سلوک

حضرت حکیم الامت نہ تو ریاضت و مجاہدات کراتے نہ ترک تعلقات نہ ترک لذات و مباحات بلکہ یہ تاکید فرماتے کہ خوب آرام و راحت سے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو اور طبیعت میں نشاط رہے جو معین عبادات ہو البتہ معصیت کے پاس بھی نہ پھٹکو، نفس کی نگرانی رکھو، ہمت سے کام لو اور بقدر تحمل و فرصت کچھ ذکر و شغل بھی کرتے رہو۔ پس انشاء اللہ مقصود کا حصول یقینی ہے۔ نہ کم کھانے کی ضرورت نہ کم سونے کی، یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں۔ کیونکہ طبائع میں آجکل ضعف غالب ہے۔ البتہ کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے مگر نہ اتنا کم کہ جس سے قلب میں انقباض پیدا ہو جائے اور فرماتے یہی شاہی سلوک ہے۔

ایک حکیمانہ اصول

تربیت باطنی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے افعال انسانی کی بنیادی تقسیم اختیاری اور غیر اختیاری کے درمیان فرما کر لاتعداد جزئی مسئلے طے کرا دیئے۔ اور خود اس سے اتنا کام لیا کہ ہزاروں مشکلات طریق اس کے ذریعہ سے حل فرما دیں۔ اور بے شمار الجھنوں سے بچا لیا۔ صدیوں سے اس کا ایسا عام مفہوم بیان نہ ہوا تھا۔

جب کوئی طالب اصلاح اپنے کسی رذیلہ کا علاج دریافت کرتا تو حضرت سب سے پہلے یہی سوال فرماتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ اگر وہ کہتا کہ اختیاری ہے تو فرماتے کہ جس فعل کا اختیاری ہے، اس کا ترک بھی اختیاری ہے۔ ہمت کر کے اختیار کو عمل میں لاؤ اور چھوڑ دو۔ اگر کہتا کہ غیر اختیاری ہے تو اگر وہ در اصل غیر اختیاری ہوا تو فرماتے کہ غیر اختیاری کا آدمی مکلف ہی نہیں۔ پھر اس میں دینی مضرت ہی کیا ہوا جو اس کا علاج پوچھا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جو کام اختیاری ہے اس کی تو انسان تکمیل کر سکتا ہے اور غیر اختیاری کی فکروں میں پڑ کر اصل مقصود سے دور جا پڑتا ہے۔ پھر اختیاری بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

چند بنیادی اصول

حضرتؒ کے ضابطۂ تعلیم و تربیت میں چند خاص بنیادی اصول تھے۔ جن کی فہم پیدا ہو جانے کے بعد طریق میں کوئی گنجلک، پیچیدگی یا ابہام باقی نہ رہتا تھا۔ مثلاً مطالبات دین کو مفاد دنیا پر غالب رکھنا، اختیاری امور میں کوتاہی نہ کرنا اور غیر اختیاری کے درپے نہ ہونا، سالک کو تجویز ترک کرنا اور تفویض کو اختیار کرنا، مقصود شرعیہ کو پیش نظر رکھنا اور غیر مقصود کی طرف التفات نہ کرنا، کیفیات باطنی کو محمود سمجھنا اور مقصود نہ سمجھنا، طبعی امور سے مغلوب نہ ہونا بلکہ عقل کے فتوٰی پر عمل کرنا اور ہمیشہ عقل کو شریعت کا تابع رکھنا

شریعت و طریقت کا تلازم

حضرت حکیم الامت کی ذات شریعت و طریقت کا حسین امتزاج تھی۔ کوئی صرف عالم ہوتا ہے اور طریقت سے ناواقف، کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور علوم شرعیہ سے ناآشنا۔ مگر آپ ایک ہی وقت میں صوفی بھی تھے، عالم بے بدل بھی، رومی عصر بھی تھے۔ رازی وقت بھی۔ آپ نے جس طرح شریعت ظاہرہ کو جہالت و ضلالت کی تاریکیوں سے نکالنے کا کام انجام دیا اسی طرح طریقت باطنہ کو افراط و تفریط کی بھول بھلیوں سے نجات دلائی۔ طریقت کو جو ایک زمانہ سے محض چند رسوم کا مجموعہ ہو کر رہ گئی تھی اور جس کی اصل حقیقت مستور ہو چکی تھی حشو و زوائد سے صاف کر کے قدما اور سلف صالحین کے رنگ پہ لا کھڑا کیا۔ جاہل پیروں اور دکاندار صوفیوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں اور من گھڑت عقیدوں کی اصلاح فرمائی جو شریعت اور طریقت کو دو چیزیں سمجھتے اور سمجھاتے رہے۔ آپ نے تمام عمر یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے۔ احکام الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل کا ہی نام طریقت ہے باقی سب ہیچ ہے۔ تصوف کے بغیر دین و ایمان کامل ہی نہیں ہوتا۔ یہی خاص امت کا مذہب ہے۔ آپ نے ایک مستقل کتاب مسائل السلوک من کلام الملوک، اور دوسری التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف تصنیف فرما کر تصوف کے احکام اس کی اصلی اور صحیح تعلیمات کو کتاب و سنت سے جمع کر کے پیش کرنے کا اہتمام بلیغ فرمایا اور زبان و قلم سے اس فن کے مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اس کے بعد طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا خود فرماتے ہیں کہ

> اب بحمد اللہ طریق بے غبار ہے صدیوں تک تجدید کی ضرورت نہیں جب ہوگی حق تعالےٰ
> اور کسی کو پیدا فرما دیں گے۔ یہ ان کی رحمت ہے جس سے چاہیں اپنا کام لے لیں۔ کسی خاص
> شخص پر موقوف نہیں۔

فیضان تربیت

اس ہمہ گیر تربیت اور مصلحانہ تعلیم و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں دینی شعور اور اسلامی شعائر کی طرف رجحان پیدا ہونے لگا۔ اور تصنیف و تالیف، مواعظ و ملفوظات کی بدولت ہزاروں مسلمانوں کی زندگی میں دینی انقلاب واقع ہوا، اور وہ محض نام کے بجائے کام کے مسلمان بن گئے۔ ان کے ایمان میں پختگی، عقائد میں درستگی، عبادات میں خلوص، معاملات میں صفائی اور معاشرت و اخلاق میں اسلام کی جھلک پیدا ہوئی۔ جس سے ان کی دنیا و آخرت دونوں سدھر گئیں۔

عوام و خواص کا جتنا بڑا طبقہ حضرت حکیم الامت کے فیض سے مستفیض ہوا، اس کی مثال اس دور میں کم ہی ملے گی۔ اس دائرہ کی رفعت و بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے بڑے صاحب علم و فضل اور اہل کمال ان کے دامن عقیدت سے وابستہ تھے۔ منتسبین یوں تو ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ برصغیر اور اس کے باہر بھی ہزاروں اشخاص نے ان سے اصلاح و تربیت حاصل کی۔ لیکن علم و عمل کے ایسے مجسم خزانے جنہوں نے بعد میں بھی اس چشمہ فیض کو جاری رکھا ان کی تعداد بھی سوا سو سے زائد ہے۔ اس حلقہ فیض کے جرعہ نوش زندگی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے، ان میں علماء اور صوفیاء بھی تھے، تاجر و سوداگر اور زمیندار بھی، امراء اور نواب بھی تھے۔ غریب اور مفلس و قلاش بھی، حضرتؒ اپنی مجلس میں علوم و معارف اور حقائق کے دریا بہاتے۔ اہل ذوق حضرات کی باتیں سنتے اور لکھتے، عارفین جھومتے اور اہل دل وجد کرتے، تعلق مع اللہ کا وجدان حاصل کرتے، بڑے بڑے علماء، وکلاء اور فلسفی حضرت کے سامنے گردن جھکا کر بیٹھ جاتے۔ اکثر و بیشتر انگریزی تعلیم یافتہ اور سرکاری محکموں کے بڑے بڑے عہدیدار بھی کثرت سے حضرت کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور بعض تو حلقہ بگوش عقیدت ہو گئے۔ اور بعض کی باطنی تعلیم و تربیت سے دینی حالت میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ حضرت نے ان کو اپنے خلفائے مجازین صحبت میں شامل فرما لیا۔ مگر ان لوگوں میں سے حضرت تھانوی نے نہ کسی کی دولت ختم کرائی، نہ کسی کو گوشہ نشین بنایا، نہ کسی کے بیوی بچے چھڑائے نہ اعزاء و اقارب کے چھوڑنے کو کہا بلکہ ہر ایک کو اپنی حیثیت پر قائم رکھتے ہوئے ولی اور مصلح بنایا۔

اس طرح حضرت حکیم الامت نے اس دور حاضر میں ایک ایسی زندہ مثال قائم فرما دی کہ مسلمان خواہ کسی مشغلہ زندگی سے وابستہ ہو، اگر چاہے تو پکا دیندار بن سکتا ہے۔ یہ حضرت کی ایسی کرامت اور کارنامہ تبلیغ دین ہے جو ہر اعتبار سے انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔ خود ایک موقع پر اپنی خانقاہ کے تربیت یافتہ لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

دیکھو! سرکاری ملازمین میں میرے تربیت یافتہ لوگ ملیں گے۔ علماء و صوفیاء اور مدرسین میں میرے مجازین ملیں گے۔ اطباء و ڈاکٹروں میں، تاجروں میں وکیلوں میں، انجینئروں میں میرے اجازت یافتہ ملیں گے۔ فقیروں اور نوابوں میں میرے مسلک کے لوگ ملیں گے۔ تمہارے لیے اس دور سے زیادہ فتنہ والا دور اور کیا ہوگا۔ بس دیکھو! دین کے بارے میں ان کی مثالیں سامنے رکھنا ان کا دامن پکڑے رکھنا دیکھو! دین کتنا آسان ہے۔ یہ سب تمہارے سامنے ہیں سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز ان کے لیے دین سے مانع نہیں، حارج نہیں۔ دیندار رہتے ہوئے بھی سب اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ تحصیل معاش میں مصروف ہیں۔ کوئی دشواری نہیں کوئی مشکل نہیں۔ اب تمہارے پاس کوئی عذر نہ ہونا چاہیے۔ تم کو صاف محسوس ہوگا کہ دین کس قدر آسان اور ہر شعبۂ زندگی میں قابل عمل ہے۔ (مآثر حکیم الامت ص۱۳۶)

مجلس صیانۃ المسلمین

وراثت نبوت یا جذبۂ مجددیت سے جو شفقت علی الخلق و اصلاح مسلمین کی فکر حضرت حکیم الامت پر ہمہ وقت طاری تھی اس نے آپ کا سونا، جاگنا، رفتار، گفتار، آرام و راحت سب کا سب اسی شغل کی نذر کر دیا تھا حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی یا کسی پریشانی کی خبر آتی وہ غم میں اس طرح گھلنے لگتے تھے جیسے کسی شفیق باپ کی صلبی اولاد پر کوئی مصیبت آئی ہو۔

اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور پُر فتن میں ایسے جذبہ رکھنے والے کو چین و آرام کہاں؟ خود احقر نے بارہا دیکھا کہ جب کوئی فتنہ مسلمانوں میں چلا جس سے ان کی دینی یا دنیوی تباہی کا خطرہ تھا تو حضرت کا نظام صحت مختل اور قویٰ میں ضعف و اضمحلال نظر آنے لگتا تھا۔ ایک ایسے ہی فتنہ کے زمانے میں خود فرمایا کہ

مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اس کے نتائج کا تصور اگر کھانے سے پہلے آجاتا ہے تو بھوک اڑ جاتی ہے اور سونے سے پہلے آجاتا ہے تو نیند اڑ جاتی ہے۔ الخ

اسی فکر کے مدنظر ۳۰ جمادی الاول ۱۳۴۶ھ کو نماز صبح کے وقت آپ کے قلب پر وارد ہوا کہ بعض اعمال خاصہ ہیں کہ جن کا التزام کرنے سے مسلمانوں کے مصائب دور ہو سکتے ہیں، چنانچہ آپ نے اس سلسلہ میں ۲۵ اصول حیات حیٰوۃ المسلمین کے نام سے مرتب فرمائے جو فہرست ہے۔ ان اعمال کی جن پر عمل پیرا ہونے

سے دین و دنیا کی فلاح یقینی ہے۔ اور ان مصائب کا جو اس وقت مسلمانوں پر آ رہے ہیں مکمل علاج موجود ہے حضرت تھانوی اپنی تمام تصانیف پر حیوٰۃ المسلمین کو ترجیح دیتے تھے اور اس کو اپنے لیے سرمایۂ نجات سمجھتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

میرا غالب گمان ہے اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور تمام عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔

ان اصولِ حیات کی وسیع پیمانہ پر عملی ترویج اور مسلمانوں کی زندگی میں ان کے مکمل نفاذ کی منظم طریقہ پر جدوجہد کے لیے ۲۱ دفعات پر مشتمل ایک نظامِ عمل "صیانۃ المسلمین" کے نام سے ۱۳۱۵ھ میں جاری فرمایا اور امت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو دین کی حفاظت، ذاتی، اجتماعی اصلاح اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی تدابیر مرتب فرمائیں۔

حیوٰۃ المسلمین شخصی اصلاح کے لیے تحریر فرمائی گئی۔ اور "صیانۃ المسلمین" میں جمہوری نظام پیش کیا گیا ہے۔ یہ چشمۂ فیض آج بھی علمائے ہند و پاک کی سرپرستی میں لاہور سے پشاور تک جاری و ساری ہے اور اس کے مفید نتائج بھی سامنے آ رہے ہیں۔ اگر سب مل کر اجتماعی طور پر اس کو اختیار کر لیں تو معاشرے کی تمام خرابیاں بہت جلد دور ہو جائیں۔ اور مسلمان موجودہ پستی اور تنزل سے نجات حاصل کر کے ترقی حاصل کر سکتے ہیں ما حصلہ کہ اس میں انتظام ہے ان کے دین و دنیا کا جو انشاء اللہ قیامت تک آنے والی نسلوں کیلئے پیامِ عمل ہے

بزرگانِ دین سے عقیدت و محبت

حضرت حکیم الامت کو حضرات بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے خاص عقیدت و محبت تھی۔ آپ اپنے زمانے کے تمام بزرگانِ دین سے ملے ہیں اور ہر ایک سے دعا و توجہ اور لطف و عنایت کے ذریعہ استفادہ کیا ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ

"بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور قلب میں نور پیدا ہوتا ہے۔"

بزرگانِ دین کے ذکرِ خیر کو اس درجہ نافع اور مفید سمجھتے تھے کہ "نزہت البساتین" کے نام سے بزرگوں کی ایک ہزار حکایات کا مجموعہ شائع کرایا۔ اس کے علاوہ "قصص الاکابر" اور "ارواحِ ثلٰثہ" وغیرہ آپ کی ایما سے مرتب ہو کر شائع ہوئیں۔ آپ نہایت وثوق سے فرماتے تھے کہ

"بزرگانِ دین اور اولیائے کرام رسولِ خدا کے عاشق ہیں۔ اس لیے ممکن نہیں کہ ان کے حالات

پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الٰہی پیدا نہ ہو۔"

آپ کو اپنے شیخ کے ساتھ ایسا شغف تھا کہ ساری عمر اپنے تمام کمالات کو حضرت حاجی صاحب کی طرف منسوب فرماتے رہے۔ اسی طرح اپنے سارے ہی کاموں کو شیخ کے نام سے موسوم فرمایا، مثلاً خانقاہ کا نام "امداد القلوب" اور مدرسہ کا "امداد العلوم" رکھا۔ اپنے فتاویٰ کا نام امداد الفتاویٰ تجویز فرمایا۔

زندہ کتابیں

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نظر کتابوں پر زیادہ نہیں رہتی تھی۔ علوم و معارف کے چشمے تو بس اندر ہی سے ابلتے رہتے تھے۔ ایک صاحب نے آپ سے دریافت کیا کہ حضرت آپ نے اس قدر کتابیں تحریر فرمائی ہیں تو ہزاروں کتابیں دیکھی ہوں گی؟ حضرت حکیم الامت نے فرمایا۔ "ہاں چند کتابیں دیکھی ہیں، جن کے نام یہ ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔ ان کتابوں نے مجھے دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے زیادہ کتب بینی کا ذوق نہیں ہوا کیونکہ نفس علم کو مقصود نہیں سمجھا عمل کیلئے جتنے علم کی ضرورت ہے اس میں اپنے بزرگوں پر مکمل اعتماد و اعتقاد تھا۔ جو کچھ قرآن و سنت کی تعبیر میں انہوں نے فرمایا تھا اس پر دل سے مطمئن تھا۔

(مجالس حکیم الامت صہ ۱۰۳)

مولانا دریا آبادی فرماتے ہیں کہ وہاں تو

ع صد کتاب و صد ورق در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

کا گلزار کھلا رہتا تھا اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے۔ اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں لیکن نظر کی اس وسعت نے نظر کے عمق کو غارت کر دیا ہے۔ لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں لیکن گہری نہیں ہوتیں۔ صرف سطح پر رہتی ہیں۔ اپنے مضامین، مقالات میں حوالے تو خوب دے دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پہ یوں لکھا ہے۔ لیکن فہم مسائل کی استعداد نہیں بڑھتی۔ سمندر سے موتی وہی نکال کر لا سکتے ہیں جو گہری غواصی کر سکتے ہوں۔ محض سطح سمندر پہ دور دور تک پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگلے علماء مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہم کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا۔ لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کئے۔

(حکیم الامت نقوش و تاثرات صہ ۳۰)

بارہا حضرت اقدس نے خود اپنے متعلق فرمایا کہ

”نہ کبھی طالب علمی میں میں نے محنت کی نہ اس طریق (تصوف) میں کبھی مجاہدات و ریاضات کئے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے سب اپنے حضرات اساتذہ و مشائخ کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

”بحمد اللہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی بزرگ کو ایک منٹ کے لیے بھی مکدر نہیں کیا۔“

استغناء اور توکل

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور کمالات باطنی کے ساتھ استغناء اور توکل کی نہایت ممتاز اور یگانہ روزگار دولت عطا فرمائی تھی۔ اور فیاضی کے جوہر سے بھی نوازا تھا۔ کانپور میں حضرت کا مشاہرہ ۲۵ روپے ماہوار مقرر ہوا تھا جو اگرچہ اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ کم بھی نہ تھا لیکن حضرت کے کمالات اور والد صاحب کے تمول کے پیش نظر کچھ بھی نہ تھا مگر حضرت تھانوی نے اس کو بھی بہت سمجھا کیونکہ فرماتے تھے کہ

”جب کبھی طالب علمی میں تدریس کے متعلق سوچتا تھا تو دس روپے سے زیادہ تنخواہ پر نظر نہ جاتی تھی نہ دس سے زیادہ کا خود کو مستحق سمجھتا تھا۔“

کانپور سے ترک ملازمت کے بعد جب خانقاہ امدادیہ میں متوکلانہ قیام فرمایا تو اس وقت ضروریات خانگی کیلئے ڈیڑھ سو روپیہ قرض ہو گیا۔ آپ نے حضرت مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں دعا کی درخواست پیش کی اور ایک عریضہ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں بھیجا۔ حضرت حاجی صاحب نے تحریر فرمایا کہ آپ کی استقامت اور توکل میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی فیض کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔

اور حضرت مولانا گنگوہیؒ نے دریافت فرمایا کہ مدرسہ دیوبند میں ایک جگہ ملازمت کی خالی ہے اگر رائے ہو تو میں ان کو لکھ دوں؟ حضرت گنگوہی کے اس سوال سے حضرت حکیم الامت کشمکش میں پڑ گئے کہ ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں حاجی صاحب کے ارشاد کی مخالفت لازم آتی ہے اور نہیں کرتا تو حضرت گنگوہی کے اس ارشاد کے باوجود قبول نہ کرنا ایک گونہ بے ادبی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صحیح جواب دل میں ڈال دیا۔ فرمایا میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصد صرف دعا ہے۔ کسی ملازمت یا ذریعہ معاش کی طلب مقصود نہیں کیونکہ حضرت حاجی صاحب نے ممانعت فرمائی ہے کہ کانپور سے تعلق چھوڑ دو تو پھر کوئی دوسری ملازمت اختیار نہ کرنا لیکن اگر حضرت کی یہی تجویز ہے

تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب کی تجویز سمجھوں گا۔ اور پہلی تجویز کا ناسخ قرار دے کر ملازمت اختیار کر لوں گا۔ اس پر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا نہیں، نہیں میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ دعا کروں گا ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ چنانچہ ہر دو اکابر کی دعاؤں کی برکت سے بہت جلد قرضہ سے سبکدوشی ہوگئی (اشرف السوانح)

برادر خورد منشی اکبر علی صاحب کا واقعہ خود حضرت حکیم الامت نے اپنی مجلس میں بیان فرمایا کہ:

ایک دفعہ بھائی نے چاہا کہ میں کچھ ماہوار تمہارے لیے مقرر کر دوں سمجھدار آدمی ہیں بے تکلف لکھ دیا میں نے لکھا کہ اس میں خرابی ہے۔ اب تو میری نظر کسی خاص شخص پر نہیں اللہ پر ہے اور اگر مخلوق پر بھی ہے تو کسی مخلوق معین پر تو نہیں ہے اگر تم نے ماہوار مقرر کر دیا تو بس یہی ہیں دل پڑا رہے گا۔ اول تو حساب لگانا پڑے گا کہ ماہ ختم ہو گیا یا نہیں سی ختم ہوئی یا نہیں۔ جب پہلی تاریخ ہوگی تو یہ خیال ہوگا کہ آج تنخواہ وصول ہوئی ہوگی۔ آج روپیہ چلا ہوگا۔ آج راستہ میں ہوگا، آج آنا ہوگا نہ آیا تو لیجئے پریشانی کہ معلوم کیا وجہ ہوگی۔ من حیث لا یحتسب کی شان تو نہ رہے گی کہ جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا وہاں سے حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ دوسرے میں نے یہ لکھا کہ برا ماننے کی بات نہیں گو تمہاری تنخواہ ساڑھے چار سو روپیہ ہے لیکن ضرورتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ بعض دفعہ بچوں کا خرچ بڑھ جائے گا۔ اس وقت تم کو گرانی ہوگی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ہر وقت جوش محبت کا نہیں رہتا وہ بڑے سمجھدار آدمی ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ مجھے تعجب ہے کہ ایسی موٹی بات کی طرف لکھتے وقت مجھ کو توجہ نہیں ہوئی۔ آپ کا خط دیکھ کر آنکھیں کھلیں اس کا ہر ہر حرف آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

(حسن العزیز جلد ۱ سیرت اشرف جلد دوم ص ۱۰۹)۔

جائیداد چھوڑ دی

حضرت کے والد ماجد نے جائیداد خاصی چھوڑی تھی۔ اگرچہ ان کے ذرائع آمدنی بھی کوئی ناجائز نہ تھے۔ مگر حضرت کی نظر میں کچھ مشتبہ تھے۔ اس لیے حضرت گنگوہیؒ کو خط لکھ کر سوال کیا کہ وہ حصہ لینے میں مال مشتبہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے اور چھوڑتے ہیں اس لیے تردد ہے کہ کہیں بعد میں پریشانی نہ ہو۔ جواب آیا۔

”اگر یہ حصہ لے لو تو رخصت ہے نہ رکھو۔ جب بھی حق تعالیٰ ذری سے تم کو پریشان نہ کرے گا۔

(سیرت اشرف، جلد اول ص ۱۶۴)

حضرت تھانوی نے تقویٰ کا پہلو اختیار فرمایا اور اپنا حصہ میراث جو بڑا سرمایہ تھا بھائیوں کی طرف منتقل فرما دیا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ احقر نے اپنے والد سے سنا کہ حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اشرف علی

کا ادنیٰ تقویٰ یہ ہے کہ والد کی میراث کا حصہ نہیں لیا۔

(مجالس حکیم الامت ص۳۰۳)

تصانیف کی حق ملکیت

کتابیں ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئیں کوئی دوسرا ہوتا تو لکھ پتی ہو جاتا۔ حضرت کی سیر چشمی و فیاضی خلوص اور للّٰہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرانے کا اذن عام تھا۔

ہدیہ کا اصول

آپ کے حلقہ ارادت میں اچھے خاصے رئیس اور اہل ثروت موجود تھے لیکن ہدیہ بس خصوصی مخلصوں سے ہی قبول فرماتے۔ اور ان کے لیے بھی حدود مقرر تھے۔ کسی کا ہدیہ چاہے جتنا بڑا ہوتا اگر ذرا ایہام و ابہام یا اور کوئی بات اپنے معمول و اصول کے خلاف ہوتی تو بلا ادنیٰ تامل کے منی آرڈر کے فارم پر وجہ لکھ کر واپس فرما دیتے۔ اگر کوئی زیادہ کثیر رقم یا کوئی بیش قیمت ہدیہ استعمالی اشیاء کا پیش کرتا تو نہایت متواضعانہ انداز سے معذرت فرما لیتے۔

مصارف کا تعین

اپنے فتوحات مالیہ میں سے آپ چوتھائی حصہ علاوہ زکوٰۃ کے صدقات نافلہ میں صرف فرماتے رہے۔ حاجتمندوں کی ضروریات پر جہاں تک علم ہو سکتا نظر رکھتے تھے اور حسب موقع و گنجائش اعانت فرماتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ صدقات مالیہ جاریہ بھی حضرت اقدسؒ نے بہت کئے چنانچہ بعض کمپنیوں میں حصص خرید کر وقف فرما دیئے اور ایک قطعہ زمین بعض باغات، مکان وغیرہ اپنی حیات ہی میں وقف کر دیئے تھے۔ اپنا ایک بڑا کتب خانہ جس میں زیادہ تر خود اپنی ہی تصانیف تھیں سہارنپور کے مدرسہ مظاہر علوم میں وقف فرما دیا اسی طرح بعض اور متفرق کتابیں دیوبند، سہارنپور اور دیگر مدارس میں موقع بموقع بھیجتے رہے اور ترکہ کا چوتھائی حصہ، کارہائے خیر میں صرف کئے جانے کی وصیت فرما گئے۔

چندہ کے متعلق اصول

آپ کا استغناء نہ صرف اپنی ذات تک محدود تھا بلکہ آپ مستغنی گر تھے کہ تمام اہل علم اور دینداروں کو مستغنی دیکھنا چاہتے تھے مستغنی بنانا چاہتے تھے۔ آپ علماء و مدرسین کے لیے چندہ مانگنے کے کام کو بہت ناپسند فرماتے کہ اس غرض اور دباؤ کی بدولت وہ آزادی اور استغناء کے ساتھ احکام کی تبلیغ نہ کر سکیں گے۔ اسی لیے آپ مدرسہ وغیرہ کسی

دینی کام میں چندہ تک کے لیے شخصی تخاطب کے روادار نہ تھے۔ بس زیادہ سے زیادہ عمومی اعلان و اطلاع کو جائز رکھتے تھے۔ وعظوں میں بھی چندہ کی تحریک سے ابتدا ہی سے احتراز کیا۔ خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم کا مدار بھی توکل ہی پر رکھا۔ کسی رئیس نے ایک رقم مدرسہ کے لیے بھیجی ساتھ ہی تشریف آوری کی درخواست بھی کر دی حضرت نے رقم واپس فرما دی اور لکھا کہ دونوں باتوں کے اقتران سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لیے یہ رقم بھیجی گئی ہے۔

ایک صاحب نے مدرسہ کے لیے غالباً دو سو روپے بھیجے وصول فرما لیے دوسرے سال پھر رقم بھیجی اور لکھا کہ معمول کے موافق روپیہ بھیجتا ہوں لیکن سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی رسید نہ آئی تو آئندہ بند کر دوں گا۔ منی آرڈر وصول نہیں فرمایا اور تحریر فرمایا کہ تم آئندہ سال بند کرو گے ہم اسی سال سے بند کرتے ہیں آپ فرماتے تھے کہ

میرے یہاں تو اتنا بچاؤ ہے سوال سے کہ مدرسہ کے بارے میں بھی سوال کی صورت اختیار نہیں کی جاتی بلکہ میں تو کہہ دیتا ہوں کہ یہ مدرسہ نہیں ہے اس کو خانقاہ کہتے ہیں۔ کیونکہ مدرسہ آج کل اسے کہتے ہیں جس کا باقاعدہ انتظام ہو چندہ کی تحریک کی جاتی اور باقاعدہ رسید دی جاتی ہو اور یہاں ان باتوں میں سے ایک بھی نہیں۔ اس لیے اس کو مدرسہ کہنا ہی ٹھیک نہیں ——— یہاں تو یہ ہے جس کا جی چاہے دو اور جس کا جی نہ چاہے مت دو۔ رسید کا اہتمام تو جب کریں جب ہم خود مانگتے ہوں۔ ہم جب مانگتے نہیں تو کیوں جھگڑا کریں، بعض لوگوں نے کہا اس طرح تم نے چلا لیا مگر کسی اور سے نہ چل سکے گا میں کہتا ہوں ہر وہ شخص چلائے گا جو خلوص سے اللہ کے بھروسہ پر کام کرے گا۔ اور اگر نہ بھی چلے چھوڑ دے۔ میں نے بھی یہی فیصلہ کر لیا تھا کہ جتنا کام اپنی ذات سے ہو سکے گا وہ کروں گا اور اس سے زیادہ اگر حق تعالیٰ چاہیں گے کسی ذریعہ سے کرا دیں گے ورنہ اس کے عدم ہی میں مصلحت سمجھوں گا۔

ایک مہتمم صاحب کا خط آیا لکھا کہ خرچ بڑھا ہوا ہے اور آمدنی (کافی) نہیں سخت پریشانی ہے۔ فرمایا میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس کی وحی تو نہیں ہوئی کہ فلاں خاص پیمانہ پر مدرسہ ہو تو مدرسہ کہلائے گا ورنہ نہیں ارے بھائی کام کم کر دو خرچ خود کم ہو جائے گا اور اگر بالکل آمدنی نہ ہو تو مدرسہ بند کر دو کوئی فرض نہیں واجب نہیں ظاہر ہے کہ آمدنی کا ہونا اختیاری نہیں مگر خرچ کم کر دینا اختیاری ہے۔

سیاسی تحریکات میں عدم شرکت

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف، تعلیم و تربیت اور اصلاح امت و ہدایت خلق کی طرف تھا۔ اس لیے عملی طور پر سیاسی و ملکی تحریکوں میں براہ راست حصہ لینے کی نوبت نہ آئی اور نہ آپ کبھی کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی اس کے بارے میں ایک ماہر شریعت عالم دین ہونے کی حیثیت سے اس کی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظر بصیرت ڈال کر نتائج و عواقب واضح کرنے اور ملت کی علمی و روحانی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ فرمایا آپ کو کسی تعلیم گاہ کے طلبہ و مدرسین کا ملک کی عملی سیاست میں حصہ لینا اصولاً پسند نہ تھا کہ اس سے تعلیم میں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جب دارالعلوم دیوبند کے طلباء اور اساتذہ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تو آپ نے دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ چنانچہ فرماتے تھے کہ۔

علماء کو تو اپنے لکھنے پڑھنے کی طرف مشغول ہونا چاہیئے۔ دیکھیے جس قدر متمدن قومیں اور سیاسی قومیں ہیں ان میں بھی تقسیم عمل ہوتی اگر سب ایک ہی طرف اور ایک ہی کام میں لگ جائیں تو ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

افاضات الیومیہ جلد نمبر ۳ صـ ۲۱۰

مدرسہ دیوبند کو سیاست سے بالکل الگ رہنا چاہیئے اور یہی ہمارے اکابر کا طریق تھا کہ تعلیم کے زمانہ میں کسی دوسری طرف توجہ کو سخت مضر خیال فرماتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ معلّمین کے طرز عمل کا طلبہ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے لہذا مدرسہ کے مدرسین کو بالخصوص طلبہ کی مصلحت سے سیاست سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور مدرسین کے دوسری طرف متوجہ ہونے سے تعلیم کا حرج بھی مشاہد ہے۔ ایک ایسی جماعت کی بھی سخت ضرورت ہے جو محض علم دین کی خدمت کرے۔

خاتمۃ السوانح صـ ۵۵ مطبوعہ لاہور

میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلبہ کو سیاست میں مبتلا نہ کیا جائے طلبہ اگر ان قصوں میں پڑ گئے تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے اور تربیت بھی ان کی نہ ہو گی چنانچہ جب سے طلبہ کو اس سلسلہ میں ڈالا گیا ہے ان

میں آزادی پیدا ہو گئی ہے

خاتمۃ السوانح صـ۵ مطبوعہ لاہور

طالب علمی کے زمانہ میں کسی اور چیز کی طرف توجہ ہونا تعلیم کو برباد کرنا ہے طالب علم کے لیے یکسوئی اور جمعیت قلب ضروری ہے اس کے برباد ہونے سے تعلیم برباد ہو جاتی ہے میں نے زمانہ طالب علمی میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی تھی تو اس پر حضرت نے فرمایا تھا کہ جب تک کتابیں ختم نہ ہو جائیں اس خیال کو شیطانی خیال سمجھنا۔ واقعی یہ حضرات بڑے حکیم ہیں۔ کیسی عجیب بات فرمائی ایک وقت میں قلب دو طرف متوجہ نہیں ہوتا بس ضروری کو غیر ضروری پر ترجیح دینا چاہیئے۔

افاضات الیومیہ جلد ۳ صـ۳۴

اہتمام انضباط اوقات

حضرت حکیم الامتؒ نہایت منتظم المزاج اور اصول و ضوابط کے پابند تھے وقت کے لمحات ضائع نہیں ہونے پاتے تھے۔ کھانے پینے، سونے جاگنے اور اُٹھنے بیٹھنے کے تمام اوقات مقرر تھے جن پر سختی سے عمل فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے وقت میں برکت بھی بڑی عطاء فرمائی تھی۔ خود فرماتے ہیں کہ

مجھے انضباط اوقات کا بچپن ہی سے بہت اہتمام ہے جو اس وقت سے لے کر اب تک بدستور موجود ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قدر دینی کام مجھ سے لے لیا۔ میں ایک لمحہ بھی بے کار رہنا برداشت نہیں کرتا۔ میرے استاد حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ایک بار تھانہ بھون تشریف لائے میں نے ان کے قیام اور راحت رسانی کے تمام ضروری انتظامات کیئے جب تصنیف کا وقت آیا تو باادب عرض کیا کہ حضرت میں اس وقت کچھ لکھا کرتا ہوں اگر حضرت اجازت دیں تو کچھ دیر لکھ کر پھر حاضر ہو جاؤں۔ گو میرا دل اس روز کچھ لکھنے میں لگا نہیں لیکن ناغہ نہیں ہونے دیا کہ بے برکتی نہ ہو تھوڑا سا لکھ کر جلد ہی حاضر خدمت ہو گیا۔ حضرت کو تعجب ہوا کہ اس قدر جلد آ گئے عرض کیا حضرت چند سطریں لکھ لیں معمول پورا ہو گیا۔

مولانا محمد تقی عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ

حضرت تھانوی کی سوانح میں ان کے تنظیم کار کا باب ایک ایسا باب ہے جو نہایت سبق آموز

ہے۔ حضرت مجدد الملت ؒ کے صرف علمی و عملی کارناموں کو پڑھنے والا بسا اوقات یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ ایک ایسی شخصیت جس کو شب و روز اس درجہ کی مصروفیات لاحق ہوں وہ صرف انہی مشغولیات کا ہو کر رہ گیا ہوگا نہ اس کو گھر والوں کے پاس بیٹھ کر ان کے احوال سننے کا موقع ملتا ہوگا نہ وہ کسی سے خوش طبعی کے ساتھ گفتگو کے قابل ہوگا لیکن آپ کے معمولات دیکھنے سے آپ کی اس کرامت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام مصروفیات کے باوجود آپ نہ صرف عام امت کے لیے اتنا عظیم الشان تبلیغی کام کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ گھر والوں کے حقوق کی ادائیگی کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے اور حقوق کی ادائیگی کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ان کے نفقہ کا انتظام کر دیں بلکہ ان کے پاس بیٹھتے ان کے احوال سنتے اور اپنے کہتے۔

مقدمہ امداد الفتاویٰ جلد اول

مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ فرماتے ہیں

کیسی الٹی سمجھ والوں نے حضرت ؒ کو خشک مشہور کر دیا ——— بے شک مزاج میں حرارت و حدت تھی (جس طرح آپ کو نسبی نسبت فاروق اعظم سے تھی) لیکن آپ اس کا استعمال موقع اصلاح پر تادیب کے لیے ہی کرتے تھے۔ میں نے آپ کو صحت و مرض، قوت و ضعف، حزن و نشاط کے ہر موقع پر دیکھا ہے اس لیے میں آنکھوں دیکھی شہادت دے رہا ہوں کہ نظم و انتظام کے تو آپ بادشاہ ہی تھے، افراط و تفریط اکثر بزرگوں اور اولیائے امت میں ہوا کرتی ہے کوئی کسی خصلت میں بہت زیادہ بڑھا ہوا اور کوئی کسی خصلت میں توازن و اعتدال حضرات انبیاء کا خاصہ ہوتا ہے اسی سیرت انبیائی کی جھلک آپ میں دیکھنے میں آئی۔ ہر کام اپنے وقت پر ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر کھانے پینے، چلنے، اٹھنے، بیٹھنے سب کے ضابطے سب کے آداب ہر گفتگو ایک مقصد لیے ہوئے بے مقصد گفتگو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ زبان پر اتنا قابو میں نے کسی بزرگ کا نہ پایا اوراد و وظائف پر جو زور دوسرے آستانوں پر رہتا ہے اس کا یہاں کام ہی نہ تھا رسوم سے اجتناب، نمائشی تکلفات سے احتراز، بس اپنے کام سے کام، دوسروں کو زحمت سے بچانے کا کامل اہتمام بندوں کی خدمت عبادت کے درجہ میں بس یہی خصوصیات مجلس اشرفی کے دیکھنے میں آئے۔

بزرگ میں نے اپنی عمر میں بہت دیکھ ڈالے اور تذکرے بہتوں کے اس تفصیل و استناد سے کہ گویا انہیں بھی دیکھ لیا عابد و زاہد بھی چلہ کش و مرتاض بھی، صاحب کشف و کرامات بھی، انمیں یقیناً بہت سے اچھے لوگ بھی ہوں گے اللہ کے برگزیدہ جنتی اور مغفور لیکن مصلح۔ مربی اصلاح کرنے والا اور تربیت

سے لگانے والا) حضرت تھانویؒ کا مثیل و نظیر کوئی نظر سے نہیں گزرا اور نہ سننے میں آیا۔

معاصرین ص ۱۵ ، ص ۱۶

مخالفت میں رعایت حدود

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا دل دشمن سے بھی انتقام لینے کا روادار نہ تھا۔ آپ چھوٹے بڑے ہر معاملہ میں رویہ صلح و آشتی ہی کا رکھتے تھے اور اس میں پیش قدمی بھی خود ہی کرتے رہتے۔ مخالفت ذاتی و خانگی معاملات میں گویا کسی سے تھی ہی نہیں۔

سیاسی و مذہبی اختلافات میں لوگ علی العموم حد سے آگے نکل گئے اور سب و شتم میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی خود آپ پر اور آپ کے بزرگوں پر کفر کے فتوے لگائے لیکن ان کے متعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کبھی کوئی حرف ناشائستہ زبان سے نہیں نکالا اور نہ ان کے الزامات کی تردید کے لیے کوئی اقدام کیا، مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ آپ فرماتے تھے کہ

مجھے اگر کسی سے ایذا یا تکلیف پہنچتی ہے تو ناگواری تو بہت ہوتی ہے مگر ضبط کر لیتا ہوں اور اس کے خلاف دل میں کبھی انتقامی جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس کے لیے بد دعا کرنے کو جی چاہتا ہے بلکہ عقل کو غالب کر کے اس کو معاف ہی کر دیتا ہوں۔

اور فرماتے کہ

میں اپنے مخالفین اور موذیوں کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں۔

مخالفین سے ایسے نرم اور متین سلوک کی مثال شاید تاریخ مشاہیر پیش کر سکے ایک مرتبہ کسی صاحب کے سوال پر حضرت نے فرمایا تھا۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ یہ لوگ جو میری مخالفت کرتے ہیں اس مخالفت سے ان کا منشا کیا ہے اگر منشاء حب رسول ہے تو میں ان کو معذور جانتا ہوں بلکہ ماجور سمجھتا ہوں کہ میری مخالفت کی وجہ سے ان کو اجر ملے گا۔

تحریک خلافت کے دوران بہت سی مقتدر ہستیوں نے حضرتؒ کے مسلک کے متعلق طعن و تشنیع کی بعض اخبارات اور اکثر لوگوں نے بہت نامناسب الفاظ میں حضرت کی مخالفت کی، کچھ لوگوں نے قتل کی بھی دھمکیاں دیں مگر حضرتؒ کوہ وقار بنے ہوئے خاموش ہی رہے کبھی کسی کو کوئی جواب نہیں دیا اور کبھی کسی

سے مغلوب بھی نہیں ہوئے فرماتے تھے۔

بحمد للہ مجھ پر حق واضح ہوگیا ہے اگر حق کی بقا، اور حفاظت کے لیے مجھے اپنی جان بھی قربان کرنا پڑے تو انشاء اللہ دریغ نہ کروں گا۔

اہل وعیال

حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی دو بیویاں تھیں اور دونوں بفضل تعالیٰ نہایت شفیق غربا پرور، متوکل، قانع، مہمان نواز اور حضرت کی خدمت گذار تھیں اولاد دونوں سے کوئی نہ تھی برادر خورد منشی اکبر علی صاحب کے صاحبزادے مولوی شبیر علی صاحب کو مثل اولاد کے چاہا اور تربیت کی وہی مدرسہ امداد العلوم کے مہتمم اور خانقاہ کے انتظامی امور کے ذمہ دار تھے۔

علالت ورحلت

وفات سے تقریباً پانچ برس پہلے علالت شروع ہوئی جو بتدریج بڑھتی گئی اتباع سنت میں علاج جاری رہا۔ لیکن علالت زور پکڑتی گئی علامہ سید سلیمان ندوی آپ کی علالت و رحلت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لیے بُجھ گیا ؎

داغ فـــراق صحبت شب کی جلی ہوئی
ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم الامت مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے مرض ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹ اور ۲۰ جولائی (۱۹۴۳ء) کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نماز عشاء کے وقت اس دارِ فانی کو "الوداع" کہا اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین و مہجور چھوڑا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

تجہیز وتکفین

اس حادثہ جانکاہ کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی اور برق بن کر عشاق کے قلوب پر گری صبح ہوتے ہی ہزاروں عقیدت مند و شیدائی تھانہ بھون پہنچنا شروع ہو گئے مولانا شبیر علی صاحب کی نگرانی میں غسل دیا گیا عیدگاہ میں جنازہ لے جایا گیا حضرت کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانی نے نماز جنازہ پڑھائی اور خانقاہ امدادیہ کے شمال جانب حضرت ہی کے وقف کردہ کیہ میں جس کا تاریخی نام "قبرستان عشق بازاں" ہے آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃ

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

مسلم خوابیدہ پر تھے جس کے احساں بے شمار	آج محوِ خواب ہے وہ رہنما زیرِ مزار !
دہر کے دستِ جفا سے بے سروپا ہو گئے	زہد و رشد و فضل و تقویٰ ہمت و فیض و وقار

گیارہ وصیتیں

میں اپنے سب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے معاصی صغیرہ و کبیرہ عمداً و خطاءً کے لیے استغفار فرمائیں۔

۲۔ میرے بعض اخلاق سیئہ کے سبب بعض بندگانِ خدا تعالیٰ کو حاضراً و غائبانہ میری زبان و ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں خواہ اہلِ حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للّٰہ دل سے ان کو معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تقصیرات سے درگذر فرمائیں گے میں بھی ان کے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں عفو و عافیت عطا فرمائیں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگذر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ الخ

۳۔ اس جنس کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں بطیبِ خاطر گذشتہ اور آئندہ کے لیے محض خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کو اور اپنی خطاؤں کی معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔

۴۔ میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمان کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب یا بذریعہ صحبت، بغیر اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتن دینیہ سے حفاظت ہو سکے جن کی آجکل بے حد کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

۵۔ طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ نرے درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں اس کا کار آمد ہونا موقوف ہے۔ اہل اللہ کی خدمت و صحبت و نظرِ عنایت پر اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں ؎

بے عنایاتِ حق و خاصانِ حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

۶۔ جو مدرسہ دینیہ (امداد العلوم) فی الحال یہاں میرے تعلق میں جاری ہے وہ ایک خاص شان کا مدرسہ ہے۔ میرا دل یوں چاہتا ہے کہ میرے بعد بھی اس کے ابقاء کی طرف توجہ رکھی جاوے اور خدا تعالیٰ اس مدرسہ کی خدمت کی جس کو توفیق دے تو وہ اس کے طرز کو جس کا ایک مہتم بالشان جزو تربیت اخلاق و اصلاح

نفس ہے نہ بدنے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس میں بہت خیر و برکت کی امید ہے

۷۔ دینی و دنیوی مضرتوں پر نظر کرکے اِن امور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

(۱) شہوت وغضب کے مقتضاء پر عمل نہ کریں۔ (۲) تعجیل نہایت بُری چیز ہے (۳) بے مشورہ کوئی کام نہ کریں (۴) غیبت قطعاً چھوڑ دیں۔ (۵) کثرت کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو اور کثرت اختلاط خلق بلا ضرورت شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ اور خصوصاً جب کہ دوستی کے درجہ تک پہنچ جاوے پھر خصوصاً جبکہ ہر کس و ناکس کو راز دار بھی بنالیا جاوے نہایت مضر ہے۔ (۶) بدون پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھائیں۔

(۷) بدون سخت تقاضہ کے مقاربت نہ کریں (۸) بدون سخت حاجت کے قرض نہ لیں (۹) فضول خرچی کے پاس نہ جائیں (۱۰) غیر ضروری سامان جمع نہ کریں (۱۱) سخت مزاجی اور تند خوئی کی عادت نہ کریں، رفق اور ضبط و تحمل کو اپنا شعار بناویں (۱۲) ریا و تکلف سے بہت بچیں اقوال و افعال میں بھی طعام و لباس میں بھی (۱۳) مقتدیٰ کو چاہیئے کہ امراء سے نہ بد خلقی کرے اور نہ زیادہ اختلاط کرے اور نہ ان کو حتی الامکان مقصود بناوے بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لیے (۱۴) معاملات کی صفائی کو دیانات سے بھی زیادہ مہتم بالشان سمجھیں (۱۵) روایات و حکایات میں بے انتہا احتیاط کریں۔ اس میں بڑے بڑے اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں خواہ سمجھنے میں یا نقل کرنے میں (۱۶) بلا ضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت و تجویز طبیب حاذق شفیق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں (۱۷) زبان کی غایت درجہ ہر قسم کی معصیت و لایعنی سے احتیاط رکھیں (۱۸) حق پرست رہیں اپنے قول پر جمود و اصرار نہ کریں۔ (۱۹) تعلقات نہ بڑھاویں (۲۰) کسی کے دینی معاملہ میں دخل نہ دیں۔

۸۔ میں اپنے تمام منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص، اپنی تمام زندگی بھر یاد کرکے ہر روز سورۂ یٰسین شریف، یا تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے مگر کوئی اور امر خلاف سنت بدعات عوام و خواص میں سے نہ کریں۔

۹۔ حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگاویں اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اس وقت پیام اجل آجائے تو کوئی فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو "
لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین   اور ہر وقت یہی سمجھیں۔

۱۰۔ شاید ہمیں نفس نفس "واپسیں بود" اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے، اور رات کے

کے گناہوں سے قبل دل کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

۱۰۔ خاتمہ بالخیر ہونے کو تمام نعمتوں سے افضل واکمل اعتقاد رکھیں اور ہمیشہ خصوصاً پانچوں نمازوں کے بعد نہایت مناجات وتضرع سے حسن خاتمہ کی دعا کیا کریں اور ایمان حاصل پر شکر کیا کریں کہ حسب وعدہ لئن شکرتم لازیدنکم"

۱۱۔ میرے ایصال ثواب کے لیے بھی جمع نہ ہوں، نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہوجاویں تو تلاوت وغیرہ کے وقت قصداً متفرق ہوجاویں اور ہر شخص منفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا وصدقہ وعبادات نافلہ سے نفع پہنچائے نیز میری مستعمل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے مضائقہ نہیں اس کا اعلان اور دوسروں کو دکھانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔ فقط۔

بس یہ گیارہ وصایا ہیں جن کو احد عشر کوکبا سے بلحاظ عدد تشابہ ہے ہدایت اور عمل کے لیے انشاء اللہ تعالیٰ کافی وافی ہیں۔ اللہ تعالےٰ توفیق عمل بخشیں۔ آمین ثم آمین۔

◆ ◆ ◆

فہرست خلفائے مجازین

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

محترم شبیر احمد صاحب نفیسی

حکیم الامت کے زیر تربیت جن حضرات نے منازل سلوک طے کیں ان میں ایک تو وہ ہیں جنہیں آپ نے اجازت بیعت سے نوازہ "مجازین بیعت" کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسرے وہ جن کی مجلس و صحبت بھی متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑتی، حضرت نے ان کو تلقین بلا بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی اور ایسے حضرات کا لقب "مجازین صحبت" تجویز فرمایا۔

یہ فہرست اشرف السوانح جلد سوم اور خاتمہ السوانح سے مرتب کی گئی ہے ممنوع الاجازت حضرات کے نام اس فہرست میں نہیں لکھے گئے، البتہ جن حضرات خلفاء کی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں وفات ہو گئی ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں شامل ہیں۔

	مجازین بیعت	تاریخ وفات
۱	جناب مولانا احمد علی فتحپوری	
۲	جناب مولانا محمد صاحب چاٹگامی	
۳	جناب مولانا نور حسین صاحب اوڈانہ ضلع جہلم	
۴	جناب مولانا عبیدالحق صاحب [illegible]	
۵	جناب حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری	
۶	جناب حکیم نور احمد صاحب کانپوری	
۷	جناب مولانا عبدالرحمن صاحب بکھرا	نصف ذی قعدہ ۱۳۴۳ھ

۸	جناب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب اعظم گڑھی	رجب ۱۳۴۱ھ
۹	جناب مفتی محمد سلطان صاحب مدراس	شوال ۱۳۴۲ھ
۱۰	جناب حاجی محمد مصطفیٰ صاحب خورجوی	۸ زی الحجہ ۱۳۴۳ھ
۱۱	جناب مولانا محمد عیسیٰ صاحب مقیم بنارس	۹ رجب ۱۳۴۴ھ
۱۲	جناب مولانا شاہ لطف رسول صاحب بارہ بنکی	غرہ شعبان ۱۳۴۴ھ
۱۳	جناب حافظ محمد عمر صاحب نہوٹوری مقیم علیگڑھ	۷ رمضان ۱۳۴۴ھ
۱۴	جناب شیخ معشوق علی صاحب قنوجی	شوال ۱۳۴۵ھ
۱۵	جناب مولانا محمد صادق صاحب مالیگاؤں ضلع ناسک	۱۳ زی الحجہ ۱۳۴۷ھ
۱۶	جناب مولوی رحیم بخش صاحب مقیم دہلی (للعوام)	زی الحجہ ۱۳۴۷ھ
۱۷	جناب مولانا عبد الحی صاحب سہارنپوری مقیم حیدرآباد	۲۷ رمضان ۱۳۴۸ھ
۱۸	جناب خیرات احمد خاں صاحب سونڈھیا ضلع گیا	۲۶ زی قعدہ ۱۳۴۹ھ
۱۹	جناب مولانا ابوالحسن صاحب جونپور	۷ ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ
۲۰	جناب حاجی محمد یوسف صاحب رنگونی	۸ محرم ۱۳۵۲ھ
۲۱	جناب مولانا ابوبکر صاحب ارکانی	۲۲ ج ۲ ۔ ۱۳۵۳ھ
۲۲	جناب سید فیروز شاہ صاحب مندری ضلع پشاور	۳ شوال ۱۳۵۳ھ
۲۳	جناب مولانا عبد المجید صاحب شاہجہانپوری	۴ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ
۲۴	جناب مولانا عبد الرحمٰن صاحب بریلوی	۲۱ شوال ۱۳۵۴ھ
۲۵	جناب مولانا عبد العلیم صاحب پنڈرا ڈاکخانہ براشام بازار ضلع بردوان (بھارت)	
۲۶	جناب مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری	
۲۷	جناب مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی	
۲۸	جناب مولانا حسن الدین صاحب مدراس	
۲۹	جناب مولانا غلام صدیق صاحب ڈیرہ غازیخان	
۳۰	جناب مولانا سید محمد اسحٰق صاحب کانپوری	

۳۰	جناب مولانا محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادی	۲۵ر ربیع الاول ۶۳ھ
۳۱	جناب مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری	۱۲ر اگست ۶۳ء کراچی
۳۲	جناب حاجی شیر محمد صاحب گھوٹکی (سندھ)	۱۳۸۶ھ مدینہ طیبہ
۳۳	جناب مولانا افضل علی صاحب بارہ بنکی	
۳۴	جناب مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی	۱۵ر مارچ ۵۱ء خانیوال
۳۵	جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب	۲۷ر شعبان ۱۳۶۳ھ
۳۶	جناب مولانا حبیب اللہ صاحب اعظم گڑھی	۱۹ر جون ۶۰ء سکھر
۳۷	جناب مولانا واحد بخش صاحب بہاولپور	
۳۸	جناب حاجی شمشاد علی صاحب کلانوری	
۳۹	جناب محمد عبداللہ خانصاحب بھوپالی	
۴۰	جناب سید فخرالدین شاہ صاحب گھوٹکی سندھ	
۴۱	جناب مولانا صغیر محمد صاحب کمرلہ بنگال	
۴۲	جناب مولانا عبدالحمید صاحب وزیراستانی	
۴۳	جناب مولانا ظہر علی صاحب میمن سنگھی (بنگال)	۱۱ر شوال ۹۶ھ میمن سنگھ
۴۴	جناب مولانا عبدالوہاب صاحب، لٹ ہزاری (بنگال)	
۴۵	جناب ابوالبرکات صاحب سلطانپوری (للعوام)	
۴۶	جناب مولانا نذیر احمد صاحب کرنالوی	
۴۷	جناب مولانا رفیع الدین صاحب الٰہ آباد	جمادی الثانی ۶۳ھ
۴۸	جناب مولانا عبدالسلام صاحب پشاوری	
۴۹	جناب مولانا محمد موسیٰ صاحب مہاجر مدنی	
۵۰	جناب مولانا محمد سعید صاحب مدراسی	۱۸ر محرم ۸۹ ۱۳ھ
۵۱	جناب مولانا نذیر احمد کیرانوی	۸ر دسمبر ۵۶ء کیرانہ
۵۲	جناب مولانا مقصود اللہ صاحب بریسال (بنگال)	

۵۳	جناب مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری (الہ آباد	۲۵ر نومبر ۶۷ء بحری جہاز پر انتقال ہوا
۵۴	جناب مولانا محمد حسن صاحب امرتسری (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور)	۱۶ر ذی الحجہ ۸۰ھ کراچی
۵۵	جناب مولانا مفتی سراج احمد صاحب امروہوی	
۵۶	جناب مولانا ممتاز احمد صاحب سونڈھیا گیا بہار	رمضان ۱۳۰۷ھ
۵۷	جناب مفتی حقدار خاں صاحب لکھنوی	
۵۸	جناب مولانا عبدالجبار صاحب فیروزپوری	۱۶ر اپریل ۵۱ء ہارون آباد
۵۹	جناب مولانا ولی احمد صاحب کیمل پوری	
۶۰	جناب مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بانی خیر المدارس ملتان	۲۰ر شعبان ۹۰ھ
۶۱	جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور	۲۱ر دسمبر ۶۵ء کامل پور
۶۲	جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	۱۴۰۳ھ
۶۳	جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (مفتی اعظم پاکستان	۱۰ر شوال ۹۶ھ کراچی
۶۴	جناب مولانا محمد نبیہ صاحب ٹانڈہ بالی مراد آباد	۱۲ر ربیع الاول ۹۴ھ ٹانڈہ
۶۵	جناب مولانا محمد صابر صاحب امروہوی	۲ر صفر ۹۳ھ
۶۶	جناب نواب احمد علی خانصاحب سہارنپوری	
۶۷	جناب حکیم کرم حسین صاحب سیتاپوری	۱۰ر ذی الحجہ ۶۳ھ
۶۸	جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب مئو آئمہ الہ آباد	
۶۹	جناب حاجی محمد عثمان خانصاحب دہلوی تاجر کتب	۷ر رمضان المبارک ۵۰ھ کراچی
۷۰	جناب ماسٹر مقبول احمد صاحب سیتاپوری	
۷۱	جناب مولانا جلیل احمد صاحب شیروانی علیگڑھی بانی مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان	۱۰ر ربیع الثانی ۵۵ھ لاہور
۷۲	جناب شہاب الدین صاحب خیاط کٹھوری (للعوام)	۲۰ر اگست ۷۰ء
۷۳	جناب مولانا محمد مسیح اللہ خانصاحب شیروانی جلال آباد	ماشاء اللہ حیات ہیں۔
۷۴	جناب مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری	۳۱ر دسمبر ۵۱ء
۷۵	جناب حکیم عبدالخالق صاحب ہوشیارپوری	۱۱ر فروری ۵۴ء ٹانڈہ

۷۶	جناب ماسٹر ضامن علی صاحب سندیلوی	۵۰ء سکھر
۷۷	جناب حافظ عنایت علی صاحب لدھیانوی دارالعلوم	
۷۸	جناب مولانا ولی محمد صاحب گورداسپوری	۲۱؍ اپریل ۵۹ء راولپنڈی
۷۹	جناب مولانا نور بخش صاحب چاٹگامی	
۸۰	جناب مولانا عبد الودود صاحب پشاوری	اپریل ۵۲ء
۸۱	جناب مولانا اسعد اللہ صاحب رامپوری ناظم مظاہر العلوم سہارنپور	۶؍ رجب ۹۹ھ
۸۲	جناب مولانا حکیم الٰہی بخش صاحب شکارپور سندھ	
۸۳	جناب ماسٹر محمد شریف صاحب ہوشیارپوری ملتان	
۸۴	جناب حافظ ولی محمد صاحب قنوج فرخ آباد	
۸۵	جناب مولانا کفایت اللہ صاحب شاہجہانپوری	
۸۶	جناب حکیم فضل اللہ صاحب شکارپوری	
۸۷	جناب بابو عبد العزیز صاحب گوجرانوالہ	۷۴ء
۸۸	جناب ماسٹر شیر محمد صاحب ہوشیارپوری	۱۰؍ اپریل گوجرہ
۸۹	جناب مولانا رسول خان صاحب ہزاروی	۱۴؍ رمضان ۱۹۱ھ اچھریاں
۹۰	جناب مولانا محمد اللہ صاحب نواکھالوی	رمضان ۱۴۰۷ھ
۹۱	جناب حکیم مولوی عبد الحق خانصاحب فتحپور ہسوہ	
۹۲	جناب حکیم خلیل احمد صاحب سہارنپوری	۶۵ء
۹۳	جناب محمود الغنی صاحب سہارنپوری حیدرآباد دکن	۵۶ء کراچی
۹۴	جناب ڈاکٹر عبد الحئی صاحب	۱۴۰۶ھ
۹۵	جناب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب	۲۲؍ نومبر ۵۵ء
۹۶	جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی	۳۰؍ جنوری ۷۶ء
۹۷	جناب مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئی	ماشاء اللہ حیات ہیں
۹۸	جناب مولانا فقیر محمد صاحب پشاور	〃 〃 〃

مجازین صحبت

۱	جناب حافظ سعید احمد خاں صاحب، رئیس بہیرہ ضلع ایٹہ	
۲	جناب حافظ علی نظر بیگ صاحب مرادآبادی	
۳	جناب مولانا شیخ محمد حسن صاحب الوارہ پکڑپو لکھنؤ	
۴	جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل پٹنہ	
۵	جناب مولوی محمود الحق صاحب وکیل حقی منزل ہردوئی	۱۹۳۶ء ہردوئی
۶	جناب حافظ عبدالولی صاحب نائب ناظم ریاست کپورتھلہ بہرائچ	۳۱ مئی ۱۹۷۹ء کراچی
۷	جناب شیخ عبدالکریم صاحب سیشن جج سکھر سندھ	
۸	جناب منشی محمد جلیل صاحب منصف اسرڑا ضلع بلیا	
۹	جناب مولوی انوار الحسن صاحب اعزازی مجسٹریٹ کاکوری	۱۳؍ جنوری ۵۵ء
۱۰	جناب منشی علی شاکر صاحب قانون گولا ضلع کھیری	۱۹۴۷ء کراچی
۱۱	جناب مولوی نجم احسن صاحب وکیل پرتاپ گڑھ	۱۹؍ رمضان ۹۶ء
۱۲	جناب مولوی سعادت علی صاحب وکیل سہارنپور	۵؍ فروری ۶۱ء
۱۳	جناب مولوی عبدالحکیم صاحب پروفیسر کالج میمن سنگھ بنگال	
۱۴	جناب منشی علی سجاد صاحب ڈپٹی کلکٹر جونپور	
۱۵	جناب ماسٹر حافظ مظہر احمد صاحب تھانوی بھوپال	دسمبر ۵۰ء
۱۶	جناب حافظ محمد طٰہٰ صاحب کورٹ انسپکٹر گورکھپور	۱۰؍ جون ۶۰ء
۱۷	جناب خواجہ محمد صادق صاحب شال مرچنٹ امرتسر	
۱۸	جناب منشی محمد عبدالصبور صاحب حصہ اول دفتر نہر سارده شاہجہانپور	
۱۹	جناب حافظ زاہد حسین صاحب امروہوی کوہ رانی کھیت	
۲۰	جناب مولانا بخشش احمد صاحب گورکھپوری	۱۹۳۴ء
۲۱	جناب مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی	
۲۲	جناب مولانا ظہور الحسن صاحب کسولوی ناظم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون	۸؍ شعبان ۹۲ھ

۲۳	جناب مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی نبیرہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی	
۲۴	جناب مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی	جنوری ۵۸ء
۲۵	جناب مولانا سلطان محمود صاحب مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی	
۲۶	جناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب دہلی	
۲۷	جناب منشی محمد یعقوب صاحب کلانوری انگلش کلرک سررشتہ تعلیم روہتک	۱۳ر ربیع الثانی ۷۷ھ
۲۸	جناب مولانا عبدالصمد صاحب بنارسی کرنیل گنج کانپور	
۲۹	جناب مولانا ابوالندا نور محمد صاحب حیدرآباد دکن	
۳۰	جناب حاجی سیٹھ داؤد ہاشم صاحب ۳۴ پاک لین رنگون	
۳۱	جناب مولانا حمید حسن صاحب دیوبندی مفتی ریاست مالیر کوٹلہ	
۳۲	جناب مولانا حکیم ریاض الحسن صاحب باغپت ضلع میرٹھ	۶۱ھ مکہ معظمہ
۳۳	جناب حکیم محمد سعید صاحب گنگوہی اجمیری منزل بمبئی	
۳۴	جناب منشی عبدالحمید صاحب پنشنر تحصیلدار مقبول گنج لکھنؤ	
۳۵	جناب حاجی عبدالغفور صاحب ٹھیکیدار جودھپور	۲۰ر جمادی الاول ۹۰ھ
۳۶	جناب حکیم فیاض علی صاحب بھوپال	
۳۷	جناب قاضی محمد مصطفیٰ صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر بھدوئی بنارس	
۳۸	مولوی محمد داؤد یوسف راندیر ضلع سورت	
۳۹	جناب میر امام الدین صاحب محاسب صدارت العالیہ حیدرآباد دکن	
۴۰	جناب مولانا عبدالمجید صاحب گھوسی ضلع اعظم گڑھ	
۴۱	جناب مولانا محمد میاں صاحب دائرہ شاہ حجۃ اللہ الہ آباد	ماشاالشحیات میں
۴۲	جناب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نیو ٹاؤن کراچی	۳ر ذیقعدہ ۹۷ھ کراچی
۴۳	جناب ڈاکٹر علی ساجد صاحب ہاشمی ہومیوپیتھک لکھنؤ	
۴۴	جناب مولانا مفتی محمد سعید صاحب لکھنوی	
۴۵	جناب مولانا سید عبدالکریم صاحب سرحدی	

۴۶	جناب شیخ عبدالغفار صاحب رئیس گھوسی ضلع اعظم گڑھ	
۴۷	جناب محمد نعیم صاحب بخاری کابل	
۴۸	جناب مولانا سخاوت حسین صاحب ککلی	
۴۹	جناب منشی عرفان احمد صاحب کلرک ڈاکخانہ تارگھر سہارنپور	
۵۰	جناب عزیزالرحمٰن نبیرہ مولانا عبدالواحد صاحب چوڑی والان دہلی	
۵۱	جناب شفیق احمد صاحب گنگوہی مدرس مدرسہ سلیمانیہ بھوپال	
۵۲	جناب شاہ محمد صاحب طوطہ کان ضلع مردان (سرحد	
۵۳	جناب خواجہ وحید اللہ صاحب پنشنر تارگھر کوٹہ (راجپوتانہ)	
۵۴	جناب مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی	۹رجب ۱۹۶۸ء ساہیوال
۵۵	جناب سید حسن صاحب ڈپٹی کلکٹر نگرام ضلع لکھنؤ	۱۹۵۰ء
۵۶	جناب مولانا سید حسن صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند	۲۲ جمادی الاول ۸۱ھ
۵۷	جناب مولانا مسعود علی صاحب شبلی منزل اعظم گڑھ	۲۷ اگست ۶۷ء
۵۸	جناب مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب نبیرہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی	ماشاء اللہ حیات ہیں
۵۹	جناب مولانا حکیم محمد مسعود صاحب گنگوہی معروف بہ حکیم اجمیری بمبئی	
۶۰	جناب ماسٹر منظور احمد صاحب تحصیل اسکول رڑکی	مارچ ۶۳ء
۶۱	جناب حکیم بہاءالدین صاحب ہردوئی	
۶۲	جناب حاجی ظفر احمد صاحب تھانوی انجینئر	
۶۳	جناب مولانا عبدالغنی صاحب رسول ضلع بارہ بنکی	
۶۴	جناب انوار احمد صاحب پنشنر جج پٹنہ ہائی کورٹ	ماشاء اللہ حیات ہیں
۶۵	جناب قریشی شفیع محمد صاحب سندھی کراچی	
۶۶	جناب شاہ محمد علیم صاحب اعظم گڑھی	

فیض رساں مجازین

اسمائے گرامی خلفائے مجازین بیعت و مجازین صحبت جو تا دم تحریر چشمۂ فیض اشرفیہ جاری رکھے ہوئے ہیں اور اشاعت طریق میں مصروف ہیں۔

۱ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خانصاحب شیروانی، مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد

۲ جناب مولانا ابرار الحق صاحب ناظم مجلس دعوۃ الحق و اشرف المدارس حقی منزل ہردوئی

۳ حضرت مولانا فقیر محمد صاحب، پشاور پاکستان

مجازین صحبت

۱ حضرت مولانا محمد میاں صاحب دائرہ شاہ حجۃ اللہ الہ آباد

۲ حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب انصاری گنگوہی

۳ جناب جسٹس انوار احمد صاحب بستی نظام الدین نئی دہلی ۱۳

اکابر علماء دیوبند

برصغیر پاک و ہند کے ۹۸ ممتاز اکابر علماء دیوبند
کے حالات، کمالات اور خدمات جلیلہ کا جامع تذکرہ

تالیف
حافظ محمد اکبر شاہ بخاری

ادارہ اسلامیات
۱۹۰ انارکلی لاہور

عمدہ ڈائی دار جلد، مجلد ۴۲/-

المہند علی المفند
یعنی
عقائد علماء اہل سنت دیوبند

تالیف
فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری قدس سرہ العزیز
متوفی ۱۳۴۶ھ
بمعہ
عقائد اہل السنۃ والجماعۃ
از
حضرت مولانا مفتی سید عبد الشکور ترمذی مدظلہ
مع
تصدیقات و تحشیہ جدیدہ

عمدہ کاغذ، کرومو کارڈ کی خوبصورت جلد
سائز ۲۲×۱۸/۸ ۱۵/-

اسلام کا اقتصادی نظام

اسلام کے نظام معاشی کا مکمل خاکہ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام
اقتصادی و معاشی نظاموں میں اسلام کا نظام اقتصادی ہی وہ نظام ہے
جس نے سرمایہ و محنت کا صحیح توازن قائم کرکے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے

تالیف
حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی نوراللہ مرقدہ

اعلیٰ ایڈیشن، عمدہ جلد ۴۵/-

بوادر النوادر

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی التھانوی قدس سرہ
تفسیر، حدیث، فقہ، علم الکلام اور تصوف کے نادر علمی مضامین پر مشتمل حضرت کی آخری تصنیف

ادارہ اسلامیات لاہور
۱۹۰ انارکلی

اعلیٰ کاغذ، عمدہ جلد، مکمل ایک جلد ۱۰۰/-

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور ۲

قصبہ تھانہ بھون کا تاریخی پس منظر

جناب شناء الحق صاحب صدیقی۔ کراچی

✻

قصبہ تھانہ بھون صوبہ یوپی میں ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ ہے اور سہارنپور شاہدرہ لائٹ ریلوے پر واقع ہے۔ اس لائن پر اور بھی کئی مشہور قصبے پڑتے ہیں۔ جیسے رام پور منہاران، نانوتہ، شاملی، کاندھلہ، باغپت اور بڑوت، ان قصبوں کیطرح تھانہ بھون بھی ایک پرانا قصبہ ہے مگر یہاں قدیم عمارتوں کے کھنڈرات دیگر مقامات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں۔ یہ کھنڈرات زبان حال سے قصبہ کی عظمت رفتہ کی داستان سنا رہے ہیں۔

اگرچہ اور بہت سے قدیم قصبوں اور شہروں کی طرح تھانہ بھون کی آبادی کی ابتداء اور اس کے ابتدائی دور کے واقعات ماضی کے دھندلکے میں چھپے ہوئے ہیں تاہم کسی قدر وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے قیام سے پہلے اس قصبہ کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تھانہ بھون کی حیثیت کبھی بھی ایک قصبہ سے زیادہ نہیں رہی، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا ذکر ایک قصبہ کی حیثیت سے کیا ہے۔ انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی اس کی آبادی کبھی ۳۰، ۳۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہوئی لیکن جہاں تک اس کی دیرینہ عظمت و شوکت کا تعلق ہے اس میں بہت تھوڑے قصبات اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء میں یہاں جو علم آزادی بلند کیا گیا تھا اس کی پاداش میں انگریزی حکومت نے اس قصبہ کا نام و نشان مٹانے کی پوری کوشش کی اور اس کوشش کو عرصہ تک جاری رکھا، چنانچہ متعدد پختہ اور شاندار عمارتوں کے نشانات آج اس طرح معدوم ہو چکے ہیں کہ ان کی جگہ کا تعین کرنا بھی اب ممکن نہیں رہا۔ پھر بھی جو کھنڈرات موجود

ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ قصبہ اپنی ترقی کی انتہائی بلندی پر تھا، اُس وقت قرب و جوار میں اس کی نظیر تلاش کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے تھانہ بھون کی حیثیت دیگر شہروں اور قصبوں کی طرح ایک قلعہ بند قصبہ کی تھی۔ اس کے چاروں طرف ایک مستحکم اور پختہ دیوار تھی، جس میں چار پھاٹک تھے۔ ان پھاٹکوں پر پہرہ چوکی کا معقول انتظام تھا۔ رات کے وقت یہ پھاٹک بند کر دیے جاتے تھے۔ اور پھر صبح ہونے تک کسی کو اندر داخل ہونے یا باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ تقریباً تمام آبادی چہار دیواری کے اندر تھی۔ البتہ کچھ مکانات اور عمارتیں خصوصاً سرکاری عمارات شہر پناہ کی دیوار کے باہر بھی تھیں۔

قصبہ میں متعدد محلات، بہت سی شاندار مسجدیں اور کھرنجے کی پختہ سڑکیں تھیں، آبادی کا پلان بہت عمدہ تھا۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پورے قصبے کو ایک منصوبے کے تحت بسایا گیا تھا اور یہ منصوبہ اور آبادی کا نقشہ کسی بڑے ماہر نے تیار کیا تھا۔ پانی کی نکاسی کا انتظام نہایت معقول تھا۔

کافی شکست و ریخت کے بعد اب بھی کئی محل اور مسجدیں اچھی حالت میں موجود تھیں تقسیم کے وقت محلہ محلت میں ہی چار محل قابل سکونت تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شاندار محل کھیر کا تھا جس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو قاضی عنایت علی رہ چکے تھے۔ اور یہیں سے انہوں نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء تک اِن کے خاندان کے بعض افراد اسی محل میں سکونت پذیر رہے

پرانی مسجدوں میں جو آزادی ہند کے وقت تک موجود تھیں اور غالباً آج بھی موجود ہیں حسب ذیل مسجدیں قابلِ ذکر ہیں۔

مسجد گھیر والی، مسجد پیر محمد والی جس کو خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کہا جاتا ہے، مولانا کی مسجد، عدالت والی مسجد، لال مسجد، مسجد حوض والی، تائیوں کی مسجد، ریتی کی مسجد، جامع مسجد، جمعیت کی مسجد۔

یہ سب مسجدیں تقسیم کے وقت تک نہایت گلزار اور آباد تھیں۔ خصوصاً مسجد پیر محمد والی جس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا قیام رہا تھا۔ سب سے زیادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ ہر نماز میں سب سے زیادہ نمازی اسی مسجد میں ہوتے تھے۔ جمعہ کے روز بھی سب سے زیادہ نمازیوں کا ہجوم یہیں رہتا تھا۔ قصبہ کے خاص خاص محلے جو تقسیم کے وقت تک آباد تھے حسب ذیل ہیں۔

محلت، نوگانزاہ، خیل، ریتی، دمدمہ، سیدوں کا محلہ، پٹھان پورہ۔

پرانے زمانے کی بہت سی سڑکیں اب بھی موجود ہیں اور بغیر مرمت کے برابر کام میں لائی جاتی رہی۔ ان کا صدیوں پرانا کھرنجہ کا فرش ابھی تک کافی مضبوط اور اچھی حالت میں ہے۔ سڑکوں اور گلیوں کے بنانے میں بڑی باقاعدگی اور سلیقہ مندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اکثر سڑکیں ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ پر کاٹتی ہیں۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف گہری گہری پختہ نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ جن کی وجہ سے سڑکوں پر پانی رُکنے نہیں پاتا، اور شدید بارش کے بعد بھی تھوڑی ہی دیر میں سڑکیں صاف ہو جاتی ہیں۔

قصبہ کی آبادی متعدد قوموں، ذاتوں اور پیشہ وروں پر مشتمل ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل ذاتیں قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ (ان میں اکثریت فاروقیوں کی ہے)، سیّد (اکثریت شیعوں کی ہے)، پٹھان، لائیں، جولاہے دھنیے، نائی، قصائی، چون گر، گاڑے، گڈریے، روڑ، برہمن، کائستھ، بنئے، چمار، بھنگی۔

جیسا کہ تاریخی واقعات اور زبانی روایات سے پتہ چلتا ہے تھانہ بھون کی بنیاد ہندوؤں کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اس لئے ان ہی کو اس قصبہ کے اصلی باشندے کہنا چاہیئے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے باہر سے آکر اس قصبہ میں بس جانے کے بعد سے ہندوؤں کی حیثیت برابر کم ہوتی چلی گئی۔ اور مسلمانوں کا غلبہ و تسلط بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ اگر آج بھی جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس قصبہ کی اکثر چیزوں پر مسلمانوں کے تمدّن کی گہری چھاپ ہے۔ مسلمانوں کی شاندار عمارتیں، عمارتوں کے کھنڈرات ان کی مسجدیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی عمارتوں میں ان کے ماضی کی شان و عظمت کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ تلاش و جستجو کے بعد اگر کوئی مندر دکھائی دے جاتا ہے تو وہ بھی بہت معمولی، ویسے بھی ہندوؤں کی آبادی قصبہ کے تھوڑے سے حصے میں سمٹی ہوئی ہے۔

تھانہ بھون ۲۹ درجے ۴۰ دقیقے عرض البلد شمالی اور ۷۷ درجے ۲۵ دقیقے طول البلد مشرقی پر واقع ہے اس طرح اس کو منطقہ معتدلہ کی ایک آبادی کہا جا سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جو انتظامات ہوئے ان میں اس قصبہ کو مغربی یو۔پی کے ایک ضلع مظفر نگر میں شامل کر دیا گیا تھا، اور اس وقت سے یہ اسی ضلع اور اسی صوبہ میں شامل چلا آتا ہے۔ پہلے یہ قصبہ صوبہ دہلی کے تحت، اور ضلع سہارنپور کا ایک پرگنہ تھا۔ آئین اکبری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے زمانہ میں تھانہ بھون، صوبہ دہلی کی سرکار سہارنپور کا ایک محل تھا۔ اس وقت تک اس کا نام تھانہ بھیم تھا۔ اور یہاں خصوصیت سے دو قومیں آباد تھیں۔ راجپوت اور مندہار، غالباً اکبری عہد کے بعد سے یہاں مسلمانوں کا غلبہ شروع ہوا، اور شاہجہان اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں وہ اس قصبہ پر پوری طرح چھا گئے۔ بعد میں ان کے نئے نئے محلے آباد

ہوئے۔ محلات اور شاندار مکانات بنے۔ مسجدیں تعمیر ہوئیں اور شاہ عالم ثانی کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے یہ قصبہ مسلمان آبادی کے ساتھ مخصوص ہوگیا۔ اور شمالی ہندوستان میں اسلامی تمدن کا ایک چھوٹا سا مگر شاندار مرکز بن گیا۔ غالباً اسی زمانے میں قصبہ کے نام پر سے بھی ہندوؤں کا اثر ختم ہوگیا اور تھانہ بھون کے نام سے شہرت پاگیا۔

قصبہ تھانہ بھون گنگا اور جمنا کے بیچ کی سرزمین میں آباد ہے۔ اس علاقہ کو دوآبہ اعظم یا صرف دوآبہ کہا جاتا ہے۔ یہ سرزمین زمانہ قدیم سے زرخیز و زرریز بھی جاتی رہی ہے اور اس کا شمار دنیا کے بہترین خطوں میں ہوتا ہے۔ دہلی اگرچہ دوآبہ سے باہر ہے لیکن دریائے جمنا کے عین مغربی کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کو دوآبہ سے الگ نہیں سمجھا جاسکتا۔ بلکہ اب تو اس کی آبادی کا پھیلاؤ جمنا کے مشرقی کنارے کی طرف اتنی دور تک ہوگیا ہے کہ اس کو دوآبہ کا شہر کہنا ہی مناسب ہے۔ میرٹھ بھی دوآبہ ہی کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔

دہلی اور میرٹھ کی آب و ہوا بڑی حد تک معتدل ہے۔ تھانہ بھون چونکہ ان دونوں شہروں سے کسی قدر شمال میں واقع ہے اس لیے یہاں کی آب و ہوا بھی تقریباً ایسی ہی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی گرمی اعتدال سے زیادہ ہوجاتی ہے لیکن مجموعی طور پر یہاں کی گرمی کو انتہا درجہ کی نہیں کہا جاسکتا۔ سردی ہلکی ہوتی ہے اور بارش کا سالانہ اوسط ۳۰ء۳۵ انچ سے آگے نہیں بڑھتا۔ درجہ حرارت اور بارش کی کیفیت کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کی آب ہوا معتدل ہے۔ یہ آب و ہوا صحت کیلئے بھی موزوں ہے۔ اور پیداوار کے لیے بھی مناسب۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے دوآبہ دنیا کے انتہائی زرخیز علاقوں میں سے ایک ہے۔ اسی علاقہ میں ہونے کی وجہ سے تھانہ بھون کو بھی قدرت کا یہ عطیہ ملا ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ اس معاملہ میں یہ قصبہ اور مقامات سے کچھ زیادہ ہی خوش قسمت ہے۔ اس کے گرد و نواح کے علاقہ کی مٹی بڑی زرخیز ہے اور اگر لفظ زرخیز کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال کرکے یہ بھی کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ "یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے"

تھانہ بھون ہر طرح کے غلے اور پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ بعض اشیاء کی پیداوار میں تو یہ قصبہ آس پاس کے دیگر قصبوں سے بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ جیسے عمدہ خربوزے یہاں پیدا ہوتے ہیں ویسے کسی اور جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ خوشبو، ذائقہ اور شیرینی میں بے مثل ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان خربوزوں کا

بیج لکھنؤ سے لاکر بویا گیا تھا مگر یہاں یہ تجربہ بیحد کامیاب رہا اور اب تھانہ بھون کے خربوزے جن کو کہا جاتا ہو لذت اور شیرینی میں لکھنؤ کے خربوزوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ ان کی مانگ بیرون جات میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ سینکڑوں ٹوکرے یومیہ کے حساب سے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ دو شہروں میں ان کا دساور مخصوص ہے ایک دہلی اور ایک دہرہ دون۔ خربوزوں کی فصل میں ریلوے اسٹیشن پر ٹوکروں کے انبار لگے رہتے ہیں اور ان کی خوشبو سے اسٹشن مہکا رہتا ہے۔ ٹوکروں کو مال کے ڈبوں میں جو عموماً پسنجر ٹرین ہی میں جڑے رہتے ہیں، لادنے کے لئے گاڑی کو ایک ایک، ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک رکنا پڑتا ہے۔

تھانہ بھون کے تربوز کو خربوزوں کے برابر مقبولیت حاصل نہیں بلکہ اس معاملہ میں بڑھانہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ پھر بھی تھانہ بھون کے تربوز کی پیداوار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فصل کے موقع پر یہاں کے چوک بازار میں تربوزوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ انمیں اکثر شیریں اور ذائقہ دار ہوتے ہیں۔

قلمی آموں کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے۔ لیکن تخمی آم بکثرت ہوتا ہے۔ عید گاہ میں آموں کے جو چند درخت ہیں ان کے آم ذائقہ اور مٹھاس میں بے نظیر ہوتے ہیں۔

میدانی علاقہ میں پیدا ہونیوالے پھلوں میں اور بھی کوئی پھل ایسا نہیں ہے جو تھانہ بھون میں نہ ہوتا ہو۔ قلت اور کثرت کی بات الگ ہے۔ پیوندی بیر لوہاری اور جلال آباد کا مشہور ہے لیکن تھانہ بھون کا بیر بھی ان سے کم درجہ کا نہیں ہے۔ کھجور کے خودرو درخت بھی قصبہ کے گردونواح میں بکثرت ہیں لیکن انکی طرف کوئی دھیان بھی نہیں دیتا اور نہ ان کو آمدنی کا کوئی ذریعہ سمجھتا ہے۔

غلوں میں گندم، جو، چنا، دھان، مکئی اور جوار باجرہ خوب ہوتے ہیں۔ دالوں میں مسور بے مثل ہے۔ پیلے اور سرخ رنگ کی مرچ یہاں کی مخصوص پیداوار ہے۔ دوسری اہم چیز پیاز ہے۔ اور بھی کئی چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے گنا، تمباکو، تل وغیرہ لیکن ان سب پیداواروں کا الگ الگ ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ زمین سے اگنے والی ان بیشمار چیزوں سے کہیں زیادہ اہم چیز اس خطہ کی مردم خیزی ہے۔

گزشتہ چار صدیوں میں یہاں ایسے ایسے مشاہیر پیدا ہوئے جن کے ناموں اور کاموں کو مدتوں فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ اعلیٰ منصبوں پر فائز ہونیوالوں میں نواب فاروقی خاں، حافظ محمد یار شکار خاں اور نواب مکرم خاں کے نام بہت اہم ہیں۔ رؤسا میں نجابت علی خاں اور عنایت علی خاں کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں نرے نواب اور رئیس ہی نہیں تھے۔ بلکہ قدرت نے انہیں اور بھی خوبیاں عطا کی تھیں۔ نجابت علی خاں اپنے جود وسخا میں بے مثل تھے۔ ان کو اگر اپنے زمانے کا حاتم کہا جائے تو بیجا

نہ ہوگا۔ عنایت علی خاں فنون جنگ میں ماہر اور جوشیلے انسان تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے نہ صرف شامل اور تھانہ بھون کے جہاد میں نمایاں کردار ادا کیا، بلکہ بجنور اور مراد آباد میں بھی مجاہدین کے ساتھ مل کر کافی عرصہ تک جنگ کرتے رہے۔

جن لوگوں نے علمی میدان میں نام پیدا کیا ان میں ملا محمد صابر کا نام سرفہرست ہے۔ ان کو صاحب کشاف اصطلاحات الفنون ” جیسے عالم اجل نے ”آتقی العلماء“ کہا ہے۔ ملا محمد صابر، نواب فاروقی خاں کے باپ تھے۔ اور اپنی علمیت و فضیلت کی بنا پر دربار شاہی میں کافی رسوخ رکھتے تھے۔ ۱۰۹۲ھ میں فوت ہوئے۔ دوسرا نام قاضی محمد اعلی تھانوی کا آتا ہے۔ وہ ملا محمد صابر کے پرپوتے اور ”کشاف اصطلاحات الفنون“ جیسی کتاب کے مصنف تھے۔ انہوں نے علمی دنیا میں اپنے پردادا سے کہیں زیادہ شہرت پائی۔ اور اپنی اس تصنیف کی بدولت عرب دنیا سے خراج تحسین وصول کیا۔ آج بھی مصر، لبنان وغیرہ میں علامہ تھانوی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کا سن ولادت اور سن وفات نہیں مل سکا۔ تاہم بعض شواہد کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے زمانے میں اپنی علمیت اور تصنیفات کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس کے بعد احمد شاہ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے زمانے میں انہوں نے کافی نام پایا۔ اور شاہ عالم ثانی کے زمانے میں فوت ہوئے۔ اسطرح وہ شاہ ولی اللہ اور مرزا جان جاناں مظہر کے ہمعصر قرار پاتے ہیں۔ تیسری اہم شخصیت جو علم و دانش کا ایک روشن ستارا بن کر چمکی حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی کی تھی۔ وہ ملا محمد صابر کی ساتویں پشت میں تھے۔ تھانہ بھون کے تاریخی حالات جو اس وقت پیش کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہی مرتب کئے تھے۔ ان تین کے علاوہ اس فاروقی خاندان میں اور بھی بہت سے حضرات ایسے تھے جن کو علم کے سمندر کے غواص کہا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس معاملہ میں ”ایں خانہ ہمہ آفتاب است“ کا مقولہ اس خانوادے پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ باقی افراد کو چھوڑ کر دو نام لینا کافی ہے مولانا شیخ محمد کے پدر بزرگوار مولوی محمد اللہ (ف ۱۲۲۹ھ / ۱۸۲۲ء) اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (ف ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء)۔

علماء کے بعد مشائخ کا نمبر آتا ہے۔ اس کوچہ میں سب سے زیادہ نامور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حضرت حافظ ضامن علی شہید، حضرت مولانا شیخ محمد اور حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ حاجی امداد اللہؒ اپنے علوئے مرتبت کی وجہ سے شیخ العرب والعجم کہلائے۔ حافظ ضامن علی جہاد ۵۷ء میں سرفروشی کا اعلیٰ نمونہ پیش کر کے ؏ ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

کا مصداق بنے۔ مولانا شیخ محمد شریعت وطریقت کا سنگم ثابت ہوئے، مولانا فتح محمد نے بھی اپنے ورع وتقویٰ کی بنا پر ایک بلند مقام حاصل کیا۔ اور مولانا اشرف علی، حکیم الامت کے معزز لقب سے یاد کیے گئے۔

دنیوی اعتبار سے بھی بہت سے لوگوں نے خاصا نام پایا۔ ان میں سے دو نام کسی طرح نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ ارشد تھانوی اور شوکت تھانوی۔

غالباً تھانہ بھون کے علماء اور مشائخ کا ہی یہ اثر ہے کہ یہاں کے لوگ اب بھی بدعتوں سے بڑی حد تک محترز رہتے ہیں۔ چنانچہ پیروں، فقیروں، روشنیوں اور اعراس کا بہت کم چرچا ہے۔ دیوبند تک میں معروف اور غیر معروف پیروں متعدد درگاہیں ہیں جن میں آئے دن روشنیاں اور عرس ہوتے رہتے ہیں لیکن تھانہ بھون میں صرف شاہ ولایت صاحب کی روشنی ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور کسی عرس یا میلے کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ اگر یہاں کے لوگوں کا یہ عقیدہ ہوتا تو وہ حافظ ضامن علی شاہ صاحب، مولانا شیخ محمد صاحب اور مولانا اشرف اشرف علی صاحب جیسے بزرگوں کے شاندار مقبرے بناتے اور قصبہ کی آبادی کیلئے جشن کے کم از کم تین موقعے آسانی سے نکال لیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان تینوں بزرگوں کے معمولی سے مزارات ہیں جن سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے۔

بقیہ از صفحہ ۷۹

وہ نصف نصف دونوں اہلیہ محترمہ کی خدمت میں پیش کر دی گئی۔ حضرتؒ کے بھائی صاحب مرحوم نے نیلامی سے قبل صرف ایک تسبیح کی درخواست کی جو حضرتؒ کے استعمال میں رہتی تھی، چنانچہ وہ تسبیح ان کو دے دی گئی، یہ ہیں مختصر حالات اس مردِ مومن کے جس نے اپنی ساری عمر احیائے سنت واشاعت حق اور بدعات و رسوم کے مٹانے میں صرف کی اور کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات ومراتب بیش از بیش بڑھائے، اور ان کی قبر کو نور سے معمور فرمایئے، رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہو دستور میخانہ
وصف او را ہرگز نیاید در کلام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

کی

مختصر سوانح حیات

حضرت مولانا وکیل احمد صاحب شیروانی

نام نامی آپ کا نام محمد اشرف علی، جو ایک مجذوب کا رکھا ہوا تھا، ددھیالی نام عبد الغنی، اور تاریخی نام کرم عظیم تھا۔

والد کا نام والد صاحب کا نام منشی عبد الحق فاروقی تھا۔

وطن مالوف آپ کا وطن قصبہ تھانہ بھون، جو یو۔ پی کے مشہور ضلع مظفر نگر کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، جو شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت حافظ ضامن صاحب شہیدؒ اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ اقطاب ثلثہ کا وطن تھا۔

نسب آپ ددھیال کی طرف سے فاروقی، اور ننھیال کی طرف سے علوی تھے۔

ولادت باسعادت آپ کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۸۴۰ء چہار شنبہ (بدھ) کے دن صبح صادق کے طلوع کے ساتھ ہوئی۔

ابتدائی تعلیم آپ کی ابتدائی تعلیم کا دور قرآن شریف سے ہوا، چند پارے آپ نے کھتولی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اخون جی سے پڑھے، پھر حافظ حسین علی صاحب دہلوی سے جن کا قیام میرٹھ میں تھا، دس سال کی عمر میں حفظ سے فراغت پائی، فارسی کی تعلیم میرٹھ کے استادوں سے حاصل کی، پھر متوسطات تھانہ بھون میں حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ سے پڑھیں اور فارسی کی انتہائی کتب ابو الفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب مرحوم سے پڑھیں اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے، عربی کی ابتدائی چند کتابیں حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ

ے اور فارسی کی چند کتابیں سکندر نامہ وغیرہ بھی دیوبند میں مولانا منفعت علی صاحبؒ سے پڑھیں۔

ابتدائی کتب کے اساتذہ کرام

حافظ حسین علی صاحب دہلویؒ، حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانویؒ، جناب مولانا منفعت علی صاحب دیوبندیؒ، جناب آخون جی صاحب میرٹھیؒ اور جناب واجد علی صاحبؒ۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

عربی کی کتابوں کی تکمیل کے لیے دنیا کی مشہور و معروف درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں آخر ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۵ھ میں داخل ہوئے، علوم عربیہ کی تمام کتابیں یہیں شروع کیں اور یہیں ختم کیں اس سلسلہ میں ۵ سال دیوبند رہنا ہوا اور شروع ۱۳۰۱ھ میں بیس۲۰ سال کی عمر میں فراغت حاصل کی۔

دیوبندی دور کے اساتذہ کرام

(۱) حضرت تھانویؒ نے دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند سے کوئی سبق تو نہیں پڑھا لیکن جلالین شریف کے درس میں شرکت کیا کرتے تھے۔ (۲) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ (۳) حضرت مولانا شیخ العالم محمود حسن صاحب دیوبندیؒ (۴) جناب مولانا سید احمد صاحبؒ (۵) جناب مولانا عبد العلی صاحبؒ (۶) جناب ملا محمود صاحب سے تعلیم حاصل کی اور قرأت کی مشق مکہ مکرمہ کی حاضری پر شیخ القرأ قاری عبد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے کی۔

دستار بندی

حضرت کی دستار بندی سنہ ۱۳۰۱ھ میں قطبِ عالم، عالمِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔

تین پیشین گوئیاں

(والد صاحب کی پیشین گوئی) ایک مرتبہ حضرتؒ کی "تائی صاحبہ مرحومہ" نے حضرت قدس سرہ کے والد ماجد سے فرمایا کہ تم نے چھوٹے لڑکے (جناب منشی اکبر علی صاحب مرحوم) کو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا، بڑا لڑکا اشرف علی عربی پڑھ رہا ہے وہ کہاں سے کھائے گا؟ اس کی گزر اوقات کی کیا صورت ہوگی، آخر یہ بات والد صاحب مرحوم کو سخت ناگوار گزری اور جوش میں فرمایا۔۔۔ "خدا کی قسم جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے تو اس کی جوتیوں میں لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رُخ بھی نہیں کرے گا۔" بفضلہ تعالیٰ ایسا ہی ہوا، آپ کے والد صاحبؒ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف ثابت ہوئی اور لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔

دوسری پیشین گوئی

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی محدثؒ جو حضرت اقدس میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی نوراللہ مرقدہ کے خاص خلفا میں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہٗ کے پیر بھائی تھے، فرمایا کرتے تھے "کہ میرے بعد یہ لڑکا اشرف علی، میری جگہ ہوگا" چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ ایسا ہی ہوا، اور ایک دفعہ عالم رویا میں فرمایا کہ "ہم کو تو تمہاری طرف اب بھی ویسی ہی توجہ ہے جیسے حیات میں تھی۔"

تیسری پیشین گوئی

حضرتؒ نے جب یہ سنا کہ ہماری دستار بندی ہونے والی ہے تو اپنے ہم سبقوں کو ساتھ لے کر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے، ساتھیوں نے گفتگو کے لیے حضرت تھانویؒ کو منتخب کیا، حضرت نے اپنے استاذ مکرم کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضرت! ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی کی جائے گی اور سند فراغ دی جائے گی اس کو منسوخ کر دیا جائے ہم ہرگز اس قابل نہیں مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی" یہ سن کر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو جوش آگیا اور فرمایا کہ "تمہارا یہ خیال غلط ہے . . . . خدا کی قسم جہاں تم جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے، باقی سارا میدان صاف ہے، اطمینان رکھو" بفضلہٖ تعالیٰ یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی۔

درس و تدریس

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں اپنے اساتذہ کرام کے فرمان سے پچیس روپیہ ماہانہ پر مدرسہ فیض عام کانپور میں درس دینا شروع کر دیا، آپ کا تقرر ایک ایسے مشہور اور جامع بالخصوص ماہر معقولات عالم کی جگہ ہوا جن کا طلبا میں بہت شہرہ تھا، اُن کی جگہ کسی عالم کو بیٹھ کر درس دینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، حضرت کو اس صورتِ حال کی بالکل خبر نہ تھی، جب وہاں سے ایک مدرس کی طلبی ہوئی تو بلا تکلف اخیر صفر ۱۳۰۱ھ میں باجازت والد صاحب مرحوم کانپور تشریف لے گئے، حضرتؒ اس وقت نوجوان اور سبزہ آغاز تھے لیکن کانپور پہنچ کر وہاں کے علماء مدرسین اور اہلِ شہر میں بہت جلد شہرت ہوگئی اور عام طور پہ ہر دلعزیز ہوگئے اور جن عالم کی جگہ تقرر ہوا تھا یعنی حضرت مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ وہ بھی محبت اور وقعت سے پیش آنے لگے، اس طرح آپ نے کانپور میں مدرسہ فیض عام اور پھر اس کے بعد مدرسہ جامع العلوم میں ۱۳۱۵ھ تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔

دار العلوم کے زمانہ قیام میں چند معمولات

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

فرماتے ہیں کہ "جب حضرت تھانویؒ دارالعلوم میں پڑھنے کے لیے آئے ہیں تو آپ نے چار معمولات مقرر کئے ہوئے تھے (۱) پہلا تو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے لیے کچھ ساتھی منتخب کر لیے تھے اور ان سے معاہدہ کر لیا تھا کہ نمازِ عشاء کے بعد نہ تکرار کریں گے نہ مطالعہ کریں گے بلکہ فوراً سو جائیں گے اور اخیر شب میں اٹھ کر تہجد پڑھیں گے اور اس کے بعد مطالعہ اور تکرار کریں گے جو کام لوگ ابتدائی رات میں کرتے ہیں وہ ہم آخر میں کریں گے چنانچہ ان کے سب ساتھی اس کے پابند ہو گئے اور دوسرا معمول یہ تھا کہ منڈی میں جو دیوبند کا بازار ہے وہاں چوراہے پر تحصیل کے سامنے عصر کی نماز کے بعد روزانہ وعظ فرماتے تھے، قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے اور ہر روز پابندی سے وعظ فرماتے اور تیسرا معمول یہ تھا کہ جمعہ کے دن حضرات اساتذہ کرام کی خدمت میں جایا کرتے تھے ایک گھنٹہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں ایک گھنٹہ مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ کی خدمت میں اور ایک گھنٹہ مولانا منفعت علی صاحبؒ کی خدمت میں اور چوتھا معمول یہ تھا کہ حجرہ میں ایک گھڑا رکھا چھوڑا تھا جو خط آتا بغیر پڑھے اس میں ڈال دیا کرتے، پھر ان کو امتحانات کے بعد پڑھتے، کسی میں خوشی کا اظہار ہوتا اور کسی میں غمی کا ذکر ہوتا، سالانہ امتحان سے فراغت کے بعد جب آپ تھانہ بھون آتے تو کسی کے یہاں تہنیت کے لیے جاتے اور کسی کے یہاں تعزیت کے لیے، سب لوگ کہتے کہ ہم نے خط لکھا تھا مگر تم نے جواب بھی نہیں دیا، تو حضرت فرماتے کہ میں پڑھنے کے لیے گیا تھا، کتابیں پڑھنا میرا موضوع تھا ان کو پڑھا، خطوط پڑھنا میرا موضوع نہ تھا۔

تلامذہ کرام

کانپور کے زمانہ قیام اور چودہ سالہ دورِ تعلیم میں یوں تو ہزاروں علمائے کرام نے آپ سے سندِ فراغ حاصل کی مگر ان میں سے چند حضرات بڑی شہرت اور امتیاز کے مالک ہوئے۔ مثلاً حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانیؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب کانپوریؒ، حضرت مولانا احمد علی صاحب فتح پوریؒ، حضرت مولانا صادق الیقین صاحب کرسویؒ، حضرت مولانا فضل حق صاحب الہ آبادیؒ، حضرت مولانا شاہ لطف رسول صاحب فتحپوریؒ۔ حضرت مولانا الحاج حکیم محمد مصطفٰے صاحب میرٹھیؒ، حضرت مولانا مظہر الحق صاحب چاٹگامیؒ، حضرت مولانا سعید احمد صاحب تھانویؒ، شیخ المحدثین حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ، جناب منشی منظر علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا عبد اللہ صاحب گنگوہی مصنف تیسیر المبتدی، حضرت

مولانا سمیع اللہ خان صاحب شروانی، جناب مولانا محمد احمد صاحب تھانویؒ بانی مدرسہ اشرفیہ سکھر اور جناب مولانا سید محمد شمس الحسن صاحب تھانوی، خطیب جامع مسجد خضریٰ کراچی ان تینوں مذکور حضرات نے تھانہ بھون میں حضرت تھانویؒ سے جلالین شریف کے کچھ اسباق پڑھے تھے، بڑے خوش قسمت ہیں وہ حضرات جن کو حضرت تھانویؒ سے تلمذ حاصل ہے۔

فَطُوْبٰی لَهُمْ وَهَنِیْئًا لَّهُمْ۔

طرزِ تعلیم

علوم عربیہ کی تعلیم ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے بڑی ترقی کے ساتھ مدارس کی شکل میں قائم رہی ان مدارس دینیہ میں درس نظامی پڑھایا جاتا ہے جو آٹھ سالہ نصاب پر مشتمل ہے، مگر حضرتؒ نے ایک نصاب کم فرصت والوں کے لیے مرتب فرمایا جس سے تین سال میں کافی استعداد عربی کی اور اپنے مذہب سے واقفیت فاضل استعداد کے ساتھ ہو جاتی ہے اس نصاب کا نام ضمانُ التکمیل فی زمانِ التعجیل ہے' درسی کتابوں کی تقریر میں اکثر لمبی لمبی تقریروں سے نفرت فرماتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ کتاب کو طالبِ علم کے لیے آسان سے آسان پیرایہ میں ڈھال کر پڑھانا چاہیئے، نفسِ مضمون سے زائد باتیں استاد کو نہ کہنی چاہئیں۔

بیعت

اپنی اصلاح اور تربیت باطنی کی فکر طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھی، اسی دوران ایک دفعہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو آپ نے ان سے بیعت کی درخواست کی مگر حضرت گنگوہی قدس سرہ نے طالب علمی کے زمانہ میں بیعت کرنا مناسب نہ سمجھا اور انکار فرما دیا۔ جب حضرت گنگوہیؒ حج کو تشریف لے جانے لگے تو حضرت تھانوی نے ان ہی کے ذریعہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خدمت بابرکت میں عریضہ بھیجا اور اس میں لکھا کہ آپ مولانا سے فرما دیں کہ وہ مجھے بیعت کر لیں، تو حضرت حاجی صاحب نے بجائے سفارش فرمانے کے خود ہی بیعت فرما لیا، یہ واقعہ سنہ ۱۲۹۹ھ کا ہے اس وقت حضرت کی عمر ۱۹ سال تھی، اس طرح آپ سنہ ۱۲۹۹ء میں سلسلہ امدادیہ میں داخل ہوگئے۔

حضرت شیخ کی خدمت میں پہلی حاضری اور پہلا حج

یہ بیعت بذریعہ خط ہوئی تھی اس وقت تک ان دونوں حضرات یعنی حضرت تھانویؒ اور حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔

کیونکہ حضرت حاجی صاحبؒ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی کی ناکامی کے بعد ہجرت فرما گئے تھے، اس وقت حضرت تھانویؒ پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور جب کہ آپ طالب علم تھے اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ کے والد ماجد صاحب مرحوم کو کہلا بھیجا کہ "جب تم حج کے لیے آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو ہمراہ لیتے آنا" حضرت جب کانپور میں اشاعتِ علوم میں مصروف تھے تو سفرِ حج کے سامان پیدا ہو گئے، حضرتؒ اپنے والدِ محترم کی معیت میں زیارتِ حرمین شریفین اور حضرت شیخ کی زیارت کے لیے روانہ ہو گئے، یہ ۱۳۰۱ھ کا واقعہ ہے، مکہ معظمہ (زادہا اللہ شرفہا) پہنچ کر حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف ہوئے، حضرت شیخؒ بھی آپ کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے اور پھر دست بدست بیعت سے سرفراز کیا۔ حضرت شیخؒ کی دلی تمنا تھی کہ چھ ماہ میرے پاس رہیں۔ مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر نہایت ادب و احترام سے عذر فرما دیا، حضرت شیخؒ نے فرمایا اس وقت چلے جاؤ، پھر دیکھا جائے گا، حضرت کا یہ پہلا حج بیس سال کی عمر میں ہوا۔

حضرت شیخ کی خدمت میں دوسری مرتبہ حاضری

دوسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ میں جب حضرت حج کو تشریف لے گئے تو اُس وقت مکمل چھ ماہ حضرت حاجی صاحب کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہے، عشق کی چنگاری تو پہلے ہی موجود تھی اس زمانۂ قیام میں حضرت حاجی صاحبؒ کے تعلق نے اس کو خوب ہوا دی اور ارضِ پاک کے قیام نے اس کو خوب بھڑکایا۔

خلافت و بیعت کی اجازت

۱۳۱۰ھ میں جب حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں رہ کر وطن واپس ہوئے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے اجازت بیعت و تلقین سے مشرف فرمایا، واپس آ کر کانپور میں پھر کام شروع کیا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کی دو وصیتیں

حضرت تھانویؒ نے جب حاجی صاحبؒ سے رخصت چاہی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے دو وصیتیں بطورِ خاص فرمائیں۔ پہلی وصیت یہ فرمائی کہ "دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا۔

دوسری وصیت

اور دوسری یہ فرمائی کہ کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر

دوسری جگہ تدریس وغیرہ کا تعلق قائم نہ کرنا بلکہ توکل بر خدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا، پہلی پیشین گوئی کا ظہور کانپور کے زمانۂ قیام میں ہی ہوا کہ آپ پر ایک ایسی کیفیت اور حال طاری ہوا کہ جس کی وجہ سے سارے مشاغل سے دل اچاٹ ہو گیا اور درس و تدریس سے دلچسپی ختم ہو گئی۔ وعظ کہنا چھوڑ دیا اور یکسوئی اختیار کر لی، اسی زمانہ میں کانپور میں ایک عظیم جلسہ تھا جس میں بڑے بڑے مشائخ و علمائے کرام تشریف لائے ہوئے تھے، منتظمین جلسہ نے آپ سے بھی شرکت اور وعظ کی درخواست کی آپ نے سکوت اختیار فرمایا اور آنسوؤں کی زبانی اپنا حال سنانا شروع کیا، اُس زمانہ کے مشہور و معروف بزرگ اور عالم حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواریؒ نے فرمایا کہ اگر ایسی حالت میں ان سے وعظ کہلوایا تو بس منبر پر بیٹھ کر اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ انا الحق ہوگا، ایسی حالت میں اصرار مناسب نہیں" اس زمانہ میں توحید کا بہت غلبہ تھا خود ہی فرمایا کہ اس لیے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو جائے۔ آخر جب اضطراب حد سے گزرنے لگا اور خودکشی تک کا ارادہ ہو گیا تو ایک عریضہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں مکہ معظمہ بھیجا، جب یہ عریضہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پہنچا تو بیان کرنے والے نے بیان کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کبھی گھر کے اندر تشریف لے جاتے اور کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے کہ جوان آدمی ہیں غلبہ ہو گیا ہے، تحمل نہیں ہو سکا، مگر میں تو اتنی دُور ہوں کیا کروں حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک واپس جانے والے حاجی کے معرفت حضرت کے خط کا جواب ارسال فرمایا اور تحریر فرمایا کہ جب تک تمہارا یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی طرف رجوع کرتے ہو (اس زمانہ میں حضرت نے اپنی اس حالت کے بارے میں اپنے ماموں پیرجی امداد علی صاحبؒ سے رجوع کیا تھا۔ یہ اس طرف اشارہ ہے) حضرت فرماتے ہیں کہ جب ان حاجی صاحب نے ظہر سے قبل مجھے حضرت حاجی کا یہ پیغام سنایا اور گرامی نامہ دیا تو بس سنتے ہی اور پڑھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دہکتے ہوئے تنور پر بھری ہوئی مشک چھوڑ دی، اُسی وقت سکون ہو گیا اور وہ حالت فوراً فرو ہو گئی۔

دوسری وصیت کا ظہور

دوسری وصیت کے ظہور کا وقت بھی آن پہنچا اور وہ اس طرح کہ جب کانپور سے دل برداشتہ ہو گئے تو فوراً آپ کو اپنے شیخ کی دوسری وصیت یاد آئی، آپ نے اس پر عمل کرتے ہوئے کسی اور جگہ تعلق قائم کرنے کے

بجائے تھانہ بھون ہی واپس آنے کو ترجیح دی۔

مستقل قیام تھانہ بھون

۱۳۱۴ھ کے ختم پر حضرت نے مصمم ارادہ فرمالیا کہ تھانہ بھون واپس آکر اپنے شیخ کی خانقاہ امدادیہ کو جو دکانِ معرفت کہلاتی تھی دوبارہ مسکن بنایا جائے یہ دکانِ معرفت حضرت حاجی صاحبؒ کی ہجرت، حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کی شہادت اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی رحلت کے باعث بے رونق ہو چکی تھی، چنانچہ آپ نے اسی خانقاہ کو اپنا مسکن بنایا اور تھانہ بھون آکر مکہ معظمہ حضرت شیخ کو مطلع فرمایا

حضرت حاجی صاحبؒ کی بشارت

حضرت حاجی صاحبؒ نے جواب میں بڑی مسرت اور خوشی کا اظہار فرمایا اور تحریر فرمایا کہ "بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا: آپ ہمارے مدرسہ و مسجد کو از سرِ نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے"
(مکتوب گرامی ع۳۶ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ)

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ

حضرت کے قیام تھانہ بھون سے اب وہ خانقاہ امدادیہ کے ساتھ ساتھ اشرفیہ بھی ہو گئی، مگر حضرتؒ ہمیشہ اس کو خانقاہ امدادیہ ہی کے نام سے ذکر فرماتے، حضرتؒ چونکہ حضرتِ حاجی صاحبؒ کے عاشق صادق اور فنا فی الشیخ تھے، اس لیے حضرتؒ نے اپنی بعض کتابوں کے نام بھی حضرت حاجی صاحبؒ کے اسم گرامی سے موسوم کیے، مثلاً امداد الفتاویٰ، جو سات جلدوں میں ہے امداد المسائل، امداد الاحکام، ماہانہ رسالہ "الامداد" اور مدرسہ کا نام بھی امداد العلوم ہی رکھا۔

۱۳۱۵ھ سے مستقل قیام تھانہ بھون

۱۳۱۵ھ سے حضرت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات باقی رہا، یعنی مستقل قیام تھانہ بھون، پدری جائیداد میں کچھ اشتباہ ہونے کی وجہ سے گو فقہ کی رو سے اس کا لے لینا جائز تھا مگر تقویٰ کی رو سے لینا مناسب نہیں تھا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا ارشاد اور پیشینگوئی

اور توکلاً علی اللہ اپنے شیخ باکرامت کی خانقاہ میں بیٹھ کر ہی دین اور قوم کی خدمت کرنے کا ارادہ فرمالیا اور اپنے اس ارادہ کی اطلاع کیلئے اپنے پہلے مجوزہ شیخ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو تحریر فرمایا کہ اگر رکھو تو رخصت ہے اور نہ رکھو جب بھی حق تعالیٰ روزی کی تنگی سے تم کو محفوظ رکھے گا۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ ایسا ہی ہوا۔

مسندِ ارشاد پر حضرت گنگوہیؒ کی اس تسلی سے بالکل متوکلاً علی اللہ تعالیٰ ہمہ تن دین اور اصلاحِ اُمت کی خدمت میں مشغول و مصروف ہو گئے، پھر کیا تھا کبھی تجلی جمالی سے سکینت پاتے، اور کبھی تجلی جلال سے برقِ تپاں بن جاتے، صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھتا رہا جو آتے گئے ان کو بھی اسی رنگ میں ڈبوتے گئے، خانقاہ امدادیہ کی رونق میں چار چاند لگ گئے۔ اس دور میں رنگ ہی اور تھا، خود سراپا سوز و گداز تھے، اس لیے جو بھی آجاتا سوختہ گداختہ بن جاتا، اور یوں تو حجِ ثانی کے لیے کانپور ہی سے رشد و اصلاح باطنی کا کام شروع ہو گیا تھا اور حضرت گنگوہیؒ بھی اپنے بعض متعلقین کو حضرت تھانویؒ کی خدمت میں بھیجنے لگے اور پھر تھانہ بھون پہنچ کر ذاکرین مریدین کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی، اور ہندوستان کے شمال جنوب اور مشرق و مغرب سے لوگ پروانہ وار آنے شروع ہو گئے، اور اس شمعِ ضیا پاش سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق روشنی کے سامان حاصل کر گئے۔ لوگوں کی آمد و رفت کا یہ عالم تھا کہ حکومتِ وقت کو حضرتؒ کی دعاؤں کی برکت سے قصبہ تھانہ بھون کے لیے ایک مستقل ریلوے اسٹیشن بنانا پڑا اور خانقاہ امدادیہ کی "دکانِ معرفت" پر خریدارانِ علم و عرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلویؒ اور حضرت شیخ احمد سرہندی و مجدد الف ثانیؒ کے بعد تاریخ ہندوستان میں شاید اپنی نظیر آپ تھا۔

جامعیت حضرت تھانویؒ کے علمی، دینی اور اصلاحی فیوض و برکات اور آپ کی علمی و سماجی خدمات کو اس مختصر مضمون میں سمونا ناممکن ہے، بس اتنا ہی عرض کرنا کافی ہے کہ حضرت تھانویؒ اپنی ذات میں علم و معرفت کا ایک جہاں تھے، وہ جس طرح شریعت کے متبحر عالم تھے، طریقت و سلوک میں بھی اسی طرح مقامِ رفیع پر فائز تھے، آپ کی ذاتِ علومِ ظاہری و باطنی کا مخزن تھی، یوں تو چشمِ فلک نے بڑی بڑی ہستیاں دیکھی ہوں گی مگر شریعت و طریقت کا ایک ایسا حسین امتزاج شاید ہی اس خطۂ ارض پر کسی نے دیکھا ہو گا۔

اصلاحِ ملت و قوم کے سلسلہ میں چند عظیم کارنامے آپ کو ہر وقت اُمت کی اصلاح کی فکر دامن گیر رہتی تھی جس نے آپ کا سونا، جاگنا، رفتار و گفتار، آرام و راحت سب کا سب اسی مشغلہ کے نذر کر دیا تھا، جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی، یا کسی پریشانی کی خبر آتی وہ غم میں اسی طرح گھلنے لگتے تھے جیسے کسی شفیق باپ کی صلبی اولاد پر کوئی مصیبت آتی ہو۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو اس دور میں مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا تھا اس لیے حضرتؒ نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی میں بڑھتی ہوئی تباہیوں اور بربادیوں کو محسوس فرما کر جہاں سینکڑوں اور ہزاروں میل کے

سفر طے کر کے اپنے مواعظ حسنہ، ملفوظات اور عام مجالس کے ذریعہ لوگوں کو انفرادی طور پر اپنی اصلاح و تربیت کی طرف متوجہ کیا، وہاں آپ نے اپنی عظیم تصانیف کے ذریعہ عوام و خواص کی رہبری و رہنمائی فرمائی اور ان کو صحیح دین سے روشناس کرایا، رسوم و بدعات کی تاریکیوں سے نکالا جو مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔

① اسفار آپ نے تبلیغی و اصلاحی سلسلے میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر اپنے مواعظ حسنہ سے لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کیا، اور ہزاروں افراد کے اجتماعات سے خطاب فرمایا، لاؤڈ سپیکر کا رواج نہ ہونے کے باوجود آپ کی آواز نزدیک و دُور سب کو پہنچتی تھی، جسے کرامت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سفرنامے آپ کے کئی سفرنامے مختلف ناموں سے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ مثلاً خیر المحفور فی الکانپور، خیر العبور فی سفر گورکھپور، خیر الحدور فی السفر الثالث الی گورکھپور، سفرنامہ پانی پت، سفرنامہ دیوبند، سفرنامہ گنج مراد آباد، سفرنامہ کوئٹہ، سفرنامہ گنگوہ، سفرنامہ ڈھاکہ، سفرنامہ لکھنؤ، سفرنامہ کانپور، سفرنامہ علی گڑھ، سفرنامہ کراچی، سفرنامہ بہاولپور، سفرنامہ امرتسر، سفرنامہ لاہور۔ اور سفرنامہ جالندھر

② مواعظ و تقاریر آپ کا یہ کارنامہ کہ مختلف دور و نزدیک مقامات پر سفر فرما کر لوگوں کو اپنے مواعظ حسنہ سے مستفید فرمایا جن کا مختصر ذکر اُوپر آ چکا ہے، ایک عظیم کارنامہ ہے، یہ مواعظ چار سو ۴۰۰ کے قریب ہیں۔ جو آپ کی نظر ثانی کے بعد شائع ہو چکے ہیں، جن کو بعض حضرات نے مضامین کی مناسبت سے چھتیس ۳۶ مختلف مجموعوں میں شائع کئے ہیں، حضرت تھانویؒ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی بعض مواعظ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ مثلاً التبشیر، التذکیر، حسن الموعظت، الذکریٰ، اشرف المواعظ، البشریٰ، عید میلاد النبی، ہفت اختر، دعوات عبدیت، البلاغ۔

مواعظ کو قلمبند کرنیوالوں کے بعض اسمائے گرامی ہر شخص کی تمنا ہوتی تھی کہ حضرت کی تقریر اور وعظ کو ضبط کرے مگر یہ

ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی، اس کام کے لیے چند حضرات جو زود نویسی میں مہارت رکھتے تھے انہوں نے از خود رضاکارانہ طور پر یہ خدمت انجام دیکر صدقہ جاریہ میں حصہ لیا، ان حضرات میں سے حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ، حضرت مولانا حکیم محمد مصطفےٰ صاحبؒ، حضرت مولانا حکیم محمد یوسف صاحبؒ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانویؒ، حضرت مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی، مولانا احمد عبدالحلیم صاحب لکھنویؒ، حضرت مولانا اطہر علی صاحب سلہٹیؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ (سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور) حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ، حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا سعید احمد صاحبؒ تھانوی کے اسمائے گرامی سرِ فہرست تھے۔

(۳) ملفوظات

مواعظ کے علاوہ حضرتؒ کی یومیہ مجالس بھی ہوا کرتی تھیں جو مجلسِ عام بعد نماز ظہر تا عصر، اور مجلس خاص جو صبح کسی وقت اور تیسری اخص الخواص کے نام سے منعقد ہوتی تھیں۔ مجلس عام میں ہر کس و ناکس کو حاضری و استفادہ کی اجازت ہوتی تھی، اور مجلس خاص میں صرف بیرونی علماؔ کو حاضری کی اجازت تھی اور اخص الخواص مجلس میں صرف چند مخصوص علماؔ مشائخ کو حاضری کی اجازت تھی۔ ان مجالس میں یہ حضرات اپنے اپنے طور پر ارشادات کو قلمبند کر لیا کرتے تھے، اور پھر بعد نظر ثانی حضرتؒ یہ شائع ہو جاتے تھے۔ ان ارشادات کو ملفوظات کے عنوان سے شائع کیا جاتا تھا یہ ملفوظات مختلف ناموں سے ساٹھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، مثلاً حسن العزیز چار جلد، الافاضات الیومیہ دس جلدوں میں، القول الجلیل چار حصوں میں، مقالات حکمت، مزید المجید، الکلام الحسن، اسعد الابرار، الکلام الجمیل وغیرہ۔ تفصیل مجلس صیانۃ المسلمین کے دفتر واقع جامعہ اشرفیہ سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

ملفوظات ضبط کنندگان کے بعض اسمائے گرامی

ان ملفوظات و ارشادات کو جن حضرات نے ضبط کیا، یوں تو بیشمار حضرات ہیں، مگر ان میں سے چند معروف و مشہور حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں: حضرت (۱) خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ حضرت (۲) مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، حضرت (۳) مولانا حافظ جلیل احمد صاحب شروانیؒ حضرت (۴) مولانا حکیم محمد مصطفےٰ صاحب میرٹھیؒ، حضرت (۵) مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت (۶) مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ حضرت (۷) مولانا اسعد اللہ صاحب سہارنپوریؒ، حضرت (۸) مولانا محمد عیسیٰ صاحب

الہ آبادیؒ، حضرت[۹] مولانا عبدالمجید صاحبؒ بچھرانوی، حضرت[۱۰] مولانا خیر محمد صاحبؒ حضرت[۱۱] مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادیؒ، حضرت[۱۲] مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ اور حضرت[۱۳] مولانا سید محمد ابرار الحق صاحب مدظلہ وغیرہ۔

④ تصانیف

نشر و اشاعت کے اس دور میں حضرتؒ کا یہ عظیم اور امتیازی کارنامہ ہے جو ایک ہزار کے قریب تصانیف پر مشتمل ہے۔ جن کی صرف فہرست ہی چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر علم و فن میں تصنیفات و تالیفات اس قدر فرمائیں کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ متقدمین و متاخرین میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ تفسیر حدیث، فقہ، ادب علم کلام، فلسفہ، تجوید، عقائد، اصولِ فقہ، منطق، معانی، حکمت اذکار، تذکار، سیاست، مکتوبات، متفرقات، غرض کوئی ایسا موضوع نہیں چھوڑا جس پر آپ نے قلم نہ اٹھایا ہو، اور تصوف تو آپ کا خاص موضوع تھا۔

بعض مشہور تصانیف

آپ کی مشہور و معروف تصانیف میں سے تفسیر بیان القرآن (بارہ جلدیں) احکام القرآن (چار جلدیں) اعلاء السنن (۱۸ جلدیں) بہشتی زیور، بہشتی گوہر، التکشف، کلید مثنوی، التشرف، بمعرفۃ احادیث التصوف (چار حصے) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم، مائۃ دروس (سو علوم کی تعریف میں) مثنوی زیر و بم بوادر النوادر البدائع، اصلاح انقلابِ اُمت۔ طریقہ مولد شریف، عید میلاد النبی (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے موضوع پر چند مواعظ کا مجموعہ ہے) امداد الفتاوی (۸ جلدیں) الحیلۃ الناجزہ (جس میں مظلوم اور بے بس عورتوں کے چھٹکارے کی شرعی صورتیں بیان کی گئی ہیں) جمال القرآن، تجوید القرآن، آداب القرآن، زاد السعید، اصلاح الرسوم، تربیت السالک، حیوۃ المسلمین، تبلیغ دین، تعلیم الدین وغیرہ جیسی کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں

سب سے بڑا رسالہ اور سب سے چھوٹا رسالہ

ایک دفعہ حضرت نے ہنس کر فرمایا کہ ایک رسالہ تو میرا بارہ جلدوں میں ہے یعنی تفسیر بیان القرآن اور ایک رسالہ میرا بارہ سطروں میں ہے الیم فی التسنم جو میزان کل ہے تمام سلوک کی (القول الجلیل)

وقت میں برکت

حضرتؒ کے وقت میں حق تعالیٰ نے ایسی برکت عطا فرمائی تھی جس میں بہت سے کام ہو جاتے تھے، رسالہ الابتلاء، سولہ[۱۶] صفحے کا تین گھنٹہ میں،

ایک جلسہ میں لکھی، جس کی جامعیت حیرت انگیز ہے، ایک تقریر بحیثیت صدر مجلس میرٹھ کے جلسہ موتمر انصار میں پڑھی تھی جو بتیس "۳۲" صفحے پر ہے جو دعار الامت و بداۃ الملت کے نام سے شائع ہوئی ہے وہ صرف پانچ گھنٹہ میں لکھی گئی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "تھوڑے وقت میں اتنی تصانیف کا ہوجانا یہ سب حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے" اور فرمایا کہ مکہ معظمہ میں حضرت مرشدیؒ کے حکم سے کتاب تنویر کا ترجمہ لکھا کرتا تھا اور حضرت کو سنا بھی دیتا تھا، ایک بار حسبِ معمول سنایا تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ کتنی دیر میں لکھا ہے، میں نے عرض کیا کہ اتنے وقت میں لکھا ہے، فرمایا اتنے سے وقت میں تو کوئی بھی اتنا مضمون نہیں لکھ سکتا، اور بہت دعائیں دیں۔ (القول الجلیل)

کسی کتاب کے حقوق کو محفوظ نہیں کرایا

حضرت تھانویؒ نے اپنی کسی ایک کتاب کا بھی حقِ تصنیف محفوظ نہیں کرایا جب کہ اکثر مصنفین حضرات اپنی تالیفات و تصنیفات کو اپنے لیے، اپنے اہل و عیال کے لیے، اور اپنی تنظیم کے لیے ذریعہ آمدنی بناکر جاتے ہیں، مگر حضرتؒ نے اس کو پوری امت کے لیے وقف فرماکر اور اشاعت عام کی اجازت فرما کر آج کی دنیا میں ایک انفرادی اور لاثانی کارنامہ انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصانیف کی کثرت اشاعت کی، کہ آپکی تصانیف کو ہر ایک نے شائع کیا، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، حضرتؒ کی تصانیف جو حضرت کی زندگی میں طبع ہوچکی ہیں ان کی مجموعی قیمت چالیس لاکھ روپے سے کم نہیں، یہ تخمینہ سنہ ۱۹۴۳ء کا ہے۔ آج کے حساب سے اس کو کم از کم دس گنا کرلیجئے۔ حضرت کی سیر چشمی اور فیاضی، خلوص اور للہیت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ کتابوں کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوجود آپ نے کبھی کسی کتاب کا حق اشاعت اپنے لیے محفوظ نہیں کیا اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کے وصال کے بعد ان کے شرعی ورثاء میں سے بھی کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی، یہ بھی انہی کی تعلیم و ذہنیت اور للہیت کا اثر ہے۔

اردو زبان کی خدمت

اس وقت ہند و پاک کے اکثر باشندوں کی زبان اردو ہے۔ یہ زبان مغلیہ خاندان کے دورِ آخر میں کافی ترقی کرچکی تھی مگر ہندوستان پر جب انگریزوں کی حکومت ہوئی تو اردو کی ترقی میں رکاوٹ ہوگئی، مگر ہمارے بزرگوں کا اردو زبان پر بڑا احسان ہے کہ پروا کیے بغیر اسی زبان میں دین کی خدمت کی نتیجہ یہ نکلا کہ اردو ادب آہستہ آہستہ کتابوں اور علوم سے مالا مال ہوتا چلا گیا، حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جو عالم اسلام کی

مشہور شخصیت گزری ہے اور جو عربی کے علاوہ کسی اور زبان کی کتابوں کو دیکھتے ہی نہیں تھے، ان کا ارشاد ہے جب سے میں نے حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن (جو بارہ جلدوں میں ہے) مطالعہ کیا ہے اس وقت سے اُردو کی کتابیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، اور معلوم ہوا کہ اُردو زبان میں بھی اتنی استعداد اور قابلیت ہے کہ اس زبان میں بھی علوم مرتب و مدون ہو سکتے ہیں۔" حضرت تھانویؒ کی اکثر کتابوں کی زبان اُردو ہے ملک کے بڑے بڑے ادیبوں اور نامور مصنفوں نے ان کو اُردو ادب کا محسن اعظم کہا ہے اور بارہا ایسا ہوا کہ دہلی یا لکھنؤ یا علی گڑھ میں جب ہزاروں کے مجمعے میں وعظ ہوا بعض اردو ادب کے مشہور ماہرین اور نقاد اس غرض سے شریکِ مجلسِ وعظ ہوئے کہ وہ بظاہر اس دیہاتی عالم کی تقریر میں اُردو ادب کی اغلاط پکڑیں۔ مگر بعد میں انہوں نے اعتراف کیا کہ کئی کئی گھنٹے کی تقریر میں کسی ایک جگہ بھی گرفت نہیں کی جا سکتی۔

۵ خلفاء کرام

آپ اپنے بعد کے لوگوں کے لیے ایک ایسی عظیم اصلاح یافتہ جماعت چھوڑ گئے جو انہی کے اندازِ تربیت پر قوم و ملت کی اصلاح و تربیت کرے، چنانچہ ایسے حضرات جن پر حضرت کو مکمل اعتماد ہو گیا کہ یہ لوگ اصلاح و تربیت کے اہل ہو گئے ہیں ان کو بیعت و تلقین کی اجازت مرحمت فرما کر خلافت سے نوازا، ان میں سے بعض حضرات تو وہ ہیں جن کو بیعت و تلقین دونوں کی اجازت ہے اور بعض وہ ہیں جن کو صرف تلقین کی اجازت ہے، بیعت کی اجازت نہیں، پہلی قسم کے حضرات کو "مجازِ بیعت" اور دوسری قسم کے حضرات کو "مجازِ صحبت" کا لقب دیا گیا، ان دونوں قسموں کے حضرات کی مجموعی تعداد (۱۶۹) ہے، ان حضرات میں سے چند کے نام لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ امرتسری بانی جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوریؒ، حضرت مولانا عبدالباری ندوی صاحبؒ، حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شروانیؒ (بانی مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان) حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ بنگلہ دیشی، حضرت مولانا حکیم محمد مصطفےٰ صاحبؒ میرٹھی، حضرت مولانا عبدالمجید صاحب بچھرانویؒ، حضرت مولانا شاہ محمد وصی اللہ صاحب اعظم گڑھیؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ، حضرت مولانا قاضی عبدالسلام صاحب نوشہرویؒ، استاذ العلماء حضرت مولانا رسول خان صاحب ہزارویؒ، حضرت مولانا محمد یوسف

صاحب بنوریؒ، بانی جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ بانی دارالعلوم کراچی، حضرت مولانا مفتی واحد بخش صاحب بہاولپوریؒ، حضرت مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلویؒ حضرت مولانا شبیر محمد صاحب سندھیؒ حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب جلال آبادی مدظلہ، حضرت مولانا سید محمد ابرارالحق صاحب ہردوئی مدظلہ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب لکھنویؒ، حضرت مولانا عبدالوہاب صاحبؒ ہاٹ ہزاری (بنگلہ دیش) حضرت مولانا الحاج محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملتان، حضرت مولانا شاہ فقیر محمد صاحب مدظلہٗ پشاور، حضرت مولانا الحاج محمد اللہ صاحب ڈھاکوی رحمۃ اللہ علیہ بنگلہ دیش،

(۶) مجلس صیانۃ المسلمین اجتماعی اصلاح کا پروگرام

اور صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اُن کی انفرادی اصلاح کے لیے صرف تالیفات و مکتوبات، ملفوظات و مواعظ کا ذخیرہ چھوڑا یا خلفاء تربیت کنندگان کی ایک عظیم جماعت تیار کی ہو، بلکہ مسلمانوں کے لیے اجتماعی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے ایسا نظام العمل مرتب فرما گئے اگر سب مسلمان مل جل کر اس نظام کو اجتماعی شکل میں اپنائیں تو جتنے مصائب آرہے ہیں وہ انشاء اللہ سب دور ہو جائیں حضرتؒ نے یہ نظام ۱۹۳۰ء میں مرتب فرما کر قوم و ملت کے سامنے پیش کیا جس کی طرف قوم نے تا ہنوز کما حقہ توجہ نہیں کی لیکن حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شروانیؒ نے اپنے زیر نگرانی جاری کیا اور یہی وہ مجلس صیانۃ المسلمین ہے جس کی نشاندہی آل انڈیا مسلم لیگ کے منعقدہ اجلاس کی طرف سے ۲۳ر اپریل ۱۹۴۳ء میں شرکت کے لیے دعوت نامہ کے جواب میں کی اور فرمایا کہ اگر مجھے سفر سے عذر مانع نہ ہوتا تو میں ضرور شرکت کرتا، لیکن میں اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیام عمل ہیں، ایک حیوۃ المسلمین جو شخصی اصلاح کے لیے ہے دوسرے صیانۃ المسلمین جو جمہوری نظام کے لیے ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے دعوت نامہ اور اس کے جواب کا پورا مضمون تعارف صیانۃ المسلمین میں ملاحظہ فرمائیں جو دفتر مجلس صیانۃ المسلمین جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ حضرتؒ نے کس اہتمام اور کس دل سوزی سے مسلم لیگ کے ارکان کو ان دونوں کتابوں کی طرف توجہ دلائی، اور اس نظام عمل پر حضرت تھانویؒ کو

کتنا اعتماد تھا، یقیناً مسلم لیگ اگر حضرت تھانویؒ کی ان کتابوں کو مشعلِ راہ بناتی تو آج صورتِ حال مختلف ہوتی۔ مجلس صیانۃ المسلمین کا مقصد اسلام کے بنیادی اصول، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، معیشت اخلاق اور صحیح سیاست کی طرف انفرادی و اجتماعی طور پر خاص توجہ دلانا ہے تاکہ مسلمان کامل اور مکمل مسلمان بن کر ترقی کریں۔ پاکستان بننے کے بعد حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شروانیؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) کے زیر سرپرستی لاہور میں ۱۹۵۳ء میں اس کی بنیاد رکھی، بفضلہ تعالیٰ اس دن سے اور آج تک ملک کے گوشہ گوشہ میں مجلس کی متعدد شاخیں قائم ہو گئیں، سینکڑوں حضرات نے اپنا اصلاحی تعلق بزرگوں سے جوڑا، اور ہزاروں افراد دین کی طرف متوجہ ہوئے، متعدد شہروں میں لائبریریاں قائم کی گئیں، سالانہ اجتماعات کے ذریعہ اہل اللہ سے استفادہ کا موقع عنایت کیا جاتا ہے تفصیلات کے لئے "مجلس کا تاریخ وار جائزہ" ملاحظہ فرمائیں۔

تحریکِ آزادی میں حضرت کا حصّہ اور آپ کا سیاسی نظریہ

دینی مسائل ہوں یا دنیوی، ایک مصلحِ اُمّت جب ان کو پرکھے گا تو اس کی کسوٹی صرف کتاب و سُنّت ہی ہو گی، حضرت تھانویؒ مروجہ سیاست سے بالکل الگ رہتے تھے ورنہ وہ دین نہیں جس میں سیاست نہ ہو اور وہ سیاست نہیں جو شریعت اسلامیہ کے تابع نہ ہو۔ اس لیے جن اکابر علماؒ نے ان میں حصّہ لیا انہوں نے دین و شریعت کو غالب رکھا، یہ موقع تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے صرف اتنا بتانا ہے کہ حضرتؒ نے ہمیشہ مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا ان کے دین اور دنیا کے لیے نقصان دہ سمجھا، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کے سینکڑوں ارشادات آپ کے مطبوعہ ملفوظات میں شائع ہو چکے ہیں جن میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے کانگریس کی شرکت کو دینی اور دنیوی لحاظ سے نقصان دہ بتایا ہے اور مسلم لیگ میں شرکت کا فتویٰ بھی آخر میں شرائط کے ساتھ صادر فرمایا، جس کا اثر یہ ہوا کہ جو عام مسلمان اور علماء پریشان اور منتظر تھے کہ ہم کس جماعت کا ساتھ دیں، وہ حضرتؒ کے اس فتوے کے بعد جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے مسلم لیگ کو بھی علماء و مشائخ کی ایک عظیم قوت حاصل ہو گئی۔ علامہ اقبال مرحوم ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں

کے بڑے ہمدرد اور پاکستان کی بنیادیں مضبوط کرنے والے معمار کی حیثیت رکھتے ہیں اور مشہور ہے کہ پاکستان کا نظریہ سب سے پہلے علامہ صاحب مرحوم کی دوررس نظر میں سامنے آیا، یہ زمانہ ۱۹۳۰ء کا ہے۔ مگر اتنی بات ضرور کہی جائے گی کہ علامہ صاحب مرحوم کے اس بیان میں لفظ پاکستان کہیں نہیں ہے، اس سلسلہ میں یہ کہنا کوئی غلط اور تاریخ کے خلاف نہ ہوگا کہ اس سے بھی پہلے پاکستان کے نظریہ کے بانی حضرت تھانویؒ ہی تھے۔ چنانچہ حضرتؒ کے فرمائے ہوئے ارشادات سے جو ۱۹۲۸ء کے قریب کے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ نے پاکستان کا نظریہ نہایت وضاحت سے پیش کیا، ہند و پاک کے مشہور و معروف فلسفی اور تاریخ نویس مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب مرحوم لکھتے ہیں

"کہ یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں تھانہ بھون میں حضرت کی مجلس میں کان میں پڑی ہیں۔" اور آگے چل کر اپنی کتاب حکیم الامت اور انداز سخن میں لکھتے ہیں کہ بندہ نے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پاکستان کی یوں تجویز رکھی کہ

"جی چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین، تعزیرات وغیرہ کا اجرا احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال قائم ہو، نظام زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں، مسلمانوں کو اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوؤں سے مل کر یہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔

حضرتؒ کے اس فتوے کی اشاعت کے بعد علمائے کرام اور علمائے دیوبند نے اور خصوصاً حضرت تھانوی کے متوسلین مثلاً شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانویؒ، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ عثمانی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، حضرت مولانا اطہر علی صاحبؒ (سابقہ مشرقی پاکستان) اور حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جس جانفشانی اور تندہی سے رات دن کام کیا — وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ سرحد ریفرنڈم اور سلہٹ ریفرنڈم میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی، خود قائدین کو بھی اس کا اقرار اور احساس تھا۔ چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے ڈھاکہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانویؒ اور کراچی میں حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندیؒ سے اولین پرچم کشائی کرائی۔

پاکستان کے متعلق ایک پیشین گوئی

نیز حضرتؒ نے ۳۸ء میں پاکستان کے متعلق ایک پیشین گوئی بھی فرمادی تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ ۴۷ء میں پوری ہوئی۔ اپنے ایک برادرِ نسبتی سعید احمد صاحب مرحوم سے فرمایا کہ:

" مجھے تمہارے خیالات کا (جس کا اظہار تم نے اپنی ہمشیرہ سے کیا تھا اس کا) علم ہوا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں مجھے بہت سے مجذوبوں نے بتلا دیا ہے، کہ اسلامی سلطنت ۴۷ء میں قائم ہوجائے گی۔ (مولانا اشرف تھانوی اور تحریک آزادی پروفیسر احمد سعید)

قائداعظم کی نظر میں

ایک مرتبہ قائدِ پاکستان سے بمبئی کے تجار نے کہا کہ کانگریس کے ساتھ تو علماء کی ایک کثیر جماعت ہے، آپ کے ساتھ (یعنی مسلم لیگ کے ساتھ) کون ہے۔ قائدِ پاکستان نے کہا کہ:

مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے، جس کا علم و تقدس اور تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم و تقدس اور تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ اُن کا پلڑا بھاری ہوگا، وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں۔

مثالی نظم وضبط

(اس سلسلہ میں منشی عبدالرحمٰن خان صاحب ملتانی کی کتابیں سیرت اشرف' تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی اور پروفیسر احمد سعید صاحب کی کتاب مولانا اشرف علی تھانویؒ اور تحریک جدوجہد آزادی ملاحظہ فرمادیں) حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے۔ کہ دینداری اور لاابالی پن مترادف دکھائی دینے لگے ہیں اور عوام تو عوام' اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ دیندار کے پاس نہ کسی ضابطہ کی حاجت ہے نہ "قواعد کی اور نہ کسی نظم وضبط کی' حالانکہ ایک سچے مومن ہی کی زندگی نظم وضبط کا بہترین نمونہ ہوسکتی ہے، حکیم الامت کی مجددانہ شان کا یہ وصف بھی بہت ممتاز ہے آپ نے خارجی زندگی اور داخلی زندگی کا ایک ایسا اصُولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اہلِ حق ایسے بھی ہوتے ہیں آپ کا ہر کام نظم وضبط کے تحت ہوتا تھا ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر تھا، اس وقت میں صرف وہی کام انجام دیتے" اور اس اصول پر تا زندگی قائم رہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا، اور بدنظمی کے بارے میں خود فرماتے تھے کہ "مسلمانوں کی بربادی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ انتظام اور اصول کی پابندی

نہیں۔ الخ۔ غرض کہ حضرت تھانویؒ نے اپنے اوقاتِ کار کا ایک نظام بنا رکھا تھا، یہ وقت تصنیف و تالیف کا ہے، یہ وقت گھر میں جانے کا ہے، یہ وقت احباب و متعلقین سے ملنے کا ہے یہ وقت عبادت کا ہے، یہ وقت مجلس عام کا ہے، یہ وقت مجلس خاص کا ہے، سارے اوقات حضرتؒ کے یہاں نظام کے سانچے میں ڈھلے ہوتے تھے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

خارجی زندگی

حضرت کے اوقات اس طرح بٹے ہوئے تھے کہ صبح کی نماز کے بعد سیر کے لیے تشریف لے جاتے، اسی دوران تلاوت کلام پاک اور کبھی کبھی بعض ہمراہیوں کو جن میں بڑے بڑے علماء و مشائخ ہوتے تھے، پند نامہ کا سبق پڑھاتے تھے، واپسی پر اشراق نماز اور ناشتہ کے بعد ۱۲ بجے تک متفرق کاموں کو انجام دیتے، مثلاً بعض خطوں کے جوابات لکھتے اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے، ۱۲ بجے کے بعد دولت خانہ تشریف لے جاتے، وہاں کھانا کھاتے۔ کچھ آرام فرماتے پھر ظہر کی نماز کے لیے خانقاہ تشریف لاتے ظہر سے عصر تک مجلس عام فرماتے، اسی میں خطوط کے جوابات آنے والوں سے ملاقات، ان کے استفسارات کے جوابات، تعویذ لینے کے لیے آنے والوں کو تعویذ عطا فرماتے اسی وقت سر مبارک میں تیل لگواتے، اور اسی دوران علمی اصلاحی اور تربیتی مضامین کا بھی بیان ہوتا، گویا دو ڈھائی گھنٹے کے وقفے میں اتنے کام انجام دیتے۔

داخلی زندگی

خارجی زندگی میں آپ کا ہر کام تنظیم اور اصول کے تحت ہوتا، ایسے ہی گھر تشریف لا کر وہاں بھی ہر کام نظم و ضبط کے تحت انجام دیتے، آپ جیسے باہر رہتے تھے ویسے ہی گھر میں رہتے تھے گھر کے اوقات کو بھی تقسیم کر رکھا تھا، گھر میں تشریف لے جا کر حتی المقدور اپنا کام خود ہی کر لیا کرتے تھے، جو چیز جہاں سے اٹھاتے فارغ ہونے کے بعد اسی جگہ رکھ دیتے تھے اور لوگوں کو بھی یہی تعلیم تھی اس سے جانبین کو راحت ملتی ہے خانقاہ سے آنے کے بعد گھر میں داخل ہونے کے وقت اطلاع دیکر اندر داخل ہوتے، بغیر اطلاع کبھی اندر داخل نہیں ہوئے۔ اور جب گھر سے خانقاہ تشریف لے جاتے تو پہلے پوچھ لیتے تھے کہ میں خانقاہ جا رہا ہوں، کوئی کام تو نہیں ہے، اگر ہوتا فوراً کر جاتے، ورنہ تشریف لے جاتے۔ سخت لہجہ سے بات نہ فرماتے ہمیشہ نرم اور پیارے انداز سے بات کرتے، الا یہ کہ کوئی اصول کے خلاف کام کرے، تو پھر اس کی اصلاح کے لیے زجر و توبیخ فرماتے۔

ذاتی اوصاف و حالات اور اخلاق فاضلہ

صورت و شکل کے اعتبار سے حضرت کی شخصیت حسن و وجاہت و حسین امتزاج تھی، نورانی صورت، گندمی رنگ، درمیانہ قد، سینہ کشادہ، رعب دار چہرہ، صحت عموماً اچھی رہتی تھی۔ کیونکہ صحت کا بہت خیال رکھتے تھے، صبح ہوا خوری، سیر، سر کی مالش، آنکھوں میں سرمہ لگانا، رات کو سوتے وقت دودھ پینا، جلدی ہضم ہو جانے والی غذاؤں کا استعمال رکھنا یہ ان کے ذاتی معمولات تھے۔ جس کام کو شروع فرماتے تھے، جب تک وہ ختم نہ ہو جاتا ادھورا نہ چھوڑتے، اسی لیے حضرتؒ نے زندگی میں وہ بڑے بڑے کام انجام دیئے جو کسی دوسرے سے اس کا پانچواں حصہ بھی نہیں ہو سکتا تقریباً ایک ہزار کتابیں لکھیں، ہند و پاکستان کا غالباً کوئی ایسا ضلع نہیں ہوگا کہ جہاں حضرتؒ وعظ و تبلیغ کے لیے تشریف نہ لے گئے ہوں، اور ایک اہم بات یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ حضرتؒ نے سوائے آمد و رفت کے کرایہ کے کبھی کسی سے وعظ و تقریر کا نہ معاوضہ لیا۔ اور نہ سفر میں کسی سے ہدیہ قبول کیا بلکہ بسا اوقات آمد و رفت کا خرچ بھی اپنی جیب سے فرماتے، اس مختصر تحریر میں حضرتؒ کے فاضلانہ اوصاف و حالات کا تحریر کرنا ناممکن ہے اس لیے اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا،

(تفصیل کے لیے اشرف السوانح حصہ سوم کا چوبیسواں صفحہ ملاحظہ فرماویں۔

ازواج محترمات

حضرتؒ نے دو شادیاں فرمائی تھیں، ایک گنگوہ میں جو سنہ ۱۹۲۸ء میں ہوئی یہ نکاح حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے پڑھایا تھا، یہ بی بی صاحبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے بیعت تھیں، اور بہت ہی پارسا اور متقیہ تھیں، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی اور دوسری اپنے بھانجے مولانا سعید احمد صاحب تھانویؒ کے انتقال کے تقریباً ایک سال بعد وسط رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۴ھ میں ان کی بیوہ سے شادی کی، لیکن ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی بھی یہی خواہش تھی کہ "جیسے میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ان سے نکاح ہوا تو مولانا سعید احمد صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی ان کے ہمراہ تھیں، جن کی پرورش حضرتؒ نے ہی فرمائی اور وہ حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ کے نکاح میں آئیں۔ دونوں ازواج محترمات، بفضلہ تعالیٰ شفیق، غربا پرور، متوکل،

قانع، مہمان نواز اور حضرتؒ کی خدمت گزار رہیں، حضرتؒ نے اپنے اس دوسرے عقد کی جو باتیں رسالہ اصلاح انقلاب میں تحریر فرمائی ہیں، جس کا عنوان الخطوب المذیبہ للقلوب المنیبہ ہے اس میں ملاحظہ فرمائیں۔ پہلی اہلیہ محترمہ حضرتؒ کی وفات کے چند سال بعد وفات پاگئیں، اور حضرتؒ کے ہی پہلو میں دفن ہوئیں، دوسری اہلیہ محترمہ بفضلہٖ تعالیٰ ابھی حیات ہیں، اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کے پاس مقیم ہیں۔

بے مثال عدل و انصاف

شریعت میں چار تک کی شادیوں کی اجازت ہے، مگر جب کہ اختیاری امور میں عدل و انصاف کو قائم رکھ سکے، اور اگر اس پر قادر نہیں تو پھر اس کی اجازت نہیں، حضرتؒ نے جب دوسری شادی فرمائی تو پہلی اہلیہ محترمہؒ نے فرمایا کہ "تم نے اپنے متعلقین کے لیے دوسری شادی کرنے کا دروازہ کھول دیا ہے اب لوگ دھڑا دھڑ دوسری شادی کیا کریں گے" فرمایا "میں نے عقد ثانی کا دروازہ کھولا نہیں بلکہ بند کردیا ہے، کیونکہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ دو بیویوں میں اتنی رعایت کرنی پڑتی ہے تو اس کو دشوار سمجھ کر عقد ثانی کی ہمت ہی نہ کرسکیں گے۔" چنانچہ حضرتؒ نے عقد ثانی کی دشواریوں ہی کا ذاتی تجربہ فرما کر اس مضمون میں جو اپنے عقد ثانی کے متعلق اصلاح انقلابِ اُمت میں تحریر فرمایا ہے دوسروں کو یہ نصیحت فرمائی ہے ع

من نہ کردم شما حذر بکنید

حضرتؒ کو عدل کا اس قدر اہتمام تھا کہ شاید ہی کسی سے سننے میں آیا ہو، اور چونکہ حضرتؒ کو حقوق العباد کا بہت ہی اہتمام تھا اور دوسروں کو بھی اسی کی تعلیم ہوتی تھی، اسی لیے حضرتؒ خود بھی اس کا اہتمام فرماتے تھے، اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ فرمایا کہ "میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے اور یہ حق تلفی ہے" اور فرمایا اسی طرح اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں، کیونکہ اگر میں ایک گھر میں رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت پیدا ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔" نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے تھے وہ دونوں کو برابر دیتے تھے اور اس کا یہاں تک اہتمام تھا کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کے لیے جو وزن کی جاتی

ہیں ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی خانقاہ میں نشست گاہ کے سامنے لگا رکھا تھا جس کو مزاحاً "میزان عدل" فرمایا کرتے تھے، کھانا بھی ایک دن ایک گھر میں، اور ایک دن دوسرے گھر میں تناول فرماتے تھے، اسی طرح رمضان المبارک میں افطار کے وقت پہلی اہلیہ محترمہ کے گھر اور سحر کے وقت دوسری اہلیہ مدظلہا کے گھر سے کھانا کھاتے آپؒ کی برادری میں ادائے مہر کا دستور نہیں تھا مگر حضرتؒ نے دونوں گھروں میں مہر بھی ادا فرما دیا تھا، حالانکہ آپ کی پہلی اہلیہ محترمہ نے آپ کو اپنا پانچ ہزار حق مہر بخوشی معاف کر دیا تھا لیکن پھر بھی آپ نے وہ پانچ ہزار روپیہ انہیں ادا فرما دیا، آپ فرماتے تھے کہ اگر عورت معاف بھی کر دے تب بھی مرد کی غیرت کا مقتضا یہی ہونا چاہیے کہ وہ پھر بھی مہر ادا کر دے۔ اس مختصر فہرست سے اندازہ فرما لیا جائے کہ حضرتؒ کے یہاں عدل، مساوات اور احتیاط کا کس درجہ اہتمام رہا۔

ایک عجیب واقعہ

حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب جلال آبادی مدظلہ نے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ ایک دن مجلس میں ایک دیہاتی دو تربوز لے کر حاضر ہوا، حضرتؒ نے پوچھا بھائی! یہ دو تربوز کیسے ہیں؟ اس نے کہا کہ میرے دو بیویاں نہیں ہیں کیا؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ہاں بھائی ہیں تو! تو اس نے کہا کہ ایک ایک بیوی کے لئے دوسرا دوسری بیوی کے لئے، حضرت نے فرمایا کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ دونوں برابر ہیں یا کم و زیادہ، اس نے کہا میں دونوں وزن کر کے لایا ہوں، دونوں ہم وزن ہیں، پھر فرمایا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ کونسا میٹھا ہے اور کونسا پھیکا، اور کونسا سرخ ہے اور کونسا نہیں؟ تو اس نے کہا کہ میں اندر تھوڑا ہی گھسا ہوں جو دیکھتا کہ اندر سے کیسا ہے، تو حضرتؒ نے دونوں کو نصف نصف کر کے ایک کا نصف دوسرے کے نصف کے ساتھ، اور دوسرے کا نصف پہلے کے نصف کے ساتھ کر کے خادم کو دونوں گھر پہنچانے کا حکم دیا، یہ صورت دیکھ کر اس دیہاتی نے عرض کیا کہ مولوی جی! اوں تو بڑی تکلیف میں ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی! یہاں کی تھوڑی سی تکلیف گوارا ہے، آخرت کی بڑی تکلیف سے، یہ ایک مثال ہے حضرتؒ کے عدل و انصاف کی ورنہ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جو اشرف السوانح میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اپنے مخالفین کے ساتھ بے مثال وسعت قلبی کا مظاہرہ

حضرت تھانویؒ کے یہاں جہاں اور باتوں میں وسعت تھی، وہاں اس معاملہ میں بھی وسعت تھی کہ حضرتؒ اپنے متعلقین کو اپنے مخالفین سے ملنے ملانے میں کبھی رکاوٹ نہیں

ہے، یہ مخالفت خواہ سیاست و مسلک کی بنا پر ہو یا مشرب کی بنا پر، حتیٰ کہ بعض ایسے حضرات کو بھی خلافت سے نوازا جن کو حضرتؒ سے مناسبت بھی نہیں تھی، اس سلسلہ میں دو واقعے ملاحظہ فرمائیں

واقعہ نمبر ۱

فرمایا کہ "میں نہایت خوش دلی سے اپنے احباب کو اجازت دیتا ہوں کہ جن حضرات کو مجھ سے کشیدگی ہے ان سے میری وجہ سے اپنے تعلقات کو نہ بدلیں اور نہ چھوڑیں، بلکہ ویسے ہی تعلقات رکھیں جیسے کہ پہلے سے آپس میں رہیں، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے احباب کے تعلقات میں بے لطفی ہو، اور خدانخواستہ وہ کشیدگی والے بھی میرے دشمن نہیں، نیز پس پُشت جو بھی کرتے ہوں، یا کہتے ہوں، مگر سب سامنے آکر نیازمندی ہی کا برتاؤ کرتے ہیں، اور میں اپنے اس خلق کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی برکت سمجھتا ہوں، اور یہ بھی انہیں کی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ مخالف سے مخالف بھی سامنے آکر سرنگوں ہو جاتا ہے۔ ورنہ میرے اندر ایسی کوئی چیز نہیں جس کا یہ اثر ہو، نہ مجھ میں کوئی علمی ہی قابلیت ہے نہ خاندانی ہی وجاہت ہے، نہ کوئی جاہی قوت ہے، ایک غریب آدمی ہوں، غریب شیخ زادہ کا لڑکا ہوں، پھر یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے سب حق تعالیٰ کا فضل اور حضرت حاجی صاحبؒ کی برکت اور دعاؤں کا ثمرہ ہے، اسی کی فرع ہے کہ میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ اس معاملہ میں آزادی دیتا ہوں کہ میری وجہ سے ایسے دوستوں سے جن کو مجھ سے کشیدگی ہے بے لطفی اور بے تعلقی نہ پیدا کریں۔ اگر ان سے تعلقات رکھے جائیں تو مجھ پر بحمد اللہ ذرہ برابر اثر نہ ہوگا، البتہ اس کے عکس پر تعجب نہیں کہ اثر ہو (ملفوظات الافاضات الیومیہ حصہ چہارم)

واقعہ نمبر ۲

حضرت بابا نجم احسن صاحبؒ پرتاپ گڑھی خلیفہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ حضرتؒ نے ایک صاحب کو اجازت بیعت دیتے وقت فرمایا کہ "گو ان کو مجھ سے مناسبت نہیں ہے مگر دین سمجھ گئے ہیں، امید ہے کہ کام کریں گے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے حضرتؒ نے دین کو اپنی طبیعت پر غالب کر لیا تھا۔ (ذکر احسن ص ۲۰)

واقعہ نمبر ۳

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی مرحوم جن کا ہمیشہ حضرت تھانویؒ سے اختلاف رہا۔ اور صرف اختلاف ہی نہیں بلکہ کفر کے فتوے لگائے گئے، مگر حضرت تھانویؒ نے ہمیشہ ان کے بارے میں کوئی نامناسب اور نازیبا لفظ تک نہیں فرمایا، جواب میں کفر کے فتوے تو کیا لگاتے بلکہ یہ فرماتے کہ "ممکن ہے ان کی مخالفت کا سبب واقعی حبِ رسول ہی ہو اور وہ غلط فہمی

سے ہم لوگوں کو نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا سمجھتے ہوں"۔ اور اس لئے ہمیں کافر کہتے ہوں اور خدا کے نزدیک وہ اس میں معذور ہوں"۔ اور

مخالفین کے ساتھ حسن ظن

فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میرے قلب میں کسی بزرگ کی طرف سے محض فروعی اختلاف کی بنا پر بدعقیدگی پیدا نہیں ہوتی، بشرطیکہ ان میں بزرگی کے آثار غالب ہوں، اللہ، اللہ کرنے والوں سے حسن ظن ہی رکھتا ہوں، گو وہ حضرات بعض غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کے اقوال وافعال کو شریعت پر منطبق کیا جائے بلکہ مغلوب الحال بزرگوں کے اقوال وافعال کی یہ تاویل کر لیتا ہوں کہ بوجہ مغلوبیت معذور ہیں، یا جو اجتہادی امور ہیں ان میں اجتہادی اختلاف کی گنجائش سوئے ظن سے مانع ہو جاتی ہے۔

(سیرت اشرف ص ۵)

مخالف علماء کرام کا احترام

فرمایا کہ، علماء جیسے بھی ہیں ان علماء کے وجود کو دین کی بقاء کے لئے اس درجے ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سارے علماء ایسے مسلک کے بھی ہو جائیں جو مجھے کافر کہتے ہیں، تو میں پھر بھی ان کی بقاء کے لئے دعا مانگتا رہوں گا، کیونکہ گو وہ بعض مسائل میں غلو کریں اور مجھ کو برا بھلا کہیں لیکن وہ تعلیم تو قرآن وحدیث ہی کی دیتے ہیں، ان کی وجہ سے دین تو قائم ہے میں ان علماء کو دہری مدعیان اسلام کے مقابلہ میں ہزار درجے غنیمت سمجھتا ہوں جو سرے سے دین ہی کو اڑانا چاہتے ہیں، اور خدا جانتا ہے کہ اس وسعت رائے میں میری کوئی ذاتی مصلحت نہیں بلکہ اس کا منشاء حفظ حدود ہے۔ (اشرف السوانح حصہ اول)

دیکھا آپ نے حضرتؒ کا ظرف اور آپ کی وسعت قلبی، کہ اپنے مخالفین کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ ہمیشہ اللہ اللہ کرنے والوں کا ادب فرماتے تھے، خواہ اس کا تعلق کسی ملک سے ہو چنانچہ آپ فرماتے تھے کہ میں نے ہمیشہ اللہ اللہ کرنے والوں کا ادب کیا ہے، گو ان سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں، حالانکہ میں صاحب فتوے ہوں مگر اہل اللہ پر فتوے کبھی جاری نہیں کیا، سب اہل اللہ سے میں نے دعائیں ہی لی ہیں۔

اتحاد و اتفاق کی جڑ اور بنیاد

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ فرماتے تھے کہ اتحاد کی جڑ تواضع ہے، اگر ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے کمتر جانے، پھر اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، اور تواضع کا نہ ہونا ہی جڑ اور بنیاد ہے حکومتوں، پارٹیوں

جماعتوں، انجمنوں اور مجلسوں کے اندر افتراق اور انتشار کی، - اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ ایک عجیب جملہ فرماتے تھے کہ "اپنے مسلک و مشرب کو چھوڑو نہیں، اور دوسرے کے مسلک کو (بلا وجہ شرعی) چھیڑو نہیں"، اور مجلس صیانۃ المسلمین کی دعوت چونکہ تمام مسلمانوں کو ہے، اس لیے مجلس کے تمام متعلقین کو چاہیئے کہ حضرت تھانویؒ کے اس جملہ کو مضبوطی سے اپنے پلے باندھ لیں۔

بزرگان عصر کے تاثرات

یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ تمام اللہ اللہ کرنے والوں سے ملتے اور ان سے دعائیں کراتے خواہ وہ اپنے مسلک کے ہوں یا غیر مسلک کے، چنانچہ ہر بزرگ نے آپ کا احترام اور آپ سے محبت اور عقیدتمندی کا مظاہرہ کیا، اور آپ کی تعریف کرنے پر مجبور ہوئے۔ مثلاً

حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنیؒ

یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند خلیفہ مجاز حضرت گنگوہیؒ نے بھی آپ کی مجددیت کا اعتراف فرمایا ایک صاحب کے سوال کے جواب میں حضرت مدنیؒ نے فرمایا "کہ بیشک وہ (حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) مجدّد تھے، انہوں نے ایسے وقت میں دین کی خدمت کی جب کہ دین کو بہت احتیاج تھی"۔ (مولانا سیّد فرید الوحیدی صاحب واقعات ص۱۶۳)۔

حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب کاندھلویؒ

حضرت مولانا محمد یحیٰی صاحب کاندھلویؒ خلیفہ مجاز حضرت گنگوہیؒ نے ایک بار فرمایا تھا کہ "اب تک میرا گمان تھا کہ اس صدی کے مجدد حضرت مولانا گنگوہیؒ تھے، لیکن اب میرا یہ خیال ہے کہ ہمارے مولانا کا فیض تو خاص تھا، زیادہ تر علماء آپ سے فیض یاب ہوئے، لیکن میں اب دیکھ رہا ہوں، کہ مسلمانوں کو اس وقت عام نفع مولانا تھانویؒ سے بہت پہنچ رہا ہے اس لئے مجدّدیت کی شان ان میں زیادہ پائی جاتی ہے"۔

حضرت مولانا محمّد روشن خان صاحبؒ

حضرت مولانا محمد روشن خان صاحب خلیفہ خاص حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک دفعہ جب حضرت ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت سے فرمایا کہ "آپ میرے لیے دعا کیجئے کہ

اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ ایمان پر کرے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے۔ (اشرف السوانح حصہ اوّل)

مصنف تذکرہ مشائخ دیوبند

اسی طرح مولانا عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری مصنف تذکرہ مشائخ دیو بند فرماتے ہیں کہ حکیم الامت حضرت تھانوی نے مواعظ، ملفوظات، اور تالیفات کے ذریعہ جتنی دین کی خدمت کی ہے اور قوم کا سدھار کیا ہے، اور کسی دوسرے کو یہ بات حاصل نہیں (تذکرہ مشائخ دیو بند)

علمائے سندھ

اسی طرح سندھ کے مشہور و معروف علماء و مشائخ کرام حضرت مولانا شاہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ اور حضرت مولانا تاج محمود صاحب امروٹیؒ اور حضرت پیر جھنڈا صاحبؒ سے بواسطہ ایک عالم ملاقاتیں کیں اور دعائیں لیں، ان سب حضرات نے حضرتؒ کی بڑی تعظیم و تکریم کی، جناب پیر جھنڈا صاحبؒ نے تو آپ کو ایک قیمتی خرقہ بھی عطا فرمادیا، اور اپنے مریدین کو وصیت بھی فرمائی کہ ”جس بات کے پوچھنے کی ضرورت ہو، یا تم لوگوں میں کسی بات پر اختلاف ہو تو مولانا (یعنی تھانوی صاحبؒ) سے رجوع کرنا“۔

حضرت شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ

آخر میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ کا ارشاد گرامی نقل کیا جاتا ہے جس سے بخوبی معلوم ہوگا کہ باوجود سیاسی اختلاف ہونے کے حضرت استاد کے دل میں اپنے اس شاگرد کی کتنی وقعت اور عظمت تھی، ایک بار ایک بانی پتی اہل علم سے یہاں تک فرمادیا کہ

بھائی اپنی جماعت میں اختلاف تو اچھا نہیں معلوم ہوتا پھر میں ہی کسی قدر رائے کو کیوں نہ بدل دوں؟ اور اس معاملہ میں ان کی موافقت کرلوں، کیوں کہ میرے اوپر وحی تو نازل ہوئی نہیں کہ میری رائے ٹھیک ہی ہو۔ الخ (اشرف السوانح ص۲۲ حصہ اوّل)

ایسے ہی ایک دفعہ کچھ خدام حضرت تھانویؒ کی برائی اور تحریک سے علیحدگی پر مذمت، اور اپنے استاد کی مخالفت کا ذکر کر رہے تھے۔ تو حضرت دیوبندیؒ نے سُن کر ناگواری اور ناراضی کا اظہار فرماتے ہوئے فرمایا کہ۔

ہم کو تو فخر ہے کہ ہم ہی میں ایسا قوی القلب شخص موجود ہے جو سارے ہندوستان کی بھی پروا نہیں کرتا، اور میرے اوپر کیا وحی اتری ہے، میری رائے ہے ممکن ہے غلط ہو، ۲۹ جنوری ۱۹ء

رئیس المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ جو حضرت گنگوہیؒ کے خلیفۂ اعظم اور علم و عمل میں اپنی نظیر آپ تھے، حضرت تھانویؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ۔

مجھ کو اشرف علی سے اس وقت سے محبت ہے جب کہ ان کو خبر نہ تھی،

اور آپ کے مواعظ کے بارے میں تو یہ فرماتے تھے کہ "ان کے بیان میں انگلی رکھنے تک کی گنجائش نہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی کا واعظ کہنا منہ چڑانا ہے"۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ جب کسی تحریر میں حضرت کے نام کے ساتھ حکیم الامت لکھا ہوا نہ پاتے تو بہت ناراض ہوتے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے جب قلوب رجال میں ان کے لئے ایک لقب ڈال دیا ہے تو اس کو نہ چھوڑنا چاہیے کہ اس میں حضرت کے ساتھ سوء ادب ہے۔ (اشرف السوانح حصہ سوم)

یہ تو ان چند بزرگوں اور علماء کرام کا بالکل اجمالی تذکرہ ہے، جو مطلع شہرت کے درخشندہ ستارے ہیں، ان کے علاوہ حضرت تھانویؒ ہر قسم کے بزرگوں سے ملے اور ان سے دعائیں لی ہیں۔ (جن کا ذکر اشرف السوانح میں ہے)

علمی، عملی، سیاسی اور حالاتِ زندگی پر لکھی جانے والی چند کتابیں

اُمت میں بہت کم ایسے حضرت گزرے ہوں گے جن کے حالات زندگی پر اتنی کثرت سے کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہوں جتنے حضرت تھانویؒ پر لکھے گئے ہیں، ان میں سے چند ایک کتابوں کے نام لکھے جاتے ہیں، مثلاً اشرف (۱) السوانح (چار جلدیں) (حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ) سیرت (۲) اشرف (دو جلد، منشی عبدالرحمٰن صاحب ملتانی) حکیم (۳) الامت (مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی) مآثر (۴) حکیم الامت حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ۔ حکیم (۵) الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (مولانا نور احمد صاحب الکیانی) مولانا (۶) اشرف علی تھانوی اور میرے ذاتی تاثرات (حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی ظلہ) ذکر (۷) اشرف (پروفیسر محمد احمد صاحب) افادات (۸) اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) مولانا (۹) اشرف علی تھانوی

اور تحریک آزادی (پروفیسر احمد سعید صاحب) مجدد الملت کے آثار علمیہ (حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی) حیات اشرف (مولانا غلام محمد صاحب) کمالات اشرفیہ (مولانا محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی)

تعلیمات

یوں تو حضرت تھانویؒ کے ۸۰۰ سے زائد مواعظ، اور ملفوظات کے مجموعے، اور تمام تصانیف آپ کی تعلیمات و ارشادات ہی سے پُر ہیں مگر حضرتؒ کے یہاں جن چیزوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا وہ خاص طور پر چار چیزیں تھیں، ایک معاملات کی صفائی، دوسرے معاشرت کی درستی، تیسرے حقوق العباد کی ادائیگی اور چوتھے تربیت اخلاق کا اہتمام، حضرتؒ کے یہاں نوافل، ذکر، اذکار، اوراد و وظائف پر زور کم دیا جاتا تھا، حضرتؒ کے یہاں معمولات کے ناغہ، یا کوتاہی پر بازپُرس کم ہوتی تھی، البتہ مذکورہ بالا امور میں کوتاہی پر سخت گرفت فرماتے۔ اسی سلسلہ میں ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ:۔

انسان بننا فرض ہے، رسمی بزرگ بننا فرض نہیں اس لیے کہ انسان نہ بننے سے دوسروں کو تکلیف ہوگی، اور بزرگ نہ بننے سے اپنے ہی کو تکلیف ہوگی، وہ یہ ہے کہ دوزخ میں جائے گا، خود تکلیف اٹھائے گا، انسان ہوگا تو اس سے دوسروں کو تو تکلیف نہ ہوگی، اس لئے میں انسان بنانے کی کوشش کرتا ہوں، بزرگ نہیں بناتا، کیونکہ انسان بننے سے بزرگ تو خود بخود بن جائے گا۔)

اسی طرح ایک دفعہ فرمایا کہ:۔ (مآثر حکیم الامت ص۱۴۷)

"میرے یہاں تو صرف ایک چیز سکھائی جاتی ہے اور وہ انسانیت ہے، کوئی عرفی بزرگی کو ضروری سمجھ رہا ہے، میں انسانیت و آدمیت کو ضروری سمجھتا ہوں، آدمی بننا ہو تو یہاں آئے ورنہ اور کہیں جائیے" (مآثر حکیم الامت ص۱۴۷)

اسی طرح ایک دفعہ فرمایا کہ:۔

"حقوق العباد کا ادا کرنا اوراد و وظائف سے بدرجہا زیادہ ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مواخذہ ہوگا اور ترک وظائف سے کچھ مواخذہ نہیں، یہ تو مستحب ہے، لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر غیر ضروری اختیار کرتے ہیں۔"

معاملات کی اہمیت اور معاشرت کی درستی کے سلسلہ میں حضرتؒ کے دو رسالے صفائی معاملات اور آداب المعاشرت ملاحظہ فرمائیں۔

معمولات

آپ کے چند معمولات کا ذکر کیا جاتا ہے جن پر آپ ہمیشہ عمل پیرا رہے، اور یہ معمولات حرز جان بنائے جانے کے لائق ہیں۔

(۱) آپ جب چارپائی پر کھانا تناول فرماتے تو سرہانے کی طرف کھانا رکھتے، اور پائنتی کی طرف خود بیٹھتے

کہ کھانے کی بے ادبی کا شائبہ تک نہ ہو (۲) آپ چھڑی کا نچلا حصہ کبھی قبلہ رُو نہ کرتے (۳) آپ جب گھر تشریف لے جاتے تو جھٹ آواز دے کر اور اجازت لے کر جاتے، کبھی اس کے خلاف نہیں کیا (۴) آپ ہمیشہ ہر چیز کو اپنے ٹھکانہ پر نہایت قرینہ سے رکھتے، استعمال کرنے کے بعد اس کو پھر اپنی جگہ رکھ دیتے، کہ اگر اندھیرے میں بھی اٹھائی جائے تو فوراً مل جائے (۵) مسجد میں جوتے قبلہ رُخ نہیں رکھتے تھے (۶) وقتاً فوقتاً اپنی مملوکہ اشیاء کا جائزہ لیتے رہتے، زائد از ضرورت اشیاء کو فوراً الگ کر دیتے (۷) معمولی معمولی چیزوں کی قدر فرماتے، حتیٰ کہ ڈاک کے لفافوں کو اُلٹ کر کام میں لاتے، اسی طرح، پن، جیسی اشیاء کو بحفاظت رکھتے۔ (۸) خادم کو تنخواہ ہاتھ میں دیتے، نیچے نہ رکھتے (۹) اگر کوئی حجام سید ہوتا تو اس کو سرہانے بٹھا کر حجامت بنواتے (۱۰) آپ ہر امانت کو الگ الگ رکھتے، کیونکہ خلط ہو جانے کی صورت میں شرعاً ان کے احکام بدل جاتے ہیں، پھر امانت، امانت نہیں رہتی، بلکہ قرض ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ حضرتؒ کے چالیس ارشادات "ہر مسلمان کو رات دن زندگی کیسے گزارنی چاہیئے" کے عنوان سے اور گیارہ ارشادات "وصایا" کے عنوان سے الگ الگ دو چارٹوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ بھی تعلیمات ہی کا حصہ ہیں، ان کو بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اصلاحیات

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کو وقتِ نظر اور وسعتِ خیال عطا فرمائی تھی، اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے، اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں اور علما، فضلا وصوفیا، مشائخ کے حلقوں تک پھیلا ہوا ہے، اور سب کے لئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس، مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی، غمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی کو وہ محیط ہیں، غرض! ایک مسلم جدھر اپنی زندگی میں رُخ کرے اس کے لئے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ارشاد

مؤرخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حقیقت میں مصلحِ اُمت تھے، اُمت کے سینکڑوں مصائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید کی اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف لکھیں، وہ حکیم الاُمت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشاط و احیاء پر حیوۃ المسلمین اور صیانۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے، غرض ان کی زندگی میں، مسلمانوں کی شاید کوئی مذہبی ضرورت ہو گی جس کی مدد اس حکیم الاُمت نے اپنی زبان اور قلم سے نہ فرمائی ہو، اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں

آسکتا ہے۔

اصلاحات کے تحت یوں تو حضرت کی ہر تصنیف و تالیف اور ملفوظات و مواعظ داخل ہیں، مگر ان میں سے بعض کتابوں کو خاص دخل ہے مثلاً حیوۃ المسلمین، بہشتی زیور، بہشتی گوہر، اصلاح الرسوم، آداب المعاشرت، صفائی معاملات، حقوق الزوجین، حقوق الوالدین، اصلاح انقلاب اُمت، تعلیم الدین، حقوق البیت، اصلاح ترجمہ دہلوی، اصلاح ترجمہ حیرت، وغیرہ۔

ﮯ ہچکیاں بھی میری سن لو میرے نالے تو سنے ٹھہرو اک نغمہ ابھی اور مرے ساز میں ہے

علالت

وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معدہ و جگر کی تکلیفوں نے عاجز کر دیا تھا۔ کبھی قبض ہوتا تو ہٹنے کا نام نہ لیتا، اور کبھی اسہال ہونے لگتے تو رکنے ہی نہ پاتے، مختلف اعضاء متورم ہو چکے تھے، علاج برابر ہوتا رہا، اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی حفاظت میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی، لیکن تدبیر ہی تو بندہ کے اختیار میں ہے ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

معالجین میں بڑے بڑے نامور فاضل حکماء تھے۔ لکھنؤ کے بڑے بڑے مشہور و معروف حکماء کے زیر علاج رہے، اور میرٹھ کے مشہور و معروف بزرگ اور حکیم، حکیم محمد مصطفٰے صاحبؒ اور سہارنپور کے جناب حکیم محمد خلیل احمد صاحبؒ تو مستقل معالج تھے، کچھ دنوں حضرت ڈاکٹر محمد عبد الحئی صاحب مدظلہ سے بھی ہومیو پیتھک کا علاج کرایا، حضرتؒ ڈاکٹری علاج کے مخالف تھے، مگر حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ جو آپ کے بھتیجے اور مثل اولاد کے تھے، ان کے کہنے سننے سے کچھ دنوں تک انگریزی علاج بھی فرمایا، مگر وہی بات کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

رحلت

رشد و ہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۸۶۳ء میں مطلع تھانہ بھون سے نمودار ہوا تھا اور ۱۳۱۵ھ سے ہندوستان کے طول و عرض میں شریعت و طریقت کے انوار پھیلاتا رہا۔ بالآخر ۱۶، ۱۷ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو منگل بدھ کی درمیانی شب میں بیاسی سال تین ماہ گیارہ دن کی عمر پا کر ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

رحلت سے کچھ دیر قبل اپنی دونوں اہلیہ محترمہ سے پوچھا، کیا میں دونوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں؛ تسلی دلائی گئی ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے۔ آپ دے چکے ہیں بے فکر رہیں، پھر فرمایا کہ آج تو ہم جا رہے ہیں؛

اہل خانہ نے پوچھا کہاں؛ پھر فرمایا "تم نہیں جانتیں"، اس کے بعد غشی طاری ہوگئی تو سوا گھنٹہ تک ہوش نہ آیا' سانس تیزی اور آواز سے چلتا رہا۔

نور کی کرنیں

چھوٹی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے بوقت نزع دیکھا کہ جب سانس زور سے اوپر کو آتا تھا تو داہنے ہاتھ کی انگشت شہادۃ اور بیچ کی انگلی کے درمیان پشت کی طرف گھاٹی میں ایک ایسی تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہوجاتی تھی کہ باوجود اس کے کہ بجلی کے دو قمقمے اس وقت روشن تھے پھر بھی اس کی چمک ظاہر ہوتی تھی۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا، متعدد مستورات نے اس منظر کو دیکھا' جب سانس ختم ہوا تو یہ روشنی بھی غائب ہوگئی، کیا عجب کہ جن انگلیوں سے حقائق و معارف ایک عرصہ دراز تک معرض تحریر میں آتے رہے یہ نور اسی کا ہو۔

آپ کی وفات کی خبر بجلی کی طرح آناً فاناً چاروں طرف دوڑ گئی، جو شخص جس حال میں تھا سکتہ میں رہ گیا، اور بے تابانہ جنازہ میں شرکت کے لئے کوشش کرنے لگا۔ دیوبند، سہارنپور اور دہلی وغیرہ کے عوام علماء، مشائخ عظام، اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے حضرات تھانہ بھون پہنچنا شروع ہوگئے۔ سہارنپور اور دہلی کے لوگوں کی مساعی سے چلائیں۔

تجہیز و تکفین

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوریؒ سابق صدر مدرس مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانویؒ، حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب شیروانی جلال آبادی مدظلہ اور حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مدظلہ جیسے اکابر علماء و مشائخ کے نگرانی میں تجہیز و تکفین کی گئی۔

ذکر اللہ بعد از وفات

حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب مدظلہ بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرتؒ کو غسل دیا جارہا تھا اس وقت بندہ نے اور دیگر حضرات نے دیکھا کہ حضرت والاؒ کی زبان مبارک اور ہونٹ ذکر اللہ میں مشغول تھے۔

نماز جنازہ

حضرت کا جنازہ اوّل آپ کی خانقاہ میں لایا گیا، مگر بے پناہ ہجوم کے باعث خانقاہ ناکافی سمجھی گئی، تو پھر آپ کے جنازہ کو عیدگاہ میں لے جایا گیا، جہاں آپ کے جنازہ کی نماز آپ کے بھانجے اور اعلاء السنن کے مصنف حضرت علامہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے جنہیں پہلے سے بشارت ہوچکی تھی، نماز جنازہ پڑھائی، حالانکہ اس وقت دیوبند، سہارنپور اور دہلی کے بڑے بڑے علماء کرام اور مشائخ عظام موجود تھے، مگر کسی کی ہمت اور جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر حکیم الامت مجدد الملت قدسی نسبت

کی نماز جنازہ پڑھائے، سب نے مل جل کر آپ کے بھانجے ہی کو آگے کیا۔

تدفین

نماز کے بعد آپ کے جنازہ کو آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ (قبرستان) میں جس کا تاریخی نام "قبرستان عشقبازان" ہے، جسم مبارک کو دفنایا گیا، نور اللہ تعالیٰ مرقدہٗ وقدس اللہ سرہٗ

مزار مبارک

حضرتؒ کے لیے دوسرے بزرگوں کی طرح کوئی بڑا پرشکوہ مزار تعمیر نہ کیا گیا، اور نہ ایسا ہو سکتا تھا، کہ جس نے ساری عمر ردِّ بدعات و رسومات میں گذاری ہو، اس کی وفات کے بعد ان کا آغاز ان کے مزار کی تعمیر سے کیا جاتا۔ ہرگز نہیں، حضرتؒ کا مزار کس نوعیت کا ہے؟ اس کی تفصیل مشہور و معروف فلسفی اور صحافی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مرحوم کے بیان کے مطابق یہ ہے۔ "اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا؟ پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں، اور مزار، آہ مزار! نہ کوئی بلند گنبد، نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری، نہ آستانہ، نہ جنگلہ، نہ کٹھرا، ایک اوسط درجے کی وسعت کا باغ، ایک سمت میں ایک مختصر پُر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ، اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ، ! نہ شامیانہ، نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت! (حکیم الامت) بس یہ مزار مبارک کی نوعیت ہے۔ حضرتؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد آپ کی پہلی اہلیہ محترمہ کی وفات ہو گئی، ان کی قبر حضرتؒ کے پہلو میں بنائی گئی، پھر اس کے کچھ عرصہ بعد حضرتؒ کے برادر خورد جناب منشی محمد مظہر علی صاحب تھانویؒ (جن کے لئے حضرتؒ نے رسالہ الضمان لتکمیل فی زمان التعجیل تین سالہ عربی فارسی اور دینیات کا نصاب مرتب فرمایا تھا) ان کا بھی انتقال ہو گیا، ان کو حضرتؒ کے قدموں کی طرف دفنایا گیا، اس طرح اب اس وقت تین مزارات ہیں، ایک حضرت حکیم الامتؒ کا، دوسرا اہلیہ محترمہ کبریٰؒ کا اور تیسرا آپ کے برادر خوردؒ کا،

مقام شہادت

دفن کے بعد کی پہلی رات کو آپ کے ایک خلیفہ خاص حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ صاحب شیروانی جلال آبادی دام ظلہم نے نصف شب کے بعد حضرتؒ کو خواب میں دیکھا، حضرتؒ نے فرمایا، کہ

"مجھے مردہ نہ سمجھو، میں زندہ ہوں، جس طرح میری حیات میں مجھ سے فیض لیتے رہتے تھے فیض لیتے رہنا، فیض ہوتا رہے گا (یعنی کتابوں سے) مجھے مقامِ شہداء نصیب ہوا ہے کہہ دیا جائے۔"

حدیث شریف میں پیٹ کی بیماری سے مرنے والے کو شہید فرمایا گیا ہے اور حضرت تھانویؒ کی وفات بھی مرض اسہال میں ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ فتنوں کے زمانہ میں سنّت کو زندہ کرنے والے

کے لئے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی بشارت دی ہے، اور حضرت کی ساری زندگی احیائے سنت میں گزری جس کی وجہ سے محی السنت آپ کے نام کا جز بن چکا تھا۔

جانشینی

جانشینی ہو یا سجادہ نشینی محض ایک دنیوی رسم ہے جسے محض ذاتی اغراض کی تکمیل کے لئے قائم رکھا جاتا ہے، اور اس خاص مقام کو ہر حال میں آباد رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ خواہ اسے آباد رکھنے والوں میں رشد و ہدایت کی اہلیت ہو یا نہ ہو اہل اللہ کے یہاں صرف اسی امر کو ترجیح دی جاتی ہے کہ جس میں تربیت وایثار کی صلاحیت پاتے ہیں اسے رشد و ہدایت کی اجازت دیتے ہیں، یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جہاں چاہے بیٹھ کر خدمت دین انجام دے، یہی وجہ ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے ۱۸۵۷ء میں ہجرت کرکے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کے بعد مدتوں تھانہ بھون کی خانقاہ خالی رہی، اگر حضرت حاجی صاحبؒ یا ان کے خلفاء کرام کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت ہوتی تو اکابر دیوبند یا ان کے خلفاء اس گدی کو ضرور آباد کرتے جو ہر لحاظ سے اس کے اہل تھے، مگر کسی نے اس بدعت کو جاری نہیں کیا، جس کے مفاسد حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ "سجادہ نشینی" میں تفصیل سے گنوائے ہیں، حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا تھا مگر حضرتؒ نے رسالہ سجادہ نشینی لکھ کر اپنی ہی زندگی میں اس سلسلہ کو بند کر دیا، آپ کے خلفاء میں کوئی جامع الکمالات تو نہیں ہوا، لیکن آپ کا ہر مجاز آپ کی بعض بعض خصوصیات کا مظہر اتم ضرور ہے

آپ کی مملوکہ اشیأ کے ساتھ معاملہ

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ علمائے کرام و مشائخ عظام کی وفات کے بعد ان کی اشیاء کو تبرکات کے طور پر عوام و خواص کی زیارت کے لئے رکھ دیا جاتا ہے، شریعت کے مطابق ورثاء کے درمیان تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اگر ورثاء میں کوئی نابالغ ہوا تو شرعاً اس کی اجازت کا اعتبار نہیں، غرض بجائے شریعت کی پابندی کے رسوم کی پابندی کی جاتی ہے، حضرت تھانویؒ کی تمام عمر اتباع شریعت اور احیائے سنت، اور رسوم و بدعات کے مٹانے میں صرف ہوئی ہے تو بھلا حضرتؒ کی وفات کے بعد یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حضرت کی مملوکہ اشیأ کے ساتھ بھی خلاف شرع معاملہ کیا جاتا، چنانچہ حضرتؒ کی وفات کے وقت تین ورثاء دو اہلیہ محترمہ اور ایک برادر خورد جناب مظہر علی صاحب مرحوم زندہ تھے، حضرت کی وصیت کے مطابق کہ "میری اشیاء میں سے چوتھائی حصہ خانقاہ امدادیہ کے نام وقف ہے، اس چوتھائی حصہ کے نکالنے کے بعد بقیہ مملوکہ اشیأ کو ان تینوں ورثاء کی اجازت سے نیلام عام کے ذریعہ فروخت کیا گیا، فروخت کے بعد جو رقم وصول ہوئی

بقیہ صفحہ ۸۲ پر

خصوصیاتِ زندگانی

حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب عارفیؒ

* * *

اُسوۂ حسنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تعلیماتِ نبوت کی تجدید فرمانے والے اور ایک مجددِ ملت کا منصب رکھنے والے کی یہی شان ہونی چاہیئے کہ اس کی زندگی کا ہر انداز ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ“ کا پورا مصداق ہو کیونکہ جب وہ مسلمانوں کو احیاءِ سنت کی تعلیم و تبلیغ کر رہا ہو تو خود بھی اس کی ساری زندگی اسی تعلیم کا عملی نمونہ ہونا چاہیئے۔ اس کے تمام عادات و معاملات اور اخلاقیات معاشرت قدم بہ قدم اتباعِ سنت ہی کی صراطِ مستقیم پر ہوں۔

اللہ تعالٰے نے حضرت حکیم الامت، مجددِ ملت شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی فطرتِ سلیمہ ہی میں متابعتِ سنت کی صلاحیت ودیعت فرمائی تھی۔ حضرتؒ والا کا تمام ضابطۂ حیات و اندازِ زندگانی اسی سے مرتب نظر آتا ہے اور یہ چیز آپ کے تمام کارناموں، اشاعت و تبلیغِ دین اور اندازِ تعلیم و تربیتِ باطن میں ہر طرح ظاہر و نمایاں نظر آتی ہے۔

اس موضوع کی وضاحت کے لئے خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات جو وقتاً فوقتاً ارشاد ہوئے اور قلمبند ہو کر شائع ہوئے ہیں۔ ان کے بعض اجمالی خلاصے اشرف السوانح سے نقل کر کے درج کئے جا رہے ہیں تاکہ حضرتؒ کی ذاتی و صفاتی زندگی کی ایک ہلکی سی جھلک ناظرین کے لئے بصیرت افروز ہو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تمام ظاہری و باطنی اعمال کو اسوۂ حسنہ رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم میں اس طرح ڈھال لیا تھا کہ ایک شانِ محبوبیت پیدا ہوگئی تھی ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اہتمام اتباعِ سنّت

ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجھے ایک دن خیال آیا کہ ہم لوگ اتباعِ سنت کا بہت ذکر کرتے ہیں مگر اس کا کچھ حصہ ہمارے اعمال میں ہے بھی کہ نہیں ؟ چنانچہ میں نے تین دن تک صبح سے رات تک کے اپنے تمام اعمال کا بغور جائزہ لیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ کتنی اتباعِ سنت ہم لوگ عادتاً کرتے ہیں اور کتنی اتباع کی توفیق علم حاصل ہونے کے بعد ہوئی نی باتوں میں اب تک محرومی ہے۔ چنانچہ تین دن تک تمام امورِ زندگی کا جائزہ لینے لائحہ عمل صاف ہوگیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ۔

ی جائزہ کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ فرمایا جس کا نام " الغالب غالب " ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اعمال اور ارشادات کا ذکر ہے نی اتباع کے لئے ہم کو حکم دیا گیا ہے یا جن کا تعلق ادائے حق محبت سے ہے اس میں حضرتؒ والا نے اپنی کتاب " حیٰوۃ المسلمین " کی روح ہشتم کی طرف توجہ دلائی ہے س میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کا ذکر ہے حضرت والا ۃ اللہ علیہ نے اس کو مطالعہ میں رکھنے کی بہت تاکید کی ہے اور فرمایا ہے کہ مجھے یقین ہے اس کے مطالعہ سے ضرور نفع ہوگا ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور نفع ہوگا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اتباعِ سنت ہی میں ہمارے لئے حیاتِ طیبہ ہے اور دین و دنیا کی فلاح ہے اور خود اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے کلام پاک میں اس کا اعلان فرمایا ہے کہ جو بھی میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اپنے امورِ زندگی میں کرے گا اللہ تعالےٰ خود اس سے محبت فرمائیں گے ۔ ایک بندۂ عاجز کے لئے اس سے بڑا احسان و انعام الٰہی اور کیا ہوسکتا ہے ؎

جب اُن کو اعترافِ محبت ہے عارفی
کیا اس سے بڑھ کے اور تمنا کرے کوئی

حلیۂ مبارک

کھلتا ہوا گندمی رنگ، وجیہہ چہرہ، سر پر برابر کے بال، داڑھی گول بھری ہوئی، سر کے بال اور داڑھی میں سفیدی غالب، دونوں بھنویں قریب قریب ملی ہوئی، دُہرا بدن، میانہ دراز قد، چہرہ گول رعب دار باوقار سنجیدہ اور متین، بادشاہوں کی سی شبیہ، رفتار نہایت آہستہ، گردن تھوڑی سی خم کرنے کی عادت، جسم کے قویٰ مضبوط اور پُر گوشت، آواز صاف و نرم، پیشانی پر ہلکا سا نشانِ سجدہ، آنکھیں بارونق پُر کیف ہمیشہ نیچے کی جانب جھکی ہوئی جن میں ایک خاص اثر و رُعب۔

ملبوسات، وغیرہ

چکن ڈوریہ یا تن زیب کی پنج کلی ٹوپی، کُرتہ زیادہ تر چکن یا سفید نینوں کا زیب تن فرماتے تھے۔ اندر ایک بنڈی بند دار، کُرتے کا بٹن اُوپر کا ہمیشہ کُھلا ہوا۔ شرعی پاجامہ، ازار بند کپڑے کا جس میں کنجیوں کا گچھا بندھا ہوا، کپڑے نفیس اور عمدہ وضع دار، رومال بڑا چارخانہ کا، جمعہ کے دن دھاری دار عمامہ زیبِ فرقِ مبارک، کپڑے ہفتہ میں دو بار ضرور تبدیل فرماتے تھے۔ جمعہ کے روز عطر لگاتے تھے۔ سردیوں میں اُونی عبا زیب تن فرماتے تھے۔ سردیوں میں عام طور پر سر پر رومال باندھ لیتے تھے اور اُونی گرم چادر اوڑھے رہتے تھے۔ صبح و شام گرم موزہ پہنتے تھے بعد میں اُونی موزے وغیرہ پہننا چھوڑ دیا تھا۔

پُر تکلف اور قیمتی لباس پہننا کبھی پسند نہیں رہا ہمیشہ سادہ لباس پہنا مگر صاف ستھرا رہنے کا ہمیشہ طبعاً اہتمام رہا۔

بستر وغیرہ میں کوئی خاص اہتمام پسند نہ تھا بجز اس کے کہ بستر صاف ستھرا ہو۔ شب میں تہبند باندھ کر آرام فرماتے تھے۔ سردیوں میں روئی کی مرزئی اور روئی کا پتوعہ

استعمال فرماتے تھے اور صافہ باندھتے تھے۔ پلنگ یا کوئی چیز ٹیڑھی یا بے ترتیب بھی ہو تو ناگوار گزرتی تھی۔

جمعرات کے دن حجامت بنواتے تھے۔ سر کے بال پیچھے کچھ پٹوں کی طرح تھے۔ لبیں بہت باریک قینچی سے ترشواتے تھے۔ چہرہ پر کہیں بال درست کرنے کے لئے اُسترہ کا استعمال نہ کیا جاتا تھا۔ ہفتہ میں دھوبی ایک بار کپڑے لاتا۔ کاپی میں تاریخ وار اندراج رہتا تھا۔ یادداشت تحریری سے دھوبی جو کپڑے لاتا تھا اس کی مطابقت فرماتے اور جو اُجرت ہوتی فوراً ادا کر دیتے۔ پھر اترے ہوئے کپڑے دھوبی کو دے کر اس کی یادداشت تفصیل کے ساتھ کاپی میں درج فرما لیتے۔

عاداتِ طیّبہ

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ابتداء عمر ہی سے پاک و صاف رہنے کا اور ہر کام وقت پر اور سلیقہ کے ساتھ کرنے کا اہتمام رہا اور ہمیشہ اس کا خیال رہا کہ میری وجہ سے کبھی کسی کو کوئی ناگواری یا میری بات ناگوارِ خاطر نہ ہو۔ اکثر و بیشتر شروع ہی سے اپنے حالات و اعمال کا جائزہ لیتے رہنے کی عادت تھی۔

فرماتے تھے کہ اہلِ تعلقات سے ان کے فرقِ مراتب کے ساتھ میں نے جو بھی معاملہ رکھا الحمدللہ عمر بھر اس کو اسی طرح نباہا۔

فرماتے تھے کہ میں روپیہ کو کبھی بائیں ہاتھ سے نہیں لیتا اور کبھی جوتا وغیرہ داہنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔

دستی رومال کے ایک کونہ میں گرہ لگا لیتے تھے تاکہ صرف اسی طرف سے ناک وغیرہ صاف کی جائے۔ ایک وقت میں کوئی کھانے پینے کی چیز اگر زیادہ مقدار میں سامنے آتی تو حضرتؒ پر بار ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ تھوڑی مقدار میں اگر چیز ہو تو کھانے پینے میں انشراح رہتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے تو اور طلب کر لیتا ہوں۔

فرماتے تھے کہ جب راستہ پر چلتا ہوں تو اچھا راستہ دوسروں کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اس معاملہ میں مویشیوں تک کی رعایت رکھتا ہوں۔

کسی کا راستہ میں معتقدانہ انداز میں پیچھے چلنا پسند نہ فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ چلنا ہو تو برابر رہ کر چلو ورنہ فاصلہ سے چلو۔

فرماتے کہ اللہ تعالےٰ کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کی بھی میرے دل میں بڑی قدر ہوتی ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے، فیتہ، تاگا اور کوئی ایسی حقیر چیز جو کسی کام میں آسکتی ہو اس کو بھی اُٹھا کر محفوظ کر لیتا ہوں۔ وقت پر اس کا کام میں آجانا بڑی راحت کا سبب معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جس نعمت کے اجزائے کثیرہ سے اپنی ضرورت اور لذت پوری ہوتی ہو اس کے اجزائے قلیلہ کو تلف کرتے ہوئے میرا دل لرزتا ہے۔

فرمایا کہ میری عادت یہ ہے کہ اول تو حتی الوسع کسی کی چیز عاریتاً نہیں لیتا اور اگر کبھی کسی مجبوری سے کوئی چیز لینی پڑی تو فراغت کے بعد اس کو فوراً ہی پہنچا دیتا ہوں تاکہ قلب مطمئن ہو جائے۔ اکثر لوگ اس سے غافل ہیں، حالانکہ احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اخلاق کا خلاصہ یہی ہے کہ کسی کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ۔

طبعی و مزاجی کیفیت

؎ خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حالات مذکورہ کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مزاجی کیفیت کا کچھ بیان بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرتؒ کے مزاج مبارک میں اس قدر سادگی اور بے تکلفی تھی کہ عام نظر میں کوئی بھی خصوصی بات مابہ الامتیاز معلوم نہ ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امور شرعیہ اور اعمال سنت حضرتؒ کے امور عادیہ بن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرتؒ نہایت لطیف مزاج اور نازک طبع تھے۔ کوئی بات بھی حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی نہ خود اپنے لئے اور نہ دوسرے کے لئے پسند تھی۔

اپنی مزاجی حالت کے متعلق فرماتے تھے کہ ہجوم سے طبیعت پر بہت بوجھ ہوتا ہے۔ ہاں یہ تو مجھے مرغوب ہے کہ دو چار اپنے ہم خیال احباب پاس رہیں! بالکل تنہائی کو بھی جی نہیں چاہتا

اور یہ تو بارہا فرمایا کرتے تھے کہ جس کام کے سامنے آتے ہی اس کی فکر سوار ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس سے جلد فراغت ہو جائے۔

فرماتے تھے اگر کسی وقت کوئی ضروری کام یا خاص بات یاد آجاتی ہے تو فوراً کاغذ پر اس کی یادداشت لکھ کر رکھ لیتا ہوں تاکہ دماغ اس میں الجھا نہ رہے۔ پھر وقت پر فراغت کے ساتھ وہ کام کر لیتا ہوں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں کسی شخص کو جس کا کوئی کام مجھ سے متعلق ہو کبھی دیر تک منتظر نہیں رکھتا۔ اولین وقت پر اس کو اس طرف سے فارغ کر دیتا ہوں۔ اسی طرح خود بھی کسی کام کے لئے منتظر رہنا برداشت نہیں ہوتا۔ چاہتا ہوں کہ جس کے ذمہ جو کام کیا ہے وہ اس کو انجام دے کر فوراً مطلع کر دے۔

چھوٹے بچوں سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہت دلچسپی تھی کبھی کبھی بچوں کے ساتھ بڑی خوش طبعی اور مزاح فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اطباء نے مقویات و مفرحات کی بڑی فہرست لکھی ہے لیکن دو چیزیں چھوڑ دیں ایک تو روپیہ جو مقویات میں بڑا درجہ رکھتا ہے اور دوسرے چھوٹے بچے جو مفرحات میں بڑا اثر رکھتے ہیں۔

فرمایا کہ میں کھانے پر اصرار کرنے کو پسند نہیں کرتا کسی کو بے بھوک کھلانا زہر دینا ہے۔ لوگوں میں یہ عرفی مرض ہے کہ خواہ وقت ناوقت مہمان کو اصرار کر کے کھانا کھلانا چاہتے ہیں۔

فرماتے تھے کہ کوئی کیسا ہی محبوب مہمان ہو اور اس کے ٹھہرانے کو کتنا ہی جی چاہتا ہو کبھی اس کی مرضی کے خلاف اصرار نہیں کرتا اور جب جانے کو کہتا ہے تو نہایت فراخدلی سے کہہ دیتا ہوں کہ جیسی مرضی ہو اور جس میں راحت ہو۔

حضرتؒ کے مزاج میں غیرت بھی بہت زیادہ تھی۔ اگر کوئی زیادہ کثیر رقم یا کوئی بہت زیادہ قیمتی ہدیہ استعمالی اشیاء کا پیش کرتا تو نہایت متواضعانہ انداز سے معذرت فرما لیتے۔

تبرکات حاصل کرنے کے معاملہ میں بھی حضرت خاص احباب سے بھی غلو کرنے میں منع فرماتے تھے۔ اپنے احباب اور اعزہ سے حضرت بہت کم کسی چیز کی فرمائش کرتے تھے اور اگر کسی ضرورت کی چیز کی فرمائش کرتے تو شرط کر لیتے تھے کہ اس کی قیمت ان کو قبول کرنا پڑے گی

متعلقین اور احباب کی معمولی غلطیوں اور فروگذاشتوں سے اکثر چشم پوشی فرمالیتے تھے۔

فضولیات سے انقباض

حضرت رحمۃ اللہ علیہ قیمتی سامان اپنے استعمال میں رکھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ بہت سادہ اور مختصر سامان اپنی ضروریات کے لئے استعمال فرماتے تھے۔

ضرورت سے زیادہ اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھتے تھے اگر کسی نے ایسا ہدیہ دیا جو حضرتؒ کی ضرورت کا نہ ہو خواہ استعمال کی چیز ہو خواہ کھانے پینے کی ہو تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ احباب سے اس کا ہدیہ تو قبول فرمالیتے تھے لیکن اس چیز کو اپنے خاص متعلقین کے ہاتھ بہت ہی معمولی قیمت پر فروخت فرمادیتے تھے یا یوں ہی دے دیتے تھے اس سے حضرتؒ کی شانِ تربیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہدیہ دینے والے کو سبق ہو جائے۔ فرماتے تھے کہ سب سے آسان بات یہ ہے کہ جو ہدیہ دینا چاہے وہ پہلے سے استمزاج کرلے تاکہ فریقین کو انبساط خاطر و مسرت حاصل رہے۔ فرماتے تھے کہ سب سے ہلکا پھلکا اور راحت و فراغت قلب کا ہدیہ تو نقد رقم کا ہدیہ ہے یہ ہر ضرورت مطلوبہ میں کام آسکتا ہے۔

فرمایا مجھے تو اس تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے کہ میری ملک میں ضرورت سے زیادہ چیزیں ہوں چاہے ان چیزوں سے خود مجھے سابقہ کبھی نہ پڑتا ہو لیکن خیال ہوتا ہے کہ میری ملک ہی میں ایسی فضول چیزیں کیوں ہوں آخر ان کا ہوگا کیا؟ طبیعت بہت ہی الجھتی ہے کہ جو چیز کام میں نہ آوے وہ گھر میں کیوں رہے مفت میں پہرہ چوکی دینا، حمال ہونا، مزدور بننا، فضول کا دردِ سر، خوب کہا ہے صائب نے ؎

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

مجھے سفر کے وقت اکثر یہ خیال آیا کرتا ہے کہ اے نفس! ضرورت کی چیزیں تو بس اتنی ہی ہیں جتنی اس وقت سفر میں ساتھ ہیں کہ دو، چار کپڑوں کے جوڑے ہیں۔ بستر اور لوٹا ہاتھ میں ہے۔ اب مجھے سفر کئے ہوئے دو ماہ ہوئے ہیں ان چیزوں کی کچھ بھی ضرورت نہیں ہوئی جو گھر میں بھری ہوئی ہیں بلکہ سفر میں بھی بعض چیزیں جب غیر ضروری معلوم ہوئیں تو گھر بھیج دی گئیں اور مجھ کو تو اس پر بھی شرم آتی ہے کہ الہ آباد سے بعض زائد چیزیں وطن واپس کردی گئیں لیکن میں

کیا کروں۔ میں تو بہت بچنا چاہتا ہوں کہ زیادہ بکھیڑا جمع نہ ہو مگر حق تعالیٰ میرے پاس بہت کچھ بھیجتے ہیں۔ میرے دوست احباب کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں وہ بہت سی چیزیں بھیج دیتے ہیں جن کو واپس کرتا ہوں تو اُن کا دل بُرا ہوتا ہے، لیکن میں اکثر اپنی مملوک چیزوں کا جائزہ لیتا رہتا ہوں اور غیر ضروری سامان کو نکالتا رہتا ہوں۔ (الاسراف ص ۴۳)

ایک نفیس قالین سہ دری میں بچھانے کے لئے حضرت خواجہ صاحب نے پیش کیا تو اُن کی خوشی کے لئے بچھا لیا خطوط تحریر فرمارہے تھے، فرمایا کہ دیکھئے جب قلم کو دوات میں ڈال کر اٹھاتا ہوں خیال ہوتا ہے کہ کہیں سیاہی گر کر دھبّہ نہ پڑ جائے الجھن ہونے لگی اور یکسوئی جاتی رہی مضامین کی آمد میں فرق آگیا۔ اگر معمولی گدا ہوتا تو دھبہ پڑنے کا خیال بھی نہ ہوتا۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ اس کو معمولی ہی سمجھیں دھبّہ پڑنے کا کچھ خیال نہ فرمائیں۔

فرمایا کہ طبیعت اس کو گوارا نہیں کرتی۔ کیونکہ ہر چیز کے ساتھ اس کی حیثیت کے موافق برتاؤ کرنا چاہتا ہوں۔ پھر دوسرے دن وہ اٹھا دیا اور فرمایا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ ایسی چیز پر بیٹھنے سے مجلس خواہ مخواہ بارعب ہو جاتی ہے۔ پاس بیٹھنے والوں پر رُعب پڑتا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ کسی کے قلب پر میری ذرا ہیبت نہ ہو۔ لوگ مجھ سے بالکل بے تکلف رہیں تاکہ جو کچھ جس کے جی میں آوے پوچھ سکے۔

ف ۔ اس ملفوظ سے حضرتؒ والا کے یہ صفات صاف ظاہر ہیں۔ ہر چیز کے ساتھ اس کی حیثیت کے موافق برتاؤ کرنا جو عین اتباعِ سنت ہے حدیث میں آیا ہے: کلموا الناس علی عقولہم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ ان کی حیثیت کے موافق برتاؤ کرنے کا حکم ہے تو چیزوں کے ساتھ ان کی حیثیت کے مطابق برتاؤ کرنا تو مزید کمال ہوا۔ دوسرے اپنے مجلس والوں کے ساتھ بے تکلف رہنے کو چاہنا جو دوسرا شعبہ اتباعِ سُنّت کا ہے۔ تیسرے اپنے احباب کی دلجوئی، جو تیسرا شعبہ اتباعِ سنت کا ہے۔

فرمایا کہ خدا جانتا ہے مجھے ذرا سی بات بھی فضول ہو تو اس سے نہایت انقباض ہوتا ہے بلکہ ہنسی مذاق یہاں تک کہ فحش تک سے بھی چاہے وہ عقلاً منکر ہو لیکن اس سے انقباض نہیں ہوتا اور بعض فضول باتوں میں بھی اتنی ناگواری نہیں ہوتی جتنی ان فضولیات

ئیں جن کو کہنے والا خود بھی سمجھے کہ یہ فضولیات ہیں ۔

فرمایا کہ جب کسی کام کو شروع کرتا ہوں تو اس سے قلب کو فارغ کرنے کا اس درجہ تقاضا طبیعت میں پیدا ہوتا ہے کہ جب تک ختم نہیں کر لیتا چین ہی نہیں آتا یہاں تک کہ بعض تصانیف کے ختم کے قریب رات رات بھر بیٹھا لکھتا رہتا ہوں اور ایک منٹ کو بھی آرام نہیں کرتا اور فرمایا کہ چاہے توفیق یادِ خدا کی نہ ہو لیکن میں اپنی طرف سے تو قلب کو فارغ رکھنے کی کوشش ہی کرتا رہتا ہوں تاکہ اگر کبھی توفیق ہو تو آسانی سے حق تعالیٰ کی طرف قلب کو رجوع تو کر سکوں اور اس وقت کوئی مانع توجہ الی اللہ سے نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اُلجھی ہوئی باتوں سے میری طبیعت پریشان ہو کر متغیر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ بات ختم ہو کر جلد یکسوئی حاصل ہو اور طبیعت اٹکی نہ رہے اور لوگ تو اُلجھی ہوئی باتیں کر کے طبیعت کو دیر تک خواہ مخواہ اٹکائے اور اُلجھائے رکھتے ہیں۔ (اشرف السوانح)

بچپن ہی سے میرا دماغ اس بات کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہو مگر ترتیب کے ساتھ نہ ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ نہ خود الجھی ہوئی تقریر کر دوں اور نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ فطرتاً میرا دماغ کچھ ایسا ہی ہے۔

میری عادت ہے کہ میں کسی مضمون کے سمجھنے میں زیادہ تعب نہیں اُٹھاتا بس جو سرسری توجہ سے سمجھ میں آ گیا وہ آ گیا ورنہ چھوڑ دیتا ہوں زیادہ کاوش نہیں کرتا۔ بس اس پر عمل ہے اِذَا لَمْ تَسْتَطِعْ شَیْئًا فَدَعْهُ ۔ نیز دشوار طریق کو چھوڑ کر سہل طریق اختیار کرنے میں اس حدیث پر عمل کرتا ہوں :-

"ما خیر صلی اللہ علیہ وسلم فی امرین الا اختار ایسرھما۔"

حضرتؒ کسی کام میں اگر کسی شخص کی بے پرواہی اور بے خیالی دیکھتے تو سخت ناگواری ہوتی اور اس کو متنبہ فرماتے۔

فرماتے تھے کہ کوئی شخص اگر اپنی کسی غلطی پر خواہ مخواہ کی تاویلات کرتا ہے اور صریحاً اعتراف سے گریز کرتا ہے تو ایسی حالت میں طبیعت میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح فرماتے تھے کہ بہت طویل خطوط سے خصوصاً جب غیر ضروری باتیں تحریر ہوں تو بہت کلفت ہوتی ہے اور ایک خط میں دو مختلف مضامین سے زیادہ

بقیہ مضمون صفحہ ۹۸ پر ملاحظہ کریں

انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد دُنیا کے مقدس ترین انسانوں کی سرگزشتِ حیات

سِیَرُ الصحابہ رضی اللہ عنہم

تاریخ اسلام، اسماء الرجال اور ذخیرۂ احادیث کی گرانقدر کتابوں سے ماخوذ مستند حوالہ جات پر مبنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیز مشہور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ کرام رحمہم اللہ کے مفصل حالاتِ زندگی پر اُردو میں سب سے جامع کتاب

جلد اول ۱
خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
جلد دوم ۲
سیر مہاجرین کامل ۲ حصے
جلد سوم ۳
سیر انصار کامل ۲ حصے
جلد چہارم ۴
چار کبار صحابہؓ، ۵۰ اصاغر صحابہؓ

جلد پنجم ۵
اسوۂ صحابہؓ کامل ۲ حصے
جلد ششم ۶
سیر الصحابیاتؓ، اسوۂ صحابیاتؓ، اہل کتاب صحابہؓ
جلد ہفتم ۷
تابعین کرام
جلد ہشتم ۸
تبع تابعین

مکمل چودہ حصے آٹھ جلدوں میں مجلد، پانچ ہزار کے قریب صفحات، عمدہ کتابت وطباعت ودبیز عمدہ کاغذ، مضبوط ڈائی دار جلد، مکمل سیٹ ۸ جلد مجلد قیمت ۵۲/-

طلب فرمائیے: **اِدارۂ اسلامیات** ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور
(فون ۔ ۲۲۳۵۳)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خانگی حالات

ماخوذ از : مآثر حکیم الامتؒ

* * *

ازواجِ محترمات

حضرتؒ والا کی ازواجِ محترمات دو تھیں اور بفضلہٖ تعالےٰ دونوں نہایت شفیق غرباء پرور، متوکل، قانع، مہمان نواز اور حضرتؒ والا کی نہایت مزاج شناس اور خدمت گزار تھیں۔

حضرتؒ والا کے دوسرے عقد کا مفصّل حال خود حضرتؒ والا کے قلم مبارک کا لکھا ہوا رسالہ "اصلاح انقلاب اُمّت" میں موجود ہے (الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ)

حضرتؒ والا کو عدل کا اس درجہ اہتمام تھا کہ شاید و باید، شروع شروع میں عدل کی جزئیات دقیقہ کی رعایت میں بڑی دشواری پیش آئی۔ لیکن چونکہ حضرت والا حقوق العباد کے متعلق خاص طور سے بہت ہی زیادہ محتاط تھے اس لئے برابر فکر و اہتمام بلیغ میں مشغول رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حسبِ وعدہ ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ سب دشواریوں کو آسان فرمادیا اور رفتہ رفتہ ساری جزئیات عدل کے متعلق طریق عمل سمجھ میں آگیا جو علماً اور عملاً ہر لحاظ سے سہل تھا۔

اسی رعایت جزئیاتِ عدل کی بنا پر حضرت والا نے بعض کے اس کہنے پر کہ آپ نے تو عقدِ ثانی کا دروازہ کھول دیا یہ جواب ارشاد فرمایا کہ نہیں میں نے دروازہ کھولا نہیں ہے بلکہ بند کردیا ہے کیونکہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑے گی تو اس کو دشوار سمجھ کر عقدِ ثانی کی ہمت ہی نہ کرسکیں گے۔

چنانچہ حضرتؒ والا نے عدل کی دشواریوں ہی کا ذاتی تجربہ فرما کر اس مضمون میں جو اپنے عقد ثانی کے متعلق اصلاحِ انقلابِ امت میں تحریر فرمایا ہے، دوسروں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ ع

من نکردم شما حذر بکنید

حضرتؒ والا کے اہتمام جزئیاتِ عدل کے متعلق اس زمانہ کا ایک ملفوظ یاد آیا جبکہ نیا نیا عقد ثانی کیا تھا۔ فرمایا کہ میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلافِ عدل سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہو گی جس کی باری ہے اور یہ اُس کی حق تلفی ہے۔ اسی طرح اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت پیدا ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔ اھ

اسی سے اندازہ لگا لیا جائے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو عدل کا کس درجہ اہتمام رہا ہے۔

حضرت والا نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے تھے دونوں کو برابر دیتے تھے اور اس کا یہاں تک اہتمام تھا کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کے لئے جو وزن کی جاتی ہیں ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا تھا جس کو مزاحاً آپ میزانِ عدل فرمایا کرتے تھے۔ کھانا بھی ایک دن ایک گھر میں تناول فرماتے تھے اور ایک دن دوسرے گھر میں اور رمضان المبارک میں افطار کے وقت بڑے گھر اور سحر کے وقت چھوٹے گھر۔

گو برادری میں ادائے مہر کا عام دستور نہیں تھا لیکن حضرتؒ والا نے دونوں گھروں میں مہر ادا فرما دیا۔ بلکہ حضرتؒ والا تو فرمایا کرتے تھے کہ اگر عورت مہر معاف بھی کر دے تب بھی مرد کی غیرت کا مقتضا یہی ہونا چاہئیے کہ وہ پھر بھی مہر ادا کر دے اور حضرتؒ والا کے نزدیک وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی کی راجح تفسیر یہی ہے۔

حضرتؒ والا کو تو اس امر میں اتنی غیرت تھی کہ گھر والوں کے ایک پیسے کے احسان کے بھی روادار نہیں تھے۔ لیکن خشکی اور دل شکنی کا معاملہ کسی حال میں نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرتؒ والا دونوں گھروں میں خاص اپنے کھانے کا خرچ الگ دیا کرتے تھے۔ جب دونوں نے بہت اصرار کیا کہ بس اب تو یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا اس کو موقوف کیجئے تو

حضرتؒ والا نے موقوف فرما دیا لیکن پھر یکمشت غالباً ایک ایک ہزار یا کچھ کم یا زیادہ دونوں کو ان کے حصہ موظفہ سے زائد اپنے حصہ میں سے دے دیا۔ کیونکہ حضرتؒ والا اپنی فتوحات کے تین حصے فرما کر ایک ایک حصہ دونوں گھروں میں دے دیتے تھے اور ایک حصہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ رقم مذکور دیتے وقت تو کچھ نہیں فرمایا لیکن بعد کو مزاح کے لہجہ میں ظاہر فرما دیا کہ میں نے کرایہ مکان اور اپنی خوراک کا حساب لگا کر ۱۳۷۰ھ تک کا روپیہ یکمشت دے دیا ہے۔ کرایہ مکان اس لئے ادا فرماتے کہ دونوں مکانوں کو دونوں کی مِلک فرما چکے تھے اور چونکہ حضرت والا بھی دونوں مکانوں سے متمتع ہوتے رہتے تھے اس لئے اس تمتع کا معاوضہ ادا فرماتے رہتے تھے۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ دونوں گھروں میں ہر طرح کے معاملات و ضروریاتِ زندگی اور ادائے حقوق میں چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں مساوات کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ الحمد للہ ان میں سے کسی کو بھی آج تک مجھ سے اس معاملہ میں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ جس قسم کے بھی ہدیے آتے ہیں ان کے تین مساوی حصے کر لیتا ہوں ایک حصہ اپنے لئے اور دو حصے دونوں گھروں کے لئے۔ ان کے روزمرہ کے اخراجات اور لوازمات و ضروریاتِ خانگی کے لئے اندازہ و حساب کر کے ایک رقم ماہانہ دونوں کو دے دیتا ہوں جس سے وہ راضی و قانع رہتی ہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی قسم کی فرمائش کریں۔ اپنے کھانے وغیرہ کا بھی حساب کر کے ان کی ماہانہ رقم میں شامل کر دیتا ہوں۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ جب گھر جاتا ہوں تو پہلے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹا کر سلام کرتا ہوں جواب آنے پر اندر جاتا ہوں اس کا خیال رکھتا ہوں کہ اگر کوئی عورت مہمان ہو تو اس کو پردے کا موقع مل جائے۔ گھر والوں سے ہمیشہ خوش مزاجی اور نرمی کرتا ہوں اور ان کی باتیں دلچسپی سے سنتا ہوں۔ اگر وہ کسی ایسے کام میں مشغول ہوں جس میں میں کچھ شرکت کر سکتا ہوں تو شریک ہو جاتا ہوں۔ ان کے اصلاحِ خیال و اصلاحِ اعمال پر ہمیشہ نظر رکھتا ہوں۔ گھر میں اپنی ضروریات کی چیزیں علیحدہ رکھتا ہوں اور جو چیز جہاں سے اٹھاتا ہوں پھر اسی جگہ رکھتا ہوں اوروں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں اس میں بڑی راحت و مصلحت ہے کہ ضرورت کے وقت ادھر ادھر تلاش کرنے میں پریشانی نہیں ہوتی۔ گھر والوں کے استعمال کی چیز اگر ضرورتاً استعمال کرتا ہوں تو جس حالت میں جس جگہ سے اٹھاتا ہوں اسی حالت میں اسی جگہ واپس رکھ دیتا ہوں۔

اگر کوئی کھانا وغیرہ کسی کے برتن میں کسی کے یہاں سے آتا ہے تو تاکیداً برتن کو اسی وقت واپس کرا دیتا ہوں تاکہ بھیجنے والے کو اس کے جلد واپس نہ ہونے سے تکلیف و حرج نہ ہو۔

اسی طرح سہواً چاہے کبھی خلاف ہو گیا ہو تو ہو گیا ہو مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی گھر میں کھانا کھا کر یہ کہا ہو کہ برتن اٹھا لو بلکہ میں کہتا ہوں کہ برتن اٹھوا لو۔ گو وہ محکوم ہیں لیکن ان کی حاکمیت کا جو ان کو گھر میں اپنے محکومین پر حاصل ہے لحاظ رکھتا ہوں کیونکہ محکومین کا بھی احترام چاہیئے۔ پھر چاہے وہ خود اٹھا لیں یا کسی اور سے اٹھوا لیں۔ میں نوکرانی سے بھی خود کسی کام کے لئے نہیں کہتا بلکہ میں تو گھر میں کہتا ہوں اور وہ نوکرانی سے کہتی ہیں کیونکہ نوکرانی براہ راست انہی کی محکوم ہے اس میں بھی ان کی حاکمیت کو ملحوظ رکھتا ہوں۔ نیز اجنبی عورت سے بلا ضرورت خطاب بھی ایک درجہ میں خلافِ حیا ہے۔

دونوں ازواج کے اعزہ واقربا سے بھی ان کے مراتب کے لحاظ سے ہمیشہ حسنِ سلوک اور مراعات کا معاملہ کرتا ہوں۔ دونوں گھروں میں ایک ایک روز باری باری قیام کرنیکا معمول ہے لیکن بعد عصر روزانہ تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے دونوں گھروں میں ہو آتا ہوں جس قدر وقت ایک جگہ صرف کرتا ہوں گھڑی دیکھ کر اتنا ہی وقت دوسری جگہ صرف کرتا ہوں کبھی ایک گھر کا ذکر دوسرے گھر میں نہیں کرتا اور نہ ہونے دیتا ہوں۔ الحمدللہ! ان دونوں میں آپس میں محبت اور یگانگت بھی ہے۔ الحمدللہ طبیعت پر اس قدر قابو ہے اور عادت ہو گئی ہے کہ ایک گھر کے تاثرات کو دوسرے گھر تک جانے میں بالکل بھول جاتا ہوں اور قلب کو بالکل فارغ پاتا ہوں۔

غرض حضرتؒ والا جب تک گھروں میں رہتے بہت بے تکلف اور ہشاش بشاش رہتے۔ مخدومیت کی شان سے نہیں رہتے اور گھر والوں کی طرف ایسے ملتفت رہتے جیسے ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہو اور اس وقت ہوتا بھی یہی حال ہے لیکن جب تھوڑی دیر بعد پھر خانقاہ میں تشریف لا کر مشغول مشاغل دینیہ ہو جاتے تو پھر ایسا معلوم ہوتا کہ گویا کسی سے کچھ تعلق ہی نہیں۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی عام طور سے بہت تاکید فرماتے رہتے اور جب کسی کے تشدد کا حال سنتے تو حضرتؒ والا کا دل بہت ہی کڑھتا اور فرماتے کہ عورتیں بے چاریاں ہر طرح بس شوہر ہی کے رحم و کرم پر ہوتی ہیں سوائے شوہر

کے اور اُن کا کون ہوتا ہے؟ لہٰذا بہرحال رحم ہی کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور ہندوستان کی عورتیں تو عموماً اپنے شوہر کی فدائی ہوتی ہیں اور اُن کے اوپر تشدّد تو اور بھی بے رحمی ہے اور عموماً عفیف بھی ایسی ہوتی ہیں جیسے حُوریں۔ جن کی صفت قرآن مجید میں قاصرات الطرف بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مَردوں میں تو نامحرم کے وسوسوں سے شاید ہی کوئی بچا ہُوا ہو اور شریف عورتیں قریب قریب سب ہی ایسی ہیں کہ اُن کو کبھی عمر بھر بھی کسی غیر مرد کا وسوسہ تک نہ آیا ہو گا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دونوں بیویوں میں سے کسی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اولاد کا ہونا اللہ تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے اور نہ ہونا بھی بڑی رحمت ہے۔ اگر میں صاحبِ اولاد ہوتا تو شاید یکسوئی کے ساتھ اس قدر کام نہ ہو سکتا جتنا کہ مَیں نے اس حالت میں کر لیا ہے۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس بنا پر (کہ اپنے بعد بھی بیویوں کی آسائش کی فکر سنت ہے چنانچہ ترمذی کی ایک حدیث مرفوع میں اس کی تصریح بھی ہے اور نیز امر طبعی بھی ہے) اپنے بعد اپنی دونوں ازواجِ محترمات کی کفالت کے لئے اپنے بہت ہی خاص مخصوصین کو بعنوان عام وصیت بھی فرمائی۔ جس کا ذکر باب وصایا میں ملاحظہ سے گزرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(اشرف السوانح)

ملازموں کے ساتھ معاملہ

فرماتے تھے کہ ملازموں کو بھی تنخواہ توقیر کے ساتھ دیتا ہوں ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں پھینک کر نہیں دیتا جیسا کہ متکبرین کا شعار ہے۔

جب گھر کے لوگ نہیں ہوتے اور صبح کو ملازم کے ساتھ گھر سے باہر جانا ضروری ہوتا ہے تو ملازم کے بیدار ہونے کے بعد میں قصداً کسی کام میں مشغول ہو جاتا ہوں تاکہ وہ باطمینان اپنی ضروریات سے فارغ ہو لے اور میرا ارادہ اور انتظار دیکھ کر اس کو عجلت نہ ہو۔

(اشرف المعمولات)

ملازموں سے کوئی ایسا کام نہیں لیتا جو اُن پر بار ہو یا طبعاً ناگوار ہو۔ جو کام اطمینان کے

اور سمجھ کر کرنے کے ہوتے ہیں پہلے ملازم کو اچھی طرح سمجھا دیتا ہوں اور پھر اطمینان بھی کر لیتا ہوں کہ وہ میرا مطلب اور کام کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ اپنی روزمرہ کی ضروریات اور راحت کے لئے بہت مختصر اور سادہ سامان رکھتا ہوں۔ مجھے تکلّفات سے بالطبع وحشت ہوتی ہے۔

اپنے ضروری کام خود کر لیتا ہوں اس کے لئے نہ گھر والوں کو اور نہ ملازم کو کسی طرح مکلّف نہیں کرتا اور نہ اپنا ایسا کام کسی پر منحصر کرتا ہوں کہ اس کے پورا ہونے کے لئے مجھے انتظار کرنا پڑے۔ مجبوری اور معذوری کی اور بات ہے۔ مجھے خود اپنی اور دوسروں کی فراغتِ قلب بہت عزیز ہے۔

آج کل لوگوں کو دوسرے کی راحت و تکلیف کا ذرا خیال نہیں۔ اب اگر کوئی انتظام کرنے لگے تو اسے قانون ساز کہتے ہیں۔ چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں۔ ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں۔ انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام، ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۵۳)

مصارفِ خیر

حضرتؒ کے وصال کے بعد یادداشتوں سے یہ پتہ چلا کہ جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے۔ دو حصے دونوں گھروں میں دیدیتے ایک حصہ اپنے لئے رکھ لیتے مگر فرماتے کہ میرے پاس زیادہ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے اس لئے جب معتدبہ رقم جمع ہو جاتی ہے تو اس کو بھی دونوں گھروں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ آخر میں اپنا حصہ کچھ نہ رکھتے بلکہ جو رقمیں آتی لائیں اپنے پاس رکھتے جاتے اور جو ذاتی ضرورت ہوتی اس میں سے پوری کرتے رہتے۔ باقی مہینہ کے آخر میں دونوں گھروں میں تقسیم فرما دیتے یا اہلِ حاجت کو دیدیا کرتے تھے۔

علاوہ ان کے صدقاتِ مالیہ جاریہ بھی حضرت اقدس نے بہت کئے چنانچہ بعض کمپنیوں میں حصص خرید کر وقف فرما دیئے اور ایک قطعہ زمین خرید کر وقف فرما دی اور بعض باغات بھی خرید کر وقف فرما دیئے اور اسی طرح ایک مکان بھی۔ ان سب کے متعلق مفصّل اور واضح طور پر سب شرائط وصایا

میں لکھ کر شائع فرما دیئے۔ وقف کرنے کا تو اتنا شوق تھا کہ فرمایا ایک بار دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر میرے پاس کہیں سے ایک لاکھ روپیہ آجائے تو کیا کروں؟ چونکہ طبع مبارک نہایت ہی حساس تھی محض اس خیال کے آنے سے بھی الجھن پیدا ہو گئی اور جب اس کا مصرف ذہن نے تجویز کر لیا اس وقت سکون ہوا۔ چنانچہ وہ مصرف یہ سوچا کہ سارے تھانہ بھون کی زمین خرید کر وقف کر دوں تاکہ ایک مقام تو خالص دار الاسلام ہو جائے۔

سبحان اللہ کیا جذبات تھے کیا خیالات تھے کیا حالات تھے۔ علاوہ اوقاف مذکورہ بالا کے اپنا ایک بڑا کتب خانہ بھی جس میں زیادہ تر خود اپنی ہی تصانیف تھیں مدرسہ سہارنپور میں بھیج دیا اور وقف فرما دیا۔ اسی طرح بعض اور متفرق کتابیں مدرسہ دیوبند اور مدرسہ سہارنپور اور دیگر مدارس میں موقع بموقع بھیجتے رہتے تھے۔ نیز بڑی رقمیں صرف فرما کر بڑی بڑی اور مفید کتابیں تصنیف کرا کے شائع فرماتے رہے، مثلاً اعلاء السنن، بوادر النوادر، حیلۂ ناجزہ گو ان میں سے اکثر دوسروں کی بھیجی ہوئی رقوم سے شائع ہوئیں لیکن بوقتِ ضرورت خود بھی مالی شرکت فرماتے اور خرید فرما کر بھی تقسیم فرما دیتے۔

صدقاتِ مالیہ کا تو یہ حال تھا کہ شروع ہی سے برابر اپنے فتوحاتِ مالیہ سے چوتھائی حصہ علاوہ زکوٰۃ کے صدقاتِ نافلہ میں صرف فرماتے رہے اور اس سے زائد بھی۔ چنانچہ اس مد کی کاپی الگ تھی۔ بعض خاص ضرورت کے مواقع پر بڑی بڑی رقوم اس مد میں پیشگی خرچ فرما دیتے تھے پھر مجرا ہوتا رہتا۔ اسی طرح ربع آمدنی کے حساب سے اپنی عمر میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ صدقات میں صرف کر ڈالے بلکہ ترکہ کا ربع حصہ کارہائے خیر میں صرف کئے جانے کی وصیت فرما گئے جن کی تفصیل مندرجۂ وصیت ہے اور جس کے صرف کا انتظام اب بھی جاری ہے۔

اس کے علاوہ ہزارہا روپیہ لوگ حضرت اقدسؒ کو اعلیٰ درجہ کا امین اور مصارفِ خیر کا بہترین جاننے والا اور موقع شناس سمجھ کر اپنی طرف سے امورِ خیر میں صرف کرنے کے لئے بھیجتے رہتے تھے ان کا ثواب حضرت اقدسؒ کو الگ ملتا تھا۔ کوئی سائل خالی نہ جاتا حسبِ گنجائش و مصلحت ضرور کچھ نہ کچھ خدمت فرماتے بشرطیکہ خود کوئی گڑبڑ نہ کرے اور اصول صحیحہ جو بتائے جائیں ان پر عمل کرے۔ اہلِ خانقاہ، اہلِ قصبہ، متعلقین، غیر متعلقین، مقامی اور بیرونی سب حاجتمندوں کی ضروریات پر جہاں تک علم ہو سکتا نظر رکھتے اور حسبِ مواقع اعانت فرماتے رہتے۔ بعض خاص

کے اور اُن کا کون ہوتا ہے؟ لہٰذا بہر حال رحم ہی کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور ہندوستان کی عورتیں تو عموماً اپنے شوہر کی فدائی ہوتی ہیں اور اُن کے اوپر تشدد تو اور بھی بے رحمی ہے اور عموماً عفیف بھی ایسی ہوتی ہیں جیسے حوریں۔ جن کی صفت قرآن مجید میں قاصرات الطرف بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مَردوں میں تو نامحرم کے وسوسوں سے شاید ہی کوئی بچا ہُوا ہو اور شریف عورتیں قریب قریب سب ہی ایسی ہیں کہ اُن کو کبھی عمر بھر بھی کسی غیر مرد کا وسوسہ تک نہ آیا ہو گا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دونوں بیویوں میں سے کسی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اولاد کا ہونا اللہ تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے اور نہ ہونا بھی بڑی رحمت ہے۔ اگر میں صاحب اولاد ہوتا تو شاید یکسوئی کے ساتھ اس قدر کام نہ ہو سکتا جتنا کہ مَیں نے اس حالت میں کر لیا ہے۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس بنا پر (کہ اپنے بعد بھی بیویوں کی آسائش کی فکر سنت ہے چنانچہ ترمذی کی ایک حدیث مرفوع میں اس کی تصریح بھی ہے اور نیز امر طبعی بھی ہے) اپنے بعد اپنی دونوں ازواجِ محترمات کی کفالت کے لئے اپنے بہت ہی خاص مخصوصین کو بعنوان عام وصیت بھی فرمائی۔ جس کا ذکر باب وصایا میں ملاحظہ سے گزرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(اشرف السوانح)

ملازموں کے ساتھ معاملہ

فرماتے تھے کہ ملازموں کو بھی تنخواہ توقیر کے ساتھ دیتا ہوں ان کے سامنے رکھ دیتا ہوں پھینک کر نہیں دیتا جیسا کہ متکبرین کا شعار ہے۔

جب گھر کے لوگ نہیں ہوتے اور صبح کو ملازم کے ساتھ گھر سے باہر جانا ضروری ہوتا ہے تو ملازم کے بیدار ہونے کے بعد میں قصداً کسی کام میں مشغول ہو جاتا ہوں تاکہ وہ باطمینان اپنی ضروریات سے فارغ ہو لے اور میرا ارادہ اور انتظار دیکھ کر اس کو عجلت نہ ہو۔

(اشرف المعمولات)

ملازموں سے کوئی ایسا کام نہیں لیتا جو اُن پر بار ہو یا طبعاً ناگوار ہو۔ جو کام اطمینان کے

اور سمجھ کر کرنے کے ہوتے ہیں پہلے ملازم کو اچھی طرح سمجھا دیتا ہوں اور پھر اطمینان بھی کر لیتا ہوں کہ وہ میرا مطلب اور کام کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ اپنی روزمرہ کی ضروریات اور راحت کے لئے بہت مختصر اور سادہ سامان رکھتا ہوں۔ مجھے تکلفات سے بالطبع وحشت ہوتی ہے۔

اپنے ضروری کام خود کر لیتا ہوں اس کے لئے نہ گھر والوں کو اور نہ ملازم کو کسی طرح مکلّف نہیں کرتا اور نہ اپنا ایسا کام کسی پر منحصر کرتا ہوں کہ اس کے پورا ہونے کے لئے مجھے انتظار کرنا پڑے۔ مجبوری اور معذوری کی اور بات ہے۔ مجھے خود اپنی اور دوسروں کی فراغتِ قلب بہت عزیز ہے۔

آج کل لوگوں کو دوسرے کی راحت و تکلیف کا ذرا خیال نہیں۔ اب اگر کوئی انتظام کرنے لگے تو اسے قانون ساز کہتے ہیں۔ چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر عنایت فرماؤں نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں۔ ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں۔ انگریزوں کا سا قانون ہر بات میں انتظام، ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۵۳)

مصارفِ خیر

حضرتؒ کے وصال کے بعد یادداشتوں سے یہ پتہ چلا کہ جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے۔ دو حصے دونوں گھروں میں دیدیتے ایک حصہ اپنے لئے رکھ لیتے مگر فرماتے کہ میرے پاس زیادہ روپیہ جمع ہو جاتا ہے تو مجھے وحشت ہونے لگتی ہے اس لئے جب معتد بہ رقم جمع ہو جاتی ہے تو اس کو بھی دونوں گھروں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ آخر میں اپنا حصہ کچھ نہ رکھتے بلکہ جو رقمیں آتی تھیں اپنے پاس رکھتے جاتے اور جو ذاتی ضرورت ہوتی اس میں سے پوری کرتے رہتے۔ باقی مہینہ کے آخر میں دونوں گھروں میں تقسیم فرما دیتے یا اہلِ حاجت کو دیدیا کرتے تھے۔

علاوہ ان کے صدقات مالیہ جاریہ بھی حضرت اقدس نے بہت کئے چنانچہ بعض کمپنیوں میں حصص خرید کر وقف فرما دیئے اور ایک قطعہ زمین خرید کر وقف فرما دی اور بعض باغات بھی خرید کر وقف فرما دیئے اور اسی طرح ایک مکان بھی۔ ان سب کے متعلق مفصّل اور واضح طور پر سب شرائط وصایا

میں لکھ کر شائع فرما دیئے۔ وقف کرنے کا تو اتنا شوق تھا کہ فرمایا ایک بار دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر میرے پاس کہیں سے ایک لاکھ روپیہ آجائے تو کیا کروں؟ چونکہ طبع مبارک نہایت ہی حساس بھی محض اس خیال کے آنے سے بھی الجھن پیدا ہو گئی اور جب اس کا مصرف ذہن نے تجویز کر لیا اس وقت سکون ہوا۔ چنانچہ وہ مصرف یہ سوچا کہ سارے تھانہ بھون کی زمین خرید کر وقف کر دوں تاکہ ایک مقام تو خالص دارالاسلام ہو جائے۔

سبحان اللہ کیا جذبات تھے کیا خیالات تھے کیا حالات تھے۔ علاوہ اوقاف مذکورہ بالا کے اپنا ایک بڑا کتب خانہ بھی جس میں زیادہ تر خود اپنی ہی تصانیف تھیں مدرسہ سہارنپور میں بھیج دیا اور وقف فرما دیا۔ اسی طرح بعض اور متفرق کتابیں مدرسہ دیوبند اور مدرسہ سہارنپور اور دیگر مدارس میں موقع بموقع بھیجتے رہتے تھے۔ نیز بڑی بڑی رقمیں صرف فرما کر بڑی بڑی اور مفید کتابیں تصنیف کرا کے شائع فرماتے رہے، مثلاً اعلاء السنن، بوادر النوادر، حیلۂ ناجزہ گو ان میں سے اکثر دوسروں کی بھیجی ہوئی رقوم سے شائع ہوئیں لیکن بوقتِ ضرورت خود بھی مالی شرکت فرماتے اور خرید فرما کر بھی تقسیم فرما دیتے۔

صدقاتِ مالیہ کا تو یہ حال تھا کہ شروع ہی سے برابر اپنے مفتوحاتِ مالیہ سے چوتھائی حصہ علاوہ زکوٰۃ کے صدقاتِ نافلہ میں صرف فرماتے رہے اور اس سے زائد بھی۔ چنانچہ اس مد کی کاپی الگ تھی۔ بعض خاص ضرورت کے مواقع پر بڑی بڑی رقوم اس مد میں پیشگی خرچ فرما دیتے تھے پھر مجرا ہوتا رہتا۔ اسی طرح ربع آمدنی کے حساب سے اپنی عمر میں ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ صدقات میں صرف کر ڈالے بلکہ ترکہ کا ربع حصہ کارہائے خیر میں صرف کئے جانے کی وصیت فرما گئے جن کی تفصیل مندرجۂ وصیت ہے اور جس کے صرف کا انتظام اب بھی جاری ہے۔

اس کے علاوہ ہزارہا روپیہ لوگ حضرت اقدسؒ کو اعلیٰ درجہ کا امین اور مصارفِ خیر کا بہترین جاننے والا اور موقع شناس سمجھ کر اپنی طرف سے امورِ خیر میں صرف کرنے کے لئے بھیجتے رہتے تھے ان کا ثواب حضرت اقدس کو الگ ملتا تھا۔ کوئی سائل خالی نہ جاتا حسبِ گنجائش و مصلحت ضرور کچھ نہ کچھ خدمت فرماتے بشرطیکہ خود کوئی گڑبڑ نہ کرے اور اصول صحیحہ جو بتائے جائیں ان پر عمل کرے۔ اہلِ خانقاہ، اہلِ قصبہ، متعلقین، غیر متعلقین، مقامی اور بیرونی سب حاجتمندوں کی ضروریات پر جہاں تک علم ہو سکتا نظر رکھتے اور حسبِ مواقع اعانت فرماتے رہتے۔ بعض خاص

خاص مواقع پر بالخصوص اہلِ علم اور شرفاء کے اہلِ حاجت متعلقین کو بڑی بڑی رقمیں بھی عطا فرمائی گئیں اور متعدد اہلِ حاجت کو ماہوار رقمیں بھی دی جاتیں۔ مگر بمصالح سب سے شرط یہ تھی کہ بذریعہ پرچہ یا کارڈ ماہوار یاد دہانی کی جایا کرے۔ اگر کسی کو اصلاح کے سلسلہ میں کوئی ایسا مشورہ دیا جاتا جس میں خرچ کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے مالی اعانت میں شریک ہونے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے۔ مواقع خیر کے ہمیشہ متلاشی رہتے۔ بڑے بڑے چندے بھی کارِ خیر میں دیتے رہتے تھے۔ اکثر دیکھا کہ کبھی کپڑے مساکین کو تقسیم کئے جا رہے ہیں، کبھی نقد، کبھی طعام، خیرات بھی بڑے انتظام سے اور اصول سے کرتے جیسا کہ ہر چھوٹے بڑے کام میں معمول تھا۔

* * *

بقیہ از صـ ۸۹

اگر ہوں تب بھی گرانی ہوتی ہے۔

فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ایک خط میں کوئی فقہی مسئلہ دریافت کرے اور اس کے ساتھ کوئی باطنی حال یا تصوف کے متعلق کچھ دریافت کرے تو اس وقت بھی ناگواری ہوتی ہے اور جواب میں تحریر فرما دیتے تھے کہ ایک خط میں صرف ایک ہی مضمون ہونا چاہیئے۔ اگر پوچھنا ہی ہے تو الگ الگ خطوں میں مضمون مذکورہ لکھا جائے۔

خانقاہِ اشرفیہ

پروفیسر مسعود احسن علوی

* * *

حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

"جی چاہتا ہے کہ حضرت کی خانقاہ کی کچھ تفصیلات بیان کی جائیں، یہ باتیں بھی اس وقت مجھ سے سُن لیجئے ورنہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھر کوئی دوسرا اس کو بیان بھی نہ کرسکے۔ چونکہ محبوب سے ایک خاص تعلقِ قلبی ہوتا ہے اس لئے اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز میں محبوبیت اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے۔ تذکرہ میں بھی لطف آتا ہے اس کے سننے میں بھی انبساط و کیف ہوتا ہے ؎

کچھ یہی محسوس ہوتا ہے وفورِ شوق میں
ہر ادائے دوست جیسے میرے دل کا راز ہے

یہ ایک عجیب بات ہے اور شاید یہ بات مقدر ہوچکی تھی کہ اب سے تقریباً چالیس سال قبل میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور خانقاہ میں مقیم تھا۔ ایک دن خیال آیا کہ اس خانقاہ کے متعلق اور حضرت کے معمولات کے متعلق اور اہلِ خانقاہ کے متعلق کچھ یادداشت لکھوں۔ چنانچہ جہاں تک نظر گئی ایک ایک بات تحریر کرتا رہا۔ کافی مضمون ہوگیا مگر پھر اس کے بعد کبھی اس یادداشت کی یاد بھی نہ آئی۔ اب اس وقت جبکہ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت کے متعلق کچھ عرض کیا کرتا ہوں اس تحریری یادداشت کا خیال ذہن میں آیا۔ تلاش کرنے پر الحمد للہ مل گئی۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس وقت جو کچھ لکھ لیا تھا اب تو حافظہ ہزار یادیں تازہ کرے ان معمولی معمولی جزئیات پر ہرگز نظر نہ جائے گی۔

اب آپ مطالعہ کریں خود اندازہ ہوگا اور آپ کے سامنے حضرت کی سادہ زندگی

بے تکلف معمولات، ضابطہ اور نظم و نسق کی تصویر انشاء اللہ سامنے آ جائے گی۔ میرا اپنا گمان ہے کہ یہ مضمون اپنے اندر بہت سی افادیت لئے ہوئے ہے اس کے مطالعہ سے آئندہ نسلوں کے لئے اس مجدد العصر کی جائے قیام، نشست و برخاست کا نقشہ و خاکہ انشاء اللہ بہت سبق آموز ہوگا۔ وَمَا توفیقی الا باللہ العظیم۔

محلِ وقوع

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ یہ خانقاہ کہاں واقع ہے۔ قصبہ تھانہ بھون ایک پرانا قصبہ ہے (ضلع مظفرنگر۔ یوپی۔ ہندوستان) جو سہارنپور اور دہلی، شاہدرہ کے درمیان واقع ہے۔ اس زمانہ میں یہاں کے اسٹیشن کا نام تھانہ بھون "ٹاؤن" تھا اسٹیشن اور قصبہ کے درمیان چند کھیت کا فاصلہ ہے جہاں سے آبادی شروع ہوتی ہے وہاں آگے چل کر داہنی طرف خانقاہِ اشرفیہ کا پھاٹک ہے جو کافی بلند ہے اور اس میں کواڑ لگے ہیں۔ اس خانقاہ میں مسجد بھی ہے مدرسہ بھی کتب خانہ بھی ہے اور مہمان خانہ بھی۔ یہ خانقاہ پختہ لکھوری[1] اینٹ سے بنی ہوئی ہے۔ کسی زمانے میں یہ خانقاہ دوکانِ معرفت کہلاتی تھی اس میں تین بزرگ رہا کرتے تھے:۔

حضرت حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز
حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید قدس سرہ العزیز
حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث قدس سرہ العزیز۔

یہ تینوں بزرگ حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہ کے خلفاء تھے۔ غدر کے زمانے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز مکہ معظمہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ شہید ہو گئے اور حضرت مولوی شیخ محمد صاحبؒ وفات پا گئے۔ خانقاہ کچھ عرصہ کے لئے خالی ہو گئی۔ پھر کچھ طویل مدت کے بعد حضرت حاجی شاہ محمد امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (جو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد تھے) کے ایماء اور حکم سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس خانقاہ میں سکونت

---

[1] چھوٹی اینٹ

اختیار کی اور آخر عمر تک تقریباً ساٹھ سال یہاں قیام فرمایا۔ رفتہ رفتہ یہ خانقاہ مرجع خلائق بن گئی۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے لاکھوں طالبانِ حق اور تشنگانِ طریق مسلسل آتے جاتے رہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوتے رہے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بحرِ ذخارِ علوم و معارف اور حقائق سے سیراب ہوتے رہے اور حضرت کے مواعظ و ملفوظات سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔ اسی عرصۂ قیام و عرصۂ حیات میں حضرت رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے دین کے تمام شعبوں میں تقریباً ایک ہزار تصانیف کا ذخیرہ صدیوں تک کے لئے آئندہ نسلوں کے لئے بہم پہنچایا ہے۔ ذٰلِکَ فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء وما توفیقی الا باللّٰہ العظیم۔ اور ملک کے ہر گوشہ میں حضرتؒ کے فیض یافتہ حضرتؒ کی حیات ہی میں کثیر تعداد میں خلفاءِ مجازین کی صورت میں موجود تھے جن سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا۔

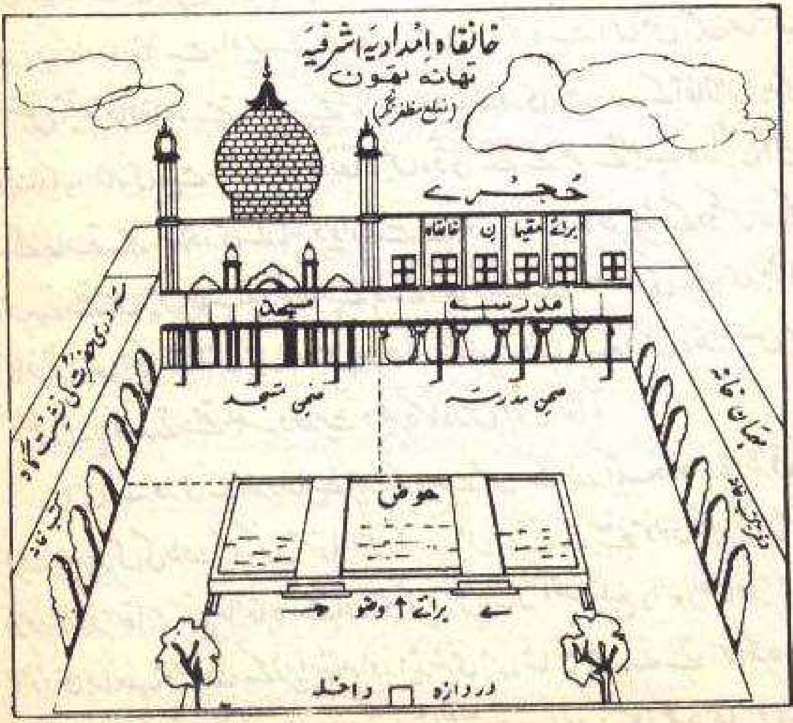
خانقاہ امدادیہ اشرفیہ
تھانہ بھون
(ضلع مظفرنگر)
حجرے
برائے مقیمان خانقاہ
مسجد
مدرسہ
صحن مسجد
صحن مدرسہ
سہ دری حضرت کی نشست گاہ
مہمان خانہ
حوض
برائے وضو
دروازہ داخلہ

عمارتِ خانقاہ

اس خانقاہِ مقدس میں جب داخل ہوتے ہیں تو پہلے اس کا پھاٹک ملتا ہے جو کافی بلند ہے۔ اس پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اس کے ہر دو جانب دو مختصر غسل خانے ہیں اور ہر غسل خانے کے آخر میں گرم پانی کا حمام ہے جس میں اندر کی طرف کنوئیں کے قریب دو نل لگے ہوئے ہیں جن سے گرم پانی نکلتا ہے۔ پھاٹک کے آگے بڑھ کر سامنے سیڑھی پر ہو کر اندر صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ زینہ کے متصل بائیں جانب کنواں ہے جس میں چرخی لگی تھی اور رسّی و چمڑے کا ڈول پڑا رہتا تھا۔ زینہ کے بعد سیدھی طرف دیوار سے ملا ہوا چیڑ کا ایک لمبا سا بکس رکھا ہوا تھا اس میں جوتے رکھے جاتے تھے، سیدھی طرف ایک حجرہ ہے اس کے سامنے بھی سردیوں میں وضو کرنے کے لئے اونچی سطح پر نالی بنی ہوئی ہے۔ اس کے بعد زینہ کا دروازہ ہے۔ اوپر کے بالاخانے میں ایک حجرہ ہے اس میں ایک صاحب مستقل مقیم خانقاہ رہتے تھے۔ نیچے شمال کی طرف سہ دری ہے اس کے آغاز میں سیدھی طرف ایک الماری ہے۔ اس میں خانقاہ میں روشنی کے لئے چھوٹے لیمپ و لالٹین وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ سہ دری کے باہر دیوار سے ملے ہوئے ادھر اُدھر چیڑ کے دو بکس رکھے ہوئے تھے جس میں طالب علم وغیرہ اپنے جوتے رکھا کرتے تھے۔ سہ دری کے اندر چٹائی کا فرش بچھا ہوا تھا اس میں مدرس صاحبان مع اپنے طلباء کے درس و تدریس میں مشغول رہا کرتے تھے۔ تفسیر و حدیث وغیرہ کا درس ہوتا تھا۔

اس سہ دری کے اندر سامنے ایک کمرہ ہے جس کے اندر ایک دروازہ مشرق کی طرف باہر سڑک کی طرف بھی کھلتا تھا۔ اس کمرے میں حضرتؒ کے بھتیجے مولوی شبیر علی صاحب مرحوم کا دفتر تھا جو مہتمم خانقاہ تھے اور اسی کمرہ میں رسالہ "التبلیغ والنور" کا دفتر بھی تھا جو مولوی صاحب موصوف کے زیرِ اہتمام اور ایڈیٹری میں شائع ہوتے تھے۔ اس کمرہ کے اندر ایک اور لمبا سا کمرہ تھا اس میں حضرتؒ کی شائع شدہ تصانیف کا ذخیرہ تھا جس کے مالک مولوی شبیر علی صاحب مرحوم تھے وہی اپنے ذاتی مصارف سے ان کی طباعت و اشاعت

کے ذمہ دار تھے۔ اس معاملہ سے حضرتؒ کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ تھا۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کسی تصنیف کا کسی صورت سے بھی کبھی شمہ برابر بھی مالی معاوضہ نہیں لیا اور نہ ہی حق تصنیف محفوظ فرمایا بلکہ تمام تصانیف فی سبیل اللہ وقف فرما دی تھیں جس کا جی چاہے شائع کرے۔ مولوی شبیر علی صاحب مرحوم سے امورِ متعلقۂ خانقاہ وابستہ تھے اور ہر ایک دریافت طلب امر انہی سے متعلق تھا۔

کمرے سے باہر کی سہ دری سے ملی ہوئی ایک اور سہ دری ہے۔ بیچ میں ان دونوں کے ایک محرابی دروازہ ہے گویا دونوں مل کر ایک دالان ہے۔ اس سہ دری میں بھی طالب علم پڑھتے تھے۔ اس آخری سہ دری کے اندر تین دروازوں کا ایک وسیع کمرہ ہے جس میں چٹائی کا ایک فرش بچھا ہوا تھا اور اس کمرہ کے اندر ایک اور کمرہ مختصر سا تین دَر کا ہے اس میں چار پائیاں بھی رہتی تھیں۔ یہ دونوں کمرے مہمان خانے کا نام سے موسوم ہیں اس میں تازہ وارد مہمان مقیم ہوتے تھے اور اپنا اسباب وغیرہ رکھتے تھے۔ پھر صحن کے غرب کی طرف ایک بڑا سا دالان ہے۔ یہ دالان بھی طلباء کے درس و تدریس کے لئے تھا۔ اس میں چھوٹے بچے قرآن شریف حفظ و ناظرہ پڑھتے تھے اس میں بھی چٹائی کا فرش تھا۔ اس دالان کے اندر متعدد مختصر حجرے بنے ہوئے ہیں جن میں بعض طالب علم رہتے تھے۔ اس دالان کے سیدھی طرف ایک پتلا سا گلیارہ ہے اس میں بھی دونوں طرف حجرے بنے ہوئے ہیں اور دالان کے اور اس گلیارہ کے اتصال پر غرب کی طرف ایک زینہ ہے جس سے اُوپر جاتے ہیں اور اس دالان کے چھت پر حجرے بنے ہوئے ہیں ان میں جو لوگ عرصہ تک مہمان رہتے تھے وہ مقیم ہوتے تھے۔ گلیارے میں نیچے جو حجرے ہیں ان کی چھت پر بھی مختصر مختصر حجرے بنے ہوئے ہیں۔

نیچے باہر والے دالان سے ملی ہوئی جنوب کی طرف مسجد ہے۔ اس مسجد میں تین دَر ہیں۔ مسجد میں اندر تین صفیں ہو جاتی تھیں جس میں تقریباً چالیس آدمی نماز پڑھ سکتے تھے مسجد کے باہر رنگین (ٹین کا) سائبان ہے۔ اس میں بھی تقریباً تین صفیں ہوتی تھیں پھر اس کے آگے مسجد کا صحن ہے۔ مسجد کے اندر مغربی جانب میں تین، چار گوشہ نما درجے ہیں۔ ان کے اندر داخل ہونے سے سیدھی طرف دیوار میں دو خوبصورت تختے جڑے ہوئے ہیں۔

جن پر کلام پاک کی کئی جلدیں رکھی رہتی تھیں۔ سامنے والی الماری میں بھی کلام پاک اور مناجات مقبول کی کئی جلدیں رکھی رہتی تھیں۔ ان ملحقات مسجد میں رمضان شریف کے زمانہ میں لوگ معتکف رہتے تھے۔ مسجد کے فرش پر کھجوری موٹی چٹائی بچھی ہوئی تھی باہر مسجد کے سائبان سے متصل جنوب کی طرف حضرتؒ کی نشست کی سہ دری ہے جس کا مفصل نقشہ آگے مذکور ہے۔ صحنِ مسجد کے آخر میں مشرق کی طرف دیوار میں ایک مختصر سی الماری ہے جس میں حضرت کی دوائیں وغیرہ مقفل رہتی تھیں اس کے نیچے ایک لمبی سی منڈیر بنی ہوئی ہے جس کے آگے نالی بنی ہوئی ہے۔ یہ جگہ وضو کرنے کے لئے ہے۔

اس کے اوپر بالاخانہ ہے جس میں مہمان مقیم ہوتے تھے اس میں چار چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ اس کمرے کے شمال کی طرف ایک دروازہ ہے جس کے آگے تھوڑا سا چھت کا کھلا ہوا صحن ہے اس حجرے میں کئی کھڑکیاں ہیں، کمرہ کشادہ اور آرام دہ ہے فرشِ مسجد کے اختتام پر مشرق کی طرف سائبان کے نیچے اور کنوئیں کے درمیان ایک دروازہ ہے جس کے اندر ایک گلیارہ سا ہے۔ اس گلیارہ میں بائیں طرف دو غسلخانے ہیں جن میں کواڑ لگے ہوئے ہیں۔ اس گلیارہ کے آخر میں ایک دروازہ ہے جس میں ایک کواڑ لگا ہوا ہے۔ اس کو کھولنے کے بعد سیدھی طرف پھر ایک لمبا سا گلیارہ ہے اس میں استنجی خانہ اور پاخانے بنے ہوئے ہیں۔ اندر داخل ہونے پر سب سے پہلے بائیں ہاتھ کی طرف ایک درجے میں استنجے کے لئے مٹی کے ڈھیلے بھرے رہتے تھے۔ اسی کے بعد دوسرے درجے میں پیشاب کے لئے جگہ بنی ہوئی تھی۔ استنجا کرنے کے بعد ڈھیلے وہیں قریب ایک گوشہ میں ڈال دیئے جاتے تھے۔ پیشاب خانہ کے درجے کے بعد کئی ایک پاخانے کے درجے ہیں۔ ان پاخانوں میں جا کر طاقوں میں استنجے کے ڈھیلے رکھ دیئے جاتے ہیں اور فراغت کے بعد ڈھیلوں سے استنجا کر کے ڈھیلے وہیں کونڈے میں ڈال دیئے جاتے تھے (پانی کا لوٹا وغیرہ وہاں نہیں لے جاتے نہ آبدست لیتے ہیں) اس گلیارہ کے باہر جو مختصر گلیارہ میں غسل خانے ہیں ان میں پانی کا بدھنا پہلے سے بھر کر رکھ لیتے ہیں۔ وہاں جا کر پانی سے استنجا کرتے ہیں اسی طرح پیشاب کا استنجا بھی وہیں پانی سے پاک کرتے ہیں۔ پھر پانی کا بدھنا لا کر باہر حدودِ مسجد میں جو منڈیر بنی ہوئی ہے وہاں

رکھ دیا جاتا ہے غسل خانے میں نہیں چھوڑا جاتا۔

خانقاہ کے وسطی صحن میں چاروں طرف ٹین کا سائبان پڑا ہوا ہے۔ مسجد میں داخلہ کے پھاٹک کے سامنے سائبان کے بعد صحن میں حوض ہے جو تمام تر پٹا ہوا ہے۔ حوض لمبائی میں چوڑائی سے زیادہ ہے لیکن صرف شرقی جانب ڈیڑھ فٹ کے قریب چوڑائی میں کھلا ہوا ہے اور کافی لمبا ہے۔ وضو کے لئے بیٹھنے کی جو پٹڑی ہے اس کے آگے نالی بنی ہوئی ہے اس کے بعد حوض کا کھلا ہوا حصہ ہے۔ جب وضو کے لئے بیٹھتے ہیں تو رُخ مغرب کی طرف ہوتا ہے۔ اس حوض کے کھلے ہوئے حصے کے اوپر پٹاؤ کے حاشیہ پر لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے حوض کے داہنی طرف مدرسہ کی سہ دری کا صحن ہے اور بائیں جانب مسجد کا مختصر سا صحن ہے۔ دونوں صحن ایک ہی سطح پر ہیں درمیان میں معمولی نشان حد فاصل ہے۔ جمعہ کی جماعت زیادہ ہوتی ہے تو نماز حوض کے پٹاؤ پر اور مدرسہ کے دالان و سائبان و صحن میں سب جگہ ہوتی ہے اور مسجد کی صفوں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔

حوض کے شمال کی طرف تھوڑی سے کھلی ہوئی جگہ ہے اسی طرح جنوب کی طرف تھوڑی کشادہ جگہ ہے جہاں ٹین کے سائبان میں بیٹھ کر حضرت قبلہ وضو کرتے تھے۔ اسی جگہ نالیاں بنی ہوئی ہیں جن سے پانی حوض کی پٹڑی کے نیچے نیچے ہو کر باہر نکل جاتا ہے جہاں حضرتؒ وضو فرماتے تھے۔ اسی سائبان کے نیچے حضرت کا مصلیٰ بچھا رہتا تھا جہاں سنن و نوافل بھی حضرت اکثر پڑھا کرتے تھے۔ اسی سائبان کے نیچے سہ دری کی دیوار پر ایک اعلان ضوابطِ اوقات اور حضرت کے معمولات کے متعلق نوواردوں کی اطلاع کے لئے لگا ہوا ہے اس کا دوسری جگہ ذکر ہے۔ غسل کرنے کے واسطے باہر جانے والے پھاٹک کے اندر جو غسل خانے ہیں اُن میں غسل کرنے کے لئے لوہے کے اور مٹی کے گھڑے رکھے رہتے تھے۔ جاڑوں میں گرم پانی کے لئے حمام (سقاوہ) تیار کیا جاتا تھا۔ خانقاہ کے جنوب میں جس سہ دری میں حضرتؒ تشریف رکھتے تھے وہ چھ دَر کا ایک ہی دالان ہے جس کے درمیان میں ایک محراب ہے گویا ایک لمبی شش دری ہے تخمیناً دس گز لمبی اور ساڑھے تین گز چوڑی۔ پہلی سہ دری میں پرانی جاجم کا فرش بچھا ہوا تھا۔ بیچ کے دَر میں کچھ اندر کی طرف اور کچھ حصہ باہر کی طرف ایک کچی قبر ہے، برائے نام کچھ تھوڑی سی اُونچی ہے۔ دالان

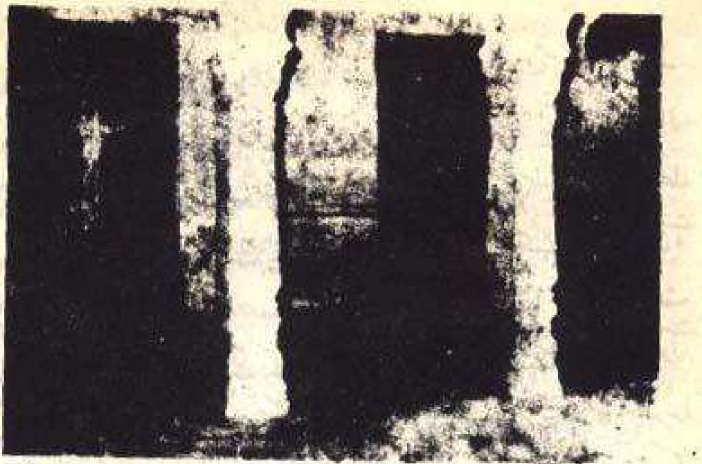

کتب خانہ و مزار حضرت قاضی محمد اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
(مصنف مصطلحات الفنون)

کے فرش کے نیچے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس خام قبر کے قریب ایک مٹی کا کونڈا پانی سے بھرا ہُوا رکھا رہتا تھا شاید چڑیوں کے پینے کے واسطے۔ یہ قبر سُنا جاتا ہے کسی بزرگ کی ہے جو بہت عرصہ پہلے اسی مسجد میں رہا کرتے تھے یعنی حضرت حاجی صاحبؒ کے زمانے سے بہت پہلے شاید اُن کی دُعا تھی کہ ان کی قبر پر ذکر اللہ ہوتا رہے چنانچہ دن رات ذکر اللہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ جن طالب علموں کو کلام پاک یا دوسری کُتب کے پڑھنے میں دقت ہوتی ہے وہ اس سہ دری میں قبر کے قریب بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں اور بہت جلد اُن کا مطالعہ رواں ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

اس پہلی سہ دری کے دروازوں کے سامنے جنوبی دیوار میں دو دَر کا ایک کمرہ ہے جس میں کُتب خانہ ہے اس میں ایک عالم صاحب بیٹھتے تھے اور استفتاء وغیرہ کے جوابات لکھا کرتے تھے۔ سہ دری کے اندر ایک گوشہ میں ایک لیٹر بکس آویزاں تھا اس میں مقیمانِ خانقاہ یا تازہ واردانِ خانقاہ اپنا حال لکھ کر حضرتؒ کے ملاحظہ کے لئے ڈال دیا کرتے تھے۔ اور صبح کی نماز کے بعد حضرت اُن کو نکال کر جواب تحریر فرماتے تھے۔

اس پہلی سہ دری کی شرقی دیوار میں ایک مختصر سی کوٹھڑی ہے اس میں چیڑ کے دو صندوق رکھے رہتے تھے جس میں ردی کاغذ اور استعمال شدہ لفافے و پوسٹ کارڈ وغیرہ

ڈالے جاتے تھے۔ اس صندوق پر المونیم کا ایک لوٹا رکھا رہتا تھا جس سے حضرتؒ وضو فرماتے تھے۔ حضرت کی چھڑی اور نعلین مبارک یہیں ایک کونے میں رکھے رہتے تھے، جو حضرتؒ خود ہی رکھتے تھے اور خود ہی اٹھاتے تھے یا کوئی خاص خادم اُٹھا کر ساتھ لے جاتا تھا کسی اور کو اس کی اجازت نہ تھی۔ اس کوٹھڑی کے دائیں طرف دیوار سے ملی ہوئی ایک آرام کرسی جس میں کپڑا لگا ہوا تھا رکھی رہتی تھی اور بائیں جانب لکڑی کے اسٹینڈ پر لوہے کا ایک ترازو کا کانٹا وزن کرنے کا رکھا ہوا تھا۔ اس میں خطوط یا پارسل وغیرہ کا وزن کیا جاتا تھا۔ حضرت جس سہ دری میں تشریف رکھتے تھے اس میں جانے کے لئے اس پہلی سہ دری سے ہو کر جاتے تھے کیونکہ حضرتؒ کی نشست کے سامنے کی سہ دری کے دروازے مسجد کے اندر کھلتے تھے اور وہ نیچے سے ایک فٹ تک بلند بھی تھے اور لوہے کی دو، دو سلاخیں بھی ان میں لگی ہوئی تھیں اس لئے اس طرف سے آمد و رفت نہ تھی۔

اعلان انضباط الاوقات

سہ دری کے دروازہ پر حضرت کی طرف سے حسبِ ذیل اعلان آویزاں تھا :-

نظم الاوقات تاکہ نہ اہلِ حاجت کا حرج ہو نہ احقر کا ۔

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں اس وقت کسی سے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے حرج بھی ہے۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین اشخاص مستثنیٰ ہیں ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہو اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی مثلاً دردِ زہ وغیرہ کا تعویز لینا ہو یا فوری ضرورت کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو جس میں تاخیر نہ ہو سکے۔ مگر تینوں اشخاص کو چاہیئے کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تاکہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نماز ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے اس میں ملاقات سے اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں

۴ - پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اُس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے بیٹھنے کی، ہر قسم کی بات چیت کی تعویذ وغیرہ مانگنے کی البتہ جمعہ کا دن تعویذ دینے سے مستثنیٰ ہے۔

۵ - پھر اذانِ عصر سے نماز سے فارغ ہونے تک کے لئے وہی قاعدہ ہے جو صبح سے ۱۲ بجے تک کے وقت کا ہے جو م۱ میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو م۲ میں مذکور ہیں۔

۶ - عشاء کے بعد علی الاطلاق معذوری ظاہر ہے باستثناء ضرورت شدید۔

کتبہ احقر اشرف علی

مقامِ مسند

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

جنوبی دالان کی دوسری سہ دری جہاں حضرتؒ کی نشست تھی وہ مسجد کے سائبان کے جنوب میں ہے۔ اس میں مسجد کی طرف تین دروازے ہیں۔ سہ دری کے اندر جنوبی دیوار میں ایک مثلث نما بہت ہی مختصر سا حجرہ ہے اس حجرے کے دروازے سے ملی ہوئی جگہ پہ حضرت تشریف فرما ہوتے تھے۔

اسی سہ دری میں مغرب کی طرف ایک دوسرا حجرہ ہے یہ بھی مختصر و تنگ اور مثلث ہے۔ یہ دونوں حجرے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت کے ہیں اور حضرت حاجی صاحبؒ بھی اسی سہ دری میں قیام فرماتے تھے۔ اس سہ دری میں دھاری دار دری کا فرش بچھا رہتا تھا جہاں حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے تھے۔ اس جگہ فرش پہ ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی جس کے حاشیہ پر سیاہ کپڑے کی گوٹ لگی تھی اس پہ دری کی جانماز بچھی رہتی تھی اور سردیوں میں اس پر روئی کا گدا بچھا دیا جاتا تھا۔ اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہوتے تھے۔ بائیں طرف گاؤ تکیہ رکھا رہتا تھا۔ حضرت کی نشست کے سامنے ایک چھوٹی سی چوکھونٹی چوکی نما میز رکھی رہتی تھی اس پر ایک لمبی سی الماری رکھی رہتی تھی جس کی اونچائی فٹ بھر ہوگی۔ نیچے والی میز پر مختلف کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ بیچ میں ایک جیبی گھڑی سفید چمڑے کے غلاف میں رکھی رہتی تھی جس کے زنجیر بھی لگی ہوئی تھی ایک ٹائم پیس ٹین کے بکس میں بند رکھی رہتی تھی

اس نیچے والی میز میں دو درازیں تھیں جس میں قفل لگا ہوا تھا۔ اس کے اندر حضرت کے مختلف مدوں کی رقوم محفوظ رہتی تھیں۔

اوپر والی الماری میں سامنے کا تختہ نیچے سے اوپر کی طرف کھلتا تھا اس میں بھی قفل لگا ہوا تھا اس کے اندر بھی چند کتابیں اور بیاضیں وغیرہ محفوظ رہتی تھیں۔ اس الماری کے اوپر بھی چند کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ ایک مجلد کاپی تھی جس میں دھوبی کے کپڑے لکھے جاتے تھے۔ کچھ یادداشتوں کی کاپیاں اور ایک بلاٹنگ کا چپٹا سا رولر رکھا رہتا تھا۔ ایک شیشہ کا پیپر ویٹ بھی تھا۔ نشست کے سامنے والی میز کے نیچے ایک لکڑی کا قلمدان رکھا رہتا تھا جس کے اندر کپڑے میں تر کی ہوئی سیاہ روشنائی کی دوات تھی ایک جالی دار ڈبیا جس میں روشنائی خشک کرنے کے لئے ریت بھری تھی۔ ایک چاقو، ایک چھوٹی قینچی دو کلک کے قلم دو ہولڈر رہتے تھے۔ ایک سفید ہڈی کا اور ایک سبز لکڑی کا۔ اکثر حضرتؒ باریک تحریر سفید ہولڈر سے لکھتے تھے۔ لفافوں پر پانی لگانے کا سرخ رنگ کا آلہ بھی تھا اس کے نیچے کی طرف تر اسپنج لگی ہوتی تھی۔ اس قلمدان کے نیچے کی کشتی میں تعویذ وغیرہ لکھنے کے لئے کاغذ کے ٹکڑے رکھے رہتے تھے۔ یہ ٹکڑے عموماً استعمال شدہ کاغذوں سے کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ میز کے ایک جانب ٹین کے پونگے رکھے رہتے تھے۔ حضرت کے سیدھے ہاتھ کی طرف سامنے الماری سے ملا ہوا جو پونگا رکھا ہوتا تھا اس میں ڈاک خانہ کے خطوط لائے جاتے تھے اور بھیجے جاتے تھے۔ ان پونگوں میں قفل لگا ہوتا تھا جس کے ایک کنجی حضرت کے پاس رہتی تھی اور ایک پوسٹ ماسٹر کے پاس رہتی تھی۔ حضرت مولانا جس وقت خطوط آتے تھے اُن کو چاک کر کے اندر کے جوابی لفافوں کے اندر خطوط رکھ دیتے تھے جو چھوٹی میز پر بائیں ہاتھ کی طرف کنارے پر رکھے رہتے تھے۔ بعد ظہر جب تشریف رکھتے تھے اور مجلسِ عام ہوتی تھی اس وقت ان خطوط کے جوابات تحریر کئے جاتے تھے اور کبھی کبھی درمیان میں حاضرین سے کچھ گفتگو فرماتے جاتے تھے۔ نشست کے بائیں طرف دیوار میں ایک طاق ہے اس میں ایک کلاک نہایت خوبصورت رکھی ہوئی تھی اور اس طاق میں شیشہ دار فریم لگا ہوا تھا۔ اس گھڑی میں آفتاب کے طلوع و غروب کے حساب سے وقت رہتا تھا۔ ایک دھوپ گھڑی خانقاہ کی شمالی چھت کے کونے پر نصب تھی۔ جس کے وقت کے مطابق نمازیں ہوتی تھیں۔

دالان کے غربی حجرے کے دونوں طرف ایک ایک طاق تھا۔ دائیں طاق میں کچھ متفرق کاغذات رکھے رہتے تھے اور بائیں طاق میں کچھ ادویات کی شیشیاں وغیرہ اور ڈبے اور سر میں ڈالنے کا تیل رکھا رہتا تھا۔ اسی طاق میں ایک تھیلی میں سنگِ لرزاں بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ عجیب و غریب چیز ہے نو انچ لمبا اور چھ انچ چوڑا پتھر ہے۔ انگلی سے دبانے سے سخت اور ویسے ہاتھ سے ہلانے سے ہلتا تھا بلکہ ایک ایک کونہ ہلتا تھا، جہاں سے ہلاؤ وہیں سے ہلتا تھا۔ کسی نے حضرت کی خدمت میں ہدیتاً پیش کیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

جہاں حضرت والا کی نشست تھی وہاں اوپر چھت پر ہاتھ سے کھینچنے والا ایک پنکھا لوہے کے تاروں میں آویزاں رہتا تھا جس میں پنج رنگی پیوند لگے ہوئے تھے۔ سامنے والے تین دروازوں میں ٹاٹ کے پردے بندھے ہوئے تھے جو اکثر لپٹے رہتے تھے اور ضرورت کے وقت کھولے جاتے تھے۔ حضرتؒ کی نشست کے سامنے والی دیوار میں ایک مختصر سی الماری ہے جس میں پٹ لگے ہوئے ہیں وہ مقفل رہتی تھی اس میں شاید رقوم محفوظ رہتی تھیں۔ واللہ اعلم

نشست کے سامنے سہ دری کے تینوں دروازوں میں نیچے کے حصے میں لوہے کی دو سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ نشست گاہ کی بائیں طرف گاؤ تکیہ پر دو اور چھوٹے نرم تکیے رکھے رہتے تھے ایک سُرخ رنگ کا تھا۔ سیدھی طرف الماری سے ملا ہوا پیتل کا اگالدان رکھا رہتا تھا۔

دوسری جانب کاغذ رکھنے کا پتلا سا خانہ دار اسٹینڈ تھا۔ سہ دری کی غربی دیوار میں ایک طاق ہے اس میں مسواک رکھی رہتی تھی۔ اس کے نیچے ایک مطبوعہ نقشہ اوقاتِ نماز اور سحر و افطار کا ٹنگا رہتا تھا اور کھونٹی پر ایک چارخانہ دار رومال پڑا رہتا تھا جو سر کا تیل پونچھنے کے لئے تھا۔

یہ میں نے آپ کے تصورات کے سامنے اپنے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نشست گاہ کا ایک نقشہ پیش کیا ہے تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس شہرہ آفاق مجددِ عصر کی خانقاہ کا کیا انداز تھا۔

معمولاتِ اہلِ خانقاہ

نمازِ فجر کے بعد کچھ لوگ مسجد میں وظیفہ پڑھتے رہتے تھے اور کچھ اہلِ خانقاہ اور طالب علم کلامِ پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے اور کچھ لوگ ذکر جہری میں محو ہوتے تھے۔ پھر سورج نکلنے پر مدرسہ شروع ہوتا تھا۔ خانقاہ کے شمالی و غربی دالانوں میں جگہ جگہ مختلف جماعتوں کے طلباء اپنے اپنے اسباق میں معروف رہتے تھے۔ چھوٹی جماعتوں کے لڑکے کلام پاک بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ساڑھے دس بجے کے بعد مدرسہ ختم ہوجاتا تھا اور ظہر کی اذان تک خانقاہ میں خاموشی رہتی تھی۔

ظہر کی اذان کے بعد لوگ وضو کر کے مسجد میں جمع ہوجاتے تھے۔ نماز کے بعد مدرسہ پھر شروع ہوجاتا تھا اور پھر طلباء کے پڑھنے سے خانقاہ گونجنے لگتی تھی۔ اذانِ عصر کے بعد مدرسہ ختم ہوجاتا تھا۔ نماز کی عملی تعلیم دینے کے لئے چھوٹی جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے وضو کر کے صف در صف نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے اور ایک لڑکا امام بنتا تھا اور قرأت کے ساتھ ساری نماز ادا کرتا تھا۔ نماز ختم کر کے یہ لڑکے چھٹی پاکر اپنے مکان چلے جاتے تھے۔ عصر کی جماعت کے بعد چند اہلِ خانقاہ حوض کے پٹاؤ پر حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ختم خواجگان[1] دانوں پر پڑھتے تھے۔ (یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے) اس کے بعد ایک صاحب بآوازِ بلند ایک تختی پر لکھی ہوئی دُعائیں پڑھتے تھے اور سب لوگ آہستہ آہستہ آمین کہتے جاتے تھے۔ ان دعاؤں میں جمیع مسلمانوں کی فلاح دارین کے

---

[1] ختم خواجگان کا طریقہ :- ختم خواجگان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں۔ پھر تین سو ساٹھ مرتبہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ لَا مَلْجَاءَ وَلَا مَنْجَاءَ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ - پڑھیں۔

اس کے بعد تین سو ساٹھ مرتبہ پوری سورہ الم نشرح پڑھیں۔ اس کے بعد پھر تین سو ساٹھ مرتبہ مذکورہ بالا کلمات پڑھیں اور پھر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں اس کے بعد دُعا کریں۔

اس ختم کے بعد دعا انشاءاللہ تعالےٰ قبول ہوتی ہے۔ مجرب ہے۔

مفتی محمد [illegible] صاحب دارالافتاء، دارالعلوم کراچی

لئے دُعا ہوتی تھی۔ پھر خاص خاص دُعائیں یعنی جو شخص اپنے مقاصد کے لئے دُعا کرانی چاہے وہ بھی اس کے بعد کی جاتی تھی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ اس ختم خواجگان میں دُعا کرانا چاہتے وہ اپنے مقاصد کے لئے دُعا کا مضمون لکھ کر دیتے تھے۔ اس ختم کی دُعائیں ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں۔

اس کے بعد مغرب کے وقت تک پھر مسجد و خانقاہ میں خاموشی رہتی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد مسجد کے صحن میں اور مسجد کے دالان میں اور بیت الخلاء اور غسل خانوں میں اور مہمان خانوں میں روشنی کر دی جاتی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کھانوں میں مشغول ہو جاتے تھے کہیں کہیں کوئی طالب علم اپنے اپنے سبق کے مطالعہ میں منہمک نظر آتا تھا اور کوئی ذکر و تسبیحات میں محو ہوتا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جائے قیام پر چلا جاتا تھا پھر کسی کو آپس میں باتیں کرنے کی اجازت نہ تھی اور خانقاہ کا پھاٹک بند کر دیا جاتا تھا۔ پھاٹک ایک خاص مقررہ وقت پر شب کو بند ہوتا اور فجر کی اذان کے بعد کھلتا تھا۔ پھاٹک بند کرنے سے پہلے آواز دے دی جاتی تھی کہ جس کو باہر جانا ہو وہ چلا جائے۔

جو شخص وہاں مہمان ہوتا تھا اس کے لئے ہر طرح کی راحت و ضرورت کا سامان مہیا رہتا تھا ہر نو وارد اپنے آنے کی اطلاع مہتمم خانقاہ کو کر دیتا اور مہمان خانہ میں مقیم ہو جاتا تھا۔ اگر مہمان کی پہلے سے کوئی خصوصیت نہیں تو اس کے لئے یہ ضابطہ تھا کہ اگر حضرتؒ اپنی سہ دری میں تشریف رکھتے ہوں اور کسی خاص کام میں منہمک نہ ہوں تو جا کر مصافحہ کرے اور اپنا تعارف کرا کے واپس چلا جائے۔ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے پھر جب بعد ظہر مجلس عام ہو اس وقت وہاں حاضر ہو اور اگر اپنا کچھ حال وغیرہ عرض کرنا ہو تو جاتے ہی اول مرتبہ نہایت مختصر و مفصل طریقے سے صاف صاف عرض کر دے۔ حضرت والا کو زیادہ استفسار یا انتظار کی زحمت نہ دے۔ پہلی ملاقات میں ہرگز کوئی تحفہ یا ہدیہ پیش نہ کرے۔ کوئی بات نامکمل یا گول مول الفاظ میں نہ کرے بلکہ جس مقصد سے آیا ہو فوراً صاف صاف عرض کر دے جو بات حضرت دریافت کریں اس کا جواب بلا تاخیر فوراً واضح اور صاف لفظوں میں عرض کر دے۔

حضرتؒ کے سامنے جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ دوسری طرف متوجہ ہوں کھڑا نہ ہو بلکہ فاصلہ پر بیٹھ جاتے اور نہایت بے تکلّف ہو کر بیٹھے۔ بہت مؤدبانہ ہیبت نہ بنائے اس کو حضرت پسند نہ فرماتے تھے مگر حدودِ ادب سے بھی متجاوز نہ ہو جو ہدایت کہ حضرت فرمادیں اُس پر پورا پورا عمل کرے اور کسی غلطی یا فروگذاشت کی دلیل و توجیہہ نہ بیان کرے بلکہ اپنی غلطی کا صاف لفظوں میں اعتراف کر کے معافی چاہے اور آئندہ کے لئے اس غلطی سے اجتناب کرنے کا وعدہ کرے۔ مہمان نووارد کے کھانے کا انتظام بھی آسان تھا۔ ایک ملاجی صبح و شام آتے رہتے تھے وہ کھانے کا انتظام بہت ہی قلیل معاوضہ پر کر دیتے تھے اور دونوں وقت کھانا مسجد میں پہنچا دیتے تھے۔ خانقاہ کے باہر ٹیلے پر بھی ایک دوکان تھی اس میں بھی آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا اور وہاں دودھ چائے وغیرہ بھی دستیاب ہو جاتی تھی۔ اگر کسی مہمان کے پاس موسم سرما میں بستر اور اوڑھنے کا سامان کم ہوتا تو خانقاہ کے مہتمم جناب مولوی شبیر علی صاحب مرحوم سے دستیاب ہو سکتا تھا اور بعد استعمال بوقت واپسی ان ہی کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ غسل خانے اور بیت الخلاء کے متعلق انتظام اوپر درج ہو چکا ہے۔ اسٹیشن پر اسباب لے جانے کے لئے بھی آسانی سے انتظام ہو جاتا تھا اور بہت کم مزدوری ہوتی تھی۔ دھوبی چوتھے پانچویں روز شام کے وقت خانقاہ میں آتا تھا اور حسبِ ضرورت وقت پر کپڑے دھو کر دے جاتا تھا۔ حجام بھی اکثر آتا رہتا تھا۔ اگر کسی نووارد کو کوئی بات دریافت کرنا ہو تو مقیمانِ خانقاہ سے معلوم ہو سکتی تھی۔ نووارد اجنبی کو اوقاتِ مقررہ کے علاوہ کسی وقت از خود حضرتؒ کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی کیونکہ حضرتؒ کے معمولات کے خلاف تھا۔

مقیمانِ خانقاہ کو مجلس کے علاوہ دوسرے اوقات میں اپنے اپنے حجروں ہی میں رہنے کی ہدایت تھی آپس میں جمع ہو کر ملاقات و گفتگو کی اجازت نہ تھی اور نہ قصبہ میں کسی کے یہاں آنے جانے کی اجازت تھی۔ اگر اس کی ضرورت ہوتی تو پہلے حضرتؒ کو اطلاع کرنا ضروری تھا۔

* * *

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے آثارِ علمیہ

حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اِس قدر مختلف النواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون سے نہیں ہو سکتا اور یہی ان کی جامعیت ہے جو اُنکے اوصاف و محامد میں سب سے اوّل نظر آتی ہے۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں، مجوّد ہیں، مفسّر ہیں۔ اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدّث ہیں، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ وہ فقیہ ہیں، ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں۔ نئے سوالوں کو حل کیا ہے۔ نئی چیزوں کے متعلق انتہائی احتیاطوں کے ساتھ فتوے دیئے ہیں، وہ خطیب تھے۔ خطب ماثورہ کو یکجا کیا ہے۔ وہ واعظ تھے۔ ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں۔ وہ صوفی تھے۔ تصوّف کے اسرار و غوامض کو فاش کیا ہے۔ شریعت و طریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ کرکے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔

ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں۔ وہ ملفوظات ہیں۔ جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچ چکی ہے، وہ مرشدِ کامل تھے، ہزاروں مسترشد و مستفیدان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے اور انکے تسکین بخش جوابات دیتے اور ہدایات کرتے تھے۔ جن کا مجموعہ تربیت السالک ہے۔

انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا۔ اُن کی متعدد کتابیں اس مضمون پر ہیں۔ انہوں نے حضرات چشت کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی اور ان کی تاویلات کیں، ان کی کتابوں کے خلاصے اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہیں۔ جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے کی ہے۔ وہ مصلح اُمت تھے، اُمت کے سینکڑوں معائب کی اصلاح کی۔ رسوم و بدعات کی تردید اور اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں۔ وہ حکیم الامت تھے۔ مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ و احیاء پر حیوٰۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے۔ غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی شاید کوئی مذہبی ضرورت ہوگی۔ جس کا مداوا اس حکیم الامت نے اپنی زبان اور قلم سے نہیں فرمایا اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر آسکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اُردو اور عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے اُن کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا۔ چنانچہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی بنگالی، گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں۔ آٹھ سو کے قریب ہیں۔ ۱۳۵۴ھ میں ان کے ایک خادم مولوی عبدالحق فتحپوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۶ صفحوں کو محیط ہے۔ اس کے بعد کے نو برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں، پریس اور مطبع ہی کے برکات ہیں، زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہیں۔ اس بنا پر مناسب تھا کہ اس صدی کے مجدد کے کرامات بھی ان ہی کمالات میں جلوہ گر ہو۔

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں۔ جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے امام جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں۔ اس سلسلہ کا آخیر نام حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

تصانیف کے انواع

مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد گو آٹھ سو کے قریب ہے مگر ان میں چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین و مقالات کہتے ہیں۔ داخل ہیں۔ ان میں بعض اتنے مختصر ہیں کہ صرف صفحے دو صفحے میں ہیں۔ بعض ایسی ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔ بیشتر تصانیف نثر میں اور اُردو زبان میں ہیں البتہ بارہ تیرہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں:

"سبق الغایات[1] فی نسق الآیات، انوار الوجود[2]، التجلی العظیم[3]، حواشی تفسیر[4] بیان القرآن، تصویر المقطعات[5]، التلخیصات[6] العشر، مائۃ دروس[7]، الخطب الماثورۃ[8]، وجوہ[9] المثانی، سبع[10] سیارہ، زیادات[11]، جامع[12] الآثار، تائید الحقیقۃ[13] اور تین فارسی میں ہیں: مثنوی[1] زیر و بم، تعلیقات[2] فارسی، عقائد[3] بانی کالج"

نظم و نثر

نظم میں مولانا کی تصنیف یہی ایک مثنوی زیر و بم ہے اور یہ طالب علمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک بے وقوف عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے، مگر درحقیقت یہ نفس انسانی کی بصیرت افروز حکایت ہے ایک اور نظم اوراد روحانی کے آخر میں ہے۔ مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زبان تھے اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی تھا مگر کبھی اس سے کام نہیں لیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے برادر گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحبؒ کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا اور ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ لکھ دیا:

زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہو گا

برادرِ موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی اور یہ مصرعہ بھی سُنا دیا تو فوراً فقیروں کو بدل کر یوں فرمایا:

ؔ زندگی ہے تو سلیماں کا بھی پھیرا ہو گا

ایک دفعہ حضرتؒ نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی تو خاکسار نے ایک بیت کہی:

ؔ خواجہ بخشید مرا سبحۂ صد دانہ بلطف
دانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل مرحوم نے موقع سے حضرت کو یہ سُنا دیا تو فرمایا: "تو بھئی مجھے بھی اس کا جواب کہنا پڑے گا" مگر کچھ فرمایا نہیں۔ سب سے آخر میں جب خاکسار نے از خود حضرت کی تحریک و اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر رجوع و اعتراف کا مضمون معارف میں شائع کیا اور ملاحظہ کے لئے بھیجا تو بہت مسرت ظاہر فرمائی اور مثنوی کے وزن پر دس بارہ شعر لکھ کر بھیجے جو اس ہیچ میرز کے لئے وجہ سعادت ہیں۔ یہ غالباً آخری نظم کی تصنیف ہے اور اس کا ایک نام بھی حضرت نے رکھ دیا ہے۔

موضوعاتِ نثر

تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے اور کم تر کتب درس کے متعلق تاہم ڈُو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں۔ مذہبی تصانیف میں علوم القرآن، علوم الحدیث، کلام و عقائد، فقہ و فتاویٰ اور سلوک و تصوّف اور مواعظ اکثر ہیں۔

قرآن پاک کی خدمت

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی۔ وہ بجائے خود اُن کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانۂ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں پر اُمت کے اوّلین مفسرِ قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَاب کی دُعا دی تھی اور بشارت سُنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رویاء کے بعد سے میری مناسبتِ قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اسی کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظ

اور معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ قاری تھے اور فنون تجوید و قرأت کے بڑے ماہر۔ اخیر زمانہ میں پانی پت کے قاری عبدالرحمان صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہو گئی تھی۔

مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی جہری نماز میں امام بنا دیا۔ مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قرأت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی کہ صحتِ مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قرأت نہیں سُنی۔ مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی۔ لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لئے بتکلف اُتار چڑھاؤ ہوتا تھا بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسبِ موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی کہ ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

① تجوید و قرأت و متعلقاتِ علوم قرآنی

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے۔ مولانا نے اس فن پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں:

① جمال القرآن: یہ فنِ تجوید کا رسالہ ہے۔ جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں۔ مخارج اور صفاتِ حروف، اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام و تفخیم و ترقیق اور وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

② تجوید القرآن: اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

③ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف: اوقافِ قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔

④ وجود المثانی: اس میں قرآن شریف کی مشہور قرأتوں کے اختلافات کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے اور اخیر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

⑤ تنشیط الطبع فی اجرا السبع: قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

⑥ زیادات علی کتب الروایات: اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں۔ یہ وجود المثانی کے اخیر میں بطور ضمیمہ ہیں۔

⑦ ذنابات لمانی الروایات : یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

⑧ یادگار حق القرآن : اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ تجوید القرآن کا اختصار اور ضمیمہ ہے۔

⑨ متشابہات القرآن لتراویح : رمضان میں قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں۔ ان سے بچنے کے ان میں چند قواعد کلیہ یعنی گر بعض آیات کے ضبط فرمائے گئے ہیں۔

⑩ آداب القرآن : قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات و تنبیہات ہیں۔

② ترجمہ و تفسیر قرآن

① ترجمہ : قرآن پاک کا سلیس و با محاورہ اُردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے۔ جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے ترجمے خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اُردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے۔ اس لئے عام اُردو خوانوں کی فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں یعنی ترجمہ اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔

② تفسیر بیان القرآن : یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے۔ جس کو اڑھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے۔ اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں :

،، سلیس و با محاورہ حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ، نیچے ف کے اشارہ فائدے

آیت کی تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں۔ تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہلِ علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات و حقائق اور معارف الگ لکھے گئے ہیں۔ ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے، اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا مل جاتی ہیں۔”

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اُردو تفسیریں صرف عوام اُردو خوانوں کیلئے علماء لکھتے ہیں:

” یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اُردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے۔ خود میرا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے۔ ساتھ ہی ربط آیات و سور کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ ربطِ آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں۔ اس لئے وجوہِ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں۔ اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے۔ اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دُور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے گی۔”

③ چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی۔ اسلئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجان و دل مساعی رہتے تھے۔ اُردو میں شاہ عبد القادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع تھے۔ وہ بالکل کافی تھے۔ مگر نئے زمانہ میں پہلے سرسید نے بضمن تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اُردو ترجمے شائع کئے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی اپنے جدید عقائد کو پیشِ نظر رکھ کر ترجمہ کریں اور اولین توجہ زبان کی طرف رکھیں اور اقوالِ سلف کی پرواہ نہ کریں۔ اس طرزِ عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ انکی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ ای ضرورت سے مجبور ہو کر کیا۔ مگر اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا اور اس کے اغلاط پر نشان دیکر ایک رسالہ اس ترجمہ کے اصلاح پر لکھا۔ جس کا نام اصلاح ترجمۂ دہلویہ ہے۔

④ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا۔ جس کی نسبت عام طور سے مشہور ہے کہ وہ لکھنو کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے، لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے۔ بہر حال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ جس کا نام اصلاح ترجمۂ حیرت ہے۔

⑤ بعض معاصر علماء نے اُردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں۔ جن میں ربطِ آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے اور آیات کو بتاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق ہے اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں حدِ اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں۔ جن کا نام التقصیر فی التفسیر ہے۔

⑥ لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے نام سے جمع کیا ہے۔ انکے مؤلف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان کے نام سے ظاہر فرمائے۔

⑦ مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو تحریر میں ضبط کر لیا تھا۔ وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات رکھا مگر چھپا نہیں۔

⑧ رفع البناء فی نفع السماء الذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناءً کی تفسیر ہے۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا کیا فائدے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

⑨ احسن الاثاث فی النظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلث۔ سورۂ بقرہ کی تین آیتوں کی تفسیر پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

⑩ اعمال قرآنی: قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربوں میں آئے، ان کو بیان کیا گیا ہے۔

⑪ خواص فرقانی: اس کا موضوع بھی وہی ہے، اس کا ایک اور حصہ ہے۔ جس کا نام آثار تبیانی ہے۔ ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویذ گنڈوں اور عملیاتِ سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف متوجہ کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

③ علوم القرآن

علوم القرآن کے متعلق مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف، مواعظ، ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو اچھی خاصی ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ مگر ان پر مستقل طور پر بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں سے اول سبق الغایات ہے۔

① سبق الغایات فی نسق الآیات: یہ قرآن پاک کے آیات و سُوَر کے ربط و نظم پر عربی میں ۱۵۹ صفحوں کی کتاب ہے۔ جس کو سنہ ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا اس میں مولانا نے سورۂ فاتحہ سے سورہ الناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیتوں کے ربط پر کلام فرمایا ہے اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی تفسیر کبیر اور مفتی ابوالسعود بغدادی المتوفی سنہ ۹۵۱ھ کی ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا القرآن الکریم سے ماخوذ و مستنبط ہے۔ جس

کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے۔ ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو "قال المسکین" کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصا ہے اور اخیر کی سورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں۔ جن میں مؤلف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعیین فرمائی ہے۔ چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں، اسلئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہوسکتی ہیں، تاہم ان سے مولانا کے ذوقِ قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہوسکتا ہے۔

تفسیر البیان میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

② اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن: مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے۔ جن میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں۔ افسوس ہے۔ ورنہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو اس کے کئی حصے مرتب ہو سکتے تھے۔

③ دلائل القرآن علی مسائل النعمان: مولانا کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا۔ وہ ظاہر ہے۔ ان کا مدت سے خیال تھا کہ احکام القرآن ابوبکر جصاص رازی اور تفسیراتِ احمدیہ ملا جیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوقِ قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں۔ جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پا سکا۔ آخر میں یہ خدمت انہوں نے اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں۔

چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہِ امدادیہ میں جاکر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے۔ مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے اُن کو یاد آجاتے تھے۔ بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اسکو اپنے مقام پر آکر قلمبند فرمالیتے۔ یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام رہ گیا۔[1]

---

[1] حضرتؒ کی وفات کے بعد یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے۔ ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو "قال المسکین"، کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصا ہے اور اخیر کی سورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں۔ جن میں مؤلف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعیین فرمائی ہے۔ چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں۔ اسلئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ تاہم ان سے مولانا کے ذوقِ قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

تفسیر البیان میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

② اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن: مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے۔ جن میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں۔ افسوس ہے۔ ورنہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو اس کے کئی حصے مرتب ہو سکتے تھے۔

③ دلائل القرآن علی مسائل النعمان: مولانا کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا۔ وہ ظاہر ہے۔ ان کا مدت سے خیال تھا کہ احکام القرآن ابوبکر جصاص رازی اور تفسیراتِ احمدیہ ملا جیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوقِ قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں۔ جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پا سکا۔ آخر میں یہ خدمت انہوں نے اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں۔

چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہِ امدادیہ میں جا کر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے۔ مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے اُن کو یاد آ جاتے تھے۔ بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اسکو اپنے مقام پر آ کر قلمبند فرما لیتے۔ یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام رہ گیا۔[1]

---

[1] حضرتؒ کی وفات کے بعد یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سنی ہے۔ جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے، وہ نقل کرتے تھے کہ مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے اور فقیہانہ دقتِ نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا لیکن اُب تک اُس پر اُس حیثیت سے نظر نہیں پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بادل پھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا۔ اُسی کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے سُن کر اپنے مستقر پر پہنچ کر اس کو بعینہٖ اُسی طرح قلمبند کر لیتے تھے۔ جس طرح مولانا نے اس کی تقریر فرمائی تھی۔

(۴) تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبادات: تفسیر بیضاوی میں حروفِ مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے۔ اس رسالہ میں بزبانِ عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے حروفِ مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

(۵) (۶) مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہیں اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے۔ ایک کا نام مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرے کا نام تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ ہے۔ ان دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر ہے۔ جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مؤلف کی تالیف ہے۔ جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۳۷ھ میں بہاولپور میں ملا تھا۔ اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔

(۴) علوم الحدیث

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو علوم الحدیث میں جو مہارت حاصل تھی، اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل اور تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں۔ جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلخیصات، ان کے مشکلات کی شرح، ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں، برمحل حدیثوں کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہٖ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد اُن

کی اُن تصانیف کو لیجئے جو گو فقہ و فتاویٰ اور احکام و مسائل یا اصلاحِ رسوم اور سلوک میں ہیں لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے۔ اُن میں احادیث کے حوالے دلائل کی مضبوطی اور صحتِ بیان کی تائید و شہادت کے لئے گئے ہیں، جو مؤلف کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں۔

حضرت حکیم الامتؒ کو فن سلوک کی تجدید کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی۔ اس کا ایک مُبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا۔ جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے۔ اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد و رقاق کا تذکرہ کیا ہے تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں۔ قدماء میں سے صرف ایک بزرگ حضرت امام عبداللہ بن مُبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے۔ جنہوں نے کتاب الزہد والرقاق کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے۔ مگر یہ ہیچمدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ مگر قیاس یہ ہے کہ وہ ابن ابی الدنیا کی کتاب کی طرح زہد و رقاق اور مذمت دنیا کے مضامین کی احادیث پر مبنی ہو گی۔

اہل سلوک نے جن روایات احادیث سے کام لیا ہے۔ وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں۔ اسی لئے علماءِ سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے اور اسی بنا پر اہلِ حدیث و روایت نے یہ بزعم خود غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ فنِ سلوک اور اس کے مسائل احادیثِ نبویؐ سے ثابت نہیں اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا۔ گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا۔ مثلاً امام ابن ابی جمرہ اندلسی المتوفی ۶۹۹ھ نے صحیح بخاری کی شرح بہجۃ النفوس کے نام سے لکھی، جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی شرح میں سلوک کے مسائل و نکات کی طرف بھی اشارے کرتے جائیں۔ حضرت حکیم الامت نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا اور حقیقۃ الطریقہ من السنۃ الانیقہ، التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف کے نام سے دو کتابیں تالیف کیں۔

① حقیقۃ الطریقۃ: ۱۳۲۷ھ میں تالیف فرمائی ہے اور یہ درحقیقت حضرت کی کتاب التکشف مہمات التصوف کا آخری جزو ہے اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے۔ اس میں تین سو

احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں۔ سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے اور اُن کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات، رسوم مسائل، اقوال، توجیہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اہلِ علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

② التشرف: یہ کتاب چار حصوں میں ہے۔ ان میں اُن احادیث کی تحقیق ہے، جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آتی ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ اصول و فنِ حدیث کی رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور حدیث کی کس کتاب میں ہے اور جو روایات ان میں دراصل حدیث نہ تھیں، بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ثابت ہیں تو ان احادیث و آیات اور اُن سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر گفتگو فرمائی۔

حصہ اوّل تشرف میں امام غزالیؒ کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے۔ اس حصہ کا مآخذ زیادہ تر امام غزالیؒ کی تخریج احیاء العلوم ہے جس کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں۔ جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ ۱۳۴۱ھ میں لکھا گیا ہے۔

حصہ دوم میں دفتر اوّل مثنوی مولانا روم اور اس کی شرح کلید مثنوی میں آئی ہوئی احادیث و روایات کی تخریج کی گئی ہے۔ ان احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کی المقاصد الحسنۃ سے التقاط کی گئی ہیں۔ یہ حصہ ۱۳۴۹ھ میں زیرِ قلم آیا۔

حصہ سوم و چہارم ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروفِ تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحقیقاتِ خاصہ کا جا بجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح و تطبیق و بعض مشکلات کا حل کیا گیا ہے۔ حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ۱۳۵۰ھ میں ترتیب پایا ہے اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں اور وہ محرم ۱۳۵۲ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

جامع الآثار

حضرات اہلِ حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے۔ اکثر حضرات حنفیہ پر یہ طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں۔ اور چونکہ کتب احادیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں۔ اس لئے ان میں حنفیہ کی مؤید حدیثیں یکجا نہیں ہیں۔ گو امام محمد کی مؤطا اور آثار اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الآثار اور مسند ابی حنیفہ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاوی کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے۔ مگر کتبِ صحاح و مسانید و مصنفات سے جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں۔ چن کر ان احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا۔ جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی۔

یہ ضرورت گو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہلِ حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب (عظیم آباد پٹنہ) سے ہوا۔ اسی لئے اس ضرورت کا احساس بھی پہلے ہمیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے آثار السنن کے نام سے کتب حدیث سے التقاط کر کے اس قسم کی حدیثوں کو شائع کیا۔ اس کے دو ہی حصے شائع ہو سکے۔ اس کا دوسرا حصہ سنہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا۔

علمائے احناف نے اس کتاب کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس تھے۔ اس کی مدح میں عربی قصیدے لکھے۔ افسوس ہے کہ مولانا نیموی کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا۔

احیاء السنن

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی، لیکن افسوس کہ اس کا مسودہ ضائع ہو گیا۔

جامع الآثار

کچھ دنوں کے بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا لیکن یہ سلسلہ ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہیں بڑھا تاہم جتنا مرتب ہو گیا۔ وہ چھپ کر شائع ہو گیا۔

تابع الآثار

یہ بھی اسی موضوع پر ہے اور اس کو جامع الآثار کا نمونہ بنایا گیا۔

احیاء السنن کا احیاء

۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ اس کے لئے بعض مستعد علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کام شروع کیا، جو کام وہ کرتے جاتے مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے، اس طور سے کتاب الحج تک کام ہوا اور اُس کا نام دوبارہ احیاء السنن رکھا گیا تاکہ مرحوم احیاء السنن کی یادگار ہو۔ اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا اور آئندہ کام کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا انتخاب ہوا ہے۔

الاستدراک الحسن

مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی وسعتِ نظر اور تحقیق وتنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا۔ سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو استدراک کے نام سے شائع کیا گیا۔

اعلاء السنن

اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر اعلاء السنن کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا اور اس وقت تک اس کی بارہ ۱۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں[۱] جن میں مذہب حنفی کی مؤید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہلِ فن کی تحقیقات اس کے شروح و حواشی میں یکجا کئے گئے ہیں۔

الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ

جمعہ وعیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف وتصنع اور مضامین کے ابتذال سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے زبان اور طرزِ ادا اور مضامین ومطالب کے لحاظ سے عہدِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہارِ قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہیں۔ حکیم الامۃ کی اصلاحی نظر سے محراب ومنبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہ رہا۔ چنانچہ الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ

---

[۱] بعد میں یہ کتاب اٹھارہ جلدوں میں بزبان عربی طبع ہو کر شائع ہوئی۔

کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدینؓ کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرماکر ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفاتِ باردہ کے گناہ سے محفوظ رہیں۔

خطبات الاحکام

جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا۔ جس میں احادیث وآثار وآیات سے ترغیب وترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد واعمال واخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

مناجاتِ مقبول

احادیث میں وارد شدہ اوراد واذکار مسنونہ کے لئے حصن حصین وحزبِ اعظم ملا علی قاری وغیرہ کی کتابیں رواج پذیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں، حضرتؒ نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ان سب سے تلخیص کر کے مناجاتِ مقبول قربات عند اللہ وصلوٰت الرسول کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے۔

⑤ علوم الفقہ

حضرت حکیم الامتؒ کو مسائل فقہیہ کی تلاش وتحقیق کا خاص ذوق تھا اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ واساتذۂ کرام سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ ابھی وہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فتویٰ نویسی کی خدمت لینی شروع کر دی تھی۔ اگر حضرت حکیم الامتؒ کی فقہی خدمات کا آغاز سنہ ۱۳۰۱ھ سے بھی کیا جائے تو سنہ ۱۳۶۲ھ تک بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فنِ شریف کی خدمت میں بسر کئے۔ اس طویل عرصہ میں ہزاروں مسئلوں کے جواب دیئے۔ ہزاروں فتوے اور سینکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے۔ متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتاویٰ کے نام سے حضرتؒ کے فتاویٰ کے مجموعے جمع کئے گئے، جس کی نظر ہندوستان میں کم ازکم نہیں ملتی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء۔

حوادث الفتاویٰ کے نام سے اُن فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانہ کے نئے مسائل اور نئے موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن کے جوابات گزشتہ کتب فتاویٰ سے بآسانی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو گو عورتوں کی ضروریات کے لئے ہیں۔ مگر ان میں تمام ابواب فقہیہ کے مسائل مندرج ہیں۔ جن کے جوابات ہندوستان کے حالات و ضروریات اور اصلاحات کے مطابق صرف انہی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

ترجیح الراجح : یہ وہ مجموعہ ہے۔ جس کی نظیر سلف صالحین میں تو ملے گی مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے ان مسائل کو جمع فرما دیا ہے۔ جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے۔ یہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضراتِ تابعین و تبع تابعین اور مجتہدینِ عظام کا طریق تھا۔ جس کو اس زمانہ میں حضرت حکیم الامتؒ نے زندہ کیا اور اپنے کو بارِ آخرت سے بچایا۔

فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے۔ جو مختصر رسائل ہیں۔

بہشتی گوہر۔ بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے۔ جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے۔ جو مردوں سے خاص ہیں۔ جیسے جمعہ، جماعت عیدین وغیرہ۔

ان کے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ رباء، مسئلہ رشوت، مسئلہ بنک، سینما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعات پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

(۶) علمِ کلام

علم کلام و عقائد اور توحید پر متعدد رسالے قلمبند فرمائے جو شائع و ذائع ہیں۔ خاص نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرایا۔ مثلاً ”اسلام اور سائنس“ کے نام سے الحصون الحمیدیہ کا مولانا اسحاق صاحب سے ترجمہ کرایا۔ یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف علامہ جسری ہیں۔ جنہوں نے سلطان عبدالحمید خان کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویلِ فاسد کا دروازہ نہیں کھولا گیا ہے۔

المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ تین حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام ومسائل کے مصالح وحکم بیان کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں نماز وزکوٰۃ، دوسرے میں روزہ، عیدین، صدقۂ فطر، قربانی، حج، نکاح وطلاق اور غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں خرید وفروخت ومعاملات، حدود وقصاص، فرائض، عذابِ قبر اور معاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔

الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ۔ یہ بھی علم کلام ہی کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔[1]

اشرف الجواب بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو مواعظ وملفوظات سے جمع کیا گیا ہے جس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات اور خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں۔

⑦ علمِ سلوک وتصوّف

علمِ سلوک وتصوّف روحِ شریعت کا نام ہے۔ جس میں اخلاقِ دین اور اعمالِ قلب کے احکام اور دقائق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدماء صوفیہ نے اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں، مثلاً رسالۂ قشیریہ امام قشیری، قوت القلوب ابوطالب مکی، کتاب اللمع ابونصر عبداللہ بن علی سراج الطوسی، کتاب الصدق ابوسعید خزاز، فتوح الغیب شیخ سہروردی اور غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر جیلانی اور متاخرین میں تصانیفِ امام شعرانی، ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ مصنوعی اور دوکاندار صوفیہ اور مبتدعہ کی تلبیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ بدعات کا مجموعہ بلکہ بطلان وضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہوگئے جو اسلام کی روح کے تمام تر منافی ہیں، حتیٰ کہ وحدتِ وجود، وحدتِ شہود ولطائف و دوائر کے مباحث واعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں جو یا تو علم کلام وفلسفہ یا اوہام وخیالات واحوال

---

[1] آجکل کے تعلیم یافتہ حضرات کے مطالعہ کے لئے بے نظیر کتاب ہے اسکا انگریزی ترجمہ بھی اب شائع ہوگیا ہے۔

سے وابستہ ہیں، جن کا تعلق نفسیات سے ہے۔

اصل شئے جو اخلاص فی الدین، طلبِ رضا، حصولِ قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات ہیں اور جن سے مقصود رذائل سے پاکیزگی اور فضائل سے آراستگی ہے۔ تمام تر متروک ہو گیا تھا۔ صدیوں کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو پھر سلفِ صالحین کے رنگ میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب و سنت کے نور میں اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا اور زبان و قلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔ وللہ الحمد!

اس سلسلے میں پہلی چیز قصد السبیل ہے جو پچاس ساٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے، لیکن اس کوزہ میں دریا بند ہے۔ فنِ سلوک کے وہ تمام حقائق و تعلیمات جو سالہا سال میں معلوم ہو سکے ہیں اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزلِ مقصود کو گم کر دیتے ہیں، اس میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں عمر صرف کر دے تو اس کے لئے انشاء اللہ کافی و وافی ہے

جاہل پیروں اور دکان دار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں اور اس زور شور سے اس کو شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے۔ احکامِ الٰہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فنِ سلوک سے ناآشنا ہے۔ اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے۔

؎ اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہ شہر جو مے نوش ہے

حضرت حکیم الامتؒ نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے مستنبط فرمایا اور اس کے متعلق مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ نام

کے دو رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ جن کا ذکر اُوپر گزر چکا۔ پھر ان مسائل سلوک کی تشریح فرمائی جن کا ماخذ احادیثِ نبوی اور سنتِ صحیحہ ہے اور یہ التشرف اور حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ میں مدون ہیں۔

اہلِ تحقیق کے لئے اس فنِ شریف پر ایک جامع کتاب التکشف بمہمات التصوف تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ یہ حقیقتِ طریقت، حقوقِ طریقت، تحقیقِ کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل ہے۔

طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا اُن کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کے بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی "مثنوی معنوی" جو سرود نواز حقیقت ہے۔ خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ ؒ کو اس سے خاص ذوق تھا اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ایماء سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا بحر العلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحبؒ کے خلفاء میں سے حضرت حکیم الامۃؒ نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی۔ سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی میں تطبیق فرمائی کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوان حافظ کی پرجوش و مردافگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط مے نوشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ بدگمانوں کو تو اس شراب معرفت پر شیراز کے بادۂ انگور کا شبہ ہوا اور بے احتیاط خوش گمانوں نے اس سے اباحت کی تعلیم حاصل کی کہ:

؎ بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

حضرت حکیم الامتؒ کی معرفت اس تیز و تند شراب کے "منافع و اثم" سے پوری طرح باخبر تھی، حضرت نے عرفانِ حافظ کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہو گیا۔

ع ساقی پلا پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین و سالکین کی تعلیم و تربیت کے لئے تربیۃ السالک و تنبیہۃ الہالک کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا۔ جس میں سالکین کے مشکلاتِ راہ، ذاکرین و شاغلین کے شبہات و خطراتِ راہ کے لئے ہدایات مندرج ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں۔ ۱۲۰۲ صفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے۔

ایک دوسرا اہم سلسلہ ملفوظات کا ہے، بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانہ سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ چشتیہ حضرات میں حضرت سلطان خواجہ معین الدین اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اہلِ شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کر سکے کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلمبند ہو سکے۔ وہ چند سال بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہیں ہیں اور نہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظرِ کیمیا اثر سے بھی گزارا تھا۔ تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے۔ اس لئے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لئے بڑی خیر و برکت کی چیزیں ہیں۔

حضرت حکیم الامتؒ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدوّن ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے اور جن میں سے اکثر حسن العزیز وغیرہ ناموں سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصّے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقہیہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات، طالبوں کی ہدایت و تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے مجربات وغیرہ اس

خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل و دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

⑧ اصلاحات

حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے اور خاصہ اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر اُن کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا ہے اصلاح کا دائرہ اِتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں اور عورتوں سے لے کر مردوں اور علماء و فضلاء کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے اور سب کے لئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شادی و غمی کے رسوم اور روز مرہ کی زندگی تک کو وہ محیط ہیں۔ غرض ایک مسلم جدھر اپنی زندگی میں رُخ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایات کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرتؒ کی سب سے اہم چیز مواعظ ہیں۔ واعظ تو بحمد اللہ زمانۂ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار گزرے ہوں گے۔ مگر شاید واعظین میں ابن نباتہؒ اور ائمۂ سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہیں، لیکن یہ ان بزرگوں کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہے، اللہ تعالٰے نے اس اخیر دَور میں اُمتِ اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفیدین کے دِل میں یہ ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر بشہر ہوئے ہیں۔ عین وعظ کے وقت لفظ بہ لفظ قید تحریر میں لائیں اور حضرت کی نظر سے گزار کر ان کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدہ کی غرض سے شائع کریں۔ چنانچہ اس اہتمام اور احتیاط کے ساتھ تقریبًا چار سو مواعظ جو احکام اسلامی، ردّ بدعات، نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کی مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور جن میں حقائق کے ساتھ ساتھ دلچسپیوں کی بھی کمی نہیں مرتب ہوئے اور اکثر شائع ہوئے اور مسلمانوں نے ان سے فائدے اُٹھائے۔

سلسلۂ اصلاح و تربیت میں حضرتؒ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عمومًا واعظین صرف عقائد و عبادات پر گفتگو فرماتے ہیں، حضرتؒ ان چیزوں کی اہمیت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق و معاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصلاح پر زور دیتے ہیں، بلکہ اپنی تربیت و

سلوک کی تعلیم میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے، حالانکہ عام مشائخ نے اس اہم سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا۔

⑨ حیواۃ المسلمین

مواعظ کے علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ان کی کتاب حیوٰۃ المسلمین ہے، جس میں قرآن پاک و احادیث نبویہ کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی دنیاوی ترقی و فلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری تصانیف میں اس کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی وہ کسی میں نہیں پیش آئی اور اسی لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ میں اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے لئے ذریعۂ نجات گمان کرتا ہوں۔

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں اصلاح الرسوم، صفائی معاملات، اصلاح امت اصلاح انقلاب اُمت وغیرہ ہیں اور ہر ایک کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی اور معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو اور ان کے سامنے وہ صراطِ مستقیم کھل جائے جو ہدایت کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے۔

افسوس کہ اس مضمون کو جس استیعاب اور اہتمام کے ساتھ یہ ہیچمدان لکھنا چاہتا تھا اپنی علالت و عدمِ صحت کے سبب سے اس کو اس طرح پورا نہ کر سکا تاہم جو کچھ ہوا وہ اگر مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو تو بہت ہے۔

طوفانِ اشک لانے سے اے چشم کیا فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

علامہ سید سلیمانؒ ندوی کا یہ معرکۃ الآراء مضمون رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کے ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

فیضان تصانیف حکیم الامتؒ

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحبؒ

* * *

اللہ جل شانہٗ نے ہمارے حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ العزیز کو اس دورِ حاضر میں مجددیت و مجتہدیت کے منصب پر فائز فرمایا تھا۔ حضرتؒ نے مسلمانوں کی ہر شعبۂ زندگی میں بڑھتی ہوئی دینی و دنیوی تباہیوں اور بربادیوں کو محسوس فرمایا اور ان کی دین سے منافرت کے اسباب پر نظر ڈالی اور دینی شعور کے بڑھتے ہوئے فقدان کا اندازہ کیا۔ پھر اپنی تمام زندگی مسلمانوں کے رشد و ہدایت اور تبلیغ دین کے لئے وقف کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہمیشہ شاملِ حال رہی اور حضرتؒ کو اپنی حیات ہی میں اپنی مساعی اور کارنامۂ تبلیغ میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور ملک کے گوشہ گوشہ میں حضرت کے تحریری و تقریری فیوض و برکات سے مسلمانوں میں ایک حیاتِ تازہ پیدا ہو گئی۔ جذبۂ اسلامی بیدار ہو گیا اور اکثر و بیشتر مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی میں ایک بہتر انقلاب پیدا ہو گیا۔ اُب تک تمام معتبر و مُستند علومِ دینیہ، عربی و فارسی زبان میں مدون تھے مگر اس مجددِ وقت کے فیضان ایمانی و روحانی سے اُردو لٹریچر دینِ مبین کی حیات افروز دولت سے مالا مال ہو گیا اور اس کا وقار و معیار معتبر و مستند ہو گیا۔

حضرت والا قدس سرہٗ العزیز کی تصانیف کثیرہ، تفسیر و احادیث اور فقہ و تصوف پر مشتمل ہیں اور ملفوظات و مواعظ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ دورِ حاضر کے خاص دینی علوم و فنون کے مبصروں نے حضرتؒ کے دینی کارناموں کے پیشِ نظر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حضرت اقدسؒ

اس عہد کے مجدد ملت، حکیم الامت وحجۃ اللہ فی الارض تھے۔ چنانچہ اظہر من الشمس ہے کہ خواص و عوام کے لئے علماء و صلحاء کے لئے طالبین و سالکین کے لئے مفید و کار آمد اور بصیرت افروز اعجازی و الہامی مضامین مدتوں تک منجانب اللہ حضرتؒ والا کے قلم و زبان سے جاری رہے۔ شریعت و طریقت کے دقائق و حقائق کی تشریح و وضاحت ہوتی رہی۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

مسلمانوں کے لئے دین و دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر حضرتؒ والا کی سیر حاصل مستند و معتبر تصانیف اور مواعظ و ملفوظات نہ ہوں۔ نصائح و وصایا کا بھی نہایت جامع و نافع مکمل دستور العمل مرتب فرما دیا ہے۔ خود بھی بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ:

> ”بحمد اللہ و بفضلہٖ تعالیٰ سب ضروری کام ہو گیا ہے۔ صدیوں تک کے لئے دین کا راستہ بے غبار ہو گیا ہے۔ آئندہ نسلوں کے لئے ان شاء اللہ تعالیٰ میری ہی تصانیف ملفوظات و مواعظ سے ضروری کام چلتا رہے گا۔ یہ سب حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز کا فیض و برکت ہے۔“

بعض اہم تصانیف

حضرت اقدس سرہٗ العزیز کی یوں تو تقریباً ایک ہزار تصانیف ہیں اور ہر تصنیف اپنے مقام پر نہایت دقیع، جلیل القدر اور معتبر و مفید ہے، مگر میں صرف چند ضروری کتابوں کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں۔ جن کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ دین کا بہت ضروری علم حاصل ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ چند کتابیں ایسی ہیں جن کے لئے ضروری ہے کہ کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً استفادہ کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہم اور ضروری کتابیں جن کا شروع ہی میں مطالعہ کیا جائے تو بہت مناسب ہے۔ وہ اشرف السوانح ہر چہار حصہ ہے۔ یہ کتاب اپنی نافعیت میں لاجواب ہے۔

یوں تو اس کتاب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مبارک کے مفصل حالات ابتداء سے تا آخر مذکور ہیں، مگر اس کے حصہ دوم میں حضرتؒ کا تمام کارنامۂ تبلیغ دین نہایت جامعیت و نافعیت کے ساتھ افادیت عام کے لئے بہترین ہدایت نامہ ہے۔ حضرتؒ نے جہاں تفسیر بیان القرآن اور کلید مثنوی جیسی مہتم بالشان اور عظیم المرتبت کتابیں اُردو میں تصنیف فرمائی

ہیں اور التکشف ونیز بوادر النوادر میں معارف وحقائق کی نہایت سلیس اُردو میں وضاحت فرمائی وہاں روزمرہ کی دینی ضروریات کے لئے چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابیں بھی تحریر فرمائیں۔ جن سے مسلمانوں کے بچے اور عورتوں تک مستفیض ہوئیں اور انشاء اللہ تعالیٰ ہوتی رہیں گی۔

چنانچہ بہشتی زیور اور بہشتی گوہر ان کی ایک زندہ وتابندہ مثال ہے۔ یہ اُردو میں دین کے ایسی بے مثال اور شہرۂ آفاق کتاب ہے کہ جس میں حضرت نے تمام قرآن وحدیث کے مضامین کے بحر ذخار کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں دین و دنیا کی کوئی ایسی ضروری بات نہیں۔ جو اس میں مذکور نہ ہو گویا دین اسلام کی یہ ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا ہے۔ آج تک کوئی ایسی کتاب نہ تھی۔ جس میں خاص طور پر عورتوں کے لئے تمام دینی معلومات اور ضروریات دنیوی کے لئے تمام مسائل اور علوم نہایت سہل طریقے سے اُردو زبان میں۔ جمع کر دیئے گئے ہوں۔ اس کتاب میں جہاں عقائد، ایمان، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاقیات کے نہایت سہل زبان میں مضامین ہیں۔ وہاں پند ونصائح بھی ہیں، علاج معالجہ کی تدبیریں بھی ہیں۔ صنعت وحرفت جو گھریلو زندگی میں ممکن ہے۔ اس کا بھی ذکر ہے۔ مختلف بیماریوں اور مشکلات کے لئے ضروری تعویذ اور مسنون عملیات ودعائیں بھی ہیں مزید تفصیل تو مطالعہ ہی سے واضح ہوگی۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مختصر مختصر کتابیں حضرتؒ کی تصانیف میں ہیں۔ اہلِ ذوق ان کو فراہم کریں اور مطالعہ سے فائدہ حاصل کریں۔ حضرت نے عام مسلمانوں خصوصاً دنیوی مشاغل میں مصروف رہنے والوں کے لئے شریعت وطریقت کا ضروری علم حاصل کرنے کے لئے چند کتابیں تجویز فرمائی ہیں۔ جن کی فہرست میں آئندہ پیش کر دوں گا۔ ہر شخص اُن کو پڑھ کر اپنی ظاہری وباطنی زندگی اللہ اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق آسانی سے سنوار سکتا ہے اور تمام مکروہات ومنکرات اور ضلالت وگمراہی سے بچ سکتا ہے۔

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں چند بزرگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے اقتباسات وانتخابات مناسب ترتیب وتبویب کے ساتھ جمع کر کے شائع کئے

ہیں جو اپنی نوعیت میں بہت ہی کارآمد ہیں[1] اور حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے اور خود بھی اپنے مجددانہ انداز میں الہامی مضامین کا انتخاب مرتب کر کے شائع کیا ہے اس مجموعہ کا نام ”بوادر النوادر،، ہے۔ جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق چمن بندیٔ علوم کا آئینہ دار ہے۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری ملاقات میں علامہ سید سلیمان ندویؒ (خلیفۂ ارشد حضرت حکیم الامتؒ) سے ارشاد فرمایا تھا کہ میری تصانیف سے انتخاب شائع کرتے رہنا۔ اتنے بڑے علامہ سے یہ فرمائش بڑی معنی خیز ہے۔

بظاہر اس ارشادِ گرامی کی اہمیت اس طرح مفہوم ہوتی ہے کہ چونکہ حضرتؒ کو اپنی تصانیف و مواعظ و ملفوظات پر منجانب اللہ پورا یقین تھا کہ اس میں شریعت و طریقت کی اس طرح کامل وضاحت ہوئی ہے کہ وہ آئندہ نسلوں کے لئے بہت ہی کافی وشافی ہوگی اور جب ان کے مضامین علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسے متبحر عالم و صاحب ظاہر و باطن کے ذریعہ سے اشاعت پذیر ہوں گے تو نہایت پُر اثر اور معتبر ہوں گے مگر کچھ ایسے حالات و واقعات درپیش ہوتے رہے کہ حضرت سید صاحبؒ کو اس سعادت کے حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ ان کے پیشِ نظر ”سیرت اشرف،، کے مرتب کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ اس کی تکمیل بھی نہ ہو سکی۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تمنا بعض دوسرے خدام کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً پوری ہوتی ہی رہتی ہے۔ فقط۔

مولانا عبدالباری صاحب (خلیفۂ راشد حضرت رحمۃ اللہ علیہ) نے ایسا ہی کام سرانجام دیا ہے اور متعدد کتابیں مختلف عنواناتِ مفیدہ کے تحت میں شائع کی ہیں[2]۔ جو اُن کی بڑی قابلِ قدر یادگار اور حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق رکھنے والے صاحبانِ علم کے لئے بہت سبق آموز اور راہنما ہیں۔ کاش حضرت سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم حضرات اس طرف توجہ فرماتے۔

حصولِ سعادت کے لئے انسب وانفع طریقہ تو یہ تھا کہ اپنی تصانیف کے ساتھ ساتھ لیکن

---

[1] انفاس عیسیٰ، کمالاتِ اشرفیہ، الرفیق سواء الطریق، اشرف المسائل وغیرہ۔

[2] تجدید دین کامل، تجدید تصوف وسلوک، تجدید تعلیم و تبلیغ، تجدید معاشیات وغیرہ۔

وطالبین کو حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف ہی کی طرف متوجہ کیا جاتا۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کی دل نشین تشریح کی جاتی تاکہ لوگوں کے امورِ زندگی کی اصلاح ہوتی۔ ملفوظات کی وضاحت کی جاتی تاکہ زندگی کے ہر شعبہ پر روشنی پڑتی اور بہتر تغیر پیدا ہوتا۔ کیونکہ یہ مضامین تمام تر صلاح و فلاح دارین کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہیں اور ان میں دین و دنیا کی ہر قسم کی ضرورت اور ہر طرح کی مشکل اور ہر ممکن شک و شبہ، اعتراض اور اشکال کا حل موجود ہے۔

فسادِ عقائد، مذمومات، عبادات وطاعات، رسوم و بدعات کی خرابیاں، معاملات میں منکرات کی آمیزش معاشرہ میں فسق و فجور کا طغیان، اخلاقِ باطنیہ میں نفسانیت کی آلودگی کا مؤثر معالجہ اور اُن سے نجات کے لئے مفید اور آسان تدابیر کا کافی وشافی ذخیرہ ان مضامین میں موجود ہے۔

ملفوظ بابت تفسیر بیان القرآن

ایک بار حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تفسیر بیان القرآن میں سب الہامی مضامین ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے، جو الفاظ ومعانی الہام فرمائے بعینہٖ میں نے وہی لکھے۔ بجز دو، ایک مقام کے جن کی میں نے نشان دہی کر دی ہے۔ یہ تفسیر میں نے کامل شرح صدر کے ساتھ لکھی ہے اس کی قدر تو ان لوگوں کو ہوگی، جنہوں نے کم از کم بیس معتبر تفاسیر کا مطالعہ کیا ہو۔ وہ دیکھیں گے، وہ مقامات جہاں سخت اشکالات واختلافات واقع ہوئے ہیں۔ ان کا حل کیسی سہولت کے ساتھ قوسین کے اندر صرف چند الفاظ بڑھا دینے سے ہوگیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے۔

حضرتؒ والا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

> "میں نے بیان القرآن میں یہ بھی التزام کیا ہے کہ تفسیر تو وہی لکھی جو میری سمجھ میں آئی جب تک اس کی تائید سلف صالحین کی تفاسیر سے نہیں ملی۔ اُس پر اطمینان نہیں کیا۔ اس صورت میں تفسیر بظاہر تو سلف کی تفاسیر سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ سرتاسر خود حضرتؒ والا ہی کی تفسیر ہے۔ نیز اس التزام میں وقت بھی بہت صرف ہوا اور ہر مقام کے لئے بہت سی تفاسیر کو دیکھنا پڑا اور دیکھنے والوں کو اس کی خبر بھی نہیں اور جہاں اپنی تفسیر کی کوئی صریح تائید سلف سے باوجود تلاش کے نہیں ملی۔ وہاں بھی رکھا میں نے اپنی ہی تفسیر کو، لیکن اُس کے آگے یہ لکھ

دیا کہ ہذا من المواہب، اھ "

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"تفسیر بیان القرآن کے بعض بعض مقامات کی تفسیر لکھنے کے قبل میں آدھ آدھ گھنٹہ ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا اور اللہ تعالٰے سے دُعا کرتا رہا۔ تب کہیں جاکر شرح صدر ہوا اور جن بعض مقامات کے متعلق پھر بھی شرح صدر نہ ہوا۔ وہاں اُس کا صاف اظہار فرما دیا اور لکھ دیا کہ اگر اس سے بہتر تفسیر کہیں مل جائے تو اسی کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ تفسیر میں دو مقامات ایسے ہیں، ایک سورۂ برأت میں ایک سورۂ حشر میں اور یہ حضرت" والا کی خصوصیاتِ خاصہ میں سے ہے ورنہ اکثر اہل علم کو اپنے عجز و نقص کے اظہار سے عار مانع ہوتی ہے۔"

ملفوظ بابت نشر الطیب و تعلیم الدین

نشر الطیب جو کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مختصر و جامع کتاب ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ جس گھر میں اس کا مطالعہ شوق و محبت سے کیا جائے گا انشاء اللہ وہاں ہر طرح سے خیر و برکت ہوگی۔

کتاب تعلیم الدین ایسی کتاب ہے جس میں دین کے پانچوں شعبے یعنی عقائد، عبادات و معاملات، معاشرت، اخلاقیات کے متعلق تمام مضامین کلام اللہ اور کلام رسول اللہ ہی سے اخذ کرکے جمع کئے گئے ہیں اور تصوّف کی اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اگر کم فرصت اصحاب صرف اپنے مطالعہ کو اسی پر منحصر کرلیں تو انشاء اللہ دنیا و آخرت کے لئے بڑا جامع و نافع، کافی و شافی ذخیرہ موجود ہے۔ حیات المسلمین کے متعلق حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ملاحظہ ہو۔

ملفوظ بابت حیات المسلمین

فرمایا مجھ کو اپنی تصنیف کے متعلق یہ خیال نہیں کہ یہ میرا سرمایۂ نجات ہے۔ البتہ حیات المسلمین کے متعلق میرا غالب خیال یہی ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور سرمایہ سمجھتا ہوں۔ مگر لوگ اس کو اُردو میں دیکھ کر بے وقعت سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر ان علماء

کو ہوگی جو حدیث شریف پڑھاتے ہیں، وہ دیکھیں گے کہ کونسا اشکال کہاں پر کس ذرا سے لفظ سے حل ہوگیا ہے اور پھر یہ کتاب گویا ایک فہرست ہے ان اعمال کی کہ جن سے یقینی طور پر دنیا کی بھی فلاح حاصل ہوگی اور دین کی بھی۔ میں نے اس کو بہت سوچ سوچ کر لکھا ہے، اس کے لکھنے میں مجھ کو تعب ہوا ہے۔ میں اول اس کے مضامین لکھتا تھا۔ پھر ان کو سہل کرتا تھا اس کے بعد دیکھتا تھا کہ اگر کم سہل ہوئے تو پھر دوبارہ سہل کرتا تھا اور میں ہر ماہ اُس کے دو ورق لکھا کرتا تھا اور وہ دو ورق بھی بعض مرتبہ کئی کئی بار کے مسودہ میں لکھے جاتے تھے

(حاضرین میں سے ایک صاحب نے بہشتی زیور کے سہل ہونے کی تعریف فرمائی) اس پر فرمایا کہ اس کے اندر تو مسائل ہیں۔ اس کی تسہیل تو چنداں دشوار نہیں اور اس کے اندر احادیث کی شرح کی گئی ہے۔ مگر ایسی شرح کی گئی ہے کہ جس سے سارے اشکالات کا حل ہوگیا ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں کوئی اشکال ہو تو وہ اس کے پڑھنے سے حل ہو جائے گا۔ اور اس کی اسی شخص کو قدر ہوگی۔ ورنہ اور کوئی کیا قدر کر سکتا ہے۔ میرا تو ارادہ تھا کہ میں ایک بار حیوٰۃ المسلمین کو خود پڑھوں گا۔ مگر ہجوم کے احتمال پر موقوف کر دیا۔ مسلمانوں کو جتنی ذلت اور پریشانی آج کل ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں ان سب کا علاج ہے۔

پھر ایک صاحب نے ملفوظ مسمّٰی بہ سلسبیل کی تعریف کی پھر اس کے بعد اس میں سے مختصر ملفوظ ”الیم فی الیم“، کی بھی تعریف فرمائی تو حضرت نے ہنس کر ارشاد فرمایا کہ میں اس ملفوظ کو ایک رسالہ کہا کرتا ہوں۔ ایک رسالہ تو میرا بارہ ۱۲ جلدوں میں ہے یعنی تفسیر ”بیان القرآن“ اور ایک رسالہ میرا بارہ ۱۲ سطروں میں ہے یعنی ”الیم فی الیم“ مگر یہ میزان کل ہے تمام سلوک کی لیکن اس میزان کل کی قدر اس کو ہوگی۔ جس نے پوری چھان بین کی ہو اور پوری تفصیل دیکھی ہو، ورنہ کوئی کیا قدر کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات سلوک کی رہی نہیں۔

حضرتؒ والا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

> ”بعض تصانیف میں کسی بہت ہی مختصر سی بات کے معلوم کرنے کے لئے بعض کتب کو دوسرے مقامات سے بڑا اہتمام اور خرچ کر کے منگوایا گیا اور اُس کی مدد سے ایک ذرا سی عبارت لکھ کر اُن کو فوراً واپس کر دیا گیا۔ اب اس ذرا سی

عبارت کو دیکھنے والا یوں ہی پڑھتا چلا جائے گا لیکن اس کو کیا خبر کہ اس کے لکھنے میں کیا اہتمام کیا گیا تھا"۔

فرمایا جب قصد السبیل لکھی ہے۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی تھی۔ اگر مناسبت ہو جائے تو انہی کتابوں کو لے کر بیٹھ جایئے۔ عمر بھر کی رہبری کے لئے کافی ہیں، مثلاً قصد السبیل، تعلیم الدین، تربیت السالک وغیرہ۔

ایک مشورہ

"فرمایا گو مجھ سے کوئی بیعت نہ ہو، لیکن عقیدت کے ساتھ میری کتابیں لے کر کونے میں بیٹھ جائے انشاء اللہ تعالےٰ واصل الی المقصود ہو جائے گا۔ اس ضمن میں آپ نے فرمایا کہ جو طالب علم کسی بزرگ سے بھی مناسبت نہ رکھتا ہو اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ کتاب و سنت پر عمل کرتا رہے اور اپنی اصلاح و ہدایت کے لئے بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرتا رہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ وہ بھی واصل الی المقصود ہو جائے گا۔"

اشرف النصاب

حضرت" والا نے ان لوگوں کے لئے جو دنیاوی مشاغل کی وجہ سے دین کا ضروری علم حاصل کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں احکاماتِ شریعت و سنت کے ضروری علوم جن کو ہر مسلمان کے لئے حاصل کرنا ضروری ہے ان کے لئے چند خاص خاص کتابوں کا ایک نصاب مقرر فرمایا ہے۔ جس کے مطالعہ سے تمام ضروری فرائض و واجبات اور اوامر و نواہی کا علم ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے، ورنہ بغیر اس کے حاصل کئے ہوئے نہ دنیا ہی کی فلاح مل سکتی ہے نہ آخرت کے مواخذہ سے نجات ممکن ہے۔ وہ نصاب ذیل میں درج ہے۔ کتابوں کا مطالعہ اسی ترتیب سے کیا جائے۔

① بہشتی زیور اور بہشتی گوہر
② حقوق الاسلام
③ فروع الایمان
④ جزاء الاعمال

⑤ صفائی معاملات
⑥ اصلاح الرسوم
⑦ تعلیم الدین
⑧ حیٰوۃ المسلمین
⑨ آداب المعاشرت
⑩ قیامت نامہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ
⑪ تبلیغِ دین
⑫ نشر الطیب
⑬ قصد السبیل
⑭ شوقِ وطن
⑮ الانتباہات المفیدہ اس کی تسہیل حل الانتباہات
⑯ تسہیل المواعظ کے وعظ جس قدر مل سکیں۔

ہدائیت

① اگر تسہیل المواعظ نہ مل سکیں تو ان کے بجائے اصل مواعظ کا مطالعہ کیا جائے اس کے بعد مزید ترقی و بصیرت کے لئے جس قدر ممکن ہو دوسرے مواعظ اشرفیہ (بالخصوص مواعظ ہفت اختر، طریق القلندر اور محاسن الاسلام اور ملفوظات اشرفیہ کا مطالعہ مناسب ہے۔")

② مناسب یہ ہوگا کہ اس نصاب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق سبق ساتھ ساتھ شروع کئے جائیں۔

① بہشتی زیور مع بہشتی گوہر
② مواعظ میں سے کوئی وعظ
(جب ایک وعظ ختم ہو جائے تو دوسرا وعظ شروع کر دیا جائے اور
③ باقی چودہ کتب میں سے کوئی کتاب (ترتیب مذکورہ کے مطابق)

نصاب تصوف

حضرتؒ والا نے اہلِ تصوف اور سالکینِ طریق کے لئے بھی چند کتابوں کا ایک نصاب مقرر فرمایا ہے۔ جس کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ (انشاء اللہ) اس کے مطالعہ سے سالکین کو نفس و شیطان کے مکائد معلوم ہوں گے اور ہر طرح کی بدعات و ضلالت باطنیہ کی ضروری اور تفصیلی معلومات

حاصل ہوں گی ۔ اگر کسی اہلِ علم سے سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے ۔ جس طرح کتابوں کی نمبر وار ترتیب دی گئی ہے ، اسی طرح پڑھنے کی ہدایت ہے ۔

① آداب المعاشرت
② معمولات خانقاہ
③ رحمۃ المتعلمین حصہ اوّل
④ تعلیم الدین باب اوّل و دوم
⑤ التکشف حصہ اوّل
⑥ فروع الایمان
⑦ نُزہۃ البساتین
⑧ وعظ راحت القلوب
⑨ تبلیغ الدین
⑩ جہاد اکبر
⑪ قصد السبیل
⑫ بقیہ تبلیغ الدین
⑬ التکشف حصہ دوم و سوم
⑭ مسائل السلوک
⑮ کلید مثنوی دفتر ششم
⑯ تربیت السالک تمام
⑰ عوارف یا اسکا ترجمہ
⑱ الدر المنضود
⑲ ترجمہ آداب العبودیت
⑳ ترجمہ تنبیہ المغترین
㉑ اکمال الشیم
㉒ رفع الضیق
㉓ اصول الوصول
㉔ الابتلاء لاہل الاصطفاء

دین کے ہر شعبہ میں خاص تصانیف

① عقائد : تعلیم الدین ۔ فروع الایمان ۔ اکسیر فی اثبات التقدیر ۔ الانتباہات المفیدۃ المصالح العقلیہ ۔ حفظ الایمان ۔ شوقِ وطن ۔ احکامِ تجلّی ۔ اشرف الجواب ۔

② عبادات : خطب ماثورہ ۔ مناجاتِ مقبول ۔ جزاء الاعمال ۔

③ معاملات : تعدیل حقوق الوالدین ۔ حقوقِ زوجین ۔ حقوق سلام جماعت المسلمین ۔ حقوق البیت ، اصلاح انقلاب اُمت

④ معاشرت : صیانۃ المسلمین ۔ اغلاطِ العوام ۔ صفائی معاملات ۔ اصلاح الرسوم ۔ آداب المعاشرت ۔

⑤ اخلاقیات : التکشف ۔ کلید مثنوی ۔ بوادر النوادر ۔ قصد سبیل ۔ اشرف المسائل البدائع الرفیق فی سواء الطریق ۔ مسائل سلوک ۔ التشرف ۔ تربیت السالک ۔

⑥ سیرت النبی ؐ : نشر الطیب ۔ زاد السعید ۔

⑦ علوم القرآن : تفسیر بیان القرآن

⑧ علوم حدیث : اعلاء السنن ۔

⑨ علوم فقہ : بہشتی زیور، امداد الفتاویٰ ۔ ترجیح الراجح ۔ رفع الضیق ۔ وعظ راحت القلوب ۔ الابتلاء لاہل الاصطفاء ۔

ضابطۂ تصنیف و تالیف

حضرتؒ والا کا ذہن کبھی فارغ نہیں رہتا تھا۔ اکثر مسائل مشکلہ پیش آمدہ میں غور و خوض ہی فرماتے رہتے تھے اور جب کوئی بات سمجھ میں آتی تو اس کو یادداشت میں تحریر فرما لینے کا فوراً انتظام فرماتے تاکہ ذہن سے نکل نہ جائے۔ اس کا یہ بھی سبب تھا کہ حضرتؒ والا اپنے دماغ پر کسی بات کے یاد رکھنے کا بار بلا ضرورت کبھی نہیں ڈالتے تھے اور کوئی کام اُدھار نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر فرمایا کرتے کہ جس وقت جو کام پیش آتا ہے۔ میں اس کو دوسرے وقت پر نہیں ٹالتا بلکہ فوراً کر ڈالتا ہوں، گو اس میں اس وقت تو تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن بعد فراغ بس بالکل بے فکری ہو جاتی ہے اور پھر بڑی راحت ہوتی ہے۔ ورنہ ٹالنے سے اکثر کام پھر ہوتے ہی نہیں اور اگر ہوئے بھی تو برابر فکر دامن گیر رہتی ہے اور جتنا وقت گزرتا ہے وہ کلفت ہی میں گزرتا ہے پھر اس سے تھوڑی دیر کی تکلیف ہی کیوں نہ گوارا کر لی جایا کرے۔ پھر چاہے فراغ کا وقت کم ہی ملے مگر وہ راحت اور بے فکری سے تو گزرے گا۔ جس سے دماغ کو سکون ہوگا، اور قلب کو فرحت حاصل ہوگی۔

حضرتؒ والا تصنیف کے معمولات کو بیان فرما کر فرمایا کرتے کہ ایسی حالت میں اگر کوئی خادم دین معاش کا شغل کر لے تو وہ دین کی خدمت کما حقہ کیونکر کر سکتا ہے۔

حضرتؒ والا کی کثرت تصانیف اور وقت میں برکت ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حضرتؒ والا نہایت منضبط الاوقات تھے۔ چنانچہ حضرتؒ والا فرمایا کرتے کہ اگر میں انضباطِ اوقات نہ کرتا تو دین کی جو کچھ تھوڑی بہت مجھ سے خدمت ہو سکی ہے وہ ہرگز نہ ہو سکتی۔

کیونکہ حضرت والاؒ نے محض خدمتِ دین سمجھ کر خالصاً لوجہ اللہ کتابیں تصنیف فرمائیں اور مقصود اشاعتِ دین تھا۔ اِس لئے حضرت والا نے اپنی کسی تصنیف کی نہ خود رجسٹری کرائی نہ کسی دوسرے کو رجسٹری کرلنے کی اجازت دی۔ کیونکہ رجسٹری کرنا اور رجسٹری کرانا شرعاً

بالکل ناجائز ہے۔ چنانچہ بہ ضرورت شرعیہ حضرتؒ والا نے اس کے متعلق ایک اعلان بھی تتمہ رابعہ تنبیہات وصیت مطبوعہ الامداد بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ میں شائع فرمایا تھا جو یہاں اطلاع عام کے لئے بفضلہٖ نقل کیا جاتا ہے۔ وہ اعلان یہ ہے:

“چونکہ یہاں کی تصانیف پر کسی سے کچھ حق تصنیف وغیرہ نہیں لیا جاتا، اس لئے اُن کی رجسٹری کرانے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔”

(فقط یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ)

حضرتؒ والا مثل دیگر امورِ ضروریہ کے اپنی تصانیف کے متعلق بھی نہایت احتیاط اور اہتمام کا التزام رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنی ہر چھوٹی بڑی تصنیف یا تحریری مضمون کے ناموں کی بالالتزام اپنے پاس یادداشت رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً شائع فرماتے رہتے ہیں، اس میں علاوہ مکمل فہرست محفوظ رہنے کی مصلحت کے بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اس صورت میں کوئی تصنیف غلط طور پر حضرتؒ والا کی طرف منسوب نہ کی جاسکے۔ چنانچہ حضرتؒ نے ایک یہ عام اطلاع بھی شائع فرمادی تھی کہ جس مسودہ پر میرے دستخط نہ ہوں یا جابجا میرے ہاتھ کی اصلاح بنی ہوئی نہ ہو، وہ میرا نہ سمجھا جائے۔ اھ

سب سے بڑی احتیاط جو حضرتؒ والا کی اعظم خصوصیات سے ہے کہ اپنی تصانیف کے تسامحات اتفاقی کو جن کا علم خود یا کسی دوسرے کے ذریعہ سے ہوتا رہتا اُن سے رجوع فرماتے رہتے تھے اور اس رجوع کو شائع بھی فرمادیتے تھے اور اس سلسلہ کا ایک خاص لقب “ترجیح الراجح” تجویز کیا تھا جو مستقل طور پر جاری رہا۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ والا کو جہاں اپنے تسامح پر شرح صدر ہو جاتا۔ وہاں رجوع فرمالیتے اور جہاں تردّد رہتا وہاں جواب لکھ کر یہ تحریر فرما دیتے کہ دیگر علماء سے بھی تحقیق کرلیا جائے۔ اس سلسلہ کے متعلق حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ ترجیح الراجح اس زمانے میں ایک بالکل نرالی چیز ہے۔ یہ سلف صالحین کا معمول تھا۔ مولانا تھانوی (یعنی حضرتؒ والا) کی امتیازی شان اور کمال صدق و اخلاص کے ظاہر کرنے کے لئے بس یہی کافی ہے۔ اھ

حضرتؒ والا نے بعض فضلاء سے اپنی تصانیف بہشتی زیور، امداد الفتاویٰ اور تفسیر بیان

القرآن پر نظر ثانی بھی کرائی اور جن تسامحات پر شرح صدر ہوگیا اُن کو اصل میں درست فرما کر شائع کرادیا۔ غرض حضرتؒ والا اس کی بہت ہی احتیاط فرماتے کہ میری کسی تحریر سے کسی کو کسی زمانہ میں کسی قسم کا بھی ضررِ دینی نہ پہنچنے پائے اور غلط فہمی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ حضرتؒ والا کے رسالہ تنبیہات وصیت کی تنبیہہ دہم متعلقہٗ تالیفاتِ خود میں بھی اور اس رسالہ کے تتمات میں بھی بعض احتیاطیں مذکور ہیں جو وہاں یا اشرف السوانح کے باب وصایا میں تلاش سے مل سکتی ہیں۔

حضرتؒ والا کی تصانیف کی بعض خصوصیاتِ فہرست تالیفات میں بھی مذکور ہیں جو اشرف السوانح کے آخر میں ملحق ہیں۔ ان کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔ (اشرف السوانح جلد ۳)

حضرتؒ والا کسی کتاب پر تقریظ محض اجمالی مطالعہ پر نہیں تحریر فرماتے کیونکہ اس کو ناجائز سمجھتے تھے اور اگر تفصیلی مطالعہ کی فرصت نہیں ہوتی تھی اور اکثر ہوتی بھی نہیں تھی تو کسی ایک مقام کی تعیین کرالیتے اور اس کے متعلق تقریظ تحریر فرمادیتے اور اس صورت میں جس پر اطمینان ہوتا۔ اس مقام کی تقریظ میں بھی یہ اضافہ فرمادیتے کہ امید ہے کہ بقیہ کتاب بھی ایسی ہی ہوگی اور قبل تجربہ احیاناً اس معمول کے خلاف بھی ہوگیا۔ مگر بعد کو اس کتاب کی غلطیوں پر مطلع ہونے پر بہت افسوس ہوا اور اپنی تقریظ سے رجوع کا اعلان شائع فرمادیا۔

اپنی تصانیف کے متعلق حضرتؒ کا یقین

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک بار کچھ مخالفین کی حضرتؒ کی تصانیف کے متعلق مخالفانہ کارروائیوں کا ذکر تھا اس وقت حضرت نے بہت جوش کے ساتھ فرمایا کہ مخالفین سب اپنی اپنی کوششیں کرلیں۔ آپ دیکھیں گے کہ انشاء اللہ تعالیٰ میری کتابیں ایسی پھیلیں گی کہ کسی کے روکے نہ رکیں گی۔ (بفضلہٖ تعالیٰ ایسا ہی ہو رہا ہے)

(اشرف السوانح)

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا طریقِ تعلیم و تربیت

حضرت مولانا محمد میاں صاحب صدیقی۔ اسلام آباد

انسان تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے، روح، جسم اور عقل۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نسلِ انسانی کے کسی فرد کی صحیح تربیت اسی وقت ممکن ہے جب ان تینوں اجزا کا خیال رکھا جائے اور کسی مرحلے پر بھی ان تینوں کے یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

انسان کی تربیت کا وہی نظام صحیح اور درست ہو سکتا ہے۔ جس میں ان تینوں تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام موجود ہو۔ اگر صرف جسمانی ضروریات پوری کرنے پر زور دیا جائے تو انسان حیوانِ محض بن کر رہ جائے۔ اس کی عقل کو زنگ لگ جائے اور روح لاغر و ناتواں ہو جائے۔ اگر عقل کو اوّلیت دی جائے اور اسے امام بنا لیا جائے تو انسان بحث و تمحیص اور ابلیسی مکر و فریب ہی کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھ لے۔ اس کے ہاتھ سے رشتۂ عمل چھوٹ جائے اور وہ جذبۂ ایثار و محبت سے بھی محروم ہو جائے۔ اور اگر انسان عقل اور جسم کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دے اور ساری توجہ روحانی کیفیات کے ارتقاء پر صرف کر دے تو اس کی وہ قوتِ عمل مفلوج ہو کر رہ جائے جسے کام میں لانے کا اللہ نے قدم قدم پر حکم دیا ہے، حقوق و فرائض کی جو طویل فہرست اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے انسان کے سپرد کی ہے اور انہیں ادا کرنے کا حکم دیا ہے، انسان اُن کی ادائیگی سے عاجز و درماندہ ہو جائے۔

اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جس طرح بھرپور زندگی گزاری ہے اُس کی امت کے افراد ویسی زندگی گزارنے سے محروم ہو جائیں گے حالاں کہ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر

کی زندگی کو پوری نسلِ انسانی کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نمونۂ کامل بنایا ہے اور اس کی پیروی کا حکم ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عہدِ جدید کے آغاز میں تشریف فرما ہوئے اور اس عالمِ ہست و بود کو رونق بخشی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ہی اس دورِ جدید کے دروازے کو کھولنے والے ہیں کیوں کہ تجرباتی اندازِ علم سے جو موجودہ سائنس کا بنیادی اصول ہے پہلے پہل قرآنِ حکیم ہی نے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے نہ صرف "الدین" کے بنیادی اصول توحید پر بہت زیادہ زور دیا بلکہ ایک ایسا نظام بھی تجویز فرمایا جو مختصر اور آسان ہونے کے ساتھ اتنا جامع ہے کہ انفرادی، اور اجتماعی کردار کی تعمیر کا کوئی پہلو اس سے خارج نہیں۔ اس میں روح، عقل اور بدن تینوں کے تقاضوں کی تکمیل کا سامان کر دیا گیا ہے۔ یہ براہِ راست عقل کو متاثر کرتا ہے۔ معاشرہ کی چھوٹی سے چھوٹی وحدت کی ابتدائی ضروریات کو بھی بطریقِ احسن پورا کرتا ہے اور کسی رنگ نسل، یا جغرافیائی حد بندی تک اپنے آپ کو محدود کیے بغیر پوری انسانیت کے تقاضوں کو بھی عالمی یا بین الاقوامی سطح پر پورا کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں اتنا توازن، جامعیت اور لچک موجود ہے کہ اب یہ انسانیت کا اس وقت تک ساتھ دے سکتا ہے جب تک یہ بزمِ کون و مکاں سجی ہے۔ اور اس کا وجود باقی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی عمل کے ذریعے اللہ کے وجود، اس کی صفات اور دوسرے عقائد سمجھانے میں مشاہدہ پر زور دیا۔ دیکھو، سمجھو، سوچو، سنو، یاد کرو اور عمل کرو کو اصول کے طور پر ذہن نشین کرایا۔ ماضی کو حال سے مربوط کیا۔ بہترین اخلاق و کردار کی تعلیم دی اور اس میں انسان کی فطری صلاحیتوں جبلی قوتوں اور جذبۂ غیرت و حمیت کے ساتھ اللہ کی رضا کو اساس بنایا۔ اس پورے عمل میں عظمت کی بات یہ تھی کہ ان تمام باتوں کی تعلیم و تلقین سے پہلے خود آپؐ کی ذات ہر عقیدہ اور ہر عمل کا کامل مظہر تھی۔ اس لیے سمجھنے والے کے لیے تعلیم کا ہر پہلو عقل و نظر دونوں کے سامنے مجسم ہو جاتا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی۔ یعنی لوگوں کو بتانا اور دکھانا اور نہ صرف سکھانا بلکہ بہترین اعمال و افعال کی تربیت دینا اچھی باتوں کا پابند بنانا اور بری باتوں

سے بچنے کی عادت ڈالنا۔ قرآن نے آپ کی یہی خصوصیت بیان کی

يعلمهم الكتاب والحكمة ويزكيهم (۲ : ۱۲۹)

وہ رسول ان کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس معلمِ انسانیت نے کن طریقوں سے تعلیم و تربیت کے اس اعلیٰ و ارفع فرض کو پورا کیا! ایک کامیاب معلم کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی کرنے کی صلاحیت یکساں طور پر موجود ہو، وہ ایک ماہر جراح کی طرح ہو جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے وہ زخم کو چیر کر فاسد مادہ باہر نکال سکے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک چیز ہو تو اس کے لیے بہتر اور کامیاب علاج ممکن نہ ہوگا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم و تربیت کے طریقوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موقع محل کی مناسبت سے نرمی اور سختی دونوں استعمال کرتے تھے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حضور نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ اپنی ذات کا معاملہ ہوتا تو حد سے زیادہ نرمی کا مظاہرہ کرتے لیکن شریعت کے حکم سے کوئی سرتابی کرتا تو سخت سزا دیتے۔

تعلیم و تربیت کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل اور محاسن کو خوبصورت تشبیہوں کے ساتھ اور رزائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں پیش کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سننے والا طبعی طور پر فضائل کی طرف مائل ہوگا اور اس کے دل میں رذائل کی نفرت پیدا ہوگی۔

تعلیم و تربیت کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور مفید نتائج اور بُرے کاموں کے برے اور مضر نتائج لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دیئے جائیں، تاکہ دلوں میں اچھے کام کرنے کا جذبہ ابھرے اور برے کاموں سے بچنے کی خواہش پیدا ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت کو زیادہ سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے جو خاص ہدایات وقتاً فوقتاً جاری فرمائیں ان کی نفسیاتی اہمیت نہ صرف یہ کہ آج بھی برقرار ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ آشکارا ہے مثلاً آپ نے یہ اصول دیا کہ:

يسروا ولا تعسروا، بشروا ولا تنفروا۔

لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو۔ انہیں مشکلات — میں نہ پھنساؤ۔ انہیں اچھی اچھی باتیں بتاؤ۔ نفرت دلانے والی باتیں مت کرو۔

آپ لوگوں کو جب کسی اچھے عمل کی تلقین کرتے تو یہ بھی فرماتے کہ اس حد تک کرنا کہ اکتا نہ جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بعض لوگوں نے ہفتہ وار درس کو دو روزہ یا سہ روزہ کرنے کی درخواست کی تو آپ نے کہا کہ میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہوں کیونکہ آپ ہمیں ہر روز وعظ و نصیحت نہیں فرماتے تھے اس ڈر سے کہ ہم اکتا نہ جائیں۔

آپ اپنی تمام تر قادر الکلامی کے باوجود ہمیشہ مخاطب کی فہم اور ذہنی سطح کے مطابق بات کرتے تھے۔ آپ کے پورے اقوال و فرمودات کو دیکھ لیجیے ان میں کہیں بھی بھاری بھرکم اصطلاحات پیچیدہ عبارات اور مبہم اشارات و تمثیلات نہیں ملیں گی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ دیہات سے بعض وفد اور قبیلے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپؐ ان کے مقامی لہجے کے مطابق گفتگو فرماتے بچوں سے محو کلام ہوتے تو انہی کی زبان میں بات کرتے۔

کسی شخص کی کوئی بات ناگوار گزرتی اور آپ اسے منع کرنا چاہتے تو بھری محفل میں نام لے کر کبھی منع نہ فرماتے کیوں کہ اس سے آدمی کو شرمندگی ہوتی ہے اور اس کی رسوائی کا سبب بنتا ہے بلکہ یوں کہتے کہ: لوگوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے ایسا اور ایسا کرتے ہیں، آپ کا مقصد تو لوگوں کی اصلاح تھی، انہیں رسوا کرنا مقصود نہ تھا۔

یوں تو ہر نبی نے اپنے دور میں یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ اور ایسے افراد تیار کیے جنہوں نے اس دنیا کو نئی زندگی بخشی اور زندگی کو جو انسان کی خود فراموشی اور غلط اندیشی سے بے معنی ہو گئی تھی، بامعنی بنایا۔ نبوت کے ان کارناموں میں جو زندگی کی پیشانی پہ درخشاں ہیں، سب سے روشن کارنامہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے افراد سازی اور آدم گری کے اس عمل میں اللہ تعالی نے آپؐ کو جو کامیابی عطا کی وہ آج تک کسی انسان کو حاصل نہ ہو سکی۔ آپ نے جس سطح سے تعمیر انسانیت کا کام شروع کیا اس سطح سے کسی اور پیغمبر نے نہیں کیا، یہ وہ سطح تھی جہاں حیوانیت کی سرحد ختم ہوتی تھی اور انسانیت کی سرحد شروع ہوتی تھی اور جس سطح پہ آپؐ نے اس کام کو پہنچایا اس سطح تک بھی کبھی تعمیر انسانیت کا کام کوئی نہیں پہنچا سکا تھا۔ آپ نے انسانیت کی انتہائی پستی سے کام شروع کیا اور

اسے انسانیت کی آخری بلندی تک پہنچایا

آپؐ کے تیار کیے ہوئے افراد میں سے ایک ایک نبوت کا شاہکار، اور نسلِ انسانی کے شرف و افتخار کا باعث ہے، پوری کائنات میں پیغمبروں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین و جمیل، اس سے زیادہ دل کش و دل آویز تصویر نہیں ملتی جو ان کی (صحابہؓ) زندگی میں نظر آتی ہے۔ ان کا پختہ یقین، ان کا گہرا علم، ان کی سادہ زندگی، ان کی خدا ترسی، ان کی شفقت و محبت، ان کی شجاعت اور شوقِ شہادت، ان کا عدل، اور ان کا حسنِ انتظام۔ دنیا کی تاریخ میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ نبوتِ محمدی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جو انسانی افراد تیار کیے ان میں سے ایک ایک فرد ایسا تھا کہ اگر تاریخ اس کی گواہی پیش نہ کرتی۔ اور انہیں دیکھنے والے اس کی تصدیق نہ کرتے تو ایک شاعرانہ تخیل اور فرضی افسانہ معلوم ہوتا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے نظام دعوت و ارشاد اور تعلیم و تربیت کے مطالعے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ اس میں انسان کی نفسیات اور مزاج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو قرآن کریم کا طریقِ اصلاح بھی انسانی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ افراد کی اصلاح و تربیت کے معاملے میں قرآن نے انسان کی طبیعت، مزاج اور نفسیات کو کسی مرحلے پر نظر انداز نہیں کیا قرآن کریم میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً شراب کو حرام قرار دینے میں انسانی طبیعت اور مزاج کا کتنا احترام کیا گیا۔ یک لخت بھی حرام کی جاسکتی تھی مگر ایسا نہیں کیا۔ بلکہ مرحلہ وار اس کی ممانعت کی گئی کیونکہ اسلام کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ بالجبر اور ظالمانہ طریقہ سے کوئی بات لوگوں سے منوائی جائے جس بات کا حکم دیا ہے اور جس بات سے منع کیا ہے اس کے منافع اور نقصانات پہلے بتائے ہیں انسان کو اس کے نفع و نقصان کا پہلے قائل کیا ہے۔ پھر اس کے کرنے یا نہ کرنے کی بات کی ہے۔

اس تمام تمہید سے ہم آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ جو دین، دینِ فطرت ہے اور جس کی تمام تعلیمات عقلِ سلیم اور انسانی مزاج کے مطابق ہیں اس کی تعلیم میں اور تعلیم کے مطابق تربیت میں بھی انہی اصول کو، اور اسی طریقِ کار کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن کی رعایت خود قرآن کریم نے کی۔ اور اس ذاتِ اقدس نے کی جو حاملِ قرآن بھی تھی، اور قرآن کی عملی تصویر، اور جیتا جاگتا چلتا پھرتا مجسمہ بھی۔ اگر وہ لوگ جو اس دینِ فطرت کے امین ہیں، جن کو اللہ نے اپنے اس آخری اور ابدی دین کی خدمت اور تبلیغ کا فرض سونپا ہے جنہیں علوم نبوی کی وراثت عطا کی ہے اگر وہ قرآن اور

حامل قرآن کے طریق تعلیم وتربیت کو اپنائیں گے تو اس کے وہی نتائج اور ثمرات ظاہر ہوں گے جو مطلوب ہیں۔ اگر ان اصولوں کو نظر انداز کیا جائے گا اور اس طریق کار سے انحراف کیا جائے گا، جو اس دین فطرت کی تبلیغ واشاعت میں اولاً اختیار کیا گیا تھا تو مطلوبہ نتائج وثمرات کا حصول دشوار ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن علماء، صوفیا اور اولیا نے لوگوں کی تعلیم وتربیت اور اصلاح کے لیے پیغمبرانہ طریق کار اختیار کیا وہ زیادہ موثر ثابت ہوا۔

اس تناظر میں جب ہم اپنی چودہ سو سالہ تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کئی شخصیتیں بہت قدآور اور بلند و بالا نظر آتی ہیں۔ لیکن چودھویں صدی ہجری کے حوالہ سے اگر دیکھا جائے تو بلاشبہ سب سے نمایاں، اور سب سے ممتاز شخصیت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۹۴۳ء) کی ہے۔

مولانا تھانوی نے لوگوں کی تعلیم وتربیت اور ذہنی وفکری اصلاح کا جو طریقہ اپنایا وہ عام ڈگر سے ہٹ کر تھا ان کا طریق کار انسانی جبلت وفطرت اور نفسیات کے عین مطابق تھا اور انہوں نے وہی اسلوب اپنایا جو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور ایک طرح انہوں نے صحیح معنیٰ میں وارث علم نبی ہونے کا حق ادا کیا۔

دوسرے علماء اور بزرگان دین کی طرح ان کے ہاں آنے والے اور ان سے فیض حاصل کرنے والے لوگ بنیادی طور پر دو قسموں میں منحصر تھے۔ ایک وہ لوگ جو باقاعدہ حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہوتے اور مولانا سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرتے۔ دوسرے وہ لوگ جو باقاعدہ بیعت تو نہیں ہوتے تھے لیکن ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے اور ان کی مجلسوں میں حاضر ہو کر ان سے اکتساب فیض کرتے تھے

جو حضرات مجازِ بیعت ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض تو ان میں بہت نرم خو ہوتے ہیں وہ بیعت لیتے وقت ابتداً مرید کو کسی قسم کی شرائط کا پابند نہیں کرتے۔ ان کے پاس جو شخص بھی بیعت ہونے کے لیے آتا ہے وہ اسے بیعت کر لیتے ہیں۔ نیت اُن کی بھی نیک ہوتی ہے ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ایک ایسے آدمی سے جو کچھ بھی نہیں جانتا۔ دین کے بارے میں اس کا علم تو کجا عقائد بھی درست نہیں، اس سے اگر قبل از وقت ہی قیدیں شرطیں لگائیں تو وہ بھاگ جائے گا۔ پہلے اسے اپنے حلقے میں داخل کر لو۔ پھر اس کی ذہنی اور علمی تربیت کی طرف توجہ دو۔ نیز

بزرگانِ دین کو یہ بھی اعتماد ہوتا ہے کہ ایک سادہ فکر و ذہن کا آدمی یا ایک گم کردہ راہ جب ہماری خانقاہ اور ہمارے حلقے میں آ جائے گا۔ اور یہاں آ کر لوگوں کے اعمال و اخلاق دیکھے گا تو غیر شعوری طور پر خود اس میں نیکی کو قبول کرنے کی تڑپ پیدا ہوگی۔ کچھ کہنے اور سننے سے زیادہ بہتر ہے کہ اس کے سامنے عمل اور کردار کا بہترین نمونہ پیش کیا جائے۔

اس تصور اور جذبہ کی بنا پر بعض صوفیا اور اولیاء اللہ کا یہ طریقہ رہا کہ جب ان کے پاس کوئی بیعت ہونے کے لیے آتا تھا تو وہ یہ بھی نہیں معلوم کرتے تھے کہ تم مسلمان بھی ہو یا نہیں۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۶۴ھ) اور برصغیر پاک و ہند کے بعض دوسرے اولیائے کبار کا یہی معمول تھا کہ ان کی خدمت میں جو بھی آتا اسے قبول کر لیتے، بہت سے غیر مسلم بھی آ کر ان سے بیعت ہو جاتے۔ اور جب اُن کا اور اُن کے ساتھیوں اور دوسرے مریدوں کا عمل دیکھتے تو کچھ کہے سنے بغیر ہی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے اور ان کے فیضِ تربیت سے نہ صرف ایک اچھے مسلمان بن جاتے بلکہ وہاں سے باہر نکلنے کے بعد اسلام کے بہترین داعی اور مبلغ ثابت ہوتے۔ بعض لوگوں نے اس طرزِ عمل پر اعتراض کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بلکہ میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ یہ طریق کار انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ انسان کی جبلت میں یہ بات رکھ دی گئی کہ وہ دوسرے کا عمل دیکھ کر زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وعظ و تقریر سن کر یا کتاب پڑھ کر انسانی طبیعت وہ اثرات ہرگز قبول نہیں کرتی جو اچھا یا برا عمل دیکھ کر قبول کرتی ہے۔ بچے گھر میں جو ماحول دیکھتے ہیں، طلبہ درسگاہوں میں جیسا کچھ دیکھتے ہیں غیر شعوری طور پر اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے قرآن حکیم کی صورت میں ایک جامع، مکمل اور ابدی نظام حیات نازل کرنے کے باوجود نمونہ نبیؐ کی ذات اور اس کے عمل کو بنایا ہے۔ آج کے دور میں جو اصلاح کا عمل دشوار تر نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اگرچہ ہر طرف مواعظ و تقاریر کا شور ہے۔ کتابوں کے انبار ہیں مگر حسنِ عمل اور حسنِ کردار نہیں ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ کھچے چلے آئیں ان کا بھی رنگ بدلے۔

بہر کیف جن لوگوں نے صوفیاء کے اس طرزِ عمل پر اعتراض کیا۔ شاید ان کے پیش نظر یہ بات رہی کہ بیعت اسلام کے اعمال و افعال کا ایک حصہ ہے اور اس کے لیے اسلام شرط ہے حالاں کہ

علما و صوفیا اور اولیاء اللہ کی بیعت افراد کی اصلاح و ترتیب کا ایک طریق کار ہے مقصود افراد کی اصلاح ہے طریقے مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ قرآن حکیم نے مقصود پر زور دیا ہے جسے وہ ”لعلکم تتقون“ سے تعبیر کرتا ہے کہ امید ہے تم پاکیزہ صفات کے حامل انسان بن جاؤ گے۔ اسلاف کی نظر اسی مقصد پر ہوتی تھی اور وہ اسے حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اب بدقسمتی سے ہم نے مقاصد کو نظر انداز کر دیا نظر صرف ذرائع پر رہ گئی نماز پڑھتے ہیں لیکن بے حیائی سے نہیں رکتے۔ روزہ رکھتے ہیں لیکن تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ زکوٰۃ دیتے ہیں مگر غریبوں اور مصیبت زدہ انسانوں کی مصیبت سے ہمارے دل بے چین نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ ایک اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ ہم نے انہی کو مقصود بالذات سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ ذرائع ہیں ”لعلکم تتقون“ کے۔

اس نرم خو، اور وسیع المشرب طبقہ کے علاوہ ایک طبقہ وہ بھی تھا، یا ہے جو کسی کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے وقت بڑی سخت اور کڑی شرائط عائد کرتا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ الدہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۱۷۶ھ) نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ (۱)

یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان دونوں طریقوں میں عمومیت اور اطلاق ہے۔ جس نے بغیر کسی شرط کے مرید کیا، اس نے ہر ایک کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا۔ اس میں نہ کسی کے ساتھ کوئی امتیاز برتا نہ کسی کی ذہنی اور علمی سطح کو ملحوظ رکھا، اور نہ کسی کے دینی اور فکری پس منظر پر نظر کی۔ اسی طرح جنہوں نے قیود، شرطیں لگائیں انہوں نے بھی کم و بیش وہی اسلوب اپنایا یعنی نہ لوگوں کی علمی سطح کو پیش نظر رکھا، نہ ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں پہ نظر کی اور نہ ان کی طبیعت اور مزاج کا جائزہ لیا، نہ خاندانی پس منظر کو دیکھا سب کے لیے ایک ہی سی شرائط عائد کر دیں جو ان شرائط پہ پورا اترا اسے

حلقۂ بیعت و ارادت میں لے لیا اور اس کی تربیت شروع کر دی۔ لیکن مولانا تھانوی کا طریق بیعت ان دونوں طبقوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا طریق تربیت قرآن اور حامل قرآن کے طریق تربیت کے عین مطابق تھا۔ انہوں نے اپنے طریق تربیت میں انسانی نفسیات اور جبلت کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جیسا کہ خود قرآن اور حامل قرآن نے ایسا کیا ہے

مولانا نے اپنے ایک رسالہ ”قصد السبیل“ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ، ہر شیخ کا طریقۂ تعلیم اور طرز بیعت و تربیت مختلف اور جداگانہ ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے ان لوگوں کو چار

قسموں میں تقسیم کیا جو استفادے اور تربیت کی غرض سے ان سے رجوع کریں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ: طالب یا عامی (یعنی ان پڑھ) ہے یا عالم ہے اور ان میں سے ہر ایک یا فکرِ معاش و حقوقِ عباد سے فارغ ہے یا مشغول، یہ چار قسمیں طالب کی ہوئیں،، ایک عامی فارغ دوسرے عامی مشغول، تیسرے عالم فارغ، چوتھے عالم مشغول" (۲)

ان سب کے لیے مولانا نے ایک دستور العمل تجویز نہیں کیا، کیوں کہ ان کی ذہنی سطح میں بھی اختلاف ہے عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں سے ایک ہی انداز کی بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر فارغ اور مشغول میں بھی فرق ہے ایک ایسا شخص جسے کوئی کام کاج نہیں، ہر طرف سے فارغ ہے وہ جتنا وقت دے سکتا ہے ایک ایسا شخص یقیناً اتنا وقت نہیں دے سکتا جو مصروف ہے اور جس کے سر مختلف ذمہ داریاں ہیں۔ لہٰذا عقل کا بھی تقاضا یہی تھا کہ ان کو ایک سطح پر نہ رکھا جائے ان کے لیے جدا جدا معمولات تجویز کیے جائیں اور قابل عمل بات بھی یہی تھی اور ان کے مزاجوں علمی و ذہنی سطح اور مصروفیات کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کا نظام مرتب کیا جائے۔

مریدین کے لیے مولانا نے چار مختلف دستور العمل مرتب کیے جیسا کہ میں نے مختصراً اس کا حوالہ دیا۔ مریدین سے زیادہ بڑا حلقہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو باضابطہ بیعت نہیں ہوتے مگر عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے ہیں اور ان کی نیت اصلاح و تربیت اور استفادے کی ہوتی ہے، ایسے حضرات کے لیے مولانا نے ایک الگ ہدایت نامہ مرتب کیا۔ جس میں ان کی مکمل راہنمائی کی کہ وہ اپنے اوقات زندگی کس طرح گزاریں۔

ہدایت ناموں کے علاوہ دو نصیحت نامے لکھے۔ ایک عام مردوں کے لیے، اور دوسرا عام عورتوں کے لیے یہ نصیحت نامے بالکل عمومی نوعیت کے ہیں۔ ان سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے نہ کبھی مولانا کو دیکھا ہو۔ نہ ان سے ملے ہوں، حتیٰ کہ ان کی کتابیں اور مواعظ بھی نہ پڑھے ہوں۔

اس تجزیے اور اہتمام سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا نے معاشرے کے کسی طبقے، کسی صنف، اور کسی فرد کو نظر انداز نہیں کیا۔ سب کو پیش نظر رکھا اور ہر ایک کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اس کی اصلاح اور تربیت کا سامان فراہم کر دیا۔ مولانا نے خود اس حقیقت

کی طرف اشارہ کیا، اور اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ ،، ہر شخص کی طبیعت جدا ہے اور اس کے لیے طریق تربیت بھی الگ ہے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا ،، (۴)

مولانا کا یہ بھی طریق کار تھا کہ جو لوگ بیعت کے ارادہ سے جاتے تھے انہیں فوراً بیعت نہیں کرتے تھے، پہلے ان کی صلاحیتوں کو جانچتے تھے، پھر ان کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے کہ کسے بیعت کیا جائے اور کس کی اصلاح و تربیت بغیر بیعت کے کی جائے۔

مولانا کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ تاثر ہے کہ وہ بہت سخت تھے۔ ناچیز راقم کو ان کی زیارت کا شرف تو نصیب نہیں ہوا لیکن والد مرحوم اور دوسرے بزرگوں سے ان کے بارے میں جو کچھ سنا اور ان کی تصانیف اور تحریروں سے جو بات اخذ کی وہ یہ ہے کہ سخت نہیں تھے باصول تھے اور ایسے باصول کہ جن قاعدوں ضابطوں کی پابندی دوسروں سے کراتے تھے۔ خود بھی ان کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ لوگ اصول کی پابندی سے گھبراتے ہیں بے قید زندگی سے خوش رہتے ہیں مولانا کے ہاں اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی، اسلام بے قید زندگی کی نفی کرتا ہے،

نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ: "الدین یسر،، دین اسلام آسان ہے قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی ہمت اور صلاحیت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلف نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ بار بار انسانوں کو یہ نوید سناتے اور تسلی دیتے ہیں کہ: میں تمہارے ساتھ نرمی اور آسانی چاہتا ہوں، تمہیں تنگی اور مشکل میں پھنسانا نہیں چاہتا،، اس قرآنی اصول اور پیغمبرانہ طریق کار پر کتنے حضرات جو رشد و ہدایت کے منصب پر فائز ہیں، عمل کرتے ہیں ؟ میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور چاہوں گا کہ موجودہ دور میں نئی اور دین سے بیگانہ نسل، وہ نسل جسے مغرب کی رعنائیوں اور رنگینیوں نے چکاچوند کر رکھا ہے، اس کے دین سے دور رہنے کی ایک بڑی وجہ وہ سختیاں اور پابندیاں ہیں جنہیں اسلام کے نام پر مسلط کر دیا گیا ہے یا مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نبی علیہ السلام دوسروں کے لیے نرمیاں مہیا فرماتے تھے۔ نماز میں کسی بچے کے رونے کی "واز سن لیتے تو فرض نماز مختصر کر دیتے۔ نرمی کے وقت نرمی برتنا اور سختی کے موقع پر سختی کرنا عین حکمت ہے لیکن ہر وقت لوگوں کو کَس کر رکھنا انہیں ہدایت اور نیکی سے دور کر دیتا ہے۔

مولانا ہمیشہ اسی حکمت اور دانائی پر عمل کرتے تھے۔ ایسے واقعات سے ان کی تحریریں بھری پڑی ہیں۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ ہم ریل میں ایک جگہ سفر کر رہے تھے ہمارے پاس ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب بھی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ نماز کا وقت ہوا تو ہم نے نماز پڑھی۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ تمہارے معتقد ہیں تم ان کو نماز کی نصیحت کرو۔ میں نے کہا نماز کی حقیقت سے تو یہ واقف ہی ہیں کہ پڑھنے نہ پڑھنے پر عذاب وثواب ہوگا۔ یہاں تبلیغ فرض تو ہے نہیں مستحب ہے۔ میں ایک مصلحتِ دینیہ کو اس مستحب پر ترجیح دیتا ہوں مگر اس کہنے سے ان کا جی نہیں بھرا۔ خیر جب ہم نماز پڑھ چکے اور ان کے پاس آکر بیٹھ گئے، میں نے پھر اسی طرح جس طرح کہ پہلے ان سے انشراح کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ جس وقت حضرت والا نے آکر مجھ سے باتیں کرنا شروع کی ہیں تو میں ذبح ہی تو ہو گیا میں تو یہ سمجھتا تھا کہ نماز پڑھنے کے بعد مجھ سے بات بھی نہ کریں گے ہمارے حضرت نے فرمایا پھر وہ پکے نمازی ہو گئے۔ پھر ان کی کوئی نماز قضا نہ ہوئی اس کو اہل طریق سمجھتے ہیں کہ اس وقت نصیحت کا کیا طرز اختیار کرنا چاہیے ان کے ذوق صحیح ہوتے ہیں، علماء ظاہر اس رتبہ کو نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

اگر مولانا اس موقعہ پر ان صاحب کے ساتھ سختی برتتے تو ان کی ہرگز اصلاح نہ ہوتی۔

اسی طرح ایک اور واقعہ مذکور ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے لوگوں کے لیے کتنی نرمی اور آسانی فراہم کرتے تھے

فرماتے ہیں کہ "ایک حاجی صاحب جو تھانہ بھون ہی کے رہنے والے تھے۔ وہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میرا اور ان کا کیرانہ کا سفر ساتھ ہوا۔ راستے میں نماز کا وقت آیا، میں نے گاڑی (بیل گاڑی) والے سے کہا: گاڑی روک لے۔ اس نے گاڑی روک لی۔ میں نے اتر کر لوٹا لیا پانی لیکر وضو کی اور نماز شروع کر دی، حاجی صاحب سے میں نے کچھ نہیں کہا، انہوں نے بھی چپکے سے وضو کی اور میرے ساتھ نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور پھر سارے سفر میں نماز پڑھتے رہے۔ جن لوگوں کو معلوم تھا کہ حاجی صاحب نماز نہیں پڑھتے۔ انہوں نے مذاق اڑایا کہ واہ جی واہ، حاجی صاحب نے بھی نماز شروع کر دی۔ کہنے لگے: "بھائی! میں کوئی نماز کا منکر تھوڑی ہی ہوں، میری نماز تو ان مولویوں نے چھڑوا دی، لمبی لمبی نمازیں پڑھتے ہیں وہ مجھ سے پڑھی نہیں جاتیں۔ اگر مولوی اشرف علی جیسا امام ہو کہ جلدی جلدی نماز پڑھا دے تو پھر تو میں کبھی بھی نماز نہ چھوڑوں" (۶)

یہ ہے دین میں آسانیاں پیدا کرنے کی صورت، آج کل صورت حال یہ ہے کہ عام علما، ائمہ اور خطبا (معدودے چند کو چھوڑ کر) کوئی موقع ایسا نہیں چھوڑتے جہاں تقریر نہ کرتے ہوں نکاح بھی اب تقریر کے بغیر نہیں ہوتا۔ جمعہ کی تقریروں سے لوگ تنگ آچکے ہیں۔ بیشتر اماموں اور خطیبوں کی تقریریں بے مقصد و بے معنی ہوتی ہیں، اس کے لیے لوگوں کو ایک ایک گھنٹہ بٹھائے رکھتے ہیں۔ نماز جمعہ کا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا وہ تقریر کے ختم ہونے پہ موقوف ہوتا ہے۔ خطبہ مسنونہ (جوکہ ضروری ہے) کے لیے صرف ڈیڑھ دو منٹ دیئے جاتے ہیں اس صورت حال نے اب یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ لوگ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ خطبہ کی اذان ہو تو ہم مسجد میں جائیں۔ حالاں کہ ایک وہ دور تھا کہ جمعہ کے روز علما کے وعظ اور تقاریر نماز جمعہ کے بعد ہوا کرتی تھیں اور سب لوگ ذوق و شوق سے سنتے تھے۔

مولانا کا کتنا حکیمانہ ارشاد ہے فرماتے ہیں "میں تو راحت و آسائش کا عاشق ہوں، دوسروں کے لیے بھی یہی اختیار کرتا ہوں اور اسی کو پسند کرتا ہوں"۔ (۷)

مولانا کے پاس ایک صاحب بیعت ہونے کے لیے آئے اور یہ بھی بتلا دیا کہ میں غیر مقلد ہوں مولانا نے ان سے رفع یدین، آمین بالجہر یا آٹھ رکعت تراویح پہ مناظرہ نہیں کیا، نہ یہ کہا کہ بھئی ہم تو مقلد ہیں اور حنفی المسلک ہیں ہم آپ کو کیسے مرید کر سکتے ہیں، انہیں مرید کر لیا ان کے مسلک کی کوئی چیز انہیں چھوڑنے کے لیے نہیں کہا۔ صرف اتنی شرط لگائی کہ پڑھنے کے لیے میں جو چیزیں بتاؤں گا ان کی پابندی کرنا۔ انہوں نے دیکھا کہ مولانا نے انہیں ان کی کوئی بات چھوڑنے کے لیے نہیں کہا، نہ اشارۃً نہ صراحۃً صرف اتنا کہا کہ میں جو بتاؤں وہ پڑھتے رہنا وہ بیعت ہو گئے۔ چند روز بعد اس شخص نے عدم تقلید کی تمام باتیں خود ہی چھوڑ دیں۔ (۸)

جیسا کہ مولانا کا مقولہ میں نے مذکورہ بالا سطور میں نقل کیا کہ میں سب لوگوں کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتا"، اس کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ مولانا سے ایک طالب علم نے خط کے ذریعے یہ درخواست کی کہ میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے اسے جواب دیا کہ جس کام میں لگے ہوئے ہو، یعنی تحصیل علم میں، اسی میں لگے رہو۔ یہ شیطان کا دھوکہ ہے (کہ اس وقت بیعت ہو جاؤ) وہ تمہیں حصول علم سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ خیر خواہانہ کہتا ہوں کہ جس کام میں لگے ہو اسی میں لگے رہو" (۹)

فرماتے۔ طالب علموں کو زمانۂ طالب علمی میں ذکر و شغل نہیں کرنا چاہیئے صرف اعمال و اخلاق کی اصلاح کرنی چاہیئے (۱۰)

جہاں سختی کا موقعہ ہوتا تھا وہاں سختی برتتے تھے۔ بطور خاص ان لوگوں کے ساتھ جو روپے پیسے والے ہوتے اور ہدیے تحفے لے کر آتے اور یہ سمجھتے کہ ہماری امیری اور ریاست کو دیکھ کر مولانا کی پوری توجہ ہماری طرف ہو جائے گی اور مولانا ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ایسے لوگوں کی مولانا صحیح معنیٰ میں "ناک رگڑواتے" تھے تاکہ ان کے دماغ سے اپنی امارت کا غبار نکل جائے۔ امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ بن حنبل اور ان جیسے دوسرے بے شمار بزرگان دین کا یہ طرز عمل رہا۔ انھوں نے از راہ تکبر ایسا نہیں کیا بلکہ ان کا منشا یہ ہوتا تھا کہ علم دین ذلیل و رسوا نہ ہو۔

اہل علم و فضل جو کتابیں لکھتے ہیں وہ عام طور پر ایک ہی انداز اور ایک ہی معیار کی ہوتی ہیں ان کا افادہ بجا اور مسلّم۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ہر سطح کے آدمی کے لیے ان کی تحریروں میں استفادے کا سامان ہے براہ راست طریقۂ تعلیم و تربیت کے علاوہ مولانا کی تحریروں میں بھی یہ خوبی نمایاں ہے کہ انھوں نے ہر رتبے کے افراد کو سامنے رکھا ہے۔ جہاں ان کے سامنے وہ گراں مایہ علم و فضل کے حامل لوگ ہیں جو مسند درس پر فائز ہیں، شاگردوں کا ایک حلقہ ان کے آگے سر بزانو ہے۔ اور وہ قرآن حکیم کے اسرار حکم بیان کر رہے ہیں، ان کے لیے "بیان القرآن"، موجود ہے جو خانقاہوں میں سر جھکائے بیٹھے ہیں، چہار سو ارادت مندوں کا جھرمٹ ہے اور انہیں اخلاق و تصوف کے رموز سمجھا رہے ہیں، ان کے لیے کلید مثنوی، مسائل السلوک اور التکشف جیسی کتابیں راہنمائی کا سامان فراہم کر رہی ہیں" ان مبتدی اور نو آموز لوگوں کے لیے جو نہ علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے اور نہ ان میں اتنی ہمت و جرأت کہ وہ اس کی گہرائیوں میں جا کر موتی رول سکیں ان کی علمی، فکری اور ذہنی تربیت اور رہنمائی کے لیے حیات المسلمین، اصلاح المسلمین، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم اور تبلیغ دین جیسی آسان اور ہلکی پھلکی کتابیں موجود ہیں جنھیں ہر شخص پڑھ سکے اور ہر شخص سمجھ سکے۔

خواتین کو علما کے ایک بڑے طبقے نے عرصۂ دراز سے نظر انداز کر رکھا ہے ان کی اصلاح و تربیت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ اس صدی میں دینی نقطۂ نظر سے خواتین کی تعلیم و تربیت اور راہنمائی کا جتنا عظیم کام مولانا نے کیا بلاشبہ کوئی نہیں کر سکا۔ بہشتی زیور کی مقبولیت اس کی سب سے بڑی گواہ ہے۔ (۱۱)

تصانیف کا رنگ بھی جدا ہے۔ اور پھر ان سب سے ہٹ کر مواعظ کا ایک الگ اسلوب ہے مواعظ کے مخاطب کیوں کہ عام وخاص سبھی ہوتے تھے اس لیے ان میں جہاں دقیق علمی نکات کا بیان ہے وہاں امثلہ اور حکایات کے رنگ میں ان کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کا ایک مؤثر ڈھنگ بھی ہے۔

میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اگر پاکستان میں علماء عوام کی علمی و فکری تربیت کا ایک وسیع اور مربوط نظام قائم کر لیں تو ایک خاص وقت اور مدت کے بعد بغیر کسی تحریک، جلسہ جلوس اور احتجاج کے اس ملک میں نظامِ اسلام نافذ ہو جائے گا۔

دینی تربیت کا یہ نظام مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، اسکولوں، اور کالجوں میں یکساں اور بیک وقت قائم ہو سکتا ہے۔

بہر حال یہ کہے اور مانے بغیر چارہ نہیں کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے جس انداز سے لوگوں کی تربیت کی۔ ان کے ایمان و یقین کو پختگی بخشی، اوہام و خیالات کی دلدل سے نکالا وہ صرف اس بات کی برکت تھی۔ کہ انہوں نے پیغمبرانہ طریق تربیت کو اپنایا، قرآن نے جس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت دی تھی اسے قبول کیا اللہ نے لوگوں کو اپنے راستہ کی طرف جس طرح بلانے کی ہدایت کی تھی، اسی طرح بلایا حکمت و موعظت کا راستہ اختیار کیا۔ اور جنگ و جدل سے دور رہے قطبیت بزرگیت اور غوثیت کے اظہار، اور کشف و کرامات کو نظر انداز کر کے اور غیر ضروری باتیں ترک کر کے صرف دو باتوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ایک تو یہ کہ طالبین اور مریدین کے اندر انسانیت ہو یعنی وہ اپنے قول و فعل میں اس بات کا خیال رکھیں کہ ان سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ دوسرے طالب پر مقصود اور اس کے طریقہ کی حقیقت منکشف ہو جائے تاکہ وہ اپنا عمل پوری بصیرت اور اعتماد کے ساتھ کر سکے (۱۲)

”والد مرحوم سے بارہا مولانا کا یہ مقولہ سنا کہ ”میں لوگوں کو مولوی نہیں بناتا۔ انسان بناتا ہوں“

مولانا کے ایک خلیفۂ مجاز ڈاکٹر عبدالحی مرحوم (م ۱۹۸۶ء) نے مولانا کی تربیت گاہ کا جو مختصر مگر جامع نقشہ کھینچا ہے، میں اسی پر اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے موضوع پر نہ میں اس تحریر کو جامع لکھنے کے لیے تیار ہوں اور نہ ہی شاید قارئین تیار ہوں۔

ڈاکٹر عبدالحی لکھتے ہیں۔

حضرت کی تربیت گاہ میں نہ کیفیات و ذوقیات تھیں، نہ وجد و حال، نہ رسمی مراقبے تھے نہ مجاہدے اور ریاضتیں۔ بس اہتمام تھا تو صرف احکام شریعت کی بجا آوری کا۔ دھن تھی تو اپنے ہر انداز زندگی میں اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز زندگی کے اتباع اور پیروی کی، فکر تھی تو اس بات کی کہ نفس اور شیطان کے مکر و فریب سے بچا جائے۔ تاکید تھی تو صرف یہ تھی کہ اپنے ظاہر کو بھی پاک صاف رکھو اور باطن کو بھی طاہر و طیب، اگر ان باتوں کی توفیق نصیب ہو جائے تو سمجھ لو کہ دونوں جہاں کی دولت مل گئی۔ (۱۳)

جس طرح اللہ کے حقوق ادا کرنا ضروری ہیں، اسی طرح بندوں کے حقوق ادا کرنا بھی فرض اور ضروری ہے ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیز و اقارب کے، ہمسایوں کے، کاروباری احباب کے حقوق پوری طرح ادا کرو۔ ان میں ذرہ برابر کوتاہی کرو گے تو تمہیں تعلق مع اللہ کی ہوا تک نہیں لگے گی۔ چاہے زندگی بھر مروجہ رسمی تصوف کے مجاہدوں، نوافل اور وظائف میں سر مارتے رہو اللہ کی مخلوق کو ناراض کرتے ہوئے اللہ کو راضی کر لو۔ ایں خیال است و محال است و جنوں" (۱۴)

حوالہ جات و حواشی

۱۔ القول الجمیل مع شرح شفاء العلیل شاہ ولی اللہ الدہلوی۔ ص: ۳۶ - ۳۹۔ طبع کتب خانہ اشرفیہ کراچی ۱۹۵۴ء

۲۔ قصد السبیل۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ ص: ۷ - طبع: کتب خانہ اشرفیہ دہلی ۱۹۲۴ء

۳۔ ایضاً ص: ۲ - ۱۸

۴۔ جزا و سزا (وعظ الموق والرحیق) مولانا اشرف علی تھانوی۔
ص: ۲۰۵ - طبع: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان۔ ۱۴۰۴ھ۔

۵۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م: ۱۹۷۴ء)

۶۔ مزید المجید (ملفوظات حضرت تھانوی) مرتب: عبدالمجید بچھرایونی، ص ۵۱ - طبع: مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون: ۱۳۳۵ھ

۷۔ ایضاً: ص: ۵۴

۸۔ فیوض الخالق (ملفوظات) ص: ۱۶۔ طبع مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون۔

۹۔ مزید المجید۔ ص: ۱۶

۱۰۔ الکلام الحسن (ملفوظات) مرتب: مفتی محمد حسن امرتسری ص: ۹۵۔
طبع: مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون۔ ۱۹۶۵ء

۱۱۔ بہشتی زیور کے بارے میں ناچیز راقم کی ایک عرصہ سے یہ خواہش ہے کہ اسے موضوع وار مرتب کیا جائے۔ ضمیموں کی صورت میں جو مضامین اس کے ساتھ شامل ہیں انہیں اصل کتاب کا حصہ بنا دیا جائے۔ الگ الگ ضمیموں کی وجہ سے مضمون کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے جس سے پڑھنے والے کو الجھن ہوتی ہے اور مضمون کا تاثر بھی مجروح ہوتا ہے اس کام کے سلسلے میں: میں قطعاً کسی قسم کی منفعت کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ بحمد اللہ مجھے اس کی ضرورت ہے کتب فقہ کی جو مشکل عبارتیں اس کے حاشیوں پر چڑھا دی گئی ہیں انہیں حتی الامکان کم کیا جائے اس سے بہشتی زیور اتنی عام فہم اور ہلکی پھلکی کتاب نہیں رہی جیسے حضرت تھانوی نے لکھی تھی اگر کسی ایسے صاحب کی سمجھ میں میری یہ بات آئے جو بہشتی زیور کو طبع کر سکیں تو وہ مجھ سے رجوع کر سکتے ہیں۔ میں ایک مفید علمی خدمت سمجھ کر یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔

۱۲۔ مآثر حکیم الامت:۔ ڈاکٹر عبدالحئی۔ ص: ۱۲۱،
طبع: سعید ایچ ایم کمپنی کراچی ۱۴۰۰ھ

۱۳۔ ایضاً۔ ص: ۱۲۲

۱۴۔ ایضاً۔ ص: ۱۲۳

حکیم الامت رحمہ اللہ

کا

نظریۂ تعلیم و تربیت

مولانا محمد امجد صاحب کاشمیری

اہل مغرب نظریہ یا آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) کو مندرجہ معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ا۔ عام نظریات کا کوئی ضابطہ یا کوئی پروگرام جس کی اساس فکر و فلسفہ پر ہو[1]

ب۔ نظریہ سے مراد کسی سیاسی، تہذیبی یا معاشرتی تحریک کے عام منصوبہ یا لائحہ عمل کا عملی بیان ہے[2]

ج۔ عمل نظریہ سے مراد کسی خاص نظام فکر کی روشنی میں سیاسی مسائل کا تجزیہ ہے جس میں عملی پروگرام شامل ہو[3]

ہر انسان کسی نہ کسی نظریے کے مطابق زندگی گذارتا ہے قدیم یونانی مفکرین اور یہود و نصاریٰ کے نزدیک انسان پیدائش کے وقت گناہ کا ایک پلندہ ہوتا ہے اور وہ تمام زندگی اس ناکردہ گناہ کا کفارہ ادا کرتا رہتا ہے۔ ایک مذہب کے پیروکاروں کا یہ خیال ہے کہ ان کے پیغمبر نے سولی پر چڑھ کر ہمیشہ کے لیئے ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا ہے اس لیئے اب وہ شتر بے مہار کی سی زندگی گزار سکتے ہیں برصغیر کی ہندو آبادی اداگون کے چکر میں مبتلا ہے۔ انہیں ہمیشہ خدشہ رہتا ہے کہ اگلے جنم میں وہ کہیں کتے یا بلے کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ کچھ اپنے جسم کو اذیت دینے میں نجات سمجھتے ہیں اسی طرح جب بہت سے منفی نظریات کا دور دورہ تھا تو اسلام نے بنی نوع انسان کے سامنے ایک مثبت نظریہ پیش کیا۔

تعلیم ہمیشہ نظریہ علم کے تابع ہوتی ہے قرون اولیٰ میں علم حق کا واحد ذریعہ وحی تھا۔ اس زمانے میں اسلامی تعلیم کا محور قرآن و حدیث تھا۔ صرف، نحو، ادب، لغت اور اشعار عرب کی جو تعلیم دی جاتی تھی وہ ان دو کی تعلیم کا ضمیمہ اور مقدمہ تھی۔ بعد میں تفسیر اور فقہ کے علوم کا اضافہ ہوا ۸۳۰ء میں خلیفہ

---

[1] ڈاکٹر جارج لبراس [2] ویسٹریا [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔

المامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا اس دانش کدے میں ایک دارالترجمہ، ایک کتب خانہ اور ایک لیبارٹری بھی تھی جس میں سائنس کے تجربے کئے جاتے تھے دارالترجمہ میں یونانی کتب کے ترجمے بڑے زور وشور کے ساتھ ہوئے ان تراجم نے مسلمانوں کو یونانی منطق، فلسفے، ریاضی، ہیئت، ہندسہ اور طب وغیرہ کے علوم سے متعارف کرایا۔ نامور استاد اپنے اپنے گھروں میں ان علوم کی تعلیم دینے لگے اس سے مذہبی عقائد اور اقدار کو جو نقصان پہنچا اس کے تدارک کے لئے اس زمانے کے علماء نے بڑی وسیع القلبی سے کام لیا۔ [1]

حضرت تھانویؒ کے نظریۂ تعلیم وتربیت کے مطالعے سے قبل قرآن کے نظریۂ تعلیم پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

علم کے ایک خطرناک پہلو کا قرآنی علاج

بات یہ ہے کہ عام حیوانات کے مقابلہ میں "الانسان" ایک تعلیمی حقیقت ہے، یعنی جن چیزوں کے علم سے خالی اور جاہل ہو کر پیدا ہوتا ہے، تعلیم کے ذریعے سے ان کے جاننے کی صلاحیت آدمی ہی میں ہے، قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواند) تعلیم بالقلم (نوشت) کا ذکر کرنے کے بعد

علم الانسان مالم یعلم سکھائی انسان کو وہ باتیں جنہیں وہ نہیں جانتا کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے۔

کَلّاۤ اِن الانسان لیطغیٰ خبردار! بلاشبہ انسان سرکش ہو جاتا ہے۔

"الانسان تعلیمی حقیقت ہے" پھر ایک تنبیہی کلمہ "کلا" کے بعد فرمانا کہ "الانسان سرکش ہو جاتا ہے" ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے اسی کا اظہار ہے، یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی میں صلاحیت بڑھتی جاتی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اٹھنے لگتی ہیں، وساوس وشکوک، تنقید واعتراض یہ قصہ ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ علم کا یہی وہ خطرناک پہلو ہے کہ اس پہلو کی جانب سے

---

[1] برصغیر پاک وہند کے قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم ص۳۳۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

معمولی غفلت ہمیشہ خطرناک نتائج کو پیدا کرتی رہی ہے، تعلیم اور ایجوکیشن کے خلاف بعض دلوں میں جو مخالفت پائی جاتی ہے، دراصل علم کے ان ہی طغیانی نتائج پر ان کی مخالفت ملتی ہے خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

بہر حال مسلمانوں کو پہلی نازل شدہ سورت میں تعلیم کے اس خطرناک پہلو پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا، مجھے اس وقت دوسرے ممالک سے بحث نہیں لیکن ہندوستان کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ جس زمانے سے اس ملک میں اسلامی تعلیم کا نظام قائم کیا گیا، اسی زمانہ سے آخر وقت تک زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیمی شعبہ بھی مسلمانوں کا برباد نہ ہوا تھا یہ قرآنی نکتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ دماغی تربیت و اصلاح کے ساتھ ساتھ لازمی طور پر قلبی اصلاح کی طرف توجہ تعلیم کی ایک ناگزیر ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی کی اس طویل مدت میں آپ مشکل ہی سے کسی ایسے عالم کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس نے مدرسہ سے نکلنے کے بعد یا مدرسی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی خانقاہ سے تعلق نہ پیدا کیا ہو، خود قرآن میں علم کے اس طغیانی پہلو پر چونکانے کے بعد۔

ان راه استغنیٰ اس لئے آدمی سرکش ہو جاتا ہے) وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے کے الفاظ سے اس سبب کو ظاہر کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے اہل علم میں یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے، گویا پڑھ لکھ لینے کے بعد آدمی یہ باور کرنے لگتا ہے کہ اب میں خود سوچ سکتا ہوں، دوسروں سے مشورہ لینے کی مجھے کوئی حاجت نہیں، حق و باطل میں امتیاز میرا دماغ خود پیدا کر سکتا ہے، علم کا یہی استغنا انسانیت کی موت ہوتی ہے، الغرض مرض (طغیان) سبب مرض استغناء کے بعد۔

ان الی ربک الرجعیٰ (علاج اس کی طغیانی کا یہ ہے) کہ تیرے رب کی طرف واپسی ہو، کو اس طغیان کا واحد علاج بتایا گیا ہے، اسی قرآنی حکم کی تعمیل کی یہ شکل تھی کہ جن کے پاس ان کا رب تھا۔ ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اپنی صحبت اپنی تربیت میں رکھ کر رجوع کرنے والے کو بھی اس کے رب کی طرف وہ پھیر دیتے تھے، اسی کا اصطلاحی نام پیری مریدی یا بیعت و صحبت تھا[1]

مذکورہ مرض کے قرآنی علاج کے پیش نظر حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانویؒ نے ان دونوں نظریات کو اپنایا یعنی طلباء کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ قلبی اصلاح کو بھی ضروری قرار دیا حضرت تھانویؒ کے تعلیمی افکار و نظریات کی ایک جھلک مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۲۷-۲۸ / ۲۴ - از حضرت مولانا سید۔ مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

تحریک دیو بند اور اصلاح امت

اس ادارے (دارالعلوم دیو بند) سے مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی، مولانا عبید اللہ سندھی علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، مولانا ثناء اللہ امرتسری علامہ انور شاہ کشمیری جیسے جید عالم تعلیم پا کر آسمان علم و فضل پر چمکے یہ اصحاب کامل خود سپردگی اور فدائکاری کے جذبے کے ساتھ آزادی قوم کے لئے سرگرم رہے۔ دیو بند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی تعلیم کی اشاعت کی۔ بدعتوں، فضول رسومات اور مضر اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کی۔[1]

جس تحریک کو اکابر علماء دیو بند نے اپنے وقت میں کتاب و سنت کے مطابق دین اسلام کی بگڑی ہوئی صورت کو نکھارنے کے لئے، رسوم و بدعات کو مٹانے کے لئے طهامات صوفیہ و اغلاط جہلا سے تصوف کو پاک کرنے کے لئے مردہ سنت کو زندہ کرنے کے لئے بفحوائے حدیث لایزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خذلھم۔ اٹھایا تھا اس کی اشاعت کی سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔ اس کو ہندوستان اور بیرون ہند میں صحیفوں اور مواعظ کے ذریعے آپ کے قلم و زبان نے پھیلایا اور کس طرح پھیلایا۔ اس کو مؤرخ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی زبان سے سنیئے۔ اصلاح امت کی کوشش میں علمی، عملی زندگی کے ہر گوشہ پر ان کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک فاسقوں سے لے کر صوفیوں تک درویشوں سے لیکر زاہدوں تک۔ غریبوں سے لے کر امیروں تک استادوں اور مدرسوں تک، غرض ہر صنف امت، اور ہر جماعت کے کاموں تک ان کی نظر دوڑی پیدائش شادی، بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر ان کی نظر پڑی اور شریعت کے معیار پہ جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا۔ اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست، معاشرت، معاملات، اخلاق عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی، اس کی اصلاح کی۔[2]

---

[1] فلسفہ تاریخ و تعلیم اردو بازار لاہور صـ ۳۵ [2] مقدمہ تربیت السالک از سید ظہور الحسن صاحب مہتمم خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون صـ ۱۱، تاریخ دار العلوم دیو بند۔

خانقاہ امدادیہ اور امداد العلوم

آپ کی خانقاہ اصلاح اعمال واخلاق اور تربیت باطن کی درس گاہ تھی وہاں طالبان حق اپنے امراض باطنی کبر ونخوت غرور وغصہ وساوس وغیرہ لیکر آتے تھے اور علاج کے لئے پیش ہوتے تھے اور یہاں سے مناسب نسخے تجویز کیے جاتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے۔ حکیم الامتؒ نے ضرورت سمجھ کر اپنی خانقاہ میں مسئلہ مسائل اور ابتدائی معلومات کے لئے امداد العلوم کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس میں نہایت مختصر نصاب "ضمان التکمیل فی زمان القلیل" کے نام سے جاری کیا تاکہ ذاکرین ظاہری علم سے بھی کماحقہ، واقفیت حاصل کرسکیں [1]

نماز فجر کے بعد کچھ لوگ مسجد میں وظیفہ پڑھتے رہتے تھے اور کچھ اہل خانقاہ اور طالب علم کلام پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ پھر سورج نکلنے پر مدرسہ شروع ہوتا تھا۔ خانقاہ کے شمالی وغربی دالانوں میں جگہ جگہ مختلف جماعتوں کے طلباء اپنے اپنے اسباق میں مصروف رہتے تھے۔ چھوٹی جماعتوں کے لڑکے کلام پاک بلند آواز سے پڑھتے تھے ساڑھے دس بجے کے بعد مدرسہ ختم ہوجاتا تھا اور ظہر کی اذان تک خانقاہ میں خاموشی رہتی تھی۔

ظہر کی اذان کے بعد لوگ وضو کر کے مسجد میں جمع ہوجاتے تھے نماز کے بعد مدرسہ پھر شروع ہوجاتا تھا اور پھر طلباء کے پڑھنے سے خانقاہ گونجنے لگتی تھی۔ اذان عصر کے بعد مدرسہ ختم ہوجاتا تھا نماز کی عملی تعلیم دینے کے لئے چھوٹی جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے وضو کر کے صف در صف نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے اور ایک لڑکا امام بنتا تھا اور قرآت کے ساتھ ساری نماز ادا کرتا تھا۔ نماز ختم کر کے یہ لڑکے چھٹی پاکر اپنے مکان چلے جاتے تھے [2]

نظام الاوقات

حضرت کی مجلس میں حسن معاشرت اور خوش معاملگی پہ بار بار کلام میں زور دیا جاتا رہا ہے۔ نظام الاوقات کی تاکید فرمائی جارہی ہے نظام الاقات کا حکم کلام پاک میں پاک میں موجود ہے۔ انضباط اوقات پہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمل کر کے بتلا گئے اور یہ ایسی اہم اور ضروری چیز ہے کہ دین ودنیا کی صلاح وفلاح اس میں مضمر ہے۔ یہ سب نورانی چیزیں ہیں۔ راحت کی باتیں ہیں۔ انسانی مشاغل ہیں، پیغمبرانہ اعمال ہیں جہالت سے نکلو، گمراہیوں سے بچو، ظلمتوں کو چھوڑدو اور دین متین اور شرع مبین کو اپنا شعار زندگی بناؤ اور یہی غایت ہے تمہاری زندگی کی جس کے لئے

---

[1] ایضاً ص ۱۰۱

[2] مآثر حکیم الامت ص ۴۶، ۴۷

تم پیدا کئے گئے ہو۔[1]

حضرت کو فطرتاً حسن انتظام نظم الاوقات کا بڑا اہتمام تھا چنانچہ اپنی نجی ضروریات کیلئے تصنیف و تالیف کے لئے اور مجلس احباب میں تعلیم و تربیت کے لئے ایسے فراغت کے اوقات مقرر فرمائے کہ ہر کام آسانی اور اطمینان سے سرانجام ہوتا رہے۔ اس نظم الاوقات میں اس قدر انضباط اور جامعیت تھی کہ آخر ایام تک اس میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ حضرت کا منجملہ دیگر خصوصیات کے نظم الاوقات کا استحکام بھی اپنے مقام پر منفرد ہے اپنے منتسبین سے ہمیشہ نظم الاوقات کی پابندی کی تاکید فرمایا کرتے تھے کیونکہ فراغت قلب کی دولت اسی کی بدولت حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے لئے ایک بے بہا نعمت ہے اور اسی نظم الاوقات کی بدولت تمام حقوق اللہ اور حقوق النفس کماحقہ سرانجام ہوتے رہنے کی نعمت میسر ہوتی ہے۔[2]

انداز تعلیم وتربیت

طالبین و سالکین طریق کے لئے ایسے ایسے ضوابط اور دستور العمل مقرر فرمائے کہ ہر درجہ اور استعداد کا طالب حق ان کے مطابق صحیح طریقہ پر عمل کرنے سے بغیر کسی کاوش و تردد اور بغیر کسی مشقت شدیدہ کے مقصود طریق سے واقف ہو کر بہت جلد کامیاب ہو جائے۔ حضرت فرماتے تھے کہ طالب کے اندر اصلاح اعمال کا اہتمام پیدا کر دینے سے قبل اس کو اذکار و اشغال میں مصروف کر دینا اکثر مضر ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ پھر وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھنے لگتا ہے۔ خاص کر اگر کہیں اتفاقاً اذکار و اشغال سے یکسوئی ہو کر اس پر کیفیات کا بھی ورود ہونے لگا تب تو گویا اس کے نزدیک بزرگی کی رجسٹری ہو گئی۔ حالانکہ اس قسم کی کیفیات کا بزرگی سے کیا تعلق ایسی کیفیات تو بعض ریاضات اور مشق سے فساق و فجار بلکہ کفار تک کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جب وہ ان ہی کیفیات کو بزرگی سمجھ لیتا ہے تو پھر اس کو اصلاح نفس اور اصلاح اعمال کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی، نہ کبھی ادھر توجہ ہوتی ہے اس لئے ہمیشہ جہل ہی میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اصل مقصود یعنی وصول الی اللہ سے محروم رہتا ہے جس کا طریق تحصیل نصوص نے صرف اصلاح اعمال ہی کو بتلایا ہے۔

(اشرف السوانح ص ۱۹۵)

حضرت والا اپنی اس تربیت کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ سلسلہ چشتیہ کے مشائخ سلف کے

---

[1] ایضاً ص ۱۷۱ [2] مآثر حکیم الامت ص ۸۵۔

یہاں تو سلوک کی اصل ترتیب یہ رہی ہے کہ اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ کی تکمیل کے بعد اذکار و اشغال شروع کراتے تھے لیکن اکابر متاخرین نے یہ دیکھ کر کہ اس زمانہ میں عمریں اور ہمتیں دونوں قاصر ہیں تو انہوں نے اس ترتیب کو قائم نہیں رکھا۔ بلکہ اصلاح اعمال کے ساتھ ساتھ اذکار و اشغال کی بھی تعلیم کرنے لگے اور دونوں کو ساتھ ساتھ چلانے لگے اور میں نے اپنے زمانے کے طالبین کی مصالح پہ نظر کرکے اکابر سلف کے طریق اور اکابر متاخرین کے طریق کے بین بین طریق اختیار کیا ہے۔ یعنی کچھ دن تک تو میں محض اصلاح اعمال ہی میں مشغول رکھتا ہے اور جب یہ دیکھ لیتا ہوں کہ اصلاح اعمال کی اہمیت اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو گئی ہے۔ اور اس کے اندر اس کا خاص اہتمام پیدا ہو گیا۔ اس وقت اذکار و اشغال بھی بتا دیتا ہوں اور پھر دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلاتا ہوں۔ غرض میں نے اکابرین متاخرین کے طریق میں اپنے زمانے کے طالبین کی طبائع کا رنگ دیکھ کر بضرورت صرف اتنی ترمیم کر لی ہے کہ وہ حضرات تو دونوں چیزوں کو شروع ہی سے ساتھ ساتھ چلاتے تھے اور میں کچھ دن بعد ساتھ ساتھ چلاتا ہوں (اشرف السوانح ص ۱۹۱، ۱۹۳ حصہ دوم)

تحصیل علوم دینیہ میں مشغول رہنے والوں کے لئے ذکر و شغل مناسب نہیں

حضرت والا عموماً ان کو جو تحصیل علوم دینیہ میں مشغول ہیں ذکر و شغل نہیں تعلیم فرماتے تاکہ حرج واقع نہ ہو کیونکہ علاوہ وقت صرف ہونے کے ذکر و شغل سے اکثر دلچسپی اتنی پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اصلاح اعمال بہرحال فرض ہے اور اس میں کوئی حرج اوقات بھی نہیں بلکہ ترک فضولیات کی وجہ سے وقت اور بچ جاتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق خط و کتابت کی اجازت بلکہ کبھی ابتداءً مشورہ بھی دے دیتے تھے

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی مرحوم رقمطراز ہیں بندہ زادہ سے جو تحصیل علوم میں مشغول تھا بنہایت شفقت دلسوزی فرمایا کہ جو موٹی موٹی عیب کی باتیں اپنے اندر محسوس ہوں ان کے متعلق مجھے وقتاً فوقتاً لکھتے رہنا میں انشاء اللہ ایسی سہل سہل تدابیر بتلاتا رہوں گا جن پہ عمل نہایت سہل ہو گا اور اس سے زیادہ کیا سہل ہو گا کہ تم کو میں اجازت دیتا ہوں کہ چاہے مشوروں پہ عمل بھی نہ کرنا لیکن اپنی اصلاح کے متعلق مجھ سے مشورے ضرور حاصل کرتے رہنا اس سے بھی انشاء اللہ تم دیکھو گے کہ بہت نفع ہو گا۔[1]

طریقہ تعلیم حضرت تھانوی کا طریقہ تعلیم اتنا نفیس، سادہ اور سلیس تھا کہ جو طالب علم دو چار سبق

---

[1] حاشیہ حکیم الامت۔

بھی حضرت سے پڑھ لیتا پھر اس کی کسی اور استاد سے تسلی نہ ہوتی تھی، اس کی وجہ خود حضرت کے بیان سے ظاہر ہے کہ جب میں پڑھاتا تھا تو اپنے اوپر بہت تعب برداشت کر کے پہلے سے سبق کی تقریر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ پھر پڑھاتا تھا۔ اس لئے میری ساری تقریر نہایت سہل اور بالترتیب ہوتی تھی جس کی وجہ سے مشکل مضامین طالب علموں کے لئے بالکل پانی ہو جاتے تھے اور بآسانی ذہن نشین ہو جاتے تھے گو مجھ کو تو سہل کر کے تقریر کرنے میں بڑا تعب ہوتا تھا۔ لیکن طلباء کو کسی مقام کے سمجھنے میں الجھن نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ صدرا میں ایک مشہور مقام ہے مثنا بالتکریر جو بہت ہی مشکل سمجھا جاتا ہے لیکن جب کتاب میں وہ مقام آیا تو میں قبل اس کے کہ طلباء کو اس مقام کی اطلاع دوں، اس کے مضمون کی ایک سلیس تقریر کر دی لیکن یہ نہ معلوم ہونے دیا کہ یہ تقریر کس مشکل مقام کی ہے۔ بلکہ یوں ہی سرسری طور پر تقریر کر دی۔ چونکہ میں نے بہت سہل کر کے تقریر کی تھی طلباء کی سمجھ میں خوب آگئی۔ اور جب انہوں نے اس کا اقرار کر لیا۔ تب میں نے کہا۔ یہ تو وہی مقام تھا جس کو مثنا بالتکریر کہتے ہیں، تو سنتے ہی وہ چوکنے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ بس بس اب مت ڈرو اب تو پار ہو گئے۔ میں نے پھر پوچھا۔ کہ بتاؤ یہ بھی کوئی مشکل مقام تھا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم کو تو طلباء نے اس سے بہت ڈرا رکھا تھا۔ لیکن یہ تو کچھ بھی مشکل نہ تھا۔

؎ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا

مقام تو واقعی مشکل تھا لیکن میں نے اس کی تقریر ایسی بے فکری اور سلاست سے کر دی کہ نہایت سہولت کے ساتھ ان کی سمجھ میں آگئی۔ البتہ مجھ کو سہل کر کے بیان کرنے میں بڑا تعب اٹھانا پڑا۔ کیونکہ دوسروں کا بوجھ میں نے اپنے اوپر لے لیا۔ میں پڑھانے میں ہمیشہ یہی کرتا تھا۔ آج کل کے اساتذہ اپنے اوپر ذرا مشقت ڈالنا نہیں چاہتے۔ بات یہ ہے کہ شفقت نہیں رہ گئی۔ محض ضابطہ پری رہ گئی ہے میں نے پڑھاتے وقت کبھی ضرورت سے زیادہ تقریر نہیں کی۔ صرف حل کتاب پر اکتفا کرتا تھا۔ زوائد سے طالب علموں کا کبھی وقت ضائع نہیں کیا۔ اور میں اس کی تاکید اپنے ماتحت مدرسین پر بھی رکھتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی جا کر ان کے پڑھانے کی بھی جانچ کیا کرتا تھا۔ اساتذہ زیادہ تر اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے نکات و دقائق کی تقریر کیا کرتے ہیں۔ جس سے کتاب کے اصل مطلب میں بھی خلط ہو جاتا ہے۔ بعض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک اس قسم کی تقریریں نہ کی جائیں استاد کی مہارت کے متعلق طلباء کی تسلی نہیں ہوتی۔ لیکن طلباء کی یہ تسلی دیکھنا چاہیئے یا ان کا نفع۔ ان کا نفع تو اس میں ہے کہ اصل کتاب کو اچھی طرح حل کر دیا جائے۔

کیونکہ استعداد اسی سے پیدا ہوتی ہے تو پھر نکات و دقائق خود ہی سمجھ میں آنے لگیں گے۔ لہٰذا استاد کامل مطمع نظر بھی ہونا چاہیئے۔

یہ جو نئے نئے طریقے ہفتہ وار مشق، تقریر اور مناظرہ کے نکلے ہیں۔ ان کی ضرورت نہیں بلکہ یہ مضر ہیں۔ اس لئے کہ ہفتہ بھر تک بجائے اسباق کی طرف متوجہ ہونے کے اسی کی تیاری میں رہتے ہیں۔ اوّل تو اس قسم کی مشق کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ جب کتابیں اچھی طرح سمجھ کر پڑھی جائیں گی تو تقریر و تحریر و مناظرہ سب کی استعداد خود ہی پیدا ہو جائے گی اور اگر ایسا ہی شوق ہے تو طالب علم جو کتاب پڑھ رہا ہو۔ اسی کے متعلق اس سے تقریر کرائی جایا کرے۔ اس سے تقریر کی بھی مشق ہو جائے گی۔ اور حرج بھی نہ ہوگا۔ بلکہ کتابیں اور پختہ ہو جائیں گی۔

طلباء کو ہدایات

حضرت تھانویؒ اپنے تجربہ کی بناء پر طلباء کو ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ تم تین باتوں کا التزام کرلو، پھر میں ٹھیکہ لیتا ہوں اور ذمہ دار ہوتا ہوں کہ تمہیں استعداد علمی حاصل ہو جائے گی۔

(۱) جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ــــ ضرور کیا جائے اور مطالعہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ مطالعہ کا مقصد صرف یہ ہے کہ معلومات اور مجہولات متمیز ہو جائیں۔ اس سے زیادہ کاوش نہ کرے۔

(۲) سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لے۔ بلا سوچے سمجھے آگے نہ پڑھے۔ اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہ ہو تو کسی دوسرے وقت سمجھ لے۔

(۳) اس کے بعد خود بھی مطلب کی تقریر کرے۔ بس پھر ان تینوں التزامات کے بعد بے فکر رہے چاہے یاد رہے یا نہ رہے۔ انشاء اللہ استعداد ضرور پیدا ہو جائے گی۔ یہ تینوں باتیں تو درجۂ وجوب میں ہیں۔ اور یہ بات جو درجۂ استحباب میں ہے وہ یہ کہ کچھ آموختہ روزانہ دہرا لیا کرے۔[1]

طالب علموں کو وصیت کرتا ہوں کہ نرے درس و تدریس پر مغرور نہ ہوں اس کا کارآمد ہونا موقوف ہے اہل اللہ کی خدمت و صحبت و نظر عنایت پر اس کا التزام نہایت اہتمام سے رکھیں۔[2]

بے عنایات حق و خاصان حق
گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بعض تعلیمی ضابطے

بیعت کرنے کے بعد اور قبل تلقین اذکار طالب کے موجودہ معمولات بھی

---

[1] مقدمہ تربیت السالک صد۱ و اشرف السوانح جلد نمبر ۱ صد۵۱۔ [2] ماثر حکیم الامت صد۲۸۳

دریافت فرما لیتے اور ان میں مناسب کمی بیشی فرما کر اوراد تجویز فرما دیتے اور اس کی وجہ بھی بیان فرماتے کہ پرانے معمولات سے چونکہ دلچسپی و انس ہو جاتا ہے اس لئے ان کو چھوڑنے کو بھی دل گوارا نہیں کرتا اس لئے بلا ضرورت ان کو نہیں چھڑواتا۔ نیز قدیم معمولات میں مداومت کی بدولت ایک خاص برکت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ (اشرف السوانح حصہ دوم)

تعلیم و تربیت کا طریقہ حضرتؒ کے یہاں یہ بھی تھا کہ طالب کو ہدایت ہوئی تھی کہ اس معاملہ میں زبانی کوئی گفتگو نہ کرے۔ جو کچھ دریافت کرنا ہو یا جو اپنا باطنی حال اظہار کرنا ہو وہ تحریر کے ذریعہ سے کرے۔ چنانچہ ایسے خطوط کے جواب ہمیشہ سائل کی عبارت کے سامنے حاشیہ پر تحریر فرما دیتے تھے تاکہ سوال و جواب ایک ساتھ رہیں اور بعد میں کوئی مغالطہ پیدا نہ ہو۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ ہمیشہ جوابی لفافہ بھیجا جائے۔ کارڈ پر حالات لکھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ خط ہفتہ میں ایک بار لکھا جائے اور ہر خط میں صرف ایک مضمون ہونا چاہیے۔ سالک کو اپنے احوال باطنی سوائے اپنے شیخ کے دوسروں پر ظاہر کرنے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ بھی ہدایت تھی کہ ہر نئے خط کے ساتھ پچھلا خط بھی ملفوف کیا جائے اور خطوط رکھنے کی ہدایت تھی تاکہ آئندہ ان کے مطالعہ سے یادداشت تازہ ہوتی رہے۔

حضرتؒ کا یہ بھی اندازِ تعلیم و تربیت تھا کہ روزانہ کی مجلس میں خاص طور پر ایسے مضامین بیان فرماتے جن سے عام طور پر لوگوں کو سابقہ رہتا ہے۔ مثلاً معاشرے کی خرابیاں، معاملات میں کوتاہیاں، اخلاق کی کمزوریاں، ان باتوں کو کچھ ایسے پیرائے سے روایات کے طور پر بیان فرماتے کہ ان کے اسباب پر نظر پہنچتی پھر ان کے تدارک کے لئے تدابیر مقرر فرما دیتے تھے۔[1]

سوال وجواب کے آداب

مجیب صاحبوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ جب ایسے مسئلے پوچھے جائیں اور سائل ان کے سمجھنے کا اہل نہ ہو تو ہرگز جواب نہ دیں۔ عالم ہونے کی شان یہی نہیں کہ ہر بات کے جواب کے لئے تیار ہو جائیں آج کل دونوں طرف سے بے احتیاطی ہے۔ سائل تو ایسے ہی مسئلوں کی چھیڑ چھاڑ کو دین سمجھے ہوئے ہیں اور علماء اپنا کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ سارے مسائل کو سمجھا ہی کر چھوڑیں۔ قرآن شریف میں تو ان احکام کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جن

---

[1] مآثر حکیم الامت ص۱۶۷

کی ضرورت نہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

لَا تَسْـَٔلُوا عَنْ اَشْيَاۗءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ

یعنی وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ ظاہر کردی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو۔

اس آیت کا شان نزول بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ جب حج کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی، تو ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے۔ آپ نے تین بار سکوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہوجاتا۔ اور پھر کسی سے ادا نہ ہوسکتا۔ تو جب احکام کے متعلق ایسی باتوں کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جو غیر ضروری ہیں تو ان باتوں کا تو کیا پوچھنا جو مضر بھی ہیں۔

تجربہ کرکے دیکھئے کہ غیر ضروری سوالات وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو کچھ کام کرنا نہیں چاہتے اور جن کے ذہن میں دین کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، جن کے دلوں میں علماء کا کچھ ادب نہیں۔ ورنہ دیکھئے کہ ایک کلکٹر سے ملنے جاتے ہیں تو وہاں گنی چنی ہی باتیں کرتے ہیں اور باہر نکل کر کہتے ہیں کہ میں نے قصداً زیادہ باتیں نہیں چھیڑیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا پیچھے لگ جائے۔ دیکھئے وہاں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی قانونی مسئلہ کو چھیڑ دیں کہ اس کا حکم قانون میں ایسا کیوں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں ہیبت اور ادب ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں۔ صحابہؓ ایسے مؤدب تھے کہ جو ضروری باتیں پوچھنا بھی چاہتے تھے تو کئی کئی دن تک نہ پوچھتے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے بعض دفعہ فرشتہ کو بصورت انسان بھیجا اور اس نے وہ سوالات کئے جو صحابہؓ کے دل میں تھے تاکہ لوگوں کو علم ہو۔ یہ ان کے ادب کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے خود ان سوالات کو حل فرمادیا۔ چنانچہ حدیث جبرائیلؑ ایک مشہور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ جبرائیلؑ بصورت انسان آئے اور حضورؐ سے کچھ سوالات کئے اور اس سے غرض یہی تھی کہ لوگوں کو ان باتوں کا علم ہوجائے۔ ادب کی یہ برکت ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ضرورت پوری کی گئی اور بے ادبی کا یہ نتیجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا کہ ایک گائے کی قربانی کرو۔ انہوں نے اس حکم میں حجتیں نکالنا شروع کیں کہ یہ بتلائیے گائے کیسی ہو؟ بتلایا گیا کہ جوان گائے ہو۔ کہا یہ بھی تو بتلائیے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ حکم ہوا کہ رنگ زرد ہونا چاہیئے۔ پھر کہا کہ ٹھیک اور مشرح بتلائیے کہ کیسی گائے ہو؟ اب تک ہماری سمجھ میں پوری حالت اس کی آئی نہیں۔ حکم ہوا کہ ایسی گائے ہو کہ جس سے نہ جوتنے کا کام لیا گیا ہو اور نہ سینچائی کا کام لیا گیا ہو، اور بالکل یک رنگ ہو، کہیں اس میں داغ دھبہ نہ ہو۔ چنانچہ ایسی گائے ان کو تلاش کرنا پڑی۔ طویل وقت اور کثیر رقم خرچ کرکے بہم پہنچی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اتنی

حجت نہ کرتے اور جیسے ہی حکم ہوا تھا، فوراً کوئی سی گائے ذبح کر ڈالتے تو کافی ہو جاتی۔ یہ تنگی کثرت سوال کی وجہ سے ہوئی۔ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس امت کو حق تعالیٰ نے خود ہی اس فعل سے منع فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے۔ یاآیھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیآء ان تبد لکم تسؤکم۔ اور آگے یہ بھی فرما دیا۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كَافِرِيْن

یعنی تم سے پہلی امت نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ احکام میں اسطرح حجتیں کرتے تھے گویا تحقیق کر رہے ہیں۔ لیکن جب حکم ہوتا اور اس کی پوری شرح کر دی جاتی تو اس کی امتثال سے انکار کر دیتے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حجتیں کرنا اسی بات کی علامت ہے کہ اس شخص کو کام کرنا منظور نہیں۔ کام کرنے والا ہمیشہ ڈرا کرتا ہے کہ خدا جانے مجھ سے تعمیل ہو سکے گی یا نہیں۔ اسی واسطے وہ اپنے اوپر تنگی کو اختیار نہیں کرتا بنی اسرائیل بڑے سرکش تھے۔ انہوں نے حجتیں چھانٹیں اور تقریریں کر کے اپنے اوپر مصیبت لا دی۔ اس امت پر خدا کا فضل رہا کہ حضرات صحابہؓ حکم کو سن کر اس میں شکوک اور احتمالات نہ نکالتے تھے۔ [۱]

استعداد کے مطابق تعلیم

فرمایا ایک طالب علم منتہی کسی طالب علم کو پڑھا رہے تھے میرا ادھر سے گزر ہوا تو وہ میزان والے کو الف لام کی قسمیں بتا رہے تھے میں نے کہا مولانا آپ تو چالیس قسمیں بتاتے ہیں مگر اس کے نزدیک تو ایک ہی قسم ہے یعنی الف لام استغراق کا تم اس بیچارے کو پڑھاتے ہو یا خود اپنی استعداد بڑھانے کو پڑھتے ہو۔ بھلا اس غریب کو اس سے کیا نفع۔ [۲]

ایک اور سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک عورت ضعیفہ نے مجھ سے سوال کیا کہ مولوی صاحب تمہیں تو اللہ میاں کے گھر کی سب خبر ہے میں یوں پوچھوں کہ اللہ میاں زندہ ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر علمی مضمون بیان کیا تو یہ بیچاری کیا سمجھے گی بے علمی تو اس سوال کا سبب ہی ہے میں نے اس کے فہم کی رعایت کرتے ہوئے کہا کہ اچھا یہ بتلاؤ کہ مینہ کون برساتا ہے۔ اولاد کون دیتا ہے۔ کہا کہ اللہ میاں میں نے کہا کہ بھلا مر کر بھی کوئی کام کر سکتا کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ بس اب تو تم خود ہی سمجھ لو بہت خوش ہوئی اور دعائیں دیں [۳]

---

[۱] ماہنامہ انوار العلوم جلد ۴ شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ء ص ۸۸، ۸۹ (ترجمان جامعہ اشرفیہ لاہور)

[۲] جمیل الکلام ص ۱۸۱

[۳] الافاضات الیومیہ۔ حصہ سوم ص ۲۹

اشرف النصاب

حضرتؒ والا نے ان لوگوں کے لیے جو دنیاوی مشاغل کی وجہ سے دین کا ضروری علم حاصل کرنے سے بھی محروم رہتے ہیں۔ احکاماتِ شریعت و سنت کے ضروری علوم جن کو ہر مسلمان کے لئے حاصل کرنا ضروری ہے ان کے لئے چند خاص خاص کتابوں کا ایک نصاب مقرر فرمایا ہے جس کے مطالعہ سے تمام ضروری فرائض و واجبات اور اوامر و نواہی کا علم ہر شخص کو حاصل ہو سکتا ہے ورنہ بغیر اس کے حاصل کئے ہوئے نہ دنیا ہی کی فلاح مل سکتی ہے نہ آخرت کے مواخذہ سے نجات ممکن ہے وہ نصاب ذیل میں درج ہے۔ کتابوں کا مطالعہ اسی ترتیب سے کیا جائے

۱۔ بہشتی زیور اور بہشتی گوہر
۲۔ حقوق الاسلام
۳۔ فروع الایمان
۴۔ جزاء الاعمال
۵۔ صفائی معاملات
۶۔ اصلاح الرسوم
۷۔ تعلیم الدین
۸۔ حیوٰۃ المسلمین
۹۔ آداب المعاشرت
۱۰۔ قیامت نامہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ
۱۱۔ تبلیغِ دین
۱۲۔ نشر الطیب
۱۳۔ قصد السبیل
۱۴۔ شوقِ وطن
۱۵۔ الانتباہات المفیدہ اس کی تسہیل حل الانتباہات
۱۶۔ تسہیل المواعظ کے وعظ جس قدر مل سکیں

ہدایت

* اگر تسہیل المواعظ نہ مل سکیں تو ان کے بجائے اصل مواعظ کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے بعد مزید ترقی و بصیرت کے لئے جس قدر ممکن ہو دوسرے مواعظ اشرفیہ د بالخصوص مواعظ ہفت اختر، طریق القلندر، محاسن الاسلام اور ملفوظاتِ اشرفیہ کا مطالعہ مناسب ہے۔"[1]

نصابِ تصوّف

حضرتؒ والا نے اہلِ تصوّف اور سالکین طریق کے لئے بھی چند کتابوں کا ایک نصاب مقرر فرمایا ہے جس کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کے مطالعہ سے سالکین کو نفس و شیطان کے مکائد معلوم ہوں گے اور ہر طرح کی بدعات و ضلالت باطنیہ کی ضروری اور تفصیلی معلومات حاصل ہوں گی۔ اگر کسی اہل علم سے

---

[1] ماثر حکیم الامت ص ۳۲۷

سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ جس طرح کتابوں کی نمبروار ترتیب دی گئی ہے اسی طرح پڑھنے کی ہدایت ہے۔

۱۔ آداب المعاشرت
۲۔ معمولات خانقاہ
۳۔ رحمۃ المتعلمین حصہ اوّل
۴۔ تعلیم الدین باب اول و دوم
۵۔ التکشف حصہ اوّل
۶۔ فروع الایمان
۷۔ نُزہۃ البساتین
۸۔ وعظ راحت القلوب
۹۔ تبلیغ الدین
۱۰۔ جہاد اکبر
۱۱۔ قصد السبیل
۱۲۔ بقیہ تبلیغ الدین
۱۳۔ التکشف حصہ دوم و سوم
۱۴۔ مسائل السلوک
۱۵۔ کلید مثنوی دفتر ششم
۱۶۔ تربیت السالک (تمام)
۱۷۔ عوارف یا اس کا ترجمہ
۱۸۔ الدر المنضود
۱۹۔ ترجمہ آداب العبودیت
۲۰۔ ترجمہ تنبیہ المقربین
۲۱۔ اکمال الشیم
۲۲۔ رفع الضیق
۲۳۔ اصول الوصول
۲۴۔ الابتلاء لاہل الاصطفاء[1]

طلبا اور سیاست

اس سے بڑھ کر کیا شانِ افاضہ و تبلیغ اور شوقِ خدمتِ دین ہوگی کہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند جو حضرت اقدس کا علمی گہوارہ اور بزرگوں کی خاص جگہ تھی اس کی محبت جس قدر حضرت کو ہو سکتی ہے کوئی دوسرا آدمی اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ وفات سے چند سال پہلے وہاں کے ارباب حل و عقد سے مذاق و رائے کا کچھ اختلاف پیش آیا۔ حضرت اقدس کی رائے تھی کہ موجودہ سیاسیات کا اشتغال خواہ فی نفسہ حق ہو یا باطل مگر دارالعلوم کے طلباء و علماء کی اس میں شرکت بہرحال مدرسہ کے —— مقاصد اصلیہ کو متزلزل کر دینے والی ہے جس کا مشاہدہ و تجربہ بھی عرصہ سے اکثر حضرات کو ہو چکا ہے لیکن حضرت اقدس کی عادت ہمیشہ سے یہ تھی کہ اختلاف کے موقع پر جو بات حق سمجھی اس کا اظہار صاف صاف کر دیا۔ پھر قبول کر لیا گیا تو بہتر ورنہ اپنے آپ کو اس سے علیحدہ کر لیا۔ خلاف و جدال میں پڑنے سے طبعاً نفرت تھی۔ اکثر ایسے مواقع پر یہ شعر پڑھا اور لکھا کرتے تھے۔ ؎

خود چہ جائے جنگ و جدل نیک و بد کیں دلم از صلحہا ہم مے رمد

اسی عادتِ قدیمہ کی بناء پر عرصہ ہوا دارالعلوم کی سرپرستی سے استعفاء دے دیا تھا لیکن دارالعلوم کی

---

[1] مآثر حکیم الامت ص۳۲۶

ہمدردی و بہی خواہی اور اس کی عظمت و محبت رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور جس طرح کی کوئی امداد ہو سکتی تھی برابر کرتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ تو ہماری ماں ہے شکایت و اختلاف اگر کچھ ہے تو بھائیوں سے ہے ماں سے نہیں۔ اسی لئے باوجود ضابطہ کی علیحدگی کے مفید مشورہ سے کسی حال میں دریغ نہ فرماتے تھے۔

مرضِ وفات میں اتفاقاً کانگریس کی تحریکی کارروائیوں کا فتنہ اٹھا اس میں مدرسہ کے طلباء اور بعض متعلقین کی کسی درجہ میں شرکت اور اس کی روک تھام پر منتظمین دارالعلوم میں باہمی اختلاف کی خبر حضرت اقدسؒ کے کانوں تک پہنچی تو رنج ہوا کہ اس کو مدرسہ کے حق میں مضر جانتے تھے۔ انہی ایام میں اتفاقاً مہتمم صاحب دارالعلوم حاضرِ خدمت ہوئے تو باوجود طول مرض اور ضعف شدید کے اہتمام کے ساتھ ان کے سامنے ایک مفصل تقریر فرمائی ——— یہ تقریر چھوٹے گھر سے باہر چھپتہ کے اندر چارپائی پر بیٹھے ہوئے ارشاد فرمائی تھی جو مدارسِ تعلیم و تربیت کے زریں اصول اور اصلاحی آئین سے متعلق تھی۔ افسوس کہ اس وقت اس کو ضبط نہ کیا گیا۔

خلاصہ اس کا یہ تھا کہ میں نے قرآن و سنت اور عمر بھر کے تجربہ، نیز جن بزرگوں کی خدمت کا شرف حاصل ہوا ان سب کے طرزِ عمل سے مدرسہ کے بارہ میں جو کچھ اصلح سمجھا وہ یہ ہے کہ مدارس اور ان کے متعلقین کو سیاسیاتِ حاضرہ سے بالکل مجتنب رہنا چاہیئے اور صرف سیاسیات ہی سے نہیں بلکہ ہر اس کام سے جو تعلیمی مشاغل میں خلل انداز ہو اگرچہ وہ کام فی نفسہ کیسا ہی محمود اور مفید کیوں نہ ہو۔ ہمارے بزرگوں نے طلباءؑ کو بیعت کرنے اور سلوک میں مشغول ہونے سے بھی باوجود اس کو اہم سمجھنے کے طالب علمی کے زمانہ میں ہمیشہ منع فرمایا ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہ، کبھی کسی طالب علم کو فراغت سے پہلے بیعت نہ فرماتے تھے۔ پھر کسی سیاسی اور ملکی تحریک میں شرکت کیسے گوارا کی جا سکتی ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے سے زائد اس تقریر کا سلسلہ رہا۔ حضرت مہتمم صاحب نے تقریر سن کر اس کو حرف بحرف تسلیم کیا اور عرض کیا کہ میں اس کی پوری کوشش کروں گا۔ حضرت والا نے مسرور ہو کر دعائیں دیں اور یہ مجلس ختم ہوئی۔ اس کے بعد برابر حضرت اقدس کو یہ انتظار رہا کہ اس بارہ میں کوئی اصلاحی صورت مدرسہ میں ظاہر ہو اور آنے جانے والوں سے خلافِ معمول کچھ حالات بھی دریافت فرماتے رہے لیکن کوئی نئی چیز معلوم نہ ہوئی بلکہ ایک تحریر اسی عرصہ میں منجانب مدرسہ شائع ہوئی جس میں حضرت نے صورت مناقشہ محسوس فرما کر

ناپسند کیا۔

اسی میں ایک عرصہ گزر گیا اور اب مرض کا اشتداد اور ضعف کی انتہا ہو گئی اور اکثر اوقات غنودگی کا عالم طاری رہنے لگا۔ اس وقت ۲۹ جمادی الثانیہ ۱۳۶۲ھ کو حضرت مہتمم صاحب دوبارہ حاضر خدمت ہوئے تو باوجود انتہائی ضعف کے پھر ایک آخری نصیحت فرمانے کا اہتمام کے ساتھ قصد فرمایا کہ حاضرین خدمت میں سے چند اصحاب مولانا شبیر علی صاحب، مولانا جمیل احمد صاحب، ڈپٹی علی سجاد صاحب ڈاکٹر عبد الحئی صاحب کو اس مجلس میں طلب کیا اور فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مدرسہ دیوبند کے بارہ میں اپنی آخری اور مختتم رائے آپ سب حضرات کے سامنے ذکر کر دوں تاکہ بعد میں غلط انتساب کا احتمال نہ رہے۔

یہ سب حضرات اور مہتمم صاحب مقررہ وقت پر جمع ہو گئے تو تقریباً سوا گھنٹہ مسلسل تقریر فرمائی گو غایت ضعف سے آواز بہت پست تھی اور مخاطبین کو بہت قریب بلا لیا تھا تاکہ تقریر سنائی دے سکے۔ بلکہ تقریر شروع کر کے احتیاطاً پوچھ بھی لیا تھا کہ سب صاحب سن رہے ہیں، ضعف اس درجہ تھا کہ رخسارِ مبارک کو بار بار تکیہ پر رکھ لیتے تھے۔ حیرت کی انتہا نہ تھی کہ اس درجہ ضعف میں بھی بسترِ مرگ پر پڑے پڑے اتنے مؤثر انداز سے ایسی مفصل، مکمل، مُدلّل اور مسلسل تقریر فرما رہے ہیں مع تمہید اور جمیع علمی جذباتی، مصلحانہ اور مشفقانہ رعایتوں کے جیسے کوئی رسالہ تصنیف کیا ہوا سنا رہے ہوں۔

منجملہ دیگر ضروری باتوں کے تمہید میں یہ مضمون بھی تھا کہ میں عرصہ سے بیمار ہوں حیات کا اعتبار نہیں، اس وقت پھر مدرسہ دیوبند کے متعلق اپنا خیال صاف صاف ظاہر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مدرسہ دیوبند ایسی چیز نہیں جس کے متعلق میں اپنی مختتم رائے ظاہر کئے بغیر چلا جاؤں تاکہ بعد میں ہر فریق کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ وہ ہمارے موافق تھا۔ وہ مختتم رائے یہ ظاہر فرمائی کہ مدرسہ دیوبند کو سیاسیات سے بالکل الگ رہنا چاہئیے اور یہی ہمارے اکابر کا طریق تھا کہ تعلیم کے زمانے میں کسی دوسری طرف توجہ کو سخت مضر خیال فرماتے تھے اور ظاہر ہے کہ معلمین کے طرزِ عمل کا طلباء پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا مدرسہ کے مدرسین کو بالخصوص طلباء کی مصلحت سے سیاسیات سے علیحدہ رکھنا ضروری ہے اور مدرسین کے دوسری طرف متوجہ ہونے سے تعلیم کا حرج بھی مشاہد ہے۔ ایک ایسی جماعت کی بھی سخت ضرورت ہے جو محض علم دین کی خدمت کرے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔ وہ لوگ جن کو اگر ہم

زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں اور سب کام کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات ہیں اور سیاسیات و جہاد مقصود اصلی نہیں بلکہ اقامتِ دین کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاسیات و جہاد کا حکم سب کو نہیں دیا گیا بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی وہاں دیا گیا ورنہ نہیں وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ بقدرِ ضرورت ہی دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ وعد اللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم "تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا۔"

یہاں ایمان و عمل صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے تمکین فی الارض کی جس سے تمکین و سیاست کا مقصودِ اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطورِ خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس دین پر سیاست و قوت موعود ہوئی لیکن ہر موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں ورنہ آیت کریمہ (ولو انھم اقاموا التورٰۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم "اور اگر یہ لوگ توراۃ کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے"۔) میں جس میں اقامت توراۃ و انجیل و قرآن یعنی عمل بالقرآن پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا۔ پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان و عمل صالح پر شوکت و قوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطورِ خاصیت اس پر مرتب ہوں گے نہ کہ مقصود جو اس کی

عنایت کہلائے۔

بہرحال واضح ہوا کہ سیاست و دیانت میں سیاست وسیلہ ہے دیانت مقصود اصلی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں اور دیانت خود مقصود اصلی ہے۔ اسی بنا پر میرا خیال یہ ہے کہ ایک جماعت ایسی بھی رہنا چاہئے جو خالص حفاظت دیانت اور تعلیم دین میں مشغول ہو اور وہ جماعت اہل مدارس ہی کی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے میری پختہ رائے یہ ہے کہ طلباء کو سیاسیات میں مبتلا نہ کیا جائے۔ طلبا اگر ان قصوں میں پڑ گئے تو وہ تعلیم سے بھی جاتے رہیں گے اور تربیت بھی ان کی نہ ہو گی۔ چنانچہ جب سے طلباء کو اس سلسلہ میں ڈال دیا گیا ہے ان میں آزادی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہی لوگ ہر وقت ان کی طرف سے متفکر اور خائف رہتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار یہ کہا اور اب پھر کہہ رہا ہوں لیکن میں اس کے قبول کے آثار نہیں دیکھتا چنانچہ اب جو مضمون آپ کی طرف سے شائع ہوا ہے (یعنی مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے بیان کا جواب) اس میں بھی بحق مدرسہ سیاسیات سے کوئی تبری نہیں کی گئی بلکہ اثبات معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس مضمون میں مناظرانہ صورت پیدا ہو گئی ہے جس سے ذات البین پر برا اثر پڑتا ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے آپ کو مجبور کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود مجبور ہو کر کہا ہے تاکہ میرا طریق اور میری رائے تلبیس میں نہ پڑ جائے کہ میں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے بزرگ اور مشفق استاد حضرت مولانا دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی اپنی رائے کے اخفاء کو خیانت سمجھ کر ظاہر کر دیا اور ظاہر ہے کہ اگر میں اس تلبیس کو گوارا کرتا تو اس وقت حضرت کے لئے کرتا، اب اس کی کوئی وجہ نہیں۔

افسوس ہے کہ یہ تقریر دلپذیر پوری ضبط نہ ہو سکی اس لئے جس قدر چیزیں یاد ہیں وہ ذکر کی گئی ہیں جناب مولانا مہتمم صاحب دار العلوم نے یہ تقریر سن کر حضرت کے ارشاد کے مطابق عمل پر آمادگی ظاہر فرمائی تو حضرت نے خاص مسرت و شفقت کا اظہار فرمایا اور یہ مشورہ دیا کہ اگر آپ کو اس طرز عمل کی تنفیذ پر دار العلوم میں قدرت نہیں ہے تو کم از کم اپنی رائے کا اعلان صاف طور پر کر دینا چاہئے۔ مہتمم صاحب نے اس کا وعدہ فرمایا اور مجلس ختم ہو گئی۔

اصلاح کی خاطر سختی کرنا

فرمایا کہ حضرت مولانا دیوبندیؒ[1] کی بھی آخیر میں یہی رائے ہو گئی تھی کہ بعض

---

[1] مآثر حکیم الامت ص ۴۵۵

کے لئے تشدد کی ضرورت ہے چنانچہ ایک معتبر شخص مجھ سے حضرت کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ متکبرین کو تھانہ بھون بھیجنا چاہیئے وہاں ہی درست ہو سکتے ہیں (تھانہ بھون بھیجنے سے مراد میرے پاس بھیجنا تھا۔

(الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۱۴)

یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ اصلاح کی خاطر دلسوزی سے متکبرین وغیرہم پر سختی فرماتے تھے مگر اس سختی میں بھی دراصل شفقت پوشیدہ ہوتی تھی۔ بقول عارف باللہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ؎

منبع صد کرم تیرا لطف بھرا عتاب تھا ‏ ‏ ‏ ‏ سارے تعلقات کا وہ ہی تو فتح باب تھا

واقعی ایسی سختی پر ہزاروں شفقتیں قربان ہوں۔ اسی لئے آپ کے متعلقین اسی سختی سے بھاگتے تھے بلکہ بزبان احوال یہ کہتے ؎

ٹلوں گا میں نہ ہرگز لاکھ ہو تو خشمگیں ساقی ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جو مئے سب سے بہتر ہے ملتی ہے یہیں ساقی[1]

اہل مدارس کا عدم توکل

ایک مدرسہ کے طلباء کی شورش کا حال سن کر فرمایا کہ مدرسہ والے بھی بڑے ڈھیلے ہیں سب کو نکال باہر کریں۔ مدرسہ والوں کا سب کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب میں ایک مدرسہ میں تھا تو مجھے بھی کچھ کچھ خیال ہوتا تھا کہ چندہ بند ہو جائے گا اور چندہ ہوتا ہے تکثیر سواد سے۔ لیکن تکثیر سواد خود مقصود ہی نہیں مقصود تو یہ ہے کہ آدمی کام کے پیدا ہوں اور جو کام نہ کریں انہیں نکال باہر کرنا چاہیئے اگر کم ہو جائیں گے ہو جائیں ورنہ یہ ترقی ایسی ہوگی جیسے مردہ مر کر پھول جاتا ہے کہ ترقی تو ہوئی مگر کس کام کی۔ ہمارے اکابر کے زمانہ میں بڑے بڑے مدرسوں میں ساٹھ ستر طلبہ سے زیادہ نہ ہوتے تھے مگر ان میں سے ایسے ایسے نکلتے تھے کہ جنید وقت ہوتے تھے۔ سادگی اتنی تھی کہ اگر کسی کتاب کی غلطی درست کرنی ہوتی تھی تو قلم دوات نہیں ملتی تھی۔ بس دفتر سے مانگ کر بناتے تھے اور اب تو ہر حجرہ کے سامنے سائیکل نظر آتی ہے اور کتابیں طاق میں بھی رکھی رہتی ہیں اور کئی کئی طرح کے قلم روشنائی مہیا رہتی ہے مگر کام کے لئے نہیں بلکہ یہ بھی ایک فیشن ہو گیا ہے۔

اسی سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہی کے زمانہ میں اہل شہر کی طرف سے دارالعلوم دیوبند میں ایک ممبر بڑھانے کے لئے درخواست کرنے میں فتنہ کھڑا ہو گیا مگر مولانا یہی فرماتے رہے کہ ان میں اہلیت نہیں

---

[1] معارف شیخ الہند ص ۹ از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔

غیراہل کو ممبر بنانا جائز نہیں۔ میں نے عرض کیا کیا حرج ہے ایک ممبر بڑھا لیجئے فتنہ دب جائے گا اور ضرر کچھ ہے نہیں کیونکہ فیصلہ کثرت رائے سے ہوتا ہے اور کثرت آپ کے خدام کی ہے اور نہ بڑھانے میں فتنہ بڑھنے سے اندیشہ ہے کہ مدرسہ ٹوٹ جائے۔ فرمایا کہ اگر مدرسہ ٹوٹ گیا تو اس کے ٹوٹنے کے وہ ذمہ دار ہوں گے اور اگر ہم نے نااہل کو بنایا تو ہم گنہگار اور ذمہ دار ہوں گے اور خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہوگا سو ہمیں مدرسہ مقصود نہیں رضائے حق مقصود ہے۔ [1]

مدارس اسلامیہ کے لیے چندہ جمع کرنے کا طریقہ

ارشاد فرمایا (حضرت تھانویؒ نے) کہ مبارک علی صاحب سابق نائب مہتمم دار العلوم، دیوبند سے مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت شیخ العربؒ والعجم مولانا محمود الحسنؒ کے سامنے کسی نے یہ شکل پیش کی کہ مدارس عربیہ اسلامیہ کے لیے چندہ جمع کرنے میں بہت سے منکرات پیش آتے ہیں لوگوں میں علم و علماء کی تحقیر پیدا ہوتی ہے وغیرہ اور چندہ نہ کریں تو ان مدارس کا کام کیسے چلے؟

حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا "چندہ کرو، مگر غریبوں سے"۔

حضرتؒ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ یہ بالکل صحیح علاج ہے وجہ یہ ہے کہ غریب لوگ چندہ جمع کرنے والے علماء کو حقیر نہیں سمجھتے تعظیم کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان پر بارِ خاطر بھی نہیں ہوتا، خوش دلی کے ساتھ دیتے ہیں جس میں برکت ہی برکت ہے۔ مگر اس پر یہ سوال ہوگا کہ غریب لوگوں سے چندہ ملے گا ہی کتنا؟ مقدار چندہ بہت گھٹ جائے گی مگر یہ خیال اولاً تو یوں غلط ہے کہ دنیا میں ہمیشہ غریبوں کی تعداد زیادہ اور مالداروں کی کم رہی ہے اگر فی الواقع چندہ کم وصول ہو تو کام کو اسی پیمانہ پر کرو، زیادہ نہ بڑھاؤ، کیا ضروری ہے کہ قدرت سے زیادہ بار اٹھایا جائے۔ مجالس حکیم الامت ص۲۱۱ [2]

عصری علوم

اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہِ راست اس فقیر (حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ نے) مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے سنی تھی۔ اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دار العلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جا رہے تھے تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں، جہاز میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے۔

---

[1] جمیل الکلام ص۶۶ [2] معارف شیخ الہندؒ ص۶ از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

انہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کئے اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا، اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیونکہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہِ راست گفتگو کرنے سے پڑ سکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمّی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی۔ کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جارہا ہے، ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی، حضرت مولانا قاسم کے نقطۂ نظر کو تو آپ سن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی[1] کی ہی النور میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے۔

”ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں میرزاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں یہ خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میرزاہد کی لیکن حکیم الامۃ کا خیال یہی ہے اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ”کیونکہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی“ یعنی وہی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ والی بات ہے، جامع ملفوظ نے ——— اس ملفوظ کو درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ”یہ بات بڑی قوت سے فرمائی“۔

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطۂ نظر ہو، اگر بجائے امور عامہ اور صدرا و شمس بازغہ کے تمرینی اغراض کے لئے جدید علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس

---

[1] صد افسوس کہ شریعت و طریقت کا یہ آفتاب درخشاں ۱۹-۲۰ جولائی ۴۳ء کی درمیانی شب میں غروب ہوگیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا، جیسے بخاری کا پڑھنا باعث اجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چونکہ اسلام کی خدمت کا موقع امور عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے، اس لئے یقیناً اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ "استاذ اساتذۃ الہند، مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً مسلک دیوبند کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب ان کے ملفوظات طیبہ میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (عبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی آگیا تھا، حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے، لیکن باوجود اس کے حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ

فاضلے از اکابر علماء آمدہ از تحقیق توریت بلسان عربی می کردم (ملفوظات عزیزیہ ص ۴)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی، جامع ملفوظ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ "چنانچہ چند آیات اور توریت (مع ترجمہ ارشاد فرمود ص ۴) اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے، لیکن کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں

بہر حال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے عبری زبان سیکھی تھی، پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی اگر ان ہی کے پیس روؤں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود عمر ہونے کے اگر کر لیا ہو تو کیا تعجب ہے [1]

۱۳۲۰ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن بنایا گیا [2]

اگلے سال ۱۳۲۱ھ کی روداد میں دارالعلوم کی جانب سے ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ایسے طلباء کو جو کم از کم انٹرنس پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں ان کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ کے وظائف دیئے جائیں اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلباء انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں ان کے لئے بھی وظائف مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے روداد کے الفاظ یہ ہیں کہ "دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لئے

---

[1] مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۳۹، ۴۰، ۱۴۱ [2] تاریخ دارالعلوم دیوبند ج ۱ ص ۲۰۷

بہت سے فوائد ہیں۔" افسوس ہے کہ اس مد میں عطیات نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔[۱]

عہد نبوی کی مخصوص نصابی سرگرمیوں میں بھی مسلمانوں کے لئے قرآن و حدیث کی تعلیم، تجوید القرآن، فقہ، علم ہئیت اور علم الانساب شامل نصاب تھے۔ جب اسلامی ریاست کے سفارتی امور کو نبٹانے کی ضرورت پڑی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا حکم بھی دیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم ملا۔ اور اسی طرح دوسرے مسلمانوں نے غیر ملکی زبانیں سیکھیں اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کو جاری رکھا۔" یثرب میں یہودیوں کی ایک ایسی درسگاہ جس کا نام بیت المدارس تھا۔ رسولِ خدا کی ہجرت کے وقت بھی موجود تھی۔ اس دانش گاہ سے رسولؐ اللہ نے مسلمانوں کو عبرانی اور دیگر علوم سیکھنے کا حکم دیا تھا۔[۲]

پروفیسر احمد سعید صاحب حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جب آپ عربی علوم کا تیسرا سال پورا کر چکے تو آپ کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب آپ کو اپنے ہم سبق حضرت حکیم الامت ــــ کی خدمت میں لے گئے اور آپ سے مشورہ کیا کہ آیا مفتی صاحب کو فلسفہ کی کتابیں پڑھائی جائیں یا نہیں۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ارشاد فرمایا ضرور پڑھو تم فلسفہ پڑھ لوگے تو تمہیں انشاء اللہ اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا بلکہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کو پڑھ کر اس کا رد کر سکوگے۔[۳]

تعلیم کے لیے عمر کی قید نہیں

جامعہ عثمانیہ کے سابق پروفیسر مولانا عبدالحئی مرحوم نبیرۂ مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جو شاہزادگان آصفی کے استاد بھی تھے پچاس سال کی عمر کے بعد حفظ قرآن میں مشغول ہوئے، اور تراویح سنا کر بلکہ دوسرے سال تراویح پڑھتے ہوئے طاعون میں مبتلا ہو کر مولانا نے درجۂ شہادت حاصل کیا، حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی سے ارادت و خلافت کا تعلق رکھتے تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے بھی قریب قریب پورا قرآن حال ہی میں یاد فرمایا، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی سن کہولت ہی میں قرآن کو محفوظ فرمایا ہے جیل خانوں کی زندگی میں حضرت والا کا سب سے بڑا مشغلہ یہی اشتغال بالقرآن رہتا ہے اور پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات میرے کان میں پہنچی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اس وقت یاد کیا جب

---

[۱] ایضاً ص ۲۰۹ ج ۱ [۲] عہد نبوی کا نظام تعلیم ص ۷۔

[۳] بزم اشرف کے چراغ ص ۸۳ [۴] بعد کو تذکرہ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح

(باقی اگلے صفحہ پر)

حج کے ارادہ سے آپ جہاز پر سوار ہوئے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دیکھا گیا۔ تراویح کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہم سفر تھے۔ اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا آخر مولانا ہی تیار ہو گئے روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سنا دیا کرتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔

خلاصہ یہ ہے کہ معمر ہونے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شروع سے جاری رہا ہے، اور سچ پوچھئے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت بھی عمل قرار پا سکتا ہے، آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ہے کہ چالیس کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا صحابہ میں بھی جو لوگ حافظ تھے کھلی ہوئی بات بھی ہے کہ اس کا موقعہ معمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

الغرض ———— حضرت تھانوی کی زندگی کا ایک نہایت روشن پہلو آپ کے بلند پایہ اصلاحی و تجدیدی کارنامے بھی ہیں۔ آپ مسلمانوں کے عقائد و عبادات کی تصحیح کے ساتھ ان کے اخلاق، معاملات، معاشرت و عملی زندگی کی اصلاحات پر بھی پوری توجہ فرماتے تھے۔ جو صرف آپ ہی کا حصہ تھا۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت جامع کتاب حیات المسلمین کے نام سے تالیف فرمائی جس میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح و ترقی کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا۔ آپ نے ایک عالم کو فیض ظاہری و باطنی سے سیراب کیا آپ کے بے شمار مواعظ، ملفوظات اور تصانیف کی روشنی سے شرق و غرب روشن ہو گئے۔ لاکھوں قلوب آپ کے فیض باطن سے جگمگا اٹھے۔ عوام و خواص علماء و ادباء سب ہی نے آپ سے فیض پایا۔

آپ سے سینکڑوں حضرات نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور آپ کے نظریات کو عملی جامہ پہنایا۔ ان خوش نصیبوں میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا خیر محمدؒ شامل ہیں۔ جنہوں نے مدارس قائم کر کے اپنی مربی کے نظریات کو تادیر جاری رہنے کا انتظام کیا اللہ تعالیٰ ان مدارس کو اپنی حفاظت میں رکھے اور امۃ مسلمۃ کو زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی

(گذشتہ صفحے کا بقیہ) عمرہ میں بحمداللہ یہ الفاظ بھی مل گئے ایک دفعہ حضرت مولانا محمد قاسم حج بیت اللہ کو تشریف لیجارہے تھے۔ جہاز میں ماہ رمضان المبارک آگیا مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا۔ دن بقدار تراویح یاد کر کے رات کو سنا دیتے تھے۔ نظام تعلیم و تربیت حصہ ۱ ص ۲۰

توفیق عطا فرمائے۔

سند و دستار

ہر قسم کے فارغین کو علاوہ سند کے دستار بھی دی جاتی تھی جس پر طالب علم کا نام مع مدرسہ و سن فراغ ریشم سے لکھا ہوا ہوتا تھا۔ پہلے حفاظ اور ناظرہ خوانوں کو دستار نہ دی جاتی تھی لیکن حضرت حکیم الامت کو خیال ہوا کہ جب فارغین حدیث کو دستار دی جاتی ہے تو فارغین قرآن کو کیوں نہ دی جایا کرے۔ چنانچہ پھر ان دو فریق کو بھی دی جانے لگی[1]

سید محبوب رضوی دارالعلوم دیوبند کے نظام تعلیم کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ جو طلباء علوم و فنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے ہیں ان کو سند دینے کے علاوہ قدیم درسگاہوں کے معمول کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ کے ہاتھوں سے ان کے سروں پر دستار باندھی جاتی ہے جو مدارس عربیہ کی اصطلاح میں "دستار فضیلت" سے موسوم ہے۔[2]

یہ تھی حضرت تھانوی رح کے سلسلہ اسناد کی حامل تعلیمی نظریات و افکار کی ایک جھلک جن کو متلاشی ہدایت کے لئے عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے ان پر عمل پیرا ہونے والے حضرات علم و عمل ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں بدعات کی تردید اور روک تھام میں پیش پیش رہے۔ یہ تردید بھی نئی نہیں بلکہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رح بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے۔

ائمہ سلف اور فقہائے اسلام جو علم و اجتہاد کے نور سے منور تھے، ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے راستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم ٥ صراط الذین انعمت علیھم

اے اللہ چلا ہمیں سیدھی راہ پر۔ راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔

---

[1] اشرف السوانح جلد ۱ ص ۵۵

[2] تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۳۰۱ ج ۲

انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے حالاتِ زندگی کا انوکھا اجمالی خاکہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی

اس ناکارہ کے اکابر شموس و بدورِ ہدایت ہر ایک اپنے علوم و معرفت اور علوِ شان فقہ و سلوک تفسیر و حدیث میں ممتاز ؎

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع
الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں!   کہ ہر اک دست بوسی کیا قدم بوسی کے قابل ہے
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر   ان ہی کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی!
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے   انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں   پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے   اور آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

لیکن اس کے باوجود گلدستہ کے پھولوں کی طرح سے ہر ایک کی بو الگ، نظافت و لطافت الگ اور گلدستہ جب ہی کامل و مکمل ہو سکتا ہے جبکہ اس میں مختلف رنگوں کے اور مختلف خوشبوؤں اور اداؤں کے پھول ہوں۔ ؎

گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن   اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

میرے جملہ اکابر کی سوانح عمریاں مختصر و مفصل بہت سی لکھی گئی ہیں جن میں اُن کے علمی کمالات، عملی ریاضات معارف و علوم و حکمت پر مختصر مفصل سب ہی کچھ لکھا گیا۔ لیکن ان سب کا احاطہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ مجھ جیسے ناقص العلم والفہم کے ادراک میں آسکتے ہیں۔ مگر میرا جی یہ چاہا کرتا ہے کہ ان اکابر کے تاریخی حالات نہایت

اجمالی طور پر ضرور دوستوں کو مستحضر ہیں اس سے دَور اور زمانے کا علم تو ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے اکابر کا حال جس تذکرہ میں عربی میں یا اُردو میں لکھا بہت مختصر لکھا۔ چونکہ خوانِ خلیل حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کی تالیف ہے اور حضرت حکیم الامۃ کی سوانح عمریاں مختصر و مطول ہند و پاک میں بہت سی لکھی جا چکی ہیں اور گو کمالات علمیہ اور عملیہ تو ان میں بھی نہ آئے۔ ان میں اشرف السوانح مؤلفہ محبی و مخلصی جناب الحاج خواجہ عزیز الحسن بہت ہی مکمل اور قابل اعتماد ہے کہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زمانۂ حیات میں لکھی گئی اور خود حضرت کی نظرِ ثانی دو حصوں پر ہوئی۔ اس کے بعد جتنی لکھی گئیں وہ سب اسی سے ماخوذ اور ان کا چربہ ہیں جو مختلف اہلِ ذوق نے اپنے ذوق کے موافق لکھی ہیں میرا ذوق جیسا کہ میں نے اُوپر لکھا نہایت مختصر تاریخی حالات لکھ دینے کا ہے اسی لحاظ سے اس مختصر مضمون میں خوانِ خلیل کے مصنف حضرت اقدس حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے مختصر تاریخی حالات لکھنے کا ہے۔

یہ تو مشہور ہے کہ آپ کی پیدائش ایک صاحب خدمت مجذوب حافظ غلام مرتضےٰ پانی پتی کی دُعا سے ہوئی۔ اس لئے کہ آپ کے والد صاحب نے مرض خارش سے تنگ آکر اطبّاء کے مشورے سے کوئی دوا قاطع النسل کھائی تھی جس کی وجہ سے اولاد کے پیدا ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ آپ کی نانی صاحبہ بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے اپنی لڑکی (یعنی آپ کی والدہ ماجدہ) کے لئے دُعا کرائی۔ ان مجذوب نے پیشین گوئی کی کہ اس لڑکی سے دو لڑکے پیدا ہوں گے۔ ایک میرا ہوگا جو مولوی، عالم، حافظ ہوگا۔ اس کا نام اشرف علی رکھنا اور دُوسرا دنیا دار ہوگا اس کا نام اکبر علی رکھنا۔ حضرت حکیم الامۃ فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کسی وقت اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں تو انہیں مجذوب صاحب کی روحانی توجّہ کا اثر ہے جن کی دُعا سے میں پیدا ہُوا ہوں کیونکہ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔

تاریخ ولادت

۵ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ کو بدھ کے دن صبحِ صادق کے وقت آپ کی ولادت ہوئی۔ تاریخی نام کرم عظیم ہے۔ دادھیالی نام عبد الغنی تجویز ہُوا اور نانیہالی اشرف علی، پھر اسی کو غلبہ ہُوا۔

حضرت کا تعلیمی دَور قرآن شریف سے ہُوا۔ چند پارے آپ نے کھتولی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے اخون جی سے پڑھے۔ پھر حافظ حسین علی صاحب جو دہلی کے رہنے والے تھے اور میرٹھ میں قیام تھا۔ آپ نے دس سال کی عُمر میں حفظ سے فراغت پائی تھی۔ فارسی کی تعلیم میرٹھ کے استاذوں سے حاصل کی اور پھر متوسطات تھانہ بھون میں حضرت مولانا فتح محمد صاحب سے پڑھیں۔ اور انتہائی کُتب فارسی ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادبِ فارسی کے استاد کامل تھے۔ اس کے بعد دیوبند تشریف لے گئے۔ عربی کی ابتدائی چند کتابیں مولانا

فتح محمد صاحب تھانوی سے پڑھیں اور فارسی کی چند کتابیں سکندر نامہ وغیرہ بھی دیوبند میں مولوی منفعت علی صاحب سے پڑھیں۔ دیوبند کا داخلہ آخری ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں ہے وہاں جاکر حضرت نے نور الانوار ملا حسن مشکوٰۃ شریف مختصر المعانی شروع کی اور پانچ سال تک مسلسل دار العلوم میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن دوران تعلیم میں حضرت کو خارش کا مرض لاحق ہوا جبکہ حضرت کی عمر اٹھارہ برس کی تھی چھٹی لے کر اپنے مکان تھانہ بھون تشریف لے گئے اور چونکہ طالب علمی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور خالی رہنا مشکل تھا اس لیے بطور شغل کے مثنوی زیر و بم تصنیف فرمائی جس کا پہلا شعر جو اس کی تمہید ہے یہ ہے ؎

ہمی گوید گرفتار درد و نالہ! نادان ہشتدہ سالہ!

۱۳۰۱ھ میں جب کہ حضرت کی عمر بیس سال کی تھی علوم ظاہریہ سے فراغت حاصل کی حضرت حکیم الامتؒ کی۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کی تائی صاحبہ نے فرمایا کہ بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کما کھائے گا اور بڑا عربی پڑھ رہا ہے اس کی گذر اوقات کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جائیداد وارثوں میں تقسیم ہو کر قابل گذارہ کے نہ رہے گی۔ یہ بات والد صاحب کو بہت ناگوار ہوئی اور باوجود اس کے کہ تائی صاحبہ کا بہت ادب کرتے تھے۔ یہ سن کر جوش آگیا اور کہنے لگے کہ بھابی صاحبہ یہ تم نے کیا کہا؟ خدا کی قسم! جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو ایسے ایسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے گا۔ یہ مقولہ نقل کر کے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ بات کوئی درویش کہتا تو اس کی بڑی کرامت سمجھی جاتی۔ لیکن والد صاحب تو دنیادار سمجھے جاتے تھے۔

دیوبندی دور کے اساتذہ کرام

(۱) حضرت اقدس نانوتوی قدس سرہٗ حضرت حکیم الامت نے ان سے کوئی سبق تو نہیں پڑھا لیکن درس جلالین میں شرکت کیا کرتے تھے۔

(۲) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول جو حضرت حاجی صاحب کے اکابر خلفاء میں شمار ہوتے تھے اور اسباق میں بھی علوم ظاہریہ کے ساتھ علوم باطنیہ سے بھی طلباء کو مستفید فرماتے تھے۔

(۳) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مدرس چہارم جبکہ حضرت حکیم الامتہ ۱۲۹۵ھ میں دیوبند میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ الہند کے پاس مختصر المعانی اور ملا حسن کے اسباق پڑھے حضرت حکیم الامت نے اپنی تعلیم کی تفصیل سبع سیارہ میں لکھی ہے۔ ان کے علاوہ حضرت کے اساتذہ میں مولانا سید احمد صاحب مدرس دوم اور ملا محمود صاحب مدرس سوم اور مولانا عبد العلی صاحب بھی تھے۔ ذکر محمود میں ہے کہ ابتداءً حاضری سے فراغ تک حضرت شیخ الہندؒ

کے پاس میرے اسباق ہے جن میں حمد اللہ میر زاہد رسالہ میر زاہد ملا جلال اور فقہ میں ہدایہ اخیرین اور حدیث کی متعدد کتب پڑھیں جن کی تفصیل سبع سیارہ رسالہ میں ہے اور قرأت کی مشق مکہ مکرمہ کی حاضری پر شیخ القراء قاری عبداللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے کی۔ اشرف السوانح میں تحریر ہے کہ جب مدرسہ صولتیہ کے بالائی حصہ پر قاری صاحب حضرت تھانویؒ کو مشق کراتے تو نیچے سے سُننے والے کو بسا اوقات استاد و شاگرد کی آواز میں اشتباہ ہوتا تھا۔

دارالعلوم سے فروغ پر آخر صفر ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کی صدر مدرسی پر بمشاہرہ پچیس روپے تشریف لے گئے۔ حضرت حکیم الامت فرمایا کرتے تھے کہ تعلیم کے زمانے میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ دس روپے تنخواہ ہی کافی سمجھا کرتا تھا، پانچ روپے اپنی ضرورت کے لئے اور پانچ روپے گھر والوں کی ضرورت کے لئے فیض عام میں تشریف لے جانے کے تین چار ماہ بعد مواعظ کی شہرت ہوئی تو اہلِ مدرسہ نے اس پر زور دیا کہ حضرت اپنے مواعظ میں مدرسہ کے لئے چندہ بھی کیا کریں جس کو حضرت نے قبول نہیں کیا اس پر اختلاف ہُوا اور حضرت استعفاء دے کر چلے آئے۔ مگر چونکہ اہلِ کانپور گرویدہ ہو چکے تھے اس لئے جب حضرت واپسی کے لئے اس نیت سے کہ پھر ادھر آنا ہو یا نہ ہو گنج مراد آباد حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت کے لئے پہنچے اور زیارت وغیرہ کے بعد دوبارہ کانپور سامان لینے کے لئے پہنچے تو حاجی عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے محلہ کی جامع مسجد محلہ ٹپکا پور میں ایک مدرسہ جامع العلوم کے نام سے تجویز کیا اور اس میں باصرار حضرت سے قیام کی درخواست کی۔ چنانچہ پچیس روپے پر حضرت نے وہاں قیام منظور فرما لیا اور جامع العلوم کے قیام کے دوران میں حضرت کو خیال ہُوا کہ تنخواہ لے کر دین کی خدمت گو جائز ہے لیکن جی اس کو پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے کچھ دنوں بعد دہلی جا کر حکیم عبدالمجید صاحب سے طب کی تعلیم شروع کی تاکہ گذر اوقات مطب سے ہو اور خدمتِ دین لوجہ اللہ تعالےٰ۔ لیکن حضرت کے دہلی جانے پر اہلِ کانپور مضطربانہ دہلی پہنچے اور واپسی پر اصرار کیا۔

دہلی کے دوران قیام میں حضرت کے ہم سبق جناب الحاج حکیم جمیل الدین صاحب نگینوی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ طب کا مشغلہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے کہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مطب کے ساتھ دین اور علم دین کی خدمت نہیں ہوتی۔ (از زکریا عفی عنہ۔ حضرت اقدس قطب الارشاد حضرت گنگوہی کا مشہور مقولہ ہے کہ جسے دُنیا سے کھونا ہو کسی خانقاہ میں بٹھا دو، اور علم دین سے کھونا ہو تو علم طب پڑھا دے اور دونوں سے کھونا ہو تو شاعری سکھا دے۔) حضرت حکیم الامت نے از خود استاد سے سبق چھوڑ کر واپس آنا خلاف ادب سمجھا اس لئے اہلِ کانپور سے کہا کہ تم استاد سے خود اجازت لو۔ ان کے اصرار پر حکیم عبدالمجید صاحب نے حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ

اگر تم ترقی کرنا نہیں چاہتے تو اجازت ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ نے ۱۵ روز دہلی میں قیام کے بعد کانپور مراجعت فرمائی۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کو جب مشغلۂ طب چھوڑ کر کانپور مراجعت کی اطلاع ہوئی تو حضرت نے بہت اظہارِ مسرت فرمایا اور فرمایا کہ طبابت کے شغل کو ترک کر کے کانپور آ کر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہو کر بیحد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات میں برکت فرماوے۔ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو بہت مستفیض فرمائے۔ میں نے آپ کو پہلے ہی مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے۔ دُنیا خود ہی اچھی صُورت میں خدمت کے لئے حاضر رہا کرے گی۔ بہر کیف آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیاء ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالے نے مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں پس اپنے مقصُود کا خوب خیال رکھنا چاہیئے۔

(مکتوبات امدادیہ ص۳ مورخہ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ)

طالب علمی کے آخری دور میں دیوبند کے قیام میں ایک مرتبہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی دیوبند تشریف آوری پر بیعت کی درخواست کی تھی۔ لیکن حضرت قطب عالم نے یہ کہہ کر کہ طالب علمی کے زمانہ میں شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا انکار فرما دیا تھا جس کو حضرت تھانوی نے دفع الوقتی پر محمول فرمایا جس کی تفصیل یادِ یاراں میں مذکور ہے لیکن اسی زمانہ میں ایک دُوسرے طالب علم کو حضرت نے بیعت فرما لیا جس سے حضرت تھانویؒ کو بہت قلق ہُوا اور ۱۲۹۹ھ میں حضرت قطب الارشاد گنگوہی قدس سرہٗ تیسرے حج کو تشریف لے گئے تو حضرت تھانوی نے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ہاتھ ہی دستی خط حضرت شیخ المشائخ مہاجر مکی کی خدمت میں لکھا کہ میں نے مولانا سے درخواست بیعت کی تھی مولانا نے انکار کر دیا جناب سفارش فرما دیں۔ اور اعلیٰ حضرت کی حضرت قطب عالم سے جو گفتگو ہوئی وہ تو معلوم نہیں لیکن حضرت تھانوی کے خط کا جو جواب حضرت شیخ المشائخ نے مرحمت فرمایا تھا اس میں بجائے سفارش کرنے کے خود ہی خط سے بیعت فرما لیا اور اس سے بہت قبل حضرت حاجی صاحبؒ نے حضرت حکیم الامت کے والد کو ایک خط لکھا تھا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر آنا حالانکہ حضرت شیخ العرب والعجم کو اس وقت حضرت تھانویؒ سے کوئی خصوصی تعارف بھی نہ تھا۔ خط سے بیعت کے بعد منجانب اللہ حاضری کی صُورت بھی پیدا ہُوئی وہ یہ کہ اس زمانے میں دیوبند میں کوئی کمپنی قائم ہوئی تھی جس میں فی صد پانچ سو روپے کا تھا اور ایک شخص کو ایک حصّہ سے زائد لینے کا حق نہ تھا مگر حضرت تھانویؒ کے والد صاحب نے اپنے تمول کی وجہ سے تین حصّے اس طرح لئے ایک اپنے نام سے دُوسرا حضرت تھانوی کے نام سے اور تیسرا حضرت کے چھوٹے بھائی منشی اکبر علی کے نام سے

اور کچھ عرصہ بعد بعض وجوہ سے اس رقم کو واپس لے لیا۔ اس پر حضرت تھانویؒ نے اپنے والد صاحب کو لکھا کہ جو رقم آپ نے میرے نام سے جمع کیا تھا اور اب واپس لے لیا وہ میری ملک ہے یا آپ کی؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا کہ اب تک تو میری ملک تھی اور مصلحتاً تمہارا نام لکھا تھا لیکن تمہاری ملک ہے۔ اس پر حضرت تھانوی نے لکھا اب تو اس رقم کی زکوٰۃ بھی مجھ پر واجب ہے اور اس کی وجہ سے مجھ پر حج بھی فرض ہو گیا۔ والد صاحب نے زکوٰۃ کی رقم تو نقد بھیج دی اور حج کے متعلق لکھا کہ میں تمہاری چھوٹی بہن یعنی والدہ ماجدہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی (شیخ الاسلام پاکستان) کے نکاح سے فارغ ہو جاؤں تو آئندہ سال حج کے لئے جاؤں گا۔ اس وقت تم بھی ساتھ چلنا حضرت تھانویؒ نے لکھا (اگرچہ والد کا ادب بھی بہت کرتے تھے اور ڈرتے بھی بہت تھے) آپ مجھے یہ لکھ دیجئے کہ تو آئندہ سال تک زندہ رہے گا۔ اس پر والد صاحب نے لکھا کہ یہ میں کیسے لکھ سکتا ہوں تو حضرت تھانوی نے لکھا کہ پھر حج کو کیسے مؤخر کر سکتا ہوں۔ اس پر والد صاحب نے بہت ہی عجلت کی حالت میں شوال ۱۳۰۱ھ میں نہایت عجلت میں اپنی صاحبزادی کا کھڑے کھڑے نکاح پڑھ دیا اور شادی کی تقریبات سے فراغت بھی نہیں ہوئی تھی کہ حضرت تھانوی کے ساتھ حج کو روانہ ہو گئے۔ جب کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو کانپور کی ملازمت کو چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس سال دریا میں طُغیانی بہت شدت سے تھی۔ راستہ میں والد صاحب کے دوستوں نے بھی طغیانی سے ڈرایا۔ مگر والد صاحب نے فرمایا کہ اب تو ارادہ کر لیا ہے۔ واقعی سمندر میں بہت زیادہ طُغیانی تھی اور حضرت کا جہاز حیدری نام بہت چھوٹا جہاز تھا جو طُغیانی کا تحمل نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی ادھر جُھکتا کبھی ادھر موج کا پانی جہاز کے اُوپر کو گذرتا اور سب سامان کو بھگو دیتا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہایت عافیت کے ساتھ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ جب اوّل بار بیت اللہ پر نظر پڑی ہے تو اس طرح کیفیت انجذابیہ شوقیہ ہوئی کہ پھر عمر بھر کبھی نہیں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت مہاجر مکیؒ کو بھی حضرت کی حاضری پر نہایت مسرّت ہوئی اور ارشاد فرمایا کہ تم چھ ماہ میرے پاس رہ جاؤ لیکن والد نے مفارقت گوارہ نہ کی تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ اب تو والد کی اطاعت کرو پھر کبھی موقعہ ہُوا تو چھ ماہ آ کر رہ جانا۔ اس سفر میں تجدید بیعت دست بدست بھی بھی ہو گئی اور حضرت حکیم الامت کے والد بھی اسی سفر میں مشرف بہ بیعت ہوئے باوجود اعلیٰ حضرت کی خواہش کے والد صاحب نے مفارقت گوارہ نہ کی۔ اس لئے واپس آنا پڑا۔ لیکن باوجودیکہ حجاز سے واپسی پر جامع العلوم کانپور میں درس و تدریس کا سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن دن بدن طبیعت پر علوم باطنی کی طرف میلان بڑھتا رہا اور ۱۳۱۴ھ میں ذکر و شغل کی طرف جب زیادہ میلان بڑھ گیا تو حاجی صاحب سے ترک ملازمت کی اجازت چاہی لیکن

حاجی صاحب نے منظور نہیں فرمایا جو مفصل تو مکتوبات امدادیہ میں ہے اور مختصر اشرف السوانح میں ص۱۷۳ پر فارسی میں بھی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

" ذوق و شوق کے حالات سے ترقی کا اندازہ ہوا۔ البتہ ملازمت کا ترک تعلق مناسب نہیں کہ یہ تجردانہ زندگی کے مناسب ہے۔ اہل و عیال کو مضطرب چھوڑنا عاقبت اندیشی ہے۔ یہ والانامہ ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ کا ہے اسی ذوق و شوق میں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے عرائض بار بار لکھے اور چونکہ ۱۳۰۵ھ میں والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے اجازت کا مسئلہ بھی نہ تھا۔ سنہ ۱۳۱۰ھ کے آخر میں حج کے لئے روانہ ہوئے اور اعلیٰ حضرت کی تمنا کہ چھ ماہ میرے پاس رہو کو پورا کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں جانے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ایسے منظور نظر بنے کہ لوگوں کو رشک ہی نہیں حسد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت خود فرمایا کرتے تھے کہ میں یہ چاہا کرتا تھا کہ حضرت میرے اوپر سب کے سامنے اتنی شفقت نہ فرمایا کریں تو اچھا ہے آخر میں حضرت تھانویؒ کو حاسدین سے اتنا اندیشہ ہو گیا تھا کہ پورے چھ ماہ کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ہفتہ عشرہ پہلے ہی تشریف لے آئے کہ ابھی تو میں حضرت کے یہاں مقبول ہوں آئندہ کہیں لگائی بجھائی کرنے والے حاسدین حضرت کو میری طرف سے مکدر نہ کر دیں۔ اس لئے انشراح کی حالت میں ہی رخصت ہو جانا چاہیے اور اسی سفر میں اعلیٰ حضرت کی طرف سے اجازت بیعت بھی حاصل ہو گئی۔ واپسی پر اپنے شغلۂ علمیہ میں مشغول رہے۔ اسی دوران میں حضرت کے ماموں پیر جی امداد علی جو عرصے سے حیدر آباد میں مقیم تھے اور نہایت مغلوب الحال والمقال حیدر آباد سے واپسی میں کانپور کو قصداً اس تمنا میں گذرے کہ بھانجے کو بھی جن کا شہرہ سُن رہے تھے ملاقات کروں۔ وہ کانپور میں آکر سرائے میں ٹھہرے اور حضرت کو اطلاع دی کہ اگر تم اپنی وضع کے خلاف نہ سمجھو تو مجھ سے سرائے میں آکر مل جاؤ۔ حضرت ملنے تشریف لے گئے اور باصرار اپنے مکان پر لے آئے۔ ماموں صاحب نے فرمایا بھی کہ میاں تم عالم باعمل ہو مجھے اپنے یہاں نہ لے جاؤ کہ دیکھنے والے یہ کہیں کہ کس لُچّے کو لے آئے۔ مگر حضرت کے اصرار پر پیر صاحب مع اپنے سازوں سامان کے جس میں آلات سماع بھی تھے مکان پر آگئے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ماموں صاحب میں اتنی سوزش تھی کہ کلمات سے آگ سی نکلا کرتی تھی جس پر حضرت تھانویؒ کو ایک کشش پیدا ہوا کہ جس طرح بھی ہو ان سے عشق کی آگ مل جائے اور بے اختیار ماموں صاحب کی طرف رجوع کر لیا۔ حضرت تھانویؒ کا یہ رجوع دوسری مرتبہ تھا پہلی مرتبہ سفر حج ثانی سنہ ۱۳۱۰ھ یہ سفر اجازت بیعت سے پہلے کا ہے۔ اس کا بیان اشرف السوانح ص۲۱۵ پر ہے بعض حضرت تھانویؒ کے سوانح لکھنے والوں نے دونوں کو خلط کر دیا۔ اسی دوسرے رجوع پر حضرت گنگوہی قدس سرہ

کی وہ خط وکتابت ہے جو تذکرۃ الرشید میں مفصل موجود ہے۔ حضرت تھانویؒ کے اس رجوع پر حضرت گنگوہیؒ نے مولانا منور علی صاحب کے واسطے سے حضرت تھانویؒ سے شکوہ کیا۔ جس کا مختصر ذکر یاد ایام میں بھی ہے۔ اشرف السوانح میں تو یہ قصہ بہت مختصر ہے اور خط کی طرف صرف اشارہ ہے۔ لیکن تذکرۃ الرشید ص۱۱۳ جلد اوّل پر یہ تذکرہ حضرت گنگوہیؒ و حضرت تھانویؒ کی مکرر سہ کرر مراسلت کے ذیل میں مذکور ہے۔ البتہ اشرف السوانح کی ترتیب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہنگامہ حضرت تھانویؒ کے دوسرے سفر حج اور اجازت سے قبل کا ہے۔ لیکن تذکرۃ الرشید میں ان خطوط پر پر جو تاریخیں درج ہیں اُن میں حضرت تھانویؒ کے سب سے پہلے خط پر ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۱۴ھ ہے۔ اور حضرت گنگوہیؒ کے جواب پر ۵ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ ہے۔ اسی طرح حضرت تھانویؒ کا دُوسرا عریضہ ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ کا ہے اور حضرت گنگوہیؒ کا جواب ۵ محرم الحرام کا ہے اور تیسرا عریضہ حضرت تھانوی کا ۸ محرم ۱۳۱۵ھ کا ہے اور اس پر حضرت گنگوہیؒ کا جواب ۱۲ محرم ۱۳۱۵ھ کا ہے۔

اس کے بعد بھی کئی مکاتبتیں ہیں۔ آخری مکاتبت میں حضرت تھانویؒ کا رجوع اور حضرت گنگوہیؒ کا اس پر تشکر ہے جو بہت طویل خط وکتابت ہے جو تذکرۃ الرشید میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن اس ناکارہ زکریا کے خیال میں ۱۱ھ میں مکہ مکرمہ سے واپسی پر اعلیٰ حضرت نے جو دو وصیتیں فرمائی تھیں میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا اور کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو تو پھر دُوسری جگہ تعلق نہ کرنا (اشرف السوانح ص۲۰۴) توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔ اس سفر حج سے واپسی کے بعد سے حضرت کا توکل کا میلان تو بڑھتا ہی گیا۔ حضرت تھانویؒ کا خود ارشاد ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت سے واپسی کے بعد ایک سال کے قریب میں نے وعظ نہیں کہا لوگ بہت اصرار کرتے تھے مگر مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی کہ ایسے خراب شخص سے کیوں وعظ کہلاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بہت اصرار کیا تو میں رونے لگا۔ اس کے بعد اصرار نہیں ہوا۔

(حسن العزیز جلد اوّل ملفوظ ص۳۰۶ ۔ ص۱۶۴)

اس دوران میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے ترک ملازمت کی دو مرتبہ اجازت بھی چاہی جو مجھے تذکرۃ الرشید میں یاد ہے مگر حضرت گنگوہیؒ نے دونوں مرتبہ ہی اجازت نہیں فرمائی اور تیسری مرتبہ حضرت تھانویؒ نے ترک ملازمت کے بعد یہ لکھا کہ حضرت مجھ سے تحمل نہیں ہوا میں چھوڑ کر چلا آیا تو حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دعائیں دیں۔ میرے والد صاحب حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاتب خطوط نے پہلے دو خطوں پر بھی بہت سفارش کی کہ اللہ کا نام ایک شخص توکلاً علی اللہ بلا معاوضہ سکھانے کا ارادہ کرتا ہے تو حضرت کیوں منع فرماتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا کہ جو میں کہتا ہوں لکھو دو اور

تیسرے جب حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے بہت دعائیں دی تو میرے والد صاحب نے پھر عرض کیا کہ پہلے دو خطوں میں تو حضرت نے یہ لکھوایا تھا اور اب اظہار مسرت کیا تو حضرت نے فرمایا کہ آدمی مشورہ جب کیا کرتا ہے جب تردد ہو۔ اور جب تک تردد ہو توکل ٹھیک نہیں۔ یہ قصہ میں نے بڑی تفصیل سے اپنے والد صاحب سے بھی سُنا تھا اور تذکرۃ الرشید میں بھی یاد ہے مگر اس وقت مراجعت دشوار ہے۔ بہرحال حضرت حکیم الامت اوائل ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک ملازمت کرکے تھانہ بھون تشریف لائے جس کی تفصیل اشرف السوانح صفحہ ۲۲۹ پر ہے۔ تھانہ بھون تشریف آوری کے بعد حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ پر کچھ قرضہ ہُوا جس کی دعا کے لئے اعلیٰ حضرت کو مکہ مکرمہ اور قطب الارشاد کو گنگوہ لکھا۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا جواب تو یہ آیا کہ آپ کی استقامت اور توکل میں کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ مختصر مکتوب ۳۴ ۱۰ر رجب ۱۳۱۵ھ اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے تحریر فرمایا کہ اگر کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لئے مدرسی کی تحریک کردوں اس پر حضرت تھانویؒ نے عرض کیا کہ میرا تو عرض کرنے کا مقصد صرف دُعا ہے۔ باقی حضرت حاجی صاحب نے بعد ترک تعلق کانپور کہیں اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرما دی ہے لیکن اگر حضرت کی بھی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ صُورت تجویز فرما دی ہے۔ یہ سن کر حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فوراً گھبرائے ہوئے سے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں، اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ میں دُعا کروں گا کہ اللہ تعالیٰ قرض سے سُبکدوش فرمائے۔ چنانچہ دونوں حضرات کی دعا کی برکت سے قرضہ سے جلدی سُبکدوشی ہوگئی اور پھر بفضلہ تعالیٰ کبھی تنگی نہیں ہوئی۔ (اشرف السوانح صفحہ ۲۳۵)

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دو نکاح ہوئے۔ پہلا طالب علمی کے دوران میں جس کو حضرت تھانویؒ نے یادیاراں میں اس طرح تحریر فرمایا ہے کہ جب احقر کا گنگوہ میں نکاح ہُوا غالباً ۱۲۹۶ھ تھا والد صاحب مرحوم کی درخواست پر شیخ غلام محی الدین مرحوم رئیس اعظم چھاؤنی میرٹھ کہ والد مرحوم ان کی ریاست میں مختار تھے۔ والد صاحب کی درخواست پر انہوں نے نکاح میں شرکت کی۔ نکاح حضرت گنگوہیؒ نے پڑھا تھا۔ جب حضرت قدس سرہٗ مجلس نکاح سے واپس ہو گئے تو شیخ صاحب بھی ساتھ ساتھ چلے گئے۔ شیخ صاحب نے خود مجھ سے ایک دفعہ کہا کہ میں نے بہت سے بزرگ دیکھے بڑے بڑے حکام سے ملا لیکن جو رعب و ہیبت حضرت کی دیکھی وہ کسی میں نہیں دیکھی یہ حالت تھی کہ بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ ان کی یہ شہادت ایک باوقعت شہادت تھی الخ۔

دُوسرا نکاح اپنی ہمشیر زادہ مولانا سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ برادر بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب شیخ الاسلام

پاکستان کی بیوہ سے ہُوا۔ یہ نکاح وسط رمضان سنہ ۳۳ھ میں ابتداءً وکالت کے ذریعہ سے ہُوا تھا لیکن ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے حضرت نور اللہ مرقدہ کو ایک طلاق دینی پڑی اور اس پر اہلیہ اولیٰ نے خود کیرانہ جا کر سب سب کو از سر نو راضی کر کے اور حضرت کو بُلا کر تجدید نکاح کی۔ اس میں بھی بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں۔ حضرت حضرت قدس سرہٗ نے اس سلسلہ میں ایک مستقل رسالہ بھی الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ تحریر فرمایا۔ وصال کے وقت دونوں اہلیہ حیات تھیں۔ بڑی اہلیہ محترمہ کا چند سال بعد تھانہ بھون میں انتقال ہو چکا۔ دوسری اہلیہ محترمہ تقسیم ہند کے بعد اپنے داماد مفتی جمیل احمد صاحب مُفتی جامعہ اشرفیہ کے ساتھ لاہور تشریف لے گئیں جو اس رسالہ کی تالیف تک بقیدِ حیات ہیں۔

حضرت حکیم الامت اصلاح و رشد و ہدایت کے ساتھ خانقاہ امدادیہ کی زینت بنے رہے اور سلسلہ علالت تو کچھ دنوں پہلے سے شروع ہو گیا تھا اور بڑی اہلیہ کی اجازت سے اہلیہ محترمہ صغریٰ کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ علالت زور پکڑتی رہی مختلف علاج تجویز ہوتے رہے کہ ۱۵ رجب المرجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء یوم دوشنبہ کی صبح ہی سے حضرت فرمانے لگے کہ آج ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ظہر کے بعد سے سوء تنفس پیدا ہو گیا فرمایا کہ اتنی تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی۔ لیکن بجائے کراہنے کے لفظ "اللہ" درد کے ساتھ زبان سے نکلتا تھا اور دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب میں ساڑھے دس بجے وصال ہُوا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ مولانا شبیر علی صاحب برادر زادہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جن کو حضرت قدس سرہٗ نے گویا متبنیٰ بھی بنا رکھا تھا پیر کی صبح کو سہارنپور دوائیں لینے کے لئے آئے ہوئے تھے، حضرت قدس سرہٗ نے بار بار اُن کو طلب کیا کہ کچھ معاملات فرمانا چاہتے تھے مگر مولانا شبیر علی صاحب مرحوم وصال کے بعد پہنچے اور اُن ہی کی تجویز سے تدفین صبح کے بعد قرار پائی۔ منگل کی صبح نماز سے پہلے سہارنپور آدمی پہنچ گیا۔ اور بھی قرب و جوار میں بجلی کی طرح سے اطلاعیں پہنچ گئیں۔ یہ ناکارہ تو خبر سنتے ہی فوراً اسٹیشن روانہ ہو گیا اور عین گاڑی کی روانگی کے وقت بلکہ چلتی گاڑی میں سوار ہو گیا اور دس بجے کے قریب تھانہ بھون حاضر ہو گیا۔ لیکن گاڑی کوئی اور تھانہ بھون جانے والی نہیں تھی اس لئے اہل شہر کی مساعی سے تھانہ بھون کے لئے دو اسپیشل یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ پہلا اسپیشل تو ۱۲ بجے کے بعد جب کہ جنازہ عیدگاہ میں تدفین کے لئے لایا جا چکا تھا، پہنچ گیا تھا اور کچھ لوگ جو جلال آباد کے اسٹیشن سے اتر کر پاپیادہ تھانہ بھون بھاگ گئے تھے وہ تو نماز میں بھی شریک ہو گئے اور جو اسپیشل ہی میں گئے وہ دفن میں

تو شریک ہو گئے مگر جنازہ میں شریک نہ ہو سکے لیکن دوسرا اسپیشل تدفین کے بعد پہنچا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئی الی اجل مسمی کل من علیہا فان
یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

۲۹ ذوالقعدہ ۱۳۹۱ھ دوشنبہ

پاکستان کا
نمبر 1 بائیسکل
سہراب
SOHRAB
انعام یافتہ
انٹرنیشنل ایشیا ایوارڈ
پاکستان سائیکل انڈسٹریل کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ
نیشنل ہاؤس، ۲۷ شاہراہ قائداعظم لاہور (پاکستان)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

قدس اللہ سرہ العزیز

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی۔ لکھنؤ بھارت

* * *

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسم گرامی، احترام و عقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا ان کی کتاب بہشتی زیور کا گھر گھر چلن تھا اور ان خاندانوں میں جو بدعات و رسوم سے دور تھے وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی۔ غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا۔ خاندان کے ان بزرگوں اور اہل علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتویٰ سمجھا جاتا تھا ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ خاندان کے اکثر بزرگوں کے شیخ و مرشد تھے اور خود بھائی صاحب انہیں سے بیعت اور ان کی محبت و عقیدت سے سرشار تھے، سیاسی خیالات میں بھی خاندان و ماحول کا رجحان مولانا ہی کے مسلک کی طرف تھا لیکن اس سے مولانا تھانوی کی عظمت و عقیدت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ مولانا تھانوی کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ان سے مراسم و تعلقات تھے ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری اور مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے تھے اور پکارتے تھے مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے انہوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شاید ہی چند حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا۔ وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا اور اس عقیدت و احترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے میرا علمی و ذہنی نشو و نما اس زمانہ میں ہوا کہ مولانا تھانوی نے سفر کا سلسلہ بالکل موقوف فرما دیا

تھا اس لئے اگست ۱۹۳۸ء سے پیشتر جب وہ عرصہ دراز کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور پورا چلّہ یہاں قیام فرمایا۔ زیارت و ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی البتہ مکاتبت کا شرف اس سے کئی سال پیشتر حاصل ہو چکا تھا ۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا کہ بھائی صاحب نے جو میری دینی و اخلاقی تربیت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے مجھے ہدایت کی واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کر کے واپس ہوں۔ ان کو تھانہ بھون کے آداب اور حاضری کے قواعد و ضوابط کا بھی علم تھا اس لئے انہوں نے میری رہنمائی فرمائی۔ اور ہدایت کی کہ میں خط میں اپنا تعارف بھی کرا دوں اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھ دوں نیز جن حضرات سے مجھے تلمذ یا استرشاد کا تعلق ہے ان کے ناموں کی وضاحت بھی کرا دوں اس لئے کہ مولانا اس صفائی اور اظہار کو بہت پسند فرماتے تھے اور اخفاء و توریہ اور تکلفات سے ان کو اذیت ہوتی تھی میں نے ان ہدایات پر پورا عمل کیا اور لاہور سے ایک عریضہ ارسالِ خدمت کیا جس میں اپنا تعارف بھی کرایا کہ مجھے معلوم تھا کہ حضرت میرے والد ماجد سے اچھی طرح واقف ہیں اپنے اساتذہ اور جن حضرات سے بیعت و تربیت کا تعلق تھا ان کا بھی تذکرہ کیا۔ ندوہ اور مولانا مدنی سے انتساب و تعلق کا بھی اظہار کیا یہ بھی لکھا کہ ایک ہفتہ قیام کی نیت ہے اور مقصد بھی زیارت و شرف ملاقات ہے مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ اس خط کا جواب عنایت فرمایا۔ حسبِ معمول خط کے حاشیہ پر مختلف فقروں اور مندرجات کا مختصر جواب تحریر فرمایا۔ حاضری کی اجازت طلبی پر تحریر فرمایا کہ سر آنکھوں پر تشریف لائیں لیکن صرف ملاقات کی نیت سے نہ اعتقاداً نہ انتقاداً ظاہراً۔ میں نے جن بزرگوں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا اس پر تحریر فرمایا کہ صفائی سے دل خوش ہوا۔ پھر بعض بزرگوں کے طرز سے خود بھی اپنے اختلاف کا ذکر کیا ———

حاضری کی اجازت طلب کرنے پر دوبارہ ارشاد ہوا۔ کہ میرے لئے فخر ہے اگر میرے حالات اس فخر میں مانع نہ ہوں ورنہ مشتاق نہ کہ ملول (کما قال السعدی) اس وقت تک بھائی صاحب کی بھی ملاقات مولانا سے نہیں ہوئی تھی، مولانا ان کا تذکرہ غائبانہ سنتے رہتے تھے لیکن میرے نام سے بھی غالباً واقف نہ تھے اور کوئی وجہ بھی اس واقفیت کی نہ تھی اس لئے آخر میں مستقل یہ دلچسپ عبادت تحریر فرمائی کہ

مکرمی دام لطفکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اتنی تکلیف اور دیتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے بھائی ہیں۔ یا آپ ہی کے

دو نام ہیں۔"

اس سرفراز نامہ کا جواب میں نے لاہور ہی سے طالب علمانہ انداز میں دیا اور بلاضرورت یہ تحریر کیا کہ میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے کہ ایک سعادت مند کے لیے صلۂ رحم و تعلق سے مانع نہیں، گویا اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اور اس اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے استدلال اور حجت سے کام لیا۔ مولانا کی طبیعت کی نزاکت اور ذکاوت کے جو قصے مشہور تھے اور جو واقعات تھانہ بھون کے منتسبین اور آنے جانے والوں کی زبانی سنتے تھے ان کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ ایک نو عمر اور کم علم طالب علم کی جسارت اور دخل در معقولات، طبیعت پر بہت گراں گزرے گی۔ اور اس عریضہ کا جواب یہ آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا۔ غالباً اس خط کے لکھنے کے بعد میرا قیام لاہور زیادہ نہیں رہا اور میں جلد لکھنؤ واپس آگیا، شاید اس اندیشہ سے کہ اس خط کا جواب نہیں آئے گا۔ یا اپنی بے خیالی اور ضوابط کی ناواقفیت سے میں نے اس میں جوابی کارڈ نہ رکھا۔ لیکن میری حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب مولانا نے اس عریضہ کے جواب کے لئے خلاف معمول اہتمام فرمایا اور تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر خود لفافہ بنایا اس پر اپنے دستِ مبارک سے لکھنؤ کا پتہ لکھا اور مستقل ایک مکتوب لکھ کر اس کے اندر رکھا اور مولوی محمد احسن صاحب کاکوروی مالک انوار المطابع کو جو لکھنؤ آرہے تھے حوالہ فرمایا کہ مجھے پہنچا دیں، پہلے پتہ کی عبارت پڑھیئے، پھر مکتوب ملاحظہ کیجیے۔

مشفق مکرم مولوی علی ابوالحسن صاحب سلمہٗ
بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب سلمہٗ ۳۷ امین آباد لکھنؤ
مرسلہ اشرف علی از تھانہ بھون۔

از اشرف علی عفی عنہ۔

بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

فرحت نامہ پہنچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ ہٰذہ المحبۃ۔ آپ کے صدق و خلوص ا مت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعۃً آپ سے بے تکلف ہوگئی۔ اس لئے آپ سے کسی امر کا

اخفا نہیں چاہتا۔ اس کے تحت میں اتنا اور عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ کا اختلاف اس وقت تک آپ کو علمی اور اجمالی ہی معلوم ہے، کیونکہ ان کو دیکھا ہے مجھ کو نہیں دیکھا، مجھ کو دیکھنے کے بعد اس اختلاف کا علم تفصیلی ہوگا۔ اور علم سے متجاوز ہو کر جذبات و اخلاق کے متعلق بھی اس وقت مجھ کو توقع ہے کہ میرے ساتھ جو حسن ظن ہے اس بارے قلب ہلکا ہو جاوے گا جس سے راحت ہوگی۔

والغیب عند اللہ

حضرتؒ[1] خلیفہ صاحب کے پیام و سلام سے ان کی یاد تازہ ہوئی اللہ تعالیٰ ان کی برکات میں تضاعف فرماوے باقی آپ کیلئے دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے

اللّٰھم کن لنا واجعلنا لک ، والسلام

اس گرامی نامہ پر ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کی تاریخ ہے، جو ۱۴ جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ۔

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

لیکن اس کے بعد بھی تھانہ بھون حاضری کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ تھانہ بھون خود لکھنؤ آگیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں مژدۂ جانفزا سننے میں آیا، کہ حضرتؒ بغرضِ علاج لکھنؤ تشریف لا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اپنے اس علاج کے پردہ میں کتنے بیمار دلوں کا علاج ہوا اور شہر کے ایک مرکزی مقام (مولوی گنج) میں ایک مولوی (مدرسہ کا اصطلاحی مولوی نہیں بلکہ جس معنی میں مولانا جامی نے مولانا روم کے متعلق کہا تھا "مثنوی مولوی معنوی" اور کسی عارف نے کہا تھا "مولوی ہرگز نشد مولائے روم") روحانی مطب کھولنے والا ہے جس کے حاضرباشوں میں بڑے بڑے علماء و مشائخ اور عمائد شہر ہوں گے۔ غرض اگست ۳۸ء میں مولانا لکھنؤ تشریف لائے، اپنے قدیم مسترشد اور مجاز صحبت مولوی محمد حسن کاکوروی مالک انوار المطابع اور نبیرہ مولانا محسن کاکوروی کے مکان پر قیام فرمایا علاج شفاء الملک حکیم محمد عبد الحمید صاحب (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ کا تھا۔ قیام پورے چالیس دن رہا۔ وہ مدت جس کو یوں بھی سلوک و تربیت اور خانقاہوں کے نظام سے خاص مناسبت ہے ظہر اور عصر کے درمیان مخصوص لوگوں کو حاضری کی اجازت تھی۔ ضابطہ یہ تھا کہ یا تو مولانا ذاتی طور پر آنے والوں سے واقف ہوں

---

[1] یعنی خلیفہ غلام محمد صاحب دین پوریؒ

یا حاضرین مجلس میں سے کوئی معتبر آدمی اس سے واقف ہو۔

تاکہ کوئی نامناسب اور اذیت پہنچانے والی بات پیش نہ آئے۔ مولانا کی اس غیر متوقع آمد کی خبر تمام احتیاطوں کے باوجود بجلی کی طرح تمام اطراف و اکناف بالخصوص مشرقی اضلاع میں پہنچ گئی جو مدت دراز سے آپ کی آمد سے محروم و مایوس تھے، خاص ضوابط و شرائط کے ساتھ اہل تعلق کو آنے کی اجازت دی گئی۔ اور خلفاء و مسترشدین کلکتہ سے امرتسر و لاہور تک کے مختلف وقتوں میں حاضر ہوتے رہے عمائد شہر کی بھی ایک تعداد زیارت سے مشرف اور مجالس سے مستفید ہوئی ان میں علماء، فرنگی محل اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، اور شہر کے دینی ذوق رکھنے والے رؤساء و عمائد بھی تھے، مولانا عصر کی نماز مسجد خواص میں جو آپ کی تشریف آوری اور روزانہ کی مجالس کی وجہ سے حقیقی معنی میں مسجد خواص بن گئی تھی ادا فرماتے تھے۔ نماز کے بعد مسجد کے شمالی مغربی گوشہ میں مجلس ہوتی۔ مولانا خطوط کے جوابات بھی دیتے رہتے اور لوگوں سے مخاطب بھی ہوتے، اس مجلس میں سلوک و تصوف کے نکات، اصلاحی و علمی تحقیقات اور بزرگوں کے حالات و واقعات ارشاد فرماتے، بزرگوں کے واقعات بیان کرتے وقت خاص کیف و اثر محسوس ہوتا، اس وقت چیدہ چیدہ لوگ ہوتے اور مولانا کو بھی بڑا انبساط و انشراح ہوتا۔ بھائی صاحب مرحوم اس مجلس نیز عصر سے پیشتر کی مجلس میں جو قیام گاہ پر ہوتی۔ بڑی پابندی سے شرکت کرتے، ایسا معلوم ہوتا۔ کہ کوئی طالب علم مدرسہ میں حاضری کی پابندی کر رہا ہے، مولانا بھی خصوصی شفقت و التفات فرماتے۔ علاج کے بارے میں کبھی کبھی مشورہ میں شریک کرتے یہ ناچیز بھی تقریباً روزانہ ہی بھائی صاحب کے ساتھ حاضری دیتا۔

اس عاجز کی طرف بھی مولانا کی خصوصی توجہ کا ایک محرک یہ پیدا ہوا۔ کہ اسی زمانہ میں "القول المنشور" کی طباعت ہو رہی تھی جو اصلاً مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی تصنیف ہے۔ لیکن اس میں مولانا کی تحقیقات و اضافے بھی ہیں۔ مولانا کو اس کی طباعت و اشاعت کا بڑا اہتمام تھا۔ اس میں بکثرت طویل عربی کی عبارتیں بھی آئی ہیں۔ خدا وصی صاحب بلگرامی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کر دیا۔ مجھے اس میں جہاں اشکال و مراجعت کی ضرورت پیش آتی، عصر کے پیشتر کی مجلس میں مولانا کے سامنے پیش کر دیتا اور مولانا اس کو حل فرما دیتے۔ اس دوران قیام میں ۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک بھائی صاحب سے ان کے مکان پر آنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، اس سے زیادہ عزت و مسرت کی بات کیا ہو سکتی تھی مولانا

رفقاء وخدام کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکان پر تشریف لائے دیر تک سرفراز فرمایا، حضرت حاجی صاحب اور بزرگوں کے حالات کا سلسلہ وہاں بھی شروع ہوگیا۔

تین برس کے بعد دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی۔ اس مرتبہ بھی ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام رہا تقریباً وہی معمولات ونظام الاوقات رہا، اس طرح پھر ان روح پرور اور پرکیف مجالس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۳۹ء میں میری کتاب "سیرت سید احمد شہید" شائع ہوئی، میں نے تو اس کے بھیجنے کی جرأت نہیں کی لیکن میری بے خبری میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس کو ایک دوسری کتاب کے ساتھ جو ان کو بہت پسند تھی ایک صاحب تعلق کے ذریعہ مولانا کی خدمت میں اس تصریح کے ساتھ بھیجی کہ اگر حضرت کو کچھ گرانی ہو تو اس کو بلا تکلف واپس فرما سکتے ہیں، مولانا نے یہ ہدیہ قبول کیا۔ دوسری کتاب اسی وقت کسی اور صاحب کو دیدی اور "سیرت" خود اپنے مطالعہ کیلئے رکھ لی اس کے جواب اور شکریہ میں مولانا منظور صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کی اس رعایت پر مسرت وانبساط کا اظہار بھی فرمایا اور سیرت کے متعلق اپنے تاثرات بھی تحریر فرمائے یہ مکتوب یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے مولانا کے مزاج ومذاق اور اصلی جذبات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

از ناکارہ وآوارہ اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرم بندہ دام فضلہم

اسلام علیکم، کل کے روز صحیفۂ عنایت مع دو رسالہ ہدیہ پہنچ کر منت بخش ومسرت افزا ہوئے، بسر وچشم قبول کیے۔ اور آپ کی اس ادا نے زیادہ فریفتہ کر دیا کہ آپ نے میرے اس اصول کو اپنے جذبات پر ترجیح دے کر قبول سے عذر کر دینے کی بھی اجازت دیدی چونکہ میرے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرات مخلصین کی اطاعت کو فخر وسعادت سمجھتا ہوں لہٰذا ان کے قبول میں بھی میرے اصول محفوظ ہیں ایک میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اخفاء نہیں کرتا چنانچہ اس ہدیہ سے خصوصاً سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے ایک مسرت کا دوسرے خجلت کا۔ وہ خجلت کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں ہے، لہٰذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی جائیں، جو ان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو، اب دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بزرگوں کا اتباع نصیب فرمائے والسلام

بالآخر وہ دن بھی آگیا کہ تھانہ بھون حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور جس جگہ کے قصے آنے جانے والوں سے برسوں سے سننے میں آرہے تھے اس کو بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کہتے ہیں کہ پھول شاخ گل پر اور چمن کے اندر ہی اپنی صحیح شکل و صورت میں نظر آتا ہے۔ غالباً ۱۹۴۲ء اور مئی یا جون کا مہینہ تھا اتنا یاد ہے کہ خوب گرمی تھی، لو چل رہی تھی۔ میں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا جو شاہدرہ سے سہارنپور تک جاتی تھی اور جس میں وہ سب خانقاہیں و قصبات پڑتے تھے جن سے بزرگان دیوبند کی تاریخ وابستہ ہے، یعنی کاندھلہ، تھانہ بھون، نانوتہ اور رام پور منہیاران، اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلے سے قصد تھا یا اثنائے سفر میں یہ خیال ہوا کہ تھانہ بھون بھی حاضری دی جائے۔ نظام کچھ ایسا تھا کہ کاندھلہ مولانا کے ساتھ قیام کر کے جو ان کا وطن تھا رام پور منہیاران جانا تھا تھانہ بھون، کاندھلہ اور رام پور کے درمیان واقع ہے میں نے مولانا سے اجازت لی کہ میں ایک روز پیشتر کاندھلہ سے روانہ ہو جاؤں اور ۲۴ گھنٹہ تھانہ بھون قیام کر کے اسی گاڑی پر سوار ہو جاؤں جس سے مولانا رام پور تشریف لے جائیں گے، مولانا خود تھانہ بھون کے عقیدت مندوں میں تھے اور مولانا تھانوی کو اپنے مشائخ کی صف ہی میں سمجھتے تھے یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بڑی بشاشت و مسرت کے ساتھ اجازت دی تھانہ بھون کے ایک صاحب تعلق تھانہ بھون جا رہے تھے میں نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط لکھ کر ان کے حوالے کرنا چاہا کہ وہ خود پیش کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ضابطہ کے خلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اس کو پوسٹ بکس میں ڈال دیں انہوں نے اس کو منظور کیا۔ میں ایک روز کاندھلہ ٹھہر کر تھانہ بھون روانہ ہوا ٹھیک دوپہر کو گاڑی تھانہ بھون پہنچتی تھی۔ خانقاہ امدادیہ کا اسٹیشن سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے میں ایک حمال کو ساتھ لے کر پیدل خانقاہ پہنچ گیا تھا۔ تھانہ بھون کے قواعد و ضوابط اور آداب کے متعلق اتنا سن رکھا تھا اور دار و گیر و احتساب کے واقعات بھی اتنے کان میں پڑ چکے تھے کہ ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں قدم رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہو رہا ہے گرمی اور دوپہر کی وجہ سے وہاں سناٹا تھا، مقیمین خانقاہ اپنے اپنے حجروں میں آرام کر رہے تھے۔ میں ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی۔ مولانا تشریف لائے۔ وضو فرمایا۔ میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کی اس سہ دری میں جو جانب جنوب واقع ہے اور مولانا کی نشست گاہ رہتی تھی، مجلس شروع ہوئی چیدہ چیدہ حضرات اور خواص تھے جن میں خواجہ عزیز الحسن

مجذوب کو میں پہچانتا تھا۔ میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا۔ سہ دری میں قدم رکھتے ہی میری نظر اس ڈیسک پر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی اور جس پر خطوط اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ان ہی کاغذات اور سامان میں سیرت سید احمد شہیدؒ جس کو چھپے ہوئے تین سال سے زائد ہو چکے تھے سامنے رکھی تھی۔ معلوم نہیں مولانا نے میری دل جوئی اور مجھے مانوس کرنے کے لئے اس کو اسی دن نکالا تھا۔ یا وہ عام طور پر اسی جگہ رہتی تھی اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کے لئے موجود ہے۔ اس کی موجودگی سے اجنبیت کے حساس میں بڑی کمی ہوئی۔ مولانا کے خطوط جواب دینے میں مصروف تھے چند منٹ کے بعد خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خواجہ صاحب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے، آئے نہیں۔ اب میں نے خاموش رہنا نامناسب سمجھا، آگے بڑھا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں فرمایا کہ آپ نے بتایا نہیں، آئیے، مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا میں نے عرض کیا، حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا۔ خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا۔ مکرر کئی لفظ فرمائے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ میں نے تو آج آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کر لیا تھا، تا کہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔ یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا جو اس نوعمر و گمنام آنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر مزاج پرسی کے بعد بڑی شفقت سے فرمایا کہ کوئی اور رفیق تو ساتھ نہیں کھانے میں کیا معمول ہے، کوئی پرہیز تو نہیں؟ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت اپنا ہی مہمان رکھیں گے یہ بھی عام روایات اور تجربات کے خلاف تھا اور مہمان کے ساتھ بڑی خصوصیت و شفقت میرے عرض کرنے پر کہ کوئی پرہیز نہیں ہے، معذرت فرمائی کہ میں آج کل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ساتھ نہیں کھا سکوں گا۔ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں، پھر فرمایا قیام کتنا رہے گا۔ میں نے عرض کیا کہ اگلے روز دوپہر کو جانا ہے فرمایا بس اتنا مختصر قیام پھر فرمایا کہ میں اپنے دوستوں سے زیادہ قیام کے لئے اصرار نہیں کرتا کہ گرانی کا باعث نہ ہو اور شاید جو حضرات اتنا وقت بھی دیتے ہوں ان کو آنے میں پس و پیش ہو، اس کے بعد مجلسی گفتگو شروع ہوئی، زیادہ تر واقعات خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحب کے تھے۔

رات کھانا حضرت کے دولت خانہ سے آیا، کھانے میں اہتمام اور تنوع تھا، صبح نماز فجر کے بعد خواجہ

صاحب حضرت کا پیغام لائے کہ فلاں وقت میری خصوصی مجلس کا ہے۔ جس میں مخصوص احباب کو شرکت کی اجازت ہے لیکن اگر ضرورت ہو تو میں اس سے بھی الگ وقت دے سکتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خصوصی بات عرض کرنی نہیں ہے، زیارت و استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اسی خصوصی مجلس میں حاضر ہو جاؤں گا۔ تقریباً چاشت کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دو ہی چار حضرات تھے ان میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجھے یاد ہیں، حضرت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب میرا جال لے آئیے۔ خواجہ صاحب تعمیل ارشاد میں اٹھ تو گئے۔ مگر سمجھے نہیں، آپ نے فرمایا خواجہ صاحب سمجھے کہ میرا جال کیا ہے؟ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نہیں، فرمایا کہ تسبیح، یہی ہم لوگوں کا جال ہے جس سے ہم لوگوں کو پھانستے ہیں۔ مجلس میں اول سے آخر تک بڑا انبساط رہا خشونت تو الگ رہی، کسی درجہ کی خشکی —— کہیں آس پاس نہ تھی۔ خندہ جبینی، شگفتہ بیانی، زندہ دلی اور نکتہ سنجی مجلس کو باغ و بہار بنا دیتی تھی۔ تھانہ بھون کے متعلق جو تصور قائم ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے مگر استثناءات بھی، بکثرت طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لئے احتساب اور مواخذہ تھا مگر زائرین اور کبھی کبھی کے آنے والوں کے لئے نیز ان لوگوں کے لئے جن کا تعلق مستقل اصلاح و تربیت کا نہیں تھا۔

رعایت —— یہ بھی اندازہ ہوا کہ خانقاہ کا سارا ماحول حضرت کے مزاج اور مذاق اور حضرت کی جامعیت اور حکمت کے سو فیصدی مطابق نہیں تھا اور وہ مولانا کی پوری نمائندگی اور اپنے زبان حال سے ترجمانی نہیں کرتا تھا اور شاید اس شہرت عام میں جو تھانہ بھون کی دار و گیر اور رعب و جلال کے متعلق ملک میں پھیلی ہوئی تھی ان ضابطہ پرستوں کی بے لچک پابندیوں کو بہت دخل تھا۔ اپنا ہی تجربہ لکھتا ہوں کہ مولانا کی مجلس سے فارغ ہونے کے بعد گاڑی کے جانے میں بہت دیر تھی خالی اور بیکار بیٹھنے کی عادت نہیں، طالب علمی کا پرانا مرض، خانقاہ میں شمالی حصہ میں ایک مدرسہ بھی تھا، ایک عالم کوئی کتاب پڑھا رہے تھے میں بھی جا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ مدرس صاحب نے ایک طالب علم کو اشارہ کیا۔ دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی۔ جس پر لکھا تھا۔ کہ جس وقت کوئی استاد سبق پڑھا رہا ہو تو باہر کے آئے ہوئے کوئی صاحب وہاں نہ بیٹھیں وہ تختی لائے اور مجھے دکھایا، میں شرمندہ ہو کر اٹھ گیا۔ اسی طرح میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کتب خانہ کس وقت کھلے گا؟ انہوں نے بجائے خود جواب دینے کے کہا کہ تختی پر اوقات لکھے ہوئے ہیں، پڑھ لیجئے۔ غالباً یہی لفظی پابندی اور ضابطہ پرستی بہت سے اجنبی لوگوں کے لئے وحشت

کا سبب بنتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مولانا ان ضوابط پر حاکم تھے۔ محکوم نہ تھے، واضع تھے مقلد نہ تھے وہ جہاں چاہتے اور جس کیلئے چاہتے ضابطہ کو بالائے طاق رکھ دیتے اور اسی کو اس وقت کا ضابطہ سمجھتے۔

اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت، معنوی اور علمی استفادہ اور محبت و عقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا۔ بھائی صاحب سے کبھی کبھی مراسلات ہوتی۔ ایک مرتبہ حضرت نے ندوہ کے کتب خانہ سے بعض کتابیں مطالعہ کے لئے طلب فرمائیں اور ان کے بحفاظت واپس پہنچنے کے لئے اور بھیجنے والے پر کسی قسم کا بار نہ پڑنے کا اہتمام فرمایا۔ یہ مولانا کا مزاج بن گیا تھا اور جس کی رعایت و نگہداشت میں وہ اپنے اقران و اماثل میں بھی بہت ممتاز تھے۔

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا محمد الیاس صاحب لکھنؤ تشریف لائے اور اس کی وجہ سے شہر میں ایک خاص برکت و رونق اور دینی و ایمانی فضاء پیدا ہو گئی۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی دوسرے روز تشریف لائے ایک بڑی تبلیغی جماعت بھی آئی ہوئی تھی ہم سب لوگ اسی دینی دعوت اور تبلیغی نقل و حرکت میں معروف و مسرور تھے کہ اچانک یہ جاں گداز اور روح فرسا خبر سنی کہ ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو تھانہ بھون کا یہ آفتاب علم و ارشاد غروب ہو گیا۔ حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی بھی ٹھیک ان ہی دنوں میں لکھنؤ تشریف لائے۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ خبر راستہ میں سنی یا لکھنؤ آکر، لیکن ان کی بیقراری اور رنج و قلق دیکھنے کا تھا، اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے شیخ سے کیسا گہرا تعلق تھا کسے معلوم تھا کہ اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب بھی اس جہان فانی سے رحلت فرمائیں گے اور ہندوستان ان دو جلیل القدر ہستیوں سے محروم ہو جائے گا۔ کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

* * *

یہ آپس میں کس قدر قریب تھے

حضرت تھانویؒ اور حضرت مدنیؒ

دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اور صدر مدرس

حضرت مولانا حافظ ریاض احمد صاحب اشرفیؒ

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ بندہ آغاز جوانی میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوا تھا۔ اچانک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے برادر زادہ (جو خانقاہ کے حضرت کی طرف سے منصرم و مہتمم ہونے کے ساتھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اکثر امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں مختارِ عام کا درجہ رکھتے تھے) حاضر ہوئے اور یوں عرض کیا "حضرت وہ آگئے" حضرت وہ مولوی حسین احمد" (حسین احمد مدنیؒ) ٹانڈوی یا فیض آبادی کہا یہ صحیح یاد نہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے ٹھہراؤ اور اطمینان سے فرمایا۔ کیا تم اپنے مولانا حسین احمد دے بند (دیوبند) والوں کی بات کر رہا ہے؟ اس پر مولوی شبیر علی صاحب نے اثبات میں جواب عرض کیا۔ تو حضرت تھانویؒ نے بڑے اور سرتاسر محبت و شفقت کے انداز کے حامل گھبراہٹ آمیز لہجہ میں فرمایا۔ "کہاں! کدھر؟" اتنے میں حضرت مدنیؒ تشریف لے آئے۔ حضرت تھانویؒ اٹھ کر بڑے تپاک اور مجسم اخلاص بنے حضرت مدنیؒ کے استقبال کے لیے بڑھے اور بغلگیر ہوئے۔ بندہ نے اپنی آنکھوں سے جو منظر دیکھا وہ آج چالیس بھیانک سال بیت جانے کے بعد بھی یوں ہے جیسے ابھی ابھی ان سطور کے رقم کرتے میرے سامنے ہی پیش آیا ہے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دست بوسی فرمائی۔ اور حضرت تھانویؒ اشتیاق و شفقت بھری آنکھوں سے حضرت مدنیؒ کی طرف دیکھتے رہے۔ جب حضرت مدنیؒ کا یہ عمل ختم ہوا تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دوبارہ گلے لگایا اور حضرت مدنیؒ کا کندھا، پیشانی چوم کر ان کا ہاتھ اپنے سینے پر لگایا۔ اور پھر واپس اپنی نشست پر تشریف لائے اور حضرت مدنیؒ کو اپنے ساتھ سجادہ پر بٹھائے

حکم فرمایا۔ حضرت مدنیؒ سجادہ سے ہٹ کر بیٹھنا چاہتے تھے لیکن حضرتؒ نے اپنی مبارک زبان سے فرمایا کہ میرا حکم ہے کہ آپ میرے ساتھ ہی سجادہ پر بیٹھیں۔ حضرت مدنیؒ نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔

حضرت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے شکایتاً فرمایا کہ آپ نے بہت زیادتی کی کہ آمد کی پہلے سے اطلاع نہیں کی، بندہ شرمندہ ہے کہ آپ کی آمد کے لیے سواری کا بندوبست کرنے سے قاصر رہا۔ یا جیسے بھی حالات ہوتے۔ کم از کم کچھ عزیزوں کو استقبال کے لیے بھیج دیتا۔ اس پر شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "حضرت اپنے گھر میں بھی کوئی اطلاع کرتا ہے۔ اپنے گھر میں تو ہمیشہ بغیر اجازت اور بغیر اطلاع ہی کے آنا ہوتا ہے۔" اس پر حضرت تھانویؒ کے چہرہ کی سرخی۔ آنکھوں کی چمک اور شفقت آمیز لہجہ میں یہ کہنے کی لذت حقیقی طور پر صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو وہاں موجود تھا اور یا وہ جو ان دونوں مسلم مشائخ کا گرویدہ اور دلدادہ ہو۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "بلاشک و شبہ آپ کی بات درست ہے اور بندہ تو ہمیشہ سے آپ کو اپنے استاد حضرت مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) قدس سرہ کا قائم مقام اور جانشین سمجھتا ہے۔" یہ منظر قلم۔ اور گفتگو میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس منظر کشی بندہ سے ممکن ہی نہیں۔ البتہ آج تک اس کی حلاوت آمیز لذت اپنے دل و دماغ میں اسی طرح محسوس کرتا ہوں جس طرح چالیس سال قبل کی تھی۔

اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنیؒ سے کھانے کے متعلق دریافت فرمایا۔ تو حضرت مدنیؒ نے بالکل بے تکلفی اور اپنائیت کے لہجہ میں شلجم کے آنچار (اچار شلجم) اور روٹی کی فرمائش کی۔ حضرت تھانویؒ نے مولانا شبیر علی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا ان الفاظ کی تقدیم تاخیر یاد نہیں رہی غالباً اسی طرح فرمایا تھا کہ "بڑے گھر سے آنچار، روٹی۔ اور چھوٹے گھر سے لسی لے آؤ۔"

چنانچہ کچھ دیر کے بعد غالباً ایک گھنٹہ بعد سب کچھ آ گیا۔ میرے اور دوسرے خدام کے دل اس پر للچا رہے تھے کہ شیخین کا پس خوردہ ہمیں بھی اگر مل جائے تو ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ ہوگا۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نظام اور ضوابط کے تحت کسی کو لب کشائی اور اس قسم کی کیا۔ بلکہ ہر قسم کی درخواست بلا اجازت قبل از وقت جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن قربان جائیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس مسجد کے عاکف اور جانشین شیخ الہندؒ کے اخلاق عالیہ کے۔ انہوں نے خود ہی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو یہ روٹی اور آنچار لیکر ان دو تین "طفیلیوں" کو دے دیا جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں اجازت کی ضرورت ہے؟ آپ نے جب سے اپنا گھر فرمایا ہے تو یہ سب آپ

کا ہے میری جانب سے کوئی اعتراض نہیں" تو اس پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے صرف اس بنا پر اجازت کے لیے عرض کیا ہے کہ "مہمان کھانے کا مالک نہیں ہوتا اسے اس میں تصرف کا اختیار نہیں اسے صرف کھانے کا اختیار ہے اور بقایا میزبان کی ملکیت ہے۔"

حضرت تھانویؒ اس پر مسکرائے اور خوشدلی سے اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ چنانچہ بندہ کو مع، دوسرے دو خدام کے بلوایا گیا اور یہ تبرک ہمیں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمایا۔ اور پھر یہ بھی ہمیں بتایا جو اُوپر عرض کیا گیا۔

جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے رخصت چاہی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے بڑے گھر سے بڑی عمدہ ململ کی دستار منگوائی اور حضرت مدنیؒ کو عطا فرمائی۔ حضرت مدنیؒ نے وہ دستار اپنے سر پر رکھ کر اس درخواست کے ساتھ واپس فرمادی کہ حضرت! آپ کے علم میں ہے کہ بندہ نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر رکھا ہے اس لیے بندہ استعمال کرنے سے مجبور ہے۔ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح معذرت فرمائی کہ یہ بھی صرف دیکھنے اور محسوس کرنے سے متعلق ہے۔ کہنے اور لکھنے میں وہ تاثرات نہیں دیئے جا سکتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "بھائی معاف کرنا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ مجھے یہ بات مطلقاً دھیان ہی میں نہیں رہی مجھ سے سہو ہو گیا۔"

چنانچہ وہ پگڑی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر مولانا شبیر علی رحمۃ اللہ علیہ کو واپس کر دی گئی۔ اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ "بڑے گھر سے کھدر کی پگڑی لے آؤ۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کھدر کی پگڑی عنایت فرمائی۔ تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا سر مبارک آگے کر کے عرض کیا۔ حضرت آپ خود ہی باندھ دیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دستِ مبارک سے ہی حضرت مدنیؒ کے سر پر پگڑی لپیٹ دی۔ اور دو روپے ہدیہ بھی دیئے جو حضرت مدنیؒ نے بڑے ادب کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے لیے اور انہیں اپنی پگڑی کے ایک حصے میں باندھ کر سر میں دبا لیا۔ اس کے بعد حضرت تھانویؒ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے باہر تک تشریف لائے اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بار بار اصرار پر واپس تشریف لے آئے۔

اس کے بعد پاکستان بن گیا اور نیشلسٹ مسلمانوں اور لیگی مسلمانوں کے باہمی چپقلش نے خود دیوبندی مسلک کے پیروکار مسلمانوں میں دو دھڑے کر دیئے اور سرزمین پنجاب میں بالخصوص انتہا پسندی کا جذبہ

عام ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

چنانچہ اسی جذبہ کے تحت میرے بعض دوستوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں مسلم لیگ سے اپنے اختلاف کے سبب نہایت نازیبا اور مکروہ کلمات کہنے شروع کئے۔ جن کا مجھے بے حد صدمہ ہوتا۔ بندہ نے اسی صدمہ کے سبب حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہ العزیز کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ جس کے جواب میں حضرت اقدس نے جو جواب ارشاد فرمایا اس کے کچھ اقتباسات بھی پیش خدمت ہیں۔ یہ مکتوب گرامی مکتوبات شیخ الاسلام حصہ دوم کے صفحہ ۲۹۷ پر بھی درج ہے۔

"حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں ...... بہت عالم باعمل اور صوفی کامل جانتا ہوں"

"حضرت تھانوی مرحوم کی شان میں نہ میں گستاخی کرتا ہوں۔ اور نہ کسی کی گستاخی کو روا رکھتا ہوں"

"مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ .... بہت بڑے موحد۔ خدا پرست تھے۔ تصوف میں ان کا قدم بہت راسخ تھا۔"

یہ خط ربیع الاول-۱۳۷ھ میں تحریر فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس خط کو بھی آج تقریباً اٹھائیس سال ہونے کو ہیں۔ یہ تھا وہ تعلق اور للّٰہیت جس نے بندہ کو حضرت تھانوی اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہما کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ اللّٰھم اغفر لھما وارحمھما وارفع درجتھما واحشرنا معھما تحت لواء نبینا وحبیبنا علیہ الف الف التحیۃ والثناء"

* * *

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت مصنف

محترم پروفیسر لطیف اللہ صاحب۔ کراچی

اسلام حکمت و معرفت کا دین ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معلم کتاب و حکمت ہیں۔ آپؐ نے نزول وحی کے آغاز ہی التزام فرمایا کہ جو کچھ اللہ جل شانہ کی جانب سے نازل فرمایا جا رہا ہے۔ اسے محفوظ کر دیا جائے چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں تمام قرآن بصورت کتاب مدون و محفوظ ہو چکا تھا۔

حضور اکرم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ مبارک عمل گویا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے ترغیب و تشویق کی ایک صورت تھی کہ آپ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد علم و معرفت کی روشنی کو اکناف عالم میں پہنچایا جائے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو لوگوں تک پہنچاؤ، بہ طیب خاطر قبول کیا اور بجا آوری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ خود حضور انور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ میں کتابت قرآن کے ساتھ ساتھ آپ کی احادیث شریفہ کی حفاظت و تدوین بھی جاری رہی۔ یہاں جمع و تدوین قرآن اور حفاظت و تدوین حدیث کی تاریخی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے، محض ایک تناظر پیش کرنا اور اس تناظر میں بعض حقائق کی جانب توجہ دلانا مطلوب ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشفقانہ ترغیب و تشویق کا نتیجہ تھا کہ ابھی ہجرت کے سو سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ اسلامی دنیا میں محدثین، مفسرین، فقہا اور اصحاب سیر و مغازی کی ایک معتدبہ تعداد معرض وجود میں آ چکی تھی جو تصنیف و تالیف کے ذریعے شریعت کے ظاہر کو سنوارنے میں مشغول و مصروف تھی۔ ان ہی ارباب اخلاص کے دوش بدوش زہاد و عباد کی جماعت تھی۔ جو شریعت کے قالب

کا پوری طرح احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے قلب کو جمالِ احسان[۱] سے آراستہ کرنے کے طریقوں کی نشاندہی کر رہی تھی اور جسے دوسری صدی میں شناخت و امتیاز کے لئے صوفیہ کہا گیا۔ یہ سب حضرات دین کی حفاظت و اشاعت میں ہمہ تن مصروف رہے اور الحمد للہ یہ روایت بہر طور آج بھی جاری و ساری ہے۔

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ان ہی اُمناء و محافظین روایت میں ہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم لدنیہ سے ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں نفوس کو منفعت اور استقامت حاصل ہوئی ان کی تصانیف لطیف میں اگر ایک جانب حقائق و معارف کا عالم بے حجاب نظر آتا ہے تو دوسری جانب مطالعہ کرنے والے کی ذات میں محاسبۂ نفس کی صلاحیت بالیدہ ہوتی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تصانیف میں فکر کا کمال اور ذکر کا جمال دونوں مجتمع ہو گئے ہیں۔ یہ اوصاف تصنیف و تالیف کی دنیا میں مستثنیات سے ہیں۔

احقر راقم میں سرے ہی سے یہ صلاحیت نہیں ہے کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تصانیف میں جو حقائق و معارف ہیں ان کی تشریح و توضیح کرے البتہ شریک سعادت ہونے کے خیال سے چند امور پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہے شاید کسی درجے میں ناظرین کے پسند خاطر ہوں۔

کسی مصنف اور مولف کا پہلا وصف یہ ہے کہ اس نے تصنیف کے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے وہ بصیرت افروز اور عبرت انگیز ہو۔ دوسرا وصف یہ کہ ترتیب مطالب میں سلیقے سے کام لیا گیا ہو۔ تیسرا وصف یہ ہونا چاہئے کہ مصنف کا طرز بیان اور اسلوب تحریر موضوع سے ہم آہنگ ہو۔ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تمام تصنیفات و تالیفات میں مذکورہ اوصاف و محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات گرامی اور تصانیف اہل علم میں محبوب و مقبول ہیں۔ حضرت علیہ الرحمۃ کے اسلوب بیان کی خوبیوں کی مثالیں مناسب مقام پر پیش کی جائیں گی سردست علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے فرمودات سے استفادہ کرتے ہوئے حضرت کی تصانیف کے موضوعات اور ان کے تنوع کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

یہ مقالہ مرشدی و مولائی ڈاکٹر مولانا غلام محمد دامت فیوضہم کی تصنیف "حیات اشرف" مطبوعہ کراچی

---

[۱] اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ حضرتؐ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی ایسی طرح عبادت کرے جیسے کہ اس کو دیکھ رہا ہو سو اگر اس طرح کا دیکھنا تجھ سے نہ ہو سکے تو یوں جان کہ وہی تجھ کو دیکھتا ہے۔

(بخاری و مسلم عن عمر فاروق رضی اللہ عنہ شارق الانوار ۱۳۷۵ھ کراچی ص ۳)

۱۹۴۳ء میں بعنوان "حکیم الامت کے آثار علمیہ" شامل ہے۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف النوع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔" [1]

علمی و دینی تصانیف کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ تجوید و قرآت و متعلقات قرآنی (ط) تصانیف

۲۔ ترجمہ و تفسیر قرآن

(ا)۔ سلیس و با محاورہ ترجمہ قرآن حکیم

(ب)۔ تفسیر بیان القرآن

(ج)۔ اصلاح ترجمہ دہلویہ (ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمے کے اغلاط کی نشاندہی)

(د)۔ اصلاح ترجمہ حیرت (مرزا حیرت دہلوی کے ترجمے کی اصلاح)

(ہ)۔ الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان (تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کے مولف کی درخواست پر تالیف کے نقائص کی نشاندہی)

(و)۔ رفع البناء فی نفع السماء (یہ ایک سوال کا جواب ہے جس میں آسمان کے فائدے بیان فرمائے ہیں۔

(ز)۔ احسن الاثاث فی نظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلاث (سورۂ بقرہ کی تین آیتوں کی تفسیر پر نظر ثانی فرمائی)

(ح)۔ اعمال قرآنی، (قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص کو بیان فرمایا ہے)

(ط)۔ خواص فرقانی، (اس کا موضوع بھی وہی ہے جو اعمال قرآنی کا ہے)

۳۔ علوم القرآن:۔ (ا) سبق الغایات فی نسخ الآیات (قرآن پاک کے آیات و سور کے ربط و نظم کو بیان فرمایا ہے)

(ب)۔ اشرف البیان لما فی علوم الحدیث و القرآن (چند مواعظ سے آیات و احادیث کے متعلق لطیف نکات اور تحقیق کو جمع کیا گیا ہے)

(ج)۔ دلائل القرآن علی مسائل النعمان (کتاب کے عنوان ہی سے موضوع ظاہر ہے۔ یہ تصنیف مکمل نہ ہو سکی)

---

[1] حیات اشرف ص ۱۱۲

(د) تصویر المقطعات لیسر بعض العبارات (تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو مجمل اور مغلق بیان ہے بزبان عربی اس کی تسہیل فرمائی ہے)

(ہ) ۔ مسائل السلوک من کلام ملک الملوک (قرآن حکیم سے سلوک و طریقت کے مسائل مستنبط کئے ہیں)

(و) ۔ تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقہ (〃 〃 〃 〃 〃)

۴ ۔ علم الحدیث :۔ (ا) حقیقۃ الطریقہ ۔ (تین سو تینتیس احادیث سے جو صحاح میں مذکور ہیں سلوک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا ہے)

(ب) ۔ التشرف ۔ (چار حصے ہیں۔ حصہ اول "احیاء العلوم" کی احادیث کی تخریج ہے۔ حصہ دوم "کلید مثنوی" میں درج احادیث کی تخریج ہے۔ حصہ سوم و چہارم، حافظ سیوطیؒ کی "جامع صغیر" سے سلوک کے مسائل کا استنباط ہے)

(ج) ۔ جامع الآثار ۔ (فقہ حنفی پر حضرات اہل حدیث کے اعتراضات کا جواب احادیث کی سند پر دیا گیا)

(د) ۔ تابع الآثار ۔ (یہ جامع الآثار کا ضمیمہ ہے)

(ہ) ۔ احیاء السنن ۔ (احادیث کا مجموعہ جس کی ترتیب ابواب فقیہہ پر رکھی)

(و) ۔ الاستدراک الحسن ۔ ("احیاء السنن" پر نظر ثانی کر کے "الاستدراک الحسن" کے نام سے شائع کیا)

(ز) ۔ اعلاء السنن ۔ ("احیاء السنن" کا بدلا ہوا نام ۔ اس کی بارہ جلدیں شائع ہوئیں)

(ح) ۔ الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرمایا)

(ط) ۔ الخطبات الاحکام ۔ (جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبات کا مجموعہ تالیف فرمایا)

(ی) ۔ مناجات مقبول قربات عند اللہ و صلوات الرسول (احادیث میں وارد اوراد، اذکار مسنونہ کا مجموعہ)

۵ ۔ علوم الفقہ :۔ (ا) ۔ حوادث الفتاوی ۔ (زمانے کے نئے مسائل اور نئے موضوعات سے متعلق فتاوی کا مجموعہ)

(ب) ۔ بہشتی زیور ۔ (مستورات کی ضروریات سے متعلق ہے لیکن تمام ابواب فقیہہ کے مسائل درج ہیں)

(ج) ۔ ترجیح الراجح ۔ (ان فقہی مسائل کو جمع فرمایا ہے جن میں بیان کردہ مسائل پر مزید تحقیق فرما کر رجوع کیا ہے ۔ یہ تصنیف حضرتؒ کی انصاف پسندی اور بے نفسی کا عظیم شاہکار ہے)

(د)۔ فتاویٰ اشرفیہ۔ (مسائل دینیہ کو تین حصوں پر منقسم فرما کر شائع کیا۔

(ہ)۔ بہشتی گوہر۔ (بہشتی زیور کے سلسلے کا مردانہ حصہ ہے۔ اس کے علاوہ عام مسائل بھی ہیں)

۶۔ **علم الکلام** :- (ا)۔ المصالح العقلیہ الاحکام النقلیہ (تین حصوں میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم بیان فرمائے ہیں۔)

(ب)۔ الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ (جدید تعلیم یافتہ حضرات کے مذہبی خدشوں کا جواب)

(ج)۔ اشرف الجواب (〃 〃 〃 〃 〃 〃)

۷۔ **علم سلوک و تصوف** :- (ا) قصد السبیل۔ (فن سلوک پر مختصر مگر جامع رسالہ ہے)

(ب)۔ مسائل السلوک من کلام ملک الملوک (اس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔)

(ج)۔ تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقہ۔ (〃 〃 〃 〃 〃 〃)

(د)۔ حقیقۃ الطریقہ من سنۃ الانیقہ۔ (اس کا ذکر التشرف کے سلسلے میں ہو چکا ہے)

(ہ)۔ التکشف عن مہمات التصوف۔ (فن سلوک پر پانچ حصوں میں تصنیف فرمائی)

(و)۔ کلید مثنوی۔ (مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے تطبیق فرمائی)

(ز)۔ عرفان حافظ۔ (حافظ شیرازیؒ کی بعض غزلیات کی تشریح)

(ح)۔ تربیت السالک۔ (سالکین کی تعلیم و تربیت نیز مشکلات کے پیش نظر تصنیف کی)

(ط)۔ تنبیہ الہالک۔ (〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃)

(ی)۔ ملفوظات۔ (ساٹھ مجلدات و رسائل پر مشتمل ہے)

۸۔ **اصلاحیات** :- حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اصلاحیات کے موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جن کی غرض و غایت یہ تھی کہ امتداد زمانہ اور ہندوؤں کے ساتھ صدیوں خلط ملط ہونے کے باعث مسلمانوں میں غیر اسلامی طور طریق پیدا ہو گئے تھے اور شرک و بدعات نے دینی و مذہبی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مسلم معاشرے میں شادی و غمی کے موقعہ پر بے ہودہ رسول، بدعات کا چلن اور فضول خرچی کی روش نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی تھی۔ علاوہ ازیں درگاہوں اور خانقاہوں میں سالانہ عرسوں نے میلوں اور تہواروں کی شکل میں مفاسد کی راہ کھول دی تھی نام نہاد جاہل صوفیوں اور دین سے بیگانہ سجادہ نشینوں نے سلوک و طریقت کی روح کو مسخ کر دیا تھا۔ مزارات پر مرد اور عورت گانے والے شعوری یا لاشعوری طور

پروگرام، اور بدکاری پھیلانے میں شریک تھے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر حکیم الامت نے بہت ہی سہل اور آسان زبان میں، اصلاح رسوم، حصول علم اور فلاح نسواں کے موضوع پر متعدد کتابیں تحریر فرمائیں نیز مختلف مقامات پر تشریف لے جا کر معاشرے میں پیدا ہونے والے مفاسد کی نشاندہی کی۔ یہ مواعظ جن کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے شائع ہو چکے ہیں۔ اصلاحیات کے موضوع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف علاوہ مواعظ مذکورہ کے یہ ہیں۔

(ا)۔ حیواۃ المسلمین۔ (قرآن حکیم اور احادیث شریفہ کی روشنی میں مسلمانوں کو زندگی بسر کرنے کا سلیقہ بتایا)

(ب)۔ اصلاح الرسوم۔ (نام ہی سے موضوع ظاہر ہے)

(ج)۔ اصلاح امت۔

(د)۔ صلاح انقلاب امت۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیفات، ملفوظات اور مواعظ کے موضوعات پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر آشکار ہو جاتی ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی میں ایک عظیم مصنف کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کی تصنیفات کے موضوعات گوناگوں اور اسلامی علوم کے تمام شعبوں پر محیط ہیں، لیکن جو خاص پہلو حضرت ممدوح کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ وہ شریعت کے اعمال ظاہری سے باطن کی طہارت اور روحانی جمال کے اکتساب کا نصب العین ہے۔ اس اعتبار سے مولانا تھانوی قدس سرہٗ علماء و صلحاء امت کے نظام کہکشاں میں ایک نو پیدا سیارے کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی تابندگی نے سارے نظام کہکشاں منور نہ کیا ہو لیکن آس پاس کی تمام فضا کو یقیناً تابندہ کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام غزالی، امام قشیری، عبد الوہاب شعرانی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی رحمہم اللہ علیہم کے بعد لکھنے والوں میں شریعت و طریقت کی جو جامعیت حکیم الامتؒ کے ہاں محسوس ہوتی ہے ایسی جامعیت کسی مصنف کی تحریر میں نظر نہیں آتی۔ اس اساس پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی صدی کے مجدد بھی ہیں اور عارف کامل بھی۔

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو بحیثیت مصنف ایک اور اختصاص بھی حاصل ہے اور حضرت کی نفسیاتی بصیرت ہے۔ اس خصوص میں مواعظ و ملفوظات کے علاوہ "تربیت السالک" ایک ایسی تصنیف ہے جو تمام امراض روحانی کے علاج کے لئے کافی ہے۔ جس طرح جسمانی عوارض کے مریضوں کے لئے معالج کی شفقت اور

توجہ جلد صحت یابی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے بعینہٖ حضرت تھانویؒ کی بے پناہ شفقت اور پیار قاری کو ظلمات وساوس سے نکال کر نور رجا میں لے آتی ہے اور وہ بے یقینی کی یبوست سے خلاصی پا کر نفس میں از سر نو تازگی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اب تک جن امور پر گفتگو کی گئی وہ ایسے امور ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں اکابرین امت میں مشترک خیال کئے جاسکتے ہیں اور

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے مصداق مختلف دواعی اور استعدادات کے لوگوں کو ذوق و وجدان بہم پہنچاتے ہیں لیکن بہ حیثیت مصنف ایک ایسی خصوصیت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ میں قطعی انفرادی ہے اور جس کی جانب سب سے پہلے اشارہ حسن عسکری مرحوم نے کیا۔

نہ جاننے والے نہ جانتے ہوں، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ پروفیسر حسن عسکری اردو تنقید میں ایک بے باک اور بے لاگ نقاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیف "جدیدیت" جس میں روایت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس پایے کی تصنیف ہے کہ اس نے روایت کے مخالفوں میں روایت کو جنم دے دیا ہے۔ اب ہر جدیدیت پسند دانشور ادیب کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ "جدیدیت" کے رد کو اپنا مذہب بنائے۔ ان ہی حسن عسکری نے اپنے ایک مقالے میں جس کا عنوان "اردو ادب کی روایت - چند تصریحات" "حکیم الامت قدس سرہٗ کو مستند ادبی نقاد تسلیم کیا ہے۔ اس مقالے کا ایک اقتباس نذر ناظرین ہے۔ یہ اقتباس اگرچہ طویل ہے لیکن قطعی واضح اور ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے۔

"حضرت مولانا تھانوی کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا تھا۔ اس کی بنیاد بھی یہی ہے اگر میں حضرت کو ادبی نقاد کہوں تو یہ ان کی شان میں گستاخی ہوگی۔ مگر ان کا کمال یہ ہے کہ شعر و ادب کی تعلیم بھی ان کی کتابوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ رائے ظاہر کرنے سے پہلے میں نے سو صفحے کے اقتباسات ان کی چند کتابوں سے نقل کر کے تیار کر لئے تھے۔ یہ اقتباس بھی تین طرح کے ہیں پہلے تو وہ رائیں ہیں جو حضرات نے براہ راست کسی شاعر یا شعر کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ دوسرے وہ بیانات ہیں جن سے کسی ایسے مضمون کی تشریح ہوتی ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں بار بار آتا ہے۔ تیسرے وہ بیانات ہیں جن کا بظاہر تو ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر جن سے ادبی اصولوں کا استخراج ہوسکتا ہے۔ یہ انتخاب تیار کرنے میں بھی میں نے تجرباتی طریقہ کار سے کام لیا ہے۔ اور ہر اقتباس دوسرے

صاحبان کے سامنے رکھ کر ان سے درخواست کی ہے کہ اس بیان سے ادبی اصول نکالیں۔ خیال ہوا تھا کہ اس انتخاب کی اشاعت دارالعلوم کراچی کے ماہنامہ " البلاغ " میں بالاقساط شروع کر دی جائے اور اس صورت میں میرا زیر بحث مضمون دیباچے کا کام دیتا۔ مگر ارادہ یہ ہے کہ ہر اقتباس کے ساتھ وہ ادبی اصول بھی دیئے جائیں جن کا استخراج ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی نقادوں کی رائیں بھی رکھی جائیں۔ یہ کام چونکہ وقت چاہتا ہے۔ اس لئے ابھی تک شروع نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں مولانا تھانویؒ کی کتابوں اور رسالوں کی تعداد ہزار کے قریب ہے۔ ان کا سرسری جائزہ بھی چار چھ مہینے میں نہیں لیا جا سکتا۔ خیر، اللہ تعالیٰ کی مدد اور توفیق حاصل ہوئی تو یہ مجموعہ دو ایک سال میں ترتیب ہو جائے گا۔ یہ قصہ سنانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ مگر مقصد یہ دکھانا تھا کہ میں نے مولانا تھانویؒ کے بارے میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ گپ شپ کے قبیل سے نہ تھا۔ اب یہ بات از سر نو دہراتا ہوں کہ مولانا تھانویؒ کو ادبی نقادوں کی صف میں رکھنا بے تمیزی ہے۔ مگر ان کی تحریروں سے براہ راست بھی اور استخراجی طریقے سے بھی ادب کے بارے میں بہت کچھ ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔[1]

مرحوم حسن عسکری کی اس فاضلانہ تنقید کے بعد کسی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ احقر مرحوم کی روح سے انتہائی معذرت کرتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہے کہ کاملین انجانی منزلوں سے بھی اس طرح گزر جاتے ہیں گویا یہ منزلیں بھی ان کی جانی پہچانی ہیں۔ قال الرومیؒ۔

ہر کہ بر افلاک رفتارش بود   بر زمین رفتن چہ دشوارش بود

ادبی تنقید کے وصف کے اجمالی بیان کے بعد حکیم الامت علیہ الرحمۃ کے اسلوب تحریر اور طرز ادا کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں بھی حضرت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے اپنی تصنیفات و تالیفات میں تمام اسلامی علوم کا احاطہ فرمایا ہے اور ان کے طرز بیان میں عربی تراکیب کا دخل و استعمال کثرت سے ہے با ایں ہمہ موضوع کلام سے طرز بیان کی مطابقت ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک اور نمایاں خصوصیت عبارت کا ایجاز و اختصار ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ مطالب کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن حضرت اقدس علیہ الرحمۃ نے ایجاز و اختصار کے اسلوب کو اپنے اوپر عائد نہیں کیا ہے کہ اسی طور اور اسی

---

[1] " اردو ادب کی روایت ـــــ چند تصریحات " مشمولہ وقت کی راگنی از حسن عسکری کراچی ۱۹۷۹ء ص ۱۲۵-۱۲۶ -

طریقے پر لکھنا ہے جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اور جس انداز میں تحریر فرماتے ہیں اس کا مقصود منفعت عامہ ہے اکثر مقامات ہیں جہاں بات کو سمجھانے کے لئے اختصار کو ترک فرما کر طویل عبارتیں تحریر فرمائی ہیں۔ یہ اس لئے کہ منفعت عامہ تو مقصود ہی تھی۔ موضوع کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ حضرت کی تصانیف میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں عبارت سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے یہ اسلوب کا نقص نہیں ہے بلکہ مسئلہ چونکہ فنی اور کلامی انداز کا ہوتا ہے اس لئے فنی اور کلامی اصطلاحات میں گفتگو کرنا ناگزیر ہے کہ یہی تقاضائے موضوع ہے جو حضرات اصطلاحات سے آشنا ہیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اور ناآشنا کے لئے دشواری فطری ہے۔ یہ مسئلہ لکھنے والے کے اسلوب کا نہیں ہے بلکہ علم اور لاعلمی کا ہے۔ بایں ایسے مقامات بھی بے شمار ہیں۔ جہاں مضمون تو دقیق ہے۔ لیکن حضرتؒ نے اپنی تحریر کے ذریعہ حد درجہ سادہ اور سلیس بنا دیا ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے حالانکہ اس نوعیت کی متعدد مثالیں حضرتؒ کی تصانیف سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ مضمون ہے وحدۃ الوجود کے دقیق مسئلے کا لیکن حضرت نے اسے جس درجہ آسان اور قابل فہم بنا دیا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے

جملہ معشوق ست و عاشق پردۂ   زندہ معشوق ست و عاشق مردۂ

ہرچند اوپر کے اشعار میں رازِ عشاق کو کہ مسئلہ توحید وجودی ہے پوشیدہ کر گئے مگر وہ اخفا عوام کے لئے تھا جو اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہوتے ہیں اس شعر میں خواص کے لئے قدرے اس راز کی طرف اشارہ کر دیا ہے سو یہ احقر اس کو لائق فہم عوام کے بیان کرتا ہے۔ مصرعہ اول میں اس مسئلہ کا دعویٰ ہے مصرعہ ثانی میں اُس کی تفسیر ہے پس جملہ معشوق سب ہم معنی ہمہ اوست کا ہے جو اس مسئلہ کا مشہور عنوان ہے۔ عاشق سے مراد کل ممکنات کہ مظہر قدرت خداوندی ہیں پردہ سے مراد موجود ظاہری جو حجاب اور ساتر ہے موجود حقیقی کا تشبیہاً اس کو پردہ کہہ دیا کہ وہ بھی ساتر ہوتا ہے اور خود ظاہر نظر آتا ہے اور پردہ دار نظر نہیں آتا۔ پس پردہ کے معنے موجود ظاہری ہوئے۔ خلاصہ دعویٰ کا یہ ہوا کہ کل ممکنات تو صرف موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی موصوف بکمال ہستی نہیں بجز ذات حق کے اسی مضمون کو ہمہ اوست سے تعبیر کر دیتے ہیں یہ ایک جملہ ہے مطابق محاورات روزمرہ کے جس طرح کوئی حاکم کسی فریاد خواہ سے کہے کہ تم نے پولیس میں رپٹ لکھوائی تم نے کسی وکیل سے بھی مشورہ کیا اور وہ عرض کرے کہ جناب پولیس اور وکیل سب آپ ہی ہیں ظاہر ہے کہ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم

اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز قابل شمار نہیں آپ ہی صاحب اختیار ہیں اسی طرح یہاں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمہ اوست کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمہ اور آو ایک ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابل اعتبار نہیں صرف (اُو) کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے مگر ان کی ہستی ہستی کامل کے سامنے محض ایک ظاہری ہستی ہے حقیقی یعنی کامل نہیں۔ دوسرا مصرعہ اسی مضمون کی تفسیر او تمثیل ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر صفت میں دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک کامل ایک ناقص اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم سمجھا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی بستی میں ایک شخص مثلاً پانچ پارہ کا حافظ ہوا اور وہ ناظر خوانوں میں حافظ مشہور ہو اتفاق سے وہاں ایک ایسا شخص آکر رہنے لگے جو تمام قرآن کا حافظ اور ہفت قرأت کا قاری ہو۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اجنبی آدمی بستی والوں سے دریافت کرنے لگے کہ تمہاری بستی میں کتنے حافظ ہیں تو تمام عقلاء یہی جواب دیں گے کہ ایک حافظ ہے اس جواب پر اگر کوئی عامی کہنے لگے کہ میاں فلانا بھی تو حافظ ہے تو متبصر یہی جواب دے گا کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ بھلا اس کے سامنے وہ بھی کوئی حافظ ہے حالانکہ ایک معنی کر حافظ وہ بھی ہے مگر چونکہ ناقص ہے اس لئے کامل کے روبرو غیر حافظ قرار دیا گیا یا کوئی ادنٰے درجہ کا حاکم اپنے اجلاس پر بیٹھا ہوا شان حکومت دکھلا رہا تھا۔ اور پندار منصب سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا کہ ناگہاں بادشاہ وقت اجلاس پر بطریق دورہ آپہونچا اس کے دیکھتے ہی جوش اڑ گئے اور سب پندار و دعوے ونشہ وغرور ہرن ہو گیا اب جو اپنے اختیارات کو اقتدار شاہی کے روبرو دیکھتا ہے تو اس کا کہیں نام ونشان نہیں پاتا نیچے کو گڑا جاتا ہے نہ آواز نکلتی ہے نہ سر اوپر اُٹھتا ہے اس وقت گو اس کا منصب وعہدہ معدوم نہیں ہوا مگر کالعدم ضرور ہے پس اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے موجود کیوں نہ ہوتے مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص وضعیف وحقیر ہے اس لئے وجود ممکن کو وجود حق کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے جب یہ کالعدم ہوا تو وجود متعدد بہ ایک ہی رہ گیا یہی معنی ہیں وحدۃ الوجود کے کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا سو ایک ہونے کے معنے یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے بھی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں ہے اس کو مبالغۃً دباؤ عادۃً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب بیان فرمایا ہے۔ ؎

یکے قطرہ از ابر نیساں چکید   خجل شد چو پہنائے دریا بدید

گر او ہست حقا کہ من نیستم　　　کہ جائیکہ دریا ست من کیستم
ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمترند　　　کہ با ہستیش نام ہستی برند

شیخ نے تصریح کر دی ہے کہ ہست تو سب ہیں مگر ان کی ہستی ہستی حق کے سامنے ہستی کہنے کے قابل نہیں۔ [1]

اس اقتباس میں علم کی متانت، بیان کی سادگی، طرزِ ادا کا خلوص، اسلوب کی برجستگی اور ابلاغ کی کیفیت سب ہی عکس ریز ہیں اور مسرت انگیز حیرت پیدا کرتے ہیں۔ مسرت و حیرت آفرینی ہی اسلوب کا اعجاز ہے۔

آخر میں احقر راقم اس نذرانۂ حقیر کو جو اس کے لئے بہت بڑی سعادت ہے علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہے جو ان گذارشات کا بہترین تتمہ ہے۔

"ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہیں ...... کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں، پریس اور مطبع ہی کی برکات ہیں۔ زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہیں، اس بنا پر مناسب تھا کہ صدی کے مجدد کی کرامات بھی ان ہی کمالات میں جلوہ گر ہوں" [2]

امید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را　　　بدوستی سخنہائے آشنا بخشند

نوٹ:- احقر کا ارادہ یہ تھا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تمام تصانیف کی فہرست مع تعداد صفحات پیش کرتا اور ان صفحات کے مجموعے کو بنیاد بناتے ہوئے حضرتؒ نے تصانیف پر اپنی حیات مبارکہ کے جتنے سال صرف فرمائے اس کا تعین کیا جاتا۔ لیکن تمام تصانیف کی فہرست تو دستیاب ہوگی لیکن تصانیف موجود نہیں ہیں ایسی صورت میں صفحات کی تعداد، ان کا شمار اور ایام حیات پر ان کی تقسیم اور کل مدت کا تعین فی الوقت دشوار ہے ۱۲

---

[1] ۔ التکشف عن مہمات التصوف لاہور سنہ ۱۹۶۰ء صص ۱۱۲ تا ۱۱۴۔

[2] ۔ "حکیم الامت کے آثار علمیہ" مشمولہ حیات اشرف صص ۱۱۳، ۱۱۴۔

حکیم الامت رحمہ اللہ بحیثیت مفسر قرآن

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ترمذی، ساہیوال ضلع سرگودھا

حضرت اقدس حکیم الامت مجدد ملت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ذات گرامی شریعت و طریقت کی جامع اور نہ صرف یہ کہ علم و عرفان، دینی بصیرت و فقاہت، تقوی و طہارت کے درجہ کمال پر فائز تھے بلکہ برصغیر پاک و ہند کی معروف و نامور علمی و روحانی شخصیتوں کا مرکز اور صدر نشین تھے آپ کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی وہ سلف صالحین کے علوم و فیوض کے امین و وارث تھے آپ کی صحبت کی برکت سے ہزارہا بندگان خدا کو یقین و معرفت کی لازوال دولت میسر آئی اور بہت سے تشنگان معرفت کو اس چشمہ عرفان سے سیرابی حاصل ہوئی۔

حکیم الامت تھانویؒ نے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ مولانا سید احمد دہلویؒ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ اور حضرت مولانا ملاں محمودؒ جیسے بلند پایہ اساتذہ کے فیض علمی سے فیض یاب ہونے کے ساتھ پیر روشن ضمیر عارف باللہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نور اللہ مرقدہٗ کی صحبت بابرکت میں رہ کر روحانی استفاضہ کا شرف بھی حاصل کیا ہوا تھا۔ اس طرح حضرت والا کی فطری صلاحیت و مناسبت اور ذاتی استعداد و قابلیت میں اضافہ ہوا اور اس شرف مجالست و مصاحبت نے اس میں مزید جلا بخشا۔ غرضیکہ حضرت تھانوی نے اپنے وقت کے فضلائے کرام اور مشائخ عظام کے زیر نگرانی تمام فنون عقلیہ و نقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کی اور باطنی اصلاح اور تزکیہ نفس کے اعلیٰ مراحل بھی طے کیئے۔ اس طرح علوم ظاہرہ میں رسوخ کے ساتھ تزکیہ نفوس اور تقوے میں بھی بلند مرتبہ حاصل کیا۔ اس علم و تقوے کی جامعیت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے وہبی علوم میں بھی ایسا درجہ عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر اس زمانے میں تو کیا پچھلی صدیوں میں بھی بہت کمیاب ہے

"تفسیر و تصوف سے خصوصی مناسبت"

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو حق تعالیٰ نے علوم قرآن و تصوف کا خصوصی ذوق مرحمت فرمایا تھا۔ اور علم تفسیر و تصوف کے ساتھ جو امتیازی اور معیاری مناسبت تامہ آپ کو عطا فرمائی تھی اس زمانے میں وہ آپ کا ہی حصہ تھا۔ ان دونوں علوم میں آپ کی تصانیف، بیان القرآن، التکشف، التشرف، مسائل السلوک، نیز دوسرے رسائل پھر سینکڑوں کی تعداد میں آپ کے مطبوعہ مواعظ آپ کی اس خصوصی مناسبت اور کامل مہارت پر شاہد عدل ہیں۔ جو علوم قرآن و تصوف سے لبریز اور مشکلاتِ قرآنی کے حل سے پر ہیں، خاص طور سے مواعظ تو بہت ہی عجیب و غریب علمی مضامین اور حقائق و معارف پر مشتمل ہیں یہ مضامین الہامی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ حضرت والا کی وعظ سے پہلے تیاری کرنے کی عادت مبارک نہ تھی بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا کہ وعظ کہنے کے لئے جاتے ہوئے کوئی آیت مبارکہ سن لیتے بس اسی پر کئی کئی گھنٹے واعظ ہو جاتا۔ یہ مضامین القائی ہوتے تھے کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہوئے تھے۔

زیر نظر مقالے میں حکیم الامت تھانویؒ کے مفسر ہونے کی حیثیت کا مختصر طریقے پر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اور حضرت والا کے قرآنی علوم و معارف کی ادنیٰ سی جھلک دکھلائی گئی ہے ورنہ تحقیقاتِ علمیہ اور معارفِ قرآنیہ کے اس بحرِ ذخار اور سمندر ناپید اکنار کے علوم و معارف کو ایک مختصر مقالے میں کیسے پیش کیا جا سکتا ہے اور حضرتِ مفسرِ علام کے مفسر ہونے کی حیثیت کو کسی ایک تحریر میں پورے طور پہ کیسے دکھلایا جا سکتا ہے؟

حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے دین کے ہر شعبے عقائد و اعمال، اخلاق و معاملات سے لے کر معاشرت و سیاست تک میں تجدید و اصلاح کا بڑا ہی قابل قدر کارنامہ زبان و قلم سے انجام دیا ہے۔ آپ کی سینکڑوں تصانیف اور رسائل و مواعظ، مختلف دینی موضوعات پر مشتمل مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں اور عوام و خواص ان سے استفادہ کر رہے ہیں ان تمام دینی موضوعات پر قرآن و سنت کی روشنی میں امت کی رہنمائی کا کافی سامان آپ کی تصانیف و مواعظ میں بحمد اللہ موجود ہے یہ تجدیدات و اصلاحات اس زمانے میں آپ کے حکیم الامت اور مجدد الملت ہونے کی گواہ اور شاہد ہیں۔

علم تفسیر میں حکیم الامت کی خدمات اور تفسیر بالرائے کا فتنہ کبریٰ

اس دور فساد و الحاد میں تفسیر قرآن کے نام سے جو تحریف اور تفسیر بالرائے کا فتنہ کبریٰ برپا ہے اس کے استیصال کے لئے حضرت والا

کی تجدیدی اصلاحات گرانقدر خدمات بہت ہی اہمیت کی حامل اور لائق توجہ ہیں۔

سلف صالحین کے طریقۂ تفسیر سے آزاد و بے نیاز ہوکر تفسیر بالرائے کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے حضرتؒ کی مساعی جمیلہ بڑی ہی قابل قدر ہیں ان سے استفادہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے

تفسیر بالرائے کی مذمت قرآن وحدیث میں واضح طور پر آئی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من قال فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطاء (مشکوٰۃ شریف)

جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے گا وہ درست بھی ہو پھر بھی اس نے خطا کی۔ قرآن کریم کے معنے اپنی ذاتی مراد اور خواہش کے موافق بیان کرنے پر جس کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں وعید شدید سنائی گئی اور قرآن کریم میں بھی اپنی خواہش کی اتباع کو بڑی گمراہی فرمایا گیا ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ

یعنی جس نے اپنی خواہش کی اتباع کی بغیر اللہ کی ہدایت کے اس سے بڑا گمراہ کون ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اور معنی کے بیان میں اپنی آزادانہ رائے کو دخل دینا اور من مانی تفسیر بیان کرنا قرآن وحدیث کی رو سے مذموم و ممنوع ہے۔ قرآن کریم کے سیاق وسباق اور مسلمہ اصول وقواعد کو تفسیر میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ذیل کے موافق

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ ینفون عنہ
تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاھلین۔ (مشکوٰۃ شریف)

سلف کے بعد خلف میں جس طرح تحریف کرنے والے ظاہر ہوتے رہیں گے اسی طرح انہیں میں علوم قرآن کے ایسے خادم بھی ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے جو محرفین کی تحریفات اور غلط تاویلات کی اصلاح کرتے ہیں

اسی سنت الٰہیہ کے موافق چودھویں صدی ہجری میں حضرت حکیم الامت تھانوی کے حساس قلب و دماغ میں تحریف قرآن اور تفسیر بالرائے کے استیصال اور اصلاح کے لئے تقاضہ پیدا فرماکر حضرت والا کو اس کے مقابلے واصلاح کے لئے مخصوص و موفق فرمادیا گیا۔

اس وقت حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی ہمہ گیر تعلیمات اصلاحی خدمات میں صرف ان تعلیمات وخدمات کا اجمالی تذکرہ مقصود ہے جن کا تعلق قرآن کریم کی تفسیر سے ہے چونکہ اس زمانے میں قرآن کریم کی تفسیر بالرائے

کا رواج عام ہو رہا ہے۔ اس لئے اس سے متعلقہ اصلاحات و تعلیمات کا زیادہ سے زیادہ منظر عام پر لانا اور مسلمانوں کو ان سے آگاہ کرنا وقت کی اہم ضرورت اور مسلمانوں کی بہت بڑی دینی خدمت ہے۔

اصلاحی رسائل

حضرت حکیم الامت رحمہ کی تفسیری خدمات و اصلاحات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ان رسائل کے دیکھنے کی ضرورت ہے جو تفسیر بالرائے کرنے والوں کی اصلاحات کے طور پر لکھے گئے ہیں جن کا مختصر تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس پر پوری توجہ دیں گے اور بغور ان کا مطالعہ فرمائیں گے۔

(۱) "اصلاح تفسیر سرسید"

یہ رسالہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ کے فتاوی کی جلد ۵ ص۲۷۵ سے ص۳۲۴ تک شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مختصر تعارف حضرت حکیم الامت کی قلم حقیقت رقم سے ہی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۹۰۷ء میں ایک مصلحت دینیہ سے بعض خیر خواہان اسلام کی فرمائش پر کچھ اس عقائد زائغہ تفسیر القرآن مصنفہ سرسید سے بہت ہی معمولی اور سرسری نظر سے بطور نمونہ کے زبان فارسی میں ایک جدول کی شکل میں جمع کئے گئے تھے، اس کا مسودہ یادداشت کے کاغذات میں محفوظ رہا۔ اب بعض احباب کی یہ رائے ہوئی کہ اس کی اشاعت دوسروں کے لئے نافع ہوگی اور اس کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ اگر ساتھ ساتھ ان معتقدات کی وجہ بطلان کا بھی ذکر ہو جائے تو مزید فائدے کی صورت ہے ...... مزید فائدے کے لئے یہ مشورہ قبول کیا گیا۔ (امداد الفتاوی جلد ۶ صفحہ مذکور)

(۲) اصلاح ترجمہ دہلویہ

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے قرآن کریم کا نیا ترجمہ لکھا اس میں انہوں نے اپنی طبعی جدت پسندی سے کام لیا اور یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کریں۔ ان کی زیادہ توجہ زبان کی طرف رہی اور اقوال سلف کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس طرز عمل سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس ترجمہ کی اصلاح کی جائے، اس لئے حکیم الامت تھانوی رحمہ نے یہ رسالہ لکھا جو مستقل طبع ہو کر مفید خاص و عام ہوا۔

(۳) "اصلاح ترجمہ حیرت"

مرزا حیرت دہلوی عربی زبان سے ناواقف تھے پھر بھی انہوں نے اپنے نام سے ترجمہ چھپوایا مشہور یہ ہے کہ وہ ترجمہ لکھنؤ کے کسی عالم کا کیا ہوا ہے۔ حکیم الامت تھانوی رحمہ نے اس ترجمہ کی اغلاط کی اصلاح کے لئے ایک رسالہ اصلاح ترجمہ

حیرت تالیف فرمایا۔

(۴) لاہور کے ایک عالم نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں "تفسیر البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے جمع کیا۔ مصنف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے حکیم الامت تھانویؒ نے ان کی نشاندہی فرمائی اور "الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان" کے نام سے شائع کیا۔ جو امداد الفتاویٰ ج۴ ص ۲۲۳ تا ص ۲۲۷ پر موجود ہے۔

(۵) توحید الحق

یہ رسالہ اس مسئلے کی تحقیق مستقل کے لئے لکھا گیا ہے کہ آیا اہل اسلام کے علاوہ دوسرے اہل ادیان و ملل بھی ناجی ہیں کیونکہ اس زمانے میں بعض اہل قلم نے اس کا دعویٰ کیا اور تصنیف کی شکل میں اس کو شائع بھی کر دیا۔ حالانکہ یہ مسئلہ قطعی اور ضروریات دین میں سے ہے کہ سوائے دین اسلام کے کوئی بھی ناجی نہیں۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ جن آیات کریمہ کا اس مسئلے سے تعلق ہے اور ان میں تلبیس و تدلیس سے کام لیا جا رہا ہے ان کا ایک معتدبہ حصہ مع صحیح تفسیر کے بطور نمونہ کے جمع کر دیا جائے۔ اس تحریر کا نام توحید الحق ہے یعنی دین حق کے واحد غیر متعدد ہونے کا اثبات اس رسالہ میں بیس آیات مقدسہ کی تفسیر معہ ترجمہ کے فرمائی گئی، اور اس مدعی کی تدلیس و تلبیس کا پردہ اچھی طرح چاک کیا گیا۔ اور درمیان میں جا بجا بکثرت احادیث کریمہ سے بھی استدلال فرمایا گیا یہ رسالہ ۱۳۵۸ھ میں تحریر ہوا اور امداد الفتاویٰ ص ۶۵۶/۴۴ سے ص ۶۷۹ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۶) رسالہ ملاحۃ البیان فی فصاحۃ القرآن

ضلع اعظم گڑھ کے ایک اہل علم نے قرآن مجید کے بعض الفاظ کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا کہ وہ محض سجع کے لئے غیر انسب ہیں اور اسمائے سُوَر سورتوں کے مضمون کی طرف رہبری نہیں کرتے اس سلسلے میں ایک مضمون اخبار الحدیث ۱۸ جون ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا اس کا تعاقب اخبار محمدی دہلی یکم جولائی میں کیا گیا۔ اور ان دونوں اخباروں کے تراشے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

حکیم الامت نے اس پر یہ رسالہ تالیف فرمایا۔ "انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا" سے استدلال فرماتے ہوئے فرمایا، عوج مقابل ہے استقامت کا کسی شے کی استقامت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلال نہ ہو پس عوج عام ہوگا ہر اختلال میں اور یہ نکرہ ہے تحت نفی کے پس ہر قسم کا عوج منتفی ہوا...... ان نصوصِ قطعیہ سے قرآن مجید کا ہر قسم کے نقص سے منزہ ہونا اور اس تصریح میں اس

کا معجزہ ہونا مصرح ہے نیز اس پر تمام امت کا ایسا اجماع ہے کہ اس عقیدے کو اس درجے ضروریات دین میں سمجھا جاتا ہے کہ اس کے انکار پر بالاتفاق کفر کا حکم کیا جاتا ہے (امداد الفتاویٰ جلد ۴ صہ ۴۵۹) یہ رسالہ امداد الفتاویٰ جلد ۴ کے صہ ۴۵۵ سے صہ ۴۶۱ تک طبع شدہ ہے۔

(۷) "التقصیر فی التفسیر" تیس صفحے کا یہ رسالہ اصول تفسیر کا جامع اور تفسیر بالرائے، علم اعتبار کی تحقیق میں نہایت مفید رسالہ۔ بعض معاصرین اہل علم کے طرز عمل سے جو یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ علم اعتبار کو تفسیر میں داخل کر لیا ہے اس کی اصلاح اس رسالہ میں عمدہ طریقے پر کی گئی ہے۔

اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ جن احکام کو نصوص کی طرف مستند کیا جاتا ہے وہ دو قسم کی ہیں ایک قسم وہ ہے کہ وہ نصوص ان احکام پر ایسے طریقہ سے دلالت کرتے ہوں کہ جو علماء مجتہدین کے نزدیک معتبر اور کتب اصول و عربیت میں مدوّن ہیں، پھر یہ دلالت اگر بطور نص کے ہو تو اس کا نام تفسیر ہے خواہ قطعی ہو یا ظنی، اور اگر بطور استنباط کے ہے تو اس کا نام فقہ اور اجتہاد ہے۔

معلوم ہے کہ فقہ کتاب و سنت سے علیحدہ چیز نہیں ہے۔ بلکہ کتاب و سنت سے مستنبط شدہ احکام کا نام ہے۔

دوسری قسم وہ احکام ہیں کہ وہ نصوص ان احکام پر وجوہ معتبرہ سے دلالت نہیں کرتے لیکن جن احکام کو ان نصوص کی طرف مستند کیا ہے، ان احکام کو ان نصوص کے مدلولات سے ایک گونہ مناسبت و مشابہت ہے۔ اس لئے اس مشابہت کے سبب اس حکم کو اس نص کے ذیل میں بطور تشبیہ کے ذکر کر دیا جاتا ہے لیکن اس قسم کے احکام کو مدلول نص اور ثابت بالنص کہنا یقیناً تفسیر بالرائے اور تحریف ہے۔ ہاں اگر مدلول نص نہ کہا جائے تو تحریف اور تفسیر بالرائے کی حد سے تو نکل گیا۔ پھر اگر وہ حکم دین میں مطلوب ہے، اس کی علامت یہ ہے کہ دوسری نصوص بوجوہ دلالات معتبر قسم اول مقصوداً ثابت ہو، تب تو جائز ہے۔ اور ہمیشہ امت میں معمول بہ رہا ہے۔ خاص طور پر صوفیائے کرام میں، اس کا نام علم اعتبار ہے۔ اور اگر وہ حکم دین میں معتبر نہ ہو، خواہ فی نفسہٖ صحیح ہی ہو جس کی علامت ابھی مذکور ہوئی وہ ناجائز اور داخل غلو ہے۔ جیسے آیت وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم سے یہ حکم ثابت کیا گیا ہے۔ کہ اگر از ممالک خارجہ کساں را برائے ترتیب وغیرہ قوم خود طلبانیدہ شود درست است، سے یہ حکم جواز طلب از ممالک غیر گو فی نفسہٖ صحیح ہے مگر

شرعاً مطلوب و مقصود نہیں۔ تو اس حکم کا استناد قرآن کی طرف یقیناً غلو ہے۔ بخلاف احکام صوفیاء کے کہ وہ دین میں یقیناً مطلوب ہیں۔ جیسے قصہ ذبح بقرہ بنی اسرائیل سے نفس کشی کا استنباط کیا گیا ہے کہ خود نفس کشی حکم شرعی اور دین میں مطلوب اور دوسری نصوص سے مقصود اور ثابت ہے۔

"حکیم الامتؒ کا اردو ترجمہ اور تفسیر"

حکیم الامت تھانویؒ کا اردو ترجمہ بامحاورہ عام فہم ہونے کے ساتھ زبان کی سلاست اور بیان کی صحت میں بھی بڑے بڑے تراجم سے سبقت لے گیا حضرتؒ کا ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے اور ان تمام اغلاط سے پاک ہے جو زمانہ حال کے ان بعض تراجم میں پائے جاتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

"اکابر کی آراء"

حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود الحسن محدث دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں کہ "بندے کے احباب میں بھی اول مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہٗ ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا اور اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب نے ترجمہ کیا احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا جو ان خرابیوں سے پاک اور صاف عمدہ ترجمے ہیں (مقدمہ ترجمہ شیخ الہندؒ صـ)

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی طرف سے حضرت تھانویؒ کے ترجمے کے عمدہ ہونے اور جملہ خرابیوں سے پاک صاف ہونے کی شہادت بڑی وقیع اور وزنی ہے اور اس ترجمے کی معیاریت و عظمت کے لئے بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن پاک کے اردو ترجمے پڑھنے سے جو شکوک و شبہات عام طور سے لوگوں کو پیش آتے ہیں ان کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے کہ کوئی شک و شبہ پیش ہی نہیں آتا۔ اس کے ساتھ اس کی بڑی احتیاط کی گئی ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ اس کے متحمل ہوں۔

تفسیر بیان القرآن

بارہ ضخیم جلدوں میں ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۳۲۶ھ میں مطبع مجتبائی میں شائع ہوئی پھر اس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں نظر ثانی کے بعد اشرف المطابع تھانہ بھون سے جو ایڈیشن شائع ہوا تھا مکتبۃ الحسن لاہور نے اسی اشرف المطابع تھانہ بھون کے مطبوعہ کا عکس لے کر چھوٹے سائز کی تین جلدوں میں شائع کیا ہے، اس آخر میں "تتمۃ البیان" کا اضافہ بھی شامل ہے

تفسیر بیان القرآن میں صحیح روایات اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق کے ساتھ شکوک و شبہات کا بھی ازالہ کیا گیا ہے صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر بیان القرآن مطالبِ قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے جس طرح کافی ہے۔ شکوک وشبہات کے ازالہ اور اشکالات کے حل کے لئے بھی یہ تفسیر زمانہ حاضرہ کی تفسیروں میں امتیازی شان کی حامل ہے۔ اس کے حکیمانہ اسلوب بیان اور محققانہ طرزِ استدلال سے ہر شخص اپنی استعداد اور صلاحیت کے موافق استفادہ اور اپنے شکوک وشبہات کا ازالہ کر سکتا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دیکھا تو فرمایا تو فرمایا "میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے"۔

اس تفسیر کی صحیح عظمت ووقعت اور قدر ومنزلت کا انکشاف ایسے ہی اہل علم کو ہوتا ہے جنہوں نے قرآن کریم کے مطالب کو سمجھنے سمجھانے میں عمر کا خاص حصہ صرف کیا ہو۔ اور ان کو تفسیرِ قرآن سے متعلق ان علوم کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کا موقع بھی میسّر آیا ہو جن پر مطالب قرآنی کا صحیح طور پر سمجھنا موقوف ہے۔ علوم قرآنی کا مطالعہ جس قدر گہرا ہوتا چلا جائے گا اور مطالب قرآنی کا فہم وادراک جتنا عمیق ہوتا جائے گا اسی قدر اس تفسیر کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ اس صدی میں اس شان اور اس پائے کی تفسیر کا وجود اہل علم کے لئے نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہے۔

”طرزِ نگارش“

حضرت حکیم الامتؒ کا طریقہ تحریر پر وقار اور متین ہے اور کوئی لفظ زائد از ضرورت نہیں ہوتا۔ یہ ترجمہ قواعد کے لحاظ سے مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ادبیت کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہے۔ بڑے بڑے صاحب طرز ادیب اس کی ادبیت کے معترف ہیں ایک بڑے ادیب لکھتے "کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مفسرِ علام نے ایک ایک حرف تول تول کے رکھا ہے" (نقوش وتاثرات)

پھر تفسیری فوائد میں جس ایجاز واختصار کے ساتھ لفظی فصاحت و بلاغت اور معنوی لطافت کی رعایت رکھتے ہوئے منطقی اور عقلی طریقۂ استدلال اختیار فرمایا گیا ہے وہ تو اہل علم ونظر کے لئے بڑا ہی وجد آفریں ہے۔

اس موضوع پر یہ احقر مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کے حکم کی تعمیل میں کسی قدر مبسوط ایک مقالہ تحریر کر چکا ہے جو عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ اس لئے اس موضوع پر یہ مختصر مضمون حاضرِ خدمت ہے امید ہے کہ ناظرینِ کرام کو اس مختصر مضمون سے حضرت حکیم الامتؒ کی تفسیری خدمات اور آپ کے مفسر ہونے کی حیثیت کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حکیم الامتؒ کے فیوض وبرکات سے ہم سب کو استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کی

خدمتِ حدیث

از

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رح

شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی شخصیت، کردار اور کارنامے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔

مولانا موصوف نے ایک پُر مغز مقالہ بعنوان "سلسلۂ حضرت الشاہ ولی اللہ الدہلویؒ کی خدمتِ حدیث" اورنٹیل کالج کانفرنس بنارس کے شعبہ اسلامیات میں پڑھ کر سنایا تھا۔ بعدۂ یہ مقالہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیرِ ادارت شائع ہونے والے معروف جریدہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ (بھارت) کے صفحات کی زینت بنا۔

ذیل کا مضمون اسی مقالہ کا ایک حصہ ہے جس میں مولانا موصوف نے اپنے پیر و مرشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ حدیث پر روشنی ڈالی ہے۔

دراصل یہ اہم موضوع ایک مفصل مقالہ کا مقتضی ہے اور ماہنامہ "الحسن" کے حضرت تھانویؒ نمبر کی اس پہلی جلد میں اس موضوع پر مفصل مقالہ کی کمی قارئین یقیناً محسوس فرمائیں گے۔ یہ کمی انشاء اللہ العزیز حضرت تھانویؒ نمبر کی دوسری جلد میں پوری کی جائے گی۔ (نجیب احمد نفیسی)

◆

وہ حکیمِ اُمتِ مصطفےٰ وہ مجددِ طرقِ ہُدیٰ — وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
اشرف علی سراتقا شمس المعارف والتقیٰ — جو عمل سے اپنے نمونۂ عملِ صحابہ دکھا گئے

اسلامیانِ ہند کی یہ بزرگ ہستی ابھی چار مہینے پہلے ہماری نظروں کے سامنے تھی اور ہمیں فخر تھا کہ

اگر کوئی ہم سے یہ پوچھتا کہ اس وقت مسلمانوں میں سلف کا نمونہ کون ہے؟ تو ہم یہ کہہ سکتے تھے، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا نے ایک قدم بھی خلافِ شریعت نہیں اٹھایا۔ آپ نے صرف اللہ پر نظر رکھ کر کام کیا، کسی والئے ریاست یا سلطانِ ولایت پر کسی وقت نظر نہیں کی، آپ کی آٹھ سو کتابوں اور ہزارہا خطوط میں جو مردوں کے نام بھی ہیں اور عورتوں کے بھی، کوئی بات ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جس کو پڑھتے ہوئے تہذیب کے چہرہ پر جھینپ کے آثار نمودار ہوں[1]۔

مولانا ابتدائے عمر ہی سے جبکہ اٹھارہ سال کی عمر تھی مصنف تھے اور آخر عمر تک مصنف رہے، ایسا مصنف جس نے تقریباً ہر علم میں تصنیف کی ہو اور اتنی کثیر مقدار میں کتابیں لکھی ہوں، امام سیوطیؒ کے بعد مولانا کے سوا نہیں دیکھا گیا۔ وعظ اور خوش بیانی میں تو بینظیر تھے ہی کہ جس جلسہ میں تقریر کو کھڑے ہوئے پھر کسی کی تقریر سامعین کو پسند نہ آتی تھی۔ مولانا نے اپنی تصانیف سے دنیوی نفع کبھی حاصل نہیں کیا، نہ کسی کتاب کا حقِ تصنیف کسی سے لیا، تمام کتابیں اللہ کے لیے اور اصلاحِ امت کے لیے لکھیں اور ہر شخص کو چھاپنے کی اجازت دے دی۔

میں اس وقت آپ کی خدمتِ حدیث پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں، کیونکہ عام طور پر مسلمان آپ کو ایک صوفی، عالم، مفسر، فقیہ، واعظ کی حیثیت ہی سے پہچانتے ہیں، حالانکہ خدمتِ حدیث بھی اس زمانہ میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے جو آپ کے تاجِ مجددیت کا درخشاں گوہر ہے، آپ نے علمِ حدیث کی باقاعدہ سند ملا محمود دیوبندی اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند سے حاصل کی۔ ملا محمود صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب نے شاہ عبدالغنی صاحب سے حدیث پڑھی اور مولانا محمود حسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب سے۔

حضرت حکیم الامت کو قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی سے بھی سندِ حدیث حاصل ہے اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے بھی بعض کتب حدیث پڑھ کر سند حاصل کی ہے۔ پندرہ برس تک مدرسہ جامع العلوم کانپور میں باقاعدہ حدیث کا درس دیا اور آپ کے شاگردوں میں بکثرت محدث پیدا

---

[1] مسائل مخصوصۂ زنان اور مسائل جلیہ کو سہنے دیجئے کہ وہ عورتوں کے مطالعہ کے لیے ہیں اور درس و تدریس کیلئے نہیں ہیں اور ان کی ضرورت سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا پھر وہ مولانا کی تصنیف نہیں ہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔

ہوئے جن میں مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے۔

حضرت مولانا حکیم الامت نے ۱۳۱۵ھ میں توکلاً علی اللہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام فرمایا، اس وقت سے باقاعدہ درسِ حدیث کا سلسلہ ملتوی ہوگیا اور ہمہ تن تزکیہ و تربیتِ قلوب و اصلاحِ اُمت میں مشغول ہوگئے، مگر علماء اس مدت میں بھی آپ سے حدیث کی سند حاصل کرتے رہے، علامہ محقق محمد زاہد کوثری مصری نے جو مصر کے اجلہ علماء محققین و مصنفین سے ہیں، بذریعہ خط کے حضرت سے حدیث کی سند حاصل کی۔ اسانید احادیث میں مولانا کا رسالہ السبعۃ السیارہ طبع ہوچکا ہے، ترمذی پر آپ کا حاشیہ الثواب الجلی بھی طبع ہوچکا ہے، دوسرا حاشیہ المسک الذکی بصورتِ مسودہ مکمل ہے، ایک چہل حدیث بھی طبع ہوچکی ہے جس میں مسلم شریف سے چالیس حدیثیں نسخہ ہمام کی جمع کی گئی ہیں جن کو معمر، ہمام بن منبہ سے وہ ابوہریرہؓ سے اور ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، سب حدیثوں کی سند ایک ہی ہے، مولانا کے مواعظ و رسائل میں میرے انداز میں پانچ ہزار حدیثوں سے کم نہیں جن کی شرح کرکے اُمت کو تبلیغ کی گئی ہے۔

۱۳۲۳ھ میں آپ کو دلائل حدیثیہ للحنفیہ کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو جامع الآثار اور تابع الآثار دو رسالے تصنیف فرمائے جن میں ابواب الصلوٰۃ تک وہ حدیثیں جمع کی گئیں جو حنفیہ کی دلیل ہیں، پھر تمام ابواب کے دلائل کا استیعاب کرنا چاہا اور احیاء السنن کے نام سے ضخیم کتاب ابواب الحج تک تالیف فرمائی، مگر جس عالم کو اس پر نظرِ ثانی کے لیے متعین کیا گیا تھا اُس نے اپنی رائے سے اس میں اس قدر ترمیم و تنقیح کردی کہ مولانا کی تصنیف باقی نہ رہی بلکہ مستقل کتاب ہوگئی، اس لیے اس کی اشاعت ملتوی کردی گئی اور حضرت کے منشاء کے موافق دوبارہ اس اہم کام کو انجام دیا گیا، پندرہ سال سے کچھ زیادہ مدت میں ابواب الصلوٰۃ سے ابواب المیراث تک جملہ ابوابِ فقہیہ کے دلائلِ احکام، احادیث سے جمع کردیئے گئے۔

---

[1] قدر اللہ اتمامہ واکمالہ علی ید ھذا العبد الغریق فی الآثام اقل الانام ظفر احمد العثمانی التھانوی

ولیس لی فیہ غیر الرسم والاسم والشیخ نور اللہ مرقدہ ھو الروح فی ھذا الجسم

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

یہ کتاب جس کا نام اعلاء السنن ہے، بیس جلدوں میں تمام ہوئی ہے، ابتداء کی آٹھ جلدیں حرفاً حرفاً حضرت حکیم الامۃ کی نظر سے گذر چکی ہیں، بقیہ جلدوں میں مشکل اور مہم مقامات حضرت کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، حضرت حکیم الامۃ کو اس کتاب کی تکمیل سے جس قدر مسرت ہوئی ہے اُس کو لفظوں سے بیان نہیں کیا جا سکتا، فرماتے تھے کہ اگر خانقاہ امدادیہ میں اعلاء السنن کے سوا اور کوئی کتاب بھی تصنیف نہ ہوتی تو بھی کارنامہ اس کا اتنا عظیم الشان ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس میں صرف حنفیہ ہی کے دلائل حدیثیہ نہیں بلکہ متن کتاب میں احادیث مؤیدۂ حنفیہ ہیں اور حواشی میں بڑی تحقیق اور تفتیش سے جملہ احادیث احکام کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے، پھر غایت انصاف کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ ہر مسئلہ مختلف فیہا میں حنفیہ کے سب اقوال کو تلاش کیا جائے پھر جو قول حدیث کے موافق ہو اُسی کو مذہب حنفی قرار دیا گیا۔ تحقیقِ کامل کے بعد پورے وثوق سے کہا جاتا ہے کہ جس مسئلہ میں حنفیہ کا ایک قول حدیث کے خلاف ہوگا تو دوسرا قول حدیث کے موافق ضرور ہوگا، یا کوئی حدیث یا آثار صحابہ اُن کے قول کی تائید میں ہوں گے آپ کو حیرت ہوگی کہ مسئلہ مصراۃ میں بھی امام ابو حنیفہؒ کا ایک قول حدیث صحیح کے بالکل موافق ہے جس کو علامہ ابن حزم نے محلی میں روایت کیا ہے، اعلاء السنن میں تقلید جامد سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی وہاں صاف طور سے ضعفِ دلیل کا اعتراف کیا گیا اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

جن حضرات کو مذہب حنفی پر مخالفت حدیث کا اعتراض ہے وہ انصاف سے کام نہیں لیتے، جس مذہب میں مرسل و منقطع بھی حجت ہے اور راوی مستور الحال کو قبول کیا گیا ہے، قولِ صحابی کو بھی قیاس سے مقدم مانا گیا ہے اُس سے زیادہ حدیث پر عمل کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بات یہ ہے کہ خبر واحد کی تصحیح و تضعیف میں جس طرح باہم محدثین میں اصولی اختلاف ہے، اسی طرح حنفیہ کو بھی بعض مقامات میں محدثین سے اصولی اختلاف ہے، مثلاً حنفیہ کے نزدیک صحت خبر واحد کے لیے یہ بھی ضروری شرط ہے کہ وہ اصول مشہورہ کے خلاف نہ ہو، اور یہ اصول قیاسی نہیں بلکہ نصوصِ قرآنی اور احادیث مشہورہ سے ماخوذ ہیں، بعض علمائے عصر نے حنفیہ کے کلام میں موافقت اصول کی شرط دیکھ کر جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ حنفیہ روایت پر درایت کو مقدم کرتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے، حنفیہ کے نزدیک تو حدیث ضعیف اور مرسل بھی

قیاس سے مقدم ہے وہ درایت کو روایت پر کیسے مقدم کر سکتے ہیں؟ حنفیہ کی مُراد موافقتِ اصول سے اُن اصول کی موافقت ہے جو نصوصِ قرآنیہ اور سنتِ مشہورہ سے ماخوذ اور اُمت کے نزدیک مسلّم ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہ اصول درایت و قیاس کے بھی موافق ہیں مگر قیاس سے ماخوذ نہیں۔ (ملاحظہ ہو ملفوظاتِ عزیزیہ ص ۱۱۵، ۱۱۶ طبع مجتبائی میرٹھ) اس قاعدہ کی بناء پر حنفیہ بعض دفعہ ضعیف حدیث کو صحیح حدیث پر مقدم کر دیتے ہیں، کیونکہ ضعیف موافقِ اصول ہے اور صحیح خلافِ اصول، مگر وہ کسی حدیث کو رد نہیں کرتے بلکہ حدیث مرجوح کا بھی اچھا محمل بیان کر دیتے ہیں، جس کی تائید حدیث کے تمام طرق کو جمع کرنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اسی طرح حنفیہ کے نزدیک آثار و اقوالِ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھنے میں بڑا دخل ہے، وہ ہر خبرِ واحد کو آثارِ صحابہ کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ایک اجمالی اشارہ ہے جس کی تفصیل کے لیے اعلاء السنن کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اس کتاب کا مقدمہ بھی مستقل کتاب کی صورت میں الگ چھپ چکا ہے، جس میں حنفیہ کے اصولِ حدیث جمع کیے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ جن اصول میں حنفیہ عام محدثین سے منفرد ہیں ان میں بھی بعض محدثین ان کے موافق ہیں، پھر مقدمۂ فتح الباری کی ایک طویل فصل کا خلاصہ لکھ کر ثابت کیا گیا ہے کہ امام بخاریؒ جیسا محدث بھی بعض دفعہ حنفیہ کے اصول پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، پس جب تک حنفیہ کے اصولِ حدیث سے پوری واقفیت حاصل نہ ہو جائے اُس وقت تک اُن کی کسی دلیل کو کسی محدث کے ضعیف کہنے سے ضعیف نہیں کہا جا سکتا۔

الحمد للہ اس کتاب کی تکمیل سے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی وہ بات پوری ہو گئی جس کو انہوں نے فیوض الحرمین میں کبریتِ احمر و اکسیرِ اعظم بتلایا ہے۔

قال عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذهب الحنفی طریقة انیقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابه وذلك ان یوخذ من اقوال الثلاثة

فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ مذہب حنفی میں ایک طریقہ بڑا عمدہ ہے جو اُس طریقِ سنّت کے بہت زیادہ موافق ہے جو بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانہ میں مدون اور منقح ہو چکا ہے وہ یہ کہ ائمہ ثلاثہ (ابو حنیفہ و ابو یوسف و محمد رحمہم اللہ) کے اقوال میں سے اس

قول اقربهم بها فی المسئلة ثم بعد ذلك يتبع اختيارات الفقهاء الحنفيين الذين كانوا من اهل الحديث فرب شیء سكت عنه الثلاثة فی الاصول وما تعرضوا لنفيه ودلت الاحاديث عليه فليس بد من اثباته والكل مذهب حنفی ، اھ

قول کو لیا جائے جو اس مسئلہ میں سب سے زیادہ حدیث کے قریب ہو، پھر ان فقہائے حنفیہ کے جو محدثین میں سے تھے اختیارات کا تتبع کیا جائے، کیونکہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن سے ائمہ ثلاثہ نے ظاہر روایت میں سکوت کیا ہے اور ان کی نفی سے تعرض نہیں کیا، اور احادیث ان پر دلالت کرتی ہیں تو ان کو ثابت ماننا ضروری ہے اور یہ سب مذہب حنفی ہوگا۔ (مذہب سے خارج نہ ہوگا)

آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:۔

وهذه الطريقة ان اتمها الله تعالے و اكملها فهی الكبريت الاحمر والاكسير الاعظم۔

(شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں) کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طریقہ کو پورا کر دیں تو وہ کبریت احمر اور اکسیر اعظم ہوگا۔

الحمد للہ یہ طریقہ کبریت واحمر و اکسیر اعظم شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہی کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے دور تجدید میں پورا ہوگیا، کیونکہ اعلاء السنن میں یہی کہا گیا ہے کہ ائمہ ثلاثہ اور علمائے حنفیہ کے اقوال کا پورا تتبع کرکے جو قول حدیث کے زیادہ موافق تھا اُسی کو مذہب قرار دیا گیا۔

اس وقت تک اس کتاب کی گیارہ جلدیں طبع ہو چکی ہیں، نو جلدیں بصورت مسودہ رکھی ہوئی ہیں جن میں سے تین کی کاپی ہو چکی ہے، کاغذ کی گرانی کی وجہ سے طباعت میں تاخیر ہو رہی ہے، حضرت حکیم الامت کی جماعت کا خصوصاً اور تمام مسلمانوں کا عموماً فرض ہے کہ اس کتاب کی تکمیل طباعت میں پوری کوشش کریں۔ علامہ محمد زاہد کوثری مصری نے اس کی دس جلدوں پر نظر ثانی فرما کر اپنی طرف سے مفصل تقریظ جریدۃ الاسلام مصر میں شائع فرمائی ہے، جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بیرون ہند کے علماء نے اس کتاب کو کس وقعت کی نظر سے دیکھا ہے، اُن کی تقریظ کے آخری چند جملے یہ ہیں، فرماتے ہیں:۔

والحق يقال انی دهشت من هذا الجمع وهذا الاستقصاء ومن هذا الاستيفاء البالغ فی الكلام علی كل

حق بات کہنا پڑتی ہے کہ میں تو اس طرح حدیثوں کے جمع کرنے، تلاش کرنے اور پوری طرح ہر حدیث کے متن وسند پر فن حدیث کے موافق مفصل کلام کرنے

حدیث بما تقضى به الصناعة متناً وسنداً من غير ان يبدو عليه آثار التكلف في تاييد مذهبه بل الانصاف رائده عند الكلام على آراء اهل المذاهب فاغتبطت به غاية الاغتباط وهٰذا تكون همة الرجال وصبر الابطال اطال الله بقاءه في خير وعافية ووفقه لتاليف امثاله من المؤلفات النافعة ۔

سے حیرت میں رہ گیا، پھر خوبی یہ ہے کہ اپنے مذہب کی تائید میں تکلف کے آثار کا نام ونشان نہیں بلکہ جملہ اہل مذاہب کی رایوں پر انصاف کو امام بنا کر کلام کیا گیا ہے، مجھے اس کتاب سے بے انتہا خوشی ہوئی ہمت مردانہ اسے ہی کہتے ہیں اور بہادروں کا استقلال ایسا ہی ہوتا ہے، اللہ تعالے مؤلف کو خیر وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور اس جیسی اور نافع تالیفات کی توفیق دے، (آمین)

حضرت حکیم الامت نے ایک طرف مذہب حنفی کو احادیث کی روشنی میں منقح فرمایا اور دوسری طرف مسائل سلوک وتصوف کو قرآن کی آیات کثیرہ سے مجتہدانہ شان کے ساتھ مدون فرمایا جس کا نام مسائل السلوک ہے، پھر احادیث تصوف کو کتاب التعرف باحادیث التصوف میں جمع فرمایا اور دُنیا کو بتلادیا کہ صحیح اسلامی تصوف صرف قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے، اُس کا کوئی مسئلہ بھی کسی غیر اسلامی ماخذ سے لیا ہوا نہیں، التعرف سے پہلے احادیث تصوف میں مستقل کتاب سُننے میں نہیں آئی، الحمدللہ اس کتاب نے صحیح اسلامی تصوف سے مسلمانوں کو رُوشناس کردیا ہے۔ ضرورت ہے کہ حکیم الامت رح کی جماعت میں کوئی صاحب ہمت اس موضوع کی تکمیل کے لیے قدم آگے بڑھائیں کیونکہ التعرف میں ہنوز جملہ احادیث تصوف کا استیعاب نہیں ہوا۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

بحیثیت فقیہ

حضرت مولانا پروفیسر انوار اللہ صاحب، اسلام آباد

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ۱۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء کو وفات پا گئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم تھانہ بھون ہی میں مولانا فتح محمد صاحب سے حاصل کی اور بعد میں دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور ۱۸۸۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اور حضرت مولانا سید احمد دہلوی صاحب، حضرت مولانا ملا محمود صاحب، اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی سے استفادہ کرنے کا کافی موقعہ ملا، جن میں سے ہر ایک علم کا بہتا ہوا دریا اور آسمان علم و عمل پر ایک درخشندہ ستارہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسی سال آپ نے کانپور میں مدرسہ فیض عام میں بطور معلم اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ بعد میں کانپور ہی میں اپنا ایک مدرسہ بنام جامع العلوم قائم کیا اور اس میں تدریس کے ساتھ ساتھ مواعظ، افتاء اور تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور چودہ سال تک کانپور میں دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مشورے پر اپنے گاؤں تھانہ بھون میں قیام پذیر ہوئے۔ اور تادم حیات وہیں رہے۔

مولانا تھانویؒ ایک جامع شخصیت کے حامل تھے۔ آپ ایک بلند پایہ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فاضل مفسر، ممتاز محدث اور کامل فقیہ بھی تھے۔ علم تفسیر میں آپ کی تفسیر بیان القرآن ایک شاہکار کی حیثیت کا حامل ہے۔ علم حدیث میں اعلاء السنن آپ کی کاوشوں کا علمبردار ہے جو مولانا

ظفر احمد عثمانی نے آپ کی فرمائش پر آپ کی رہنمائی میں تصنیف کی اور جو علم حدیث کے چودہ سو سالہ دور کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں ان احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کیا گیا ہے جن سے فقہ حنفی ماخوذ ہے اور تمام فقہی ابواب سے متعلق احادیث نبویہ کی بے نظیر محدثانہ تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے۔ علم و فقہ میں اوروں کے علاوہ امداد الفتاویٰ آپ کا ایک عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔ جو فقہی مسائل اور مباحث کا ایک نادر مجموعہ ہے اور اس میں ہر قسم کے مسائل فقہیہ سے متعلق مواد اور رہنمائی مل سکتی ہے۔ علوم اسلامیہ میں سے کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے۔ جس میں حکیم الامت کی تصنیف نہ ہو لیکن قرآن تصوف اور فقہ آپ کے مخصوص فن تھے۔ ان تینوں فنون میں آپ کے مجددانہ تصانیف میں مقبولیت عامہ اور قبول الٰہی کے آثار مشاہد ہیں۔

فقہ سے آپ کو ابتداء سے ہی خاص ذوق تھا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے زمانہ میں آپ مختلف فقہی سوالات کے جوابات لکھتے تھے اور فتاویٰ کی شکل میں ان کو درج کرتے تھے اور ہر سوال کا جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کو دکھاتے تھے اور ان سے تصحیح کرواتے تھے چنانچہ اِس قسم کے بے شمار فتاویٰ جو آپ نے اس زمانے میں دیئے تھے۔ امداد الفتاویٰ میں موجود ہیں علم فقہ میں آپ کی خدمات فتاویٰ کی شکل میں موجود ہیں۔

ان فتاویٰ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتداء سے آپ کو علم فقہ پر کافی عبور حاصل تھا اور آپ فقہی مسائل میں کافی تلاش و تحقیق فرماتے تھے۔ یہ استفادہ کا اثر تھا جو آپ نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کیا تھا۔ جن کی صحبت و معیت میں آپ نے کافی عرصہ گزارا۔

جب آپ کے ابتدائی فتاویٰ منظر عام پہ آ گئے تو پورے ہندوستان اور باہر کے ممالک کے علماء اور عام لوگ ہر مشکل مسئلہ کے بارے میں آپ ہی سے استفتاء کرنے لگے اور روزانہ بے شمار خطوط آتے تھے جن میں آپ سے مختلف مسائل کے حل کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔ جب بھی کوئی مسئلہ آپ کے سامنے آتا تھا کتنا ہی سہل اور صاف ہو فتویٰ لکھنے سے پہلے اس کو بار بار بغور ملاحظہ فرماتے تھے۔ پھر جہاں تک ممکن ہوتا فقہاء کے فتاویٰ میں اس کا صریح جزئیہ تلاش فرما کر اس سے جواب تحریر فرماتے تھے۔ جس مسئلہ میں کوئی صریح جزئیہ ہاتھ نہ ملا وہاں اصول و قواعد سے مسئلہ کا جواب تحریر فرماتے رہے اور آخر میں عموماً اس پر تنبیہ فرماتے تھے کہ یہ جواب قواعد و اصول سے لکھا گیا ہے صریح جزئیہ نہیں ملا۔

اس لیے دوسرے علماء سے بھی مراجعت کر لی جائے اور وہ اختلاف فرمائیں تو مجھے مطلع کر دیا جائے۔

جب تک آپ کے اساتذہ اور مشائخ موجود تھے اس وقت تک تو اپنے تمام فتاوی اور تصانیف میں ان سے طالب علمانہ استفادہ کا سلسلہ جاری رہا اور جب اساتذہ اور مشائخ وفات پا گئے تو اس وقت کے ہمعصروں اور شاگردوں سے مشورہ اور مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود سب حاضرین مجلس اور عام علما کو یہ تاکید فرماتے تھے کہ میرے کسی فتوی سے کسی کو اختلاف ہو تو مجھے اس پر ضرور متنبہ کیا جائے۔ مکرر غور و تحقیق کے بعد اگر رائے بدل فرماتے تھے تو فوراً اس کا اعلان ماہوار رسالہ "النور" میں شائع فرماتے تھے اور یہ اشاعت ترجیح الراجح کے نام سے باقاعدہ جاری رہی اور جب کبھی از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو اس سے رجوع کر کے مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کرتے تھے۔

نئے مسائل جو آلات جدیدہ کی ایجاد یا معاملات جدیدہ کے رواج سے پیدا ہوتے تھے ان میں مسئلہ کے ہر پہلو پر گہری نظر مکمل تحقیق اور اس کے ساتھ ابتلائے عامہ اور عوام کی سہولت کو سامنے رکھنا آپ کا مخصوص طرز تھا۔ آپ ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ معاملات میں جہاں تک اصول فقہیہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے عوام کو کوئی گنجائش یا سہولت دی جا سکتی ہے وہ ضرور دی جائے خصوصاً ان معاملات میں جن میں ابتلاء اور اضطرار عام ہو۔ ایسے اہم اور جدید مسائل کو آپ نے بنام "حوادث الفتاوی" ایک مستقل کتاب بھی بنا دیا ہے۔ جو امداد الفتاوی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ امداد الفتاوی چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں نفیس فقہی مباحث ہیں اور عہد حاضر کے اہم مسائل کے حل کے لیے ایک شمع ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں حضرت تھانویؒ نے خود اپنے فتاوی کے تین حصے قرار دیئے ہیں: پہلا وہ حصہ ہے جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کے امر سے ان کی خدمت میں رہتے ہوئے لکھا گیا۔ اور سب کے سب ان کی نظر و اصلاح اور تصدیق سے مزین ہوا دوسرا حصہ وہ ہے۔ جو کانپور میں قیام کے دوران لکھا گیا اور تیسرا حصہ وہ ہے جس میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے مراجعت کا موقع ملا اور ان کی نظر و اصلاح شامل رہی۔ ان سب فتاوی کو ابواب فقہیہ پر مرتب کر کے شائع کیا گیا بعد میں امداد الفتاوی کے تتمات بھی اس میں شامل کئے گئے۔ یہ علم فقہ کا ایک عظیم ذخیرہ

سے حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ امداد الفتاوی کے مقدمہ میں اس کی ترتیب اور مکمل اشاعت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

امداد الفتاوی سب سے پہلے چار جلدوں میں شائع ہوا۔ اس وقت تک نظر ثانی کرنے یا دوسرے حضرات کے توجہ دلانے سے فتاوی میں جو رد و بدل ہوا۔ اس کو انہی جلدوں کے شروع میں بعنوان امداد الفتاوی شامل کر دیا گیا۔ اس وقت تک ترجیح الراجح کا مستقل سلسلہ شروع نہیں کیا گیا تھا نیز حوادث الفتاوی کا مستقل عنوان بھی ان مرتب جلدوں میں نہیں تھا۔

۱۳۲۶ھ کے بعد سے امداد الفتاوی کی اشاعت بعنوان تتمات امداد الفتاوی ہوئی اور پہلا تتمہ ۱۳۲۶ھ سے ۱۳۳۰ھ تک کے فتاوی پر مشتمل ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ میں مطبع مجتبائی دہلی شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۳۳۱ھ و ۱۳۳۲ھ کے فتاوی کا مجموعہ بنام تتمہ ثانیہ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ میں دہلی میں شائع ہوا۔ ان دونوں تتموں میں بھی ترجیح الراجح کا عنوان مستقل شروع نہیں ہوا۔ بلکہ جس قدر اصلاحات فتاوی میں عمل میں آئی ان کو آخر میں بعنوان "اصلاح تسامح" درج کر دیا گیا۔ البتہ حوادث الفتاوی کا مستقل سلسلہ تتمہ ثانیہ سے شروع ہو گیا اس کے بعد ۱۳۳۳ھ کے فتاوی بنام تتمہ ثالثہ امداد الفتاوی ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ میں اور ۱۳۳۴ھ کے فتاوی بنام تتمہ رابعہ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ میں مطبع قیومی کانپور سے شائع ہوئے ان دونوں تتموں کے ساتھ حوادث الفتاوی کا سلسلہ بھی بدستور سابق شائع ہوا اور ترجیح الراجح کا نیا سلسلہ جاری ہوا اس کے بعد کچھ عرصہ سلسلہ اشاعت بند رہا اور ۱۳۳۵ھ سے ۱۳۴۰ھ تک کے فتاوی کا ایک ہی مجموعہ بنام تتمہ خامسہ تھانہ بھون سے ۱۳۴۰ھ میں شائع ہوا اس تتمہ خامسہ میں بھی بدستور سابق حوادث الفتاوی اور ترجیح الراجح کے دو مستقل سلسلے شامل رہے اس کے بعد تتمہ سادسہ کا نمبر تھا لیکن اس کی اشاعت کچھ عوارض کے سبب کتابی صورت میں ملتوی ہو کر ماہوار رسالہ "النور" میں ہوتی تھی اور ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ کو جب کہ حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی وفات ہوئی تو فتاوی کا بڑا حصہ "النور" میں شائع ہو چکا تھا۔ کچھ فتاوی ایسے بھی تھے جو قلمی رجسٹر میں محفوظ تھے"

امداد الفتاوی ان فتاوی کا مجموعہ ہے جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے خود تحریر فرمائے لیکن سوالات کی کثرت کے باعث آپ نے خانقاہ تھانہ بھون کے بعض دوسرے علماء محققین کو بھی فتاوی لکھنے پر مامور فرمایا۔ جو آپ ہی کی رہنمائی میں فتاوی لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش

کرتے اور آپ کی نظر و اصلاح کے بعد وہ فتاویٰ روانہ کر دیئے جاتے تھے، اشاعت کی غرض سے ہر عالم کے لکھے ہوئے فتاویٰ الگ الگ رجسٹروں میں درج کر کے محفوظ کر لیے جاتے تھے۔ اس طرح آپ کی رہنمائی میں جو فتاویٰ لکھے گئے ان کے مندرجہ ذیل تین مجموعے تیار ہو گئے جن کے نام آپ نے تجویز فرمائے تھے۔

امداد الاحکام یہ ان فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی حضوری اور رہنمائی میں اکثر تو آپ کے بھانجے اور شاگرد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے تحریر فرمائے اور کچھ حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی کے تحریر کردہ ہیں اور بعض فتاویٰ اس میں خود حضرت حکیم الامت نے بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اس کتاب میں فتاویٰ کی تعداد تو امداد الفتاویٰ سے کم ہے۔ لیکن اس کی ضخامت امداد الفتاویٰ کے قریب قریب ہے کیونکہ اس میں دلائل کی تفصیل زیادہ ہے۔ خصوصاً حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے فتاویٰ میں احادیث کے دلائل نہایت شرح و بسط سے محدثانہ اصول پر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب دارالعلوم کراچی سے شائع ہو گئی ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"بعد الحمد والصلوٰۃ عرض ہے کہ [illegible] میں جب برخوردار مولوی ظفر احمد سلمہ بقصد قیام مستقل تھانہ بھون آئے تو منجملہ اور کاموں کے میں نے فتاویٰ کا کام بھی ان کے سپرد کر دیا کیونکہ کثرت مشاغل کی وجہ سے مجھے کتابوں کی تلاش و تفتیش کی فرصت نہ ہوتی تھی، برخوردار سلمہ ہر اس فتویٰ کو جس میں کچھ بھی کسی حیثیت سے اہمیت ہوتی تھی اول بالالتزام مجھے دکھا لیتے تھے اور معمولی فتاویٰ خود لکھ دیتے تھے خدا کے فضل سے فتاویٰ کے کام کو انہوں نے باحسن وجوہ انجام دیا اور بعد چندے جب دیکھا گیا کہ ماشاء اللہ فتاویٰ نہایت تحقیق سے لکھے جاتے ہیں اور بحمد اللہ ہر ہر پہلو پر نظر کافی ہو جاتی ہے پھر سب فتاویٰ کو دکھلا بھی لیتے تھے چنانچہ یہ مجموعہ جو جناب کے سامنے ہے ان ہی فتاویٰ کا مجموعہ ہے اس میں اگرچہ سب میرے دیکھے ہوئے نہیں ہیں۔ مگر برخوردار سلمہ کے فتاویٰ پر مجھے تقریباً ایسا ہی اطمینان ہے جیسا خود اپنے لکھے ہوئے فتاویٰ پر اسی لیے اس کا نام امداد الاحکام ضمیمہ امداد الفتاویٰ " تجویز کرتا ہوں: وباللہ التوفیق "

امداد المسائل یہ فتاویٰ حکیم الامت نے مولانا احمد حسن صاحب سنبھلیؒ سے لکھوائے تھے یہ فتاویٰ چھوٹے چھوٹے چار رجسٹروں میں دارالعلوم کراچی کے شعبہ مجلس خیر میں محفوظ ہیں طبع

نہیں ہوئے مگر ان کی تمہید میں حضرت حکیم الامت نے تحریر فرمایا ہے کہ ان میں صرف پہلے مہینے کے فتاوی مجھے دکھائے گئے ہیں۔ باقی میں اس کا التزام نہیں۔

جمیل الفتاوی

یہ تھوڑے سے فتاوی ہیں جو حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی سے لکھوانے شروع کیے تھے ان کی طباعت نہیں ہو سکی۔ یہ حضرت مفتی صاحب موصوف کے پاس محفوظ ہیں۔

علم فقہ میں آپ کی دوسری اہم کتاب حیلہ ناجزہ ہے جس کا پورا نام الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزہ ہے جس میں نکاح، طلاق وغیرہ نیز لاپتہ، نامرد، مجنون وغیرہ کے بیویوں سے متعلق فقہی مسائل تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ چونکہ ہندوستان میں شرعی قانون اور شرعی عدالتیں نہیں تھیں، اس لیے نکاح کے مسائل اور طلاق وغیرہ کے مسائل میں شوہروں کے مظالم اور عورتوں کے مصائب میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پنجاب میں مسلم عورتوں کے ارتداد کی شہرت ہوئی۔ یہ سنکر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بے حد صدمہ ہوا اور آپ نے ان مسائل کی مکمل تحقیق مذاہب اربعہ سے کرنے کا عزم فرمالیا اور جب ان مسائل کی تحقیق اپنی اور دوسرے مذاہب کی کتابوں سے مکمل فرمائی تو پھر حرمین شریفین کے علماء مالکیہ سے رجوع فرمایا اور مسلسل خط و کتابت رہی پھر ہندوستان کے علماء سے مشورہ اور مراجعت فرمائی، آخر آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر نکاح، طلاق وغیرہ نیز لاپتہ، نامرد، مجنون وغیرہ کی بیویوں کے مسائل میں امام مالک کے مذہب کے مطابق فتویٰ دیا جائے، تاکہ مظلوم عورتوں کو شرعی مداوی ملے۔ جن عورتوں کے شوہر لاپتہ ہو جائیں یا پاگل ہو جائیں یا نامرد ہوں یا باوجود قدرت رکھنے کے نان و نفقہ نہ دیں اور طلاق و خلع پر بھی آمادہ نہ ہوں، ان کی خلاصی کے لیے شرعی صورتیں۔ نیز جن صورتوں میں عورتوں کا اپنا نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ملتا ہے، مرتد ہو جانے کی صورت میں فسخ نکاح ہونے نہ ہونے کی مکمل بحث اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کتاب سے آپ کی علمی وسعت اور مذہبی فراخدلی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

علم فقہ میں آپ کی تیسری کتاب بہشتی زیور ہے، جو گیارہ حصوں پر مشتمل ہے اور جو آپ نے خاص طور سے عورتوں کی عائلی زندگی کی رہنمائی کے لیے لکھی تھی، لیکن اس میں آپ نے فقہ کے

جملہ ابواب کے مسائل کے ساتھ ساتھ عقائد اور تصوف کے کچھ مسائل بھی بیان کئے ہیں، اور اس میں پیدائش سے لیکر مرنے تک کے تمام حالات و مسائل جو ہر مسلمان کو پیش آتے ہیں مکمل طور پر درج ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کے لیے بھی یکساں مفید رہی گیارہویں جلد مردوں کے لیے لکھی گئی ہے جو بہشتی گوہر سے بھی موسوم ہے اور اس میں ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں، مثلاً جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ بہشتی زیور کی بڑی شہرت ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ اس کتاب کا ترجمہ مختلف زبانوں میں شائع ہو چکا ہے اس کتاب کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ عام عورتیں اور مرد گھریلو زندگی سے متعلق اسلامی احکام سے روشناس ہو گئے۔ چنانچہ کئی بار شائع ہونے کے باوجود اب بھی اس کتاب کی مانگ ہے۔

علم فقہ میں آپ کی دوسری کتابیں "تحذیر الاخوان عن الربا فی الہندوستان" اور "رافع الضنک عن منافع البنک" ہیں جن میں آپ نے سود کے مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور بینک کو بلا سود تجارت پر چلانے کی تجاویز پیش کی ہیں اور اس بات کی پوری وضاحت کی ہے کہ ہر قسم کے قرض پر ایک خاص مدت پر زیادتی سود شمار ہوتا ہے، خواہ وہ قرض کسی ذاتی ضرورت کے لیے لیا گیا ہو یا تجارتی مقاصد کے لیے اور خواہ وہ قرض کسی انسان سے لیا گیا ہو یا کسی ادارے سے۔

علم فقہ میں آپ کی ایک کتاب "الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد" ہے جس میں آپ نے تقلید اور اجتہاد پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان کے ہر گوشے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ تقلید اور اجتہاد کب اور کس حد تک کرنی چاہیئے یہ کتاب بھی آج کل کے بہت سے اختلافی مسائل کے حل کے لیے شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ فتاوی اشرفیہ کے نام سے آپ نے مسائل دینیہ کے تین الگ حصے شائع کئے جو مختصر رسائل ہیں اور جن میں زیادہ تر دینی مسائل کا بیان ہے۔

آپ نے فقہی احکام اور خاص کر فقہ حنفی پر استدلالات قرآنیہ اور مواضع خلاف میں آئمہ کے جوابات پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ فقہ حنفی کی بنیاد قرآن کریم ہی ہے، اور اس اعتبار سے اس کتاب کا نام "دلائل القرآن علی مسائل النعمان" تجویز فرمایا اور مفتی محمد شفیع صاحب کو یہ خدمت سپرد فرمائی یہ کام بڑا مشکل اور طویل تھا، حضرت مفتی صاحب

نے اپنے فرصت کے موافق کرنا شروع کر دیا، اس عرصہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ اعلاء السنن کی تصنیف کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو حضرت والا نے یہ کام ان کے سپرد فرما دیا لیکن اتفاقاً تھوڑے سے ہی عرصہ کے بعد مولانا موصوف بھی ڈھاکہ میں ملازم ہو کر تشریف لے گئے اور یہ کام التواء میں پڑ گیا ۱۳۶۱ھ میں حضرت کو اس کام کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور چاہا کہ کوئی عالم فارغ ہو کر اسی کام میں لگ جائے تاکہ جلد مکمل ہو سکے مگر اس کی صورت نہ ہوئی تو چند حضرات پر تقسیم کر دینے کا فیصلہ فرمایا چنانچہ دو منزلیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے دو منزلیں حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کے دو منزلیں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے اور ایک منزل حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کے حوالے کر دی۔ حضرت کے ایما کے موافق حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رح تھانہ بھون میں ہی قیام کر کے اس کام میں مصروف ہو گئے مولانا روزانہ کسی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آ جاتے تھے بیان فرماتے اور حضرت مولانا مفتی صاحب مدظلہ اس کو اپنے مقام پر آ کر قلم بند فرما لیتے۔ یہ تصنیف اسی طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا۔ اب بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی صاحب رح نے اپنے حصہ کے مسودہ کو مکمل فرما لیا ہے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدظلہ کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اپنے اپنے حصے تقریباً مکمل فرما لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی بقیہ تصنیف و تدوین اور اشاعت کا جلد کوئی انتظام فرما دیں۔ موجودہ وقت کے لیے نہایت اہم کتاب ہوگی۔

اس کے علاوہ حضرت تھانوی صاحب رح نے ایک کتاب بنام "المصالح العقلیہ فی الاحکام النقلیہ" لکھی جس میں اسلامی احکام کے مصالح و حکم بیان کئے گئے ہیں اس کے تین حصے ہیں پہلے حصہ میں نماز اور زکوٰۃ اور دوسرے حصہ میں روزہ عیدین، صدقہ فطر، قربانی حج و نکاح و طلاق، غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں جبکہ تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات، حدود و قصاص، فرائض، عذاب قبر اور آخرت کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے عام فہم انداز میں ثابت کیا ہے کہ شریعت کے تمام احکام عقل کے عین مطابق ہیں۔

اس کے علاوہ آپ نے مختلف فقہی موضوعات پر مستقل رسالے بھی شائع کئے ہیں ان میں اکثر امداد الفتاویٰ میں چھپے ہیں اور کچھ رہ گئے ہیں ان رسائل میں القول الصواب فی مسئلۃ الحجاب، القول

البدیع فی اشتراط المصر للتجمیع، کشف الغشرہ عن رجہ السرقرۃ، الحق الصراح فی تحقیق اجرۃ النکاح النقی فی احکام الرقی، الانسداد لفتنۃ الارتداد، بلوغ الغایۃ فی تحقیق خاتم الولایۃ، اجرا الصیام بلا الصرام، احکام الامول اور حقوق البیت کا نام قابل ذکر ہے۔

ایک فقیہ ہونے کی حیثیت سے آپ حکومت کے ساتھ اسلامی قانون سازی میں مدد دیتے رہے اسی طرح کے کاموں میں سے چند ایک کا ذکر کرنا ضروری ہے چنانچہ جب عورتوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے آپ نے حیلہ ناجزہ کتاب لکھی تو آپ نے ممبران اسمبلی کو ان کی نقول بھیج دیں اور ان سے درخواست کی کہ ایک مسودہ مسلم قانون فسخ نکاح کے نام سے اسمبلی میں پیش کریں۔ بحمد اللہ تعالیٰ آپ کی یہ مساعی جمیلہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں اور ممبران اسمبلی نے قانون میں ترمیم کی سعی شروع کی اور ایک مسودہ قانون اسمبلی میں پیش کیا۔ مگر افسوس کہ اس مسودہ میں وہ قیود و شرائط نظر انداز کر دیئے گئے جو آپ نے فقہ کی کتابوں اور علمائے محققین سے مراجعت کے بعد تحریر فرمائے تھے۔

اس کے علاوہ جب بعض اوقاف میں متولیوں کی گڑبڑ دیکھ کر بعض لوگوں کو موقع ملا کہ اوقاف کے متعلق قانون بنانے کی سعی کریں، چنانچہ ایک تحقیقاتی وفد مقرر ہوا جس کے سربراہ ایک بیرسٹر تھے جس نے ۱۹۳۰ء میں دورہ کیا تاکہ حالات کو دیکھنے کے بعد قانون بنایا جائے وہ وفد تھانہ بھون بھی آیا اس موقع پر آپ نے اس وفد سے بات چیت کے دوران تفصیل سے بیان کر دیا کہ قواعد شریعہ کے مطابق حکومت کو ایسا قانون بنانے کا اختیار نہیں ہے حضرت نے ان کے ساتھ مکالمے میں صاف صاف کہہ دیا، کہ چونکہ یہ مذہبی فعل ہے اس لیے اس کے اندر غیر مسلم کا دخل دینا خود مذہبی دست اندازی ہے جیسا نماز جو ایک خالص مذہبی فعل ہے اس کے اندر کسی طرح جائز نہ ہوگا کہ کسی غیر مسلم سے دست اندازی کی درخواست کی جاوے یا کوئی ایسی کوشش کی جاوے کہ وہ غیر مسلم وقف کے انتظامی معاملات میں دخیل ہو۔ اس کے جواب میں بیرسٹر صاحب نے کہا کہ معاف فرمایئے نماز میں اور وقف میں فرق ہے اس لیے کہ نماز کا تعلق مال سے نہیں ہے اور وقف کا تعلق مال سے ہے اور اس وقت چونکہ متولیوں کی حالت خراب ہو رہی ہے اس لیے اوقاف کے اندر وہ بڑی گڑبڑ کرتے ہیں اس کی آمدنی مصارف خیر میں صرف نہیں کرتے خود کھا جاتے ہیں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا اگر آپ کے نزدیک نماز کی نظیر ٹھیک نہیں تو زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے کہ یہ ایک خالص مذہبی فعل

بھی ہے اور اس کا تعلق مال سے بھی ہے اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں نکالتے مگر چونکہ مذہبی فعل بھی ہے اس لیے اس میں غیر مسلم کی مداخلت جس قسم کی بھی ہو ناجائز ہے بیرسٹر صاحب نے کہا کہ اچھا صاحب کیا نکاح اور طلاق بھی آپ کے نزدیک خالص مذہبی فعل ہیں حضرت نے فرمایا جی ہاں اس پر انہوں نے کہا کہ بہت اچھا اگر ایک عورت کو شوہر نے طلاق دی مگر اب وہ عورت اس مرد سے جدا ہونا چاہتی ہے اور مرد اس کو نہیں جانے دیتا بلکہ روکتا ہے اور طلاق سے انکار کرتا ہے تو ایسی صورت میں کیا اس عورت کو جائز نہیں کہ عدالت میں اس کے متعلق استغاثہ دائر کرے اور شہادت سے طلاق کو ثابت کر کے حکومت سے اپنی آزادی میں مدد حاصل کرے تو دیکھئے نکاح و طلاق مذہبی فعل ہیں مگر اس میں غیر مسلم کا دخل جائز ہوا، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ نے غور نہیں کیا یہاں دو چیزیں جدا جدا ہیں ایک تو وقوع طلاق اور ایک اثر طلاق یعنی وہ حق جو اس عورت کو مرد کے طلاق دے دینے سے حاصل ہو گیا ہے اور مرد اس حق کو چھیننا چاہتا ہے جس میں عورت کا ضرر ہے تو یہاں وہ عورت غیر مسلم حکومت کا دخل قصداً خود طلاق میں نہیں چاہتی بلکہ طلاق سے جو اس کو حق آزادی حاصل ہوا ہے جس کے استعمال نہ کر سکنے سے اس کو ضرر پہنچتا ہے اس ضرر کو دفع کرنے کے لیے وہ عورت عدالت سے مدد چاہتی ہے بیرسٹر صاحب نے کہا کہ معاف فرمائیے اسی طرح ہم یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں عورت کا ضرر ہے اسی طرح اوقاف کے اندر گڑبڑ ہونے میں مساکین کا ضرر ہے سو جیسے وہاں اس ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کا دخل جائز رکھا گیا ہے اسی طرح یہاں اوقاف میں ضرر سے بچنے کی خاطر غیر مسلم کا دخل جائز ہونا چاہیے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ نے غور نہیں کیا وہاں تو شوہر کے قید کرنے سے اس عورت کا ضرر ہے اور یہاں اوقاف میں متولی کی خیانت سے مساکین کا ضرر نہیں بلکہ صرف عدم النفع ہے اور ضرر اور چیز ہے اور عدم النفع اور چیز ہے اس کو ایک مثال سے سمجھئے مثلاً آپ کی جیب میں ایک روپے کا نوٹ تھا ایک شخص نے آپ سے وہ چھین لیا تو یہ ضرر ہوا اور اگر میں آپ کو ایک نوٹ دینا چاہتا ہوں مگر کوئی اس نوٹ کے دینے سے منع کر دے تو اس میں آپ کا ضرر کچھ نہیں ہوا بلکہ صرف عدم النفع ہوا۔

فقہ میں حضرت تھانویؒ نے موجودہ دور کی مشکلات کا حل تلاش کرنے میں بڑا کام کیا ہے

آپ نے ہمیشہ ہر مسئلہ میں اس کے حل کی طرف توجہ کی اور ان مسائل میں جن میں عام لوگ مبتلا ہوتے تھے آپ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ لوگوں کو آسانی میسر ہو خواہ اس کے لئے اپنا مسلک ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے ، قرآن کریم میں ہے " ما جعل علیکم فی الدین من حرج " اللہ تعالیٰ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی) ایک اور جگہ ارشاد ہے " یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر " (اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا) حضور نے فرمایا " لا ضرر ولا ضرار " (نہ کسی کو ضرر پہنچے اور نہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے) ایک اور حدیث میں ہے " بعثتم میسرین ولا معسرین " (تم کو آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے نہ کہ تنگی پیدا کرنے کے لیے) فقہا نے مختلف قواعد و ضوابط بتائے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ قانون سازی میں لوگوں کی آسانی پیش نظر رکھی جائے اور ہر ضرر کا ازالہ ہو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اگرچہ اجتماعی ضرر کے ازالے کو انفرادی ضرر کے ازالہ پر ترجیح دی جائے گی کسی بھی فقیہ نے یہ نہیں کہا ہے کہ صرف اس کی رائے صحیح ہے اور باقی آراء صحیح نہیں ہیں بلکہ ہر امام نے اپنی کوشش کی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک رائے دی ہے اور اس رائے دینے میں اس نے زمان و مکان کے حالات کو مدنظر رکھا ہے ، یہی وجہ ہے کہ جب عباسی خلفا ابو جعفر منصور اور ہارون الرشید کے زمانے میں وسائل کی ترقی ہوئی اور حالات اچانک بدل گئے اور لوگوں میں اختلاف بڑھ گئے اور مختلف فقہاء اور قاضی حالات و واقعات کی روشنی میں مختلف مسائل میں مختلف رائیں دینے لگے تو ہارون الرشید نے امام مالک سے مشورہ کیا کہ ان کے فقہ کو جو موطا امام مالک میں درج ہے سرکاری مذہب کی حیثیت سے نافذ کیا جائے اور سب لوگوں کو اس کا پابند بنایا جائے ، تو امام مالک نے اس سے انکار کیا اور فرمایا " میں نے حضور کے صحابہ کو دیکھا تھا ان میں سے ہر ایک الگ رائے رکھتا تھا اور وہ مختلف شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے تھے اور سب حق پر تھے ۔

امام ابو حنیفہؒ استحسان کے قائل ہیں اور امام مالکؒ مصالح مرسلہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دونوں اصولوں کا مقصد یہ ہے کہ احکام میں لوگوں کے لیے آسانی پیدا کی جائے اور ان سے تنگی اور مشقت دور کی جائے ۔

امام شافعیؒ نے بھی اپنی مشہور کتاب الرسالہ میں ایسے قواعد اور ضوابط بیان کیے ہیں جن سے

احکام میں آسانی پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں ابن تیمیہ اور ابن قیم نے سیاست شرعیہ پر کافی کام کیا ہے۔ ابن تیمیہ نے مجموع الفتاوی اور ابن قیم نے اعلام الموقعین اور الطرق الحکمیہ میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے کہ قرآن و سنت سے احکام نکالتے وقت زمان و مکان کے تقاضوں کا لحاظ رکھنا ہوگا اور ہر وقت کے لیے اس کے تقاضوں کے مطابق قانون بنایا جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ کے شاگردوں مثلاً امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر نے کئی مسائل میں اختلاف کیا۔

بعد کے دور میں حنفی فقہا میں امام بزدوی اور امام کرخی نے اصول پر باقاعدہ کتابیں لکھیں جو قانون سازی کے لیے شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں امام غزالی نے بھی اصول میں ایک کتاب "المستصفیٰ" لکھی ہے جس میں انہوں نے قانون سازی کے اصول بیان کیے ہیں ان کے بعد حنفی فقہاء میں ابن نجیم اور شافعی فقہاء میں جلال الدین سیوطی نے "الاشباہ والنظائر" کے نام سے کتابیں لکھ کر اس کام کو اور بھی آگے بڑھایا۔ لیکن افسوس کہ بعد میں تقلید کا دور آیا اور لوگوں نے اپنے مسلک کے علاوہ کسی اور کے قول کو تسلیم کرنے یا اجتہاد کرنے سے بالکل انکار کیا اور یوں مختلف اسلامی ممالک میں اسلامی احکام میں جمود آگیا اور اس جمود سے مخالفِ اسلام طاقتوں نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے ان اختلافات کو اور بھی ہوا دی اور یوں مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ گویا حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی جن میں کسی وقت تعبیر اور تشریح کا اختلاف تھا اب مستقل مذہب بن گئے اور ہر ایک میں دوسرے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی اور ان میں سے ہر ایک کے پیروکار کسی جزیئے میں اپنے مسلک کے چھوڑنے پر بالکل تیار نہیں تھے۔

ہندوستان میں بھی یہ اختلافات پھیل گئے شاہ ولی اللہؒ نے بہت کوشش کی کہ امت میں یہ اختلاف ختم ہو جائے اور سب ایک نیا مسلک اختیار کریں جس میں سارے مذہب کے اچھے اصول اور موجودہ دور کے تقاضوں کا لحاظ ہو۔ لیکن تقلید کے پجاریوں نے شاہ صاحب کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

حضرت تھانویؒ کے زمانے میں بھی بعض علماء تقلید میں غلو کرتے تھے اور غیر منصوص مسائل میں وہ سوائے امام ابو حنیفہ کے اور کسی قول کو کوئی وقعت نہیں دیتے تھے، اس ضمن میں آپ نے ایک کتاب بھی لکھی جو "الاقتصاد فی التقلید

والا اجتہاد" کے نام سے موسوم ہے، جس میں آپ نے تقلید اور اجتہاد دونوں میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنے پر زور دیا لیکن ایک فوری ضرورت کے پیش نظر آپ نے تقلید کے بارے میں ایک علمی قدم اٹھا کر یہ ثابت کر دیا کہ تقلید کوئی جامد چیز نہیں ہے اگر مفاد عام کی خاطر ضروری ہو تو ایک خاص مسئلہ میں ایک خاص امام کی رائے چھوڑ کر دوسرے امام کی رائے پر یا کسی اجتہادی رائے پر عمل کیا جا سکتا ہے، وہ ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ چونکہ ہندوستان میں علما لاپتہ شوہر، نامرد شوہر، پاگل شوہر کی بیویوں کے متعلق نیز ان شوہروں کے بارے میں جو بیویوں کو نان ونفقہ نہیں دیتے تھے .

اور نہ طلاق یا خلع پر راضی ہوتے تھے فقہ حنفی کے مطابق فتاویٰ دیتے تھے، حالانکہ فقہ حنفی میں ان مسائل کے احکام بہت سخت ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں عورتیں مرتد ہونے لگیں یا بے حیائی اختیار کرنے لگیں، اس لیے آپ نے چاروں فقہا کی کتابوں کو تفصیل سے پڑھا پھر آپ نے ہندوستان میں علماء سے مشورہ کیا اور بعد میں حجاز مقدس کے علماء سے مشورہ کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان مسائل میں فقہ مالکی کے مطابق فتویٰ دیا جائے، کیونکہ امام مالک کے مذہب کے مطابق ان مسائل کے احکام میں آسانی ہے اور یہ موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق ہے مثلاً اگر کسی عورت کا شوہر لاپتہ ہو جائے تو فقہ حنفی کے مطابق اس کی بیوی کو نوے سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن امام مالک کے مذہب کے مطابق وہ چار سال تک انتظار کرے گی اور اگر ان چار سالوں میں اس کے شوہر کا کوئی پتہ نہ چلے تو پھر اس کو دوسری شادی کی اجازت ہے ایک جگہ آپ لکھتے ہیں مسائل بعضے قطعی ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی کچھ گنجائش نہیں ہوتی بعضے اجتہادی وظنی ہوتے ہیں ان میں سلف سے خلف تک شاگرد نے استاد کے ساتھ مرید نے پیر کے ساتھ قلیل جماعت نے کثیر جماعت کے ساتھ واحد نے متعدد کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور علمائے امت نے اس پر نکیر نہیں کیا ہے اور نہ ایک نے دوسرے کو ضال اور عاصی کہا نہ کسی نے دوسرے کو اپنے ساتھ متفق ہونے پر مجبور کیا نہ اختلاف کے ہوتے ہوئے باہم بغض وعداوت ہوئی نہ مناظرہ پر اصرار کیا گیا .

ایسے مسائل اجتہادیۂ ظنیہ میں اختلاف دو طرح سے ہوا ہے ایک دلائل کے اختلاف سے جیسے حنفی شافعی میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں دوسرے واقعات یا عوارض کے اختلاف سے جیسے امام صاحب اور صاحبین میں نکاح صابیات کے مسئلہ میں کہ جن کو تحقیق ہو کہ وہ اہل کتاب

میں سے ہیں انہوں نے اس نکاح کو جائز رکھا اور جن کو تحقیق ہوا کہ وہ اہل کتاب میں سے نہیں انہوں نے اس نکاح کو ناجائز رکھا مگر اس واقعہ کی تحقیق میں اختلاف ہو گیا کہ آیا وہ کتابی ہیں یا غیر کتابی اس لیے فتوے میں اختلاف ہوا ۔

حکم شرعی کا محل اور متعلق ہمیشہ مسنون ہوتا ہے نہ کہ عنوان مثلاً کوئی شخص مغصوب زمین میں مسجد بنا لے اور مالک اس کا مغصوب ہونا ثابت کر دے اور قاضی غاصب کو اس مسجد کے انہدام اور زمین کی واپسی کا حکم دے دے تو قاضی پر یہ اعتراض جائز نہ ہوگا کہ اس نے مسجد منہدم کرا دی مسجد محض اس کا نام ہے واقع میں وہ مسجد ہی نہیں ،،

افسوس ہے کہ آج پاکستان میں ہر مکتبۂ فکر کے علماء اور پیروکار یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کا فقہ نافذ کیا جائے اور ان کے اس مطالبہ کی وجہ سے اسلامی قانون تاحال نافذ نہ ہو سکا اس لیے اگر حضرت تھانویؒ کے نقش قدم پر چل کر عام ابتلاء کے مسائل میں کسی بھی ایسے مذہب یا رائے پر عمل کیا جائے جس میں آسانی اور موجودہ زمانے کے حالات کا لحاظ ہو تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے ۔ اور مسلمانوں میں اتحاد اور محبت کا جذبہ ایک بار پھر ابھر آئے گا ۔

مراجع

	صفحات
۱۔ مقدمہ اعلاء السنن از مولانا ظفر احمد عثمانی	۱۰ - ۱۳
۲۔ بیس بڑے مسلمان از مولانا عبدالرشید ارشد	۲۱۵ - ۲۱۶
۳۔ مقدمہ امداد الفتاوی از مولانا مفتی محمد شفیعؒ	۱۶ - ۱۷
۴۔ ایضاً	۱۷ - ۱۸
۵۔ اشرف السوانح مرتبہ خواجہ عزیز الحسنؒ ، جلد ۔ ۴	۵۴ - ۵۵
۶۔ مقدمہ اعلاء السنن ،	۱۴ - ۱۶
۷۔ اشرف السوانح ، جلد ، ۳ ،	۲۴۹ - ۲۵۰
۸۔ حیات اشرف از غلام محمد	۱۱۲ - ۱۱۳
۹۔ حکیم الامت از عبدالماجد دریا بادیؒ	۷۷ - ۷۸
۱۰۔ یاد رفتگاں از سید سلیمان ندویؒ	۲۹۲ - ۲۹۵

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
قدس اللہ سرہ العزیز
کی
مجددانہ شان تربیت و ارشاد

نواب عشرت علی خان قیصر

حکیم الامت رفت و من وارفتہ حیرانم   کہ نتواں پیش کس بردن چنیں حال پریشانم
مریضم مبتلائے دل کجا جویم دواء دل   کجا یابم شفائے دل زعلتہائے پنہانم

حکیم الامت کا لقب

حق تو یہ ہے کہ حکیم الامت کا لقب صرف اسی ایک ہستی کو زیب دیتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں مجدد دین اسلام محی السنۃ وحامی شریعت وماحی شرک وبدعت وضلالت اور مسیا امت کی حیثیت سے مبعوث ہوا۔

کنتم خیر امۃ اُخرجت للناس قرآن کریم کی اس آیت سے بعض مفسرین نے استنباط کیا ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کے لیے آخری نبی بنا کر مبعوث فرمایا اسی طرح امت محمدیہ کو بھی آخری امت بنایا ہے اور یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی آخری حکیم الامت تھے۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے کہ

قدم راہ نبی میں اور پنجہ نبضِ اُمت پر   حکیمانہ نظر رہتی تھی قبض وبسط اُمت پر

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے جمیع کمالات ومقالات کا احصار ایک مختصر سی تحریر و تقریر میں کوئی کیا کر سکتا ہے بالخصوص راقم الحروف تو اس کا بھی اہل نہیں کہ اس موضوع پر قلم اٹھائے بہرحال جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور تھوڑا بہت جو پڑھا ہے اس کی روشنی میں یہ چند اوراق پیش خدمت ہیں۔ حضرت حکیم الامتؒ کی تعلیمات وتصنیفات وملفوظات کا

سلسلہ اس قدر ضخیم و وسیع ہے کہ جتنی ریسرچ کی جائے گی پھر بھی تشنگی رہے گی۔ اشرف السوانح کی تین جلدیں (مؤلفہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ) "بصائر حکیم الامت" "مآثر حکیم الامت" "معارف حکیم الامت (مؤلفہ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ) "مجالس حکیم الامت (از مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ) "تجدید دین کامل" "تجدید تصوف و سلوک" "تجدید تعلیم و تبلیغ" وغیرہ (مصنفہ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ) "حضرت حکیم الامت کے آثار علمیہ" (مؤلفہ حضرت مولانا سلیمان ندویؒ) "حکیم الامت" (مصنفہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)، "انفاس عیسیٰ" (از حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ) "احسن الکلام" (از حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ صاحب امرتسریؒ) "القول الجلیل" (از حضرت مولانا جلیل احمد شیروانیؒ) "بزم اشرف کے چراغ" (مؤلفہ پروفیسر سعید احمد صاحب) نیز دیگر اکابر کے قلمبند کردہ ملفوظات و مقالات اب تک منصہ شہود پر آچکے ہیں اور بار بار طبع ہوتے رہتے ہیں لیکن ہنوز یہ حالت ہے کہ

ع نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

اس حقیقت کا اعتراف خود مذکورہ بالا مصنفین و مؤلفین کرام و مجازین عظام نے بھی کیا ہے۔

سرکارِ مدینہ کا انعام

حضرت حکیم الامتؒ کو یہ خطاب دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا ہوا ہے یہی وجہ مقبولیت ہے۔ انشاء اللہ تا قیامت زبان زدِ خلق رہے گا۔ یہ محض ایک دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے بلکہ اس واقعہ کی تفصیل یوں ہے کہ جب حضرت حکیم الامت کو یہ انعام خاص دربار نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا تو اس انعام کے اظہار تشکر کے طور پر حضرت والا" نے ایک وعظ فرمایا اس کا عنوان ہے "شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمۃ" یہ بیان بروز جمعہ، ربیع الثانی ۱۳۴۷ھ جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا تھا حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے قلمبند کیا تھا۔ حضرت حکیم الامتؒ نے اپنا بیان شروع کرنے سے قبل یہ آیت تلاوت کی۔ "لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رءوف الرحیم" بعد تلاوت فرمایا کہ "اس وقت جو میں نے اس مضمون کو اختیار کیا ہے اس کو داعی ایک خاص تازہ انعام ہے جو اس بندہ پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے عطا ہوا ہے جس کے شکریہ میں متحیر تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ بعض احباب نے مشورہ دیا کہ اگر آج وعظ

میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کر دیے جائیں تو یہ بھی اس انعام کے شکریہ کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ بیان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو نفع پہنچ جانے کی امید ہے اس وقت وعظ لکھنے کا سامان بھی نہ تھا کیونکہ نماز کے لیے آتے ہوئے رستہ میں یہ مشورہ ہو مگر خدا تعالیٰ کو چونکہ منظور تھا۔ وقت کے وقت سب انتظام ہو گیا۔ اس لیے میں نے اس آیت کو بیان کے لیے اختیار کیا تاکہ اس نعمت کے شکریہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بیان ہونے سے تسلی ہو جائے۔

حکیم الامت کو میرا سلام

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ اس وعظ کو قلمبند کرنے کے بعد حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں " وہ انعام خاص یہ ہوا کہ ایک شخص صالح ذاکر شاغل جن کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بیداری و خواب میں اکثر ہوتی ہے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضورؐ نے ان سے ارشاد فرمایا "حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا" وہ بزرگ متردد ہوئے کہ میں تو تھانہ بھون کبھی نہیں گیا، مولانا کو سلام کیسے پہنچاؤں گا۔ تو خود حضورؐ ہی نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے مولوی صاحب (مراد مولانا ظفر احمد صاحبؒ تھے) جب وہاں جائیں گے ان سے کہہ دینا وہ پہنچا دیں گے۔" مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ رقم طراز ہیں کہ "جب میں نے حضرت حکیم الامت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پہنچایا تو حضرت کی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ جس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ جواب میں حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا کہ میری سمجھ میں تو کوئی لفظ بھی ایسا نہیں آتا جس سے حضورؐ کے سلام مبارک کا جواب دوں" پھر بعد میں فرمایا کہ "یوں جی چاہتا ہے کہ آج درود شریف زیادہ پڑھوں وہ بھی ان الفاظ سے۔ الصلوٰۃ والسلامُ علیک یا رسول اللہؐ۔ حضرت والا کی اس واقعہ سے جو حالت ہوئی وعظ کے وقت اس کا کسی قدر ظہور ہوتا تھا۔ اگر حضرت مولانا ضبط کامل سے کام نہ لیتے تو واقعی سننے والوں پر قیامت آجاتی" یہاں تک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کا بیان بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔

خطاب ربانی

جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت برحق ہے اسی طرح حضور کا قول بھی سچا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود اگرچہ از حلقوم عبداللہ بود

دراصل یہ خطاب ربانی ہے جو بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حکیم الامت کو عطا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ” وَمَا یَنۡقُ عَنِ الۡهَوٰی اِلَّا مَا یُوحٰی “ الفاظ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وحی غیر متلو ہیں چونکہ اس عطا میں رضائے الٰہی شامل ہے۔ اس لیے حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحبؒ کا یہ وصفِ حکمت ابدی و سرمدی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی حکمت ودیعت فرمائی تھی کہ جسکی نظیر شاید قرون ثلاثہ کے بعد کے اولیآ کاملین میں بھی مشکل سے نظر آئے گی مَنۡ اُوتِیَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا اس آیت کی تفسیر میں بعض علماؔ نے ”حکمت“ کو ایک صحیح فہم دین سے تعبیر کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کو اس آیت کا مورد بنایا تھا اور خیر کثیر سے مالا مال فرمایا لہٰذا یہ مُنتج ہوا کہ جس ذاتِ گرامی کو منجانب اللہ صحتِ فہم دین نصیب ہو جائے جو حقیقتاً خیر کثیر اور ایک عظیم نعمت ہے پھر وہی شخصیت اس کی مستحق ہے کہ مجدد ملت کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو کر علوم دین کی صحیح تشریح و تبلیغ و ترجمانی کرے اور اس کا ہر قول و عمل مستند و معتبر سمجھا جائے گا۔ وہی عالم ربانی اس کا اہل ہے کہ بوجہ اپنے تقویٰ و تبحر علمی اور اتباع سنت کے اجتہاد کرے۔

جملہ دینی علوم وفنون پر مکمل عبور و تخصیص

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ ان کو علوم قرآن و حدیث و تفسیر و تصوف و فقہ و افتاء علم کلام، منطق تعلیم و تبلیغ و تدریس و تربیت، شعر و ادب، غرضیکہ ہر فن میں بدرجہ اتم کمال حاصل تھا بالفیض پر تو امداد حق ہر فن میں کامل تھا۔ حضرت حکیم الامتؒ علم تصوف کے نہ صرف ماہر فن داں تھے بلکہ امام و مجدد و مجتہد و محقق تھے۔ عہد نبوی سے بُعد ہو جانے کے بعد جب ترکِ سنت عام ہونے لگا تو عجمی آمیزش نے تصوف کی صورت و روح دونوں کو مسخ کر کے طریق نبوت سے ہٹا کر ایک نیا باطل نظام رائج کر دیا۔ اس طرح باطل فرقوں نے جنم لیا جس کے نتیجہ میں فسق و فجور شرک و ضلالت، رسومات و توہمات، زیغ و بدعات زندقہ و الحاد کے غلیظ مجموعہ کو تصوف جیسی لطیف نفیس شے کا نام دیا جانے لگا۔ تصوف اس قدر لطیف و معتدل ہے کہ اگر بگڑ جائے تو اس کی افراط و تفریط یا تو مجنوں بنا دے یا پھر زندیق بن جائے۔ لہٰذا بغیر کسی رہبر کامل اور واقف کے اس طریق میں

قدم رکھنا نہایت ہی خطرناک ہے اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات کے انوار سے اپنی شان کے مطابق حضرت حکیم الامت کے مرقد کو یوماً فیوماً تا قیامت منور فرماتا رہے کہ وہ امت کے لیے دین کے موجودہ اور آئندہ فتنوں کی نہ صرف نشاندہی کر گئے بلکہ ان سے بچنے کا طریقہ بھی تجویز فرما گئے۔ چنانچہ وعظ "روح الارواح" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

شریعت، طریقت وحقیقت

شریعت کہتے ہیں مجموعہ احکام الٰہیہ کو جن میں احکام ظاہرہ باطن سب داخل ہیں۔ احکام ظاہری و باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ احکام ظاہری کے معنی یہ ہیں کہ احکام متعلق بالظاہر۔ مثلاً حکم ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز پڑھو اور ادائے حقوق کے ساتھ پڑھو اس میں دونوں احکام ہیں ظاہر و باطن کے یعنی ظاہر ادائے ارکان باعتدال اور باطن یعنی اخلاص خشوع و خضوع جو حقوق صلوٰۃ میں داخل ہیں متاخرین کی اصطلاح میں احکام باطن کی تحصیل کے طریق کو طریقت کہتے ہیں۔ اور شریعت اس سب کے مجموعہ کا نام ہے طریقت اسی کا جزو ہے۔ جیسے شریعت کا ایک جزو کتاب الصلوٰۃ ہے ایک کتاب الزکوٰۃ ہے اسی طرح اس کا ایک جزو کتاب الاخلاص ہے۔ الشکر ایک جزو کتاب الصبر ایک جزو کتاب المحبت بھی ہے۔ غرض طریقت بھی شریعت کا جزو ہے۔ اس کے مقابل کوئی چیز نہیں ہے اور شریعت مجموعہ ہے ان سب کا۔ جب آدمی شریعت پر پورا عمل کرتا ہے تو اسے حسب التعداد بعض وجوہ تکوینیہ تعلق بین الحق والخلق کے منکشف ہوتے ہیں مثلاً مسئلہ تقدیر کی تحقیق، تجدد امثال کی کیفیت، روح کی حقیقت، جن کا عدم انکشاف بھی مضر نہ تھا اور بعض وجوہ تشریعیہ تعلق مذکور کے منکشف ہوتے ہیں جس کو "علم معاملہ" کہتے ہیں اور جن کا انکشاف حسب التعداد لازم ہے ان وجوہ کو حقیقت کہتے ہیں ان انکشافات سے خدا تعالیٰ کی شناخت بڑھتی ہے اس کو معرفت کہتے ہیں یہ تحقیق ہے ان اصطلاحات کی۔ اب ثابت ہو گیا کہ نرے باطن پر اکتفا کیا تو محض باطل ہے اور جس کو ظاہر پر اکتفا کرنا سمجھا جاتا ہے وہ محض عاطل یعنی بیکار نہیں ہے بس نرا ظاہر والا نرے باطن والے سے اچھا ہے۔"

خانقاہی فتنے اور پیری مریدی

جس طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے دور

میں اکبر بادشاہ کے فتنہ دین الٰہی کا خاتمہ کیا اسی طرح تقریباً پانچ سو سال بعد اللہ تعالیٰ نے ایک مجدد وقت اور حکیم الامت کو مبعوث فرمایا جنہوں نے مدتوں کا قائم کردہ طلسم خانقاہی توڑ ڈالا مادیت وروحانیت، فلسفہ ونفسیات، اہنسا ورہبانیت، جمود وقنوطیت، ایرانی شعریت ومتصوفیت، ہندو جوگیوں کی ویدانت سے متاثر ہو کر مبتدعیوں، جاہل صوفیوں، دکاندار پیروں اور گندم نما جو فروش مشائخ نے جو بُت تراش رکھے تھے حضرت حکیم الامت نے اپنی تلقین و تقریر وتصنیف وتبلیغ کے ذریعہ سب کو پاش پاش کر دیا۔ پیروں نے اپنی مطلب براری اور تکمیل اغراض نفسانی کی خاطر ایسی خانقاہیں اور لنگرخانے کھولے کہ بجائے اصلاح باطن، ذکر و تلاوت، تقویٰ وطہارت کے وہاں فحاشی ومنکرات کے اڈے بن گئے۔ اولیاء اللہ کے مزارات پر عرس کے ایام میں قوالیوں اور رقص وسرود کے جھمگٹے لگتے تھے۔ حظ نفسانی کو حظ روحانی اور عبادت سمجھا جانے لگا۔ طبلہ اور سارنگی کی تُن تُن میں جو مزا ہے وہ بھلا نماز میں کہاں آتا۔ اجمیری، کلیری اور ہجویری رحمہم اللہ کے مزارات کے سجادہ نشینوں پہ نذرانوں کی بکھیریں اور قبروں کے چڑھاوے، ہدایا شمار ہوتے ہیں۔ وحدت الوجود، وحدت الشہود، ہمہ اوست وہمہ از اوست، لطائف و دوائر کے چکر اور بھول بھلیوں میں گم ہو کر فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کو فراموش کر بیٹھے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کی ایک چھوٹی سی سہ دری میں بیٹھ کر تمام اسرار و رموز کو فاش کر دیا کہ سینہ بسینہ کوئی چیز نہیں ہے۔ شریعت وطریقت اصل میں ایک جان و دو قالب ہیں۔ یہ پہلا دینی انقلاب تھا جو ایک مجدد کے ہاتھوں برپا ہوا۔ اور الحمد للہ کامیاب رہا۔ دنیا کو دکھا دیا کہ خانقاہ کس کو کہتے ہیں اور کیسے چلائی جاتی ہے جہاں نہ سیاست پہ گفتگو ہوتی تھی نہ کسی کی غیبت۔ نہ کوئی تجارت، نہ کسی کو کسی سے اذیت پہنچتی ع

فردوس گر بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

جہاں بقول خواجہ صاحب مجذوبؒ کہ

چسکا لگا ہے جام کا
شغل ہے صبح وشام کا
اب میں تمہارے کام کا
ہم نفسو نہیں رہا

حیات المسلمین الہامی کتاب ہے

خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں اگر کوئی مشغلہ تھا تو صرف ایک کہ طالبین و سالکین کی اصلاح ہو جائے ظاہری اور باطنی بھی۔ فکر تھی تو بس ایک کہ امت مرحومہ میں پھر جان پڑ جائے۔ اس کی نشاۃ ثانیہ ہو جائے "حیاۃ المسلمین" اور "صیانۃ المسلمین" اسی مقصد کے تحت وجود میں آئیں مسلمانوں کے زوال اور پستی کا واحد حل یہی ہے کہ وہ ان دونوں تصنیفات کے لائحہ عمل پر کاربند ہو جائیں جن میں حکیم الامت ؒ نے امت کو تمام بیماریوں کا علاج تجویز فرما دیا ہے اپنی تمام تصنیفات میں سے صرف "حیات المسلمین" کے بارہ میں فرمایا۔ ملفوظ "میرا غالب خیال یہی ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں" ذرا غور فرمائیے کہ تقریباً ایک ہزار کتابوں کا مصنف اپنی جملہ تصانیف میں سے رجو مشکل ہیں نہایت عظیم و وقیع اور دقیق علوم و فنون پر صرف ایک مختصر سی کتاب کو اپنے لیے وسیلۂ نجات اور سرمایہ حیات خیال فرماتے ہیں لیکن افسوس کہ ہم اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں، دور حاضر کے جتنے فتنے ہیں جن میں آج ہر خاص و عام، عالم و عامی مسلمان مبتلا ہے ان سب کا سد باب "حیات المسلمین" میں موجود ہے خود حضرت حکیم الامت ؒ نے حیات المسلمین" کے دیباچہ میں وجہ تصنیف یہ بیان فرمائی ہے کہ "مجھے اس وجہ سے توجہ ہوئی کہ چند دنوں سے مسلمانوں کی بدحالی سے مجھے سخت قلق ہوا جس نے مجھے بیقرار اور لاغر کر دیا پس لطف الٰہی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ۲۰ جمادی اولیٰ ۱۳۴۸ھ کو نماز فجر میں میرے دل میں اللہ نے ڈالا کہ بعض اعمال کو بعض مصیبتوں کے جن کے برداشت کی لوگوں کو طاقت نہیں ہے دور کرنے میں خاص دخل ہے ان میں سے بعض اعمال سے تو جہل رفع ہو جاتا ہے اور بعض سے افلاس اور بعض سے تشویش و پریشانی اور یہی تینوں چیزیں یعنی جہل و افلاس و تشویش ہی تمام بلاؤں اور مصیبتوں کی جڑ ہیں پس ان تینوں کی اصلاح سے دوسری تمام باتوں کی بھی اصلاح ہو جائے گی اور یہ بات بھی من جانب اللہ اسی وقت دل میں آئی کہ ان اعمال میں سے کچھ لکھو اور مسلمانوں کو پہنچاؤ۔ دخل کی وجہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عام لوگوں کے لیے نافع اور مقصود مسائل ہیں نہ کہ دلائل۔ خدا نے مجھے امید دلائی کہ اس سے یہ بلائل جائے گی اور لوگوں کو نفع ہوگا" حضرت مولانا شاہ وصی اللہ ؒ اعظم گڑھی جو حضرت حکیم الامت ؒ کے اجل خلفا میں

سے کتے اپنے ضمیمہ دیباچہ حیوٰۃ المسلمین میں رقم طراز ہیں "حیاۃ المسلمین بظاہر ایک چھوٹا سا رسالہ ہے لیکن ادنیٰ غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے یہ پوری کتاب حرزِ جان بنانے کے قابل ہے" مسلمانوں کے زوال اور پستی کا واحد حل یہی ہے کہ ہمارے عقائد صحیح ہو جائیں اور ہمارے اعمال میں صلاح پیدا ہو جائے" تاکہ عقیدہ و عمل میں کوئی تضاد باقی نہ رہے

"حیاۃ المسلمین" میں پچیس ۲۵ ابواب قائم کیے ہیں اور ہر جزو کو ایک روح کا نام دیا ہے کیونکہ وہی اساسِ حیات ہے اور ہر مسلمان کو اپنی دونوں حیات دنیوی اور اُخروی میں فلاح و نجات کی ضرورت ہے یہی اس کتاب کا مقصود ہے اور جنہوں نے اس پر عمل کیا ہے ان کو الحمد للہ مقصود حاصل ہو گیا۔

امتیاز قومی اور تشخص اسلامی

حضرت حکیم الامتؒ نے بطور تسہیل دینِ اسلام کو پانچ اجزاء پر منقسم کیا ہے۔ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور معاشرت گو کہ ہر شعبہ میں مسلمانوں سے کوتاہی و غفلت اور روگردانی ہو رہی ہے بلکہ بعض امور شریعت میں تو انکار تک کی نوبت آگئی ہے استعاذ باللہ لیکن عملی لحاظ سے سب سے زیادہ آج کل ضرب کاری ہمارے معاشرہ پر لگی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا قومی و اسلامی تشخص ختم ہو چکا ہے خواہ کوئی بین الاقوامی فورم ہو یا کسی انٹرنیشنل سرکاری و غیر سرکاری تنظیم اور ادارہ کا اجتماع ہو حتیٰ کہ اسلامی ممالک کے مندوبین مثلاً موتمرِ عالم اسلامی کا اجتماع ہو اسلامی SUMMIT کانفرنس ہو ان کے شرکاء کے لباس و پوشاک، وضع قطع، طور طریق، بول چال، رہن سہن، نشست و برخاست، طعام و قیام اور ظاہری شکل و شباہت سے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان میں کون مسلمان ہے اور کون نصرانی ؟ بقول اقبال

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود   یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اقوام متحدہ (یو این او) کے جلسوں میں مقررین کی تصاویر دیکھ کر بشرطیکہ ان کا نام مندرج ہو اور نہ ان کو پہچانتا ہو تو کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ اردن کے شاہ حسین بول رہے ہیں یا اسرائیل کا نمائندہ ہے غیر وابستہ ممالک کے (NON ALLKNEI) مندوبین کی کانفرنس میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ پاکستان کا وزیر خارجہ ہے کہ یوگوسلاویہ کا نمائندہ ؟ غرضیکہ غیر مسلم اقوام اور غیر مذاہب کے افراد کے ساتھ ہم نے اس قدر تشبہ پیدا کر لیا ہے کہ اپنا دینی شعار کھو بیٹھے اور "من تشبہ بقوم

"فہو منہم" کا مصداق بن گئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا حکم ہے "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" حضرت حکیم الامتؒ نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ظالموں یعنی نافرمانوں کی طرف باعتبار دوستی یا شرکت اعمال احوال کے مت جھکو یعنی مت مائل ہو ورنہ تم کو دوزخ کی آگ لگ جاوے گی۔ ف یہ یقینی بات ہے کہ اپنی وضع اور طریقہ چھوڑ کر دوسرے کی وضع اور طریقہ خوشی سے تب ہی اختیار کرتا ہے جب اس کی طرف دل جھکے اور نافرمانوں کی طرف جھکنے پر دوزخ کی وعید فرمائی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایسی وضع اور طریقہ اختیار کرنا گناہ ہے"

(ماخوذ از رفع بست و پنجم حیات المسلمین)

مسلمانوں کی پریشانیوں اور مصائب کے دفع کرنیکی تدابیر

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ مسمیٰ بہ "الاستغفار"

۱۱ صفر ۱۳۳۲ھ کو ایک جامع مسجد سہارن پور میں ہوا تھا۔ تقریباً پچھتر سال قبل حضرت حکیم الامت نے امت مسلمہ کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا جو سبب تشخیص کیا ہے وہ آج بھی صادق آتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ پریشان ہیں اور یوں تو ہر شخص کو خاص خاص پریشانیاں ہیں مگر ایک عام پریشانی اور مشترک و مدید شکایت تنزل اور پستی کی ہے کہ یہ پرانی شکایت ہے۔ انسان کو جو مصیبت لاحق ہوتی ہے عقل اس کی مقتضی ہے کہ اس کی تدبیر کرے اور تدبیر بھی وہ جو صحیح تدبیر ہے۔ ہمارے بھائیوں کی یہ حالت ہے کہ بعضے تو ان میں سے ایسے جواں مرد ہیں کہ تدبیر پرواہ ہی نہیں کرتے اور بعضے جو کرتے بھی ہیں وہ الٹی تدبیر کرتے ہیں۔ بعضے تو صرف یہ کرتے ہیں کہ شکایت کرتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ امسال ایسی خشکی ہوئی ہے کہ مویشیوں کو چارہ تک نہیں ملتا ہے بھوکے مر رہے ہیں کوئی کہتا ہے کہ اس فصل میں بارش نہیں ہوئی لہٰذا گرانی اور مہنگائی بہت زیادہ ہو جائے گی جو ذرا دیندار ہیں وہ کہتے ہیں کہ میاں یہ سب ہماری شامت اعمال ہے۔ مگر اصلاح وہ بھی نہیں کرتے اور جو اصلاح جدید میں ذرا مہذب ہیں وہ ترقی اور تنزلی پر لیکچر دیتے ہیں" وغیرہ سبب اصلی ہر بلا اور مصیبت کا معصیت ہے۔ خدا تعالیٰ کی نافرمانی جو اصلی سبب ہے پریشانیوں کا اس کو تو چھوڑتے نہیں اور بالائی تدبیریں کرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ جب تک کہ مرض کے اصلی سبب کا استیصال نہ کیا جائے گا مرض نہ جائے گا بس جب تک کہ معصیت نہ چھوڑ دیں گے ان بلاؤں سے

خلاصی نہیں ہو سکتی سوا اس سبب کی طرف کسی کو التفات تک نہیں ہے۔ ظاہری تدبیریں کرتے ہیں لیکن اصلی تدبیر سے غفلت ہے غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ فضول اور لغو میں تو مشغول ہیں اور جو اصلی اور صحیح تدبیر ہے اس سے غفلت ہے اور وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہے یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ" (ماخوذ از وعظ الاستغفار)

موجودہ معاشرہ کی بدحالی

فی زمانہ ہمارے ملک کی جو حالت ہے وہ اظہر من الشمس ہے ہر طرف انتشار و پریشانی، ہنگامے فسادات، قتل و خوں ریزی فرقہ بندی، صوبائی اور لسانی جنگ و جدل، تخریب کاری و بدامنی کا دور دورہ ہے۔ اتفاق و اتحاد کے بجائے عداوت و ناچاقی و جاسوسی ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ منکرات و خواہشات ہر سو نظر آتے ہیں، عورتوں کی بے پردگی اب عریانی اور بے حیائی تک پہنچ چکی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حصول تعلیم کے جگہ سیاسی غنڈہ گردی عام ہے الحاد اور دہریت کا لٹریچر زیر مطالعہ ہے۔ مخلوط تعلیم اور مخلوط ملازمت کے نتیجہ میں اغوا و اسقاط کے واقعات روزانہ کا معمول ہیں۔ کسب حلال ناپید ہے رشوت و سود خوری اور اسمگلنگ کا بازار گرم ہے۔ گھر گھر میں ریڈیو، گانا بجانا، ٹیلی ویژن اور وی سی آر کی لعنتیں موجود ہیں۔ حکومت کے دفاتر میں ظلم اور ایذا رسانی۔ عدالتیں انصاف سے خالی ہسپتالوں میں مریضوں کی لاچاری و بیکسی دیکھی نہیں جاتی غرضیکہ ہمارے گندہ معاشرہ کا نقشہ ایسا ہے کہ جتنا تفصیل میں جائیں اسی قدر انقباض و تکدر بڑھتا ہے اور ان خباثتوں کے بیان کرنے یا باہمی شکوے شکایات سے بقول حضرت حکیم الامتؒ کوئی فائدہ نہیں" تاوقتیکہ ہم اس کی تدبیر نہ کریں اور ان تدابیر پر عمل پیرا ہوں۔ اور تدبیر وہی ہے یعنی ترک معصیت اور انابت الی اللہ۔ بعنوان دیگر احکام شریعت کو بجا لائیں۔ برخلاف اسکے ہو یہ رہا ہے کہ شہروں میں امن کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر متحارب فرقوں کے جلوس نکالے جا رہے ہیں، بھائی بھائی کے نعرے لگ رہے ہیں حکومت کے وزرا اور ارباب حل و عقد، سیاسی زعما اور علماء دین سب موجودہ فسادات و بدامنی کے خلاف ہیں لیکن کوئی بندہ خدا یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام شر و فساد کس کے حکم اور مشیت سے برپا ہے۔ جو خالق خیر ہے وہی خالق شر بھی ہے جس نے زہر پیدا کیا ہے اسی نے تریاق بھی پیدا کیا لہٰذا جس کے حکم سے بسبب ہماری شامت اعمال کے یہ مصیبتیں اور بلائیں نازل ہوئی ہیں اسی سے ہمیں رجوع کرنا چاہیے

مناہیات ومنکرات کا سدّ باب

حضرت حکیم الامت ؒ فرماتے ہیں کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی تدبیر حقیقی صرف اطاعت کاملہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس تدبیر کو اختیار کرو اور دین کی طرف توجہ کرو۔ یاد رکھو اگر اس سے غفلت میں رہے تو بہت پچھتاؤ گے۔ یہاں تو ناکامی ہو ہی رہی ہے، آخرت میں بھی ناکام رہو گے بہت جلدی اصلاح کرلو۔ اس آیت میں اس کا طریقہ مذکور ہے اور وہ طریقہ مرکب ہے دو جز سے اور ان دونوں میں ترتیب بھی ہے اول تو یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے معافی مانگ لو۔ مگر معافی مانگنا یہ نہیں کہ صرف زبان سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہہ لیا یہ تو نقل ہے معافی مانگنے کی جیسے کسی فارسی دیہاتی نے کسی واعظ سے سنا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو آپ فرماتے ہیں " بارہا کردیم و شد نماز " (یعنی ایسا ہم نے بہت مرتبہ کیا اور نماز ہوگئی) وہ نماز نام اٹھنے بیٹھنے کا سمجھے۔ صاحبو ہر گناہ کے استغفار کا طریقہ جدا ہے۔ گناہوں کو دیکھو کہ کیا ہیں؟ اگر حقوق العباد ہیں تو ان کا استغفار یہ ہے کہ ان کے حقوق ادا کرو۔ ان کی معافی محض استغفار پڑھنے سے نہ ہوگی۔ اگر روزے نماز ذمہ ہیں تو ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کی قضا کرو۔ اگر گناہ ہیں تو ان کی توبہ کا طریقہ استغفار بندامت کرنا ہے نیز توبہ اور استغفار کے لوازم میں سے ہے معاصی کا ترک کرنا خواہ دیانات کے متعلق ہوں یا معاملات کے مثلاً آج کل لوگ آمدنی اور خرچ کے طریقوں میں حدود شریعت کا لحاظ نہیں رکھتے اس زمانہ میں آمدنی کے بہت سے طریقے خلاف شرع شائع ہوئے ہیں کہ جوئے اور ربوا سے خالی نہیں ہیں۔ آج کل جو سٹہ چل رہا ہے اس سے پرہیز نہیں کرتے ان سٹے والوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ نمازی ہیں، لمبی ڈاڑھی، ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہاتھ میں تسبیح، بڑے متقی لیکن سٹہ سے انکا تقویٰ نہیں ٹوٹتا یاد رکھو یہ بالکل جوا ہے۔ اسی طرح چٹھیاں پڑتی ہیں یہ بھی جوا ہے اس سے بڑھ کر جو بیمہ کمپنیاں نکلی ہیں وہ بھی حرام ہیں ان کے تو شروع ہی میں بیمہ آگیا ہے شادی فنڈ، جان کا بیمہ وغیرہ ایک قسم کے ٹکٹ کی تقسیم کا سلسلہ (پرائز بونڈ۔ راقم الحروف) یہ سب حرام و قمار و جوا اور ربوا ہیں۔ یہ تو آمدنی کے طریق ہیں اور خرچ کے اندر تو کچھ باک ہی نہیں جہاں چاہتے ہیں تنعمات ہیں، فضول سامان ہیں، ناموری کے کاموں میں بے دھڑک خرچ کرتے ہیں سمجھتے ہیں کہ اپنی شے ہے جس طرح چاہیں صرف کریں اور سب سے زیادہ گندہ مصرف جو اس شہر میں کثرت سے ہے کوکین کھاتا ہے (جیسے آج کل ہیروئن کا استعمال۔ راقم الحروف) اس سے سیکڑوں گھر

برباد ہوگئے ظاہر میں تو ذرا سی چیز ہے لیکن مفاسد اس کے کثیر ہیں۔" (ماخوذ از وعظ الاستغفار)

عصرِ حاضر کے علما اور صلحا

حضرت حکیم الامت ؒ کی یہ پیشگوئی اس دور کے مسلمانوں پر ہوبہو صادق آتی ہے اگر کوئی شبہ کرے کہ استغفار کی جاتی ہے اور دعائیں بھی مانگی جاتی ہیں مگر پھر بھی مصیبتیں نہیں ٹلتی ہیں اس کے جواب میں حضرت ؒ ارشاد فرماتے ہیں "صاحبو۔ جواب یہ ہے کہ یہ تدبیر کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ یہ کیا تدبیر ہوئی کہ ایک نے تو تدبیر کی اور زیادہ لوگ اس کی ضد اور خلاف کریں یعنی ایسے اعمال کریں کہ ان کا اثر ہو اور اثر غالب ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو زیادہ ہوں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا" أنهلك وفينا الصلحون۔ (کیا ہم ہلاک کر دیئے جائیں گے۔ حالانکہ ہمارے درمیان نیک آدمی بھی ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نعم اذا کثر الخبث "پس جب زیادہ سوء تدبیر کے مرتکب ہیں تو باوجود بعض قلیل کے تدبیر کرنے کے مصائب کا نزول کیا محلِ شبہ رہا۔ باقی رہی یہ بات کہ ان صلحا پر تو وہ مصیبت نہ آنا چاہیے بعض حکمتوں سے عادۃ اللہ یہی ہے کہ اس حالت ہی دنیا میں جو مصیبت آتی ہے اس میں سب ہی شریک ہوتے ہیں ہاں البتہ آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق محشور ہوں گے اور دنیا میں بھی وہ مصیبت ظاہری ہے حقیقت میں صلحا کے حق میں وہ رحمت ہی ہوتی ہے سو بعض صلحا کے اعتبار سے تو یہ جواب ہے لیکن بعض صلحا کے اعتبار سے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ اس زمانہ میں بعض صلحا بھی منکرات تو دیکھتے دیکھتے مُداہن ہو گئے ہیں اب جو لوگ علماء اور اتقیاء اور صلحاء کہلاتے ہیں باستثناءً خواص اہل اللہ کے، اکثر کی یہ کیفیت ہے کہ نافرمانی کرنے والوں سے ان کو انقباض نہیں ہوتا۔ بے تکلف میل جول کھانا پینا۔ شادی بیاہ، مرنے جینے میں شرکت اہل معصیت کی کرتے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ کے طرق کی بھی اصلاح کیجیے۔ نیز توبہ و استغفار کا ایک شعبہ اخلاقِ ذمیمہ کی بھی اصلاح ہے چنانچہ دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ۔ یعنی بعد استغفار کے حق تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے۔ آگے ارشاد ہے وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر مُطلق وَلَا تَتَوَلَّوْا نہیں فرمایا اس لیے کہ تولّی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صورتِ تولّی اور

ایک حقیقت تولیٰ ۔ صورۃً تو یہ کہ بشریت کے سبب غلطی ہوگئی ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا اور حقیقت تولّی ہوتی ہے مقابلانہ اور باغیانہ ۔ لہٰذا فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولّی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کرلو ۔ حدیث شریف میں ہے کہ کلکم خطّاؤن وخیر الخطائین التوّابون ۔ یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریقہ وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمانی دینی دنیوی ترقی حاصل ہوتی ہے اس کو پلّے باندھو یاد رکھو کہ ہماری دنیوی فلاح دین کے ساتھ وابستہ ہے جب کبھی اس کے خلاف ہوا ہے مسلمانوں پر تنزّل و پستی اور ادبار و قحط و فسادات سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں " (ماخوذ از وعظ الاستغفار)

مذکورہ بالا اقتباس صرف ایک وعظ سے نقل کیا ہے ورنہ سینکڑوں مواعظ اور لاتعداد ملفوظات میں حضرت حکیم الامتؒ نے مسلمانوں کے زوال و ادبار کے اسباب پر کھل کر روشنی ڈالی ہے اور ان کے دفعیہ کی صحیح تدابیر بھی تجویز فرمائی ہیں یہ نہیں کہا کہ صرف مرض تشخیص کر دیا اور نسخہ نہ دیا ۔ بلکہ ایک مکمل اصلاحی نصاب مدوّن فرما گئے ۔

قانون شریعت کا نفاذ

کاش کہ ہمارے ملک میں شریعتِ مقدسہ کا قانون نافذ ہو جاتا اور ہمیں اتباعِ شریعت نصیب ہوتا تو آج ہم موجودہ فتنوں اور فساد کا شکار نہ بنتے ۔ حضرت حکیم الامتؒ کا ایک وعظ ہے "الشریعت" جس میں فرمایا کہ شریعت ایسی حسین چیز ہے بلاوجہ لوگ ڈرتے ہیں حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر توجہ ہے " اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ آج مسلمانوں کو کہیں بھی چین و سکون نصیب نہیں ہے کیونکہ سنت کو چھوڑ رکھا ہے ۔ شریعت بل کے منظور کرنے میں نہ صرف حکومت خلاف ہے بلکہ مختلف مکاتب فکر کے علماء و دانشوروں ، سیاستدانوں و قانون دانوں ، طلبا و اساتذہ اور مغرب زدہ انجمن خواتین نے محاذ قائم کر رکھا ہے کہ شریعت مطہرہ کا نفاذ نہ ہو ۔ جو حضرات شریعت بل کے مخاطب ہیں اور اپنے تئیں عقلاء گردانے جاتے ہیں وہ قرآن کریم کی نظر میں دراصل جہلاء ہیں ۔ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ نے نصِ قرآنی سے یہ ثابت کر دیا ہے لہٰذا حضرت حکیم الامتؒ کی زبان مبارک سے

سن لیجئے " اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرماتے ہیں ثمّ جعلنٰک علی شریعۃٍ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الّذین لا یَعلمون یعنی ہم نے آپ کو دین کے خاص طریقہ (شریعت) پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے اور ان جاہلوں کی خواہشوں پر نہ چلئے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں یعنی ہوائے نفسانی ہیں ان لوگوں کی جاہل ہیں۔ حضرت حکیم الامت اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ الّذین لا یعلمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی الّذین یعلمون کی اہوا کا اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے مطلب یہ کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا مطلب یہ ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔ الّذین لا یعلمون کا مفعول جو ذکر نہیں کیا سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت ہے اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لیے مذموم ہے کہ وہ اہوا ہے اور اہوا اس لیے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے اس لیے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہواء اس لیے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں۔ یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ ساری دنیا کو جاہل بتانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا بھی احتمال خلاف کا نہیں ہے ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اس وقت گو ظاہر میں حضور تشریف نہیں رکھتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضور سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جو اب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہیں کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ ماہ کے لیے بھیج دو خدا کی قسم چھ مہینے

ہیں وہ محقق یہ ثابت کر دے گا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرا لے گا کہ میں احمق ہوں اور اس وقت قسم سے زیادہ کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تو تجربہ کر لو کہ چھ مہینے کی رخصت لو پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو اس وقت دیکھو گے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں نہیں بلکہ احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی صحبت کی برکت سے عقل آ جاوے گی تب معلوم ہو گا کہ اھواء الذین لا یعلمون کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے۔" (ماخوذ از وعظ الشریعت)

جو بات نص قطعی سے ثابت ہے اس میں شک و شبہ کرنا بمنزلہ کفر کے ہے۔

مقام عبدیت وفنائیت

عقل حیران ہے اور یہ بجا ہے کم مائیگی کے اتنی رسائی بھی نہیں ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ کے مقام کو پہچان سکیں۔ اللہ اکبر کیا شان ہے کہ ایک مجمع عام میں فی البدیہہ بیان میں علوم قرآن کی وہ آمد ہے کہ مختلف نوعیت کے مضامین اور حکم و معارف روانی سے بیان ہو رہے ہیں۔ صرف و نحو، منطق و معانی و تفسیر و فقہ و تصوف علم کلام کے دقیق نکات عام فہم زبان میں سمجھا دیئے یہ تو صرف ایک نمونہ ہے ورنہ کوئی بھی وعظ اٹھا لیجئے یہی نتیجہ نکلے گا۔ کہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ بایں ہمہ عبدیت اور فنائیت کی یہ حالت ہے کہ فرماتے ہیں۔ "میں حالانکہ کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ۔ ادنیٰ سے ادنیٰ ہوں، اسی طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ دہلی کے ایک طبیب یہاں آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے وہ سارے نقائص نکلے اور جنہیں ہنر سمجھے تھے وہ سب عیوب تھے تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر شبہ ہو تو تجربہ کر لیجئے۔ اس لیے فرمایا اھواء الذین لا یعلمون کہ جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے"۔

بہر حال حضرت حکیم الامتؒ نے قرآن و حدیث سے یہ ثابت کر دیا کہ اتباع شریعت و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں مسلمانوں کی تمام پریشانیوں، مصیبتوں اور موجودہ ذلت و خواری کا مداوا ہے یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے بلکہ عملی تجربہ سے مشاہدہ کرا دیا۔ حضرت حکیم الامتؒ خود اتباع سنت کا حال تو ان سے پوچھیئے کہ جنہوں نے ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا ہے اور شب و روز خلوت و جلوت کے معمولات دیکھے ہیں کہ ارادات شرعیہ امور طبعیہ بن گئے۔ چھوٹی سی چھوٹی جزئیات

زندگی بھی سنت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ان کے اہل مجلس دراصل اصحاب صفہؓ کا نمونہ تھے بقول خواجہ مجذوب صاحبؒ

تری محفل میں کیا انوار ہیں اے مہ جبیں ساقی
اتر آیا زمیں پر آج کیا عرش بریں ساقی

اصلاح انقلاب امت

یہ حضرت حکیم الامت کی مایۂ ناز تصنیف ہے جس سے مسلمانوں کو بیحد نفع ہوا۔ حق و باطل کا فرق معلوم ہو گیا اور فرائض و واجبات کی ادائیگی میں صحیح و غلط کی پہچان ہو گئی۔ مخالفین اور معاندین نے کفر کے فتوے لگائے قتل کی دھمکیاں دیں، مختلف سازشیں کیں، جھوٹے بہتان باندھے، عزت و ناموس پر رکیک حملے کیے مگر اس مردِ خدا آگاہ نے حق کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ نہ جان و مال کا خطرہ اور نہ عزت و آبرو پر حملہ ان کے پائے ثبات کو متزلزل کر سکا۔ گویا کہ سنت انبیاء کو زندہ کر دیا اور دین میں کسی قسم کی مداہنت و مصلحت آمیزی کو قبول نہیں کیا۔

قصد السبیل لکھ کر درویشی کی حقیقت واضح کر دی کہ اول صغیرہ کبیرہ تمام گناہوں کو چھوڑ دو ظاہر و باطن، وضع قطع، اقوال و اعمال سب سنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ قلندری یہ نہیں ہے کہ ملنگ بن جائے گردن میں رنگ برنگ کی بڑے دانوں کی مالا پڑی ہے اور کسی قبر پہ جھنڈا لگا کر مجاور بن بیٹھا ہے۔ زائرین کو سٹہ کا نمبر بتا رہا ہے نہ نماز ہے نہ روزہ، عقیدہ اور عمل صالح دونوں معدوم۔ حضرت والاؒ ببانگ دہل بار بار انہیں مجالس اور مواعظ میں یہ اعلان فرماتے تھے۔ کہ ایسی درویشی مجاوری ہے یہ دھوکہ اور ڈھونگ چنانچہ ایک وعظ میں فرمایا کہ "اجی کس کی پیری مریدی لیے پھرتے ہو یہ تو پکھنڈ ہے۔ بیعت کی صورت ضروری نہیں ہے اصل چیز بیعت کی روح ہے یعنی اتباع ہے" یوں سمجھ رکھا ہے کہ جو بھید ہیں فقیری کے جو انچھر ہیں برہم کے، وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں یہ خیال ہے کہ مرید کرتے ہی پیر اس کو برہم کے دو انچھر بتا دے گا۔ اور اللہ والا بن جائے گا۔ دھرے تھے انچھر، دھرے تھے بھید یہ سب ڈھیلے پتھر ہیں۔ میاں خدا اور رسولؐ کا نام لو اور ان کے احکام بجا لاؤ بس یہی انچھر ہیں۔ اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو بس یہی بھید ہیں اگر کوئی کہے کہ کیا باطنی طریق بس یہی ہے تو ہم بآواز دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے" غرضیکہ حضرتؒ نے مروجہ پیری مریدی کی سب پول کھول دی۔ ع ـــ

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور میخانہ

تربیت السالک

حضرت حکیم الامتؒ کی ایسی فقید المثال اور فن تصوف میں معرکۃ آرا تصنیف ہے کہ جس کا جواب نہیں۔ ایک ایسی چلتی پھرتی خانقاہ ہے کہ جس نے نفسیات کو محسوسات میں تبدیل کر دیا ہے۔ باطنی امراض کا ایک مریض جس کو کوئی شیخ کامل میسر نہ ہو وہ اس کتاب کے ذریعے اپنا علاج خود کر سکتا ہے شاید ہی کوئی ایسا رذیلہ یا روحانی مرض ایسا ہو کہ جس کا نسخہ اس میں موجود نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو معالج حضرت حکیم الامت نے سالکین کے احوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں وہ محض حضرت کی فن دانی اور علمی تجربات و مشاہدات کی بنا پر ہی نہیں ہیں بلکہ وہ الہامی بھی ہیں اور منجانب اللہ حضرت کے قلب پر القا ہوئے ہیں مثال کے طور پر مختلف سالکین نے اپنا اپنا حال جدا تحریر کیا ہے لیکن بعض امراض ان سب میں مشترک ہیں مثلاً بد نگاہی کا مرض ایک سالک نے لکھا اس کو جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ دوسرے سے مختلف ہے جس طرح ایک حاذق طبیب امراض جسمانی کے مریضوں کو ان کی مزاجی حالت اور جسمانی کیفیت کے مطابق نسخہ تجویز کرتا ہے اسی طرح حضرت حکیم الامتؒ نے بھی ہر سالک کی صلاحیت و استعداد کے موافق علاج بتایا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو یہ کرامت عطا فرمائی تھی کہ ان کو طالب کے خط کی تحریر اور الفاظ دیکھ کر اس کا اصل مرض مکشوف ہو جاتا تھا۔ ایک غیر محرم عورت کے عشق مبتلا ہو جانے کا اصل مرض ایک صاحب نے لکھا جو حسب ذیل ہے:۔

سوال:۔ میں کسی عورت پر عاشق بھی ہوں اور ناجنس دنیا پرست کی صحبت میں بھی ہوں

الجواب:۔ اس دنیا پرست کی صحبت کو یک لخت چھوڑ دو اور اگر اس سے کوئی دنیوی ضروری حاجت متعلق ہو تو کم ملو اور نفرت قلبی کے ساتھ ملو اور اس عورت سے ظاہراً و باطناً دور ہو جاؤ۔ ظاہراً تو یہ کہ اس سے نہ بولو نہ اس کی آواز کان میں پڑنے دو نہ اس کو دیکھو، نہ اس کا تذکرہ کرو نہ اس کا تذکرہ کسی سے سنو۔ اور باطناً یہ کہ اس کا تصور قصداً نہ کرو اور اگر تصور آجاوے تو کسی کام کام میں لگ جاؤ اور حق تعالےٰ سے دعا بھی کرتے رہو اور ذکر اللہ میں مشغول رہو گو دل نہ لگے اور موت وما بعد الموت کو سوچا کرو۔ اور پھر اطلاع دو (حوالہ تربیت حصہ دوئم ص۲۶۳) اسی طرح دوسرے شخص نے اپنا حال :۔ عرصہ ایک ماہ کا ہوا کہ فدوی کی بہو کا انتقال ہوگیا جس کی عمر ۱۶/۱۷ برس

کی تھی اور نہایت نیک بخت اور میری فرماں بردار تھی اس کے انتقال کا مجھے بہت صدمہ ہوا حالانکہ میرا خیال تھا کہ دنیوی محبت کسی قدر مجھے نہیں رہی۔ لیکن یہ غلط نکلا ہزار ہزار کوشش کرتا تھا کہ نہ روؤں لیکن قلب پر ایسا اثر ہوتا تھا کہ آنسو روکے سے نہیں رکتے تھے اور ایک ہفتہ تک سخت تکلیف رہی " لیکن پھر حضور والا کی خواب میں زیارت ہوئی اور حضور نے تسکین فرمائی۔

تحقیق:- بیوی یا اولاد کی محبت میں یہ حالت ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ بہو سے ایسا علاقہ ایں چہ معنی۔ مجھ کو تو سخت ہی ناگوار ہوا اس کا جو ضرر دین پر پہنچنے والا ہے ذرا اس سے بچو اور فکر کرو۔ لا الٰہ الا اللہ کیا واہیات ہے۔ نفس میں ضرور چھپا چور ہے۔ نکالو جلد نکالو ورنہ یہ رنگ لائے گا دوسرے ہی موقع پر ہی۔ افسوس یہ ثقاہت اور یہ خیانت۔ تیسرے صاحب نے بھی اسی مرض کی شکایت لکھی کہ چھ ماہ کا عرصہ ہوا کہ ایک عورت جس کا چال چلن اچھا نہیں ہے خواہ مخواہ میری طرف رجوع ہو گئی اول تو اپنے ناز و انداز سے میرے دل کو لبھایا اور جب اپنے اوپر اس نے مجھ کو فریفتہ کر لیا۔ تو خود بخود کشش کر بیٹھی۔ بس اس کا کھینچنا میرے لیے قیامت کا آجانا ہو گیا۔ عشق بازی کا مزہ، درد و فراق کی لذت، ہجر کی کیفیت، وصل کی طلب کا پورا پورا ذائقہ آ گیا۔ جو جو کچھ نہ کرنا تھا وہ کیا کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے۔ درود و وظائف تو درکنار نماز تک چھوٹ گئی۔ اس کے ہی نام کا وظیفہ اور باتیں ورد زبان ہونے لگیں اور اسی کے ردّی کتابی کا مطالعہ کرنے لگاؔ

عشق کے مکتب میں آیا ہوں دبستاں چھوڑ کر
اب پڑھا کرتا ہوں حسن و عشق قرآں چھوڑ کر

غرضیکہ اس جنوں کا اس وقت پورا شباب ہے اس کے وصل کی تدبیر میں ہوں مگر کبھی کبھی خیال آجاتا ہے۔ افسوس کیا حال ہوگا ع

بتوں کو پوجتا ہوں اور پھر سیدھا مسلماں ہوں۔

اسی خیال میں تھا کہ آج حضور کو خط تحریر کیا۔ اس لیے عجز و انکسار کے ساتھ عرض ہے کہ اس احقر کو ورطۂ ہلاکت سے نکالیے اور للہ میرے واسطے دعا کیجیے"

جواب:- مشفقم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ بدون ہمت کے آسان سے آسان کام بھی نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے امراض ظاہری میں علاج کے لیے دوا تلخ

و ناگوار پینا پڑتی ہے چونکہ صحت مطلوب ہوتی ہے اس لیے ہمت کر کے پی جاتے ہیں اور امراض باطنی میں تو زیادہ ہمت کی ضرورت ہوگی جب یہ امر معلوم ہوا تو اب اس کا علاج سنئے اور ہمت کر کے بنام خدا اس کا استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ شفائے کامل نصیب ہوگی علاج اس مرکب ہے چند اجزاء سے" (ماخوذ از تکشف ص۱۱) حضرت حکیم الامتؒ کا یہ نسخہ پانچ اجزاء سے مرکب ہے بوجہ طوالت اس کی نقل حذف کی جاتی ہے۔ ترکیب استعمال معلوم کرنے کے لیے تربیت السالک جزو اول۔ ناشر مکتبہ زکریا کراچی ص۲۷۶ کا مطالعہ کر لیا جائے۔

مندرجہ بالا تین حضرات کو ایک ہی مرض لاحق تھا لیکن حکیم الامتؒ نے ہر ایک کے ساتھ جدا طریقہ برتا ہے یہ دلالت ہے۔ اس پر کہ واقع میں وہ ولی کامل حکیم امراض باطنی تھے۔ پہلے صاحب کے سوال میں جواب ضابطہ کا ہے کہ اس عورت سے ظاہراً و باطناً دور ہو جاؤ نہ اس کو دیکھو نہ اس سے بولو نہ اس کی آواز سنو وغیرہ وغیرہ یہ تو ظاہری بعد کی صورت تجویز فرمادی اور باطنی علاج یہ بتایا کہ نہ اس کا تصور کرو کسی کام میں لگ جاؤ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور ذکر اللہ میں مشغول رہو موت اور بعد موت کا استحضار کیا کرو وغیرہ۔ دوسرے صاحب کے ساتھ زجر و توبیخ کا برتاؤ کیا ہے کوئی وظیفہ اور عمل نہیں بتایا بلکہ یہ تنبیہ کر دی کہ جو ضرر آپ کے دین پر پڑنے والا ہے اس سے بچو اور آئندہ کے خطرہ سے آگاہ کر دیا کہ نفس میں جو چور چھپا ہے جلد اس کو نکالو ورنہ یہ خباثت کر دوسرے موقع پر رنگ لائے گی۔ آج بہو کی طرف میلان طبع ہے گو کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے لیکن کل کو کسی اجنبیہ کے عشق میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔ حضرت حکیم الامتؒ نے ان کے نفس کے جو بہت باریک تھا فوراً تاڑ لیا۔ وہ بیچارے ہی سمجھے کہ یہ دنیوی محبت ہے جیسی کہ عام طور سے اپنے علائق سے ہوتی ہے لیکن حضرت حکیم الامتؒ نے انکا چور پکڑ لیا اور اپنے جواب کے آخری دو الفاظ میں سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ افسوس یہ تقاہت اور یہ خیانت "اِنّکَ تعلم خائنۃ الاعین وما تُخفی الصدور" قلب و نظر کی خیانت کی تشخیص فرما کر مرض کا استیصال کر دیا جیسا کہ بعد کے خط میں ان صاحب نے اپنی صحت یابی کا اقرار کیا ہے۔ تیسرے صاحب نے ایک بازاری عورت سے اپنے عشق مجازی کی داستان لکھی ہے۔ ایک قاری جب انکا حال پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ یقیناً ان پر ڈانٹ پڑے گی۔ اور جواب سخت ہوگا لیکن اس کے برعکس حضرت حکیم الامت

کا جواب نہایت مشفقانہ اور تسلی بخش ہے۔ آخر میں چند وظائف اور ذکر وغیرہ بھی تجویز فرمائے تھے چنانچہ تیسرے صاحب کو اس طریقۂ علاج سے شفا ہوئی۔

غرضیکہ اسی نوعیت کے دیگر امراض باطنی میں ہر سالک کی تربیت اس کی انفرادی حالت و صلاحیت کے مطابق کی گئی ہے۔ فن تصوف میں "تربیت السالک" ایک بحر ذخار ہے جس کی غواصی ہم جیسے ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے یہ تو صرف ایک باب ہے اخلاق رذیلہ کے بیان میں جس میں سے صرف تین مثالیں پیش کی گئیں ورنہ تین ضخیم جلدوں میں کئی ہزار صفحات پر یہ کتاب مدوّن کی گئی ہے جو مختلف ابواب مثلاً اخلاق حمیدہ، اعمال و احوال، ذکر و اشغال رویا و کشف، وساوس و خیالات، مشاہدات و مجاہدات و بیعت اور صحبت شیخ مثل ذٰلک موضوعاتِ سلوک پر مشتمل ہے۔

اسی ضمن میں ایک بات خاص یہ عرض کرنی ہے کہ حضرت حکیم الامت کا جو طریقۂ اصلاح و مواخذہ ہے اور جو اندازِ تربیت ہے وہ صرف ان ہی کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے حضرت والا کا ایک ملفوظ بھی ہے جو اس وقت ذہن میں نہیں ہے جس میں حضرتؒ نے دوسروں کو اسکے اپنانے سے منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حکیم الامت کا طریقۂ اصلاح موہوبہ ہے اکتسابی نہیں ہے۔ حضرت حکیم الامت اصلاح امت کے لیے مبعوث ہوئے اور مامور کئے گئے تھے۔

مسیحائے جہاں ہے جس کو سب قائل سمجھتے ہیں
مگر اس نکتۂ باریک کو عاقل سمجھتے ہیں
(مجذوب)

اللہ تعالیٰ ہمیں یہ توفیق اور سعادت عطا فرمائے کہ حضرت مجدد ملت حکیم الامت کے ذوق اور مسلک کو دنیا میں عام اور شائع کریں کیونکہ اسی میں امت مسلمہ کی موجودہ پریشانیوں اور مشکلات کا حل ہے اور اسی میں فلاح دارین ہے ع

دگر دانائے راز آید کہ ناید

حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمہ اللہ

کی

خدمت فنِ قرأت و تجوید

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب

* * *

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قرآن فہمی اور قرآنی علوم میں ایک نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔ جو برصغیر کے علماء کے حصے میں بہت کم آیا ہے۔ بیان القرآن مولانا کی اردو تفسیر ہے جو وسعت و تفصیل اور تنوع کے لحاظ سے ایک منفرد تفسیر ہے اور اردو تفاسیر میں سے یہ واحد تفسیر ہے جو مختلف النوع عربی فارسی اور اردو تفاسیر سے بے نیاز کر دیتی ہے اس کے علاوہ مولانا نے قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں پر متعدد چھوٹی بڑی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، فضائل قرآن، آیات و سُوَر کے روحانی خواص، الفاظ و معانی کے مختلف پہلوؤں سے لے کر قرأت اور تجوید کے نازک اور بلند مسائل تک میں مولانا تھانوی نے بہت عمدہ علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس مختصر سے مقالے میں ان خدمات کا جائزہ مقصود ہے جو مولانا نے قرأت و تجوید کے میدان میں انجام دی ہیں۔

تنشیط الطبع فی اجراء السبع: مولانا تھانوی کا ایک اور مفید اور جامع رسالہ ہے۔ اس رسالے میں قرأت سبع کے متعلق بے حد سادہ، آسان اور عام فہم انداز میں نہایت قیمتی معلومات مہیا کی گئی ہیں اس میں جہاں غیر ضروری طوالت اور تفاصیل سے اجتناب کیا گیا ہے۔ وہاں ناقابل فہم اجمال و اختصار بھی نہیں ہے

رسالہ تنشیط الطبع ایک مختصر خطبہ و تمہید کے بعد سات فصول اور ایک تتمیم یا ضمیمے پر مشتمل ہے پہلی فصل میں ان قراء کے اسماء اور نہایت مختصر تعارف دیا گیا ہے جنہوں نے کلام اللہ کی تلاوت و قرات کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں اس کے لئے ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اور ایک ایک حرکت یا سکون پر توجہ

صرف کی تاکہ اللہ تعالیٰ کی آخری اور عظیم الشان کتاب آئندہ انسانی نسلوں تک ہر لحاظ سے محفوظ و مصئون پہنچائی جا سکے۔ اس کے پڑھنے، اسے ضبط تحریر میں لانے اور اسے صحیح ملفظ کے ساتھ ادا کرنے میں کسی قسم کا اشتباہ یا تردد باقی نہ رہے یہ بات قرآن عظیم کے امتیازات و اعجازات میں شامل ہے انسانی تاریخ میں صحف سماویہ میں سے کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہے یہ شان و عظمت صرف خدا کے آخری پیغام کو حاصل ہے۔ جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

اس پہلی مختصر سی فصل میں تمام مشہور قراء کی مفصل فہرست ہے۔ سب سے پہلے سات مشہور قراء کا تذکرہ ہے۔ جن کی قراءات کے تواتر پر امت کا اجماع و اتفاق ہے۔ ان سات قاریوں میں سے ہر ایک کے دو مشہور شاگردوں کا بھی ذکر کر دیا ہے اس طرح گویا متواتر قرأت کے اکیس آئمہ کا تذکرہ آگیا ہے

پھر ان سات متفق اور مجمع علیہ قرأت کے ائمہ کے ذکر کے بعد تین اور مشہور قرأ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی قرأت کے تواتر کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے ان تینوں بزرگوں کے بھی دو دو مشہور شاگردوں کا ذکر ہے یوں گویا دس قرأت معروفہ کے تیس قرآء کا تذکرہ مکمل ہو گیا۔ پھر ان دس قراءات جنہیں قراءت عشرہ معروفہ کہا جاتا ہے کے علاوہ چار اور قراءات کا ذکر ہے۔ جو درجہ آحاد سے نہیں بڑھ سکیں۔ اور جن کی روایت جائز قرار نہیں دی گئی تاہم یہ منقول و مذکور ہیں۔ ان چار قراءات کے چار ائمہ اور ان کے دُو دُو شاگردوں کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس طرح گویا اس مختصر سی فصل میں مولانا تھانوی نے مجموعی طور پر پچاس قرأ کی مفصل فہرست دے دی ہے۔

دوسری فصل میں ان تمام مروی و متداول قراءات کی تعلیم و تدریس کے انداز او طریقۂ کار سے بحث ہے۔ تیسری فصل میں جس ترتیب سے یہ قراءات پڑھی جانی چاہئیں اس طریقے سے بحث ہے چوتھی فصل قرأ کے درمیان اختلاف کی نوعیت کا بیان ہے اور وہ اصول و قواعد بیان ہوتے ہیں جو اس اختلاف کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے اسباب و پس منظر کی نشاندہی کرتے ہیں اس فصل میں حضرت مولانا نے ہر قاری کی قرأت کے قواعد بڑے اختصار مگر جامعیت سے بیان کر دیے ہیں

مولانا تھانوی کے اس مختصر و مفید رسالے کی پانچویں فصل ان امور کے لئے مختص ہے جن سے تلاوت کلام پاک کے دوران بچنا بہت ضروری ہے چھٹی فصل کا موضوع ہے تعوذ بسملہ اور تکبیر

جبکہ ساتویں فصل کا تعلق ان آداب سے ہے جو کتاب اللہ کی تعلیم و تعلم، تلاوت و قرأت اور دعائے اختتام کے ضمن میں کام آتے ہیں۔ لیکن اس رسالے کی تتمیم یا ضمیمہ بےحد مفید اور اہم ہے جس میں اختلاف قرأت کا نقشہ دیا گیا ہے۔ یہ نقشہ پارۂ اول کے ربع اول پر مشتمل ہے یہ ضمیمہ گویا رسالے میں بیان کردہ اصول و قواعد کی عملی تطبیق ہے۔ آخر میں مولانا نے تقریباً دو درجن فارسی اشعار پر مشتمل ایک فارسی منظومہ بھی شامل کر دیا ہے جو قراء کے رموز قرأت پر مشتمل ہے اور سب سے آخر میں مشہور و غیر مشہور قراء کے اسماء کا مکمل اجمالی نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ جہاں تمام قراء ایک نظر میں سامنے آجاتے ہیں مولانا نے اس رسالے کے خطبے کے بعد جو مختصر دیباچہ رقم فرمایا ہے۔ وہ بھی دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں: اما بعد یہ احقر عرض رسا ہے کہ جب رسالہ قرأت منظومہ مصنفہ مولوی سعد اللہ صاحب سے فارغ ہوا مناسب معلوم ہوا کہ چند اوراق متعلق قرأت سبعہ کے لکھے جاویں تاکہ مبتدی کو تجوید و اختلاف روایات دونوں میں مناسبت ہو جاوے۔"

فن قرأت و تجوید کے میدان میں مولانا تھانوی کی کتاب جمال القرآن سب سے اہم تصنیف ہے کتاب کا نام اور فصول کے عنوان بہت دلچسپ بھی ہیں اور مناسب بھی، جمال القرآن دراصل فن تجوید اور تحسین قرأت کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے اس فن میں کمال اور کتاب اللہ کو سنوار کر پڑھنے کا جمال میسر آتا ہے فصول کو لمعات کا نام دیا گیا ہے کل چودہ لمعات یا چودہ فصول ہیں۔ جس طرح چودھویں کا چاند اپنی آن بان اور آب و تاب سے کمال و جمال دکھاتا ہے گویا جمال القرآن کا مطالعہ بھی اسی طرح زیب و زینت اور تحسین و تجوید میں کمال و جمال کا وسیلہ ہے چنانچہ جمال القرآن کے خاتمے میں مصنف خود فرماتے ہیں۔

"چاند کا پورا لمعہ بھی چودھویں رات کو ہوتا ہے اور یہاں بھی چودھویں لمعہ کے ختم پر سب مضامین پورے ہو گئے اس لئے یہاں پہنچ کر رسالہ کو ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور مقبول فرما دے، طالب علموں سے خصوصی بچوں سے خصوصی قدوسیوں سے رضائے مولیٰ کا طالب ہوں۔"

جیسا کہ کتاب کے آخر میں صراحت موجود ہے۔ یہ کتاب پانچ ماہ صفر المظفر ۱۳۳۳ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچی قاری اظہار احمد تھانوی صاحب کے مطابق یہ کتاب جمال القرآن کامل کے نام سے غالباً پہلی مرتبہ مطبع مجیدی کانپور میں شائع ہوئی تھی۔ کتابت نہایت عمدہ جلی واضح اور دیدہ زیب تھی تاہم سال اشاعت کا ذکر

نہیں ملتا۔ شاید سالِ تصنیف و سالِ اشاعت ایک ہی ہو۔ مولانا تھانوی نے یہ کتاب مولوی حکیم محمد یوسف صاحب مہتمم مدرسہ قدوسیہ گنگوہ کی فرمائش پر تصنیف فرمائی۔ اس کے ماخذ میں قاری عبدالوحید صاحب کا رسالہ ہدیۃ الوحید سرِفہرست ہے۔ بلکہ مصنف کی صراحت کے مطابق جمال القرآن کافی حد تک رسالہ ھدیۃ الوحید کی تسہیل ہے وہ فرماتے ہیں۔

"یہ چند اوراق ہیں ضروریات تجوید میں مسمّٰی جمال القرآن اور اس کے مضامین کو ملقب بہ لمعات کہا جائے گا۔ مجھی مکرمی مولوی حکیم محمد یوسف صاحب مہتمم مدرسہ قدوسیہ گنگوہ کی فرمائش پر کتب معتبرہ سے خصوصی رسالہ ھدیۃ الوحید مؤلفہ قاری مولوی عبدالوحید صاحب مدرس اول درجہ قرأت مدرسہ عالیہ دیوبند کی ملتقط کرکے بہت آسان عبارت میں جس کو مبتدی بھی سمجھ لیں لکھا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں قرأت کے دوسرے رسالوں سے بھی کچھ لکھا گیا ہے۔ وہاں ان رسالوں کا نام لکھ دیا ہے۔ اور کہیں اپنی یادداشت سے کچھ لکھا ہے۔ وہاں کچھ نشان بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ پس جہاں کسی کتاب کا نام نہ ہو وہ یا تو رسالہ ھدیۃ الوحید کا مضمون ہے اگر اس میں موجود ہو ورنہ احقر کا مضمون ہے۔"

رسالہ ھدیۃ الوحید کے علاوہ جمال القرآن میں مولانا تھانوی نے جن مآخذ کی صراحت کی ہے ان میں سے حقیقۃ التجوید، درۃ الفرید، جہد المقل اور تعلیم الوقف بہت نمایاں مآخذ ہیں خصوصاً حقیقۃ التجوید سے تو جابجا استفادہ کیا گیا ہے۔

جمال القرآن اور تنشیط الطبع کا عام فہم اور آسان اسلوب بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ مولانا تھانوی خود فن قرأت و تجوید پر کامل عبور رکھتے تھے کیونکہ سہولت و روانی اور اختصار و جامعیت جہاں اسلوب بیان کی امتیازی خوبیاں بن رہی ہوں۔ وہاں صاحب اسلوب کا متعلقہ فن پر کامل عبور اور پوری دسترس خود بخود ثابت ہو جاتی ہے اس لحاظ سے مولانا تھانوی بذات خود ممتاز قراء میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے؛ کیونکہ زیارت حرمین کے دوران مولانا تھانوی نے جہاں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں منازل سلوک طے کیں وہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں قاری عبداللہ مہاجر مکیؒ سے قرأت و تجوید کے فن میں کمال پایا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

قدس اللہ سرہ العزیز

ایک اصول پسند شخصیت

حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی۔ دیوبند

تاریخ عالم میں ایسی بہت کم ہستیاں ملیں گی جو عوامی زندگی اور اصلاح و تربیت کے منصب جلیل پر فائز ہوتے ہوئے اس قدر با اصول اور منضبط و منظم زندگی گذار گئے ہوں کہ اگر ان کی حیات پر نظر ڈالی جائے تو کوئی گوشۂ زندگی ایسا نظر نہ آئے جو بے اصولی اور قول و عمل کے تضاد سے داغدار ہو۔ حضرت اقدسؒ کی تقریباً تمام زندگی عامۃ المسلمین کی دینی اصلاح، علمی رہنمائی اور عملی تربیت کے لئے وقف تھی۔ آپ نے اپنی اصول پسندی کے تحت ان سب مشاغل کے لئے جو ضابطۂ کار تجویز فرمایا تھا اس کی عمر بھر بے مثال پابندی فرمائی۔ ایسی پابندی کہ اصول کے سامنے کسی طاقت یا شخصیت کی رعایت نہیں فرمائی۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک ایک لمحے کو بامقصد بنانے کے لئے حضرت نے ایسا نظام اوقات مرتب فرما لیا تھا کہ آپ کے تمام مشاغل از ابتداً تا انتہا مکمل ہوتے رہے۔

اس اصول پسندی کی برکت سے آپ نے اپنی حیاتِ مستعار میں دین و ملت کی جو بے مثال خدمت کی اور عوامی اصلاح کے لئے جو عظیم ذخیرۂ علمی چھوڑا وہ جہاں ایک طرف آپ کی بے لوث زندگی اور بے لاگ حق پسندی کی واضح دلیل ہے وہیں آپ کے علمی فضل و کمال کا آئینہ دار ہے۔ حضرت اقدسؒ کا ذکر آتا ہے تو بے اختیارانہ تصور میں ایک ایسی جامع کمالات شخصیت ابھرتی ہے جو عقل و فلسفہ، حکمت و بصیرت، دین و دیانت اور فضل و کمال کے اعتبار سے اپنے وقت میں رازی و غزالی کے ہم پلہ ہے۔ یوں تو ہر صاحب علم اپنی کچھ منفرد خصوصیات اور کردار کی انفرادیت میں دوسروں سے ممتاز ہو سکتا ہے مگر حضرت تھانویؒ کو حق تعالیٰ نے ایسی مجددانہ صلاحیتوں کا پیکر بنا دیا تھا کہ آپ کی ذات علم و عمل کے گوناگوں کمالات کی حامل تھی۔ آپ کی

ذکاوت و ذہانت اور علمی تعمّق تو مسلّم ہے ہی لیکن حضرت کی نمایاں ترین خصوصیات میں جس وصف کو شمار کیا جا سکتا ہے وہ افراد کی شخصیت سازی اور تعمیرِ سیرت کی عظیم صلاحیت ہے۔ حق تعالیٰ نے اس بارے میں آپ کو ایک خاص سلیقہ عطا فرمایا تھا جس کا جیتا جاگتا نمونہ حضرت کے وہ منتسبین و مجازین ہیں جو اُس خانقاہ سے نکلے تو اپنی مُربّی کی تربیت کا پیکر بن کر ایک عالم کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہوئے۔ حضرت مولانا کے فیضِ تربیت سے اُن کے علمی و عملی جوہر اس طرح نمایاں ہوئے کہ اُن کی صورتوں کو دیکھ کر ہی لوگوں کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ جہاں یہ حضرتِ اقدس کے اخلاص و للّٰہیت کا ثمرہ تھا وہیں اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے سلسلے میں حضرت کے اصول پسندانہ اور بظاہر سخت گیرانہ طریقۂ کار کا ایک کرشمہ تھا۔

اصول پسندی کو بالعموم سخت گیری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت میں اصول پسندی کا مطلب ہے زندگی کو منضبط اور منظّم کرنا اور ایک نظام الاوقات کے تحت جملہ مشاغل کو مرتب کر لینا۔ انضباط کی برکت لازمی طور پر ظاہر ہوتی ہے اور کارکردگی کے صحیح نتائج سامنے آتے ہیں کیونکہ دوسرے لفظوں میں اس اصول پسندی کا مطلب ہے افراط و تفریط سے ہٹ کر میانہ روی اختیار کرنا جو اعتدال کی راہ ہے۔ انضباطِ اوقات اور طبعی اصول پسندی کے بغیر کاموں میں افراط و تفریط کا پیدا ہونا لازمی ہے کیونکہ ایسے کام جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک وقت جذبہ ہے تو آدمی دنوں کا کام گھنٹوں میں مکمل کر لیتا ہے اور جذبہ سرد پڑ جانے پر گھنٹوں کا کام مہینوں بلکہ برسوں میں بھی پورا نہیں ہو پاتا۔ البتہ اصول کے تحت معتدل راہ ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے کیونکہ اعتدال کا لازمی اثر کاموں مُداومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور مداومتِ عمل ہی شریعت میں مطلوب ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح فرمایا کہ اِنَّ اَحبَّ العَمَلِ اِلی اللّٰہِ اَدْوَمُہٗ تو گویا مداومت موقوف ہے اعتدال پر اور اعتدال موقوف ہے اصول پسندی پر لہٰذا اس ترتیب کے تحت اصول پسندی بجائے خود شریعت میں مطلوب ہے۔ البتہ اصول پسندی میں طے شدہ اوقات اور کاموں پر استقامت ناگزیر ہے جس کو بسا اوقات دوسرے بے اصول لوگ بد لحاظی اور عدمِ تواضع پر محمول کر لیتے ہیں اور نتیجۃً اصول پسند شخص کو درشت مزاج اور اکھڑ قرار دینے لگتے ہیں مگر یہ رائے خود غرضانہ ہوتی ہے یا احساسِ کمتری اور کم فہمی پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ بظاہر اصول پسندوں پر زبانِ طعن دراز کرتے نظر آتے ہیں مگر قلبی طور پر وہ بھی اُس شخصیت کی اولوالعزمی، حوصلہ و استقلال اور جرأتِ مندانہ کے نہ صرف معترف ہوتے ہیں بلکہ دل و جان سے اس کی عظمت کا اقرار بھی کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصول پسند انسان ایک ناقابلِ

شکستِ عزم کا مالک ہوتا ہے جو اکثر اوقات ہدفِ ملامت بنتا رہتا ہے مگر اس لومۃ لائم سے دل برداشتہ ہو کر اپنا اسلوب تبدیل نہیں کرتا جو اس کی مستقل مزاجی مزاجی اولوالعزمی کی واضح دلیل ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی ذات اسی مزاجی استقلال اور جرأت و ہمت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔ حق پرستی اور حق پسندی کی یہی طبعی افتاد تھی جو بڑے سے بڑے طوفان کے سامنے سینہ سپر رہی اور مخالفتوں کے سیلاب میں بہہ جانے کے بجائے اپنے معقول اور معتدل رجحانات پر پہاڑ کی طرح اٹل رہی حضرت مولانا کو ایسے ہی نامساعد حالات اور مخالفانہ ماحول سے گذرنا پڑا اور بسا اوقات لوگوں کے تلخ و ترش تبصرے بھی آپ تک پہونچے۔ تاہم حضرت کے ورع و تقویٰ کو یہ گوارا نہ تھا کہ غیر استدلالی رنگ میں ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ آپ نے محاجۂ لسانی میں بھی جَزٰٓؤا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا کے تحت اباحت پر عمل نہیں کیا بلکہ عزیمت کے مقام پر استوار رہتے ہوئے فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ کا مظاہرہ فرمایا اور ایسے لوگوں کی طعنہ زنی کو بھی اپنے لئے ہمت شکن نہ ہونے دیا طبعی ملال فطرت ہے اور وہ ظاہر بھی ہوا لیکن افعال کی ناپسندیدگی کے ساتھ ذوات کو کبھی قابلِ ملامت نہیں سمجھا۔ چنانچہ خانقاہ میں آنے والے طالبین اور عقیدت مندوں کے ساتھ بھی حضرت جو معاملہ فرماتے تھے وہ بظاہر سخت نظر آتا ہے مگر یہ محض اصولوں کے تحت اور دوسروں کو اصول پسندی کا خوگر بنانے کے لئے ہوتا تھا جس پر اصلاحِ باطن کا مدار ہے۔ حضرت خود ہی فرماتے ہیں کہ "اخلاق کی درستی درشتی پر موقوف ہے مصلح بدون تھوڑی سی سختی کے دوسرے کی اصلاح نہیں کر سکتا"۔ خلافِ قاعدہ باتوں پر ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش ضرور کی جاتی تھی مگر ساتھ ہی اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ الحمدللہ عین اس سرزنش کے وقت بھی اس شخص کی تحقیر کا قلب میں شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں یہ طریقِ کار حق تعالیٰ کو ناپسندیدہ ہو۔ خانقاہ کے منتظمین میں سے ایک صاحب نے دوسرے شخص کو کسی خلافِ اصول بات پر ڈانٹا حضرت نے سنا تو ڈانٹنے والے صاحب سے بازپرس کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ امر بالمعروف کے طور پر ایسا کیا۔ حضرت نے فرمایا اس امر کے شرائط بھی آپ میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اولین شرط یہ ہے کہ عین سرزنش کے وقت بھی اپنی بڑائی کا قطعاً تصور نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت کی اصول پسندی بھی اتباعِ شریعت کے تحت تھی جیسا کہ خود صاحبِ شریعت کی حیاتِ اقدس مکمل طور پر منظم و منضبط تھی اور نظام الاوقات کا پورا اہتمام فرمایا جاتا تھا۔ مصلحین کی اس شان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار حضرت نے فرمایا کہ "میں ناتمام سی نقل اسی شان کی کرتا ہوں تو بدنام کیا جاتا ہوں کہ متشدد ہے۔ میں تو واللہ اپنے

نفس پر بھی متشدد ہوں اور اپنی فکر میں واللہ دوسروں سے زائد لگا ہوا ہوں۔ جو شخص اپنی اصلاح کی فکر میں ہو وہ دوسروں کی اصلاح کے معاملے میں کیا خوشامد یا چاپلوسی کرے گا۔"

جس شخص کے جذبات یہ ہوں اُس کو متشدد قرار دینا سراسر ظلم و ناانصافی کہلائے گا کیونکہ تشدد کو اگر حقیقی معنی میں لیا جائے تو اس کے ساتھ رعایت اور پاسداری مفقود ہوتی ہے جبکہ حضرت اصول کے دائرے میں رہتے ہوئے دوسروں کے لحاظ اور پاس خاطر کا انتہائی اہتمام فرماتے تھے۔ حضرت تھانوی کے تذکرے میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ نے لکھا ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا تھانوی ضوابط و قوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے اور جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں مگر خود مولانا کا یہ حال تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں لوگ کبھی اِدھر اُدھر کی خبروں کا ذکر چھیڑ دیتے بعض شدت پسندوں نے اس کو نامناسب سمجھتے ہوئے حضرت سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت نے جواباً فرمایا کہ کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں مونہہ موڑ لوں تو اُس کو صدمہ ہوگا۔ پھر فرمایا کہ زائد از کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی کرنے سے کم ہے۔

حضرت کے مزاج میں جو انتظام اور نظم و ضبط تھا وہ بھی شرعی اصولوں کی روشنی میں تھا جس کا مطلب ہے کہ اصل مقصود شریعت کی پیروی تھی چونکہ شریعت خود متبعین کی زندگیوں میں انتظام پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے حضرت نے اپنے مزاج میں وہی رنگ بھرا۔ شرعی زندگی کے اصول اصولِ مطلوبہ ہیں کیونکہ ان ہی کے اتباع سے دل و دماغ میں تقویٰ شعاری کو فروغ ہوتا ہے۔ جب اصول شرعیہ کسی شخص کی ذات میں پوری طرح رچ بس جاتے ہیں تو اس کا مزاج بھی شریعت کے مزاج کا عکس بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مزاج شریعت سے مانوس ہو جانے کی بنا پر ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس کی نظر ان گہرائیوں تک پہنچتی ہے جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ شریعت کا مزاج شناس بن جانے کے بعد اُس کا وجدان اُس معاملے کے حسن و قبح پر مطلع کر دیتا ہے اور اُسی کے تحت اُس سے قبیح پر دار و گیر سرزد ہونے لگتی ہے۔ اب یہ مقابل کا مبلغ علم و فکر ہے کہ وہ ژرف نگاہی اور اتباع شریعت کے اس مقام کو تشدد سے تعبیر کرے یا تقویٰ شعاری کا انتہائی مقام قرار دے۔

حضرت مولانا کے یہاں معاملات میں جو باریک بینی اور دور رسی پائی جاتی ہے وہ اسی بنا پر ہے کہ ہر معاملے کے لئے حضرت کے یہاں جو معیار مقرر تھا وہ شرعی نقطۂ نظر تھا اور شریعت و طریقت کے باب

میں طالبین سے اِخفا جائز نہیں۔ لہٰذا حضرت کی گرفت بروقت اور سخت ہوتی تھی۔ چنانچہ اس باریک بینی اور شرعیات کے باب میں داروگیر کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک صاحب حضرت کے یہاں آئے۔ حضرت نے پوچھا کیسے تشریف لانا ہوا۔ کہا فلاں صاحب نے بھیجا ہے کہ تم جا کر حضرت کو لے آؤ۔ حضرت نے فرمایا شاید آپ کو میرے عذر کی خبر نہیں۔ کہا مجھ کو تو خبر ہے۔ پوچھا پھر کیوں آئے۔ کہا اس خیال سے کہ اس بہانے زیارت ہو جائے گی۔ اس پر حضرت نے ناراضگی سے فرمایا کہ کرایہ ان کا اور زیارت تم کرو۔ یہ جائز ہے؟ یہ تو خیانت ہے۔ آپ کو مشورہ دینا چاہیئے تھا کہ اس کو آنے میں یہ عذر ہے غرض حضرت کو ان کی اس حرکت پر اس قدر ناگواری ہوئی کہ فرمایا آپ کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ واپس تشریف لے جائیے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا معاملات و دیانات میں کس قدر احتیاط اور باریک بینی تھی اور یہ احتیاط ایسے ہی شخص میں ہو سکتی ہے جو تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور اس کی نظر ہر اہم اور غیر اہم معاملے کے حرام و حلال اور جائز و ناجائز پہلو پر رہتی ہو۔ اس محتاط روش کے لئے یوں تو ہر مومن مامور ہے۔ لیکن ایک مصلح جو ہدایت و ارشاد کے منصب پر فائز ہوتا ہے جب تک ان جزئیات کا اہتمام کرنے والا نہ ہوگا حقیقتہً "اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفوس کی ذمہ داریوں سے صحیح معنی میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کے جزئیاتِ امور تک میں داروگیر کا اہتمام ایک منتظم طبیعت اور بااصول مزاج ہی کر سکتا ہے اور اسی کی داروگیر مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فی نفسہ وہ داروگیر بھی اصولی ہوگی اور اصول پر ہی مبنی ہوگی ورنہ وہ طبائع جو ضوابط و قوانین کی حد بندیوں میں رہنا گوارا نہیں کرتیں مقابل کی بے اصولیوں کو اول تو سمجھ ہی نہیں پائیں گی اور اگر سمجھ پائیں گی تو ان پر اصولی نقد و جرح نہیں کر پائیں گی وہ اپنی اس نااہلیت کو اگرچہ اغماض و چشم پوشی کا نام دیں لیکن حقیقتہً اس کا منشا صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے جبکہ اصول پسند انسان صاحبِ بصیرت ہوا کرتا ہے اور صاحبِ بصیرت سے ایسی رو رعایت یا فروگذاشت مستبعد ہوتی ہے لہٰذا اس سے رو رعایت کی توقع بھی عبث ہوتی ہے چنانچہ حضرت مولانا خود ہی اپنے ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ”میری عادت مدعیانِ علم و فہم کے ساتھ معاملات کی گفتگو میں تسامح و رعایت کی نہیں۔ اس سے ان کو دھوکہ ہوتا ہے کہہ دیتا ہے اور اس خیال سے ان کا جہل بڑھتا ہے۔“

یہ ہے وہ اصلاحی شان اور تربیت کا انداز جس میں مصلح کی نظر ہمیشہ مخاطب کی حالت پر رہتی ہے۔

اگر استدلال یا بحث مباحثہ بھی ہے تو وہ بھی مخاطب کے نفع کیلئے ہوتا ہے اپنے علم کے مظاہرے کے لئے نہیں پھر اسی صدقِ نیت اور حق آگاہی کا کرشمہ مخاطب کی اثر پذیری کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ ادھر یہ صدق و اخلاص بھی اولوالعزمی کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جو ایک ایسی کلی حقیقت ہے جس کے ذیلی افراد میں سے ایک فرد اصول پسندی ہے۔ اس کے آثار میں حق گوئی کی جرأت اور ناقابلِ شکست حوصلہ ہوتا ہے اسی سے معاملات میں صفائی اور بے لوثی باقی رہتی ہے اور اسی سے حقوق العباد کی کما حقہ ادائیگی ہو پاتی ہے۔ یہ سب کمالات ایک منضبط زندگی کے ہیں کیونکہ انضباطِ طبیعت سے ہی اعتدال حال پیدا ہوتا ہے جو سرچشمہ ہے ہر قسم کی خیرات و برکات کا معتدل الحال شخص خود نمائی و خود بینی، عجب و خود پسندی اور کبر و ریا جیسے رذائل سے کوسوں دور رہتا ہے اور قدرتی طور پر ان رذائل کے مقابل جو خصائل حمیدہ ہیں اُن سے متصف ہوتا ہے۔ جن کا اعلیٰ ترین فرد مکارمِ اخلاق ہیں لہٰذا یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا کے یہاں تواضع و انکسار اور بشاشت و خوش خلقی کی کمی نہ تھی البتہ ہر وصف کا کا مظاہرہ حدِ اعتدال کے اندر ہوتا تھا جس کے ذریعہ ایک مومن تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کا صحیح امتثال امر کرسکتا ہے۔

حق تعالیٰ نے اپنے چشمۂ فیضان سے حضرت مولانا کو جو محاسن عطا فرمائے تھے اُن کے ہوتے ہوئے کسی شخص کا خود بین و خود پسند بن جانا معمولی بات ہے مگر ایک صاحبِ کمال کا سب سے بڑا کمال یہی ہوتا ہے کہ اُسے جتنی سرفرازی نصیب ہوتی ہے اس میں اتنی ہی تواضع و فروتنی بڑھتی جاتی ہے۔ اُسے جتنا عُلوِ مرتبت حاصل ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خوف و خشیت کی فراوانی سے اتنی ہی سرافگندگی پر مجبور پاتا ہے اسی تواضع کا اثر تھا کہ آپ القاب و آداب سے ہمیشہ کارہ رہتے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب کا خط آیا تو پتے میں نام کی جگہ "حکیم الامت" لکھا۔ حضرت نے جواب میں لکھا۔ کیا حکیم الامت میرا نام ہے!؟ آپ کو کس دلیل سے ثابت ہوگیا کہ ڈاک خانے والے مجھے اس لقب سے پہچان لیں گے۔ اس واقعہ پر کسی نے عرض کیا کہ حضرت وہ ادب کی وجہ سے نام نہیں لکھ سکے، فرمایا کہ ادب کی وجہ سے پھر کبھی خط بھی نہ آئے اور نہ خود کبھی آئیں گے ایک پہلو پر تو نظر جاتی ہے دوسری جانب کا احتمال ہی ہوتا۔ نظر محیط ہونی چاہیئے۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب رسم کے ماتحت ہے۔ محض تکلفات ہیں لوگوں میں عجمیت غالب ہے حالانکہ عربیت ہونی چاہیئے۔" اسی طرح ایک صاحب نے اپنے خط میں حضرت سے بیعت کی درخواست کرتے ہوئے تحریر کیا سلسلۂ عالیہ اشرفیہ میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے اس تعبیر پر سخت گرفت فرمائی اور سرزنش کرتے ہوئے لکھا کہ ـــ یہ سلسلۂ عالیہ

اشرفیہ کیا ہوتا ہے (گویا دوسرے حضرات کا سلسلہ بیعت غیر عالیہ ہوا) اللہ اکبر اب دین میں بھی تحزب اور پارٹی بندی ہونے لگی۔

کمال کے جو آثار صاحبِ کمال میں ہونے ضروری ہیں حضرت مولانا کی ذات ان کا حسین مرقع تھی سادگی و بے تکلفی اور فقر و درویشی میں آپ کو حق تعالیٰ نے جو ہیبت و دبدبہ دیا اُس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ ظاہری تکلفات اور اسبابِ آرائش سے حضرت مولانا اس قدر نفور رہے کہ خود ہی فرماتے تھے۔ "سادگی عُلو اور عظمت کی دلیل ہے۔ میں جب کسی کو بنا ٹھنا دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ نہایت پست خیال شخص ہے۔ اگر بلند ہمت ہوتا تو اس کی اسے فرصت ہی نہ ملتی۔ جو شخص علومِ عالیہ میں مشغول ہوتا ہے اس کا ذہن ہی ان چیزوں تک نہیں پہونچتا۔"

علمی حیثیت سے حضرت کے تحریری و تقریری کارنامے ایسے بے مثال اور اتنے بے شمار ہیں۔ کہ ایک بدترین مخالف بھی اعتراف و تسلیم کے سوا کوئی مفر نہیں پاتا۔ ایک مُبصر حضرت کی تصنیفات و تالیفات کی فراوانی دیکھ کر عالم تحیر میں سوچتا رہ جاتا ہے کہ علمی و اصلاحی شہ پاروں کا یہ انبار کسی ایک ہستی کی حیاتِ مختصر کی کاوش ہے یا کسی ادارہ و انجمن کا جماعتی کارنامہ! عالمی انسائیکلوپیڈیا نے حضرت مولانا کی شخصیت کا تعارف صرف کثرتِ تصانیف کی بنیاد پر کرایا ہے لیکن اگر کوئی مغربی محقق حضرت کی پوری حیات اور کارناموں کا مطالعہ کرے تو بجا طور پر وہ آپ کی شخصیت کو بیسویں صدی کے بطل جلیل کی حیثیت سے متعارف کرانے پر مجبور ہوگا۔ حضرت مولانا کی ایک ہزار کے قریب تالیفات میں تفسیر بیان القرآن کے علاوہ سینکڑوں وہ شاہکار کتابیں ہیں جنہوں نے برصغیر کے پورے مسلم معاشرے میں انقلاب آفریں اثرات پیدا کئے اور لاکھوں گم گشتگان راہ کو ہدایت و نجات کی ابدی سعادتوں سے ہمکنار کر دیا۔ ہزاروں وہ دین کے تاجر جنہوں نے سادہ لوح عوام کے سامنے مذہب کو ایک اضحوکہ بنا کر پیش کیا تھا۔ اور دین کو اپنی اغراض نفسانی کے لئے آلۂ کار بنا رکھا تھا حضرت مولانا کے سحر آفریں مواعظ اور باطل شکن تصانیف کے سامنے اس میدان سے روپوش ہوگئے اور جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کے آوازے سے بام و در ایک بار پھر گونج اُٹھے

حضرت مولانا کو ایک مصلح ہی نہیں دورِ حاضر کا مُجدد کہنا ایک ایسی حقیقت افروز صدا ہے جس میں مخالف و موافق ہم آواز ہیں۔ حضرت مولانا کی مردم سازی اور تعمیر سیرت کے جیتے جاگتے اور بلاواسطہ نمونے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ابھی تک اِکا دُکا موجود ہیں جن کے کردار سیرت میں حضرت مرحوم کی تربیت و محنت نے جو گلکاری

کی ہے۔ وہ زبانِ حال سے اس رجلِ عظیم کے اخلاص کی گواہ ہے حضرت کے مجازین کی صف شریعت وطریقت کے اُن شہپاروں سے مزین ہے۔ جنہیں دیکھ کر لاکھوں دلوں کو زندگی ملی اور مل رہی ہے جنہیں حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (بانی دارالعلوم کراچی) رحمہم اللہ علیہم وہ مایۂ ناز ہستیاں ہیں کہ ان اخلاف کو دیکھ کر اُس سلفِ صالح اور عالی مرتبت میر کارواں کی بے لوث اور باعمل زندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کے اخلاص وللہیت کا یہ حضرات کرشمہ ہیں۔ یہ مجازین حضرت تھانوی کے اُس بااُصول طرزِ تربیت کی آنچ سے کُندن بنے ہیں جو جماعتِ دیوبند میں حضرت مولانا کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کی افادیت کا اقرار دبی زبانوں سے حضرت کے وہ معاصرین بھی کرتے رہے جو اسی دور میں اس پر نکتہ چیں بھی رہے۔ یہاں تک کہ حضرت کے متوسلین ومنتسبین بطور تعریض تھانوی الفکر کے لقب سے نوازے گئے یعنی حضرت مولانا جس جتھے بندی اور گروہ سازی کے خلاف زندگی بھر زبان وقلم سے جہاد کرتے رہے اسی تحزب اور جتھے بندی کو خود حضرت کے سر منڈھ دیا گیا۔

مخالفتوں کا طوفان جب تک نہ ہو کسی شخصیت کے حقیقی کردار اور استقامتِ مزاج کے خدوخال نمایاں نہیں ہوتے مصلحین کو ناسازگاری ماحول اور نامساعد حالات سے گذر کر ہی اپنے نصب العین کی حقانیت واضح کرنی پڑی ہے۔ تب ہی ان کو اولوالعزم شخصیت کے بلند قامت لقب سے یاد کیا گیا۔ تب ہی وہ أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ کی ترتیب میں آئے اور تب ہی وہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ کے حقیقی مصداق بنے یہ مخالفت وعداوت ان حضرات کے حق میں دین ودنیا کی سرخروئی اور کامرانی کی دینی وتاریخی علامت ہے۔ حضرت مولانا کی بلند وبالا سیرت کے بہت سے نقوش اس طعن وتشنیع کے سیلاب میں نمایاں ہوئے اور آپ کی عالی ظرفی، بلند فکری، صبر وثبات اور وقار وتمکین کے انمٹ نشان دلوں پر چھوڑ گئے جو آپ کے مجازینِ کرام اور صحبت یافتوں کے لئے مشعلِ راہ اور نمونۂ عمل بن گئے۔ حضرت مولانا کو ہدفِ تنقید بنانے والے اکثر لوگ اصلاح وارشاد کے میدان میں خود معارفِ تھانوی کے خوشہ چیں رہے کیونکہ طریقت کے باب میں حضرت نے جو تحریری وتقریری ذخیرہ پیش کیا وہ چونکہ اصولی لائحہ عمل سے لے کر فروعی ہدایات اور جزئیات طریق تک کو محتوی ہے اس لئے اُسی دور میں تقریباً تمام خانقاہوں اور مشائخ نے اس سے فیض حاصل کیا اور ان ہی خطوط پر سب حضرات اپنے متوسلین ومنتسبین کو تعلیم کرنے لگے کیونکہ طریق وتعلیم میں جو رطب ویابس بھر دیا گیا تھا حضرت نے اس کی

چھان پھٹک کر کے اصولِ تصوف کی ایسی تنقیح فرمائی کہ اس باب میں آپ کا اسمِ گرامی ایک مجدد کی حیثیت اختیار کر گیا اور اب کسی کو ان اصول و فروع کے اختیار کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔

یہ حضرت مولانا ہی کی ذات ہے جو طریقت و تصوف کو حیاتِ نو بخشنے کا سامان بنی۔ آپ نے اس طریق کے نوک پلک ہی نہیں سنوارے بلکہ اس کے اصول و فروغ کو عملی اور آسان قالب میں ڈھال دیا۔

حضرت اقدس کی ان مجددانہ خدمات سے مخالفین خود بھی مستفید ہوتے رہے۔ اور آج تک ان کے اخلاف ہو رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ساحرانہ چشمک سے بڑھ کر حضرت اقدس کی ذات کو مخاصمت و عناد کا نشانہ بنایا گیا حتیٰ کہ قتل تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ انگریزی سامراج کی حمایت اور حکومت نوازی کے الزامات عائد کئے گئے اور تھانوی الفکر حضرات کو تھانے سے ڈرنے والا کہا گیا۔ مگر حضرت کی طرف سے اس پروپیگنڈا مہم کا جواب سوائے ایک باوقار خاموشی اور صبر و سکوت کے اور کچھ نہیں تھا مخاصمت و عداوت کے طوفان سر آتے اور گذرتے رہے لیکن اُس مردِ آہن کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ آپ نے جن محکم اصولوں کی روشنی میں اپنا طریقِ کار اور فکر و عمل کا دستور مرتب کیا تھا اس پر بے مثال استقامت کے ساتھ گامزن رہے۔ آپ کے کارخانۂ تربیت میں شخصیت سازی اور تعمیرِ سیرت کا مثالی کاروبار جاری رہا اور سیرت و کردار کے اعلیٰ نمونے مستقبل کے مشائخ کی صورت میں ڈھلتے رہے۔ خانقاہِ تھانہ بھون کے یہ فوائد و ثمرات ہر چشمِ بینا کے لئے سرمایۂ اطمینان تھے تو حاسدین کے لئے خارِ نگاہ۔ حضرت کی اصول پسندی اور منضبط مزاج نے اُمت کے لئے جو حزب اللہ تیار کیا اُس کو معاندین اور تخریب پسندوں نے تھانوی گروہ قرار دے کر ایک مستقل اختلاف کی بنیاد ڈالنا چاہی مگر یہ بھی حضرت مولانا کے اخلاصِ نیت کی کرشمہ کاری ہے کہ حضرت کے متوسلین اپنے شیخ اور مربی کے اصولوں پر راسخ و ثابت رہتے ہوئے آج تک سیاسیات اور گروہ بندیوں کی لعنت سے پاک رہے ہیں انہیں انکے شیخ کے نقوشِ قدم سے شانِ مظلومیت کی دستار وراثۃً ملی ہے جو آج تک انکے زیبِ سر ہے۔ لیکن اسی مظلومیت میں ان کی مقبولیت ہے کیونکہ مظلومیت کا مقام مقامِ صبر ہے اور صبر ہی بوجہ مطلوبیت باعثِ اجر ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر

بطور تحدیثِ نعمت حضرت اقدس رحمۃ اللہ کے خلفاء منتسبین و محبین کی دعاؤں سے فیضیابی کیلئے یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم ناکارہ کو بفضلِ خداوندی اور سعی و توجہ والد ماجد حکیم الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند یہ سعادت میسر آئی کہ عربی نصاب دارالعلوم دیوبند کی اولین کتاب "میزان الصرف" حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ سے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

چودھویں صدی کا عظیم مُصلح

حکیم محمود احمد ظفر، سیالکوٹ

* * *

مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے "ہمارے بزرگوں نے ہمارا ذوق ہی بدل دیا کہ اُن کو دیکھنے کے بعد نگاہ میں اب کوئی جچتا ہی نہیں۔" فرمایا "ہمارے بزرگوں کا علم رازیؒ اور غزالیؒ سے کم نہیں تھا بلکہ عمق میں اُن سے بھی زیادہ تھا۔" حضرت تھانویؒ قدس سرہ خود بزرگ تھے اس وجہ سے وہ اپنے بزرگوں کے علم کی گہرائی اور گیرائی کو جانچ سکتے تھے لیکن ہم نے حضرت تھانویؒ کی کتابوں مواعظ اور ملفوظات سے جو کچھ اندازہ لگایا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ "اُن کو دیکھنے کے بعد بھی اب نگاہ میں کوئی نہیں جچتا۔" حضرت قدس سرہ کی علمی گہرائی اور گیرائی کو تو صاحبانِ علم ہی بتا سکتے ہیں لیکن علم کے جدید اور قدیم گوشوں کے بارہ میں حضرتؒ نے جو بحث کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ عقائد و اعمال، معاشرت و معیشت، سیاست، اقتصادیات، تہذیب و تمدن اور عمرانیات کے بارہ میں سادہ زبان میں جو بحث حضرت تھانویؒ نے اپنی کتابوں اور مواعظ میں کی ہے تاریخ کے اوراق میں دور دور تک اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان موضوعات پر حضرتؒ نے قرآن و سنت کی روشنی میں جو علمی جواہر ریزے موجودہ نسل اور آئندہ آنے والوں کے لیے پیش کیے ہیں اُس سے انسان کی عقل دنگ اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔

پھر قرآن و حدیث اور فقہ و تصوف ہی کی بات نہیں بلکہ ان کی تشریح کے لیے عقل و فراست سے بھی حق تعالیٰ شانہ نے حضرتؒ کو حظِ وافر عطا فرمایا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے۔ "مولوی صاحب! ہم نے بھی وہی کتابیں پڑھی تھی جو حضرت تھانویؒ نے پڑھی تھیں۔ لیکن حضرت

تھانویؒ کے پاس اگر ایک من علم تھا تو اس کی تشریح و تفصیل کے لیے ایک ٹن عقل تھی اور ہمارے پاس اگر ایک من علم ہے تو اس کی تشریح کے لیے ایک سیر بھی عقل نہیں ہے۔" شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ" اور اُن کے شاگرد رشید علامہ ابن قیمؒ کی ضخامت علم کے باوجود بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ "علمهما اکبر من عقلهما" (ان دونوں کا علم ان کی عقل سے زیادہ تھا) حضرت تھانویؒ نے قرآن و سنت اور فقہ و تصوف کی جو عقلی توجیہات پیش کی ہیں، بڑے بڑے صاحب علم اُن کو سند کے طور پہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ نے جس دیدۂ کامل سے دین کامل کی توضیح نہیں بلکہ جو تجدید فرمائی ہے اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کم ہی ملتی ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرتؒ نے خود فرمایا تھا۔

"طریق بالکل مردہ ہو چکا تھا۔ لوگ بے حد غلطیوں میں مبتلا تھے۔ بحمد اللہ اب سو برس تک تو تجدید کی ضرورت نہیں رہی۔ اگر غلط ہو جائے گا تو پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو جائیگا۔ ہر صدی پہ تجدید کی ضرورت ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس مدت کے بعد نری کتابیں ہی کتابیں رہ جاتی ہیں۔ اب تو خدا کا فضل ہے کہ وضوح ہو گیا۔ اور کتابیں فی نفسہ تو کافی ہیں۔ مگر لوگ ان میں تحریفیں کرتے ہیں کتابیں تو درکنار قرآن پاک جس کو ھدی اور بینات کہا گیا تھا۔ اس میں بھی دیکھ لیجئے کہ معانی اور مطالب میں کس قدر گڑ بڑ مچا رہے ہیں۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۴ ص ۳۱۶)

دین کی اتنی خدمت اور تجدید کے باوجود بھی دل میں کبھی اپنی بزرگی کا خیال تک نہیں آیا۔ چنانچہ حضرتؒ کی روک ٹوک پر جب بعض لوگوں نے کہا کہ۔

"ہم تو بہت بزرگوں کی مجلس میں گئے لیکن کہیں ایسی باتوں پہ روک ٹوک نہیں دیکھی"

تو حضرتؒ نے ان کے جواب میں فرمایا۔

"بھئی میں تو اپنی مجلس کو بزرگوں کی مجلس نہیں بنانا چاہتا آدمیوں کی مجلس بنانا چاہتا ہوں"

(الافاضات الیومیہ جلد ۴ ص ۱۴)

ایک اور موقع پر حضرتؒ نے فرمایا۔

"میں تو کہا کرتا ہوں کہ شاہ صاحب بننا آسان۔ ملک التجار بننا آسان، بزرگ بننا آسان، قطب بننا آسان مگر انسان بننا مشکل .... اور یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ بزرگ بننا ہو، ولی بننا ہو۔

قطب و غوث بننا ہو تو کہیں اور جاؤ - اگر انسان بننا ہو تو میرے پاس آؤ میں انسان بناتا ہوں۔"

چنانچہ حضرتؒ کے پاس اگر کوئی شخص آتا ———— تو آپ اُس سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ کتنے نوافل پڑھتے ہو، قرآن کتنا پڑھتے ہو اور کون کون سے اوراد و وظائف کرتے ہو - ہاں یہ ضرور پوچھتے تھے کہ کبھی کسی انسان کو تکلیف تو نہیں دی - کیونکہ انسان وہ ہوتا ہے جس میں انسانیت کے لیے نسبت کا مادہ ہو، دوسرے انسانوں کے لیے اُس کے دل میں شفقت و محبت ہو - اُس کو دیکھ کر دوسرے انسانوں کے دل میں اُس کے لیے محبت کے جذبات موجزن ہوں - وہ انسان نہیں ہوتا جو ایک آوارہ بیل کی طرح ہر ایک کو ٹکریں مارتا ہوا گذرے - آدمی، نماز روزہ اور ذکر و درد کے لیے تو آسانی سے تیار ہو جاتا ہے لیکن انسان بننے سے بھاگتا ہے کیونکہ اس میں محنت لگتی ہے. شاید اسی لیے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا   مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

حضرت تھانویؒ فرماتے تھے!

"بننا ایسا ہو گا جیسا کوئی کہے مربّا بنانا چاہتا ہوں - تو ظاہر ہے کہ مربّا جس طرح بنتا ہے اسی طرح بنے گا - اوّل تو پھل کے داغ دھبوں کو چاقو سے صاف کیا جائے گا - چھلکا چھیلا جائے گا - پھر دیگچی میں چولھے پر چڑھا کر نیچے آگ جلائی جائے گی تاکہ اچھی طرح اُبل جائے - مابعد چاقو سے اُس کو کوچا جائے گا تاکہ قوام اچھی طرح اندر اثر کرے ... اتنے فصول کے بعد مربّا بنے گا اور کھانے کے قابل ہو گا اور وہ اثرات پیدا ہوں گے جن کو تم چاہتے ہو۔"

(الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ۹۴)

گویا ساری زندگی حضرتؒ کا بڑا مشغلہ "کتاب انسانیت کی کاٹ چھانٹ ہی رہی اور ایک موقع پر تو صراحتاً فرمایا -

"مطلوبیت میں بزرگی سے مقدم آدمیت ہے - یہاں اس آدمیت کی تعلیم پہلے اور بزرگی کی بعد میں ہوتی ہے -" (الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ۱۴۰)

چنانچہ حضرتؒ کی تعلیمات میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا - ایک موقع پر خود فرمایا -

"مجھ کو جزئیات کا بہت اہتمام ہے۔ بزرگوں کے ہاں بڑی بڑی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے اور میں چھوٹا ہوں اس لیے میرے یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم ہوتی ہے۔"

(وعظ عمل الذرہ ص۲۴)

چنانچہ حضرتؒ کے ہاں جب کوئی شے ہدیۃً بھیجی جاتی تو برتن خالی فرما کر فوراً واپس فرما دیا جاتا تاکہ دوبارہ خود ہم کو اسے منگانے یا کسی اور کام کے لیے اس برتن کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو حتّٰی اوسع ایسی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو ناپسند فرماتے بلکہ ناراض ہوتے کہ اگر آگے کے نمازی پہلے فارغ ہو کر نکلنا چاہیں تو ان کا راستہ بند ہو اور اُن کو انتظار کرنا پڑے۔ مسجد میں اگر کوئی بدھنی بھری رکھی ہو تو کسی کو اس کے استعمال کی اجازت نہ تھی کہ شاید کوئی اپنے لیے بھر کر رکھ گیا ہو جس کو تلاش کرنے اور دوبارہ بھرنے کی اذیت اور تکلیف ہو۔ ساتھ ہی اس بات کی سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ جس کو جلدی کام لینا نہ ہو وہ دیر تک اس طرح بدھنی کو بھر کر مقید نہ کرے۔

ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کے عملی اہتمام کو بڑے بڑے اہل صلاح و تقویٰ کے ہاں بھی قابل التفات نہیں سمجھا جاتا لیکن حضرتؒ کے ہاں ان چیزوں کا خاص اہتمام تھا ———

——— اور تکمیل انسانیت کے لیے ان چیزوں کو اوراد و وظائف سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں حضرتؒ کا ایک واقعہ بھی سننے کے قابل ہے۔

حضرتؒ ایک مرتبہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ فرماتے ہیں۔

(حیدرآباد) پہنچ کر سات ہی روز گذرے تھے کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا جس میں لکھا تھا کہ ایک عرصہ سے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا، مگر بدقسمتی سے تھانہ بھون کی حاضری نصیب نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا ہوں اور فلاں فلاں وقت اپنے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔

(مطلب یہ تھا کہ اس کی رعایت سے مجھ کو وقت دیا جائے)

حضرتؒ نے اس نواز جنگ کے پرچہ کے جواب میں جو تحریر فرمایا اس سے جہاں اُس نواز جنگ کی بدفہمی کا پتہ چلتا ہے وہاں حضرتؒ کی ذہانت بھی اُجاگر ہوتی ہے۔ فرمایا!

"بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی عظمت و محبت ہے۔ مگر نیچے کی سطر پڑھ کر افسوس کی بھی کوئی حد نہ رہی کہ اس مہم سے کوئی کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے

تعبیر کیا گیا اُس کو تو اپنے اوقات فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد ہے۔ یہ کون سی فہم و تہذیب کی بات ہے۔"

اس پر اُس نواز جنگ صاحب نے اپنی بدفہمی کی معذرت چاہ کر لکھا کہ "حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرما دیں"، حضرتؒ کی طرف سے مزید تعلیم و امتحان ملاحظہ ہو۔ جواباً فرمایا۔

"اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح مہمان میزبان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ——— اس لیے سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر اختیاری ہے۔ آپ ساتھ رہیں جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں ملاقات کر لیں۔"

اس جواب پر پھر اُس نواز جنگ صاحب کا جواب الجواب آیا کہ "حضرت! بدفہمی پہ بدفہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں، نہ حضرت سے معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا۔ اگر آپ کو فرصت نہ ہوئی لوٹ آؤں گا۔" تعلیم کی اس کامیابی پر حضرتؒ نے ان الفاظ میں دلجوئی فرمائی۔ فرمایا!:-

"اب پورے فہم سے کام لیا گیا جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا اب میرا آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ تشریف لے آئیں ورنہ مجھ کو اجازت فرمائیے خود حاضر ہو جاؤں۔

اس جواب پر اہل مجلس کو مخاطب کر کے حضرت نے ارشاد فرمایا:- "یہ میرا طرز اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے لوگ جس قدر بڑے ہیں اہل دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ دکھلانا تھا کہ اہل علم و دین کی یہ شان ہے۔ تو پہلے "تذلل سے بچنا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب کھینچنا تکبر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔"

چنانچہ ایک روز وہ صاحب خود ہی آ گئے۔ اس مجلس میں بعضوں نے دور سے دیکھ کر کہا کہ حضرت فلاں صاحب آ رہے ہیں۔ حضرت اُس وقت ڈاک لکھ رہے تھے برابر لکھتے رہے۔ جب انھوں نے پہنچ کر السلام علیکم کہا تب حضرت فرماتے ہیں کہ:-

"میں نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ بیچارے بہت ہی مہذب اور دو زانو ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے برابر جگہ دے کر کہا بھئی اس طرف آ جائیے۔ اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں

آرام ملے گا۔ کچھ میرے سوال پر نواب صاحب کی بیدار مغزی اور انتظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے"۔ اس کے بعد کہا "اگر نواب صاحب سے ملاقات ہو جائے تو بہت مناسب ہے"

اب حضرت تھانویؒ کی تعلیم کے مزید اسباق ملاحظہ فرمائیں۔ فرمایا "یہ آپ کی خواہش ہے یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا کہ "میری خواہش ہے" میں نے سوال کیا کہ حضور نے آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا اس پر بھی غور فرمایا ہوگا کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟ کہا نواب صاحب کا، میں نے کہا نفع تو نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترغیب مجھ کو دی جا رہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس بیچارے کے خواب وخیال میں بھی ایسے سوالات نہیں آئے ہوں گے کہ جواب دیتے۔ جب اس اللہ کے بندے سے کوئی جواب نہ آیا تو خود حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا:۔

"اب میں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ اس صورت میں خود اُن کی ملاقات کو جاؤں مضرت ہی مضرت ہے نفع کچھ نہیں۔ یہ تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اگر ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ تو اس صورت میں اُن کو تو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے مجھ کو نقصان ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ جو چیز ان کے پاس ہے مجھ کو ملے گی یعنی دنیا اور وہ بقدر ضرورت بحمد اللہ میرے پاس بھی ہے اور جو میرے پاس ہے وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین"

"اور اگر میں گیا بھی اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب اور وظیفہ وغیرہ کی صورت میں) وہ مل بھی گئی تو اس صورت میں ایک خاص خود بھی ہے کہ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف اور اگر نہیں کرتا ہوں تو آداب شاہی کے خلاف، کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سُبکی اور اہانت ہوگی۔ اور چونکہ اس وقت میں اُن کے حدود میں ہوں اس کی پاداش میں (اخراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔ تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا اور میرا نقصان ہوگا"

اب حکیم الامت قدس سرہ نے ملاقات کی صحیح صورت بیان فرما دی جو ان کی شایان شان بھی ہو اور اُن کے لیے دینی نفع کا سبب بھی ہو۔ فرمایا کہ:۔

"یہ امر بھی شان سلاطین کے خلاف ہے کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کیے ہوئے شخص سے ملاقات کریں۔ اس میں کم فہم لوگ اس کو تنگ دلی کی طرف منسوب کریں گے۔ جس میں ان کی اہانت ہے کہ خود نہیں

مدعو کر سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ خیر اسی میں ہے کہ نہ میں اُن کے پاس جاؤں نہ وہ میرے پاس آئیں اگر اُن کا جی چاہے تو تھانہ بھون سے مجھ کو بلا لیں، میں خاص شرائط کر کے آ جاؤں گا۔ کچھ عذر نہ ہوگا۔ یہ سن کر نواز جنگ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہ پہنچ سکی۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۴ ص ۵۶-۶۳)

اور آنکھیں تو کھلنا ہی تھیں کیونکہ ایسے بزرگ چشم فلک نے بھی کبھی کبھی دیکھے ہیں۔ ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے حضرت کے خلیفہ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم سے پوچھا کہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا امتیازی وصف کیا تھا۔ مولانا عبدالباریؒ نے لکھا کہ حضرت تھانویؒ کا امتیازی وصف علم و عمل ہر شی میں حدود کی انتہائی رعایت، چنانچہ اسی چیز کے بارہ میں مولانا تھانویؒ نے فرمایا۔

"بعض رسوم اس قدر قلوب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء و صلحاء بھی باوجود تقویٰ و طہارت ان رسوم سے آگاہ نہیں ہوتے اور ان میں تساہل برتتے ہیں اور یہ تساہل بوجہ حسن ظن کے پیش آجاتا ہے (یا بوجہ غلبۂ حال کے نظر ہی نہیں پڑتی) اور وہ عام لوگوں کے اغراض و عقائد پر مطلع نہیں ہوتے اور ان رسوم کے مفاسد متعدیہ کی طرف جو مآل کار ظاہر ہوتے بوجہ دقیق ہونے کے ان کی نظریں نہیں پہنچتیں۔ ان مفاسد کا معلوم کرنا ایسے ہی شخص کا خاص حصہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے ان کے قلع قمع کے لیے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ حکایت ہے کہ حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنے چچا مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث کے گھر تشریف لے گئے۔ معلوم ہوا کہ عورتوں نے بی بی کی صحنک کی ہے۔ مولانا شہید نے منع فرمایا۔ اس پر اُن کے چچا شاہ عبدالقادر نے فرمایا کہ "اسماعیل یہ تو ایصال ثواب ہے، تو اس میں کیا حرج ہے۔" مولانا شہید نے جواب دیا کہ یہ بھی تو اس "حجر" میں داخل ہے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔" وقالوا هذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم" چنانچہ اس میں بھی یہ شرطیں لگائی جاتی ہیں کہ عورتیں کھائیں مرد نہ کھائیں اور وہ بھی سہاگنیں کھائیں۔۔۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ "واقعی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی اور حقیقت یہی ہے جو تم کہتے ہو۔"

"ایسا ہی حضرت سید احمد بریلویؒ کا قصہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ساتھ ہوا کہ حضرت سید صاحب مفتی صاحب کے گھر تشریف لائے گھر کے اندر سے ایک لڑکا ماما کی گود میں باہر لایا گیا جس کے ہاتھ میں سونے

کے کپڑے تھے اور وہ لڑکا مفتی صاحب کے خاندان کا تھا۔ حضرت سید صاحب نے فرمایا مفتی صاحب یہ تو حرام ہے۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ والدہ سے کہہ دینا کہ سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ تھوڑی دیر میں پھر ماما آئی اور مفتی صاحب سے کہا کہ آپ کو والدہ بلاتی ہیں فرمایا چلو آتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر میں تقاضا ہوا اور یہی جواب ملا۔ کئی بار کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ والدہ بلاتی ہیں ہو آیئے۔ کچھ ضرورت ہوگی۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ "حضرت کچھ بھی ضرورت نہیں ایک فضول واہیات کام کے لیے بلاتی ہیں" سید صاحب نے پوچھا کیا کام ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ شادی ہے اور چاول کوٹنے کے لیے موسل میں ڈورا بندھو رہی ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ "مولانا یہ تو شرک ہے" اس پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ والدہ سے کہہ دو سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تو شرک ہے۔ یہ باتیں جس مجلس میں ہو رہی تھیں اُس میں ایک شخص نے دیری سے مفتی صاحب سے کہا کہ سب کچھ سید صاحب ہی فرماتے ہیں۔ آپ بھی کچھ فرماتے ہیں۔ آپ نے کس واسطے پڑھا تھا۔ گویا آپ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اس پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ بھائی یہ سچ ہے کہ ہماری مثال اُس صندوق کی سی ہے جو جواہرات سے پُر ہو مگر وہ صندوق ان جواہرات کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتا بلکہ جوہری پرکھ کر ہر ایک کی قیمت کو بتاتا ہے۔ اسی طرح ہم نے سب کچھ پڑھا مگر جو سید صاحب نے سمجھا وہ ہم نے نہیں سمجھا۔ تو سید صاحب جوہری ہیں ہم صندوق"۔

(مقالات حکمت ص ۱۹۴)

عالم تو کئی ہیں لیکن صراطِ مستقیم یعنی زندگی کی ایسی سیدھی راہ جو بے اعتدالی اور افراط و تفریط کے ہر عوج و انحراف سے ناآشنا ہو، کو بتانے والے خال خال ہی ہوتے ہیں کسی زمانہ میں بھی اہل اللہ اور مقبولانِ بارگاہِ ایزدی سے دنیا خالی نہیں رہی اور اس گئے گزرے دور میں بھی الحمد للہ کئی صلحاء اور اہل اللہ موجود ہیں لیکن ہر ایک پر کسی نہ کسی خاص رنگ کا غلبہ رہا ہے۔ جو جامعیت حضرت تھانویؒ کے علم و عمل میں نظر آتی ہے اور اصلاح و تجدید کا جو کارنامہ حضرتؒ نے اپنے مواعظ ملفوظات اور اپنی کتابوں سے سرانجام دیا بڑے بڑے بزرگ اور علماء اُس سے قاصر رہے دین کے معاملہ میں جس ژرف نگاہی سے مولانا تھانویؒ نے کام لیا اُن کو پڑھ سُن کر اس زمانہ میں عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔

نہ کسی امیر کی امارت اور نہ کسی عالم کا علم حضرت کو اپنے اصولوں سے ہٹا سکتا تھا امرا سے اہانت کا برتاؤ تو نہ فرماتے بلکہ ان کے مرتبہ کا ظاہری اکرام فرماتے، البتہ قلب میں ان کی امارت اور دولت کی بنا پر کوئی عظمت نہ تھی۔ کئی دفعہ فرمایا۔

"ان کی خاطر مدارت تو کر دیتا ہوں لیکن عظمت بالکل قلب میں نہیں۔"

چنانچہ امرا میں سے جو بھی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا اپنی امارت کو طاق میں رکھ کر آتا۔

ایک مرتبہ۔

"مظفر نگر کے سفر میں ایک معزز رئیس نے جو بہت بے باک اور تیز زبان تھے اور بڑے بڑے حکام کے سامنے نہ جھکتے تھے، حضرت والا سے کوئی بے ڈھنگی بات پوچھی حضرت نے حسب معمول انہیں ڈانٹا اور یہاں تک ناگواری بڑھی کہ مجلس سے اٹھ جانے کو فرمایا۔ وہ پھر بھی بیٹھے رہے تو حضرت والا خود اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ اور فرمایا کہ میں ایسے شخص کی ہم نشینی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس پر انہوں نے دست بستہ عرض کیا کہ "حضرت بیٹھیں میں خود ہی جاتا ہوں۔ اور بعد کو کہا کہ میرا تو عمر بھر کے لیے علاج ہو گیا۔" (اشرف السوانح صـ۱۰۸)

حضرتؒ کے قلب میں جاہ و مال کے بارہ میں حق تعالے نے کامل استغنا فرمایا ہوا تھا اور کوئی شخص بھی جاہ مال کی خاطر ایک کلمہ بھی حضرت کی زبان سے نہیں نکلوا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے مال و فعال سے حضرت کو متاثر کر سکتا تھا۔

کسی رئیس نے دو سو روپیہ خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم کے لیے بھیجا۔ ساتھ ہی تشریف آوری کی بھی درخواست کی۔ حضرتؒ نے روپیہ واپس فرما دیا اور لکھا کہ اگر اس کے ساتھ بلانے کا مضمون نہ ہوتا تو مدرسہ کے لیے روپیہ لے لیا جاتا۔ اور دونوں باتوں کے اقتران سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید مجھ کو متاثر کرنے کے لیے یہ رقم بھیجی گئی ہے۔" (اشرف السوانح صـ۹۹)

اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا یہ واقعہ بھی پڑھنے کے قابل ہے جس سے جہاں حضرتؒ کے کمال تقویٰ کا پتہ چلتا ہے وہاں آپ کے مال سے کمال استغنا کا علم بھی ہوتا ہے

ریاست بہاولپور کی طرف سے کسی موقع پر حضرات علما کو جو وہاں مدعو تھے جن میں حضرت والا بھی تھے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے بعنوان خلعت اور پچیس پچیس روپے بنام دعوت عطا کیے گئے۔"

اس وقت تو اس رقم کو حضرت والا نے دیگر علماء کے ساتھ بخیال احترام رئیس قبول فرما لیا لیکن بعد کو خلوت میں وزیر صاحب سے عذر کیا کہ اس کو مجھ سے واپس لے لیا جائے کیونکہ بیت المال سے دیا گیا ہے جس کا میں مصرف نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ اب تو کاغذات میں بھی اندراج ہو گیا ہے واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ خیر اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی تو اس رقم کو مقامی علماء و طلباء میں صرف کر دیا جائے کیونکہ شرعاً بیت المال کے بھی مصرف قریب ہیں۔"

(اشرف السوانح صـ۲۴)

یہ تو امرا کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی روک ٹوک تھی۔ رہے علماء تو ان کی طرف سے بھی اگر کوئی ایسی بات حضرتؒ والا کے ساتھ کی جاتی جو دین کی اصل روح کے خلاف ہوتی یا جس میں تعلیم و تبلیغ دین کو بے دینی راہوں سے کرنا ہوتا یا ذریعہ کو مقصد بنانا ہوتا تو حضرتؒ والا کی رگ فاروقی فوراً پھڑک اٹھتی۔ خصوصی طور پر مدارس اسلامیہ کے بارہ میں جہاں مدرسہ کا نفس بقا مقصود بالذات بنا لیا جاتا اور اس کی خاطر دین کے اصولوں کو بھی پاش پاش کرنے سے دریغ نہ کیا جاتا۔ حضرت ایسے مواقع پہ بے دھڑک فرما دیتے کہ مدرسہ رہے نہ رہے لیکن کام تو اصول ہی سے ہوگا۔ چنانچہ

"ایک مہتمم مدرسہ کا خط آیا۔ لکھا کہ خرچ بڑھا ہوا ہے اور آمدنی نہیں۔ سخت پریشانی ہے فرمایا کہ میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس کی وحی تو ہوئی نہیں کہ فلاں خاص پیمانہ پر ہو تو مدرسہ کہلائے گا ورنہ نہیں۔ ارے بھائی! کام کم کر دو خرچ خود کم ہو جائے گا۔ اور اگر بالکل آمدنی نہ ہو مدرسہ بند کر دو۔ کوئی فرض نہیں واجب نہیں۔ ظاہر ہے کہ آمدنی کا ہونا اختیاری نہیں مگر خرچ کم کر دینا اختیاری ہے۔ (فرمایا) میرٹھ کے ایک رئیس نے بڑے کام کی بات کہی تھی کہ لوگ عموماً آمدنی بڑھانے کی فکر کرتے ہیں جو غیر اختیاری ہے۔ خرچ کے گھٹانے کی فکر نہیں کرتے جو اختیاری ہے۔ اکثر دنیا داروں کو ایسی حکمت کی باتیں سوجھتی بھی کم ہیں"

(الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ۳۳۱)

حضرتؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "طبیعت کو عقل کے تابع رہنا چاہیئے اور عقل کو شریعت کے" حضرتؒ کی ساری گفتگو شریعت اور عقل کے تابع ہوتی تھی۔ آپ کی کتابیں، مواعظ اور ملفوظات اس بات کے شاہد ناطق ہیں۔ آپ کو کج فہمی، بدفہمی، جہالت اور دور از عقل باتوں سے طبعی طور پر نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے عالمان دین آپ سے گفتگو کرنے سے گھبراتے اور انکھ چراتے تھے

"ایک مولوی صاحب ایک مجمع کی طرف سے آئے آنے سے قبل بواسطہ ان سے گفتگو ہو چکی تھی کہ آنے کی تین غرضیں ہو سکتی ہیں۔ ایک افادہ، ایک استفادہ، ایک مناظرہ۔ اگر افادہ مقصود ہے تو میرے ذمہ اس کا جواب نہ ہوگا۔ وہ تبلیغ ہوگی۔ اپنا فرض ادا کرکے تشریف لے جایئے گا۔ عمل کرنا نہ کرنا میری توفیق پر ہے۔ اور اگر استفادہ مقصود ہے تو اس کے لیے پہلے سے تردد لازم ہے اور آپ کو تردد ہے نہیں، اس لیے کہ شرکت کر چکے، شرکت کا اعلان کر چکے، اس لیے شق قابل تسلیم نہیں۔ یا مناظرہ اس میں بے تکلفی شرط ہے، سو مجھ میں اور آپ میں پہلے سے بے تکلفی نہیں۔ جواب آیا کہ جو چاہو مجھو آنے کی اجازت دے دو۔ میں نے آنے کی اجازت دے دی۔"

اب ذرا آنے کے بعد کی کہانی سنیئے۔

"آئے اور درخواست کی کہ تنہائی میں کچھ کہنا ہے۔ میں نے کہا کہ جلوت میں گفتگو کرنے میں تو آپ کے لیے خطرہ ہے کہ آپ کے اسرار ظاہر ہوں گے مگر آپ اس خطرہ کے لیے تیار ہیں۔ اور خلوت میں میرے لیے خطرہ ہے کہ مجھ پر اشتباہ ہو جس کیلئے میں تیار نہیں۔ آپکے لیے خلوت وجلوت دونوں برابر ہیں کیونکہ آپ اعلان کر چکے ہیں۔ توپوں، فوجوں، بندوقوں، مشین گنوں اور جیل خانوں کے لیے تیار ہو چکے ہیں، مگر میرے لیے خطرہ ہے کہ یہ سمجھا جائے گا کہ گورنمنٹ کے خلاف کوئی سازش کرنے کا ارادہ ہے۔ اس لیے جو کہنا ہو مجمع میں کہیئے۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ ۱۴۴)

ایسی کھری کھری اور سچی باتوں کا ان کے پاس کیا جواب تھا، لہٰذا کوئی جواب نہ بن پڑا اور چلے گئے۔

ایک اور واقعہ اسی مجلس کے ملفوظات میں مرقوم ہے کہ کانپور میں گیارھویں کے بارہ میں حضرت والا کا واعظ تھا۔ حضرت نے دلائل واضح سے گیارھویں کی تردید کی اور اسے بدعت قرار دیا۔

"اس میں ایک انسپکٹر پولیس بھی شریک تھے۔ وعظ کے بعد کہا کہ ہمارے لیے بڑی مشکل ہے۔ فلاں فلاں عالم تو اس کو جائز کہتے ہیں تم اس کو بدعت کہتے ہو، ہم کیا کریں۔ میں نے کہا کہ اس کا جواب تو بعد کو دوں گا۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو تردد رفع کرنا مقصود ہے یا اعتراض کرنا۔ کہا تردد رفع کرنا۔ میں نے کہا کہ تردد تو دونوں جانب ہونا چاہیئے۔ سو جیسے مجھ سے اس وقت کہا کیا کبھی ان جائز کہنے والوں سے بھی اسی طرح کہا گیا کہ فلاں فلاں منع کرتے ہیں اور آپ جائز کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ بس دارو غہ جی ختم ہو گئے۔"

ایسی معقول گفتگو جس میں عقل اور شریعت دونوں غالب ہوں حضرت والا کا روزمرہ کیا ہر وقت کا معمول تھا جس کی مثالیں حضرت کے مواعظ اور ملفوظات میں بکثرت ملتی ہیں اگر اُن کو نقل کیا جائے تو بات کافی طویل ہو جائے گی لہذا اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت والا کے قلب میں اہل علم کی نہایت وقعت اور عظمت تھی اور آپ اس وقعت اور عظمت کو لوگوں کے دلوں میں بھی قائم رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ حضرت والا سمجھتے تھے کہ علمآ کی عظمت ہی سے لوگوں کے دلوں میں دین کی عظمت قائم ہوگی۔ علمآ کا وجود تعلیم و تبلیغ دین اور بقاؤ تحفظ اسلام کے لیے نہایت ناگزیر ہے۔ اور اگر بے جا الزامات کے ذریعہ اہل علم کی تحقیر و توہین لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دی جائے اور لوگ ان سے بیزار ہو کر استفادہ نہ کریں تو پھر علماً و تعلیماً اور بالآخر عملاً معاذ اللہ دین کے فنا ہو جانے کے سوا اور کیا حاصل ہوگا۔ اگرچہ جس دین کی حفاظت اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمہ لی ہے وہ فنا نہیں ہو سکتا لیکن کیا اس سے اہل علم اپنے واجبات سے سبکدوش اور مواخذہ سے بری ہو سکتے ہیں۔ حضرتؒ والا نے کثرت کے ساتھ ہر مسلمان کو کسی نہ کسی عالم سے تعلق رکھنے کی تاکید فرمائی ہے اور اُس سے دین کے احکام دریافت کرتے رہنا ضروری قرار دیا ہے۔ اگر قریب کوئی عالم نہیں تو حضرت والاؒ کی تاکید ہے کہ دور ہی کے کسی عالم سے تعلق رکھنا چاہیے اور خط و کتابت کے ذریعہ احکام دین معلوم کرتے رہنا چاہیے اسی طرح دینی مدارس قائم کرنے اور جو قائم ہیں ان کی حفاظت و ترقی کی اپنے ملفوظات اور مواعظ میں جا بجا تاکید فرمائی کیونکہ دین کی گاڑی کے ڈرائیور یہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ عربی درسگاہوں اور دینی مدرسوں سے ان کی فراہمی منقطع ہو جائے تو امرآ کے فرسٹ سیکنڈ متوسطین کے انٹر اور غربا و عوام کے تھرڈ، سارے کے سارے ڈبے اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑے رہ جائیں۔ کیونکہ ہر طبقہ کی دینی حیات و حرکت ان مدرسوں سے نکلے ہوئے بُرے بھلے علمآ اور مولویوں ہی کے دم سے قائم ہے اور جس قدر امت کے مختلف طبقات اپنی اپنی اہلیت اور حیثیت کے مطابق ہماری دینی گاڑی کے اُن ڈرائیوروں یا چلانے والوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت اور خدمت و اعانت کا بندوبست کریں گے، اسی قدر دینی حرکت و حیات پائدار اور مضبوط ہوگی اور اسی نسبت سے انشاءاللہ ہماری دنیا بھی درست ہوگی۔

اسی سلسلہ میں حضرت والاؒ نے اہل علم کا اہل اموال سے اختلاط کو منع فرمایا کیونکہ بعض دفعہ علمآ اہل اموال کو خوش کرنے کے لیے اور اُن کی دنیوی غرض کی تسکین کے لیے دین کے مسائل میں ہیر پھیر کر دیتے

ہیں۔ جن سے اگرچہ امرا وقتی طور پر ایسے علماء سے خوش ہو جاتے ہیں لیکن جلد ہی ان علما کا وقار بلکہ شخصیت امرا کی نظروں سے گر جاتی ہے۔ اور پھر وہ ان علما پر دوسرے کو قیاس کر کے علما کی پوری جماعت اور اہل علم کے پورے طبقے ہی سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن اہل علم کا اُمرا سے بالکل منقطع ہو جانا بھی اُن کے لیے دینی نصرت کا باعث ہوتا ہے اور اُمرا کی اصلاح کے لیے ایک سنگ گراں کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا حضرتؒ والا نے اس بارہ میں یوں فرمایا۔

" باقی اگر اختلاط سے امرا کی اصلاح ہو کر اُن کو احکام دینیہ تبلائے جائیں خصوص جب کہ وہ خود خواہش کریں اور اُن کو حاضر ہونے کی مہلت نہ ہو تو ایسا اختلاط نہ مضر ہے نہ موجب مذلت۔ مگر جب قرائن یا شرائط سے یہ معلوم ہو کہ آزادی کے ساتھ حق ظاہر کیا جا سکے گا۔ اور ایسی حالت میں اگر وہ کچھ خدمت کریں تو لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ مگر احقر کا مشورہ یہی ہے کہ ہرگز قبول نہ کرے بلکہ جانے کے قبل شرط کرے کہ لینے دینے کا کچھ قصہ نہ ہو گا۔ جس کا اثر فطری طور پر بہت اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں امرا کا حوصلہ نہیں پڑتا کہ علما کو اپنا تابع بنانے کا وسوسہ بھی دل میں لائیں۔ بلکہ ہر طرح انہی کو تابع ہونا پڑتا ہے۔ اور یہی امر مہتم بالشان ہے۔ اور اگر خود امرا آئیں تو یہ اختلاط منع نہیں عین مطلوب ہے۔ اس سے بے رخی نہ کرے۔ اخلاق سے پیش آئے مگر استغنا کو اب بھی ہاتھ سے نہ دے۔ اندازہ فرمایئے کہ حضرتؒ والا نے کس احسن طریق سے نہ صرف دینی مسائل کی اصلاح فرمائی بلکہ حاملان علم دین اور عوام کی بھی قدم قدم پر رہبری فرمائی۔ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارہ میں حضرت تھانویؒ نے اپنی کتابوں میں نہ لکھا ہو۔ عقائد سے لے کر معاشرت تک اور عبادات سے لے کر تصوف و سلوک تک حضرتؒ کی کتابوں میں ایسے نکات اور ایسے جواہر ریزے پڑھنے والے کو ملیں گے جو سلف کی کتابوں کی ضخیم جلدوں میں بھی کمیاب ہیں۔

حدیث لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ .... پر ایک شبہ کا جواب دیتے ہوئے حضرتؒ نے چند لفظوں میں وہ کچھ بیان فرما دیا جو حدیث کی ضخیم شروحات میں بھی مشکل سے ملتا ہے۔

" فرمایا محبت کی دو قسمیں ہیں۔ طبعی[۱] و عقلی[۲] اور مطلوب عند المشائخ مؤخر الذکر ہے۔ بعض لوگ حب طبعی نہ ہونے سے سمجھتے ہیں کہ واقع میں محبت ہی نہیں حالانکہ حب عقلی خدا اور رسول سے ہر مسلمان کو ضرور ہوتی ہے ... سوال کیا گیا کہ حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص تم

ہیں سے مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں اُس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے نزدیک تو آپ سب سے زیادہ محبوب ہیں بجز میری جان کے۔ آپ نے فرمایا تو تم مومن بھی نہیں ہو۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اب میری جان سے بھی آپ زیادہ محبوب ہو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم مومن بھی ہو گئے۔

اشکال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس محبت کی نفی فرمائی ہے وہ محبت عقلی تو ہو نہیں سکتی اس واسطے کہ وہ تو ہر مومن کو ہوتی ہے۔ اور اگر وہ طبعی محبت مراد لی جائے تو اس کی نفی تو صحیح ہے مگر پھر اثبات درست نہیں کیونکہ بالبداہت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ محبت نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اس کا اقرار کیا تھا اور اتنی جلدی عادۃً تغیر ہو نہیں سکتا۔

اس پر فرمایا کہ حدیث کو سن کر اول اول حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ محبت طبعی مراد ہے۔ اس لیے انہوں نے صاف صاف عرض کر دیا کہ مجھے ایسی محبت تو ہے نہیں۔ جب اس پر آپ نے یہ فرمایا کہ تم مومن بھی نہیں ہو تو معاً اپنی کمال ذکاوت سے ان کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ حضورؐ کی مراد محبت عقلی ہے، کیونکہ جس قدر اعلےٰ درجے کے قائل مؤثر تھے اسی قدر اعلیٰ درجہ کے مخاطب بھی متأثر تھے۔ اس لیے زبان سے حب طبعی و عقلی کی تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ ذرا تأمل سے سمجھ گئے۔ پس فرمایا کہ اب ہے مجھے اتنی محبت آپ نے فرمایا اب تم مومن بھی ہو۔ الحاصل جملہ منفیہ میں حب طبعی کی نفی ہے اور مثبتہ میں حُب عقلی کا اثبات۔ فاندفع الاشکال۔ (بوادر النوادر)

ملاحظہ فرمایئے سیدنا عمرؓ کے حدیث کے جواب پہ اشکال عام کیا خاص اذہان میں بھی جو وارد ہوتا تھا، حضرت تھانویؒ کے ذہن رسا نے چند لفظوں میں اُسے کس طرح حل فرما دیا۔ الفاظ مختصر مگر اُن میں تشریح و تفصیل کا ایک بحر ذخار۔

قرآن حکیم میں ایک مقام پہ سیدنا جبرئیل علیہ السلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معلم ہونا مرقوم ہے جس سے بعض حضرات کو شبہ ہو گیا کہ سیدنا جبرئیل علیہ السلام جناب رسالتمآب علیہ افضل التحیات والتسلیمات سے افضل ہیں ہیں کیونکہ استاد شاگرد سے افضل ہوتا ہے۔ اور اگر معلم کے افضل ہونے کو تسلیم نہ کیجئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امت سے باعتبار علم کے افضل ہونا ثابت نہ ہوگا حالانکہ آپ اس حیثیت سے بھی بالاتفاق افضل ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اس شبہ کا اتنے جامع الفاظ میں

جواب دیا کہ اشکال کی تمام گرہیں کھل گئیں۔ فرمایا۔

،، جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ معلم کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک محض مبلغ و سفیر ہوتا ہے جس کے متعلق محض بات کا پہنچا دینا ہے۔ اس میں معلم کا افضل ہونا ضروری نہیں۔ اگر بادشاہ اپنے وزیر کے پاس کسی خاص قاصد کے ہاتھ کوئی پیام بھیجے تو کیا یہ قاصد وزیر سے افضل ہو جائے گا۔ دوسری حیثیت استاد و اتالیق ہونا جسکے متعلق متعلم و شاگرد کی تربیت بھی ہے اس میں معلم کا افضل ہونا ضروری ہے۔ سو جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم بالمعنی الاول ہیں کہ بالمعنی الثانی کیونکہ مربی بمعنی ثانی اتالیق و تربیت دہندہ حسب تصریح حدیث علمنی ربی فاحسن تعلیمی وادبنی فاحسن تادیبی۔ میرے رب نے مجھے تعلیم دی کیا اچھی تعلیم دی۔ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا کیا اچھا ادب سکھایا۔ خود حضرت جل وعلا شانہ معلم بلا واسطہ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے معلم بمعنی ثانی ہیں۔ پس آپ کی اور جبرئیل علیہ السلام کی معلمیت میں بڑا فرق ہے۔ پس معتزلہ کی یہ بہت بڑی گمراہی ہے عقیدہ واجبہ ہیں۔ (اصلاح انقلاب امت)

سب مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت عام ہے لیکن اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ خلجان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے گئے اور نہ ہی آپنے اپنے کسی صحابی کو وہاں بھیجا۔ علاوہ ازیں خود امریکہ کی دریافت بھی حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے بہت بعد میں ہوئی ہے۔ جب آپ کی وہاں دعوت نہیں پہنچی تو آپ کی نبوت عام کیسے ہوئی؛ اس خلجان سے ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لیے حضرت والا نے فرمایا۔

،، بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے۔ اور یہ معنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی۔ اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے۔ (اشرف الجواب)

اسی طرح اپنی تفسیر میں ایک مقام پر ،، نبی اور رسول کے فرق کو اس طریقے سے بیان فرمایا کہ علامہ ابن تیمیہؒ کی ،، النبوات ،، کے کئی صفحات بھی اس فرق کو واضح نہ کر سکے۔ آپ نے فرمایا۔

،، رسول اور نبی کی تعریف میں اقوال متعدد ہیں۔ تتبع آیات مختلفہ سے جو بات احقر کے نزدیک

محقق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں عموم خصوص من وجہ ہے۔ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدیدہ پہنچائے، خواہ وہ شریعت اس رسول کے اعتبار سے بھی جدیدہ ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف مرسل الیہم کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت کہ وہی شریعت ابراھیمیہ تھی، لیکن قوم جرھم کو اس کا علم حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی سے حاصل ہوا۔ اور خواہ وہ رسول نبی ہو یا نبی نہ ہو جیسے ملائکہ کہ ان پر رسول کا اطلاق کیا گیا ہے اور وہ انبیاءً نہیں ہیں۔ یا جیسے انبیاءؑ کے فرستادے اصحاب جیسا سورۂ یٰسین میں ہے۔ اِذْ جَاءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ اور نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو۔ خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ کی۔ جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل کہ شریعت موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ پس من وجہ وہ عام ہے اور من وجہ یہ عام ہے۔ پس جن آیتوں میں دونوں مجتمع ہیں۔ ان میں تو کوئی اشکال نہیں کہ عام وخاص کا جمع ہونا صحیح ہے اور جس موقع پر دونوں میں تقابل ہوا ہے جیسے مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ الخ۔ چونکہ عام وخاص مقابل ہوتے نہیں اس لیے وہاں نبی کو عام نہ لیں گے بلکہ خاص کریں گے مبلغ شریعت سابقہ کے ساتھ۔ پس معنی یہ ہوں گے۔ ما ارسلنا من قبلک من صاحب شرع جدید وصاحب شرع غیر جدید الخ۔ لیکن چونکہ اب غالباً لفظ رسول سے صاحب نبوت ہونا ہے اس لئے غیر نبی پر اطلاق اس کا بوجہ الہام کے درست نہیں۔" (بیان القرآن جلد ، ص ۱۱)

موجودہ زمانہ میں بعض لوگ علماً پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ دنیا پرستوں کی طرح محنت مزدوری یا کاروبار کر کے دنیا کیوں نہیں کماتے۔ وہ کہتے ہیں کہ علماً اپاہج ہیں آرام طلب ہیں اور قوم پر بوجھ ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے دنیا پرستوں کے اس اعتراض کا جواب کتنے لطیف انداز میں بیان فرمایا۔

" یہ مسئلہ عقلی بھی ہے، چنانچہ اس مضمون کو ایک مسلّم عند العقلاً مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اس کو دوسرا کوئی کام تجارت وغیرہ کرنا ممنوع ہے۔ مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اس پر گرفت ہوگی۔ . . . غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے۔ مگر اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن اگر بڑی سرکار (یعنی اللہ تعالیٰ) کا کوئی ملازم ہو اس لیے وہ اسباب

معاش کو ترک کرے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ یہ لوگ نکمے ہیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں کے فتوے کی تصدیق نہ ہو اور حکام کے فتویٰ کی تصدیق ہو...

"اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری کام میں خلل واقع ہوگا اس لیے اُس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے۔ اس لیے جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے۔ مشینیں اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے تو وہ مثال مذکور کو پیش نظر رکھ کر خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا میں مشغول ہوں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ یہی ہوگا کہ دین کا کام نہ کر سکیں گے۔"

(وعظ خیر المال للرجال)

اسی وعظ میں حضرتؒ نے ایک اور اشکال کا ایسا عقلی جواب دیا کہ قاضی مبارک اور حمد اللہ پڑھانے والوں کو بھی شاید اُس کا ایسا اچھا جواب نہ سوجھتا۔ معاملہ یہ ہے کہ علماً حضرات مدارس یا مساجد سے جو تنخواہ لیتے ہیں۔ مدارس اور مساجد کی آمدنی چونکہ عوام کے چندوں پر مشتمل ہوتی ہے لہٰذا بعض جدید مذاق کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماً ہمارے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں اس وجہ سے اُنہیں ذلیل سمجھتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اس بات کا جواب جس انداز میں دیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرمایا:-

"اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی کی خدمت میں محبوس ہو اُس کا نفقہ اس کے ذمہ ہونا ہے اور یہ قاعدہ تمام دنیا کے عقلاؔ کا معمول بہ ہے۔ حتیٰ کہ سلاطین تک کے لیے بھی یہی قانون نافذ ہے بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لیے کہ وہ رعایا کے کام میں محبوس ہے، کیونکہ بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بناتی ہے اور اُس کو بیت المال کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔'

"اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی، ایک پائی عمرو کی اور ایک پائی بکر کی۔ جس کوٹھڑی میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اُس کا نام خزانہ ہے۔ حقیقت اس کی وہی چندہ ہے۔ وہ بھی قومی چندہ ہے، اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے۔ صرف خزانہ کے لفظ سے اُس کی عزت بڑھ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اس کی وہی چندہ قومی ہے۔ پس یہی حقیقت اس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ ملتی ہے۔ مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو ذلت سمجھتے ہیں اور بادشاہ کے لیے ذلت نہیں سمجھی

جاتی۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشاہ کو ایک لاکھ ملتے ہیں اس لیے ذلت نہیں خیال کی جاتی اور مولوی بیچاروں کو تھوڑی مقدار ملتی ہے اس لیے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں۔ مگر بغور دیکھئے حقیقت دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ اور جب حقیقت ایک ٹھیری تو جس نے چندہ میں سے ایک پیسہ لیا اُس کی کم ذلت ہونا چاہیئے اور جس نے زیادہ لیا اُس کی زیادہ ذلت ہونا چاہیئے۔

” اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق کی علت کیا ہے۔ سو وہ استحقاق کی علت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے اُس کا نفقہ رعایا کے ذمہ ہے۔ اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے، سب کو چندہ قومی ہی سے تنخواہ ملتی ہے۔ کلکٹر کو بھی ڈپٹی کلکٹر کو بھی۔ جج کو بھی، منصف کو بھی۔ پس یہ مسئلہ ہوا اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کر لیا ہے جیسے زوجہ کا نفقہ اُس کے شوہر پر اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اس کے پاس محبوس ہوتی ہے

” اب بتلایئے کہ یہ علت علماؔ کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لیے اُن کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں دین کا کام نہیں کر سکتے۔ اگر اُن کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں اُن پر کسی کا احسان بھی نہیں۔ کبھی کوئی احسان کرنے لگے۔ اس لیے کہ اگر وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں۔ پس آپ کے ذمہ تو اُن کا قرض ہے۔ اگر یہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلوائیں یہ دوسری بات ہے کہ وہ قیامت میں معاف کر دیں۔“

(خیر المال للرجال)

حضرت والا کے اگر اعتراضات کے جوابات نقل کیے جائیں تو اس کے لیے ضخیم دفتروں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں حضرت والاؒ کا ایک ملفوظ نقل کرنا چاہتا ہوں جس میں حضرتؒ نے ایک اعتراض کا جواب نہایت نفیس انداز میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا۔

” آج کل ہر طبقہ میں ایک عجیب ہڑبونگ مچا ہوا ہے۔ ردولی میں عین مسجد کے اندر سماع ہوتا ہے۔ اُس کی اصل یہ سنی ہے کہ حضرت شیخ عبدالحقؒ کو ایک مرتبہ اتفاقاً عین حالت سماع میں وجد کا غلبہ ہو گیا اور وہ اُس حالت میں اُٹھ کر مسجد کے اندر چلے گئے تھے اور ساتھ ساتھ قوال

بھی چلے گئے۔ مگر وہ تو مغلوب تھے اور یہ لوگ محض نقل کرتے ہیں۔ اب اسی ترتیب سے مجلس ہوتی ہے یعنی سماع شروع ہوتا ہے مسجد کے باہر اور درمیان میں اُٹھ کر مسجد میں جاتے ہیں اور ڈھولک سارنگی مسجد میں بجتی ہے۔ ان نقالوں سے کوئی یہ بھی پوچھے کہ کیا حضرت شیخؒ بھی ڈھولک سارنگی سے سماع سنتے تھے یہ خوب تحقیق ہوگیا ہے کہ حضرات اہل سماع نے معازف و مزامیر کبھی نہیں سنے۔ اسی طرح ایک مسجد کے باہر سماع ہو رہا تھا۔ ڈھولک سارنگی بج رہی تھی۔ نماز کا وقت آگیا۔ باجہ والے نماز کو مسجد میں گئے تو آلات کو بھی مسجد میں لے گئے۔ ایک صاحب نے اعتراض کیا۔ یہاں مسجد میں آلات معصیت۔ ان اہل سماع میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ وہ جواب میں کیا کہتے ہیں کہ آپ بھی تو آلات زنا لیے ہوئے مسجد میں آئے ہیں۔ کیا بیہودہ جواب ہے۔ جس چیز کو انہوں نے آلۂ معصیت کہا ہے وہ آلۂ معصیت کہاں ہے؟ آلۂ معصیت تو وہ چیز ہے جو وضع کیا جاوے معصیت کے واسطے اور یہ معصیت کے لیے وضع نہیں کیا گیا۔ یہ تو ایک حلال ضرورت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یوں کوئی سوء استعمال سے معصیت کا ذریعہ بنالے تو اس سے وہ آلۂ معصیت تھوڑا ہی ہوگیا۔ بخلاف آلات غنا کے کہ وہ تو موضوع ہی ہوئے ہیں معصیت کے واسطے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اس میں تو ضرورت ہے اس کو جدا کیسے کر سکتا ہے۔ تیسرے اپنے معدن میں ہے۔ معدن میں ہونا ایسا مؤثر ہے کہ جو اپنے معدن میں ہے اس پر نجاست کا حکم نہیں کیا جاتا مثلاً پیشاب ہے۔ پاخانہ ہے۔ کس کے اندر نہیں مگر اس پر نجاست کا حکم نہیں اس لیے کہ وہ اپنے معدن میں ہے۔" (الافاضات جلد ۳ ص ۱۵۷)

بات بڑھتی ہی جارہی ہے۔ لیکن حضرت والاؒ کے علوم و معارف پر ابھی بحث شروع ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ حضرتؒ کے علوم و معارف اور طریق اصلاح میں اتنی جامعیت اور کاملیت ہے کہ دین و دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارہ میں حضرت تھانویؒ نے اصلاح نہ فرمادی ہو، ہمارا روزمرہ کا معمول ہے کہ ایک دوسرے کے لیے ہر وقت جائز و ناجائز سفارش کرتے رہتے ہیں اس بارہ ہمارا کوئی اصول ہے اور نہ ضابطہ۔ ہم صرف تعلقات کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ قریبی تعلقات والا جیسی بھی ہم سے سفارش کروالے ہم ویسی ہی اس کے لیے سفارش کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرتؒ کے ہاں ایسا دستور نہ تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مدرسہ دیوبند کے ایک طالب علم نے حضرت والاؒ سے عرض کیا کہ مجھ کو مدرسہ دیوبند کے مہتمم صاحب نے ایک غلطی کی وجہ سے مدرسہ سے

نکال دیا ہے۔ حضرت والا مہتمم صاحب کے نام ایک سفارشی خط تحریر فرما دیں کہ وہ مجھ کو دوبارہ مدرسہ میں داخل فرمالیں۔ سفارش ایک دینی طالب کی تھی اور مہتمم مدرسہ دیوبند کے حضور۔ طالب علم کے مستقبل کا انحصار اس سفارش پر تھا۔ علم تو کیا کوئی خاص علم دین بھی ہوتے تو فوراً کاغذ اور قلم دوات لے کر مہتمم صاحب کے نام سفارشی خط لکھ دیتے۔ لیکن حضرت والاؒ نے اس طالب علم سے فرمایا:

”مجھ کو واقعہ کا علم نہیں کہ وہ غلطی کیا ہے جس کی وجہ سے تم کو مدرسہ سے نکالا گیا۔ دوسرے یہ بتاؤ کہ مدرسہ کے قواعد کے تحت تم کو نکالا گیا یا نہیں؟ عرض کیا کہ نکالا تو قواعد ہی کے تحت ہے۔“

جب اس طالب علم نے اقرار کر لیا کہ مہتمم صاحب نے قواعد و قوانین کے تحت ہی مجھے مدرسہ سے خارج کیا ہے۔ تو جواب میں اس صدی کے مصلح اعظمؒ نے جو فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا کہ

”اب سفارش کا مطلب یہ ہو گا کہ قواعد کوئی چیز نہیں جس کو جی چاہا خارج کر دیا جس کو جی چاہا داخل کر لیا۔ اور بڑی بات تو یہ ہے کہ واقعہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم نہیں کہ وہ غلطی ثقیل ہے یا ثقیل نہیں۔ آیا وہ کسی کے لیے مضر ہے یا مضر نہیں۔ نیز آئندہ احتمال اس غلطی کے ہونے کا ہے یا نہیں؟ اس کو تو مہتمم مدرسہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تم ایک عرصہ مدرسہ میں رہ چکے ہو وہ تمہاری حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ سفارش کس بنا اور کس اطمینان پر کروں۔ دوسرے یہ کہ میں سفارش کے باب میں بہت محتاط ہوں۔ اگر کوئی کام واجب ہو تب تو سفارش مطلقاً جائز ہے۔ باقی مباح میں بھی میں سفارش کو جائز نہیں سمجھتا۔ آج کل کا رنگ دیکھ کر میں مباح میں سفارش کرنے کو جبر سمجھتا ہوں۔ مخاطب پر ایک قسم کا بار ڈالنا ہے جو شرعاً بھی جائز نہیں۔ البتہ اگر ایسی سفارش ہو کہ یہ یقین ہو کہ مخاطب بالکل آزاد رہے گا۔ چاہے عمل کرے یا نہ کرے۔ یہ سفارش بے شک جائز ہے۔ اور یہ سفارش حقیقت میں مشورہ کی ایک فرع ہے۔ باقی جس سفارش میں یہ احتمال بھی ہو کہ مخاطب خلاف نہ کر سکے گا ایسی سفارش کرنا گویا کہ تنگ کرنا ہے اس کو بھی شرعاً جائز نہیں سمجھتا۔“

سفارش کی شرعی حیثیت بیان فرما کر پھر حضرت والاؒ نے اس طالب علم کو مخاطب فرما کر نہایت شفقت آمیز لہجہ میں فرمایا:

”میں ایک بات بتلاتا ہوں محض تمہاری ہمدردی اور خیر خواہی کی بنا پر۔ وہ یہ کہ سفارش کا تو اکثر اثر بھی اچھا نہیں ہوتا۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ تم خود جا کر ہاتھ پاؤں جوڑ کر معافی چاہو۔ اس سے اکثر اوقات

اچھا اثر ہوتا ہے۔ دل کھل جاتا ہے۔ اور سفارش پر اگر داخل ہو بھی گئے اور پھر کوئی نہ کوئی بات ہوگئی تو سفارش کرنے والے پر بھی الزام کہ صاحب ایسے شخص کی سفارش کی۔ پھر کہاں سے سفارش لاؤ گے۔ اور یہ ایسی چیز ہے کہ ہر وقت اپنے پاس ہے۔ فوراً معافی چاہ لی۔ جاؤ یہی کرو۔ انشاءاللہ اثر اچھا ہوگا اور میں بھی دعا کرتا ہوں۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص ۱۶۵)

سفارش ہی کے سلسلہ میں جب ایک نو وارد شخص نے حضرت والاؒ سے سفارش کی درخواست کی تو حضرت والاؒ نے شرعی نقطۂ نگاہ سے سفارش پر بحث کرتے ہوئے اس کے فوائد و نقصانات بھی بیان فرمائے۔ فرمایا۔

"سفارش کے متعلق ایک تمہید سنو۔ خضر علیہ السلام کے پاس جانے کا موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ جاکر علوم سیکھو۔ آپ خضر علیہ السلام کے پاس تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے پوچھا، کون؟ فرمایا۔ موسیٰ۔ کون موسیٰ۔ فرمایا بنی اسرائیل کا موسیٰ۔ پوچھا کیسے آئے؟ فرمایا ھل اتبعک علیٰ اَن تعلمن مما علمت رشداً یعنی میں علوم سیکھنے کے لیے تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں اتنے بڑے نبی اوالعزم اور خضر علیہ السلام سے فرماتے ہیں ھل اتبعک۔ میں تمہارے ساتھ رہوں۔ مجھ کو کچھ علوم سکھا دیجئے۔ یقینی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے علوم کے سامنے خضر علیہ السلام کے علوم کیا چیز تھے مگر خیر جو کچھ بھی تھے اُن کے سیکھنے کی درخواست کی

"خیر یہ تو قصہ ہے، مگر اس میں دیکھنا یہ ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ اس گفتگو میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں۔ یہ فرماتے تو اعلےٰ درجہ کی سفارش ہوتی۔ سو اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ آج کل جو سفارش لکھا کر لے جاتے ہیں یا جاکر کسی کا نام لے دیتے ہیں۔ بعض اوقات اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حضرات انبیاءؑ علیہم السلام ہی حقیقی علوم کے حامل ہیں۔ دیکھئے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کے ارشاد سے آیا ہوں۔ کیونکہ یہ سن کر کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے پھر چون و چرا نہ کریں گے اور آزادی نہ رہے گی۔ چنانچہ خضر علیہ السلام نے نہایت آزادی سے شرطیں لگائیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدون اذن کے کسی کی صحبت سے استفادہ حاصل نہیں کرنا چاہیئے۔ نیز دوسرے کے پاس جاکر یہ نہ کہے کہ میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا ہوں۔

(الافاضات الیومیہ جلد ۳ ص ۶۳)

اسی سلسلہ میں ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت والاؒ اس سفارش کے معاملہ میں کس درجہ محتاط تھے :۔

" ایک صاحب نے سفارش چاہی اور پریشانی کا اظہار کیا اور ایک معین نام بھی تبلایا کہ فلاں سوداگر کو لکھ دو۔ میں نے ان کو اس طرح لکھا کہ

" ایک حاجت مند کو ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس پہلے سے ایسی رقم موجود ہو جس کو آپ سوچ رہے ہوں کہ کہاں خرچ کریں اور کسی دوسرے سے وعدہ بھی نہ کیا ہو اور آپ کے علم میں کسی اُور کی توقع نہ ہو تو اس حالت میں یہ حاجت مند ہیں۔ ان کی اعانت کیجئے ورنہ اپنی آزادی میں خلل نہ ڈالیے، اس بیچارے نے وہ رقم بھیج دی۔ حضرت والاؒ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا :

" مجھ کو کام کرنے سے انکار نہیں مگر جی یہ ضرور چاہتا ہے کہ کسی پر بار نہ ہو اور طریقہ سے کام ہو اور حقیقت تو یہ ہے کہ محض نام ہو جاتا ہے کسی کا ورنہ دینے والے تو وہ خود ہی ہیں "۔

باوجود ان قیود اور احتیاطوں کے چونکہ لوگوں کو بے احتیاطی کا مرض عام ہے جس کے تجربات کی بنا پر ایک صاحب کی سفارش کے سلسلہ میں فرمایا :۔

" اب ان قیود سے بھی سفارش نہ کروں گا۔ فہم میں سلامتی نہیں۔ لوگ سفارش کی حقیقت سے بے خبر ہیں ۔"

باقی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت بریرہؓ سے مغیثؓ کے نکاح کی سفارش فرمائی تھی۔ اس کے بارہ فرمایا۔ " اسی حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ بریرہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ کا حکم ہے یا سفارش۔ آپ نے فرمایا کہ سفارش۔ عرض کیا میں قبول نہیں کرتی ہوں۔ اگر اس قدر آزادی ہو تو سفارش کرنا سنت ہے، ورنہ جبر ہے۔ مجھ کو ایسی باتوں میں بڑی احتیاط ہے۔" (الافاضات جلد ۴ ص ۳۴)

سفارش اس معاشرہ میں ایک عام اور معمولی مسئلہ سمجھا جاتا ہے لیکن حضرت تھانویؒ نے اس کو شرعی اور عقلی طور پر کس طرح منقح کر کے رکھ دیا جس سے بڑے بڑے لوگوں کے ذہن خالی ہیں۔

شیخ الاسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ اس صدی کے بہت بڑے ادیب اور مؤرخ تھے۔ حضرت تھانویؒ سے تعلق قائم ہوا تو ارادہ فرمایا کہ کم از کم ایک چلّہ حضرت والاؒ کے پاس تھانہ بھون میں رہا جائے۔ یہ واقعہ احقر نے علامہ سید سلیمان ندویؒ سے خود سنا۔ فرماتے تھے کہ میں نے حضرت والاؒ کو خط لکھا کہ بندہ کچھ

عرصہ حضرت والاؒ کے پاس آکر رہنا چاہتا ہے۔ حضرتؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"دو شرطیں ہیں اگر یہ منظور ہیں تو آجائیں ورنہ آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔ ایک شرط یہ ہے کہ مجھ سے کوئی سوال نہیں کرنا اور دوسری یہ کہ جو میں کہوں اس پہ کوئی اعتراض نہیں کرنا۔"

سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت والاؒ کے اس جواب سے میں سخت پریشان ہوا کیونکہ تھانہ بھون کے قیام کے دوران میں حضرت والاؒ سے اپنے کچھ اشکالات رفع کروانا چاہتا تھا۔ لیکن حضرتؒ کی ان دونوں شرطوں سے مجھے اپنا مقصد پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

سید صاحب فرماتے ہیں میں نے اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو خط لکھا کہ میں نے حضرت تھانویؒ کو خط لکھا تھا اور آپ نے یہ دو شرطیں لگائی ہیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے میں ان دو شرطوں کی موجودگی میں تھانہ بھون جاؤں یا نہ جاؤں؛ مولانا عبدالماجدؒ نے جواب میں سید صاحبؒ کو لکھا کہ وہ حکیم الامت ہیں یہ شرطیں لگانے میں بھی کوئی حکمت ہوگی لہٰذا آپ یہ دونوں شرطیں منظور کرکے حضرت والاؒ کے ہاں چلے جائیں۔

سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی بات پر عمل کرتے ہوئے تھانہ بھون حضرت تھانویؒ کی خدمت میں چلا گیا۔ ذہن میں اشکالات کا ایک ہجوم تھا، لیکن حضرتؒ نے اپنی پہلی ہی مجلس میں ان تمام اشکالات کو بغیر میرے سوال کئے خود رفع فرما دیا جس سے قلب و ذہن بالکل مطمئن ہو گئے۔ میں نے ایک چلہ خانقاہ تھانویؒ میں قیام کیا۔ جس روز واپس آنا تھا اس روز میں نے حضرت والاؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضرت میں آج واپس جا رہا ہوں"۔ فرمایا "جائیں"۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں "حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو ایک سوال کروں"۔ فرمایا "ہاں اجازت ہے"۔ عرض کیا "حضرت آپ نے میرے آنے پہ یہ دو شرطیں کیوں لگائی تھیں"؟ اس کا جواب جو حکیم الامت تھانویؒ نے دیا وہ مولانا عبدالماجدؒ کی بات کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے "کہ آپ حکیم الامت ہیں۔ اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی لہٰذا آپ چلے جائیں"۔ حضرت والا نے فرمایا:۔

"جب آپ نے لکھا تھا کہ میں خانقاہ میں چند دنوں کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ تو میں نے سوچا کہ اگر آ رہے ہو تو کچھ لے کر جاؤ۔ تب میں نے یہ دو شرطیں لگا دیں کیونکہ مولوی کو راہ ہدایت کی طرف آنے سے یہی چیز روکتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جانتا لہٰذا یا تو وہ خواہ مخواہ سوال

کرتا ہے یا پھر دوسروں کی باتوں پر اعتراض کرتا رہتا ہے۔

حضرتؒ نے ایک عالم کی ذہنی نفسیات کا کیسا تجزیہ فرمایا اور حقیقت میں ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ دو عالم جہاں کہیں جمع ہو جائیں تو ان میں اکثر اوقات سوالات و جوابات ہی کی دھینگا مشتی ہوتی رہتی ہے اور مسائل بجائے سلجھنے کے اور زیادہ اُلجھ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت والا فرماتے تھے:

"ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علمائے محققین و عرفائے محققین اہل دل کی صحبت و ملازمت کا التزام کریں اور اُن کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کر کے رہیں۔ خود ان کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جائے گی۔ اس کے بعد جو شبہات رہ جائیں اُن کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں اور توجہ و انصاف کے ساتھ جواب سنیں۔

"ان کو اس زمانہ سکوت میں جو اصول و قواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان و شفائے کلی میسر ہو گی۔"

عہد جدید کے مصلحین جب اصلاح کا بیڑا اُٹھاتے ہیں تو ملک و قوم سے اصلاح کا عزم شروع کرتے ہیں اور اسی میں ساری عمر کھپا دیتے ہیں۔ اپنے اہل و عیال اور برادری کی باری سرے سے آتی ہی نہیں۔ اس کے برعکس انبیائی طریقۂ اصلاح اس کے بالکل خلاف ہے۔ وہ اصلاح اپنے اہل و عیال اور بھائی برادری سے شروع کرتے ہیں۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اس پر شاہد ناطق ہے۔ حکیم الامت تھانویؒ قدس سرہ نے بھی اسی انبیائی اصلاح کے طریقہ کو اپنایا اور اپنے گھر سے اس کو شروع کیا۔ اپنے اعزہ کے ہاں اگر ایسی شادی بیاہ کی تقریبات ہوتیں جن میں منکرات و بدعات کا دخل ہوتا تو حضرت نہ صرف اس میں شرکت نہ فرماتے بلکہ ان منکرات و بدعات کو ہر ممکن روکنے کی کوشش فرماتے۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرتؒ نے اپنی علاتی ہمشیرہ کی شادی کا واقعہ ملفوظات میں ذکر فرمایا ہے۔

"اس میں سب مروجہ رسوم ہوئی تھیں۔ قصہ یہ ہے کہ اُس کی والدہ کو عورتوں نے بہکایا اور یہ سمجھایا کہ تمہاری ایک ہی بچی ہے۔ دل کھول کر شادی کرو۔ باقی اگر یہ اندیشہ ہے کہ وہ (یعنی میں) شرکت نہ کرے گا تو نکاح میں تو شرکت ہو ہی جائے گی اور جن رسموں کو بُرا کہتے ہیں اُن میں نہ شریک ہوں گے۔ نکاح تو سنت ہے اس میں ضرور شریک ہوں گے۔ والدہ بیچاری بہکانے میں آ گئیں۔ برات کا دن جمعہ تھا

میں نے بھیسانی (ایک گاؤں کا نام ہے) والوں کو کہلا بھیجا کہ جب جمعہ پڑھنے آؤ ایک بہلی لیتے آنا۔ میں بعد جمعہ تمہارے ہاں آؤں گا۔ میں نے جمعہ کی نماز جامع مسجد میں پڑھی اور باہر باہر بہلی میں بیٹھ کر چلا گیا یہاں گھر والوں کو خبر نہ کی۔ یہی خیال رہا سب کو کہ ہوگا کہیں یہیں مسجد وغیرہ میں۔ مغرب کے بعد نکاح پڑھانے کے لیے تلاش ہوئی۔ نہ ملا تو بھائی صاحب نے مختلف اطراف میں آدمی بھیجے۔

ایک آدمی بھیسانی بھی آیا۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ وہ آدمی مجھے ملا۔ میں نے کہا جا کر کہہ دینا۔ میں زندہ ہوں اطمینان رکھو۔ اور اگر اوروں پر اختیار نہ تھا تو اپنے نفس پر تو اختیار تھا۔ خود اپنے کو بچا لیا۔ صبح انشاء اللہ آؤں گا۔ صبح بھی اس خیال سے دیر کر کے چلا کہ ایک براتی کی بھی صورت نہ دیکھوں پھر تو میری شرکت نہ کرنے کی وجہ سے سارے خاندان نے توبہ کی کہ بڑی واہیات بات ہوئی اب آئندہ کبھی ایسا نہ کریں گے۔ جب سے اللہ کا فضل ہے خاندان میں کبھی کوئی رسم نہیں ہوتی۔"

حضرت والاؒ کے اس فعل اور شادی کے اس شخصی بائیکاٹ کا نہ صرف خاندان والوں پر اچھا خاصا اثر ہوا، کہ ہمیشہ کے لیے خاندان میں رسومات اور بدعات کی جڑ کٹ گئی بلکہ گاؤں والوں پر بھی بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ بھیسانی گاؤں کے لوگوں نے حضرت والاؒ سے کہا:

"ہم لوگوں کا خیال ہوا تھا کہ جب مولویوں کے گھر دو سو روپے کا گھی ایک گاؤں سے جا رہا ہے اور دوسری جگہ سے بھی ضرور آیا ہوگا۔ جب گھی کا اس قدر صرفہ ہے تو اجناس میں نہ معلوم کس قدر صرفہ ہوگا۔ اب ہم بھی دل کھول کر شادیاں کیا کریں گے چاہے گھر کی جائدادیں فروخت ہو جائیں۔ سو اگر اس وقت آپ یہاں نہ آتے تو ہمارے یہاں بھی شادیوں میں ایسا ہوتا جس کا انجام گھر کی بربادی ہوتی۔ آپ نے آ کر ہمارا گاؤں بچا لیا اور ایسا ہو گیا جیسے اپنے پاس سے گاؤں ہم کو دیا۔"

(الافاضات الیومیہ جلد ۱ ص ۲۳)

یہ تو اُس گھریلو شادی کا ذکر ہے جہاں حضرت والاؒ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اسی وجہ سے حضرتؒ نے اُس سے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن جو شادی حضرت والاؒ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد مظہرؒ کی وہ اس قدر سادہ اور رسومات سے مبرّا تھی کہ وہ سارے علاقہ میں سادگی میں مثال کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ اور ارباب اتقاء و تقدس کے ہاں دوسروں کے لیے تو سادگی کی تلقین ہوتی ہے لیکن اپنی اولاد اور عزیز و اقارب کی شادیوں اور مسرت کے مواقع پر ہر رسم کی جاتی

ہے۔ اُن کے ہاں سادگی اور شرعی تقریب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بس ناچ گانا نہ ہو۔ باقی دعوت اور کھلانے وغیرہ میں فخر و مباہات کے جتنا اسراف اور فضولیات کا مظاہرہ کر لیا جائے وہ جواز کی حد میں آتا ہے۔ لیکن حضرتؒ نے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی کے بارہ میں جو تحریر فرمایا ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ فرماتے ہیں کہ

”صرف ایک بہلی تھی۔ اس میں ایک میں ایک منظہر ایک مولوی شبیر علی جو اس وقت بچے تھے ان کو اس لیے ساتھ لے لیا تھا کہ شاید گھر میں آنے جانے یا کسی بات کے کہلانے کی ضرورت ہو۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں بھی کوئی گڑبڑ نہیں صرف خاص خاص عزیزوں کو دعوت ہے جن کی تعداد چھ سات سے زائد نہیں۔ مگر یہ لوگ بھی خفا تھے محض اس وجہ سے کہ رسوم کیوں نہیں کی گئیں۔ ..... معلوم ہوا کہ لڑکی کی ماں اس اختصار سے بہت شکر گذار ہوئیں اور کہنے لگیں اگر زیادہ بکھیڑا ہوتا تو ایک گہنے کا ہار میرے پاس تھا وہ بھی جاتا اور قرض لینا پڑتا ....

اب صبح چلنے کا وقت ہوا تو ایک رسم ہے بکھیر (پنجابی میں سوٹ) کی۔ دلہن کے رخصت کے وقت بستی کے اندر اندر کچھ روپیہ پیسہ کی بکھیر کی جاتی ہے۔ میں نے یہ کیا کہ کچھ روپیہ مساکین کو تقسیم کر دیا اور کچھ مساجد میں دیا محض اس لے کہ لوگ بخل و دنائت کا شبہ نہ کریں۔ اس سادگی کے متعلق یہ روایت سنی گئی کہ لوگ کہتے تھے کہ شادی اس کو کہتے ہیں۔ قلب کے اندر تازگی، شگفتگی اور انشراح معلوم ہوتا ہے۔ یہ دنیاداروں نے کہا۔ واقعی شریعت پر عمل کرنے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے۔“

یہ تو شادی کی تقریب کی سادگی کا ذکر تھا۔ اب ولیمہ کا حال حضرت والاؒ ہی کے الفاظ میں سنئے فرمایا

”میں نے کسی کی دعوت نہیں کی۔ کھانا پکوا کر گھروں کو بھیج دیا۔ ایک بی بی نے کھانا واپس کر دیا کہ یہ کیسا ولیمہ ہے؟ میں نے کہا قبول نہیں کرتیں ان کی قسمت جانے دو۔ ان کا خیال تھا۔ منائیں گے، خوشامد کریں گے مگر ہمیں ضرورت ہی کیا تھی کہ گھر سے کھلائیں اور اُلٹے خوشامد کریں۔ صبح کو وہی بی بی آئیں کہنے لگیں۔ رات کا کھانا لاؤ۔ میں تے کہا وہ تو رات ہی کو ختم ہو گیا۔ یہ سن کر بڑی ہی دل گیر ہوئیں کہ میری قسمت کہاں تھی کہ ایسی برکت کا کھانا نصیب ہوتا۔ ان دنیاداروں کا دماغ یوں ہی درست ہوتا ہے۔ اہل دین کو قدرے استغنا برتنا چاہیئے۔ ان کو جتنا جھکو وہ زیادہ اینٹھ مروڑ کرتے ہیں۔“

(الافاضات الیومیہ جلد ۱ صـ ۲۳۶)

اُمّت کے اس حکیم نے نہ صرف گھریلو رسومات ہی کی اصلاح کی بلکہ دین اسلام میں دین کے نام نہاد عاشقوں جیسے ہندوؤں کے پنڈتوں کی طرح اپنے بطن و معدہ کے عیش و آرام کے لیے دین کے نام پر جو بدعات گھڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے ان کی بھی اصلاح و تردید کی۔ کیونکہ بدعت نہ صرف دین اسلام میں ایک سازش ہے بلکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت حقہ کے خلاف خود دعویٰ نبوت کرنے کے مترادف ہے، جس کو مدینہ طیبہ کے امام مالکؒ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

من ابتدع فی الاسلام بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم فان الرسالۃ لان اللہ یقول الیوم اکملت لکم دینکم الخ فما لم یکن یومئذٍ دیناً فلا یکون الیوم دیناً (الاعتصام للشاطبی جلد ۱ ص ۲۵)

جس نے اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کی اور اُس کو اچھا سمجھا پس اُس نے یہ خیال کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت و نبوت میں خیانت کی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل کردی ہوئی ہے۔ لہٰذا جو شئی اُن دنوں دین نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتی۔ دین کے نام پہ اتنی بڑی سازش پر اُمت کا یہ نباض اور حکیم کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ مروجہ بدعات عُرس، تیجہ، دسواں جہلم اور فاتحہ وغیرہ کی حضرتؒ نے نہ صرف تردید کی بلکہ اصلاح بھی کی۔ چنانچہ ایک مقام پہ حضرت تھانویؒ نے بدعت کے بارہ میں یوں فرمایا۔

"ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن و حدیث، اجماع و قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اُس کو دین سمجھ کر کیا جائے وہ بدعت ہے۔ اس پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً عرس کرنا، فاتحہ دلانا تخصیص اور تعیین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں ہیں اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو، عوام میں خرابی پھیلے، خواص کو چاہیئے کہ اس امر کو ترک کردیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہیں تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھپائیں گے، مثلاً اگر جنازہ کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو متابعت جنازہ کو ترک نہ کریں گے کیونکہ متابعت جنازہ کی

مطلوب عند الشرع ہے۔ پس ایصال ثواب میں دو امر ایک تعیین وقت دوسرا ایصال ثواب۔ اور ان میں تعیین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے اور چونکہ تعیین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لیے ہم تعیین کو ترک کر دیں گے۔ البتہ اگر ساری اُمت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعیین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعیین کی اجازت دے دیں گے۔ لیکن حالت موجودہ میں (جبکہ اکثروں کا یہ خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ مقبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے) کیسے اجازت دے دی جائے "......

"ایک تو تخصیص اور تعیین قابل ترک ہے، دوسرے جو ہیئت ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی (آج کل تو علما بھی یہی بات کہتے ہیں) کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو حرج ہی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتیں۔ اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر یہ نیت ہوتی ہے ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو آگے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے۔" (تقویم الزیغ صـ ۲۹)

ایک اور مقام پر حکیم الامتؒ نے اپنے حکمت آمیز انداز میں بدعت کے بارہ میں یوں فرمایا:

"پس جاننا چاہیے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور بہ پر عمل نہیں ہو سکتا۔ جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدوین۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی بنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شی نہ تھی۔ اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور بہ کی ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے۔ اس کے بعد سمجھیے کہ زمانہ خیریت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لیے وسائط محدثہ میں سے کسی شی کی ضرورت نہ تھی۔ تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت سلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے۔ قوۃ حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا۔ فہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریریں کریں۔ ورع و تدین بھی غالب تھا۔ بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ

آیا۔ غفلتیں بڑھ گئیں۔ قویٰ کمزور ہو گئے۔ ادھر اہل ہویٰ اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا۔ تدین مغلوب ہونے لگا۔ بس علمائے امت کو قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا۔ پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی بجمیع اجزائہٖ تدوین کی جاوے۔ چنانچہ کتب دینیہ حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ تصنیف ہوئیں۔ اور ان کی تدریس کے لیے مدارس تعمیر کئے گئے۔ اسی طرح نسبت سلسلہ کے اسباب تقویت و ابقاء کے لیے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں۔ اس لیے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی۔ پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ سبب خیر القرون میں نہ تھا اور موقوف علیہ حفاظت دین مامور بہ کی ہیں۔ پس یہ اعمال گو صورتاً بدعت ہیں لیکن واقع میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مقدمۃ الواجب واجب ہے۔"

اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ

"اور تیجہ، دسواں، چہلم وغیرہ من البدعات کہ اس کا سبب قدیم ہے مثلاً میلاد منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادۃ النبویۃ ہے۔ اور یہ سبب حضورؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ لیکن حضورؐ نے یا صحابہؓ نے یہ مجالس منعقد نہیں کیں۔ کیا (نعوذ باللہ) صحابہؓ کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ منشا ان کا موجود نہ تھا۔ لیکن جب کہ باعث اور بناء اور مدار موجود تھا پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضورؐ نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ پس جس شی کو باوجود اس بناءً اور مدار کی موجودگی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ ایسی شی کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت ہے صورۃً بھی اور معناً بھی۔ اور حدیث مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں اور پہلی قسم مَا مِنْہُ میں داخل ہو کر مقبول ہے۔ یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا۔ اس سے تمام تر جزئیات کا مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کالانعام ہوتے ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مولد شریف کی مجلس کو ایجاد ایک بادشاہ نے کیا ہے اور اس کا شمار عوام ہی میں ہے اور عوام ہی اب تک اس میں شرکت بھی کر رہے ہیں۔"

(السرور ص ۲۷)

حضرتؒ کی اس عبارت کو بار بار پڑھیے آپ کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ آپ نے کس لطیف اور جامع پیرایہ میں بدعت کی تعریف اور اُس پر اعتراضات کے جوابات مختصر سی عبارت میں دیے ہیں۔ اسی طرح جب بعض غیر مقلدین نے یہ اعتراض کیا کہ حنفیہ حدیث رسول کے مقابلہ میں ائمہ کے اقوال پر عمل کرتے ہیں اور یہ شرک فی النبوۃ ہے، تو حکیم الامت تھانویؒ نے اس کا ایسا مسکت جواب دیا کہ غیر مقلدین آج تک اس کا جواب نہیں دے سکے۔ آپ نے فرمایا۔

"جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں۔ جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو ہمارا عمل اگر اُس حدیث پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہے۔ اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں۔ پھر ہمارے ہی اوپر کیا الزام ہے۔ تم بھی تو الزام ہے۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے تمہاری مرجوح ہے اُس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے۔ تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجح ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے ذوق میں دوسری راجح ہے اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اسلم و ارجح ہے۔ پھر تمہارا اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسی کو میں دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل ببعض الاحادیث۔ اگر کہو کہ عمل بکل الاحادیث مراد ہے سو یہ تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ آثار مختلفہ اور احادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہو سکتا۔ یقیناً بعض پر عمل ہوگا اور بعض کا ترک ہوگا۔ اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنی سے ہم بھی عامل بالحدیث ہیں، تو پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کدھر سے کہتے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں۔ زیادہ مسائل اجتہادیہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتویٰ دیتے اور اُن پر عمل کرتے ہیں یا اور کسی امام کے قول کو لیتے ہیں۔ تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام نہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے۔ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ ہی پر عمل کرتا اور فتویٰ دیتا ہے تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات و عقود و شفعہ و رہن وغیرہ کے چند سوالات ہم اُن سے کریں اور اُن کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ صحیحہ سے دیں۔ قیامت آجائے گی اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے۔ اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب

دیں گے تو یہ تو تقلید ہوئی۔ یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان مسائل کا کوئی حکم نہیں یہ الیوم اکملت لکم دینکم کے خلاف ہوگا۔ اور یہیں سے قیاس و استنباط کا جواز بھی معلوم ہوگیا۔ کیونکہ جب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کو کامل کر دیا گیا تو چاہیئے کہ کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں۔ تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ قیاس و استنباط کی اجازت ہو کہ ان ہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کر کے ان کا حکم معلوم کریں۔

(ارضاء الحق صـ ٣٢)

اندازہ فرمائیں مختصر سے الفاظ میں امت کے حکیم نے قیاس و استنباط، تقلید اور فلاں دن یہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ مومن یہ سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا۔ اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے ہیں۔ اس وقت حق تعالےٰ شانہٗ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی اور یہاں بھی کرتے ہیں۔ کچھ ٹھکانہ ہے اس رحمت کا کہ مسلمان کو دوسروں کے سامنے ذلیل بھی نہ فرمائیں گے۔

صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمربستہ ہو۔" (المراد صـ ٢٦-٢٧)

اس قسم کے سینکڑوں تفسیری نکات و لطائف حضرت والاؒ کے مواعظ میں بکھرے پڑے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ خواہش ہے کہ حضرت کے مواعظ اور ملفوظات میں سے اس قسم کے تفسیری نکات کو یکجا کروں۔ اور اُن کو الگ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

حضرتؒ والا نے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دین کے ہر شعبہ کی اصلاح فرمائی۔ عقائد، عبادات، معاشیات و اقتصادیات، معاشرت اور سیاسیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارہ میں حضرت تھانویؒ کی چھوٹی بڑی کتابوں میں اصلاحی ہدایات موجود نہ ہوں۔ عقل حیران رہ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تھانہ بھون کے ایک چھوٹے سے قصبے میں بسنے والا اُمّت کا حکیم نہ صرف پرانے مسائل پر قلم چلاتا ہے بلکہ جدید دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں حضرتؒ نے دینی نقطۂ نظر سے اُن کے بارہ میں بھی ایسی واضح ہدایات دیں جو اُن کے معاصرین کے ہاں نہیں ملتیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندو جو آئے دن مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے اور اسلام کے نام لیواؤں پر جو انہوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ حضرت تھانویؒ تھانہ بھون میں بیٹھ کر ان حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ کہنے والے تو کہتے

ہیں کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ نے پیش کیا لیکن تاریخی لحاظ سے یہ بات غلط ہے۔ تاریخ کے رپورٹروں کی صحیح شہادت یہ ہے کہ پاکستان کا تصور سب سے پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے پیش کیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں پاکستان کے تصور کو پیش کیا تھا لیکن خطبہ الٰہ آباد سے قریباً ۲½ سال پہلے تھانہ بھون کے اس درویش اور امت کے اس حکیم نے تصور پاکستان کو اسلامیان ہند و پاکستان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ چنانچہ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں اور تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جون ۱۹۲۸ء میں جب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا بادی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت تھانویؒ نے ان علماءؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

‘‘ دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین و اجزائے احکام شریعت کے مطابق ہوں۔ بیت المال ہو۔ نظام زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علی ہذا۔ دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کیلیے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہیئے۔

(سیرت اشرف باب ص۵)

حضرتؒ کے اس بیان کو ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں نے مجذوب کی بڑ سے زیادہ حیثیت نہ دی ہو لیکن جب ۲½ سال کے بعد ترجمان حقیقت علامہ اقبالؒ نے اس بات کو اپنے الفاظ میں پیش کیا تو حضرت تھانویؒ کی یہ بات پورے ہندوستان میں گونج اٹھی۔ پھر ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی نے اس مجوزہ اسلامی مملکت کا نام لندن میں ’’پاکستان‘‘ تجویز کیا۔ اور بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ایک قرارداد کے ذریعہ جس کو بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا، اس بات کو پورے ہندوستان میں اس قدر شہرت دی گئی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اللہ کے فضل و کرم اور عوام کی جدوجہد سے حضرت تھانویؒ کی یہ خواہش عملی شکل میں منصۂ شہود پر آگئی۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ پاکستان کی فکر اور اس کا نظریہ سب سے پہلے حکیم الامت تھانویؒ نے تھانہ بھون میں بیٹھ کر پیش کیا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مولانا تھانویؒ اپنی علمی جامعیت کے ساتھ تھانہ بھون کی خانقاہ میں بیٹھ کر نہ صرف نماز و روزہ اور معاشرت و معیشت کے مسائل سے عوام و خواص کو آگاہ کرتے رہے

بلکہ حضرتؒ نے مختلف اوقات میں جدید مسائل اور حادثاتی مسائل پر بھی نہ صرف عوام کی بلکہ علماء کی بھی راہ نمائی فرمائی۔ چنانچہ ہندوستان میں جب شاردا بل پیش ہوا تو حکیم الامت تھانویؒ نے اس کی تردید میں ایک رسالہ بعنوان ضم شارد الابل فی حکم شاردا بل لکھا جو بوادر النوادر میں مرقوم ہے۔ علاوہ ازیں الحیلۃ الناجزہ لکھ کر عورتوں کے اُن مسائل کا حل بتایا جو اس جدید دور کے نشیب و فراز سے عورتوں کو درپیش تھے۔ بلادِ یورپ میں نام نہاد عیسائی اور حقیقت میں لامذہب عورتوں سے نکاح کے ناجائز ہونے کے بارہ میں دلائل دیے۔ مرد و زن کی مساوات پر قرآن و سنت اور دلائل عقلیہ سے نہ صرف اپنی کتابوں میں بلکہ مواعظ و ملفوظات میں بھی اچھی خاصی بحث کی۔ بے پردگی کے خلاف بھی علم جہاد بلند کیا۔ غرضیکہ موجودہ زمانہ کا سیاسی و غیر سیاسی کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی حضرت تھانویؒ نے اپنے قلم و زبان سے وضاحت نہ فرمائی ہو اور متشککین کے دلوں سے شکوک کے کانٹے نہ نکالے ہوں۔

موجودہ زمانے میں جمہوریت کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ایک مسئلہ ہے اور ہر شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم جمہوریت کا راگ الاپ رہا ہے۔ بلکہ بڑے بڑے حاملان علم دین آج کل جمہوریت کو عین اسلام ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں۔ یہاں تک جو لوگ اوائل میں جمہوریت کو کفر کی ایک فرع سمجھتے تھے اُنھوں نے بھی جمہوریت کی راگنی الاپنا شروع کر دی۔ قیام پاکستان سے قبل مولانا مودودی نے کھل کر جمہوریت کی مخالفت کی۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں۔

"ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک اور ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس کے نظریہ کا قائل نہیں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں۔ اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر ان کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے، بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اُن کا خدائی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ مغضوب علیہم کے حکم میں آتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں

ہے کہ ہندوستان کے جس حصے میں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس پاکستان میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ پاکستان ہوگا۔ ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی ناپاکستان ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے ماتحت غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا۔ کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کی بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے اور یہ مسلم نیشنلزم بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا ہندوستانی نیشلزم۔

(سیاسی کشمکش حصہ ۳ ص ۱۲۵)

جو عام انتخابات اس جمہوریت کے قیام کے لیے کرائے جاتے ہیں اور اُن کے ذریعہ ایک آدمی قانون ساز اسمبلی کا رکن بن جاتا ہے اس کے بارہ میں مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

”جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اصولوں پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے، کیوں کہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کریں۔“

(رسائل و مسائل جلد ۱ ص ۳۴۴)

جمہوریت کے بارہ میں یہ مودودی صاحب کی رائے تھی۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ ؎

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ایک اور مقام پہ فرمایا ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

جمہوریت مغرب کی ایجاد ہے۔ مغرب کے پاس حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انہوں نے نظریہ

جمہوریت کو ایجاد کیا اور ہم مسلمانوں نے جس طرح مغرب کی ہر شئی پر اسلام کا لیبل لگانا شروع کر دیا اسی طرح اسلام میں جمہوریت کو بھی ثابت کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ہم میں سے بعض کا مغرب سے آئے ہوئے کسی عہدہ یا عمل کو اپنا لینا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ عقیدہ یا عمل اسلامی ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب اسلام کی بصیرت مفقود ہوتی جا رہی ہے اور مغرب کی تقلید کا رحجان زوروں پر ہے۔ دراصل اسلام مغرب کی ایجاد کی ہوئی اکاون فیصد والی غیر فطری جمہوریت کا قائل نہیں۔ اسلام میں جمہوریت کا مطلب فقط اتنا ہی ہے کہ مشہور و معروف دینداری اور تقویٰ کے ثقہ اور معتبر لوگ جس شخص کو خلیفہ تسلیم کر لیں اُسے سب تسلیم کر لیں۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت ملک میں ہر وقت موجود رہے گی اور ایسے لوگ اپنے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے خود بخود لوگوں کے راہ نماؤں کے مقام پر ہوں گے خلیفہ کے لیے ضروری ہے کہ مسند خلافت پر فائز ہونے کے بعد ایسے لوگوں کے مشورہ سے کام کرے۔ لیکن اگر وہ ان کی اکثریت کی رائے سے مطمئن نہ ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ اُس کو اختیار ہے کہ چاہے تو کسی کی رائے نہ ملے اور اپنی رائے کے مطابق کام کرے۔ اور چاہے تو اقلیت کی رائے کے ساتھ اتفاق کر کے قدم اُٹھائے۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ خلیفہ کی جو رائے بھی ہو سب اُس کی اطاعت کریں اور اُس کا حکم بجا لائیں۔ حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے ایک وعظ میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور قرآن سنت اور عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں شخصی حکومت ہے جمہوری حکومت کا کوئی وجود اسلام میں نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔۔

” غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے۔ اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی حکومت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اُس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اُس کی رائے غلط ہو۔ اس لیے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے، اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے۔ بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے

جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا، موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اُس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشیین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوتی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوتی تو عمل کس پر ہوگا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے۔ اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس لیے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے، خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔ مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی نے سید احمد خان ——— سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلا کم ہیں اور بیوقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرت رائے کا فیصلہ بے وقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خان نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاً کی قلت اور بے وقوفوں کی کثرت ہے، یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیف ما اتفق جمع کر لیا جاوے تو ان میں واقعی بے وقوف زیادہ ہوں گے۔ لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف ما اتفق جمع نہیں کیے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاً ہی ہوتے ہیں۔ تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاً کی کثرت ہوگی

مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا لیکن عقلاً میں بھی قانون فطرۃ یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں۔ تو عقلاً میں بھی کثرت انہیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں۔ پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم

عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہوگا۔ سید احمد خان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہوگئے غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں۔ جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی۔ تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اُس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں۔ اور وہ نااہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم اُن سے گفتگو نہیں کرتے۔ اُن کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اُس کو شخصی حکومت کا بادشاہ بنایا جائے اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد اور اے جماعت عقلاء! بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اُس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو اور جس کی رائے میں اتنی درایت نہ ہو اُس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ — جس کی رائے اتنی رزین ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ شخص حکومت کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔ بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو رزین العقل اور صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لیے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صائب العقل رزین سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں وشاورھم فِی الْاَمْرِ۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو رفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ

کا جو درجہ ہے اُس کو بالکل نہیں سمجھا۔"

حضرت تھانویؒ نے سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا کی مثال مشورہ کے بارہ میں پیش کی ہے کہ اُن خاوند مغیث "مدینہ طیبہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اُن پر رحم آیا تو آپ نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ اے بریرہؓ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ بریرہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ آپؐ نے فرمایا مشورہ۔ حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کر دیا کہ یہ مشورہ میں قبول نہیں کرتی۔ یہ مثال بیان کرنے کے بعد حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں۔

"اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے۔ اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے۔ چنانچہ حضرت بریرہؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضورؐ اُن سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے۔ نہ حضرت بریرہؓ کو کچھ گناہ ہوا۔ نہ اُن پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب اُمت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اُسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ اُن کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں۔ اور اگر کثرتِ رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے ... اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں۔ یہاں اِذَا عَزَمْتَ صیغۂ واحد سے معلوم ہوا کہ عزم میں حضورؐ مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت پر ہوتا تو اِذَا عَزَمْتَ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اِذَا عَزَمَ اَکْثَرُکُمْ فَتَوَکَّلُوْا عَلَی اللّٰہِ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود اُن کے دعوے کی تردید کر رہا ہے ... مگر یہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے

آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں۔ اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حتکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لیے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدون مشورہ لیے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔

(وعظ تقلیل الاختلاط مع الانام ص۴۹)

حضرت تھانویؒ نے اپنے اور بھی کئی مواعظ میں اس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے، ملاحظہ ہو۔ ذم النیان ص۱۲ اور فضائل العلم والخشیت وغیرہ وغیرہ۔

بات طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن حضرت تھانویؒ کی شخصیت بھی علمی طور پر نہ صرف طویل و عریض ہے بلکہ عمیق بھی ہے۔ لہٰذا مختصر الفاظ میں حضرت والاؒ کے اصلاحی کارناموں پر بات نہیں کی جا سکتی۔ پھر انسانی زندگی بھی بے شمار شعبوں کے گرد گھومتی ہے اور حضرت والاؒ نے ہر شعبۂ زندگی کی اصلاح فرمائی ہے۔ جتنے مجددین اسلام اور مصلحین امت اس دنیا میں تشریف لائے انہوں نے ہر شعبۂ زندگی کے بارہ میں تجدید و اصلاح نہیں کی۔ یہ حضرت تھانویؒ ہی کا کارنامہ ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارہ میں حضرت والاؒ کی کتابوں، مواعظ اور ملفوظات میں اصلاحی ہدایات نہ ملتی ہوں۔ لیکن حضرت والاؒ نے سب سے زیادہ زور حسن معاشرت پر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت والاؒ نے فرمایا تھا۔

’’مجدد ملت تو خیر مجدد معاشرت تو ضرور ہوں‘‘ (اشرف السوانح جلد ۳ ص۱۷)

معاشرت کو تو لوگ دین ہی تصور نہیں کرتے، لہٰذا اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی توجہ تو تب ہوتی جب اس کو دین کا جزو تصور کیا جاتا۔ حالانکہ معاشرت کا تمام اجزائے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل الوجوہ مقدم اور مہتم بالشان ہونا ثابت ہے۔ لیکن لوگوں کے نزدیک ولایت و دینداری

کا اونچا سے اونچا معیار یہی سمجھ میں آ رہا کہ" ہاتھ میں تسبیح لے لی، ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور گھٹنوں سے نیچا کرتا پہن لیا۔ اشراق، چاشت اور تہجد کی نفلیں پڑھ لیں۔ بس ہو گئے کامل (ولی)"

(الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ ۲۴)

باقی معاملات بلکہ ان سے بھی بڑھ کر

"معاشرت کو تو لوگوں نے دین کی فہرست ہی سے نکال دیا ہے۔ سمجھتے ہیں نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، ذکر و شغل، تلاوت قرآن، نفلیں بس ان چند چیزوں کے متعلق احکام ہیں۔ آگے جو چاہیں کرتے پھریں جس کے معنی آج کل آزادی کے ہیں۔ سو خوب سمجھ لو کہ تم ہرگز ہرگز آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے۔ مثل بھینسے اور سانڈ کے کہ جس کے گیہوں چاہیں کھالیں، جس کے چنے چاہیں کھالیں، سو ہم کو ایسا نہیں چھوڑا گیا، بلکہ شریعت نے ہماری رفتار و گفتار، نشست و برخاست، لین دین اور کھانے پینے ہر چیز سے تعرض کیا ہے۔ شریعت مکمل قانون ہے۔"

(الافاضات الیومیہ جلد ۴ صـ ۲۰۳)

ایک اور جگہ پر حضرت والاؒ نے فرمایا:۔

"معاملات اور معاشرت کو علی العموم لوگوں نے دین سے خارج سمجھ رکھا ہے، لیکن تعجب ہے کہ قانونِ خداوندی سے تو آپ نے معاملات و معاشرت کو مستثنیٰ سمجھ لیا اور گورنمنٹ کے قانون سے مستثنیٰ نہ سمجھا۔ کبھی کسی نے گورنمنٹ سے نہ کہا ہوگا کہ تجارت وغیرہ میں آپ کو کیا دخل ہے۔ آپ صرف امور انتظام سلطنت میں ہم سے باز پرس کیجئے۔ باقی یہ تو ہمارے ذاتی معاملات ہیں"

اپنے رسالہ آداب المعاشرت جس میں معاشرت کی اصلاح کی طرف حضرت والاؒ نے خصوصی توجہ کرنے کے لیے تاکیداً لکھا ہے، اس کی تمہید میں حضرتؒ نے تحریر فرمایا:۔

"دیگر اجزائے دین کی کم و بیش خاص یا عام طور پر یعنی وعظ میں کچھ تعلیم و تلقین بھی ہوتی ہے۔ لیکن معاشرت کے جز کا زبان پہ نام تک نہیں آتا۔ اس لیے علماً و عملاً یہ جز بالکل نسیاً منسیاً ہو چلا ہے۔ اور میرے نزدیک باہمی الفت و اتفاق میں (جس کی شریعت نے سخت تاکید کی ہے اور اس وقت عقلاً بھی اس کی چیخ و پکار کر رہے ہیں) جو کمی ہے اس کا بڑا سبب سوء معاشرت ہے کیونکہ اس سے باہم انبساط و انشراح نہیں رہتا جس پہ باہمی الفت کا بڑا ادار و مدار ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی میں حسن معاشرت کی بڑی تاکید آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کے ساتھ خفیف سی بدتمیزی بلکہ بے تمیزی کی بھی اجازت نہیں دی۔ بلکہ یہاں تک کہ خام لہسن اور پیاز کھانے والے کو مساجد اور اُن جگہوں سے جہاں لوگوں کا ہجوم ہو جانے سے منع فرمایا تاکہ اُس کے منہ کی بدبو سے دوسروں کو اذیت نہ ہو۔ اسی وجہ سے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو شخص کھانے یا درس یا درود وظائف میں مشغول ہو اس کو سلام نہ کیا جائے، حالانکہ حدیث میں سلام کی بڑی تاکید آئی ہے۔ سلام نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص کسی ضروری کام میں مشغول ہو بلاضرورت اُس کے قلب کو پراگندہ اور منتشر کرنا شرعاً ناپسند ہے۔ اسی طرح مسجد میں نماز پڑھنے کی کتنی تاکید ہے اور زبان رسالت نے اس پر کتنے بڑے اجر کا وعدہ فرمایا، لیکن جس شخص کو گندہ ذہنی کا مرض لاحق ہو اُس کو مسجد میں نہ آنے دینا بھی فقہائے اسلام نے نقل کیا ہے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں معاشرت کی کس قدر تاکید کی گئی ہے۔

حضرت تھانویؒ کے نزدیک معاشرت صرف شریعت کا ایک جزو ہی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے یہ نماز روزہ سے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:۔

"بعض وجوہ سے (امور معاشرت) ان عبادات سے بھی زیادہ ضروری ہیں، اس لیے کہ عبادات میں اگر کوتاہی ہو تو یہ خود اپنا نقصان ہے، بخلاف امور معاشرت میں کوتاہی سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے"

ایک اور موقع پر حضرت والاؒ نے اس مضمون کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

"معاملات سے زیادہ معاشرت کا اہتمام ضروری ہے۔ کیونکہ معاملات کی اصلاح میں تو زیادہ تر لوگوں کے مال کی حفاظت ہے اور حسن معاشرت میں مسلمانوں کے قلب کی حفاظت ہے۔ اور ظاہر ہے مال سے دل کا رتبہ بڑھا ہوا ہے۔ نیز معاشرت کی اصلاح میں علاوہ قلوب کے لوگوں کی آبرو کی بھی حفاظت ہے اور آبرو کی حفاظت بعد ایمان کے ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ آبرو بچانے کے لیے آدمی ہر چیز کو قربان کر دیتا ہے۔ اور حدیث حقوق میں بھی تینوں مامور بہ ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:۔ تمہارے خون، تمہارے اموال، تمہاری عزتیں باہم ایک دوسرے پر قیامت تک حرام ہیں۔"
(دعوات عبدیت جلد ۲ ص ۵۹)

حاملین تجدید و اصلاح کے بارہ میں امت کے حکیم حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:۔

سنت تجدید میں یہ بھی داخل ہے کہ معاشرت کی بھی اصلاح کی جائے۔ بعض مجددین ایسے گذرے ہیں جنہوں نے صرف شرائع کی اصلاح کی اور بعض نے صرف معاشرت کی اور بعض نے دونوں کی :۔ (الافاضات الیومیہ جلد ۷ صـ۱۰۵)

حضرت تھانویؒ بھی اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے شرائع اور معاشرت دونوں کی اصلاح کی حضرتؒ نے جس زمانہ میں اصلاح فرمائی وہ زمانہ گذشتہ تمام مجددین اور مصلحین کے زمانوں سے زیادہ مادی زیادہ خود غرض اور زیادہ لادین معاشرے والا زمانہ تھا۔ صنعتی انقلاب نے لوگوں کو درندہ صفت بنا دیا تھا جو اپنے ہم جنسوں اور اپنے سے کمزور انسانوں کو خود غرضی اور حرص و آز کے تیز دانتوں سے کاٹ رہے تھے۔ انسانی بستیاں درندوں کی بستیاں بن چکی تھیں۔ انسانوں میں باہمی انسیت کا مادہ ختم ہو چکا تھا اور انسان احسن التقویم کے بام عروج سے اسفل السافلین کے قعر ذلت میں گر چکا تھا۔ اس پر آشوب زمانہ میں معاشرت کی اصلاح کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس خود غرضی کے معاشرہ میں اصلاح کا بیڑا اُٹھانا میرے خیال میں اصلاح و تجدید کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ کیونکہ حُسنِ معاشرت نام ہے اس بات کا کہ اپنے سے دوسروں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچے۔ جب کہ موجودہ معاشرہ کے ہر فرد کا یہ مطمح نظر ہے کہ دوسرے کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا :۔

" آج کل معاشرت تو اس درجہ خراب ہوگئی ہے کہ قطعاً اس کی پرواہ نہیں کی جاتی کہ ہماری اس بات یا کام سے دوسروں کو تکلیف ہوگی یا اُن کی پریشانی کا سبب ہوگا۔ حالانکہ حقوق العباد کا ادا کرنا اور ورد و وظائف سے بدرجہا ضروری ہے۔ اس کے ترک سے مؤاخذہ ہوگا اور ترک وظائف سے کچھ مؤاخذہ نہیں۔ یہ تو مستحب ہے۔ لوگ ضروری کام کو چھوڑ کر غیر ضروری کو اختیار کرتے ہیں۔"

(دعوات عبدیت جلد ۲ صـ۴۷)

اپنے رسالہ آداب المعاشرت میں مجدد تھانویؒ نے فرمایا :۔

" اور گو شعائر ہونے کی حیثیت سے باب معاشرت عقائد اور فرض عبادات سے مؤخر ہے۔ لیکن اس اعتبار سے کہ عقائد و عبادات کے خلل سے اپنا ہی ضرر ہے اور معاشرت کے خلل سے دوسروں کا اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اشد ہے اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے اس لحاظ سے اس کو ان دونوں پر تقدم حاصل ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ اللہ تعالیٰ سورہ فرقان میں فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ

عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کہ حسن معاشرت پر دال ہے۔ مقدم فرمایا صلوٰۃ و خشیت و اعتدال فی الانفاق اور توحید کے ذکر پر۔ حالانکہ ان چیزوں کا تعلق طاعات مفروضہ و عقائد سے ہے۔ اور تقدم علی الفرائض تو محض بعض وجوہ سے ہے۔ ورنہ نفل عبادات پر تو حسن معاشرت بہمہ وجوہ مقدم ہے۔"

"چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو دو عورتوں کا ذکر کیا گیا۔ ایک تو نماز روزہ کثرت سے کرتی تھی (یعنی نوافل وغیرہ پڑھتی تھی کیونکہ کثرت اسی میں ہو سکتی ہے) مگر اپنے ہمسایوں کو ایذا پہنچاتی تھی۔ اور دوسری زیادہ نماز روزہ نہ کرتی تھی۔ مگر ہمسایوں کو ایذا نہ دیتی تھی۔ آپ نے پہلی کو دوزخی اور دوسری کو جنتی فرمایا۔"

حضرتؒ نے اس بارہ میں مزید فرمایا:۔

"اور معاملات پر گو معاشرت اس حیثیت سے مقدم نہیں کہ معاملات کے خلل سے دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے۔ مگر ایک دوسری حیثیت سے معاملات سے بھی اہم ہے وہ یہ کہ عوام نہ سہی مگر خواص معاملات کو داخل دین سمجھتے ہیں اور معاشرت کو بجز اخص الخواص کے بہت سے خواص بھی داخل دین نہیں سمجھتے۔ اور بعض جو سمجھتے بھی ہیں وہ معاملات کے برابر اس کو مہتمم بالشان نہیں مانتے۔ اور اس وجہ سے عملاً اس کی پروا کم کرتے ہیں۔ رہی اخلاق باطن کی اصلاح تو وہ عبادات مفروضہ کے حکم میں ہے۔ اس لیے عبادات پر معاشرت کے تقدم کی جو حیثیت اوپر مذکور ہو چکی ہے وہی باطنی اصلاح پر بھی اسکے تقدم کی ہے۔"

"غرض معاشرت کا تمام اجزائے دین سے کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل الوجوہ مقدم و مہتم بالشان ہونا ثابت ہے۔ مگر اس کے باوجود عوام کا تو بکثرت اور خواص میں بھی بعض کا تو اس کی طرف خود عملاً بھی کم التفات ہے۔ اور اگر کسی نے خود عمل بھی کر لیا تو دوسروں کو خواہ وہ اجنبی ہوں یا اپنے متعلقین ان کو روک ٹوک یا تعلیم و اصلاح کرنا مفقود ہی ہے۔"

حسن معاشرت کے بارہ میں حضرت تھانویؒ ہی نے یہ تاکید نہیں فرمائی بلکہ قرآن و حدیث جو دین کی اصل بنیاد ہیں ان میں بھی یہ تاکید حق تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ ہی نے فرمایا:۔

"حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کر دیا

کرو، اور جب تم سے کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جایا کرو"۔ اور ارشاد ہے کہ دوسرے کے گھر ہیں (گو وہ مردانہ ہو مگر خاص خلوت گاہ ہو) بے اجازت مت جایا کرو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساتھ کھاتے وقت دو چھوہارے ایک دم ساتھیوں کی اجازت کے بغیر نہ لینا چاہیئے۔ دیکھئے ایک خفیف بے تمیزی سے محض اس لیے ممانعت فرمائی کہ دوسروں کو ناگوار ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ جو شخص (خام) لہسن یا پیاز کھائے تو ہم سے (یعنی مجمع سے) علیحدہ رہے۔ دیکھئے اس خفیف سے سبب اذیت سے بھی منع فرمایا۔ اور فرمایا کہ مہمان کو حلال نہیں کہ میزبان کے پاس اس قدر قیام کرے کہ وہ تنگ ہو جائے۔ اس سے ایسے امر سے سخت ممانعت ہے جس سے دوسرے کو تنگی ہو۔ اور ارشاد ہے کہ ساتھ کھاتے وقت گو پیٹ بھر جائے مگر جب تک ساتھ والے فارغ نہ ہو جائیں۔ ہاتھ نہ کھینچے، کیونکہ اس سے دوسرا بھی شرما کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور شاید اس کو ابھی کھانے کی حاجت ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایسا کام بھی نہ کرے جس سے دوسرا شرمندہ ہو۔"

"ایک بار حضرت جابرؓ در دولت پر حاضر ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپؐ نے پوچھا کون؟ انہوں نے عرض کیا میں ہوں۔ آپ نے ناگواری سے فرمایا۔ میں ہوں۔ میں ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بات صاف کہے جس کو دوسرا سمجھ سکے۔ گول بات کہنا جس کے سمجھنے میں تکلیف ہو دوسرے کو الجھن میں ڈالنا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا۔ مگر صحابہؓ آپ کو دیکھ کر اس لیے کھڑے نہ ہوتے تھے کہ آپ کو ناگوار ہوتا۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاص ادب تعظیم یا خدمت کسی کے مزاج کے خلاف ہو تو گو اپنی خواہش ہو، مگر دوسرے کی خواہش کو مقدم رکھے۔ اور فرمایا کہ دو شخصوں کے درمیان (جو قصداً پاس پاس بیٹھے ہوں) جا کر بلا اجازت بیٹھنا حلال نہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کوئی ایسی بات نہ کرے۔ جس سے دوسروں کو کدورت ہو۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو جو شخص جہاں پہنچ جاتا وہیں بیٹھ جاتا یعنی لوگوں کو چیر پھاڑ کر آگے نہ بڑھتا۔ اس سے بھی اہل مجلس کا کتنا ادب ثابت ہے کہ ان کو اتنی ایذا بھی نہ پہنچائے۔ مروی ہے کہ عیادت میں مریض کے پاس زیادہ نہ بیٹھے۔ اس میں بھی کس قدر دقیق رعایت ہے کہ کسی کی ادنیٰ گرانی کا بھی سبب نہ بنے، کیونکہ بعض اوقات مریض کو کسی کے سامنے کروٹ بدلنے، ہاتھ پاؤں

پھیلانے یا بات چیت کرنے میں ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ جس کے بیٹھنے سے اس کو راحت ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ شب برات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے آہستہ اُٹھے اور اس خیال سے کہ وہ سوتی ہوں گی بے چین نہ ہوں۔ آہستہ نعل مبارک پہنے اور آہستہ کواڑ کھولے اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے۔ اور آہستہ کواڑ بند کیے۔ اس میں سونے والے کی کتنی رعایت ہے۔ کہ ایسی آواز یا کھڑ کا بھی نہ ہو جس سے وہ دفعتاً جاگ اُٹھے اور پریشان ہو۔ حضرت مقدادؓ سے ایک طویل قصہ میں مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان تھے۔ بعد عشاء آکر لیٹ رہتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دیر میں تشریف لاتے تو (چونکہ مہمانوں کے سونے جاگنے دونوں کا احتمال ہوتا۔ اس لیے) سلام تو کرتے کہ شاید جاگتے ہوں، مگر ایسا کرتے کہ جاگتے ہوں تو سن لیں اور سوتے ہوں تو آنکھ نہ کھلے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان آداب معاشرت کی زبانی اور عملی طور پر تاکید ہی فرمائی بلکہ جب کبھی دیکھا کہ کسی نے آداب معاشرت کی بجا آوری میں کوتاہی کی ہے تو اس کو مجبور کیا کہ وہ معاشرت کے آداب کو صحیح طریقے سے بجا لائے۔ اس بات کو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے قلم ہی سے سنیئے۔ فرمایا:۔

"اور شارع علیہ السلام نے صرف اپنے قول و فعل ہی سے اس کے اہتمام پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ بے پروائی کے موقع پر ان آداب پر مجبور فرمایا۔ چنانچہ ایک صحابی کچھ ہدیہ لے کر آپ کی خدمت میں بلا سلام اور بلا اجازت داخل ہو گئے۔ آپ نے فرمایا باہر واپس جاؤ۔ اور السلام علیکم، کیا میں حاضر ہو جاؤں کہہ کر پھر آؤ۔"

"غرض شریعت نے اس کا نہایت درجہ خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت دوسرے کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف و اذیت یا ثقل و گرانی یا ضیق و تنگی یا تکدر و انقباض یا کراہت و ناگواری یا تشویش و پریشانی یا توحش خلجان کا سبب نہ ہو۔"

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ آداب المعاشرت میں معاشرت کی اُن باتوں کو بھی درج فرمایا جن کی عوام تو کیا خواص بھی پروا نہیں کرتے۔ جی چاہتا ہے کہ ان میں سے بعض کو ذکر کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام کو پتہ چل جائے کہ آداب المعاشرت دراصل ہیں کیا۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اُن آداب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

۱۔ "کسی کا خط مت دیکھو نہ حاضرانہ جیسے بعض آدمی لکھنے میں دیکھتے ہیں۔ اور نہ غائبانہ۔ اسی طرح کسی کے سامنے رکھے ہوئے کاغذات اُٹھا کر مت دیکھو، شاید وہ شخص کسی کاغذ کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہو۔"

۲۔ "جو شخص کھانے کے لیے جا رہا ہو یا بلایا گیا ہو اُس کے ساتھ مت جاؤ، کیونکہ صاحب خانہ شرما کر کھانے کی تواضع کرتا ہے۔ اور دل اندر سے چاہتا نہیں۔ اور بعضے جلدی قبول کر لیتے ہیں تو صاحب خانہ کی بلا رضامندی کھایا۔ اور قبول نہ کیا تو اس کی سبکی ہے۔ پھر صاحب خانہ کا اوّل وہلہ میں تردد یہ بھی مستقل ایذا ہے۔"

۳۔ "بعضے آدمی مجلس میں پہنچ کر سب سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اگرچہ سب سے تعارف نہ ہو۔ جس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ اور فراغ تک تمام مجلس مشغول و پریشان رہتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ جس کے پاس قصد کر کے آئے ہو اس سے مصافحہ پر قناعت کرو۔ البتہ اگر دوسروں سے بھی تعارف ہو تو مضائقہ نہیں۔

۴۔ "جب اپنے بڑے کے ساتھ ہو، بدوں اس کی اجازت کے مستقل کوئی کام نہ کرنا چاہیئے۔"

۵۔ "استنجا عام گزرگاہ سے ہٹ کر اور حتی الامکان لوگوں کی نظر سے چھپ کر سکھانا چاہیئے۔ جس قدر بھی دوری ممکن ہو۔

۶۔ "آج کل کی سفارش میں جبر و اکراہ ہے کہ اثر سے دوسروں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ جو شرعاً جائز نہیں۔ اگر سفارش کرو تو اس طرح کہ مخاطب کی آزادی میں ذرہ برابر خلل نہ پڑے وہ جائز بلکہ ثواب ہے۔"

۷۔ "کام کرنے والے کے پاس بیکار آدمی کا بلا ضرورت بیٹھنا اس کے قلب کو مشغول و مشوش کرنا ہے۔ خاص کر جب اُس کو تکتا بھی رہے۔ اس کا بہت لحاظ رہے۔"

۸۔ "متکلم گفتگو میں جس دلیل پر رد یا دعویٰ کے خلاف ثابت کر چکا ہو، تم کو ان مقدمات پر کلام کرنے میں تو مضائقہ نہیں مگر بعینہٖ اس دعویٰ یا دلیل کا اعادہ کرنا مخاطب کو ایذا پہنچانا ہے۔ اس کا بہت خیال رکھو۔"

۹۔ "جس شخص کی نسبت تم کو قرائن سے یقین یا گمان ہو کہ تمہارے کہنے کو ہرگز نہیں ٹالے گا۔ اس سے کسی ایسی بات کی فرمائش مت کرو جو شرعاً واجب نہیں۔"

۱۰۔ "اگر بلا فرمائش کوئی مالی یا بدنی خدمت کرے تب بھی لحاظ رکھو کہ اُس کی راحت یا مصلحت میں

خلل نہ پڑے یعنی اُس کو زیادہ جاگنے مت دو۔ اُس کی گنجائش سے زیادہ ہدیہ مت لو۔ اگر تمہاری دعوت کرے بہت سے کھانے مت پکانے دو۔ ہمراہی میں بہت سے آدمیوں کی دعوت مت کرنے دو۔"

۱۱۔ "اگر کسی شخص پر قصداً ناخوش ہونا پڑے یا اتفاقاً ایسا ہو جائے تو دوسرے وقت اس کا دل خوش کر دو۔ اگر تم سے واقعی زیادتی ہو گئی ہو تو بے تکلف اُس سے معذرت کر کے معافی مانگ لو۔ عار مت کرو۔ قیامت میں تم وہ برابر ہو گے۔ کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو گا۔"

۱۲ "اپنے کسی خادم یا متعلق کو اتنا مقرب مت بناؤ کہ دوسرے اس سے دبنے لگیں یا وہ دبانے لگے اسی طرح اگر وہ لوگوں کی روایات و حکایات تم سے کہنے لگے تو منع کر دو۔ ورنہ لوگ اس سے خائف ہو جائیں گے۔ اور تم لوگوں سے بدگمان ہو جاؤ گے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کا پیام یا سفارش تمہارے پاس لاتے تو سختی سے منع کر دو تاکہ لوگ اس کو واسطہ سمجھ کر اس کی خوشامد نہ کرنے لگیں۔ اس کو نذرانے نہ دینے لگیں یا وہ لوگوں سے فرمائش نہ کرنے لگے۔"

۱۳۔ "تمام لوگوں کا تعلق براہِ راست اپنے سے رکھو۔ کسی شخص کو واسطہ مت بناؤ۔ ہاں محض اپنی خدمت کے لیے ایک آدھ شخص کو خاص کر لو۔ مضائقہ نہیں، مگر اس کو لوگوں کے معاملات میں ذرہ برابر دخل نہ دینے دو۔"

۱۴۔ "اسی طرح مہمانوں کا قصہ کسی پر مت چھوڑو۔ خود سب کی دیکھ بھال کرو۔ گو اس میں تم کو تعب زیادہ ہو گا۔ مگر دوسروں کو راحت و سہولت رہے گی اور بڑے تو تعب کے لیے ہوا ہی کرتے ہیں۔"

غور فرمائیے کہ اسلام کے یہ آداب معاشرت اگر انسان اپنی زندگی میں اپنائے تو نہ تو کسی دوسرے انسان کو کوئی ایذا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اذیت۔ پورا معاشرہ انسانوں کا نہیں بلکہ فرشتوں کا معاشرہ ہو جائیگا۔

حضرت والاؒ نے ان آداب معاشرت کو نہ صرف تحریر فرمایا بلکہ خود بھی اپنایا اور اپنے متعلقین سے بھی ان پر سختی سے عمل کروایا۔ چنانچہ حضرت والاؒ نے عام ہدایت کی ہوئی تھی کہ "خط لکھنے والے ایک خط میں ایک سے زائد سوال نہ کیا کریں۔" سفارش میں بہت احتیاط فرماتے تھے۔ اگر کبھی سفارش کرتے تو دوسرے کی آزادی کو سلب نہ فرماتے۔ تاکید کر رکھی تھی کہ جو شئی جہاں سے اُٹھاؤ استعمال کرنے کے بعد وہیں رکھو۔ تاکہ پھر تلاش کرنے کی اذیت نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی برتن میں کوئی چیز لاتا تو وہ برتن اُس کو فوراً واپس فرما دیتے۔ حضرتؒ کے ملفوظات میں ایک واقعہ مرقوم ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرتؒ کس قدر محتاط تھے۔ آپ بھی اس واقعہ کو سنیئے!

"کسی شخص نے کچھ پکی ہوئی چیزیں ہدیہ بھیجیں۔ خادم سے فرمایا کہ دیکھو ان چیزوں کو بڑے گھر پہنچا دو اور کہنا کہ بچی ہوئی نہیں ہیں۔ اور جن برتنوں میں یہ ہیں لانے والے کے سامنے گن کر اور دکھلا کر لے جانا اور واپس لا کر پھر گنوا دینا تاکہ گڑبڑ نہ ہو۔ پھر فرمایا "گن لیا"۔ عرض کیا "جی ہاں گن لیا چار برتن ہیں"۔ فرمایا ایسی چیزوں میں ضرور مداخلت کرتا ہوں اس لیے کہ لوگوں میں احتیاط نہیں۔ ہر شخص پر اعتماد نہیں کرتا۔ اسی سلسلہ میں ایک مولوی صاحب نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فاتح فارس کا یہ واقعہ عرض کیا کہ جب غلام کو چیزیں کھانے پکانے کے لیے دیتے تو وزن فرما کر اور گوشت کی بوٹیاں گن کر دیتے تاکہ کسی مسلمان کی طرف سے بدگمانی کا موقع کیوں رہے۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ ہے فقر و تصوف ..... یہ ہیں اعمال باطنہ۔ کہاں تک ان حضرات کی نظر جاتی تھی۔ آخر صحبت کس کی تھی۔"

(الافاضات الیومیہ جلد ۱ صـ ٢٧٦)

حضرت تھانویؒ نے ان باتوں کو صرف تحریر تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ عملی زندگی میں ان کو اپنایا اور اپنے متعلقین کو بھی اس کی سخت تاکید کی، بلکہ بعض دفعہ تو ایسی باتوں پر ایسی روک ٹوک اور احتساب فرماتے کہ مزاج میں حدت اور شدت پیدا ہو جاتی۔ چنانچہ حضرت خود فرماتے ہیں :-

"احقر مدتوں سے اپنے متعلقین کو ایسے مواقع پر زبانی احتساب کرتا رہتا ہے۔ گو اس میں اتنی خطا ضرور ہے بعض اوقات مزاج میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ معاف کر کے اصلاح فرما دے۔ اور اکثر وعظ میں بھی ایسے امور کی تعلیم و تبلیغ کرتا ہوں"

حضرتؒ کے احتساب کی بھی عجیب بات تھی۔ شاید ہی کوئی تعلق والا ایسا ہو گا جس سے حضرتؒ نے احتساب نہ کیا ہو۔ مورخین نے لکھا ہے کہ درۂ عمرؓ سے بھی شاید کوئی ہی شخص بچا ہو اسی طرح مولانا تھانویؒ کے درۂ احتساب سے بھی شاید ہی کوئی بچا ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ متعلقین میں سے ایک نے کہہ ہی دیا کہ "حضرت! آپ بہت سخت ہیں"۔ فرمایا "بھئی میں سخت تو نہیں ہوں۔ اگر سخت ہوتا تو آپ لوگ مجھے چھوڑ کر بھاگ جاتے، کیونکہ حق تعالیٰ قرآن حکیم میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کے بارہ میں فرماتے ہیں "وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ط

(اے پیغمبر! آپ سخت دل ہوتے تو یہ صحابہؓ آپ کو چھوڑ کر بھاگ جاتے) میں سخت دل نہیں ہوں، ——— بات صرف یہ ہے کہ تم بے اصول ہو چکے ہو میں تمہیں اصول کی

بات بتایا ہوں اس وجہ سے تمہیں سخت معلوم ہوتا ہوں۔“

حقیقت بھی یہی تھی کہ آپ سخت نہیں تھے بلکہ بڑے شفیق، بڑے با مروت اور بڑے رحیم، لیکن حق تعالیٰ نے مرزا مظہر جانجاناںؒ کی طرح مزاج ایسا دیا تھا کہ بے اصولی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حضرتؒ نے ایک کتاب تعلیم الدین کے نام سے لکھی جس میں آداب معاشرت کے ساتھ ساتھ عقائد دیانات اور معاملات کی مشہور دفعات ذکر فرمائیں جو ایک عام انسان کی روزمرہ کی زندگی میں اُسے پیش آتی رہتی ہیں۔ میں تو بعض دفعہ حضرت تھانویؒ کی کتابیں پڑھ کر حیران اور متعجب ہوتا ہوں کہ یہ مسائل اور عام انسان کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات حضرت والاؒ کون بتاتا تھا؟ آج کل کا زمانہ پریس کا زمانہ ہے۔ ہر قسم کے واقعات اخبارات میں آتے رہتے ہیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی اخبارات تھے لیکن اتنی تعداد میں نہ تھے۔ پھر تھانہ بھون کی خانقاہ میں اخبارات کا کیا کام۔ علاوہ ازیں حضرتؒ کے پاس اخبار پڑھنے کا کون سا وقت تھا، کیونکہ حضرتؒ کے روزمرہ کے معمولات کا ایک ٹائم ٹیبل تھا جس میں کبھی ادل بدل نہیں ہوتا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت والاؒ نے اخبار بینی کے خلاف ایک رسالہ لکھا ہوا ہے جس میں کچھ شرائط کے ساتھ اخبار بینی کو جائز قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو بوادر النوادر ص ۶۹۴) آپ کا ایک رسالہ ”غلط مسئلے“ ہے۔ رسالہ کو پڑھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ ان غلط مسئلوں کا حضرت کو کیسے علم ہوا۔ بعض بعض غلط مسئلے اُس میں حضرتؒ نے ایسے بیان فرمائے ہیں جن کا علم اکثر لوگوں کو نہیں اور وہ واقعی غلط مشہور ہو گئے ہوئے ہیں۔

بات ہو رہی تھی حضرتؒ کی کتاب ”تعلیم الدین“ کی اُس میں حضرتؒ نے اسباب معاش، معاملات اور دیگر روزمرہ معمولات کے بارہ میں بڑے اچھے انداز سے بحث کی ہے جس کو پڑھ کر ایک انسان کی دینی معلومات میں اضافہ اور عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور انسان کی زندگی میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ آپ بھی اُس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں انشاء اللہ آپ بھی اپنے اندر ایک انقلاب محسوس کریں گے۔ حضرت تھانویؒ نے پیشوں کے بارہ میں فرمایا:۔

”سب سے بہتر دستکاری ہے۔ اس کو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمایا۔ رنڈیوں کی خرچی اور جھوٹے تعویذ گنڈے، فال کھلائی وغیرہ کا نذرانہ سب حرام ہے۔ آج کل کے پیرزادے دونوں بلاؤں میں مبتلا ہیں۔ رنڈیوں سے خوب نذرانے لیتے ہیں اور وہی تباہی تعویذ گنڈے کرتے۔ فال کھولتے

اور لوگوں کو خوب ٹھگتے ہیں۔ مانگنے کا پیشہ سب سے بدتر، ذلیل اور گناہ ہے۔ اس سے گھاس کھودنا، لکڑی کاٹ کر بیچنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ اگر کسی سخت مصیبت وہ جاری میں مانگنا ہی پڑے تو دیندار عالی ہمت سے مانگے کہ اس میں بھی ذلت کم ہے۔ اگر بلا حرص و طلب کہیں سے کچھ ملے اس کے لینے میں مضائقہ نہیں . . . .

"مفت خوری سے بہتر عالی ہمتی سے کمانا اور دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ البتہ جو لوگ ایسی خدمت دین میں مشغول ہیں کہ اگر معیشت میں لگیں تو وہ دینی کام برباد ہو تو ان کو ترک اسباب جائز بلکہ بعض اوقات اولیٰ ہے۔ . . . جس طریقے سے آدمی کی بسر ہو رہی ہے بلا ضرورت شدیدہ اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ نہ اختیار کرے۔ خرید و فروخت اور اپنے حق کے معاملہ میں نرمی برتے۔ تنگ گیری اچھی نہیں۔ سودا بیچنے میں زیادہ قسمیں نہ کھاؤ۔ ایک آدھ جھوٹ میں نکل جاتی ہے پھر برکت مٹ جاتی ہے۔

"تجارت بہت عمدہ چیز ہے۔ امانت اور راستی اس کا جزو اعظم ہے۔ اس سے دنیا میں اعتبار ہوتا اور آخرت میں انبیاؑ صدیقین اور شہداء کی ہمراہی نصیب ہوتی ہے۔ تجارت کے منافع سے کچھ خیر و خیرات کرتے رہا کرو۔ اس کی بدولت تجارت میں اگر بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں تو اس کے وبال میں کمی ہو جاتی ہے اگر تمہارے سودے یا دالوں میں کچھ عیب ہو اس کو صاف صاف کہہ دو۔ چھپانے سے برکت اڑ جاتی ہے۔"

یہ تو تفصیل تھی تجارت اور دوسرے اسباب معیشت کی۔ ان کے بیان کے بعد حضرتؒ نے اُن خرابیوں کو بیان فرمایا جس سے سود اور سودا کے درمیان فرق سمجھ میں آجاتا ہے تجارت واقعی انبیاءؑ علیہم السلام کا پیشہ ہے اور دینی اور دنیوی لحاظ سے نہایت بابرکت، لیکن موجودہ زمانہ میں جس قدر گھپلا تجارت میں ہو رہا ہے وہ اور کسی پیشہ میں نہیں ہے۔ لوگوں کو تجارت کی یجوز و لا یجوز کا کوئی علم نہیں اور نہ ہی ہمارے علمائے کرام نے ان کو بتلانے کی کبھی زحمت فرمائی ہے۔ اپنے مواعظ میں دنیا بھر کی اختلافی و اتفاقی باتیں بیان کر دیں گے دین میں مابہ النزاع مسائل وہ بھی اصولی نہیں بلکہ فروعی ان کے مواعظ کا موضوع ہو گا، لیکن دین کے وہ مسائل جن کا تجارت اور لوگوں کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق ہے ان کے بارہ میں انہوں نے کبھی لوگوں کو آشنا نہیں کروایا۔ تجارت کے بارہ میں تو سیدنا عمرؓ نے حکم جاری فرمایا ہوا تھا کہ "ہمارے بازاروں میں صرف وہ شخص بیٹھے جو فقیہ یعنی دینی مسائل متعلقہ تجارت

سے آشنا ہو۔ لیکن اس زمانہ میں دین و دنیا سے پچھڑے ان پڑھ لوگ بازار کی دکانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اُن کو یہ تک علم نہیں کہ کتنے قسم کی بیع ناجائز ہے اور بیع باطل اور بیع فاسد میں کیا فرق ہے؟ حضرت تھانویؒ نے اپنی اس کتاب تعلیم الدین میں تجارت کی قریباً اُن تمام صورتوں کو نہایت آسان زبان میں بیان فرمایا تاکہ ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ لوگ بھی ان چیزوں کو سمجھ سکیں۔ حضرتؒ کی یہ باتیں چونکہ عام لوگوں کے لیے نہایت کارآمد ہیں کیونکہ ان سے ہر روز واسطہ پڑھتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا اقتباس اگرچہ طویل ہے، لیکن اس کا تحریر کرنا مفید ثابت ہوگا۔ حضرتؒ نے فرمایا :-

"سود کے لین دین، تحریر و گواہی سب پر لعنت آئی ہے۔ جو چیزیں ناپ تول کر بکتی ہیں اور ایک طرح (یعنی ایک جنس) کی ہیں جیسے گیہوں، اس کے مبادلے میں دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ برابر برابر ہوں اگرچہ ادنیٰ و اعلیٰ کا تفاوت ہو۔ دوسرے یہ کہ دست بدست ہوں۔ اگر ایک امر میں بھی خلاف ہو تو سود ہو جائے گا۔ اگر ناپ تول کر بکتی ہیں مگر جنس ایک نہیں جیسے گیہوں اور جَو تو ان میں برابری ضروری نہیں، مگر دست بدست ہونا ضروری ہے۔ اور اگر نہ جنس ایک ہو نہ ناپ تول کر بکتی ہوں جیسے گھوڑا اور اونٹ تو نہ برابر ہونا ضروری ہے نہ دست بدست ہونا۔ یہ فقہ حنفی کے موافق سود کی تفصیل ہے۔ آج کل جو زیور خریدا یا بنوایا جاتا ہے، اُس کو تفاوت نرخ کی وجہ سے اکثر برابر بھی نہیں لیا جاتا اور اکثر ادھار بھی رہ جاتا ہے، جو بالکل سود ہے۔ ایسی صورت میں جس طرف چاندی کم ہو اُس میں کچھ پیسے بھی ملائے جائیں تو چاندی چاندی برابر ہو جاوے گی اور زائد چاندی کے عوض پیسے ہو جائیں گے۔ اور ادھار ہو تو صاحب معاملہ ہی سے جداگانہ قرض اس معاملے کو طے کریں۔ پھر اس کا قرض بعد میں ادا کر دیں۔ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ روپیہ دے کر آٹھ آنہ پیسے اب لے لیے اور آٹھ آنہ مثلاً ایک گھنٹہ کے بعد لیے یہ بھی جائز نہیں۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو روپیہ امانتاً اُس کے پاس رکھا دیں، جب اُس کے پورے پیسے آجاویں مبادلہ کا معاملہ کر لیں۔

"اگر تم خراب گیہوں کے عوض اچھے گیہوں لینا چاہتے ہو اور دوسرا شخص برابر برابر نہیں دیتا تو اپنے گیہوں ایک روپے کو مثلاً اُس کے ہاتھ بیچ ڈالو، پھر جتنے گیہوں وہ دے اُس روپے کے عوض جو تمہارا اس پر قرض ہو گیا ہے اُس سے خرید لو۔ اگر چاندی یا سونے کا جڑاؤ زیور یا جس میں اور کوئی چیز ملی ہو، چاندی یا سونے کے بدلے یا چاندی کا زیور چاندی کے بدلے اور سونے کا سونے کے بدلے خریدنا یا بیچنا

ہو تو یہ مبادلہ اُس وقت جائز ہے کہ زیور میں چاندی یا سونا یقیناً کم ہو اور داموں کی چاندی یا سونا زائد ہو۔ اگر برابر یا زائد ہونے کا گمان ہو تو جائز نہیں۔ اگر کوئی تمہارا مقروض ہو اور وہ تم کو ہدیہ دے یا دعوت کرے، اگر پہلے سے یہ رسم و راہ باہم جاری نہ ہو تو ہرگز مت قبول کرو۔ اسی سے رہن کی آمدنی کا حال معلوم کرو، کیونکہ راہن تمہارا قرض دار ہے۔ اور قرض کے دباؤ میں انتفاع کی اجازت دیتا ہے تو وہ کس طرح حلال ہوگا۔ بعض لوگ کوئی چیز ادھار خرید کرتے ہیں اور جب قیمت نہیں ادا ہو پاتی تو اس بائع کے ہاتھ کچھ کم قیمت میں اُس کو بیچ ڈالتے ہیں۔ سو چونکہ بایع کو اس بچت کا کوئی حق نہیں اس لیے یہ سود میں داخل اور ممنوع ہے، البتہ اُس کی تدبیر یہ ہے کہ بایع تھوڑی دیر کے لیے مشتری کو سابق کی قرارداد قیمت کی بقدر قرض دے دے جس کو مشتری اصل قیمت میں ادا کر دے۔ اس کے بعد وہ چیز کم قیمت میں بایع کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ اور جو باقی رہے وہ اس کے ذمہ قرض رہے گا۔ مثلاً دس روپے کو تم نے ایک گھڑی خریدی، اور روپے کا بندوبست نہ ہو سکے کہ پھر اس بائع کے ہاتھ آٹھ روپے کی بیچ ڈالی۔ تو یہ سود اور ناجائز ہے۔ ایسی ہی ضرورت پڑ جائے تو یوں کرو کہ دس روپے بائع سے قرض لے کر پہلے گھڑی کی پوری قیمت ادا کر دو۔ پھر وہ گھڑی اُس کے ہاتھ جتنی قیمت پر چاہو بیچو۔ جتنے کی بائع نے خریدی اتنا قرض تو ابھی ادا ہو گیا۔ باقی تمہارے ذمہ رہا۔"

"جب تک پھل کام میں آنے کے لائق نہ ہو جائیں اُن کا خریدنا اور بیچنا ممنوع ہے، کیونکہ معلوم نہیں پھل رہے یا جاتا رہے۔ صرف بیجک پر مال مت فروخت کرو جب تک تمہارے قبضے میں نہ آ جائے۔ اور جب بائع کے قبضے میں آ جائے —— تو مشتری کو بیجک دیکھ کر خریدنا درست ہے، مگر جب مال کو وہ دیکھے اُس وقت اس کو اختیار رہوگا کہ معاملہ کو رکھے یا انکار کر دے۔"

- بنجارہ یا کوئی اور باہر سے غلہ لایا اُس کو شہر میں آ جانے دو۔ تب خرید کرو باہر ہی معاملہ کر لینا اچھا نہیں۔ اس میں کبھی تو اس کو دھوکہ دیا جاتا ہے کہ شہر میں اس نرخ کو فروخت نہ ہوگا۔ اور شہر والوں کو یہ نقصان کہ سب اس کے محتاج ہو گئے۔ جتنے کو چاہے فروخت کرے۔ نیز ایک آدمی اگر کوئی سودا چکاتا ہو، اور بائع نے ابھی منظور نہیں کیا بلکہ منظوری کا احتمال غالب ہو تو تم اُس کے سودے کو خراب کر کے مت لینے لگو، البتہ جب وہ صاحب انکار کر دے اُس وقت خریدنے میں مضائقہ نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیلام میں کسی کی بولی پر بولی بولنا درست ہے کیونکہ خود بائع نے ابھی اس پہلی بولی کو منظور نہیں کیا ہے۔ علیٰ ہذا

کسی کو دھوکہ دینے کے لیے چیز کے دام اس لیے مت بڑھاؤ کہ دوسرا آدمی اور زیادہ بول دے۔ اگر گائے بکری وغیرہ دودھ دینے والا جانور بیچنا ہو تو اس غرض سے کسی وقت دودھ نہ نکالنا درست نہیں کہ خریدار زیادہ دودھ دیکھ کر دھوکہ میں آجائے اور بعد کو پچھتائے۔ نہ کسی اور معاملہ میں کوئی ایسی کارروائی کرو جس سے خریدار کو دھوکہ ہو۔ کوئی مصیبت زدہ ضرورت سے مجبور ہو کر اپنی کوئی چیز بیچتا ہو، تو نہ اس کو دباؤ اور اس چیز کے دام گراؤ بلکہ یا تو اس کی اعانت کرو یا اس کی چیز کو مناسب دام پر خریدو۔ ناپ تول میں دغابازی مت کرو۔

یہ مسائل جو حضرت والاؒ نے بیان فرمائے ہیں ہماری روزمرہ کی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے ہم ہر روز ان کے خلاف کرتے رہتے ہیں اور ہمیں یہ تک علم نہیں کہ ہم اسلام کے خلاف کر رہے ہیں۔ فارورڈ سودا بازی ہمارا روزمرہ کا معمول ہے، لیکن بڑے بڑے دیندار تاجروں کو بھی اس کے ناجائز ہونے کا علم نہیں۔ اسی طرح اور مسائل کا معاملہ ہے۔

حضرت نے اس سلسلہ میں مزید مسائل بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

"خود رو گھاس کا بیچنا درست نہیں اگرچہ تمہاری مملوکہ زمین میں ہو۔ اسی طرح پانی۔ جو چیز تمہاری ملک و قبضہ میں نہ ہو اس کا معاملہ اس امید پر مت ٹھہراؤ کہ بازار سے خرید کر دے دیں گے۔ رہن میں یہ شرط ٹھہرانا کہ اگر اتنی مدت تک زرِ رہن ادا نہ ہو تو اس کو بیع سمجھا جاوے گا۔ باطل ہے۔ اور مدت گذر جانے پر بیع نہ ہوگی۔ . . . . غلہ ارزاں خرید کر گراں بیچنا درست ہے مگر جب مخلوق کو تکلیف ہونے لگے، اس وقت زیادہ گرانی کا انتظار کرنا حرام اور موجب لعنت ہے، حاکم کو اختیار نہیں کہ زبردستی نرخ مقرر کرے البتہ تاجر کو فہمائش اور صلاح دینا مناسب ہے۔"

"اگر تمہارا کوئی دیندار غریب ہو تو اس کو پریشان مت کرو۔ مہلت دو یا سب کچھ معاف کر دو۔ اللہ تعالےٰ تم کو قیامت کی سختی سے نجات دیں گے۔ تم کسی کے دیندار ہو تو خراب چیز سے اس کا حق مت ادا کرو بلکہ ہمت رکھو کہ اس کے حق سے بہتر اس کو ادا کیا جائے، مگر معاملہ کے وقت یہ معاملہ جائز نہیں۔ اگر تمہارے پاس ہے تو کسی کے حق کو ٹالنا بڑا ظلم ہے۔ اگر تمہارا مدیون کسی دوسرے سے دہانید کرا دے اور اس سے وصول ہونے کی امید ہو تو خواہ مخواہ ضد میں آکر اس کو مت دق کرتے رہو۔ دہانید کو قبول کرو حتی الامکان کسی کے قرضدار مت ہو۔ اگر ضرورتاً ہونا ہی پڑے تو ادا کی فکر رکھو بے پرواہ مت

بن جاؤ۔ اور اگر دائن (قرض خواہ) تم کو کچھ کہے سنے صبر کرو، اس کا حق ہے۔ اگر وسعت ہو تو کسی غیر مستطیع قرضدار کی طرف سے اس کا قرض ادا کر دیا کرو۔ جب کسی کا قرض ادا کیا کرو تو ادا کرتے وقت اس کو دعا بھی دیا کرو اور شکر ادا کرو۔"

"شرکت میں ساجھیوں کو امانت و دیانت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ورنہ برکت سلب ہونے لگتی ہے۔ امانت میں کسی قسم کی ضیانت مت کیا کرو۔ جو مال ظلم سے، دباؤ سے، کسی کی وجاہت و لحاظ یا شرما شرمی سے وصول کیا جاوے وہ حلال نہیں۔ چندہ جمع کرنے والے اس کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں۔ حلال وہی مال ہے جو بالکل ہی خوشی خاطر سے دیا جائے۔ پڑوسی کی رعایت کیا کرو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس سے جھگڑا مت کیا کرو۔ مثلاً تمہاری دیوار میں میخ گاڑنے لگے اور تمہارا کوئی نقصان بھی نہ ہو تو اجازت دے دو۔ اگر کوئی زمین یا گھر بے میل یا بے موقع ہونے کی وجہ سے فروخت کرو تو مصلحت یہ ہے کہ جلدی اُس کو کوئی دوسرا مکان یا زمین خرید لو ورنہ روپیہ رہنا مشکل ہوتا ہے۔"

"جس درخت کے سایہ میں آدمیوں کو اور جانوروں کو آرام ملتا ہو اور تمہاری ملکیت میں بھی نہ ہو اس کو مت کاٹو۔ اس سے عذاب ہوتا ہے۔ مزدور سے کام لے کر اس کی مزدوری دینے میں کسی طرح کوتاہی مت کرو، ورنہ اس مقدمہ میں خود اللہ تعالیٰ مدعی ہوتا ہے۔ عہد کر کے خلاف مت کرو خصوصاً جب اس میں اللہ تعالےٰ کے نام کا واسطہ ہو اس میں بھی خود اللہ تعالےٰ مدعی ہوں گے..... اگر کسی کو کوئی چیز یہ کہہ کر دو کہ تمہاری زندگی بھر کے لیے دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد واپس لے لیں گے، تو وہ چیز اُس کی ہو جاتی ہے اور مرنے کے بعد اُس کے وارثوں کو ملے گی، تو اس امید باطل پر اپنی چیز مت دو ورنہ پھر حسرت ہوگی۔ اگر ایک بیٹے کو کوئی چیز دو تو دوسرے کو بھی ویسی ہی دو ورنہ ناانصافی ہوگی جو بُری بات ہے۔ ہدیہ ایسے شخص کا قبول کرو۔ جو کسی بدلے کا طالب نہ ہو ورنہ باہم رنج ہوگا۔ البتہ تم اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ بدلے ہی کی کوشش کرو۔ اور اگر یہ میسر نہ ہو تو اس کی کچھ تعریف کرو اور لوگوں کے سامنے اس کے احسان کو ظاہر کرو۔ اور تعریف کے لیے اتنا کہہ دینا بھی کافی ہے کہ جزاک اللہ خیراً۔ اور اگر محسن کا شکریہ ادا نہ کیا گیا تو خدا کا شکر بھی ادا نہ ہوگا۔ باہم تحفہ تحائف کی راہ و رسم رکھو اس سے محبت بڑھتی اور دلوں کی صفائی ہوتی ہے۔ اور یہ خیال نہ کرو کہ تھوڑی چیز ہے کیا بھیجیں۔ جو کچھ بھی ہو بے تکلف دو۔ اگر تمہارے ذمہ کسی کی امانت یا قرض یا اور کوئی حق ہو تو اس کی یاد داشت بطور وصیت کے لکھ کر پاس رکھو۔

حضرتؒ کی کتاب سے اتنا لمبا اقتباس صرف اس لیے نقل کیا گیا تاکہ یہ پتہ چل جائے کہ اسلام صرف عبادات اور ذکر و اذکار کا دین نہیں بلکہ اسکی تعلیمات انسان کی پُوری زندگی پر محیط ہیں۔ اور ہماری روزمرہ کی زندگی کے مسائل سے لے کر عالم آخرت بلکہ عالم جنت تک کے مسائل موجود ہیں۔

ابوداؤد میں حدیث ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی سیدنا سلمان فارسیؓ کو مشرکین اور منکرین اسلام نے استہزاً اور اعتراضاً کہا کہ لقد علمکم نبیکم کل شئی حتی الخراۃ

تم کو تمہارے پیغمبرؐ تمام چیزوں کی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ پاخانہ کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔

سیدنا سلمان فارسیؓ نے جواب میں فرمایا:-

"ہاں بیشک آپ نے ہم کو اس سے منع فرمایا کہ پاخانہ یا پیشاب کے لیے قبلہ رو ہو کر بیٹھیں۔ نیز آپ نے ہم کو ہدایت فرمائی کہ استنجاء داہنے ہاتھ سے نہ کریں۔ نیز یہ کہ استنجاء میں تین پتھروں (یا ڈھیلوں) سے کم پر نہ کفایت کریں۔

ایک موقع پر پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے خود فرمایا:-

"میں تمہارے لیے باپ کی جگہ ہوں اور جس طرح باپ اپنی اولاد کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتاتا ہے اسی طرح میں تم کو تعلیم دیتا ہوں۔ دیکھو جب تم سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جائے تو نہ قبلہ کی طرف منہ کرے اور نہ پیٹھ اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجا کرے۔ (سنن ابی داؤد)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ دین نے پیشاب اور پاخانہ کرنے تک کے مسائل اور طریقوں سے آگاہ کیا ہے، لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ان مسائل پر عمل تو بہت بڑی بات ہے ہمیں ان کا علم تک نہیں اور نہ ہی ان کو جاننے کی ہم نے کبھی کوشش ہی کی ہے یعنی زباں تو ہے ہمارے دلوں سے احساس زیاں تک کا کانٹا نکل چکا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز نہ ہمارے تاجروں میں ہے اور نہ کاشتکاروں میں یہی حال اور لوگوں کا ہے۔ تاجروں۔ کاشتکاروں اور دوسرے لوگوں کو بھی چھوڑیئے۔ خود علمائے کرام جو اس زمانہ میں اپنے کو دین کے علمبردار سمجھتے ہیں اُن میں سے چند علمائے ربانی نکال کر باقیوں نے تو دین کو بھی ایک پیشہ بنا لیا ہوا ہے۔ اور اپنی دنیا بنانے کے لیے اگر انہیں دین میں کچھ ہیر پھیر کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے حالانکہ جو دین پر عمل نہیں کرتا ——— وہ عالم ہونے کے باوجود بھی عالم نہیں۔ کیونکہ علم صرف کتابیں پڑھنے کا نہیں بلکہ پڑھ کر عمل کرنے کا ہے۔ اس

پر بھی مجدد تھانویؒ کا ایک ملفوظ سنتے جائیے اور پھر غور فرمائیے کہ حضرتؒ نے کیسی پتے کی بات ارشاد فرمائی۔

ایک دفعہ حضرتؒ کی مجلس میں بڑے بڑے علمائے کرام تشریف فرما تھے۔ حضرتؒ نے پوچھا کہ علم کی تعریف کیا ہے۔ "کتابوں میں جو علم کی تعریف مرقوم ہے اُن علمائے کرام نے وہ بیان کر دی۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا "سب تعریفیں کتابی طور پر درست ہو سکتی ہیں لیکن دینی لحاظ سے علم کی یہ تعریف نہیں ہے"۔ سب علمائے کرامؒ نے پوچھا "حضرت! پھر علم کی تعریف کیا ہے؟" حضرت تھانویؒ نے جو علم کی تعریف فرمائی۔ خدا کی قسم اُس پر سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کو یہ تعریف کتابوں میں نہیں ملے گی، لیکن صحیح تعریف یہی ہے۔ فرمایا "علم کی تعریف سنو! علم ایسے جاننے کو کہتے ہیں جس جاننے کے بعد آدمی عمل کے لئے بیتاب ہو جائے۔" ایک بوتل زہر سے بھری ہوئی ہے۔ ایک کو علم ہے کہ اس میں زہر ہے اور دوسرے کو اس میں زہر ہونے کا علم نہیں، لیکن دونوں اُس کو پی لیے۔ اب جس کو علم ہے کہ اس میں زہر ہے، اس کے علم کا کیا فائدہ ہوا؟ بلکہ اُس کا علم بھی جہالت کے مترادف ہے کیونکہ وہ بھی اُس زہر کو اُسی طرح پی رہا ہے جس طرح وہ شخص پی رہا ہے جس کو علم نہیں ہے کہ اس میں زہر ہے۔"

خیر یہ تو جملہ معترضہ کے طور پر علم کی تعریف کے بارہ میں حضرتؒ کا ایک ملفوظ آگیا، بات یہ ہو رہی تھی کہ علمائے کرام اور مشائخ نے دین کو پیشہ بنا کر لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یعنی اکل اموال الناس بالباطل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ "مہینے، فصلانے، اور ششماہی معین ہے۔ بڑے ثقہ لوگ کہتے ہیں کہ پیر کے ہاں خالی جاوے خالی آوے۔" بلکہ یہاں تک کہنے لگے کہ "جو خالی آئے خلوص سے وہ خالی جاوے فیوض سے۔" گویا مریدوں اور معتقدین کی جیب پر ہی نظر ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ______ حضرت تھانویؒ نے بڑی پیاری بات فرمائی۔ فرمایا!

"وہ ڈاکو اچھے ہیں جو جرأت کر کے بندوق تلوار سے لوٹ مار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو مجرم سمجھتے ہیں اور یہ اپنے کو بے جرم جانتے ہیں۔ اور وہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہ بالکل بے خطر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اچھے ہوں گے اور شاید قیامت میں ایسا ہی معاملہ ہو تو کچھ بعید نہیں جیسا کہ جامیؒ کا ارشاد ہے ؎

گنہ آمرز رندانِ قدح خوار
بطاعت گیر پیران ریا کار

(وعظ احکام المال ص ۳)

غرض جو کچھ حضرتؒ نے اپنی کتاب تعلیم الدین میں فرمایا جس کا ایک طویل اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے اگر اس پر عمل کیا جائے تو ہمارے معاشرہ میں تمام جھگڑے، فساد اور فراڈ ختم ہو جائیں نہ صرف غربا بلکہ امرا کی زندگی بھی آسودگی اور بے غمی کے ساتھ گذرنے لگے۔ عدالتوں اور تھانوں کی رونقیں ختم ہو جائیں، لیکن پتہ نہیں کیا بات ہے ہم لوگوں نے دین کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے کی قسم کھا رکھی ہے اور ہم لوگوں کے بارہ ہی میں رسولؐ قیامت کے روز کہہ دیں گے کہ

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا اور (قیامت کے روز، رسولؐ کہہ دیں گے کہ اے میرے رب بے شک میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

حضرت تھانویؒ کی ہمہ پہلو اصلاحی اور تجدیدی زندگی کے بارہ میں آپ کے خلیفہ ارشد علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا ہے :۔

" اصلاح امت کی کوشش علمی اور عملی زندگی کے ہر گوشہ پر اُن کی نظر تھی۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک، عورتوں سے لے کر مردوں تک، جاہلوں سے لے کر عالموں تک، خالقوں سے لے کر صوفیوں، درویشوں اور زاہدوں تک، غریبوں سے لے کر امیروں، استادوں اور مدرسوں تک، غرض ہر صنف امت اور ہر جماعت کے کاموں تک اُن کی نظر دوڑی۔ پیدائش، شادی، بیاہ، غمی اور دوسری تقریبوں اور اجتماعوں تک کے احوال پر اُن کی نگاہ پڑی اور شریعت کے معیار پر جانچ کر ہر ایک کا کھرا اور کھوٹا الگ کیا اور رسوم و بدعات اور مفاسد کے ہر روڑے اور پتھر کو صراط مستقیم سے ہٹا دیا۔ تبلیغ، تعلیم، سیاست معاشرت، معاملات، اخلاق، عبادات اور عقائد میں دین خالص کی نظر میں جہاں کوتاہی نظر آئی اُس کی اصلاح کی۔ فقہ کے نئے نئے مسائل اور مسلمانوں کی نئی نئی ضرورتوں کے متعلق پورا سامان مہیا کر دیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اس فن احسان و سلوک کی جس کا مشہور نام "تصوف" ہے تجدید کی"۔ چند سطور کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں۔

" ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ——— ایک گوشہ میں ایک دوربین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور اُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل،

نیک اور بد، صحیح اور غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اُس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اُس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ اُن کے درست کرنے میں مشغول تھا۔ اُس نے پُوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویر حیات اس شبیہ کے مطابق بنا دے جو دینِ حق کے مرقع میں نظر آئے۔"

(جامع المجددین ص ۲۷-۲۸)

مضمون کچھ طویل اور لمبا ہی ہوتا جا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے حضرت تھانویؒ نے بطرف ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و تجدید کے رنگا رنگ نایاب پھول کھلائے ہوئے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ہر ایک پھول بلکہ ہر رنگ کے پھول کو چن کر ایک گلدستہ میں لگا دیا جائے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ گلدستہ اتنا ضخیم نہ ہو جائے کہ "الحسن" کے گلدان ہی میں نہ سما سکے۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اس کو مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم جامع الصفات اور پیکرِ علم و فضل و کمال تھے۔ منطق و فلسفہ میں کچھ زیادہ ہی منہمک ہونے کی وجہ سے ذہن میں شک و ارتیاب کی تخم ریزی ہو گئی اور الحاد نے اپنے برگ و بار نکالنے شروع کر دیے۔ بات یہاں تک بڑھی کہ وجودِ باری، رسالت اور آخرت وغیرہ پر "دہریت" تو نہیں البتہ "لاادریت اور تشکیک کی مُہر ثبت ہو گئی۔ آخر مثنوی مولانا رومؒ نے تشکیک اور الحادِ فرنگ پر لعنت بھیجنے پر مجبور کر دیا اور مولانا عبدالباری ندویؒ کی وجہ سے مولانا تھانوی سے ایک تعلق قائم ہو گیا۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ کو ساتھ لے کر تھانہ بھون حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے لیے حاضر ہو گئے۔ رات کو گاڑی لیٹ پہنچی۔ حضرت تھانویؒ خانقاہ سے گھر تشریف لا چکے تھے۔ خادمِ خانقاہ نے ان تینوں حضرات کو خانقاہ میں کمرہ دے دیا۔ نمازِ فجر حضرت تھانویؒ نے خود پڑھائی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کا بیان ہے کہ میں نے پوری زندگی میں اتنا اچھا قرآن پڑھنے والا نہیں دیکھا۔ نمازِ فجر سے فراغت کے بعد حضرت تھانویؒ نے دیکھا کہ مولانا مدنیؒ جبّہ پہنے پہلی صف میں تشریف فرما ہیں، دونوں حضرات کا مصافحہ معانقہ ہوا۔ حضرت تھانویؒ نے پوچھا کب تشریف لائے؟ حضرت مدنیؒ نے کہا کہ رات حاضر ہوا تھا۔ فرمایا "رات کو اطلاع کیوں نہ دی"۔ حضرت مدنیؒ نے کہا "آپ کے

ضابطہ کے خلاف تھا۔" فرمایا "ضابطے تو غیروں کے لیے ہوتے ہیں۔ آپ کے لیے تو کوئی ضابطہ نہیں۔" حضرت مدنیؒ نے کہا کہ "اگر ہم نے ہی آپ کے ضابطوں پر عمل نہ کیا تو دوسرے کیوں کریں گے" حضرت تھانویؒ نے پوچھا کیسے تشریف لائے؟ حضرت مدنیؒ نے کہا کہ "عبدالماجد کو لیکر آیا ہوں آپ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرمالیں۔" اس پر جو حضرت تھانویؒ نے فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا۔

"بیعت کوئی رسم نہیں ہے کہ کسی بزرگ سے جاکر بیعت ہو لیا اور رسم پوری ہوگئی۔ بیعت اصلاح کے لیے کی جاتی ہے۔ اور اصلاح کے لیے پیر اور مرید کی طبیعت میں مناسبت ضروری ہے۔ میری اور عبدالماجد کی طبیعت میں کوئی مناسبت نہیں۔ لہذا انہیں بیعت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

پھر ہنس کر فرمایا:۔

"آپ انہیں بیعت کرلیں۔ آپ بھی خادم قوم اور یہ بھی خادم قوم اور میں نادم قوم" حضرت مدنیؒ نے بہت اصرار کیا لیکن حضرت تھانویؒ نے انکار فرمایا

پھر بقول مولانا عبدالماجد یہ تینوں حضرات واپس چلے آئے اور حضرت مدنیؒ نے مولانا عبدالماجد کو بیعت فرمالیا۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنی تفسیر میں ہر جگہ حضرت تھانویؒ کے لیے "مرشد تھانوی" ہی کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

یہ تو درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر بات آگئی تھی۔ بتانا یہ چاہتا تھا کہ مولانا عبدالماجدؒ نے اپنی کتاب "آپ بیتی" میں لکھا ہے کہ

"میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین و مؤثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں۔ ان دونوں نے کہنا چاہیے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ ان دونوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہوجاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔"

ان دو شخصیتوں میں ایک مولانا محمد علی جوہر (کامریڈ والے) جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے اور دوسری شخصیت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ تھے۔ مولانا تھانویؒ کے بارہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے جن خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مولانا دریابادیؒ نے پوری زندگی کبھی کسی شخصیت کے بارہ میں حقائق

سے ماوریٰ مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ فرماتے ہیں:۔

"دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تھی۔ مدتوں ان سے شدید بدظنی میں مبتلا رہا۔ اور اس بدظنی کے بڑھانے میں بڑا حصہ خود حضرت ہی کے بعض مریدوں، معتقدوں کا تھا۔ مدتوں یہ سمجھتا رہا کہ یہ ایک متشدد خشک مولوی ہیں۔ برطانیہ نواز اور نصرانیوں کے دوست۔ جب وصل بلگرامی نے ان کے وعظ پڑھنے کو دیے تو پہلی بار آنکھیں کھلیں۔ اور پھر جب مراسلت کے بعد نوبت دید و زیارت کی آئی، تو کتنے ہی کمالات ظاہری و باطنی کھل کر رہے۔ علم و تفقہ، تصوف و شریعت کے جامع، حُسنِ عمل کے ایک زندہ پیکر اور ارشاد و اصلاح کے تو بادشاہ۔ وقت کے دوسرے مشائخ کو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی ؎

تو بہارِ عالمِ دیگری، از کجا بہ ایں چمن آمدی

"... شیخ سعدیؒ اگر آج ہوتے تو عجب نہیں کہ اپنا نسخہ گلستاں بہ غرضِ اصلاح ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ حضرت غزالیؒ ہوتے تو عجب نہیں کہ احیاء علوم دین کی تصنیف میں استناد و استفادہ ان سے سطر سطر پر کرتے رہتے۔ جولائی ۱۹۲۸ء میں سلسلۂ مکالمت و مجالست کا شروع ہوا اور کہنا چاہیے کہ آخر عمر شریف تک جاری رہا۔ اور سلسلۂ مراسلت اس کے علاوہ ۱۹۳۰ء میں جو کچھ اس ناکارہ سے دین کی خدمت بن پڑی اور اپنے رذائل نفس سے جس درجہ میں بھی شفا اپنے ظرف و بساط کے مطابق مل سکی، کہنا چاہیے کہ وہ سارا فیض اسی بارگاہ کا ہے۔ بزرگ اور عابد، زاہد بزرگ اور متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مُصلح، مزکی، مربی کوئی ایسا دیکھنے میں نہ آیا۔ محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدیٰ و مطاع۔ محبت کے مرکز اگر وہ تھے تو عقیدت کے مرجع یہ۔ (آپ بیتی ص ۳۵۸-۳۵۹)

حضرت تھانوی کے بارہ اس مختصر سے مضمون سے حضرتؒ کے خصائل و فضائل اور اصلاح و تجدید کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی گذارش ہے کہ اگر حضرتؒ کی کتابوں، ملفوظات اور مواعظ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا جائے تو بے شمار دینی اور دنیوی فائدہ ہوگا۔

* * *

ایک عظیم ماہر نفسی طب

محترم ڈاکٹر اظہر علی صاحب رضوی

* * *

انسان اللہ تعالیٰ کی سب سے عظیم تخلیق ہے اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔ اس کو بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا۔ اپنے رب کی عبادت اور تسخیر کائنات اس کا اوڑھنا بچھونا بتایا گیا۔ انسان کو انسان سے محبت کی تلقین کی گئی۔ شیطان نے انسان کو اپنے آپ سے اور اپنے ساتھیوں سے بدظن کرنے کا کاروبار جاری کیا۔ انسان کی رہنمائی کے لیے پیغمبر آئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اسلام کی تکمیل ہوئی۔ نبیوں کے آنے کا سلسلہ بند ہوا۔ اب خدا کے نیک بندے بھٹکے ہوئے انسان کی فلاح وبہبود کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ انہیں بزرگوں میں سے ایک بزرگ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تھے۔ جو "خانقاہ امدادیہ" میں بیٹھے لاکھوں انسانوں کی مدد کرتے رہے "خانقاہ امدادیہ" حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی یاد میں اس جگہ کا نام ہے جہاں حاجی صاحب کا حجرہ اور مسکن تھا۔ یہ جگہ تھانہ بھون میں ہے اور تھانہ بھون اتر پردیش ضلع مظفر نگر میں واقع ہے اس کا اصل نام تھانہ بھیم تھا۔ کیوں کہ وہ کسی زمانے میں راجہ بھیم کا تھانہ تھا۔ کثرت استعمال سے تھانہ بھون ہو گیا۔

حالات زندگی

مولانا اشرف علی تھانوی ۵ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ / ۱۹ ستمبر ۱۸۶۳ء بروز چہار شنبہ صبح صادق کے وقت پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب نے بڑی محبت و شفقت سے دونوں بھائیوں کی اپنے ہاتھوں پر ورش کی۔ والد اشرف علی کا زیادہ خیال رکھتے

تھے۔ اس بات نے اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا کی۔ ذہانت لے کر آئے تھے ماحول نے فراخدلی سے مواقع فراہم کیے اور اس طرح یہ بچہ موجودہ دور کا امام غزالی بن گیا۔ نماز پڑھنے اور وعظ کہنے کا بچپن شوق تھا مولانا اشرف علی نے قرآن مجید زیادہ تر حافظ حسین علی سے حفظ کیا۔ فارسی کی متوسط کتابیں مولانا فتح محمد سے پڑھیں اور انتہائی کتب ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی سے پڑھیں اور پھر تحصیل عربی کے لیے دیوبند چلے گئے، پانچ سال وہاں رہے۔ ذہانت، ذکاوت اور حافظہ سب طالب علموں میں مشہور تھا۔ تحصیل علم کا اس قدر شوق تھا کہ بعض اساتذہ سے خاص کتابیں جن کے لیے مدرسے کے اوقات میں موقع نہ ملتا تھا اس طرح پڑھیں کہ استاد تو نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور اشرف علی سبق لے رہے ہیں۔ صفر ۱۳۰۱ھ میں مولانا اشرف علی مدرسہ فیض عام کانپور میں تشریف لائے اور پورے چودہ برس تک ہر طرح کی دینی خدمت بذریعہ درس و تدریس اور مواعظ و تصانیف اور ارشاد و تلقین بجا لائے۔

اس دوران کچھ دن مراد آباد بھی رہے، کچھ دن طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ پھر اہل کانپور کے اصرار پر طب کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر درس و تدریس کا کام شروع کیا۔ پڑھانے کا طریقہ عین نفسیاتی اصولوں کے مطابق تھا۔ پڑھاتے وقت طلبا کو ہدایت کرتے کہ جو سبق پڑھنا ہو اس کا مطالعہ ضرور کر لیا جائے۔ پھر سبق کو استاد سے اچھی طرح سمجھ کر پڑھے بلا سمجھے آگے نہ چلے اگر اس وقت استاد کی طبیعت حاضر نہ ہو تو کسی دوسرے وقت سمجھ لے اس کے بعد ایک بار خود بھی مطلب کی تقریر کرے اور دہراتا ہے۔

۱۳۰۱ھ میں والد صاحب کے ہمراہ حج کرنے گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا "بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو"۔

پھر ایک ایسا دور آیا ایک اضطراری کیفیت طلب مزید کی طاری ہوئی اور سارے مشاغل سے دل اچاٹ ہو گیا۔ درس و تدریس سے دلچسپی ختم ہوئی۔ وعظ کہنا چھوڑ دیا اور یکسوئی اختیار کر لی۔ لوگوں نے اصرار کیا تو مولوی شاہ سلیمان پھلواری نے کہا "اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو منبر پر بیٹھتے ہی اس شخص کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ "انا الحق" ہوگا۔ ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں"۔ اس کی تصدیق خود حضرت نے فرمائی کہ اس زمانے میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لیے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا کہ نہ جانے کیا کہا جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے۔ حضرت کو شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ "اگر کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی جا کر بیٹھ

جانا"۔ ۱۳۱۴ھ کے اختتام پر ٹھان لی کہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو جو دکان معرفت کہلاتی ہے دوبارہ مسکن بنایا جائے۔ آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں تھانہ بھون پہنچ گئے۔

تھانہ بھون میں مراجعت پر حضرت حاجی صاحب ایک خط تحریر فرماتے ہیں۔ "بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہماری مسجد کو از سر نو آباد کریں گے۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں"

رشد و ہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۲۸۰ھ میں مطلع تھانہ بھون سے نمودار ہوا اور ۱۳۱۵ھ سے غیر منقسم طول و عرض میں شریعت و طریقت سے انوار پھیلاتا رہا ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر پاکر ۱۶-۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ ۱۹-۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا

گندمی رنگ، نورانی و نرم بشاش چہرہ، پیشانی متوسط، سینہ کشادہ، قد درمیانہ، داڑھی بھری ہوئی اور گنجان، گھنگریالے بال، مسن لیکن خوش رو، نظریں نیچی، چال متین نہ بہت تیز نہ بہت ہی آہستہ ہنستا مسکراتا بشرہ، جسم پر لمبا کرتہ، سر پہ نازک سی گول اکہری ٹوپی، گفتگو نہ تیز نہ ٹھہر ٹھہر کر بلکہ بہت صاف کرتے تھے، جس میں تسلسل ہوتا تھا۔ اشارہ کرنے کے بالکل عادی نہ تھے۔ جو کچھ کہنا ہو زبان سے صاف فرماتے تھے۔

سادگی، اخلاص، سچائی، نظم و ضبط، بے طمعی اور بے نفسی ان کی شخصیت کے نمایاں وصف تھے، عالی ظرفی اور شرافت نفس کے بادشاہ تھے۔ ایک بہترین دوست، بہترین میزبان، بہترین عزیز بہترین شوہر، بہترین ہمسایہ، بہترین معلم اخلاق غرضیکہ صحیح معنوں میں انسان تھے۔ انسانوں سے محبت تھی طبیعت آزاد پسند تھی، بے قاعدگی کو برداشت نہ کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اپنے اور دوسروں کو پریشانی سے بچانے اور آرام کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کو نظم ضبط کے ساتھ گزارا جائے۔

دوسروں کا کس قدر خیال تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خانقاہ میں طالبین و سالکین کا ایک گروہ ذکر و شغل میں مشغول رہا کرتا تھا۔ مولانا بعد نماز فجر سب سے پہلے ان کے کام کی طرف توجہ دیتے تھے۔ ان کے لکھے ہوئے پرچوں کو پڑھتے اور پھر جواب دیتے۔ دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی تو اختلاف کی وجہ لکھ کر آگے کہتے ہیں کہ "بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو گزند نہ پہنچے۔ بلکہ اگر کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو تو مصلحت ہے۔"

چھوٹے بڑے رسائل اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد آٹھ سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے۔ کسی کتاب کا حق اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں کیا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کروانے کی عام اجازت ہے۔

نفسیاتی طریقہ علاج کا مقصد روحانی، ذہنی، کرداری بیماریوں کا علاج ہے۔ ان بیماریوں کی کیا نوعیت ہے۔؟ زندگی میں ان کی کیا اہمیت ہے؟ جس طرح ذہنی امراض (مسلمان مفکرین ذہنی امراض کو روحانی امراض بتلاتے ہیں) ان کے نزدیک جسمانی امراض سے زیادہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ مغربی دنیا میں ذہنی طور پر صحت مند فرد کو نارمل اور غیر صحت مند کو ابنارمل کہا جاتا ہے نارمل یا ابنارمل کی مختلف توجیہات بیان کی گئیں۔ مسلمانوں کے یہاں نارمل اور ابنارمل کی تشریح مذہبی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد اخلاق پر رکھی گئی ہے۔ بچہ بنیادی طور پر فطرت سلیم پر پیدا ہوتا ہے۔ فطرت معصوم ہے۔ ماحول اس کی نشوونما پر اثر انداز ہوتا ہے اگرچہ فطری استعداد کا بھی اس میں عمل دخل ہوتا ہے۔ انسان کا خالق اللہ ہے اس کے بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خالق مخلوق کا تعلق اور بندوں کا بندے سے رشتے کی نوعیت نارمل اور ابنارمل کا تعین کرتی ہے۔ روحانی امراض جن کو جدید دور میں وظیفی ابتری (   ) کہا جاتا ہے فرد کا فرار ہے اپنے آپ سے، اپنے ماحول سے اور اپنے خالق سے۔ جب بندے کا بندے پر اعتماد اٹھ جاتا ہے تو وہ اپنا اعتماد کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح اپنی اس فطرت سے فرار اختیار کر لیتا ہے جو اسے خالق و مخلوق پر اعتماد اور یقین کا درس دیتی ہے۔ انسان کا انسان سے، انسان اور قدرت کے درمیان نفسیاتی فاصلہ مترادف ہے انسان اور اللہ کے درمیان فاصلہ کا۔ یہ فاصلہ جتنا قریب ہوگا اتنا ہی انسان ربانی صفات اختیار کرے گا اور اتنا ہی نارمل ہوگا۔ اور یہ فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا انسان اتنا ہی ربانی صفات سے دور ہوگا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد سے بیگانہ ہوگا۔ یہ بیگانگی اسے دیوانہ بنا دیتی ہے وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتا، بے جا خوف اور ڈر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پاکیزگی اور گندگی میں فرق نہیں محسوس کر پاتا۔ مختلف قسم کے بیہودہ عمل اس کی زندگی میں مستقل عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی سوچ اعمال و افعال کو غلط سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کو راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے نفسیاتی امراض میں مبتلا لاکھوں افراد کا علاج بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ ان کے یہاں ایک فلسفہ حیات ہے، اسلوب زندگی ہے نظریہ ہے اور تکنیک ہے تربیت السالک کی چھ جلدوں میں بے شمار ذہنی مریضوں کی کیس ہسٹری درج ہے۔ ہم یہاں مختصر طور پر مولانا اشرف علی تھانوی کے طریقہ علاج ——— بیان کریں گے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے طریقہ علاج کا موازنہ مغربی طریقہ علاج سے نہیں کیا جائے گا۔ اس مضمون میں آپ مغربی مفکرین کے حوالے نہیں پائیں گے۔ یہ طریقہ علاج جس نظریہ پر مبنی ہے وہ ایک مکمل دین کا نظریہ حیات ہے اور اعتدال کی راہ ہے اور اس کی بنیاد دین پر ہے۔

مولانا اکثر فرماتے تھے کہ مسلمان کی زندگی میں تمام تر شریعت، تمام سنت اور تمام تر طریقت ہی سے معاملہ رہتا ہے۔ جس کا مختصر حاصل یہ ہے کہ حقوق، حدود اور حفظ حدود، حقوق تمام تر احکامات شرعیہ، حدود تمام تر اتباع سنت، حفظ حدود تمام تر طریقت۔ بس ان تین باتوں کا حق ادا کرنا مسلمان کے لیے حصول مقام عبدیت کا ذریعہ ہے راہ رو یعنی مسافر کو سفر میں تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آدمی کسی منزل تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ایک مقصد ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعے سے مقصود تک پہنچ سکتا ہے اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس سے راستہ نظر آتا ہے۔ شریعت ان تین چیزوں کا مجموعہ ہے یہ آنکھیں بھی ہیں راستہ اسی کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ رحمت ہے کہ مقصود بھی اس سے حاصل ہوتا ہے شریعت کے پانچ اجزا ہیں

منجملہ موانع طریق سلوک کے دو امر خاص ہیں جو اس قدر کثیر الوقوع ہیں کہ شاید ہی کوئی سالک ان میں مبتلا ہونے سے بچا ہو۔ بلکہ اہل علم بھی ان میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بعض امور غیر اختیاری کی تحصیل کی فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے ذوق و شوق و استغراق و لذت و یکسوئی و رفع خطرات و وساوس و انجذاب و عشق طبعی و امثالہا اور ان امور کی ذکر و شغل و مجاہدہ کے ثمرات سمجھ جاتے ہیں اور ان کے حاصل نہ ہونے کو حرمان سمجھتے ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ بعض امور غیر اختیاریہ کے ازالہ کے اہتمام میں لگ جاتے ہیں۔ جیسے قبض و ہجوم خطرات اور دل نہ لگنا یا کسی آدمی یا مال کی طبعی محبت یا شہوت یا غضب طبعی کا غلبہ یا قلب میں رقت نہ ہونا یا کسی دنیوی غم غلبہ یا کسی دنیوی خوف کا غلبہ۔

جب کوئی طالب اصلاح اپنے کسی مرض کا علاج پوچھتا ہے تو حضرت سب سے پہلے

یہ سوال فرماتے کہ یہ اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔

حضرت فرماتے کہ یہ اختیاری اور غیر اختیاری کا مسئلہ گویا نصف سلوک ہے بلکہ قریب ترین سارا سلوک ہے حقیقت یہ ہے کہ جتنے ظاہری و باطنی اعمال جن کا تعلق اوامر نواہی سے ہے سب اختیاری ہیں اور فرض واجب ہیں۔ ہر شخص اس کا مکلف ہے لیکن ان اعمال کے جتنے تاثرات و انفعالات ہیں۔ خواہ خطرات وساوس ہوں یا قبض و بسط یا وجد انبساط و کیفیات سب غیر اختیاری ہیں اور غیر مکلف ہیں اور نہ وہ مکلف ہیں۔ اور نہ ہی ان پر کوئی مواخذہ ہے۔ زیادہ زور اختیاری اور غیر اختیاری فعل میں امتیاز قائم کرنے پر دیتے ہیں اس میں عقلی اور طبعی۔ اعمال اور احوال، افعال اور انفعال مقصود اور غیر مقصود شامل ہیں۔ مولانا اس بات کا بار بار اعادہ کرتے ہیں کہ زیادہ تر ذہنی امراض اختیاری اور غیر اختیاری میں فرق نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں جب فرد غیر معقول رویہ کو معقول سمجھ کر یا معقول رویہ کو غیر معقول سمجھ لیتا ہے۔ پھر اس رویہ کے لیے جو جد وجہد کرتا ہے۔ وہ بیکار جاتی ہے۔ یہ کوشش رائیگاں جس سے کامیابی دور بھاگتی ہے ناکامی اور مایوسی کو جنم دیتی ہے جس کی وجہ سے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے۔ اور جب یہ بوجھ دیر تک قائم رہے تو فرد ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ بعض افراد امور غیر اختیاریہ کی تحصیل کی فکر میں پڑ جاتے ہیں اور ان کے حاصل نہ ہونے کو حرمان سمجھتے ہیں۔ بعض امور غیر اختیاریہ کے ازالہ کے اہتمام میں لگ جاتے ہیں اور اس کا عملی نقصان یہ ہے کہ جب یہ امور اختیاری نہیں تو کوشش کرنے سے حاصل نہ ہوں گے اور نہ زائل ہوں گے۔ یہ تحصیل و ازالہ کے لیے کوشش کرے گا۔ جب کامیابی نہ ہوگی تو روز بروز پریشانی ہی بڑھے گی۔ پھر اس پریشانی کے نتیجہ کے طور پہ مندرجہ ذیل افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔

۱۔ پریشانی کے تواتر سے کبھی بیمار ہو جاتا ہے۔ پھر بیماری میں بہت سے ادوار و طاعات سے محروم رہ جاتا ہے۔

۲۔ پریشانی و غم کے غلبہ سے بعض اوقات اخلاق میں تنگی ہو جاتی ہے اور دوسرے کو اس سے اذیت پہنچتی ہے۔

۳۔ غم و فکر کے غلبہ سے بعض اوقات اہل و عیال یا دیگر اہل حق کے حقوق میں کوتاہی ہونے

لگتی ہے اور معصیت تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔

۴۔ کبھی پریشانی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ مقصود سے مایوس ہوکر خودکشی کرلیتا ہے ۔

۵۔ کبھی مایوس ہوکر اعمال و طاعات کو بیکار سمجھ کر سب چھوڑ دیتا ہے ۔

۶۔ کبھی شیخ سے بداعتماد ہوجاتا ہے کہ مقصود کا راستہ خود انہیں معلوم نہیں ۔

۷۔ پھر کبھی حق تعالیٰ سے ناراض ہوجاتا ہے کہ ہم اتنی جدوجہد کر رہے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی ۔

صحیح بات یہ ہے کہ جس چیز کی تحصیل اختیار میں نہیں اس کے ازالہ کا بھی اختیار نہیں ۔ وسوسے لانا اختیاری عمل ہے ۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیئے ۔ لیکن وسوسے آنا غیر اختیاری ہے اس کی کچھ پرواہ نہ کی جائے ۔ انسان عقلی امور کا مکلف ہے ۔ کیونکہ وہ اختیاری ہیں اور طبعی امور کا مکلف نہیں کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں ۔ اعمال مقصود ہیں ۔ احوال مقصود نہیں کیونکہ اعمال اختیاری اور احوال غیر اختیاری ہیں ۔ اسی طرح افعال اختیاری اور انفعال غیر اختیاری ہیں ۔

تربیت السالک میں بہت سے افراد کی کیس ہسٹری درج ہے لوگ اپنے مسائل و الجھنیں بیان کرتے ہیں اور نفس معالج ان کا حل بتاتا ہے ۔ بعض کو کتب پڑھنے کی تلقین کرتا ہے اور یہ معاملہ ظاہرہ رو برو کا نہیں ہے ۔ سالک کو معالج سے عقیدت ہے ۔ دونوں ایک ہی خدائے واحد اور رسول کے ماننے والے ہیں اس لیے اسے اپنے مرشد کی تحریر میں مکالمہ (   ) نظر آتا ہے مریض سوال کرتا ہے ، معالج تحریر کے ذریعے جواب دیتا ہے اور وہ اس تحریر کو اس طرح لیتا ہے جیسے کہ مرشد نے بنفس نفیس خود ہی اس بات یا کام کی ہدایت کر رہا ہے ۔ اس کو تحریر میں اپنے مسائل کا حل نظر آتا ہے ۔ غیر معقول رویہ کی شناخت ہوتی ہے اور اس سے چھٹکارا پانے کا راستہ نظر آتا ہے ۔ اس طرح صحت حاصل ہوتی ہے ۔

نظریہ شخصیت

انسان کیا ہے ؟ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ انسان کس چیز کا نام ہے ، مختلف ماہرین نے ہر زمانہ میں تحقیق کا دعوا کیا ۔ کسی نے کہا انسان بدن کا نام ہے کسی نے کہا روح کا نام ہے ۔ انسان بہت سے اوصاف کا مالک ہے ۔ جب انسان کہتا ہے کہ " میں ایسا ہوں میں کیا کرسکتا ہوں یا میں نے یہ کام کیا اس " میں " یا " ہم " میں مکمل انسان کی نمائندگی ہوتی

ہے۔ جو مرکب ہے روح، قلب، نفس اور جسم کا۔ فرد اپنی شخصیت سے پہچانا جاتا ہے۔ شخصیت فرد کی مکمل اکائی کا نام ہے جس میں ظاہر و باطن دونوں شامل ہیں۔ ارث اپنی جگہ اور ماحول اپنی جگہ، بچہ بہت سے اوصاف اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ ان میں کچھ اوصاف ایسے ہوتے ہیں جو تمام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، کچھ بچے میں انفرادی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ان سب پیدائشی خصوصیات کو ارث کہا جاتا ہے۔ خارجی دنیا میں ماحول اپنا اثر دکھاتا ہے داخلی اور خارجی پہلوؤں میں یک رنگی، یک جہتی یا یوں کہہ لیجئے گسٹالٹ بنانے کے لیے ایک اور قوت کارفرما ہوتی ہے۔ اس قوت میں روحانیت کا دخل ہوتا ہے، یہی انسان کی تخلیقی قوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھی سی مٹی کے ایک پتلے میں روح پھونکی اور انسان سامنے آیا جب انسان کو زمین پر بھیجا گیا تو آدم بن گیا۔ اس دنیا میں پہلا تہذیب یافتہ انسان آدم علیہ السلام ہیں۔

حدیث رسولؐ ہے ”جسم انسانی میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو سارا جسم درست ہو گیا۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑا“ سو وہ ”قلب“ ہے جسم کی درستی کے لیے عضویاتی قلب کی درستگی ضروری قرار دی گئی ہے۔ اس گوشت کے ٹکڑے کے علاوہ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور قوت ہے اس کو بھی قلب کا نام دیا جاتا ہے۔ آسانی کے لیے روحانی قلب کہہ لیجئے، ر سمجھ لیں۔ اس کی نشوونما شخصیت کی نشوونما میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ غزالی کے نزدیک قلب، روح، نفس اور عقل، قلب ہی کے زیر اثر ہیں، یہ سب قوتیں جن کا منبع دراصل قلب ہے ایک ساتھ ایک نہج پر پروان چڑھتی ہیں تو شخصیت کی صحیح تعمیر ہوتی ہے۔

انسان دس اجزا سے مرکب ہے پانچ مادی اور پانچ غیر مادی۔ مادی اجزا میں عناصر اربعہ اور نفس شامل ہیں۔ غیر مادی اجزا قلب، روح، سر، خفی، اخفی ہیں۔ ان غیر مادی مجرد اجزا کو لطائف خمسہ کہا جاتا ہے۔ بعض صوفیا نے اپنی اصطلاح میں نفس کو بھی شامل کیا ہے اور اس مجموعہ کو لطائف ستہ کہا ہے۔ یہ اصطلاح عوام و خواص میں مشہور ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں کہ نفس کو لطائف میں شامل کرنا بوجہ اس کے مادی ہونے کے تغلیباً ہے۔ مادی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ مادہ اس کا جزو ہو۔ جیسے بدن انسانی۔ دوسرے یہ کہ خود مادہ حلول کر رہا ہو۔ یہاں پر نفس کو دوسرے معنوں میں مادی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ نفس جو قوت داعیہ الی الشہوت منبسع فی جمیع البدن ہے لہٰذا

مادی ہے ۔

نفس کا لفظ نفاست یا پھر تنفس سے ہے۔ کسی شخص کی ذات کو اس کا نفس کہتے ہیں۔ علامہ ابوالقاسم نے "روضی الانفس" میں لکھا ہے کہ روح اور نفس ایک ہی واحد شے ہے۔ فرق صرف اوصاف کی وجہ سے ہے۔ جو چیز فرشتہ ماں کے پیٹ میں پھونکتا ہے روح ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے کسب اخلاق و اوصاف حمیدہ یا زمیمہ کرتا ہے۔ بدن سے عشق و محبت پیدا کر لیتا ہے۔ اور مصالح بدن میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر لفظ نفس بولا جاتا ہے نفس اور روح کے درمیان فرق باعتبار صفات کے لیے ہے نہ کہ باعتبار ذات کے لیے۔ پس نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے وہ کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہ وہ خواہش خیر کی ہو یا شر کی۔ انسان نفس کے قبضہ میں نہیں بلکہ نفس انسان کے قبضہ میں ہے۔

بچہ سلیم فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ معصوم ہوتا ہے۔ ماحول اس میں اچھائی، برائی نیک و بد کے اثرات اجاگر کرتا ہے۔ نفس کا نام مطمئنہ ہے۔ یہ درجہ اطمینان نفس کا ہے۔ اس میں سکون کامل یا تام پیدا ہو جاتا ہے۔ درجہ ثانی میں لوامہ ہے۔ یہ غیر کامل و غیر تام ہے۔ کش مکش ہے۔ درجہ ثالثہ میں امارہ بالسوء ہے یہ عدم سکون (مطلقاً) ہے۔ نفس مطمئنہ امور خیر میں مقاومت تو نہیں کرتا لیکن وساوس و خطرات پیش آجاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کے ہر عضو کو کمال بخشا ہے۔ اگر وہ کمال حاصل نہ ہو تو اسے بے چینی اور اضطراب رہتا ہے۔ مثلاً آنکھ کا کام دیکھنے پر ہے اور کان کا کمال سننے پر، جب ان اعضا کے وہ قوی سلب ہو جائیں جن سے کمالات وابستہ تھے، تو ان کے جاتے رہنے سے کمی اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے قلب کا کمال قلب کا سرور، عیش اور اس کی لذت و شگفتگی حق تعالےٰ کی معرفت پر، اس کی محبت و انابت پر اور اس کی طرف شوق اور توجہ پر ہے جب قلب اس دولت سے محروم ہو جاتا ہے تو سخت عذاب اور بے چینی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جیسے آنکھ اپنا نور کھو کر اور زبان اپنی گویائی کھو کر۔

جب شک سے یقین کی طرف، جہالت سے یقین کی طرف، غفلت سے ذکر، گناہوں سے توبہ کی طرف، ریا سے خلوص، جھوٹ سے سچ کی طرف، سستی سے چستی کی طرف، غرور سے عاجزی کی طرف اکڑ سے فروتنی کی طرف اور بے عملی سے عمل کی طرف آ کر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے تو روح کو چین مل جاتا

ہے۔ ان تمام باتوں کی بنیاد یکی اور خود آگہی پر ہے۔

نظریہ ذہنی امراض

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا، اپنا نائب بنایا، علم سکھایا، اس کو دنیا میں اپنی عبادت اور تسخیر کائنات کے لیے بھیجا۔ فرد جسم اور روح کا مرکب ہے۔ فرد، کائنات اور خدا ایک ہی عمل کے حصے ہیں۔ انسان کا انسان سے، انسان اور فطرت کا فاصلہ دراصل مترادف ہے انسان اور خدا سے دوری کا، یہ بعد امراض ذہنی کا پیش رو ہے۔

ذات میں مکمل یک جہتی، یک رنگی، قول و فعل میں ہم آہنگی ذہنی صحت کی علامت ہے۔ وہ شخص جو اللہ کے احکام کو صدق دل سے مانتا ہے وہ اپنی ذات، دیگر افراد اور خلق خدا سے خائف نہ ہوگا۔ دنیا میں رہنے والے بندوں سے محبت کرے گا ان کا برا نہیں چاہے گا۔ اس کو اپنی ذات پر اعتماد ہوگا۔ اس اعتماد کے لیے یقین کی ضرورت ہے اور یقین عقیدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدہ خدا کی وحدت سے شخصیت کی وحدت اور کائنات میں رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ راز و نیاز، گفتگو (   ) کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے قرب، ذہنی صحت اور اللہ تعالیٰ سے دوری ذہنی امراض کا سبب ہے۔

قرب کے مختلف درجات ہیں۔ ایک قرب تو حقیقی ہے۔ جس کا ترجمہ "ملنا" کیا جاتا ہے یا ادراک، حقیقت یا اس کے ہم معنی جس لفظ سے چاہیں کر لیں۔ سو حق تعالیٰ کے ساتھ حقیقی قرب تو کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حق تعالیٰ جسم و مکاں سے پاک ہے۔ لامتناہی کو متناہی محیط نہیں کر سکتا۔ دوسرے قرب کا تعلق خصوصیت سے ہے۔ جیسے اردو میں ہم کبھی یوں کہتے ہیں کہ "میں پاس ہوں کہو کیا کہتا ہے"؟ یعنی میں سن رہا ہوں۔ اس میں پاس ہونے سے قرب علمی اور قرب سماع کا بیان مقصود ہے۔ کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے قریب ہے۔ یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ تم دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ اللہ کے قریب کون لوگ ہوتے ہیں؟ وہ ہیں "ہاں! اگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے"

اللہ تعالیٰ سے قرب کے ذرائع ایمان اور عمل صالح ہیں۔ قرب نام ہے کامل ایمان عمل صالح اور باکمال دین کا۔ خصوصاً جب وہ اس طبیعت کا حامل بن جائے کہ دینی زندگی اور دینی احکام کی اطاعت طبیعت میں راسخ ہو جائے، زندگی کی ہر حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع رغبت و پسند ہو اور ادا کرنے کو جی چاہے جو خدا اور رسولؐ کو پسند ہو اور اس کی مرضی ہو۔ علم اور عمل اور حال

کا جمع کرنا طریقہ ہے قرب و رضا کا ۔

ذہنی امراض کو باطنی امراض بھی کہا جاتا ہے ۔ انہیں قوت عقلیہ، شہویہ اور غضبیہ کے افراط و تفریط والے درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) جزیرہ (۲) سفاہت (۳) فجور (۴) جمود (۵) تہور اور (۶) جبن۔ ان میں جہل، غرور و نخوت، حسد، ریا، حرص، طمع، شک، امل اور وسواس وغیرہ شامل ہیں ۔

ان بیماریوں کا بنیادی سبب انسان کا اپنے رب، کائنات اور اپنی ذات سے فرار ہے اس فرار میں ماحول کا بہت عمل دخل ہے ۔ اگر بچے کی نشوونما فطری طور پر نہ کی جائے تو وہ اپنے اندر مستقل طور پر ایک طرح کا خلا محسوس کرتا ہے اور اگر معاشرہ اس خلا کو پر کرنے کے لیے صحت مندانہ ذرائع فراہم نہیں کرتا تو پھر منفی رجحانات پروان چڑھتے ہیں نیت میں فتور آ جاتا ہے اخلاص ختم ہو جاتا ہے اور فرد اس قسم کی بیہودہ حرکات ظاہر کرتا ہے کہ اس کا یا تو اپنے آپ کو بہت کمتر یا پھر کسی ملک کا حکمران سمجھنا، دنیا سے الگ تھلگ ہو جانا یا پھر دنیا کا ہی ہو جانا، خوراک و لباس سے بیزاری، دوسروں کو اپنا دشمن سمجھنا اپنے آپ کو سب سے زیادہ نیک سمجھنا یا پھر سب سے بڑا گنہگار گرداننا ۔ اس کے علاوہ بے چینی بے یقینی اور بے حسی کی علامتیں بھی ذہنی امراض کی غمازی کرتی ہیں ۔

نیت : دل کا ایسی چیز کی طرف مائل ہو جانا جس کو اپنی غرض و نفع کے موافق سمجھتا ہے ۔ نیت کہتے ہیں اور اس کے معنی ارادہ و قصد کے ہیں ۔ ہر کام کے لیے پہلے علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد و ارادہ ہوتا ہے ۔ اس کے بعد بھی ہاتھ پاؤں ہلانے اور کام کرنے کی قدرت پیدا ہو گی ۔ اس طرح وہ عزم اور پختہ میلان جس نے ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ کیا نیت کہلاتا ہے ۔ رسول پاکؐ کا ارشاد ہے ۔

حق تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے ۔ لیکن تمہاری نیتوں اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں ”

اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی و رضا کی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کی آمیزش نہ ہونے دینا اخلاص ہے ۔ اخلاص کے وجوداً و عدماً تین درجے

ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیح کا قصد ہو۔ یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو۔ یہ اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔ تیسرے یہ کہ غایت صحیح یا غایت فاسدہ کچھ بھی قصد نہ ہو۔ بلکہ یونہی معمول کے مطابق ایک کام کر لیا جائے اس کو اخلاص سے اتنا بعد نہیں جتنا دوسرے درجے کو ہے۔ نیت میں خلوص ذہنی صحت اور نیت میں فتور عدم اخلاص اور ذہنی بیماری کی علامت ہے۔

دوسرے مسلمان مفکرین کی طرح مولانا اشرف علی تھانوی ذہنی امراض کی بات اخلاق کی نسبت سے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں" اخلاق کے تین اصول ہیں۔ اصل میں تین قوتیں ہیں جن سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) قوت عقلیہ (۲) قوت شہویہ (۳) قوت غضبیہ۔

بھلائی اور برائی کو سمجھنے کے لیے چاہے وہ دنیوی ہو یا دینی دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک وہ قوت جس سے منفعت و مضرت کو سمجھے وہ قوت "مدرک عقلیہ" ہے اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے۔ یہ "قوت شہویہ" کا کام ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دافعہ "قوت غضبیہ" ہے۔ پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے تین درجے ہیں۔

الف ۔ افراط ۔ تفریط ۔ اعتدال

قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ مانے۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل وسفہ (کمینہ پن) تک اتر آئے۔ اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حلال وحرام کی بھی تمیز نہ رہے۔ بیوی، ماں، اور بہن سب برابر ہو جائیں اور ایک درجہ تفریط یعنی ایسا پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے یا مال کا ایسا حریص ہو کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے یا ایسا زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دے۔ قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا بن جائے اور تفریط یہ ہے کہ ایسی نرم طبیعت کا مالک ہو کہ کوئی جوتے بھی مارے یا دین کو برا بھلا کہے تب بھی غصہ نہ آئے۔ گویا کہ جذبات کا وجود نہ ہو۔

قوت عقلیہ کے افراط کا درجہ "جربزہ" اور تفریط کا درجہ "جمود" ہے قوت غضبیہ کا درجہ

افراط "تہور" اور حد سے گھٹا ہوا درجہ "جبن" ہے۔ یہ سب ذہنی بیماری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قوت عقلیہ کے اعتدال کا درجہ "حکمت"، قوت شہویہ کا "عفت" اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا درجہ "شجاعت" کہلاتا ہے۔ یہ اعتدال کا درجہ ذہنی صحت کی علامت ہے۔

یہ نو چیزیں تمام اخلاق حسنہ وسیئہ کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں تین درجے اعتدال کے یعنی حکمت عفت اور شجاعت کے مجموعے کا نام عدالت ہے۔ باقی سب رزائل ہیں۔ انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہے۔ یوں تو رزائل فطری محرکات بھی نفس کی ساخت میں شامل ہیں۔ لیکن جب تک وہ ان رزائل کو قوت سے عمل میں نہ لائے اور ان کا ظہور بذریعہ صدور اعمال نہ ہو کوئی مواخذہ نہیں۔

جس طرح امراض جسمانی میں مختلف درجات ہوتے ہیں اسی طرح امراض نفس (ذہنی امراض) میں درجات ہیں۔ ذہنی امراض کیونکہ اخلاق زمیمہ میں شمار ہوتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ان کو انسان کی ہلاکت کا سبب بتایا۔ ان کو گناہ کہا جاتا ہے۔ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ ہوتے ہیں۔ مولانا اس فرق کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ ایک مثال سے برائی کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں "اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تیرے چھپر میں چنگاری لگ گئی ہے تو کیا وہاں یہ تحقیق کی جائے گی کہ چنگاری چھوٹی ہے یا بڑی۔ یہ گناہ کی حقیقت ہے اور گناہ مضر ہے"

میں انسان کا "اختیاری و غیر اختیاری" کا پوری طرح شعور نہ ہونا عام طور پہ ذہنی مرض کا سبب بنتا ہے۔ لوگ نامعقول رویے سے امور غیر اختیاری کی تحصیل کی فکر یا ازالہ کا اہتمام کرتے ہیں اور امور اختیاری کے لیے عمل کی جگہ صرف سوچ کو دخل دیتے ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نزدیک ذہنی بیماریوں کا سب سے بڑا سبب غلط سوچ اور نامعقول رویہ ہے۔ اختیاری اور غیر اختیاری کو عقلی اور طبعی، اعمال و احوال، افعال و انفعال اور مقصود و غیر مقصود کے عنوان کے تحت بھی بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک ذہنی الجھن کا سبب بعض اوقات اختیاری اور غیر اختیاری افعال میں تمیز نہ کر سکنا ہے۔ کبھی فرق کو سمجھتے ہوئے طبعی کو عقلی اور مقصود کو غیر مقصود بنانے پر زور دینے کی وجہ سے بھی فرد ذہنی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کے طریقہ نفسی علاج کو دو واضح اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ علاج بذریعہ مطالعہ کتب

۲۔ علاج بذریعہ صحبت (اس میں انفرادی اور گروہی دونوں طریقے شامل ہیں)

مولانا تھانوی نفسی طریقہ علاج بذریعہ صحبت میں انفرادی گروہی دونوں طریقے اختیار کرتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے جو عام طور سے ماہرین کے ہاں نہیں پائی جاتی لیکن جب ہم روس میں نفسی طبی طریقہ علاج کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر ایسے نفسی طریقہ علاج کے ماہرین نظر آتے ہیں جو انفرادی و گروہی طریقہ علاج بیک وقت عمل میں لاتے ہیں۔ ایک روسی ماہر نفسی طب کا کہنا ہے کہ مشاہدے کے ذریعے یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ بعض ذہنی مریضوں کے لیے انفرادی اور گروہی دونوں طریقے علاج کو عمل میں لانا ضروری ہوتا ہے مولانا اشرف علی تھانوی اپنے طریقہ علاج میں جدید نفسی طریقہ علاج کے ان مستند اصولوں کو بروئے کار لاتے تھے جن کا احساس اکثر مغربی مفکرین کو بھی اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ نفس طریقہ علاج کی کامیابی کے لیے معالج اور مریض میں باہمی اعتماد کی ضرورت ہے۔ معالج اور مریض کا ایک دوسرے کو سمجھنا کسی ایک عقیدے پر قائم ہونا اور پھر مریض کا یہ احساس کہ معالج میرا علاج کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ تمام عوامل مولانا کے ہاں نظر آتے ہیں مریض کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے وہ اس کے ماحول کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ مرض کی نوعیت کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر اس تشخیص کی بنا پر علاج کا طریقہ وضع کرتے ہیں اور اس سبب کے لیے مریض کو پہلے ہی ہدایت کے بارے میں بتلا دیتے ہیں جو ان کے خیال میں مریض کو صحت یابی تک درکار ہے۔

ساتھ ساتھ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ طریقہ علاج میں الفاظ کے اظہار کے ذریعے جب مریض سے کوئی بات کہتے ہیں تو اس اعتماد اور شدت کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ الفاظ مریض کے لیے مہیج کا کام دیتے ہیں۔

مغربی مفکرین نے اب تک جو تجربات کیے ہیں ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ذہنی مریضوں کے علاج میں الفاظ بطور مہیج کے علامت کی شکل میں فرد کی شخصیت کو متاثر کرتے ہیں روسی ماہرین کا کہنا ہے کہ الفاظ کے ذریعے عضویاتی تبدیلیاں آتی ہیں اور اس عضویاتی تبدیلی کی وجہ سے فرد شفایاب ہو سکتا ہے۔ یہ بات کس حد تک صحیح ہے ابھی تحقیق جاری ہے لیکن یہ طے شدہ

حقیقت ہے کہ الفاظ سے تبدیلی آتی ہے اب اگر الفاظ ادا کرنے والی شخصیت مریض کی نظر میں قابل احترام اور علم کا منبع ہو وہ اس کو اپنا روحانی پیشوا سمجھتا ہو تو اسی کے الفاظ اس کے لیے دوا کی حیثیت رکھیں گے یہاں اگر اس بات کا ذکر کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کتب کا مطالعہ فرد کو پریشانیوں سے چھٹکارا دلاتا ہے لیکن کبھی کسی ذہنی خلفشار کا بھی سبب بنتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ کتب کے انتخاب کا کام بھی معالج پر چھوڑ دیا جائے اب معالج چاہے تو اپنے الفاظ سے علاج کرے یا پھر مریض کی استعداد کو دیکھتے ہوئے کتب کے مطالعہ کی ہدایت کرے یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا تھانوی کے علاج بذریعہ صحبت میں بھی کتب کا مطالعہ شامل ہے گویا کہ مولانا کا طریقۂ علاج ایک ایسا جامع جدید اور عصری طریقہ علاج ہے جس میں فرد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھا جاتا ہے اور ان پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر وہ طریقۂ اختیار کیا جاتا ہے جس سے فرد کی اصلاح ہو سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خاص طور پر زیادہ تر بالواسطہ طریقۂ اختیار کیا جاتا ہے بعض مریض کی شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے کبھی کبھی اس کی بلاواسطہ طور پر بھی راہنمائی کی جاتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اپنی کتاب "حکیم الامت" میں بلاواسطہ طریقۂ علاج کی بہت سی مثالیں بیان کی ہیں۔

یہاں علاج کے لیے رجوع کرنے والوں کو بتایا جاتا ہے کہ مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ معالج سے عقیدت رکھتا ہو۔ اس کے طریقۂ علاج کو بہتر سمجھتا ہو اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کو تیار ہو۔ مولانا اپنے بارے میں بتاتے ہیں جو خدا کی نعمت مجھ کو حاصل ہے اس کو بیان کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تربیت باطن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فہم عطا فرمائی ہے۔ اس رائے میں بہت کم غلطی ہے اور اکثر جو مجھ کو بتایا جاتا ہے وہ صحیح ہوتا ہے اور نافع ہوتا ہے یہ سب حضرت حاجی صاحب کی دعاؤں اور توجہات کی برکت ہے" پھر اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

"میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف، نہ صاحب تعریف اور نہ عامل، صرف اللہ اور رسول کے احکام سے مطلع کرتا رہتا ہوں۔ اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا اور نہ اپنی حالت تعلیم اور امور دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہو جاتا ہوں۔ اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین خود سیکھنا اور اولاد

کو تعلیم دلوانا ہر شخص پر فرض عین ہے خواہ بذریعہ کتب ہو یا بذریعہ صحبت " ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کوئی مقصود ہو جب تک اس کے حاصل کرنے کے لیے صحیح ذرائع اختیار نہ کیے جائیں مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ میں طریق میں تہذیب اخلاق کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں۔ جب اخلاق درست ہو جاتے ہیں تو اعمال خود بخود درست ہو جاتے ہیں کوئی ذکر و شغل کرتا ہو تو مجھے اس وقت تک قدر نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے اخلاق و اعمال درست نہ ہوں۔ ذکر و شغل میں تو مزہ آتا ہے نہ کرے تو چین نہ آئے عمل تو وہ ہے جس میں نفس پر تنگی ہو پھر رضائے حق حاصل کرنے کے لیے اس عمل کو اختیار کرے۔ اس طرح چاہے خود اپنے اوپر تکلیف اٹھائے۔ مگر دوسرے کے حقوق ضرور ادا کرتا رہے۔ مجھ کو کسی اور بات کا اتنا اہتمام نہیں جس قدر تہذیب و اخلاق و دیانت کا ہے کیونکہ درس و تدریس کا اہتمام تو ہر جگہ ہوتا ہے لیکن اخلاق کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں ہے کہتے ہیں کہ مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے۔ افعال اور حقوق کا۔

وہ سالک کو بتاتے ہیں کہ ان کے طریقۂ علاج کی نوعیت کیا ہے کیا طریقہ ہے اور اس علاج میں سالک، معالج سے کیا توقعات وابستہ کر سکتا ہے طریقۂ علاج کو " سلوک " کا نام دیتے ہیں اور خلاصہ سلوک یوں بیان کرتے ہیں۔

۱- اس میں کشف، کرامات ضروری نہیں۔

۲- نہ قیامت میں بخشوانے کی ذمہ داری ہے۔

۳- نہ دنیا کی کاربرآری کا وعدہ ہے کہ تعویذ گنڈوں سے کام بن جائیں یا مقدمات دعا سے فتح ہو جائیں یا روزگار میں ترقی ہو۔

۴- جھاڑ پھونک سے بیماری جاتی رہے یا ہونے والی بات سے پہلے ہی بتلا دی جائے۔

۵- نہ تصرفات لازم ہیں کہ پیر کی توجہ سے مرید کی از خود اصلاح ہو جائے۔ اس کو گناہ کا خیال بھی نہ آئے۔ خود بخود عبادت کے کام ہوتے رہیں۔

۶- نہ ارادے کے بغیر کام ہو جائیں۔

۷- نہ باطنی کیفیات پیدا ہونے کی معیار ہے کہ ہر وقت یا عبادت کے وقت لذت سے سرشار رہے۔ یہاں مرید کو واضح طور پر بتایا جا رہا ہے کہ جھاڑ پھونک سے بیماری دور کرنے کی ذمہ داری

نہیں لی جا رہی بلکہ اصلاح مرض میں مریض کے اپنے ارادے کا دخل ہے۔ ماہر کا کام راہنمائی کرنا۔ ہدایات دینا اور دوران گفتگو مریض کے خیالات کو واضح کرنے کے لیے ان کو منعکس کرنا ہے یہاں فرد کی ذہنی استعداد کا خیال رکھا جاتا ہے اور بالواسطہ انفرادی و اجتماعی دونوں ہی طریقہ ہائے کار اختیار کیے جاتے ہیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس میں ہر قسم کی جبلتیں موجود ہوتی ہیں۔ تعمیری و تخریبی، اچھی و بری بچے کی پیدائش کے وقت ان قوتوں میں یک جہتی ہوتی ہے۔ جھکاؤ کسی ایک قوت کی طرف نہیں ہوتا دنیا کا ماحول ان قوتوں کا رخ موڑتا ہے افراد میں انفرادی اختلافات ہوتے ہیں اس لیے رخ موڑنے یا کسی ایک طرف کے جھکاؤ کے لیے مختلف نوعیت اور شدت ڈوگری۔ کے معاشرتی پیچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشرف علی تھانویؒ بچپن کی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ فرد کی شخصیت کو کردار کا عکس بتاتے اور اس کے لیے صحیح تعلیم کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں بچپن کی تربیت میں سب سے پہلا فرد جس سے بچے کا واسطہ پڑتا ہے ماں ہے۔ ماں کے کردار کا بچے کی شخصیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔ ذہنی امراض کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ زیادہ تر خرابیاں بچپن میں ہوتی ہیں اور کیونکہ بچپن میں سب سے زیادہ تعلق ماں سے ہوتا ہے اس لیے ماں کی تربیت کے لیے بہشتی زیور لکھا۔ جو ایک جامع اور مکمل اصولوں کی کتاب ہے۔ اس میں جسمانی اور ذہنی دونوں خرابیوں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اور ان کا علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا طریقہ علاج بذریعہ مطالعہ کتب ہیں ان تمام باتوں کا کسی نہ کسی شکل میں ذکر آتا ہے۔ یہ طریقہ علاج کیا ہے؟

علاج بذریعہ مطالعہ کتب

مولانا یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اپنے معمولی مسائل کے لیے اپنا وقت اور پیسے خرچ کر کے تھانہ بھون آئیں۔ اس لیے انہوں نے علاج بذریعہ مطالعہ کتب اختیار کیا یہ طریقہ علاج اس اصول پہ بنایا گیا کہ فرد اپنے معمولی مسائل کا حل ان مسائل سے متعلق کتب کے مطالعے سے ڈھونڈ سکتا ہے۔

یہ طریقہ علاج مغرب کے طریقہ علاج B illio Hteralpey سے ملتا جلتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ معالج کے عقیدے پر اعتماد رکھتا

ہو۔ دوسرے اس کو خاص طور پر اسی مطلب کے لیے لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کو کہا جاتا ہے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کے ذمہ کچھ کام بھی لگائے جاتے ہیں اور یہ امید کی جاتی ہے کہ اس طرح اس کی سوچ اور عمل میں ہم آہنگی آئے گی۔ ایک ماہر طبی نفس نے اپنی تحقیق میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ الفاظ کی بہت اہمیت ہے اور یہ دیکھا گیا ہے بعض اوقات الفاظ کے ذریعے مریض صحتیاب ہو جاتا ہے اور برملا اس بات کا اظہار کرتا ہے۔

مولانا اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ پہلے سالک اپنے مریض کی حالت لکھ کر بھیجے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کیا واقعی مرض کا وجود ہے؟ اگر وجود ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے جہاں وہ سالک سے مرض کی حالت لکھنے کو کہتے تھے ساتھ ایک تیار شدہ سوالنامہ بھی بھیجتے تھے اس سوالنامے کے ذریعے وہ سالک سے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرتے تھے۔ سالک کے مرض کی لکھی ہوئی حالت پڑھنے کے بعد اگر وہ سمجھتے تھے کہ پوری معلومات حاصل نہیں ہو سکیں ہیں تو پھر وہ بعد کی وضاحت کے لیے سالک سے مطلوبہ معلومات حاصل کرتے تھے وہ سالک کو تاکید کرتے تھے کہ اپنے مسائل کو واضح اور مکمل طور پر تحریر کرے۔ وہ یہ بھی بتاتے کہ اس نے اپنے اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے اور ان میں کس حد تک کامیابی یا ناکامی ہوئی ہے۔ وہ کہتے تھے۔ مدعا بیان کرتے وقت سیدھی سچی بات بیان کی جائے۔ مسائل کی واضح طور پر نشاندہی کی جائے یہ بھی بتایا جائے کہ مسئلہ سالک کی نظر میں کتنا شدید ہے۔

ان تمام معلومات کو حاصل کر کے مولانا سالک کے مرض کی تشخیص کر کے اور اس کی نوعیت معلوم کر کے اور اگر یہ سمجھتے کہ مرض زیادہ شدید نہیں ہے تو اس مرض کے لیے علاج بذریعہ مطالعہ کتب کا طریقہ اختیار کرتے اس کو مختلف کتب کے نام لکھ دیتے کہ ان کو پڑھو اور ان میں لکھی ہوئی باتوں پر عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ شفا دے گا۔ اس سلسلے میں مولانا نے کوئی آٹھ سو چھوٹی بڑی کتب تحریر کیں۔ ان کتابوں میں لاتعداد مسائل کا ذکر اور ان کے ممکنہ حل بیان کرتے ہوئے تین سطح پر زبان کا استعمال کیا گیا۔

مشکل مسائل کے لیے مشکل زبان، درمیانی مسائل کے لیے کچھ آسان زبان اور عام مسائل کے لیے جن کا فرد کو روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے آسان زبان میں تحریر کیا۔ وہ اپنی تجویز کردہ کتب کے

علاوہ دوسرے مسلمان مفکروں کی کتب کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے اس سلسلے میں امام غزالی کی تحریر کردہ کتب "کیمیا سعادت" کا اکثر ذکر آتا ہے ۔

یہ طریقہ علاج دراصل سالک کے وقت اور پیسے کو بچانے کے لیے اختیار کیا گیا لیکن دیکھا یہ گیا کہ بعد میں سامنے آنے والے دو طریقہ ہائے علاج Bibliotherapy میں کافی حد تک Writing therapy کے اصول پر کام کیا مثلاً Writing therapy والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مریض اپنی مشکلات کو تحریری شکل میں آسانی سے بیان کر دیتا ہے ۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر روبرو بات چیت میں مریض ابتدا میں گھبراتا ہے اور وہ سب کچھ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے جو کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا ۔ اس طرح اس کی اندرونی کیفیات معلوم کرنے کے لیے Rapport کی ضرورت پڑتی ہے اس کے برعکس وہ تمام باتیں جو اس کے ذہن میں ہوتی ہیں وہ تحریری شکل میں واضح اور آزادانہ طور پر بیان کر دیتا ہے اپنے مسائل لکھتے وقت اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کو ٹوکنے اور برا بھلا کہنے کے لیے موجود نہیں ہے اکثر مریض اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنی پریشانیاں اور الجھنوں کو زبانی بتانے کی بجائے تحریر کے ذریعے اظہار کرنے میں آسانی محسوس کرتے ہیں جب مریض کو اپنے مسائل بیان کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو اسے کچھ ہدایات بھی دی جاتی ہیں جن کا خیال رکھنا رائٹنگ تھیوری کے خالق فلپ ضروری سمجھتے ہیں ۔ وہ ہدایات کچھ اس طرح ہیں ۔

۱۔ معالج سے کہا جاتا ہے کہ وہ تحریری سیشن کا وقت اس طرح مقرر کرے جس طرح عام تھراپی کا وقت مقرر کرتا ہے ۔

۲۔ مریض کو آزادانہ طور پر اپنی خواہشات اور مسائل لکھنے دیا جائے لیکن جہاں کہیں وہ اٹک جائے اس کو اس طرح مختلف عنوانات بتائے جائیں یا اشارات دیئے جائیں کہ وہ پھر لکھنا شروع کر دے ۔

۳۔ سیشن کا دورانیہ ایک گھنٹہ یا جتنا وقت مریض اور معالج بہتر سمجھیں پہلے سے مقرر کر دیا جائے ۔

۴۔ مریض سے کہا جائے کہ وہ کوشش کرے کہ مسائل کی واضح نشان دہی ہو جائے۔

۵۔ ایسے الفاظ اور جملوں کے نیچے نشان لگا دیئے جائیں جو معالج کی نظر میں مریض کو مرض کی تہہ تک لے جا سکتے ہیں۔

۶۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جذباتی مسائل اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ فرد کو زندگی میں اپنے جذبات کے اظہار کی مناسب وقت پر پوری آزادی نہیں ملی ہے نتیجہ کے طور پر اس کے اندر جذباتی گھٹن ہے۔ اس گھٹن کو دور کرنے کے لیے سوچ کی تبدیلی کی ضرورت ہے یہاں عمل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے معالج عمل پر زور دے۔

۷۔ اگر مریض کی اصلاح ہو رہی ہو یا کردار میں مثبت تبدیلی آ رہی ہو تو مریض کو اس بات کا احساس دلا کر ایک قسم کا انعام دیا جائے۔

۸۔ مریض کو واضح مقاصد سامنے رکھنے کا مشورہ دیا جائے۔

۹۔ اگر مریض کی رپورٹ نامکمل نظر آئے تو پھر اس سے کہا جائے کہ مثالوں کے ذریعے اس بات کو بیان کرو۔ اور پھر اس کے بیان کو سامنے رکھ کر معالج اور مریض دونوں بات کو آگے بڑھائیں یہ بات سامنے رہے کہ پریشان لوگ واقعات اور حقائق کو گڈمڈ کر دیتے ہیں یا پھر توڑ موڑ دیتے ہیں۔ اصل نتائج حاصل کرنے کے لیے ان کی تہہ تک جانا ضروری ہے۔

۱۰۔ اگر مریض کی کسی بات سے اختلاف ہو تو اختلاف کرنے میں جھجک محسوس نہ کی جائے لیکن اختلاف کرتے وقت دلائل کا سہارا لیا جائے اور مریض کو عقلی دلائل سے قائل کیا جائے۔ اس کو بتایا جائے۔

۱) مسائل کو تحریر میں لانے کا عمل دراصل آپ کے ذاتی، سماجی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

۲) اب جو کچھ لکھ کر دیں گے وہ صیغہ راز میں رہے گا۔

۳) آپ اپنا مدعا واضح، مکمل اور بے تکلف انداز میں تحریر کریں۔ باہمی اعتماد ہر حال میں قائم رہنا چاہیئے۔

۴۔ مریض کو کچھ مخصوص ہدایات بھی دی جاتی ہیں۔

الف) اپنا مدعا مکمل طور پر بیان کریں اپنے بارے میں لپنے خیالات اپنے مشاہدات اور لپنے مسائل کی واضح طور پر نشاندہی کریں۔ ان مسائل میں چھوٹی چھوٹی مشکلات بھی بیان کریں۔

ب) اس میں مطالعہ کی عادت، انہماک امتحانات کے بارے میں تشویشناک بھی بیان کریں۔ طلباء کی مشکلات اساتذہ کی مشکلات اور اپنے خاندان کی مشکلات اس میں شامل ہیں۔

ج) یہ سوچیں اور تحریر کریں کہ آپ نے ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے کون کون سے طریقے کامیابی اور ناکامی کے ساتھ اختیار کیے۔

د) کسی مشکل کو رپورٹ کرنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری نہیں کہ وہ کتنی معمولی یا شدید ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ تم اپنے نفس کا ایک عیب ظاہر کرو مجھ سے اس کا علاج پوچھو اور جو کچھ بتلاؤں اس پر عمل کرکے اطلاع کرو۔

مولانا ابتدا میں کتاب پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی کام کرنے کی تلقین کرتے تھے ایک جگہ سالک کو ہدایت کرتے ہیں۔

۱۔ تربیت السالک کا مطالعہ کرو۔
۲۔ میرے پاس بیٹھنے کے لیے کوئی وقت نکالو۔
۳۔ افعال اختیاری کے لیے اپنے ارادہ وہمت سے کام لو۔

جب تک سالک کا کتابوں میں دل لگے اور تعلیم اپنا اثر دکھائے۔ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رکھا جائے نہیں تو سالک کو اختیار ہے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دے۔ لیکن شرط ہے کہ وہ مولانا کو اس بات کی اطلاع ضرور کرے وہ کہتے تھے کہ غذا اور دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی ہوتا ہے اور خود غذا یا دوا کی قوت تاثیر کے لیے شرائط بھی ہوتی ہیں۔ ان شرائط کا خیال رکھے اپنے زیادہ جاننے والے کو خصوصی طور پر اپنے مربی اور مصلح کو حقیقت واقع سے مطلع کرکے اس سے فیصلہ کرایا جائے یہی علاج ہے۔

علاج بذریعہ صحبت

پیچیدہ الجھنوں اور نفسی امراض کے لیے مولانا سالک کو خانقاہ امدادیہ آنے کی دعوت دیتے ہیں مختلف ذرائع سے سالک کی اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرکے اور پھر اس کی بیماری کی نوعیت

کے بارے میں ایک رائے قائم کر کے مولانا پہلے سے یہ اندازہ لگاتے تھے کہ یہ شخص کتنے دنوں میں صحت یاب ہو جائے گا۔ علاج کے لیے رائے کا یقین کرنے کے بعد مولانا سالک کو اس بات سے مطلع بھی کرتے تھے مثال کے طور پر ایک سالک کے سائل کو سمجھنے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ سالک کا علاج محبت کے بغیر نہیں ہو سکتا وہ اس کو لکھتے ہیں۔

حالت موجودہ میں کم از کم ایک مہینہ کے لیے آپ کا آنا مصلحت ہے۔ بعض امور کے لیے قرب جسمانی کی ضرورت ہے،،

علاج یا اصلاح نفس کے لیے آنے والوں کے لیے ایک سوالنامہ بھی تیار کیا گیا تھا جس میں نام وطن، کس مقام سے آنا ہوا اور اس میں کتنا قیام رہا۔ شغل و وجہ معاش و موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں۔ اردو، عربی، انگریزی میں علمی استعداد کس قدر ہے۔ اصل مقصد آنے کا کیا ہے؟ محض ملاقات یا کچھ کہنا، لکھ کر دینا یا زبانی اور مجمع میں بات کرنی ہے یا تنہائی میں کسی کے بیعت ہیں یا نہیں اور کس سے ؟

اگر مجھ سے بیعت ہیں تو کتنا زمانہ ہوا اور تعلیم کس سے متعلق ہے؟ کیا میرے مواعظ اور رسائل دیکھتے ہیں ؟

مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں اگر ہے تو لکھا جائے کہ کتنا قیام ہو گا۔ کہاں قیام ہو گا۔ ؟

خانقاہ میں پہلی مرتبہ آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا؟

یہاں کے انتظام و طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں ؟

باہر والا اعلان قلمی دیکھ لیا ہے یا نہیں ؟

خانقاہ امدادیہ میں ایک اصول نظم و ضبط قائم تھا۔ دوسروں کی سہولت اور اپنی راحت کے لیے حکیم الامت نے خانقاہ میں اپنے نظام الاوقات کو واضح طور پر بیان کیا ہوا تھا۔

صبح بارہ بجے تک متفرق ایسے کام جن میں تنہائی کی ضرورت ہے اس وقت کسی سے ملنے اور بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی۔

اس اہتمام کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کو دوسرے افراد کے وقت کی اہمیت

کا کس قدر احساس تھا کیونکہ وہ ایسے افراد کو جو نئے نئے آئے ہوں اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتے ہوں یا جا رہے ہوں اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتے ہوں یا پھر ایسا شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہ مل سکتی ہو ان کو مولانا سے ان اوقات میں بھی ملاقات کی اجازت تھی جب کہ باقی دوسرے افراد کے لیے لائحہ عمل یہ تھا کہ ظہر کی نماز کے بعد ملاقات کریں۔ مولانا کے الفاظ میں۔

جب میں ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک آنے بیٹھنے اور ہر قسم کی بات چیت کی عام اجازت ہے۔

ساتھ ہی ساتھ مولانا کو اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ جس کا سالک عام مجلس میں اظہار نہیں کر سکتا اور اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اسے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے لائحہ عمل میں اس کی گنجائش رکھی ہے اور تنہائی میں ملاقات کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔ مولانا کے الفاظ میں ”اگر کسی نے تنہائی میں بات چیت کرنی ہو تو سہ دری کی دیوار میں لگے ہوئے بکس میں پرچہ ڈال دے جواب مل جائے گا۔

یہاں پر مولانا سالک کو پرچہ ڈالنے کے بعد گومگو کی حالت میں نہیں رکھنا چاہتے اور اس کو ذہنی طور پر ملاقات کے لیے تیار بھی کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

”عام طور پر مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں“

کیونکہ مولانا کے نفسی طریقہ علاج کی بنیاد دین فطرت پر ہے۔ اس لیے مولانا کے ہاں حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کا بھی پوری طرح خیال رکھا جاتا تھا۔ فرائض میں نماز کا درجہ سب سے افضل ہے ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ خدا اور رسولؐ پر صدق دل سے ایمان لانے کے بعد پانچ وقت کی نماز ادا کرے۔ مولانا نماز کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ خانقاہ امدادیہ میں پانچوں وقت نماز کی امامت خود کرتے تھے۔ نفسی علاج میں نماز کی اہمیت مسلمہ ہے۔ نماز میں سالک نیت اور عمل دونوں طرح سے لامحدود قوت خدا کے سامنے اس کی شان ربوبیت بیان کرتے ہوئے اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس کو راہ مستقیم پر چلائے۔ حال ہی میں سعودی عرب کے طائف ہسپتال میں

Pragan

Group therapy کا طریقہ ذہنی مریضوں پر آزمایا گیا. جس کے نتائج ہسپتال کے مہتمم کے مطابق کافی حوصلہ افزا نکلے.

نماز کی امامت کے علاوہ مولانا دوپہر کو درس دیتے اور اس درس میں مختلف مسائل اور الجھنوں کا حل بتاتے. جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے کہ مولانا مختلف ذرائع سے خانقاہ امدادیہ میں اصلاح نفس کے لیے آنے والوں کے مسائل الجھنوں کے موضوع پر درس دیتے اور درس کے دوران مسائل اور الجھنوں کی نوعیت ان کے اسباب و تدارک کے طریقے بتاتے.

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک گروپ ہے جس کا ایک قائد ہے. گروپ اور قائد ایک ہی عقیدے کے ماننے والے ہیں. گروپ کے تمام ممبران قائد کی بات غور سے سنتے ہیں اپنے دوسرے گروپ کے ممبران سے ملتے ہیں. محفلیں سجتی ہیں ذکر و شغل میں مشغول ہوتے ہیں. مراقبے میں جاتے ہیں اور اس طرح اپنے دکھ درد آپس میں بانٹتے ہیں. مولانا سالک کے ذہن میں مختلف طریقوں سے اس بات کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان صفت اختیار کا ہونا قطعی ہے جب یہ بات ہے تو اپنی اصلاح کرنے میں بھی صفت اختیار کر کے استعمال کرنا چاہیے جب تک یہ نہیں کرے گا اصلاح ممکن نہیں. شیخ راہ بتائے گا مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ گھسیٹ کر لے چلے گا. شیخ کی دعا اور برکت کو بھی اگرچہ اصلاح میں دخل ہے مگر اس کا درجہ متعین کرنا چاہیے. مثال دیتے کہ بچہ سبق نہ یاد کرے تو سبق کیسے یاد ہوگا. استاد سبق کو آسانی سے یاد کرنے کا ماحول فراہم کر دے گا. پیار و محبت سے بچے سبق یاد کرنے پر راغب کر سکتا ہے. مگر پھر بھی پڑھنا بچے ہی کو پڑے گا. اس طرح شیخ کی برکت معین ہے مگر کافی نہیں اس کا دخل تو دخل اعانت ہے. دخل کفایت نہیں.

مولانا معالجہ میں مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں. شروع میں کچھ دن تو خانقاہ امدادیہ میں آنے والے عصر کی نماز کے بعد ہونے والی مجلس میں شریک ہوتے مولانا کسی موضوع پر وعظ کہتے "وعظ" ایک روحانی مطلب ہے. یعنی باطنی اصلاح کی تدبیروں کا نام ہے جس سے باطنی امراض کا علاج ہوتا ہے مولانا لوگوں کو بتاتے ہیں کہ وعظ سننے کی غرضیں مختلف ہوتی ہیں. بعض لوگ محض رسم کے طور پر وعظ سنتے ہیں بعض برکت کی چیز کے طور پر بعض کی نیت یہ ہوتی ہے کہ شریک ہو کر اتنی دیر گناہ سے بچے رہیں گے. مگر وعظ کی جو اصل غایت ہے وہاں تک لوگوں کی نظر ہی نہیں اور اس

اصل غرض کا حاصل امراض روحانی کا مطالعہ ہے یعنی اپنے امراض کو غور سے دیکھنا اور اس کی تدبیر کرنا ۔ اگر یہ نیت پہلے سے نہ کی ہو تو اب کر لینی چاہیئے ۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ " ہم نے اپنے کلام کو اس لیے نازل کیا ہے کہ اس پہ غور کریں اور اس پر عمل کریں ۔"

مولانا سالک کو سب سے پہلے امید کی راہ دکھاتے ہیں ۔ طالب حالق کی کیسی ابتر اندیشناک اور مایوس کن حالت ہو حضرت ہمیشہ اس کو امید افزا امداد اشفاق فرماتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ہر مرض کا علاج ہے مگر علاج کے لیے ارادے کی بڑی ضرورت ہے ۔ صحت کے لیے ہمت کی ضرورت ہے ہمت بغیر خلوص کے بیکار ہے ۔ کہتے ہیں کہ ہمت و خلوص بس یہ دو چیزیں سارے تصوف کا حاصل ہیں ۔ کیونکہ اگر ہمت نہ ہوگی تو عمل نہ ہوگا ۔ اور اگر خلوص نہ ہو تو عمل ناقص ہوگا ۔ اور اخلاص و ہمت کے معنی استیعاب ہے کی مختلف صورتیں ہیں جو صورت شیخ تجویز کر دے اس پر عمل کرنا چاہیئے ۔

ہماری یہ حالت ہے کہ ہم تدبیر نہیں کرتے سوچتے نہیں ۔ ذہن میں تکرار نہیں کرتے حالانکہ دیکھا جائے کہ اگر کبھی مرض ہو جائے تو دوا بار بار پی جاتی ہے ۔ وعظ کو تھوڑا ہی سنا جائے ۔ اس کو یاد کیا جائے اور اس کا ذہن میں تکرار و اعادہ کیا جائے تو جو سنا جائے گا ۔ ضرور یاد رہے گا ۔ پھر عمل کا اہتمام کیا جائے تو اس طریقے سے دو چار وعظ میں پوری اصلاح ہو سکتی ہے ۔

سالک کے لیے ضروری ہے کہ وعظ کو سنے ۔ سوچے ، یاد کرے ، خیال کیا کرے ، قصد کرے نیت کرے ، اور پھر عمل بھی کرے ۔ تو اس کو نفع ہوگا ۔ نیت فعل اختیاری ہے اس کو درست کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے لیے حدیث نفسی یعنی (خود کلامی) ضروری ہے اس میں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ حدیث النفس پر کوئی مواخذہ نہیں ۔ حدیث میں ہے " اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لیے ان خیالات سے تجاوز فرمایا ہے جن کو وہ اپنے جی سے باتیں کرتے ہیں جب تک کہ ان کو منہ سے نہ نکالیں یا ان کو عمل میں نہ لائیں ۔"

عزیزی نے کہا ہے کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ان کے سینہ میں جو وسوسے پیدا ہوں اور حنفی نے کہا کہ خیال کے پانچ مراتب ہیں

الف) جس : پس جب کوئی بات قلب میں ابتداً واقع ہوتی ہے اور اس سے نفس میں کوئی حرکت نہیں ۔

ب) خاطر: اگر وہ نفس میں دورہ کرنے لگے یعنی وقوع ابتدائی کے بعد اس کے نفس میں آمد و رفت ہونے لگے مگر اس کے کرنے نہ کرنے کا منصوبہ نفس نے نہ باندھا ہو اس کو خاطر کہتے ہیں۔

ج) حدیث النفس: جب نفس کرنے کا برابر درجہ میں منصوبہ باندھنے لگے اور جب ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوتی اس کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

سو یہ تین درجے ایسے ہیں کہ ان پر نہ عتاب ہے اگر یہ شر میں ہیں اور نہ ثواب ہے اور اگر خیر میں ہے۔ پھر جب اس فعل کو کر لیا تب اس فعل پر عتاب یا ثواب ہوگا۔

د) ہم: پھر جب نفس میں فعل یا عدم فعل کا منصوبہ ترجیح فعل کے ساتھ ہونے لگا لیکن وہ ترجیح قوی نہیں بلکہ مرجوح ہے جیسا وہم ہوتا ہے اس کو "ہم" کہتے ہیں اگر خیر میں ہے تو اس کا ثواب ہوتا ہے اور اگر شر میں ہے تو عتاب۔

و) عزم: پھر جب فعل کا رجحان قوی ہو گیا یہاں تک عزم صمیم بن گیا ترک پر قابو نہ رہا۔ اس کو عزم کہتے ہیں اس پر ثواب و عذاب ہے۔

مولانا کہتے ہیں کہ لفظ وسوسہ کے پہلے تین درجے یا مرتبے ہیں جن میں ہاجس خاطر اور حدیث النفس سے مواخذہ نہ ہونا تو صحیح حدیث سے ثابت ہے۔

اس سے پہلے دو درجے ہاجس و خاطر مواخذہ سے بالا ہونے چاہییں گویا کہ اصل عمل حدیث النفس سے شروع ہوتا ہے۔ حدیث النفس جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے نفس کے اس عمل کا نام ہے۔ جہاں نفس کرنے نہ کرنے کا برابر درجے میں منصوبہ باندھتا ہے اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں ہوتی اس کے بعد ہی عمل کا درجہ آتا ہے۔

اس سے جو بات واضح ہوتی ہے اور جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں وہ یہ ہے کہ مولانا کے ہاں نیت اور عمل دونوں کی اہمیت ہے نیت صاف ہو لیکن عمل ندارد ہو یا پھر عمل ہو لیکن خلوص کی جگہ چکر یا دھوکہ ہو تو دونوں ہی حالت میں شخصیت میں عدم استحکام ہوتا ہے اور مولانا کا نفس طریقہ علاج اور عدم استحکام کو دور کرنے کا نام ہے۔ مولانا علاج بذریعہ کتب اور علاج بذریعہ صحبت دونوں میں ماحول کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ حدیث ہے "برے ساتھی سے تنہائی بہتر ہے" خانقاہ امدادیہ میں تمام کے تمام آنے والے نیکی کی نیت سے آتے تھے۔ ان میں گروپ بنتا تھا

وہ نیک ساتھی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں ایک قسم کی کمیونٹی تھی جو اپنے روزمرہ کا کام بھی کرتے تھے۔ وعظ بھی سنتے تھے اور اگر ضرورت محسوس کرتے تو انفرادی طور پر شیخ سے گفتگو کرتے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے۔ اگر وہ مجاہدہ کی شکل اختیار کرنے کو کہتا تو اس پر عمل کرتے۔

اگرچہ سالک کو اس بات کی پوری آزادی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی وقت بھی علاج کے سلسلے کو منقطع کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کو بتایا جاتا تھا کہ اس علاج میں یہ ضروری نہیں کہ پہلی نصیحت یا دوسری نصیحت سے فائدہ ظاہر ہونے لگے اور فائدہ ظاہر نہ ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ یہ نصیحت بے کار گئی ہے وہ بتاتے تھے کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابتدائی کچھ سیشن میں سالک نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو علاج کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس طرح یہ سیشن بیکار نہیں جاتے بلکہ سالک اور مرشد کے درمیان رابطے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نصیحت بے کار نہیں جاتی اس سے نفع ہوتا ہے اور وہ نفع کی استعداد پیدا کرنے کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس عمل کو ہم بیان کر سکتے ہیں کہ پہلی نصیحت نے نفع کی استعداد پیدا کی۔ سالک کے شعور کو اجاگر کیا اس کو بیماری اور اس کے علاج کا احساس دلایا۔ دوسری نصیحت نے اس استعداد کو اور قوی کیا گویا کہ سالک کو اپنی صلاحیتوں کا احساس ہوا۔ تیسری نصیحت نے اس استعداد کو ظاہر بھی کر دیا۔ یعنی اس درجے پر سالک کو نہ صرف خود آگاہی ہوئی بلکہ اس نے خود آگاہی کے ساتھ عمل بھی شامل کیا گویا نفع مجموعہ مرکب سے ہوا۔ اب ہم اس تمام عمل کو مختلف درجوں سے الگ الگ تقسیم نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ مجموعہ کا ہر جز مؤثر ہوتا ہے اور نتیجہ ایک کل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے شفاء بتدریج ہوتی ہے۔

جب مولانا یہ سمجھتے ہیں اور سالک اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند سمجھ رہا ہے تو وہ آئندہ کے لیے سالک کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ بات یاد رکھو کہ خطرات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو تمہارے آگے کھڑے ہیں دوسرے وہ جن کے تم پیچھے پڑے ہو اس میں فرق محسوس کرو۔ وسواس و خطرات اگر آتے ہیں تو ان کو آنے دو۔ ڈانٹ نہ لگاؤ کیونکہ یہ دباؤ تمہیں پریشان کر دے گا۔ یہ دباؤ ذہنی بیماری کا سبب بھی بن سکتا ہے، لیکن وسواس

خطرات کو خود نہ بلاؤ ان کو شعوری طور پر زیادہ اہمیت نہ دو نہیں تو پھر وہ تم پر مسلط ہو جائیں گے۔ پھر چھٹکارا حاصل بھی کرنا چاہو گے تو آزاد نہ ہو سکو گے اس لیے ہمیشہ اپنے اندر وسیع القلبی قائم رکھو۔ امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو۔ انشاء اللہ بیماری تمہیں دوبارہ تنگ نہیں کریگی

مولانا اپنے طریقۂ علاج کو حرفِ آخر نہیں سمجھتے بلکہ ایک جاری و ساری اجتہادی محل کا درجہ دیتے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

> اول تو ہر زمانہ کی تحقیقات جدا ہوتی ہیں پھر ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کتابیات

مولانا اشرف علی تھانویؒ	البدائع۔	کتب خانہ جمیلی - لاہور
〃	التکشف	سجاد پبلشرز لاہور
〃	بوادر النوادر	شیخ غلام علی اینڈ سنز
〃	تربیت السالک	ادارہ اسلامیات لاہور
〃	شریعت و طریقت	ادارہ اسلامیات لاہور
عبد الماجد دریا آبادی	حکیم الامت	ایم شمس الدین۔ لاہور
ڈاکٹر محمد عبد الحی	تاثر حکیم الامت	سعید اینڈ کمپنی کراچی

حکیم الامت حضرت تھانویؒ

اور

حبِ رسول ﷺ

حضرت مولانا ڈاکٹر حافظ محمد یونس صاحب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ومحبت مومن کا گراں بہا سرمایہ ہے اور کسی مومن کا دل اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی عشق ومحبت معبودِ حقیقی کے قرب اور اس کی ذات وصفات کے صحیح تصور کا واحد ذریعہ ہے صحابہ کرامؓ بڑے خوش قسمت تھے کہ سب سے زیادہ یہ سرمایہ ان کے حصے میں آیا تھا۔ ان کے سامنے حضورؐ کی وہ حسین صورت بھی تھی جس کے ایک ایک نقش اور خد وخال میں جمال سیرت کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور حسن سیرت کی جلوہ آرائی بھی تھی۔ حضورؐ کی نشست وبرخاست، انداز گفتگو، صدق وامانت، اپنے بیگانے سے بے پناہ ہمدردی تکالیف ومصائب میں غیر معمولی تحمل، غرض کمال انسانیت کا ایک خوب صورت پیکر تھا۔ جو اپنی ہر ادا کی دلکشی کے ساتھ رات دن دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور لوگ بن بلائے بھی اس حسن کی کرشمہ سازیوں کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ غرض حبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین نمونے ہمیں صحابہ کرامؓ کی زندگی میں ملتے ہیں ان کا یہ حال تھا کہ حضورؐ پر اپنی جان تک قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے ان کے دل حضورؐ کی محبت سے لبریز تھے جس کا اظہار وہ ہر حال میں کرتے تھے۔

صحابہؓ کرام کے بعد اب تک ایسے کروڑہا محبان رسول پیدا ہوئے جو زندگی میں حضور نبی کریمؐ کی زیارت سے مشرف تو نہ ہو سکے لیکن ان نادیدہ عاشقوں نے حضورؐ کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت کا اظہار ہر رنگ میں کیا۔ کسی نے اپنے سارے دانت نکلوا دیے کہ پتہ نہیں حضورؐ کے کون سے دندانِ مبارک شہید ہوئے ہیں اور حضورؐ ان کے بغیر کیسے خورد ونوش فرماتے تھے۔ کسی نے نعت لکھ کر اپنے جذبات کی تسکین کی اور اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا، کسی نے حضورؐ کے نقش کفِ پا کو سر آنکھوں سے لگا کر راحت محسوس کی۔ کسی نے قصیدوں

کے واسطے دے کر حضورؐ کی خدمت میں اپنے دکھڑے پیش کیے کسی نے حضورؐ کی سیرت طیبہ کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی عقیدت کا اظہار کر دیا۔ کسی نے حضورؐ کی حسن صورت کا نقشہ کھینچ کر اپنے دل و جان کو سکون بخشا۔ کسی نے حضورؐ کی محبت و عشق میں گھل گھل کر جان دے دی۔ کوئی حضورؐ کے روضۂ انور کی زیارت کو ترستا خلد بریں میں جا پہنچا۔ کوئی ہوا کو خطاب کرتے کرتے کہ "نسیماں جانب بطحا گذر کن زاحوالم محمدؐ را خبر کن" کا پیغام دیتے دیتے دل ہی دل میں حسرت لیے رخصت ہو گیا۔

کوئی مدینے کی ہواؤں کو اپنے لیے راحت جان سمجھتا رہا۔ "پھر آنے لگیں شہر محبت کی ہوائیں" کوئی مدینے کی گلیوں کے نثار ہوتا رہا۔ "اے خاک مدینہ تیری گلیوں کے تصدق" کسی نے حضورؐ کے خاک پائے اقدس کو اپنی آنکھوں کا نور سمجھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ کوئی "مدینے میں میری جاں نکلے" کی حسرت دل میں لیے دفن ہو گیا۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر آئمہ اور علماءؒ نے منظوم نذرانۂ محبت و عقیدت پیش کیا۔ عربی، اردو اور فارسی میں مسلم شعراء نے حضورؐ سے عشق کے لازوال نغمے تخلیق کیے اور نعت کے ایسے ایسے لعل و گہر پیش کیے جن کی مثال دنیا کا ذخیرۂ شعر و ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مولانا رومؒ، مولانا جامیؒ، شیخ فریدالدین عطارؒ، امیر خسروؒ، امیر مینائیؒ، حاجی امداد اللہؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا حبیب صدیقیؒ اور علامہ اقبالؒ ایسی بلند پایہ ہستیوں نے بارگاہ رسالت میں محبت و عقیدت کے ایسے نذرانے اور نعت کے ایسے سدا بہار پھول پیش کیے جن کے جام جانفزا سے عاشقان رسول قیامت تک سرور و کیف میں ڈوبے رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل حب رسولؐ یہی ہے کہ اپنی زندگی کو اسوۂ رسولؐ کے تابع بنا دے۔ کسی معاملے میں اپنی رائے اور ارادے کو باقی نہ رکھے۔ اس کے پیش نظر ہر وقت یہ بات ہو کہ حضور اقدسؐ کا عمل کیا تھا اور حکم کیا تھا۔ محض زبان سے عشق و محبت کے دعوے کرنا اور عمل سے اس کی نفی کرنا کسی صورت عشق و محبت رسولؐ نہیں کہلا سکتا۔

حکیم الامت حضرت الشاہ مولانا محمد اشرف تھانویؒ بھی ان محبان رسول میں شامل تھے۔ جن کے رگ و ریشے میں حب رسولؐ رچی بسی تھی۔ ان کی وضع قطع، شکل و شباہت، لباس، رہن سہن، معمولات، تحریریں اور انداز بیان سے ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی لگاؤ نمایاں تھا زندگی بھر حدیث رسولؐ اور سنت رسولؐ کی ہر نوع خدمت کی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت تھانوی ہمیشہ فرماتے تھے کہ حدیث "ما علیہ و اصحابی" میں ما عام ہے۔ عقائد، لباس، وضع قطع وغیرہ سب امور کو شامل ہے کہ فرقہ ناجیہ وہ ہے جو سب امور

میں حضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے طرز پر ہو۔"

حضرتؒ کی نگاہ میں وہی لوگ پسندیدہ تھے جو کسی نہ کسی رنگ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام سے مشابہت اور قلبی تعلق رکھتے تھے۔ آپ کثرت کے ساتھ حضورؐ کو یاد کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔

من احب شیئاً اکثر ذکرہ (جو کسی چیز سے محبت رکھتا ہے وہ اس کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔)

اس لیے جن کو خدا اور رسولؐ سے محبت ہو تو اگر ہر بات میں وہی یاد آویں تو کیا عجب ہے۔ صحابہ کرامؓ کی یہ حالت تھی کہ بات بات میں حضورؐ کا تذکرہ آجاتا تھا۔ حضرت ہندؓ بن ابن ابی ہالہ کی نسبت حدیث شریف میں ہے

کان وصافاً لرسول اللہ (کثرت سے وہ رسول اللہؐ کی صفات بیان کیا کرتے تھے۔)

دیکھو مثلاً ہم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے سلسلے میں ہیں اس سے اگر ذرا سا بھی بہانہ مل جائے تو اس سلسلے کے بزرگوں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور پھر اس کے قطع کرنے کو جی نہیں چاہتا یہ محض محبت کے سبب ہے۔"(۱)

آپ یہ اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے۔ (۲)

دید مجنوں را یکے صحرا نورد   در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم   می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیست ایں   می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ مے کنم   خاطر خود را تسلی مے کنم

(کسی شخص نے مجنوں کو جنگل میں دیکھا کہ وہ تن تنہا غمگین بیٹھا ریت پر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔ اس نے پوچھا اے مجنوں! یہ کیا سوداپن ہے؟ تو کس لیے ریت پر لکیریں کھینچ رہا ہے مجنوں نے کہا لیلیٰ کے نام کی مشق کر کے دل کو تسلی دے رہا ہوں۔)

یعنی اگر وہ چیز میسر نہیں تو نام ہی سہی۔ جب نفسیاتی کیفیت کی یہ حالت ہے اور ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کی محبت کا یہ اثر ہے تو جن لوگوں کو رسول اللہؐ کی محبت نصیب ہے ان کی کیا حالت ہوگی۔

ا۔ مفتی محمد حسنؒ، الکلام الحسن، ص ۱۲۶، قسط نہم

۱۔ مواعظ عید میلاد النبیؐ، مولانا تھانوی۔ ص ۱۵، ۲۔ ایضاً ص ۱۶

۳۔ مواعظ عید میلاد النبیؐ، مولانا تھانوی۔ ص ۱۶

اس لیے ہم تو حضورؐ کو یاد کر کے دلی سکون اور قلبی اطمینان حاصل کرتے ہیں (۳) حقیقت یہ ہے کہ محبت کا تعلق دل سے ہے اور دل پر کسی کو قابو اور اختیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے حبک الشیئ یعمی ویصمّ (کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور گونگا بنا دے گی)

حضرت تھانویؒ ہر چیز میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کیا کرتے تھے۔ اس کی اصل وجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا وہ بے مثال تعلق اور لاجواب والہانہ عشق اور حیرت انگیز محبت تھی جو ان کو حضور اقدسؐ کی اتباع پر مجبور کرتی تھی۔

حضرت تھانویؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحیح معنوں میں محب تھے۔ یوں تو آپؒ کی سینکڑوں کتابیں اس بات کی غماز ہیں لیکن آپ کی کتاب "نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم" خصوصاً اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کتاب حُبِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سلسلے کا شاہکار ہے اس میں کتالیس فصول ہیں اس کتاب کا ایک ایک لفظ عشق رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ خود لکھتے ہیں۔

"ایک بندہ سیدِ ابرار صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا پیاسا، عاشقانِ نبی مختار و محبانِ حبیب پروردگار کی خدمت میں عرض پیرا ہے کہ ایک مدت سے بہت سے احباب کی فرمائش تھی کہ حضور پر نورؐ کے کچھ حالات صحیح روایات سے تحریر کیے جائیں کہ اگر کوئی متبعِ سنت بغرض ازدیاد محبت آپ کے ذکر مبارک سے شوق اور رغبت کرے تو وہ اس مجموعہ کو غور سے پڑھ سکے۔ (۱)

اس سے آگے لکھتے ہیں۔

> "اس مجموعے کو تحریر کرنے کا میرا مقصد یہ ہے کہ سنت کے طریق کے مطابق محبت زیادہ کرنے کا یہ ذریعہ بن جائے۔" (۲)

خود ہی فرماتے ہیں۔

> "نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حالات کے ذکر کرنے سے سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ اس سے معرفت حاصل ہوگی۔ اور جب معرفت حاصل ہوگی تو پھر محبت پیدا ہوگی۔ اور جب محبت پیدا ہوگی تو قیامت کے دن حضورؐ کی معیت اور شفاعت کی امیدیں ہوں گی اس لیے

۱۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صہ ۷ ، ۲۔ ایضاً صہ ۸ ، ۳۔ ایضاً صہ ۹

> اس رسالے سے بے شمار منافع اور ہر قسم کی بھلائیوں کی توقع ہے۔" (۱)

حضرت تھانویؒ نے جس عقیدت و محبت اور خلوص کے جذبے کے تحت نشر الطیب لکھی ہے اس سے ان کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ چونکہ اس میں حضور نبی کریمؐ کا ذکر خیر ہے۔ اس لیے اس کی برکات کے سبب ہر قسم کی رنج و بلا اور مصائب سے نجات مل جائے گی۔ چنانچہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

> "اس کتاب کو تحریر کرنے پر زیادہ آمادگی اس وجہ سے ہوئی کہ آج کل ظاہری فتنوں جیسے طاعون، زلزلہ اور گرانی و تشویشات مختلف کے حوادث سے عام لوگ اور فتن باطنی جیسے شیوع بدعات والحاد و کثرت فسق و فجور سے خاص لوگ پریشان خاطر اور مشوش رہتے ہیں، ایسے آفات کے اوقات میں علماء امت ہمیشہ معجزات اور تکثیر سلام و صلوٰۃ سے توسل کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف کے ختم کا معمول اور حصن حصین کی تالیف اور قصیدہ بردہ کی تصنیف کی وجہ مشہور و معروف ہے۔" (۲)
>
> میرے قلب پر بھی یہ بات وارد ہوئی کہ اس رسالہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و روایات بھی ہوں گے جا بجا اس میں درود شریف بھی لکھا ہوگا۔ پڑھنے سننے والے بھی اس کی کثرت کریں گے۔ کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ ان تشویشات سے نجات دیں۔" (۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کے نزدیک بلیات و مصائب اور غم واندوہ اور پریشانیوں سے نجات کا ایک ذریعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس کا ذکر جمیل ہے۔ اپنے اس بیان کے ثبوت کے لیے حضرت ایک حدیث پاک نقل فرماتے ہیں جس کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے کہ:۔

> حضرت ابی بن کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ پر کثرت سے درود بھیجتا ہوں۔ آپ فرما دیجئے میں کس قدر درود شریف کا معمول رکھوں۔ حضورؐ نے فرمایا جس قدر چاہو۔ میں نے عرض کیا کہ ایک چوتھائی۔ آپؐ نے فرمایا جو چاہو اگر اور بڑھاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نصف (یعنی اگر کل وقت وظیفہ کا تین گھنٹے ہو تو ڈیڑھ گھنٹہ) آپؐ

۱۔ نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب صہ ۸ ۲۔ ایضاً

۳۔ نشر الطیب فی ذکر الحبیب، مولانا تھانویؒ، صہ ۲۱۳ پانچویں روایت

> نے فرمایا جو چاہو اور اگر اور بڑھاؤ تو تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ دو ثلث۔ تو آپؐ نے فرمایا جو چاہو اور اگر زیادہ کرو تو اور بھی بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تمام وظیفہ درود ہی کو کروں گا۔ یعنی پورا وقت اسی کو دوں گا تو آپؐ نے فرمایا اس صورت میں تمہارے تمام فکر و غم اور تکالیف دور ہو جائیں گی۔ اور تمہارے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔" (۱)

جو بے اندازہ انعامات اور بے حد حساب برکات درود و سلام سے حاصل ہوتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے صلوٰۃ و سلام کے بعض تصورات سے ایمان میں قوت روح میں لطائف اور قلب میں فرحت پیدا ہوتی ہے بلکہ درود ہمیشہ مقبول ہی ہوگا کیونکہ یہ اللہ مجدہ کا اپنا وظیفہ ہے وہ خود پڑھتا ہے اور خود ہی قبول کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور ہمیں درود خوانی کا ثواب تو محض اللہ کریم کی ہاں میں ہاں ملانے سے بالکل ہی مفت حاصل ہوتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

> "درود نامنظور، نامقبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ تو سراسر فعل الٰہی ہے اور ہم تو محض فعل اللہ جیسے تاکیدی کلمات کہنے والے اور اللہ جل شانہٗ کی ہاں میں ہاں ملانے والے ہیں۔" (۲)

درود سلام سے حضورؐ کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔ اور جوں جوں اس مرکزِ نور تک رسائی حاصل ہوتی جائے گی قلب و روح کا تزکیہ ہوتا جائے گا۔ اور روشنی ملتی جائے گی۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

> "اسی وجہ سے احقر درود شریف کی کثرت کو وظائف سے ترجیح دیتا ہے اور اس کو اطمینان کے ساتھ مقاصد دارین کے لیے زیادہ نافع سمجھتا ہے۔" (۳)

"درود شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ۔ مجھے جب توفیق ہوتی ہے تو یہ درود شریف پڑھتا ہوں کیونکہ یہ باوجود اختصار صلوٰۃ و سلام و برکت سب کو شامل ہے۔" (۴)

اللّٰھم صل علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آل سیدنا
ومولانا محمد وبارك وسلم

۱۔ نشر الطیب فی ذکر الحبیب مولانا تھانویؒ، ص ۲۱۳، پانچویں روایت۔ ۲۔ تفسیر رازی، مولانا فخر الدین رازیؒ پارہ نمبر ۲۲ - ۳۔ نشر الطیب، ص ۹ - ۴۔ ملفوظات اشرفیہ ص۶ -

حمد و نعت کے متعلق فرمایا کہ مجھے مرزا مظہر جاناں کی حمد و نعت بہت پسند ہے جو انہوں نے اپنی مثنوی کے شروع میں لکھی ہے۔ [1]

خدا در انتظار حمد ما نیست　　محمد چشم بر راہ ثنا نیست
محمد حامد حمد خدا بس　　خدا مدح آفرین مصطفیٰ بس

حقیقت یہ ہے کہ ہر محب اور عاشق اپنے محبوب کے عمدہ سے عمدہ اوصاف، خوبیاں اور صفتیں بیان کرتا ہے اس کی نگاہ میں اس کا محبوب ایک نرالی شے ہوتا ہے جسے وہ ہر شے سے منفرد اور ممتاز سمجھتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کو حضورؐ سے والہانہ محبت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی محبت کا اظہار ہر رنگ میں کیا ہے۔ ان کی نگاہ میں حضورؐ ایک منزّہ اور مصفیٰ نور تھے۔ قرآن مجید کی آیت قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین (۱ (یعنی تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور کتاب مبین آئی ہے) اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> "اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی دو نعمتوں کا عطا فرمانا اور ان دونوں نعمتوں پر اپنا احسان ظاہر فرمانا بیان فرمایا ہے ان دونوں نعمتوں میں ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہے۔ اور دوسری نعمت قرآن مجید کا نزول ہے ایک کو تو لفظ نور سے ذکر فرمایا ہے اور دوسرے کو کتاب کے عنوان سے ارشاد فرمایا ہے اور یہ توجیہہ اس آئت کی ایک تفسیر کی بنا پر ہے۔ یعنی جبکہ نور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود مراد لیا جائے۔" (۲

"نشر الطیب" میں حضرت تھانوی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اکتالیس فصلوں میں مختلف انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور حضورؐ کی ذات کو پوری کائنات کے لیے بطور نمونہ پیش کیا ہے اس سے حضرت کی محبت و عقیدت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

فصل اوّل حضورؐ کی نورانیت

پہلی فصل میں سات روایتیں بیان کی گئی ہیں جن سے نور محمدیؐ کا اول ہونا حقیقی اولیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کیونکہ جن

---

[1] ملفوظات اشرفیہ، ص ۷

[2] سورۃ المائدہ آئت ۱۵

جن چیزوں کے متعلق روایات میں اولیت کا حکم آیا ہے ان چیزوں کا نور محمدی کے بعد پیدا ہونا حدیث میں ذکر ہے ان حدیث میں حضرتؒ نے حضورؐ کو "نور" ثابت کیا ہے۔

پہلی حدیث یہ ہے کہ:

۱۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ روائت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں مجھے یہ بتایئے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کون سی چیز پیدا کی؟ آپؐ نے فرمایا اے جابرؓ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا، پھر وہ نور قدرت الٰہیہ سے جہاں اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا۔ اس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم تھا، نہ بہشت تھی، نہ دوزخ تھا، نہ فرشتہ، نہ آسمان، نہ زمین، نہ سورج، نہ چاند، نہ جن اور نہ انسان تھا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے دوسرے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو اس نور کے چار حصے کیے۔ ایک حصے سے قلم پیدا کیا، دوسرے سے لوح اور تیسرے سے عرش پیدا کیا، آگے حدیث طویل ہے۔ حضور کے نور سے پوری کائنات کی تخلیق ہوئی۔[1]

۲۔ دوسری حدیث حضرت عرباضؓ بن ساریہ سے روائت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بیشک میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم النبیین ہو چکا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی خمیر ہی میں پڑے تھے۔ یعنی ان کا پتلا بھی تیار نہ ہوا تھا۔" (۲) (یہ روایت بیہقی، اور حاکم نے روائت کی ہے۔)

۳۔ حضرت تھانویؒ نے حضور کے اول خلق ہونے کی تیسری حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ! آپ کے لیے نبوت کس وقت ثابت ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے یعنی ان کے بدن میں جان بھی نہ آئی تھی۔" (یہ روایت ترمذی نے نقل کی ہے۔) (۳)

۴۔ چوتھی حدیث حضرت تھانویؒ نے ابن سعدؓ سے نقل کی ہے کہ حضرت شعبیؓ سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہؐ آپ کب نبی بنائے گئے؟ آپؐ نے فرمایا کہ آدمؑ اس وقت روح اور جسم کے درمیان تھے جب مجھ سے میثاق لیا گیا۔" (۴)

۵۔ حضرت تھانویؒ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اول خلق کے سلسلہ میں پانچویں روایت حضرت

۱۔ نشر الطیب، مولانا تھانوی، ص ۱۳

۲۔ ایضاً ص ۱۴

۳۔ ایضاً ص ۱۳

۴۔ ایضاً ص ۱۵

علیؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے چودہ ہزار سال پہلے اپنے پروردگار کے حضور میں ایک نور تھا۔"

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس عدد میں کم کرنے کی نفی ہے زیادہ کرنے کی نفی نہیں ہے اس لیئے اگر کوئی ایسی روائت مل جائے جس میں زیادتی کا ذکر ہو تو شبہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" اس مدت میں تخصیص کرنے میں ممکن ہے کوئی خصوصیت مقتضی ہو۔" (۱)

علامہ زرقانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روائت حضرت جابرؓ کی روائت سے متعارض نہیں جس میں نورِ محمدیؐ کا اول الخلق ہونا مذکور ہے اس روائت میں نورِ محمدی کی تخلیق کا ذکر نہیں بلکہ حضورؐ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے آدم علیہ السلام سے چودہ ہزار برس پہلے خداوند قدوس کا خصوصی قرب حاصل ہوا۔" (۲) گویا اس حدیث میں ایک خاص الخاص مرتبہ کی طرف اشارہ ہے

۶۔ چھٹی حدیث حضرت تھانویؒ نے سہل بن صالح ہمدانی کی نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں" میں نے ابوجعفر محمد بن علیؓ یعنی امام محمد باقرؒ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب نبیوں سے اولیت کیسے حاصل ہو گئی حالانکہ حضورؐ سب سے آخر میں مبعوث ہوئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا۔ اور ان سب سے ان کی ذات پر اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب سے پہلا جواب جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا کہ کیوں نہیں۔ اس لیے حضورؐ کو سب نبیوں سے تقدم حاصل ہے۔ اگرچہ حضورؐ سب سے آخر میں مبعوث ہوئے۔"

یہ روائت ذکر کرکے حضرت تھانویؒ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ میثاق لینے کے وقت روحوں کو جسموں میں ڈال دیا گیا ہو تو پھر بھی ان کے احکام روحانی ہی ہوں گے اس لیے میں نے اس حدیث کو کیفیات نور میں لانا مناسب سمجھا۔" (۳)

۷۔ حضرت تھانوی نے ساتویں روائت عجیب وغریب بیان کی ہے کہ جب حضورؐ غزوہ تبوک سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں آپؐ کی مدح سرائی کروں۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ حضورؐ کی مدح سرائی خود طاعت و فرمانبرداری ہے (۴)

۱۔ نشر الطیب ص ۱۵

۲۔ زرقانیؒ، ج ۱، ص ۴۹

۳۔ نشر الطیب، ص ۱۵، ۱۶

۴۔ ایضاً، ص ۱۶

اس لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ آپ کے منہ کو سالم رکھے، جو کہنا چاہتے ہیں کہیں"
اس پر انہوں نے حضورؐ کی شان میں ایک ایسا عجیب و غریب قصیدہ پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ:

"زمین پر آنے سے پہلے آپؐ جنت کے سایہ میں نہائت خوش حال اور مسرور تھے۔ آپؐ حضرت آدم علیہ السلام کی صلب میں جنت اور پھر جنت سے زمین کی طرف نزول فرمایا اس وقت آپ نہ بشر تھے نہ جمے ہوئے خون اور نہ لوتھڑا تھے۔ بلکہ اپنے آباؤ اجداد کی پشتوں میں محض ایک مادہ مائیہ تھے۔ وہی مادہ کشتیٔ نوحؑ میں بھی سوار تھا۔ جب کہ طوفان سب کچھ غرق کر رہا تھا یہ مادہ مختلف طبقات سے گذرتا ہوا یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ نے نارِ خلیلؑ میں بھی ورود فرمایا۔ چونکہ آپ ان کی صلب میں محفوظ تھے اس لیے وہ کیسے جلتے۔ پھر آپ اپنے خاندانی شرف میں جاگزیں ہوئے اور اور آپ جب پیدا ہوئے تو زمین روشن ہوگئی اور آپ کے نور سے آفاق منور ہو گئے۔ اب ہم اس نور میں ہدائت کے راستوں کو طے کر رہے ہیں۔ (۱)

یہ روایت نقل کر کے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ وجود تو تمام اولاد آدمؑ و نوحؑ و ابراہیمؑ میں مشترک ہے پھر حضورؐ کی تخصیص کیا ہوئی۔ جب کہ حضرت عباسؓ کی مدح سرائی حضورؐ کی خصوصیات بیان کرنا تھا تو اس پر حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہ قرینہ غالب ہے کہ حضورؐ کا یہ مرتبہ اوروں کے وجود سے کچھ ممتاز تھا۔ یہ کہ اس مادی حصہ کے ساتھ آباؤ اجداد کی ارواح کے تعلق کے علاوہ خود حضورؐ کی روح پرنور کو بھی کوئی خاص تعلق ہو۔(۲) یہ تو عقلی بات تھی۔

"اب وہ قرینہ جو حضورؐ کی تخصیص کے لیے نقل کیا گیا ہے۔ وہ خود حضرت عباسؓ کے اشعار ہیں۔ جن میں حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں جلنے سے محفوظ رہنا۔ یہ سب کچھ حضور پرنور کے وجود باجود کی بدولت تھا۔ اس لیے اگر اس مادی جز کے ساتھ حضورؐ کی روح کا کوئی خاص تعلق نہ مانا جائے تو جزد کے آگ میں ڈالے جانے کے کیا معنی؟ اس لیے ان اشعار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک ہونا ثابت ہوگیا اور اس فصل کے ذکر کرنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔" (۳)

۱۔ نشر الطیب، ص ۱۷
۲۔ ایضاً، ص ۱۸
۳۔ ایضاً

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ نور کی حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسروں کو ظاہر کرتا ہے اس لیے حضور کی شان مظہر کے بہت مناسب ہے کہ نور سے مراد حضورؐ ہوں۔" (۱)

فصل۲: حضورؐ کی فضیلت

حضرت تھانوی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیوں اور کمالات کا ذکر اس عمدہ پیرائے میں کیا ہے کہ حضور کی اکملیت کائنات پر واضح ہوجاتی ہے اس فصل میں بطور استشہاد سات احادیث شریف اور پانچ آیات کریم درج کی ہیں۔

۱۔ پہلی ہی روائت میں آپ کی فضیلت کا اظہار حاکم کی روائت سے کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک عرش پر لکھا دیکھا اور اللہ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔" (۲)

۲۔ اسی طرح دوسری روایت میں حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے خطا کے ارتکاب کے بعد آسمان پر حضورؐ کا نام گرامی اللہ تعالیٰ کے ساتھ لکھا ہوا دیکھا تو اس کے وسیلے سے اللہ کریم سے اپنی مغفرت کی دعا کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمہاری اولاد میں سب انبیاءؑ سے آخری نبیؐ ہیں۔"

اس روائت میں بھی حضورؐ کی فضیلت کا ذکر ہے۔ (۳)

۳۔ تیسری روایت میں حضورؐ پر درود و سلام کو حضرت حوّاء علیہا السلام کے مہر کا عوض قرار دیا گیا ہے۔(۴) جب حضور پر درود و سلام کی اتنی اہمیت ہے تو حضورؐ کی ذاتِ کریم کے کمالات کے کیا کہنے؟ اسی فصل میں دیگر آسمانی کتب میں حضورؐ کے تذکرے کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں ایک قصیدے کے شعر نقل کئے ہیں جن میں ذکر ہے کہ،

تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے حضور میں اپنی حد اور مرتبہ کے موافق کھڑے ہیں۔ اور وہ حد حضورؐ کی کتاب علم سے نقطہ کی مثل ہے۔ (۵) آپ کے فضل و شرف کی حد نہیں۔ آپ معنوی اور صوری اعتبار سے مکمل و مصفیٰ ہیں۔ تمام انبیائے کرام علم میں آپ سے کم ہیں۔

تیسری فصل حضورؐ کے نسب کی شرافت

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں پانچ روایتیں ذکر کی ہیں جن سے حضورؐ کے حسب

۱۔ تفسیر موضح القرآن، ص ۱۰۲

۲۔ نشر الطیب، ص ۲۰

۳۔ ایضاً ۲۰، ۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۔ ایضاً، ص ۲۴

نسب کے اعلیٰ و ارفع ہونے اور نہایت پاکیزہ اور منزہ ہونے کا اظہار ہوتا ہے ۔

یعنی نہ صرف یہ کہ حضور کی ذات اکمل و افضل ہے بلکہ آپ کا خاندان بھی پوری کائنات کے لیے ایک نمونہ ہے اس سے حضرت تھانویؒ کے پاکیزہ جذبات اور حضور کے ساتھ انتہائی خلوص کا اظہار ہوتا ہے ۔

چوتھی فصل ۔ حضورؐ کی نورانیت کے آپ کے آباؤ اجداد میں مظاہر

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں وہ روایات نقل کی ہیں جن میں حضورؐ کی نورانیت کے کرشمے حضورؐ کے آباؤ اجداد میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ مثلاً

حضرت عبد المطلب کے بدن سے حضورؐ کے نور کی وجہ سے خوشبو آتی تھی ۔ حضور کا نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا ۔ قحط کے دنوں میں قریش عبد المطلب کا پکڑ کر ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب ڈھونڈتے اور بارش کی دعا کیا کرتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ حضور کے نور کی برکت سے انہیں اپنے فضل و کرم سے نوازتا تھا

حضرت عبد المطلب میں حضور کے نور مبارک کی ایسی عظمت تھی کہ اس کے سبب بادشاہ بھی ہیبت میں آجاتے اور تعظیم و تکریم کرتے تھے ۔

ایسی روایات کے ذکر سے حضرت تھانویؒ حضور کی شان کو پوری دنیا کے سامنے فخریہ بیان کرتے ہیں ۔ اس سے ان کی حضورؐ کے ساتھ عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے

پانچویں فصل ۔ شکم مادر میں حضورؐ کی برکات

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے تین روائتیں بیان کی ہیں جن سے یہ واضح کرنا مقصود ہے ۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت عام بچوں کی طرح نہ تھی بلکہ حضورؐ کی نورانیت کے مظاہر اس وقت بھی دیکھنے میں آئے اور آپ کی والدہ ماجدہؓ کے سامنے حضورؐ کے نور کے عجیب و غریب مظاہر ہوئے اس لیے حضورؐ عام لوگوں کی طرح نہ تھے بلکہ آپ کے انوار سے شمس و قمر بھی صاحب جمال ہو گئے تھے ۔ (۱)

چھٹی فصل ۔ حضورؐ کی ولادت باسعادت کے وقت نورانی جھلکیاں

حضرت تھانوی نے اس فصل میں سات روائتیں بیان کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ کی ولادت

۱۔ نشر الطیب ، ص ۲۹ ، ۳۰

باسعادت کے وقت ایسے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کا آئندہ زمانے میں واقع ہونا ثابت تھا مثلاً کسریٰ کے محل میں زلزلہ، دریا کا پانی خشک ہو جانا، فارس کا آتش کدہ بجھ جانا وغیرہ۔ ان سے مراد سلطنت فارس وشام کے زوال کی طرف اشارہ تھا اور یہودیوں کا حضورؐ کی نشانیاں دیکھ کر یہ کہنا کہ اے گروہ قریش! سُن لو، واللہ یہ تم پر ایسا غلبہ حاصل کریں کہ مشرق ومغرب سے اس کی خبر شائع ہوگی۔[۱]

حضرت تھانوی اس بات کو فخریہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ہمارے حضورؐ کا رعب ودبدبہ اللہ تعالیٰ نے ولادت کے وقت ہی پوری دنیا میں ظاہر کر دیا۔ آپ نے حضور کی ولادت سے متعلق روایات کو بڑے حسن سے قلمبند کیا ہے۔

آٹھویں فصل۔ حضورؐ کے عہدِ طفولیّت کے خصوصی واقعات

حضرت تھانوی ؒ نے حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد طفولیت کے واقعات سے متعلق ایسی روایات ذکر کی ہیں جن سے حضورؐ کی ذات کریم کی شان دوبالا ہو جاتی ہے اور حضورؐ کی خصوصی تربیت اور معجزات کا ذکر ہے۔ مثلاً گرمی میں بادل کے ٹکڑے کا آپؐ پر سایہ کرنا، حلیمہ سعدیہؓ کے گھر میں برکات کا نزول، سواریوں کا سبقت لے جانا، حضورؐ کے سینہ پاک کو چاک کرنا اور قلب اطہر کو دھونا، یہ تمام ایسی خصوصیات ہیں جو ایک اعلیٰ شان کی ذات سے ہی صادر ہو سکتی ہیں۔ حضرت تھانوی ؒ نے بڑی خوبی اور اختصار کے ساتھ جامعیت سے کام لیا ہے اور بڑی ترتیب سے ایسی روایات کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

نویں فصل۔ حضورؐ کی رضاعت

اس فصل میں حضرت تھانوی ؒ نے حضورؐ کی ان تمام پاکیزہ امہات کا ذکر کیا ہے جنہوں نے حضورؐ کو کسی وقت بھی دودھ پلایا ہے ان کی کردار کی بلندی، ان کے ہاں حضورؐ کا قیام اور حالات کا تفصیل جائزہ بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی عقیدت ومحبت کی غماز ہیں جو حضرتؒ کو حضورؐ کی ذات اقدس سے تھی۔ (۳)

دسویں فصل۔ جوانی سے نبوّت تک کے خصوصی واقعات

اس فصل میں حضرت تھانوی ؒ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واقعات کا بڑی صحت وصفائی سے ذکر کیا ہے جو نبوت سے قبل حضورؐ کے ساتھ پیش آئے۔ مثلاً حضورؐ کی انفرادی اور ازدواجی مکے کی زندگی جو کہ پرکشش اور مثالی تھی۔ اور تمام

۱۔ ایضاً، ص ۳۱ تا ۳۵

۲۔ نشر الطیب۔ ص ۳۸، ۴۳۔

۳۔ ایضاً۔ ص ۳۸، ۴۳۔

اہل بستی کا حضورؐ کے کردار سے متاثر ہونا، صادق و امین کے لقب سے نوازنا۔ آپ کا جذبہ خدمت خلق، یتیموں اور بے کسوں کی مدد اور خبر گیری کے واقعات کو اس نفاست سے پیش کیا ہے کہ جس کی صرف ایک عقیدت مند اور خلوص کیش سے ہی توقع کی جا سکتی ہے۔ (۱)

گیارھویں فصل۔ حضورؐ پر وحی کا نزول اور کفار کی مخالفت

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں حضورؐ کی نبوت، وحی کا نزول، اس کے اثرات و کیفیات اور پھر مخالفت، عناد و ضد کا اس عمدہ پیرائے میں نقشہ کھینچا ہے کہ جس سے حضورؐ کی ذات نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ضرور اس ذات بابرکات کی زمام کار کسی بالا و برتر ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ حضرت تھانوی نے انہی روایات کو ذکر کیا ہے جن سے حضورؐ کی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ (۲)

بارھویں فصل۔ حضورؐ کی معراج

معراج شریف ایک ایسا معجزہ ہے جو صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔ یہ جتنا زیادہ اہم ہے اس پر اتنے ہی زیادہ اعتراضات کیے گئے۔ حضورؐ کے زمانہ میں بھی یہ نزاع کا سبب بنا رہا۔ اور آج کی دنیا میں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو حضورؐ کے اس اعجاز سے روگردانی کرتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اس واقعہ کو اس قدر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ چشم بصیرت رکھنے والے اسے پڑھتے ہی اس کی حقانیت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ دراصل ایک محب اپنے محبوب کی کسی بات پر بھی کسی کی انگشت نمائی کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت تھانوی نے بھی اس جذبے کے تحت ایسی صحیح اور مستند روایات اس فصل میں پیش کی ہیں اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہے۔ حضرتؒ نے ۲۵ احادیث تو اس واقعہ کی تفصیل اور وضاحت کے سلسلہ میں ذکر کی ہیں اس کے علاوہ بہت سے اسرار و رموز بیان کیے ہیں اور اشکال دفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے واقعہ معراج کی حقانیت واضح ہو جاتی ہے۔ (۳)

تیرھویں فصل۔ حبشہ میں حضورؐ کی صداقت کے مظاہرے

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق کا جس خوبی سے ذکر کیا ہے اور جن حالات میں انہوں نے اپنے گھر بار، وطن، عزیز و اقارب کو چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ صرف محبت و عقیدت کی بناء پر ہی ہو سکتا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر حضورؐ کی صداقت کو جس انداز میں پیش کیا اس کو نہایت اختصار اور جامعیت کے انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ (۴)

۱۔ ایضاً، ص ۴۶، ۴۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۹، ۵۲

۳۔ نشر الطیب، ص ۵۲، ۱۰۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۴، ۱۰۶

چودھویں فصل ۔ بعد از نبوت حضورؐ کی مکہ میں اقامت اور اہم واقعات

حضورؐ کے اعلان نبوت کے بعد جن جاں نثاروں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور محبین کی ایک جماعت بن گئی۔ ان کے اسمائے گرامی، ان کی خدمات اور ان کے کارہائے نمایاں اور پھر حضورؐ کی ذات کریم کے ساتھ دشمنوں کی گستاخیاں، اور اللہ کی گرفت کا ذکر کرکے حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کے ساتھ اپنی حسن عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

واقعات کے ضمن میں روایات تو صرف پانچ بیان کی ہیں لیکن ہیں وہ نہائت اہم ابولہب نے جس انداز میں حضورؐ کو ایذا دی اور جس انداز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی غیرت میں اسے دونوں بیٹوں سمیت اپنی گرفت میں لیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی جانثاری حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کے واقعات نہائت مختصر مگر جامع انداز میں بیان کرکے شان رسالت کا اظہار کیا ہے۔ (۱)

پندرھویں فصل ـ حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ طیبہ

اس فصل میں حضرت تھانوی نے حضور کی ہجرت مدینہ طیبہ کا ذکر کیا ہے۔ اہل مدینہ کا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے ہاں رہنے کی درخواست کرنا، حضورؐ کا ارادہ فرمانا، کفار کا خفیہ منصوبے بنانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزانہ انداز میں ہجرت کرجانا، راہ میں کئی دیگر معجزات کا ذکر کے حضرت تھانویؒ کا نیازمندانہ انداز حضور کی خدمت میں عجز و انکساری کا مظہر ہے۔ حضرت تھانوی نے قصیدہ بردہ کے اشعار اس ضمن میں نقل کیے ہیں۔ اسی فصل کے آخر میں حضورؐ کا مدینہ طیبہ میں ورودِ مسعود، اہل یثرب کا والہانہ استقبال، معصوم ننھی بچیوں کا شوق اور خوشی کے ترانے گانا، ایسے انداز میں ذکر کیے ہیں کہ ایک سماں کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ (۲)

سولہویں فصل ـ حضورؐ کی مدینہ طیبہ تشریف آوری اور اہم واقعات

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کے مدینہ طیبہ تشریف لے جانے کے بعد تین معجزات کا ذکر کیا ہے کہ مشہور یہودی عالم عبداللہ بن سلام سے تین سوال کیے اور صحیح جواب پاکر ایمان لے آئے۔ اس کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ کے اسلام لانے اور انہیں آزادی دلانے کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ ان کی آزادی کی خاطر حضورؐ نے تین سو درخت کھجوروں کے اپنے دستِ مبارک سے لگا دیے جو کہ اسی سال پھل لائے۔ حضورؐ کا یہ معجزہ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حضورؐ کے فرمان پر حضرت عثمانؓ

۱۔ نشر الطیب، ص ۱۰۳-۱۰۶ ۲۔ ایضاً، ص ۱۰۷-۱۱۰

کا مدینہ کا کنواں یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دینے کا ذکر بھی ہے۔ (۱)

اِن واقعات کے ذکر سے حضرت تھانویؒ کا مقصود حضورؐ کی شان بیان کرنا اور اپنی عقیدت کا اظہار۔

سترھویں فصل حضورؐ کے غزوات اور مشہور واقعات کا ذکر

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ مدنی زندگی کو سن وار ذکر کیا ہے یعنی ہجری کے لحاظ سے ہر سال کے اہم غزوات، معجزات اور معاملات تفصیل سے درج کیے ہیں۔ (۱) مثلاً

پہلے سال جہاد کی فرضیت اور فوجی ترسیل، مواخات کا قیام، حضرت عائشہؓ کی رخصتی اذان کی ابتداء، جمعہ کی فرضیت۔

دوسرے سال غزوۂ بدر، تحویل قبلہ، زکوٰۃ کی فرضیت، آخر شعبان روزہ کی فرضیت، آخری رمضان صدقۂ فطر کا وجوب، عیدین کی نماز اور قربانی کا حکم، حضورؐ کی صاحبزادی حضرت بی بی رقیہؓ کی وفات اور ان کے بعد حضرت اُم کلثومؓ، دوسری صاحبزادی کا حضرت عثمانؓ سے نکاح اور ان کا ذی النورین لقب کہلانا۔ بدر کے بعد حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا نکاح۔ (۲)

تیسرے سال یہود کے قبیلے بنی قینقاع کا بوجہ نقض عہد پندرہ روزہ محاصرہ، کعب بن اشرف سرغنہ یہود کے قتل کا حکم، غزوۂ اُحد، فوجی قافلوں کی ترسیل اور امن عامہ کی خاطر اقدامات قبیلہ عضل وقارہ کے لوگوں کا فریب دے کر دس قاری صحابہؓ کو ساتھ لے جانا اور پھر بد عہدی کرکے انھیں قتل کر دینا، واقعہ بیرِ معونہ جس میں ۷۰ قاری و عالم صحابہؓ دھوکے سے شہید کر دیے گئے اور قاتل کے حق میں حضورؐ کی بد دعا اور طاعون میں اس کا مرنا اور حضورؐ کا ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھنا اور ان قاتلوں کے حق میں بد دعا کرنا۔ بنو نضیر کا حضورؐ کو دھوکے سے اپنے محلے بلا کر قتل کرنے کی سازش کرنا اور پھر حضورؐ کا ان کو محاصرہ کرنے کے بعد جلا وطن کر دینا، یہ سارا واقعہ سورہ حشر میں ذکر ہے۔ (۳)

چوتھے سال ابوسفیان کی للکار پر دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بدر میں ڈیڑھ ہزار صحابہ کرامؓ کے ساتھ جانا اور بے جنگ و رنج مسلمانوں کا واپس آنا اور تجارت میں خوب نفع کمانا، حضرت امام حسینؓ کی ولادت، پردے کا حکم نازل ہونا۔ (۴)

۱۔ ایضاً، ص ۱۱۱ - ۱۱۳

۱۔ نشر الطیب، ص ۱۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵، ۱۱۶

۳۔ ایضاً، ۱۱۶ - ۱۱۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹

پانچویں سال

حضورؐ کا دومۃ الجندل میں ایک ہزار صحابہؓ کو لے کر جانا اور دشمنوں کا خائف ہو کر بھاگ جانا مختلف غزوات، مریسیع، بنی مصطلق وغیرہ۔ اسی غزوہ میں حضرت جویریہؓ سے حضورؐ کا نکاح، اسی غزوہ میں حضرت عائشہؓ کا دردناک واقعہ، غزوۂ خندق اور حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھودنا، یہودیوں، منافقوں اور مختلف مخالف قبائل میں پھوٹ پڑنا، صلوٰۃ خوف کا حکم، قبیلہ جہینہ کے مقابلے میں تین سو صحابہ کو بھیجنا، اور وہاں عنبر ماہی کا کنارہ پر لگنا اور مسلمانوں کا اسے کھانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی کے مظاہرے۔ یہ تمام واقعات حضرت تھانویؒ نے عجیب و غریب رنگ میں بیان کیے ہیں۔(۱)

چھٹے سال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم کا بنفسِ نفیس فوجی دستوں کی کمان کرنا اور امن و امان کی خاطر مختلف مقامات کا سفر کرنا، ثمامہ بن اثال کی گرفتاری اور اس کا مسلمان ہونا، صلح حدیبیہ حضورؐ کا چودہ سو صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کی غرض سے تشریف لے جانا، اور صلح کی شرائط طے کر کے بغیر عمرہ کیے واپس آجانا۔ بنو خزاعہ کا حضورؐ کا حلیف بن جانا اور بنو بکر کا قریش مکہ کا۔ حضورؐ کے داماد اور آپؐ کی بیٹی زینبؓ کے شوہر کا مدینہ میں آنا اور مال لے کر مکہ جانا اور مسلمان ہو جانا، فتح خیبر اور خیبر کی زمینوں کے معاملات اور باغ فدک کی آدھی زمین حضورؐ کی ملکیت قرار دینا، حضرت صفیہؓ سے حضورؐ کا نکاح، حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو گوشت میں زہر دینے کی کوشش، گدھے کے گوشت کی حرمت اور متعہ کی ممانعت اور حرام قرار دیا جانا۔ اسی سال قحط پڑنا اور حضورؐ کی دعا سے بارانِ رحمت کا نزول، مختلف ممالک میں سفیروں کو خطوط دے کر بھیجنا۔(۲)

ساتویں سال

حضورؐ کا عمرۃ القضاء کرنا، حضرت میمونہؓ سے حضورؐ کا نکاح، اسی سال حضرت حمزہؓ کی بچی کا ان کی خالہ کے سپرد کر دینا۔ (۳)

آٹھویں سال

غزوۂ موتہ، فوجی دستوں کی ترسیل اور باغیوں کی سرکوبی، فتح مکہ جو کہ سب سے بڑی فتح اور اسلام کا بہت بڑا اعزاز ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے حرم میں قتال کی اجازت خانۂ کعبہ میں بُت کو توڑنا اور بتوں کو توڑنے کے لیے گرد و نواح میں دستوں کی ترسیل، غزوۂ حنین اور فتح طائف حضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کی ولادت، حضرت زینبؓ حضورؐ کی بیٹی کا انتقال۔ (۴)

۱۔ نشر الطیب، ص ۱۱۹ تا ۱۲۳

۲۔ ایضاً ص ۱۲۲ تا ۱۲۶

۳۔ ایضاً ص ۱۲۶

۴۔ ایضاً ص ۱۲۶ تا ۱۲۹

نویں سال بتوں کو توڑنے کے لیے قافلوں کی روانگی فوجی دستوں کی ترسیل، غزوہ تبوک، مسجد ضرار کو ڈھانا، حج کی فرضیت اور ابو بکرؓ کو امیر حج بنا کر روانگی، سورۂ برأت سنانے کے حضرت علیؓ کو روانہ کرنا۔ (۱) حضورؐ کی صاحب زادی حضرت اُمّ کلثومؓ کا انتقال۔ (۲)

دسویں سال حجۃ الوداع، اسلام کی تکمیل کی بشارت، حضرت علی سے محبت کا اظہار، پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ہدایت و ارشادِ خلق و عبادت خالق میں مشغولیت، ربیع الاوّل میں حضورؐ کا سفرِ آخرت۔

حضرت تھانویؒ نے دس سال کے اہم واقعات جس ترتیب اور نفاست کے ساتھ ذکر کیے ہیں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے خلوص و عقیدت عیاں ہے۔ اتنی دل سوزی اور خلوص کا مظاہرہ سوائے عقیدت اور محبت کے ناممکن ہے۔ آخر میں حضورؐ کے ذریعہ فتح و نصرت سے متعلق قصیدے کے چند شعر لکھ کر صلوٰۃ و سلام پر خاتمہ کیا ہے۔ (۳)

اٹھارویں فصل۔ حضورؐ کی خدمت میں وفود کا آنا

فتح مکہ کے بعد پورا عرب اس حقیقت کو سمجھ گیا کہ اب اسلام ہی کا غلبہ ہوگا اس لیے عرب فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور بستیوں اور قبائل کے لوگ مسلمان ہو گئے۔ اکثر علاقوں کے اکابرین نے صورت حال کا جائزہ لینے اور شرائع اسلام سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں وفود بھیجے۔ جس سال میں یہ وفود حاضر خدمت ہوئے وہ عام الوفود کہلاتا ہے حضرت تھانویؒ نے ان وفود کے آنے کو حضورؐ کی عظمت و توقیر قرار دیا ہے۔ (۴) کہ حضورؐ کی قدر سمجھ کر وفود آتے تھے۔ حضرتؒ نے وفود کا ذکر محض فہرست کے طور پر کیا ہے۔ حضور نبی کریمؐ کی محبت اور عظمت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

> "حضور ان وفود کی بہت خاطرداری اور توقیر کرتے اور انعام دے کر رخصت کرتے نیز عام اہل عرب اس کے بھی منتظر تھے کہ آپ کا معاملہ آپ کی قوم سے کیا ہوتا ہے۔ قریش کے اسلام قبول کرنے سے بھی اور لوگ نرم ہوئے"

---

(۱) نشر الطیب، ص ۱۲۹، ۱۳۰
(۲) ایضاً، ص ۱۳۰
(۳) ایضاً، ص ۱۳۰، ۱۳۱
(۴) ایضاً ص ۱۳۲

حضرت تھانوی نے آخر میں قصیدے کے چند شعر لکھ کر حضورؐ کی عزت و توقیر کا اظہار کیا ہے کہ

" اے بہترین ذات، جس کی بارگاہ میں تیز رو اونٹنیوں کی پشتوں پر سوار ہو کر سائل دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ (۱)

انیسویں فصل۔ حضور کا حکام اور اہل کار متعین فرمانا

حضور تھانویؒ نے اس فصل میں ان صحابہ کرامؓ کے بارے میں ذکر کیا ہے جن کو حضورؐ نے کسی خاص خدمت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ ان کی ذمہ داریوں کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اس سے حضرت تھانویؒ کا مقصد یہ ہے کہ اصل سربراہ کی حیثیت حضورؐ کو ہی زیبا تھی۔ ایک وقت ایسا آگیا کہ حضورؐ نے اپنی اسلامی مملکت کے ذمہ دار کی حیثیت سے اپنے صحابہ کرامؓ کا تقرر فرمایا۔ وہ حضورؐ کے ہر حکم پر لبیک کہتے تھے۔ حضورؐ نے ان کو جہاں بھیجا وہیں چلے جاتے تھے وہ حضورؐ کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ حضور کے یہ فرمانبردار ساتھی، تھے تو اپنے اپنے علاقے کے حاکم، لیکن خادم اسلام اور مخلص (۲)

بیسویں فصل۔ حکمرانوں کی طرف خطوط کی روانگی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک پہلو نبوت و رسالت کا ہے جس کی نورانیت کائنات میں جگمگا رہی ہے دوسرا پہلو اسلامی مملکت کے فرمانروا اور حکمران کی حیثیت سے ہے۔ عام طور پر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مذہبی تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہی دیکھتے ہیں حالانکہ جس رسول نے ہمیں نماز روزہ، حج، نکاح، طلاق کے مسائل سکھائے ہیں، اسی نے فرمانروائی اور حکمرانی کے اصولوں اور طریقوں سے بھی آگاہ فرمایا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں یہ واضح کیا ہے کہ سفارتکاری کا جو طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا اور جس انداز سے اس وقت کی عظیم سلطنتوں کو شرافت کے دائرے میں رہتے ہوئے قوانین کی پابندی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اس سے بہتر انداز نہ کبھی تھا اور نہ ہوا۔ اور پھر حضورؐ نے اپنے خط میں جس کو جو بات لکھی یا زبانی فرمائی وہ پوری ہو کے رہی۔ مثلاً۔

---

(۱) نشر الطیب، ص ۱۳۲، ۱۳۳ (۲) ایضاً، ص ۱۳۴

شاہ فارس کو حضورؐ نے اپنے قاصد عبداللہ بن حذافہ سہمی کے ہاتھ نامہ مبارک روانہ فرمایا اس نے نامہ مبارک کو پھاڑ ڈالا۔ آپؐ نے سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سلطنت کو پارہ پارہ کر دے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ارسال فرمانا اس بات کی دلیل تھی کہ حضورؐ کے بتائے ہوئے اصول اور احکام ہی اب چل سکیں گے، اس کے علاوہ اب بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے حضورؐ کے روشن احکام کسی پر مخفی نہ رہے اور ان کے بغیر لوگوں میں عدل قائم نہیں ہوا۔ وہ احکام فیصلہ کرنے والے قرار دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ان احکام نے کسی کے لیے کوئی شبہ نہیں چھوڑا اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ دشمن سے دشمنی بھی لڑائی سے باز آکر ان کی طرف صلح کرنے پر مجبور ہوگئے۔ حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کی اس شان کو واضح کیا ہے(1)

اکیسویں فصل۔ حضورؐ کے شمائل و اخلاق و عادات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محاسن کی کوئی حد نہیں، کہ انہیں کوئی ادا کرنے والا اپنی زبان و دہن سے ادا کر سکے۔

حضورؐ کی خوبیوں اور صفات ستودہ میں کوئی دوسرا انسان شریک نہیں، لہٰذا آپؐ کا جوہر حسن و خوبی ناقابل تقسیم ہے۔

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محاسن، اخلاق و عادات اور شمائل کے بارے میں حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ کے رسالہ ”شیم الحبیب“ کو مع اپنے ترجمہ ”شیم الطیب“ کے اپنے رسالے کا جزو اعظم بنایا ہے(2) اور مستقل فصل کے تحت عنوان بھی نقل کیا ہے، بلکہ اپنے رسالہ کو اس رسالہ کا ترجمہ قرار دیا ہے۔ اور اپنے رسالے کے دو کالم کیے ہیں اصل بھی ہے اور اس کے ساتھ ترجمہ بھی ہے۔

حضرت تھانویؒ نے اپنی کتاب میں اس رسالہ کو نقل کرکے اپنی عقیدت و محبت رسول اور جذبۂ شوق و اخلاص کو ظاہر کیا ہے۔ فصل کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں جس نے ہماری طرف ایک رسول کو بھیجا جو عربی

---

(1) نشر الطیب، ص ۱۳۵، ۱۳۶ (2) نشر الطیب، ص ۱۱

ہاشمی ، مکی ، مدنی ، سردار ، امین ، سچی خبریں دینے والے ، سچی خبریں دے گئے اور قریشی ہیں ، اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپؐ کی آل پر اور آپ کے محب اور رازدار اصحابؓ پر رحمت نازل فرمائیے ۔ (۱)

حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ لکھتے ہیں کہ " ہر زمانے میں علمائے کرام ، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن و شمائل جمع کرتے رہے ہیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں ۔ بعض نے تو اس قدر طویل و عریض لکھا کہ جس سے دل اکتا جائے اور بعض نے اتنا زیادہ اختصار کیا کہ مطلب سمجھنے ہی میں خلل پڑ جائے جبکہ لوگ مختلف قسم کے ہوتے ہیں ۔ بعض اس کی طوالت سے بھاگتے ہیں اور بعض اس کا شوق اور طلب رکھتے ہیں چونکہ طوالت اور اختصار دونوں ہی زیادہ فائدہ مند نہیں ہوتے اور درمیانہ اور مناسب مقدار ہر شخص کے مذاق کے موافق ہوتے ہیں ۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا ۔ کہ حضورؐ کے محاسن اوصاف و مکارم اخلاق اور شمائل اور خصائل میں سے ایک مختصر ، مگر جامع بیان قلم بند کردوں کیونکہ ہجر اور جدائی کا مارا ہوا عاشق جب وصال اور ملاقات سے محروم رہتا ہے ، تو محبوب کے گھر ، یا خط ، پیغام ، یا اس کی یاد ہی سے اپنے دل کو سمجھاتا ہے اور محبوب کے حسن و جمال اور خوبیوں کا تذکرہ کر کے ہی اپنے دل کو بہلاتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ثواب کے حصول کے اور عذاب سے نجات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور احباب کی دعاؤں کا بھی طالب ہوں ۔ اور یہ امید کیسے نہ رکھوں ، جبکہ میرے پاس حسنِ عمل کا کوئی وسیلہ ہی نہیں ہے اس لیے میں نے حضورؐ کے شمائل و فضائل اور آپؐ کی مدح و ثنا خوانی کے تذکرہ کا دامن پکڑا ہے ۔ اللہ کریم مجھ سے اور سب مسلمانوں کی طرف سے اسے قبول فرمائے ۔ (۲)

حضرت کاندھلویؒ کے جذبات کی ، حضرت مولانا تھانویؒ نے عکاسی کی ہے ان کی عقیدت و محبت پر اپنا رنگ چڑھا کر حضور کی شان بیان کی ہے جو حضرت تھانوی کی اندرونی کیفیات کی غماز ہے اس فصل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدوخال کا نقشہ اس رنگ میں کھینچا ہے کہ حضورؐ

۱۔ نشر الطیب ، ص ۱۳۷   (۲) ایضاً ، ص ۱۳۸

کی ذات کریم پیکرِ اعجاز کی شکل میں واضح ہو جاتی ہے۔ حضرت نے بڑی عرق ریزی، محنت و کاوش اور سعی جمیلہ سے احادیث اور جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی روایات اور اپنے جمالیاتی تصور کو یکجا کر کے حضور پُرنور کے پیکر کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جو قلب و جان کے لیے راحت اور چشم و نظر کے لیے فرحت کا باعث ہے۔

اس فصل کا مطالعہ کرنے سے قاری وہ حظ محسوس کرتا ہے، جس سے سوز و گداز، کیف و سرور، ذوق و شوق، علم و عرفان میں اضافہ ہوتا ہے اور حضور پرنور کی نورانی شکل و صورت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک سے لے کر ناخن پاک تک کا بیان موجود ہے جو پڑھنے والے کے لیے بہت بڑی سعادت ہے۔

اس فصل میں مولانا کاندھلویؒ نے ۲۵ وصل کے تحت ۲۵ عنوانات قائم کیے ہیں۔

پہلی وصل اس میں حضورؐ کا حلیہ مبارک اور آپ کے کردار و گفتار اور عادات کا ذکر کیا ہے[1]

دوسری وصل اس میں حضورؐ کے تقسیم اوقات اور طرز معاشرت کے بارے میں بیان کیا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر آنا، باہر آنا، نشست و برخاست طرز طریق کیسا تھا، حضورؐ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے اندر رہنے کے وقت کو تین حصوں پر تقسیم فرماتے ایک حصہ اللہ کی عبادت کے لیے۔ دوسرا حصہ اپنے گھر والوں کے لیے اور ایک حصہ اپنے نفس کے آرام کے لیے۔ پھر اپنے حصہ وقت کو خاص اصحاب کے واسطے سے عام لوگوں کے کام لگا دیتے" (۲)

حضورؐ کے رہن سہن کے طریق کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

تیسری وصل یہ وصل پہلی وصل کا تتمہ ہے اس میں حضورؐ کے اوصاف حمیدہ اور حسن و جمال کا تذکرہ ہے کہ حضورؐ سے زیادہ حسین و جمیل کوئی شخص نہیں دیکھا۔ گویا کہ آپ کے چہرہ اقدس میں آفتاب چل رہا تھا۔ (۳)

چوتھی وصل اس وصل میں حضور کا معطر اور خوشبودار ہونا بیان کیا گیا ہے۔ کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نے کوئی عنبر اور کوئی مشک اور کوئی خوشبودار چیز رسول اللہ

---

(۱) نشر الطیب، ص ۱۳۹ تا ۱۴۲ (۲) ایضاً، ص ۱۴۳ تا ۱۵۰ (۳) ایضاً ص ۱۵۱ تا ۱۵۶

صلی اللہ علیہ وسلم کی مہک سے زیادہ خوشبودار نہیں دیکھی اور آپ کسی سے مصافحہ فرماتے، تو تمام دن اس شخص کو مصافحہ کی خوشبو آتی رہتی (۱)

پانچویں وصل اس وصل میں حضور کی قوت بصر و بصیرت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ "میں نے اکثر کتابوں میں پڑھا ہے اور سب میں یہ مضمون پایا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عقل میں، سب پر ترجیح رکھتے ہیں، رائے میں سب سے افضل تھے اور آپ اندھیرے میں بھی اسی طرح دیکھتے تھے۔ جس طرح روشنی میں دیکھتے تھے" (۲)

اس وصل میں کئی معتبر احادیث کا تذکرہ کیا ہے

چھٹی وصل اس وصل میں حضور کی قوت بدنیہ وغیرہ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ آپ نے اپنے زمانہ کے بہت بڑے پہلوان کو تین بار کشتی میں پچھاڑا تھا" (۳)

ساتویں وصل اس وصل میں حضورؐ کے بعض خصائص کا تذکرہ ہے۔ کہ حضورؐ کو جامع کلمات عطا ہوئے اور تمام روئے زمین آپ کے لیے مسجد اور پاک بنائی گئی اور مقام محمود مخصوص کیا گیا (۴)

آٹھویں وصل اس وصل میں حضور کے کلام وطعام، نیند، قیام اور نشست کا پوری تفصیل سے تذکرہ کیا ہے کہ حضور تمام زبانیں جانتے تھے، اور آپ کی گفتگو، بیٹھنے کا انداز اور سونے کا انداز کیا تھا۔ (۵)

نویں وصل اس وصل میں حضور کی بعض صفات و مکارم اخلاق، سخاوت، شجاعت و ہیبت وجاہ، بے نفسی و ایثار وغیرہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ کو چالیس مردوں کی قوت دی گئی تھی اس کے علاوہ دیگر خصوصیات کا تذکرہ اس انداز میں کیا ہے کہ حضور کو ایک مثالی شخصیت ظاہر کیا ہے۔ (۶)

دسویں وصل اس میں حضور کی عصمت کا تذکرہ ہے (۷)

۱۔ نشر الطیب ص ۱۵۶ تا ۱۵۸ (۲) ایضاً ص ۱۵۸ (۳) ایضاً ص ۱۵۹ (ایضاً
(۴) ایضاً ص ۱۶۰۔ (۵) ایضاً ص ۱۶۰ تا ۱۶۲ (۶) ایضاً ص ۱۶۲

گیارہویں وصل

یہ وصل دراصل نویں وصل کا تتمہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا تھا۔ اور نہ ہی کسی کے لیے بددعا کی۔ اور نہ ہی کسی کو دینے سے انکار کیا۔ اور آپؐ خلق عظیم پر تھے۔ متعدد احادیث کی روشنی میں حضورؐ کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کیا ہے۔ (۱)

بارہویں وصل

اس وصل میں حضور کے بعض اخلاقِ جمیلہ اور طرزِ معاشرت کا تذکرہ مستند اور معتبر احادیث کی روشنی میں کیا ہے کہ آپؐ میں بہت زیادہ شرم وحیا تھی نہ تو آپ سخت گو تھے اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولا (۲)

تیرہویں وصل

یہ دراصل آٹھویں وصل کا تتمہ ہے کہ حضورؐ اپنی مجلس میں سب سے زیادہ، باوقار ہوتے تھے۔ جب آپؐ چلتے تو جمعیت خاطر سے چلتے۔ آپؐ کے کلمات میں نہایت وضاحت ہوتی تھی۔ اور خوشبو کو بہت پسند فرماتے تھے۔ آپؐ کی چارپائی کھجور کے بان سے بنی ہوئی تھی۔ (۳)

چودھویں وصل

اس وصل میں حضور کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے معیشت میں تنگی کو کیوں اختیار کیا ہوا تھا اس لیے کہ فاقہ آپؐ کو تونگری کی نسبت زیادہ محبوب تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ مجھے دنیا سے کیا کام ہے میرے اولوالعزم پیغمبر بھائیوں نے اس سے زیادہ سخت حالت پر صبر کیا تھا۔ (۴)

پندرہویں وصل

اس وصل میں حضور کی خشیت اور مجاہدہ کا تفصیل سے تذکرہ ہے کہ حضورؐ اللہ تعالےٰ سے بہت روتے تھے۔ نماز پڑھتے، تو قدم مبارک پر ورم آجاتا تھا۔ ستر بار استغفار کیا کرتے تھے۔ نماز کی حالت میں آپؐ کے سینہ میں ہنڈیا کا سا جوش ہوتا تھا (۵) یہ تمام باتیں نہایت رقت انگیز انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔

سولہویں وصل

اس وصل میں حضورؐ کے حسن وجمال کو ایسے خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے کہ اللہ سے غیرت الٰہی کے سبب حضورؐ کا جمال لوگوں کی آنکھوں سے چھپا

---

(۱) نشر الطیب ص ۱۶۲ تا ۱۶۵ (۲) ایضاً ص ۱۶۵ تا ۱۶۸ (۳) ایضاً ص ۱۶۸

(۴) ایضاً ص ۱۶۹ تا ۱۷۱ (۵) ایضاً ص ۱۷۲ تا ۱۷۶

کر رکھا حضورؐ حسن میں، خوش آوازی میں، خوش شکل میں، تمام پیغمبروں سے احسن تھے (۱)

سترہویں وصل

اس وصل میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی، تواضع اور طبیعت کی پاکیزگی کا ذکر متعدد احادیث کی روشنی میں نہایت شاندار انداز میں کیا ہے اور یہ کہ آپ تمام احوال و اقوال و افعال میں کبائر اور محققین کے نزدیک صغائر سے بھی معصوم تھے (۲)

اٹھارویں وصل

اس وصل میں حضور کے تزئین میں اعتدال پسندی کا ذکر کیا گیا ہے کہ آپؐ زینت اور تزئین کو پسند فرماتے تھے۔ سادگی کے ساتھ ساتھ نہایت اعلیٰ قسم کی نظافت اور صفائی کا پورا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ (۳)

انیسویں وصل

یہ وصل آٹھویں اور تیرھویں وصل کا تتمہ ہے۔ حضورؐ کے اکل و شرب کا کیا انداز تھا۔ کون کون سی چیزیں حضورؐ کو پسند تھیں۔ آپؐ کس قسم کی سواری پسند فرماتے تھے اور آپؐ کا لباس کیسا ہوتا تھا، اور آپؐ کے معمولات کیا تھے۔ ایسی باتیں وہی بار بار ذکر کر سکتا ہے جسے کوئی عقیدت و تعلق اور محبت ہو۔ (۴)

بیسویں وصل

اس وصل میں حضورؐ کی وفات شریف کا ذکر ہے کہ حضورؐ نے مرض کے دن کیسے گزارے، وصال پاک کب ہوا، لوگوں کا اضطراب کیسا تھا اور تدفین و تکفین کے مراحل کیسے طے ہوئے۔ (۵)

اکیسویں وصل

یہ وصل ساتویں وصل کا تتمہ ہے کہ حضورؐ کی نیند کیسی تھی اور حضورؐ کا یہ فرمانا کہ "میں رات اس حالت میں بسر کرتا ہوں کہ میرا رب مجھ کو کھلا پلا دیتا ہے۔" ایسی بہت سی احادیث بیان کی گئی ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شان ظاہر ہوتی ہے (۶)

بائیسویں وصل

اس وصل میں حضور پاکؐ کا خوش طبعی اور مزاح فرمانا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خشک و سخت نہیں تھے بلکہ حضورؐ کی طبیعت پاک میں دل لگی اور خوش طبعی بھی پائی جاتی تھی۔ آپؐ کبھی کبھی ظرافت اور مزاح بھی فرمالیا کرتے تھے جو آج کل کے لحاظ سے زندہ دلی میں شامل ہے۔ (۷)

---

(۱) نشر الطیب، ص ۱۶۹ (۲) ایضاً ص ۱۷۱، ۱۷۲ - (۳) ایضاً ص ۱۲۲ تا ۱۷۶

۴- نشر الطیب، ص ۱۷۶ تا ۱۸۰ ۵- ایضاً، ص ۱۸۰ تا ۱۸۱

۶- ایضاً، ص ۱۸۱ ۷- ایضاً، ص ۱۸۲

تیئیسویں وصل

یہ وصل ساتویں اور بائیسویں وصل کا تتمہ ہے کہ آپؐ افضل الانبیاء ہیں (۱)،

چوبیسویں وصل

اس وصل میں حضورؐ کے بعض بشری عوارض کے ظہور اور اس کی حکمت کا ذکر ہے کہ لوگوں کی طرح حضورؐ کو بھی تکالیف و مصائب جھیلنے کا اتفاق ہوا ہے تاکہ آپؐ کا ثواب دگنا ہو۔ حضورؐ کو مرض بھی لاحق ہوا گرمی و سردی کا اثر بھی حضورؐ پر ہوتا تھا۔ بھوک پیاس بھی لگتی تھی، کمزوری، خستگی اور تھکاوٹ بھی ہوتی تھی۔ دشمنوں کے نقصان پہنچانے اور دکھ پہنچانے کا بھی ذکر ہے تاکہ حضورؐ کے شرف کا اظہار ہو اور لوگ حضورؐ کو یہود و نصاریٰ کی طرح الوہیت کا درجہ نہ دے دیں کہ سیّدالانبیاءؐ کو بھی تکالیف پہنچی ہیں تو ہم کیا چیز ہیں۔ (۲)

پچیسویں وصل

اس وصل میں بشری عوارض کے حضورؐ کی روحِ مقدس پر اثر انداز نہ ہونے کے بارے میں ذکر ہے کہ یہ عوارض صرف حضورؐ کے عنصری جسد شریف پر طاری ہوتے تھے۔ رہا حضورؐ کا قلب مبارک، سو وہ تعلق بالخلق سے منزہ، مقدس اور مشاہدۂ حق میں مشغول تھا، کیونکہ حضورؐ ہر آن، ہر لحظہ، اللہ ہی کے ساتھ، اللہ ہی کے واسطے، اللہ ہی میں مستغرق اور اللہ ہی کی محبت میں تھے، حتیٰ کہ آپ کا کھانا، پینا، پہننا، حرکت، سکون، بولنا، خاموش رہنا، سب اللہ ہی کے واسطے اور اللہ ہی کے حکم سے تھا۔ حضورؐ جو بھی بولتے تھے وہ وحیِ ربانی ہوا کرتا تھا۔ (۳)

اجمالی خاکہ

اس پوری تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں مولاناؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک اجمالی خاکہ ہے، اس کو یاد رکھو، کیونکہ اس پر سوائے علماء و محققین کے اور وہ بھی کثیر تعداد کتابوں کی اور لائبریریوں کی چھان بین کے بعد ان چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر شخص ان پر مطلع نہیں ہو سکتا اور ہم نے آپ لوگوں کو ایک ایسا نفع بخش، دل پسند اور طبیعت کو سکون پہنچانے والا مجموعہ اکٹھا کر دیا ہے جس کو تم بہت تھوڑے وقت میں یاد کر سکتے ہیں آخر میں حضرت کاندھلویؒ نے ان تمام لوگوں کے لیے دعا کی ہے جو اس کو پڑھیں، لکھیں، سنیں، یاد کریں، کسی کے سامنے نقل کریں اور اس کو تالیف کریں کہ اے اللہ ان تمام لوگوں کو بخش دیجیے۔ (۴)

اس رسالہ کے خاتمہ پر حضرت والاؒ نے اپنے چند عربی اشعار لکھے ہیں کہ وہ حضورؐ کے دربار شریف میں بطور تحفہ اور صلوٰۃ وسلام کے بھیجے گئے ہیں۔ پہلا شعر ہے

۱۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۔ نشر الطیب ص ۱۸۳، ۱۸۴

۳۔ ایضاً ص ۱۸۴، ۱۸۵

۴۔ ایضاً ص ۱۸۵

یا شفیع العباد خذ بیدی   انت فی الاضطرار معتمدی(۱)

(دستگیری کیجئے میرے نبی   کشمکش میں تم ہی ہو میرے نبی)

عربی اشعار حضورؐ کی خدمت میں اس انداز میں پیش کئے ہیں کہ گویا وہ حضورؐ کی خدمت میں دست بستہ کھڑے ہیں اور پورے راز و نیاز سے عرض گذار ہیں (۱) عربی اشعار کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ   فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی

ابنِ عبداللہؐ زمانہ ہے خلاف   اے مرے مولا خبر لیجئے مری

کچھ عمل ہے اور نہ طاعت میرے پاس   ہے مگر دل میں محبت آپؐ کی

میں ہوں بس اور آپؐ کا در یا رسولؐ   ابرِ غم گھیرے نہ پھر مجھ کو کبھی

خواب میں چہرہ دکھا دیجئے مجھے!   اور مرے عیبوں کو کردیجئے خفی !

کاش ہو جاتا مدینہ کی میں خاک   نعل بوسی ہوتی کافی آپؐ کی

اس قدر الحاح و عاجزی وہی شخص کرسکتا ہے جو عقیدت و محبت اور عشق و الفت میں سرشار ہو اور اس کے روئیں روئیں سے حُبِ رسولؐ کی جھلک نمایاں ہو۔ حضرت تھانویؒ نے ان اشعار کا اضافہ کرکے اپنے جذبات کی صحیح اور بجا عکاسی کی ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی کے رگ و ریشے میں حُبِ رسولؐ رچی بسی تھی اور وہ صحیح معنوں میں عاشق رسولؐ تھے۔

اکیسویں فصل میں عجیب اتفاق ہے کہ اس فصل کے اجزا بھی ۲۵ ہیں، جو وصل کے نام سے موجود ہیں ان پچیس وصل کے بعد حضرت کاندھلویؒ نے روض نظیف کے اشعار لکھے ہیں، جو اتفاق سے ۲۵ ہیں۔ ان ۲۵ اشعار میں پورے رسالے کا نچوڑ بیان کر دیا ہے جو بآسانی یاد ہوجاتا ہے۔ حضرت نے لکھا ہے کہ "میں نے اپنے مدحیہ کلام کو حضورؐ کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق جلیلہ سے زینت دی ہے۔ حضورؐ محسن ہیں، شفیق ہیں، رحیم ہیں اور اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔"

بائیسویں فصل۔ حضورؐ کے بعض معجزات

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے بعض معجزات کا ذکر کیا ہے، خود لکھتے ہیں کہ "اگر صحیح نظر سے کام لیا جائے تو حضورؐ کے معجزات حد و حساب سے بالاتر ہیں کیونکہ حضورؐ کا ہر قول، فعل اور حال اسرار و رموز اور مصلحت کے لحاظ سے خارق عادت ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال و افعال اور احوال کے تمام جزئیات

۱۔ ایضاً ص ۱۸۶ ۲۔ نشر الطیب ص ۱۸۶، ۱۸۷ ۳۔ ایضاً ص ۱۸۷ تا ۱۹۰

کا شمار کرنا عادتاً نہ تو ممکن ہے اور نہ واقع میں ہے۔"

حضورؐ کے معجزات حد اور عدد سے وراء ہیں اور اگر عوام کے ادراک سے باہر ان خوارق پر ہی اکتفا کیا جائے، جو ظاہر میں بھی خارق ہیں، تو وہ بھی دس ہزار سے کم نہیں اور اگر صرف قرآن مجید کی بلاغت کے اعتبار سے دیکھ لیا جائے تو سات ہزار سات سو معجزہ پر تو صرف قرآن مجید ہی ہے اس لئے کلام اللہ میں سات ہزار سات سو معجزہ ہیں۔ محدثین اور سیرت نگاروں نے جو معجزات حضور کے اپنے علم کے مطابق لکھے ہیں، وہ تین ہزار ہیں جن میں سے ایک ہزار معجزے امام سیوطیؒ نے "خصائص کبریٰ" میں نقل کئے ہیں۔ اور تین سو سے زائد "الکلام المبین" میں مذکور ہیں، تو اس حساب سے دس ہزار سے زائد ہوتے ہیں جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ "الکلام المبین" کا مطالعہ کریں جو کافی اور موجبِ تقویتِ ایمان ہے اس میں ہے، کہ حضورؐ کے معجزات دنیا کے تمام اقسام کے متعلق ہیں نیز ہر قسم کے معجزات کو جدا جدا ذکر کیا ہے۔ (۱)

حضرت تھانوی فرماتے ہیں:۔

"چونکہ یہ میرا رسالہ بہت مختصر ہے اس لئے اس میں شرفِ تقریر کو بوجہ اس کے دل پذیر و دلچسپ ہونے کے نقل کر کے تمام اقسام کے معجزات میں سے دو چار تک اکتفا کرتا ہوں۔" (۲)

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں حضورؐ کے ۲۵ معجزات اس انداز میں بیان کئے ہیں کہ قاری پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ حضورؐ پوری کائنات میں اللہ کی ایک بے مثال ذاتِ مقدس ہے۔ (۳)

تیئسویں فصل۔ حضورؐ کے اسمائے شریفہ مع تفسیر

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسماء شریفہ مختصر تفسیر اور تشریح کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور اکثر ان اسماء میں ان کا ذکر کیا ہے جو کسی وصف یا وصف پر غالب ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ۲۵، ۳۰ کے درمیان تک شمار کئے گئے ہیں ورنہ حضورؐ کے اوصاف میں سے اگر ہر وصف سے ایک اسم نکالا جائے تو دو سو سے زائد، بلکہ بعض علماء کے کہنے کے مطابق ایک ہزار تک پہنچ جاتے ہیں۔ (۴)

حضرتؒ نے نہایت اختصار اور عقیدت سے ان اسماء شریفہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ نشر الطیب ص ۱۹۱

۲۔ ایضاً ص ۱۹۲

۳۔ ایضاً ص ۱۹۱ تا ۲۰۳

۴۔ ایضاً ص ۲۰۴، ۲۰۵

چوبیسویں فصل۔ حضورؐ کی بعض خصوصیات

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام میں سے صرف حضورؐ ہی کو عطا کی ہیں۔ (۱)

پچیسویں فصل۔ حضورؐ کے خورد و نوش اور سواریوں کا ذکر

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا خود حضورؐ سے استعمال ثابت ہے اور بعض وہ ہیں کہ حضورؐ نے ان کو پسند فرمایا ہے اور ان کی تعریف کی ہے۔ (۲)

چھبیسویں فصل۔ حضورؐ کے اہل و عیال، خدام اور رشتہ دار

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کی ازواج مطہرات اولاد، چچا، پھوپھیاں، کنیزیں، غلام، خدام، موذنین، پہرہ دار، کاتبین، شعراء اور خطیبوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ (۳)

ستائیسویں فصل۔ حضورؐ کی وفات شریف امت کے لئے مظہرِ رحمتِ الٰہیہ۔

حضورؐ کی وفات شریف کا واقعہ اگرچہ طبعی اور فطری لحاظ سے ایسا جان فرسا اور ہوشربا ہے کہ اس ایسا دوسرا واقعہ نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت العالمین ہونے کی ایسی مطلق ہے کہ اس واقعہ میں بھی اس کا ظہور بدرجہ اتم ہوا یعنی یہ وفات شریف بھی امت کے لئے مظہرِ رحمت الٰہیہ ہوئی اور جب حضورؐ رحمت کا سبب ہیں تو خود کس درجہ رحمت کے مورد ہوں گے۔ اس لحاظ سے یہ وفات شریف خود حضورؐ کے لئے بھی نعمتِ عظمٰی ہوئی چنانچہ حضرت تھانویؒ نے ان دونوں دعوؤں کے ثبوت کے لئے شرعی لحاظ سے اور نص سے ایسی روایات پیش کی ہیں تاکہ حضورؐ کے فضائل ہر رنگ میں واضح ہو جائیں ورنہ خوشی میں غم کا ذکر کرنا کوئی مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے ۱۲ روایتیں نقل کی ہیں (۴) اور ہر ہر روایت میں ایسی بیش بہا حکمتیں بیان کی ہیں جو ایک عقیدت مند ہی لکھ

۱۔ نشر الطیب ص ۲۰۶، ۲۰۷
۲۔ ایضاً ص ۲۰۸ تا ۲۱۶
۳۔ ایضاً ص ۲۱۷ تا ۲۱۹
۴۔ ایضاً ص ۲۲۰ تا ۲۳۲

سکتا ہے مثلاً :۔

"حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور سے پوچھا کہ "جس کا کوئی بچہ آگے نہ گیا ہو اور بچپن میں نہ مرا ہو" تو آپ نے فرمایا: "اپنی اُمت کے لئے میں آگے جاتا ہوں، کیونکہ میری وفات کی برابر اُن پر کوئی مصیبت ہی نہ ہو گی"۔ ابنِ ماجہ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "جس پر کوئی مصیبت نہ آئے وہ میری مصیبت کو یاد کر کے تسلی حاصل کر لے" (۱) یہ روایت نقل کر کے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں، اس حدیث سے بھی حضور کی وفات شریف کی ایک حکمت اُمت کے لئے معلوم ہوئی، کہ اس پر صبر کرنے سے ثوابِ عظیم کے مستحق ہونگے اور اس میں ثواب کے علاوہ ایک اور حکمت تسلی کی معلوم ہوئی (۲) اس پوری فصل میں حضرت تھانویؒ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر حال اور ہر رنگ میں پوری کائنات کے لئے رحمت ہیں، اور یہ کہ حضورؐ نے آخرت کے سفر کو خود پسند فرمایا تھا اور آپ کی پسند ہی آخرت کے خیر ہونے کی دلیل ہے (۳)

اس فصل میں حضورؐ کے مرض کے ایام، معمولات، لوگوں کو تسلی اور حوصلہ دلانا، خصوصی احکام، صحابہ کرامؓ کا مقام، حضورؐ کے وصال پاک پر صحابہ کرامؓ کے علاوہ فرشتوں کا رونا اور اظہار افسوس کرنا، غسل شریف اور تدفین و تکفین میں حضورؐ کی خصوصیات، حضورؐ کی قبر شریف، اس کی کیفیت اور زیارت سے متعلق تفصیلی معلومات حضرت تھانویؒ نے اس انداز میں ذکر ہیں کہ ہر محبِ رسولؐ اس کی چاشنی محسوس کرنے لگتا ہے(۴) آخر میں چند عربی کے نعتیہ اشعار ذکر کئے ہیں کہ "الا یا رسول اللہ کنت رجاءنا"(۵) (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ ہمارے امیدگاہ تھے اور ہم پر شفیق تھے سخت نہ تھے)

اٹھائیسویں فصل۔ عالمِ برزخ میں حضورؐ کے تشریف رکھنے کے متعلق بعض احوال وفضائل

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کے عالمِ برزخ میں تشریف رکھنے کے بعض حالات اور فضائل کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ (۶) کہ سعیدؓ بن مسیب سے روایت ہے کہ "کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ نبی کریمؐ

۱۔ نشر الطیب ص ۲۲۳

۲۔ ایضاً ص ۲۲۳

۳۔ ایضاً ص ۲۲۱

۴۔ ایضاً ص ۲۲۰ تا ۲۳۲

۵۔ ایضاً ص ۲۳۲

۶۔ ایضاً ص ۲۳۳ تا ۲۳۵

پر حضورؐ کی اُمت کے اعمال صبح و شام پیش نہ کیے جاتے ہوں۔"

حضورِ پاک اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپؐ کو اس عالم کا رزق دیا جاتا ہے اور آپؐ نماز پڑھتے ہیں جو کہ صرف لذت حاصل کرنے کے لئے ہے۔ حضورؐ پر درود شریف پڑھنے کا ثواب اور کیفیت کا ذکر کیا ہے کہ صبح و شام ستر ستر ہزار فرشتے نازل ہو کر حضورؐ کی قبر شریف کے گرد احاطہ کرتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں ایسی متعدد روایات سے حضورؐ کے عالمِ برزخ میں شرفِ عظیم کو ظاہر کیا ہے۔ (۱)

آخر میں حضرت تھانویؒ نے "روضِ نظیف" کے عربی اشعار لکھ کر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ حضورؐ کے مزار شریف پر کوئی شکستہ حال حرص حاجت کو نہیں پہنچا مگر اپنی شکستگی کی اصلاح ہو گئی اور جو فقیر بھی حاضر ہوا اس کے لئے نہر جاری ہو گئی"۔ (۲)

یہ سب برکات حضورؐ کے عالمِ برزخ ہی میں ظاہر ہیں۔

انتیسویں فصل۔ حضورؐ کے بعض مخصوص فضائل جو قیامت میں ظاہر ہوں گے

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے دس روایات ایسی ذکر کی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایسے مخصوص فضائل ہیں جو قیامت میں ظاہر ہوں گے ان میں یہ ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "میں اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، سب سے پہلے میری قبر مبارک شق ہوگی اور میں قبر سے نکلوں گا، اور سب سے پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا، اور سب سے اوّل میری شفاعت قبول ہوگی۔ قیامت کے روز سب سے زیادہ میری اُمت ہوگی، سب سے پہلے جنت کا دروازہ میں کھولوں گا، اور حضورؐ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ سب رسولوں سے پہلے میں اپنی اُمت کو لے کر پُلِ صراط عبور کروں گا"۔ (۳)

ایسی کئی احادیث نقل کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مخصوص فضائل ذکر کئے ہیں۔ اس کے ساتھ قصیدہ کے چند اشعار لکھ کر حضرت تھانویؒ نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ (۴)

۱۔ نشر الطیب

۲۔ ایضاً ص ۲۳۵

۳۔ ایضاً ص ۲۳۶ تا ۲۳۸

۴۔ ایضاً ص ۲۳۹

تیسویں فصل۔ حضورؐ کے بعض مخصوص فضائل جو جنت میں ظاہر ہوں گے

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے ایسی سات روایات کا ذکر کیا ہے جن میں حضورؐ کے ایسے مخصوص فضائل کا ذکر کیا ہے جو جنت میں ظاہر ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

"سب سے پہلے جنت کے دروازے میں کھلواؤں گا۔ مجھے کوثر عطا ہوگی جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اس کے کنارے موتی اور یاقوت کے محل ہوں گے، اس کی گہرائی ستر ہزار فرسخ ہے، مقام محمود مجھے عطا ہوگا، میری اُمت کے لوگ سب اُمتوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔" ایسی بہت سی روایات ذکر کی ہیں جن سے حضورؐ کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ (۱)

اکتسویں فصل۔ حضورؐ کے افضل المخلوقات ہونے میں

اس فصل میں ایسی پانچ روایات ذکر کی ہیں جن سے حضورؐ کا افضل المخلوقات ہونا ثابت کیا ہے۔ (۲)

بتیسویں فصل۔ بعض آیات کی مختصر تحقیق

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے دس قرآنی آیات جن کے ظاہر الفاظ سے حضور نبی کریمؐ کے فضائل کے معارضہ کا نعوذ باللہ وسوسہ پیدا ہوسکتا ہے، ان کی مختصر تحقیق کی ہے مثلاً "ووجدك ضالا فهدىٰ" اس کے متعلق حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: "یہاں ضلال کے وہ معنی نہیں جو اردو محاورہ میں استعمال ہوتے ہیں کیونکہ ہر زبان کا لغت اور محاورہ جدا ہے اس لئے عربی میں اس کے معنی مطلق ناواقفی کے ہیں اور وہ اپنی دونوں قسم کو عام ہے۔ ایک وہ جو احکام آنے کے پہلے ہو، اور ایک وہ جو احکام کے معارضہ میں ہو اس لئے پہلا مذموم نہیں، دوسرا مذموم ہے کیونکہ نبوت کے بعد جو علوم وحی سے معلوم ہوتے ہیں، ظاہر ہے قبل نبوت وہ معلوم نہیں تھے، لہٰذا یہ آیت ایسی ہوئی جیسے ارشاد ہے "وعلمك مالم تكن تعلم" (اور آپؐ کو وہ کچھ سکھا دیا جو اس سے پہلے معلوم نہیں تھا) اسی طرح باقی آیات میں جو وسوسے پیدا ہو (۳)

۱۔ نشر الطیب ص ۲۵۵ تا ۲۵۷ ۲۔ ایضاً ص ۲۵۶

۳۔ ایضاً ص ۲۴۷ تا ۲۵۱

سکتے ہیں، ان کو پوری تحقیق کے ساتھ اسی طرح تحریر کیا ہے کہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس کے متعلق ہر قسم کے شبہات دور ہو گئے ہیں۔ اسی سے حضرت تھانویؒ کی عقیدت و محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تینتیسویں فصل۔ حضورؐ کی عبدیت

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رسالت میں اکمل تھے اسی طرح عبدیت کے بھی اعلیٰ مدارج طے کئے ہوئے تھے، اور بشریت کے بھی اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کے عبد ہونے کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے اس سلسلے میں پانچ روایات بیان کی ہیں جن سے حضورؐ کے اکمل بشر ہونے کو ثابت کیا ہے، اور بشری لوازمات کا ذکر کر کے یہ واضح کیا ہے، کہ حضورؐ خود بھی بندۂ خدا تھے اور ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ ہی سمجھتے اور کہتے رہے۔ حضرت عمرؓ کی روایت پیش کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"مجھ کو اتنا مت بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ کو بڑھا کر خدا کا درجہ دے دیا تھا۔ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا تم مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ کہا کرو۔"

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ "میں بشر ہوں جیسے تم بھولتے ہو میں بھی بھولتا ہوں اس لئے جب میں بھول جاؤں مجھ کو یاد دلا دیا کرو"

حضرت تھانویؒ کا مقصد یہ ہے کہ عقیدت و محبت میں شرعی حد سے تجاوز نہ کیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ حضورؐ کو اُلوہیت کا درجہ دیا جائے۔ (۱)

چونتیسویں فصل۔ حضورؐ کی اُمت کے ساتھ شفقت

اس فصل میں حضرت تھانویؒ نے اُمت کے ساتھ حضورؐ کی شفقت کے بارے میں سات روائتیں بیان کی ہیں (۲) کہ "حضورؐ اپنی اُمت کے لئے دعا فرماتے تھے۔ اللہ نے آپؐ کی دعا کو قبول فرمایا کہ سب گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں، سوائے حقوق العباد کے کہ ظالم سے مظلوم کا حق ضرور وصول کروں گا۔"

حضرت ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "صحابہ تو میرے دوست ہیں اور میرے

۱۔ نشر الطیب، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴   ۲۔ ایضاً ص ۲۵۵ تا ۲۵۷

بھائی وہ لوگ ہیں جو ابھی نہیں آئے۔"

ان روایات کے بیان کرنے سے حضرت تھانویؒ کی غرض یہ ہے کہ ہماری عقیدت ومحبت اس لحاظ سے بھی حضورؐ کے ساتھ زیادہ ہونی چاہیئے کہ حضورؐ ہم پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔ (۱)

پینتیسویں فصل۔ حضورؐ کے حقوق جو اُمت کے ذمہ ہیں

اس فصل میں حضرت تھانویؒ کے حضورؐ کے ان حقوق کا ذکر کیا ہے جو اُمت کے ذمہ لازم ہیں۔ ان میں سب سے بڑے حقوق حضورؐ سے محبت، اور حضورؐ کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، کیونکہ جس شخص سے محبت ہو، تو اس کا تقاضا اطاعت وفرمانبرداری ہے، اور یہ تین چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے ایک تو محبوب کے کمال کی وجہ سے، دوسرے اس کے حسن وجمال کی وجہ سے اور تیسرے نوال یعنی عطا وبخشش کی وجہ سے، چونکہ تینوں صفات حضورؐ کی ذاتِ اقدس میں پوری طرح موجود ہیں اس لئے اکیسویں اور چونتیسویں فصل کا ذکر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ حضورؐ کے ساتھ امت کو اعلیٰ درجے کی محبت ہونی چاہیئے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے اور نص سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "جس نے میری سنت سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔"

ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے، کہ گناہ گاروں کی محبت کو بھی حضورؐ نے پسند فرمایا۔ اس لئے خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو اس پر لعنت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس سلسلے میں پانچ روایات بیان کر کے حضورؐ سے محبت کرنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے (۲)

چھتیسویں فصل۔ حضورؐ کی توقیر، ادب واحترام

اس فصل کا تعلق دراصل گزشتہ فصل کے ساتھ ہے اس میں حضورؐ کے اعلیٰ حقوق جو توقیر اور ادب واحترام کے سلسلے میں واجب اور ضروری ہیں، ان کے بارے میں پانچ قرآنی آیات مع ترجمہ وتشریح اور پانچ روایات بیان کی ہیں۔ (۳) "ایمان والو اللہ اور رسول کی اجازت سے پہلے تم کسی قول یا فعل

۱۔ نشر الطیب ص ۲۵۶ ۲۔ ایضاً ص ۲۵۸ تا ۲۶۱

۳۔ ایضاً ص ۲۶۲ تا ۲۶۹

میں سبقت مت کیا کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں بلند آواز سے باتیں نہ کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ ایسی آیات اور روایات بیان کر کے حضرت تھانویؒ نے مسلمانوں کو حضورؐ کے ادب و احترام اور عزت کرنے کی طرف راغب کیا ہے جو مومن کا بہترین سرمایہ ہے۔

سینتیسویں فصل۔ حضورؐ پر درود کی فضیلت

یہ فصل بھی گزشتہ فصل کا تتمہ ہے کیونکہ یہ بھی حضورؐ کے حقوق وآداب سے متعلق ہے اسمیں سات روایات ذکر ہیں کہ جو حضورؐ پر ایک دفعہ درود شریف بھیجے گا، اس کے دس درجے بلند ہونگے اور دس گناہ معاف ہوتے ہیں اور دعا اس وقت تک زمین وآسمان کے درمیان معلق رہتی ہے جب تک اپنے نبیؐ پر درود نہ پڑھو۔

اس سلسلے میں سات روایات، پانچ حکمتیں اور فوائد کا تذکرہ کیا ہے۔ (۱) اس سے حضرت تھانویؒ کی عقیدت ومحبت اور تعلق کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخر میں بعض عاشقوں کے خصوصی چند اشعار لکھے ہیں جنکا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تمام لوگوں کے مونس پر رحمت بھیج جو قبر میں وحشت کو انس و محبت میں بدل دیں گے۔" (۲)

اڑتیسویں فصل۔ دعا کے وقت حضورؐ کا وسیلہ پکڑنا

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں یہ واضح کیا ہے کہ دعا میں حضورؐ کا وسیلہ پکڑنا جائز ہے اس کی صورت یہ ہے کہ وہ یہ کہے۔

"اے اللہ فلاں بندے پر تیری رحمت ہوتی ہے اور جس پر تیری رحمت ہوتی ہے، اس سے محبت رکھنا اور اس پر اعتقاد رکھنا بھی تیری رحمت کو متوجہ کرنے کا سبب ہے۔ چونکہ ہم اس سے محبت اور اعتقاد رکھتے ہیں اس لئے ہم پر بھی رحمت فرما۔" صحابہ کرامؓ حضورؐ کے توسل سے دعا مانگا کرتے تھے۔

حضرت تھانویؒ کا خیال ہے کہ وفات کے بعد بھی وسیلہ پکڑنا ثابت ہے کہ یا اللہ یہ تیرے نبی کی قبر ہے جس کو ہم حضورؐ کے جسدِ مبارک کی وجہ سے متبرک سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے وسیلے سے ہم پر

۱۔ نشر الطیب ص ۲۷۰ تا ۲۷۵ ۲۔ ایضاً ص ۲۷۵

رحم فرما۔ اس سلسلے میں قرآن کی آیات اور پانچ روایات ذکر کی ہیں۔ اس باب میں بھی حضرت تھانویؒ کا حضورؐ کے ساتھ تعلق اور عقیدت ظاہر ہے۔ (۱)

انتالیسویں فصل۔ حضورؐ کو بار بار یاد کرنا

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، چونکہ شدید محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کو بار بار یاد کیا جائے۔ اس لئے اس فصل میں ایسی پانچ روایات بیان کی ہیں، جن سے حضور نبی کریمؐ کی محبت کا واجب ہونا ثابت ہے۔ شرعی اور طبعی دونوں لحاظ سے بھی حضورؐ کو کثرت سے یاد کرنے، حضورؐ سے محبت رکھنے اور آپؐ پر درود شریف بھیجنے کا ثبوت موجود ہے۔ اس فصل کے تذکرے سے بھی حضرتؒ والا کی محبت و عقیدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے (۲)

چالیسویں فصل۔ خواب میں حضورؐ کی زیارت

خواب میں حضورؐ کی زیارت کے بارے میں حضرت تھانویؒ نے تین روایتیں نقل کی ہیں۔ حضرتؒ لکھتے ہیں کہ جس شخص کو بیداری میں یہ شرف نصیب نہیں ہوا، اس کے لئے خواب ہی میں زیارت سے مشرف ہو جانا، سرمایہ تسلی اور فی نفسہ ایک نعمت عظمیٰ اور دولت کبریٰ ہے اور یہ سعادت کسی محنت اور کسب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ صرف ایک وہبی چیز ہے۔ ہزاروں کی عمریں اس حسرت میں ختم ہو گئیں۔ البتہ غالب یہ ہے کہ کثرت درود شریف، اتباع سنت میں کمال اور محبت کے غلبہ پر یہ سعادت حاصل ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ لازمی اور ضروری نہیں، کہ ضرور ہی ہو۔ اس لئے نہ ہونے سے مغموم اور غمگین نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ بعض لوگوں کو زیارت نہ ہونے ہی میں حکمت و رحمت ہوتی ہے۔ عاشق کو محبوب کی رضا سے غرض رکھنی چاہئے خواہ اس میں وصل ہو تب بھی اور ہجر ہو تب بھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بہت سے ایسے تھے، جنہوں نے صورت میں تو زیارت نہ کی، اور ہجر ہی میں رہے، جیسے حضرت اویسؓ قرنی۔ حضرتؒ کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ہر حال میں خوش ہیں۔ (۳)

۱۔ نشر الطیب ص ۲۷۶ تا ۲۷۹ ۔۔۔ ۲۔ ایضاً ص ۲۸۰ تا ۲۸۲

۳۔ ایضاً ص ۲۸۳ تا ۲۸۶

اکتالیسویں فصل۔ صحابہؓ، اہل بیتؓ اور علماء کی محبت و عظمت

حضرت تھانویؒ نے اس فصل میں حضرات صحابہ کرامؓ اہل بیتؓ اطہار اور علماء سے محبت رکھنے اور ان کی توقیر و عزت کرنے اور ان کی عظمت کے بارے میں متعدد مستند روایات ذکر کی ہیں کہ ان کی محبت و متابعت موجب نجات ہے اور بغض و مخالفت ہلاکت کا سبب ہے۔ اس فصل کے بارے میں حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں۔

"اس کی وجہ ظاہر ہے کہ محبوب کے متعلقین طبعی طور پر محبوب ہوتے ہیں، خصوصاً وہ متعلقین جو محبوب کے محبوب اور ممدوح بھی ہوں اور محبوب نے ان کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم بھی دیا ہو، تو وہ شرعی لحاظ سے بھی محبوب ہوں گے، اور سب سے بڑھ کر ایسی حالت میں کہ اب محبوب تک رسائی کی بھی توقع نہ رہی ہو، تو محبوب کے قائم مقاموں کو ہی غنیمت سمجھنا چاہیے، جو لوگ ان کو محبوب نہیں سمجھتے ان کا حُبِ رسولؐ کا دعویٰ غلط ہے۔ (۱)

اس فصل میں فضائل صحابہؓ کے بارے میں تین روایات، فضائل اہل بیت کے بارے میں تین روایات اور فضائل علماء کے بارے میں بھی تین روایات نقل کی ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرتؒ کو حضورؐ کے متعلقین اور محبوبوں کے ساتھ بھی محبت تھی۔ (۲)

خاتمہ

حضرت تھانویؒ نے "نشر الطیب" کے خاتمہ میں بھی مقدمہ کی طرح تین مضمون بیان کئے ہیں۔

پہلا مضمون

یہ مضمون فصل ۳۷ کا تتمہ ہے (۳) اس میں درود شریف کے فضائل مذکور ہیں اس سلسلے میں حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ "زاد السعید" سے درود شریف کی چالیس احادیث پوری کی پوری نقل کر دی ہیں تاکہ اس رسالے کے پڑھنے والے آخر میں ایک بار تو ضرور پڑھ لیں، اور فصل ۳۷ پر عمل بھی ہو جائے۔ جس میں درود شریف پڑھنے اور حضورؐ کا بار بار ذکر کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۔ نشر الطیب ص ۲۸۷

۲۔ ایضاً ص ۲۸۷ تا ۲۹۲

۳۔ ایضاً ص ۲۹۳ تا ۲۹۸

دوسرا مضمون

یہ مضمون فصل ۳۸ کا تتمہ ہے، جس میں حضورؐ کے ساتھ توسّل حاصل کرنے کی برکت کا ذکر ہے۔ قصیدہ بردہ سے توسّل حاصل کرنا، حضورؐ کے نعل شریف کے نقشہ کے برکات وخواص اور حضرت تھانویؒ نے اپنے رسالہ نیل الشفا میں مدحیہ الفاظ کا ذکر کیا ہے اکہ کس طرح یہ چیزیں عاشق کے لیے باعث طمانیت قلب ہیں[1]۔

تیسرا مضمون

یہ مضمون فصل ۳۹، ۴۰ کا تتمہ ہے۔ اس میں درود شریف کے بعض ایسے صیغے مذکور ہیں، جن کے بارے میں بزرگوں کے تجربہ کو زیادہ دخل ہے کہ اُن کے پڑھنے سے حضورؐ پاک کی خواب میں زیارت ہوجاتی ہے۔ اور بعض صلحاَ نے حضورؐ کے بعض ارشادات جو خواب میں زیارت کے وقت سنے ہیں، اُن کا بھی تذکرہ ہے[2]۔

پہلا حصہ

اس حصہ میں شیخ عبدالحق محدث دھلویؒ سے نقل کیا ہے اکہ انہوںؒ نے "کتاب ترغیب اھل السعادات" میں لکھا ہے اکہ جمعہ کی شب میں دو رکعت نماز نفل اس طرح پڑھے کہ ہر رکعت میں "گیارہ بار آیۃ الکرسی" اور "گیارہ بار قل ھو اللہ" اور سلام کے بعد" سو بار یہ درود شریف پڑھے۔ انشاء اللہ تین جمعہ نہ گزرنے پائیں گے کہ حضورؐ کی زیارت نصیب ہوگی۔ وہ درود شریف یہ ہے

"اللھم صل علی محمد النبی الامی والہ واصحابہ وسلم"

شیخ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں الحمد شریف کے بعد ۲۵ بار قل ھو اللہ، اور سلام کے بعد یہ درود شریف ہزار بار پڑھے اور اس کو زیارت کی دولت نصیب ہوگی۔ درود یہ ہے: "صلی اللہ علی النبی الامی"

اس کے علاوہ بھی شیخ عبدالحق دھلویؒ کے زیارت شریف کے بارے میں طریقے ذکر کئے ہیں[3]۔

دوسرا حصہ

حضرت تھانویؒ نے اس حصے میں صلحاَ کی ان خوابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں وہ حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور حضورؐ پاک نے ان کو جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ تفصیل سے بیان کیا ہے[1]۔

۱- نشر الطیب، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰

۲- ایضاً، ص ۳۰۰   ۲- ایضاً ص ۳۰۰

۱- نشر الطیب: ص ۳۰۱، ۳۰۲

حضرت تھانویؒ نے اپنی کتاب نشر الطیب ۱۳۲۹ھ کو مکمل کی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ حضرتؒ نے یہ کتاب کس عقیدت ومحبت اور خلوص کے جذبات سے لبریز ہو کر لکھی ہے۔ ایک طرح سے آپ پر وجدانی کیفیت طاری تھی، اور عشق ومستی میں سرشار تھے۔ اس کا پڑھنے والے کو بخوبی ہوجاتا ہے۔ حضرتؒ نے یہ ثابت کیا ہے، کہ اللہ عزوجل نے اپنے محبوب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات وصفات کا مظہرِ اتم، حقیقت ومعرفت کے تمام ظاہری وباطنی کمالات کا مخزن روحانیت کے تمام محاسن اوصاف کا معدن بنایا تھا، اور آپؐ کو وہ حسن وجمال عطا فرمایا جسے دیکھ کر نظریں خیرہ ہوگئیں، اور جس کا مشاہدہ کرکے زبان کو عالمِ حیرت میں یہ کہنا پڑا، ایسا حسن وجمال تو نہ سے قبل دیکھا گیا اور نہ ان کے بعد۔

آپؒ کے یہ جذبات کس قدر جذبۂ شوق، اخلاص اور محبتِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کرتے ہیں۔

بہرکیف "نشر الطیب" کا مطالعہ، قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے، کہ اس قسم کی تحریر صرف اسی شخص کے قلم سے نکل سکتی ہے، جو از سرتا پا عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہو۔ الفاظ بولنے اور لکھنے والے کے جذبات اور دلی کیفیات کے بہترین ترجمان وعکاس ہوتے ہیں۔

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسا موضوع ہے کہ جسکو چھیڑ دیا جائے، تو اس کو ختم کرنا مشکل ہے، کیونکہ عاشق ہمیشہ اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ محبوب کی ہر بات اور ہر ادا سے آگاہی حاصل کرے۔ اس کے لیے وہ زندگی ختم کر دیتا ہے، حضرت تھانویؒ اس پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

> "محبت کا انحصار معرفت پر ہے، یعنی جب تک کسی چیز کی معرفت نہ ہوگی، اس چیز
> سے محبت نہیں ہو سکتی
> اور اس درجہ کی معرفت ہوگی اسی درجہ کی محبت بھی ہوگی۔"[1]

حضرت تھانویؒ کے دل میں حضورؐ کی محبت وعقیدت اس درجہ رچ بس گئی تھی کہ آپ حضورؐ کو کثرت سے یاد کرتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] القول الجلیل، ص ۲۴

"محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر بار حضورؐ کے نام مبارک زبان پر آنے سے درود شریف پڑھے "[2]

اس لیے کہ:

درود شریف ایسی اطاعت ہے، جو کبھی رد نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ حضورؐ کے لیے رحمت کی درخواست ہے۔ اور حضورؐ اللہ کے محبوب ہیں، اور جو محبوب کے لیے درخواست کی جاتی ہے، وہ رد نہیں ہوتی[3]

حضرت تھانویؒ کو حضورؐ کے ساتھ اس قدر محبت و عقیدت تھی، کہ آپؐ کی خوشنودی حاصل کرنے کو گناہوں کا کفارہ سمجھتے تھے، آپؒ فرماتے ہیں۔

"کوتاہی کرنے کا گناہ صرف توبہ کرنے سے معاف نہ ہو گا، بلکہ اس کی تلافی توبہ کے ساتھ حضورؐ کو خوش کرنے سے ہوگی، جس کا طریقہ یہ ہے، کہ کوتاہی ہو جانے کے بعد اللہ تعالٰی سے توبہ بھی کرے، اور آئندہ درود شریف کی کثرت کرے، یہاں تک کہ دل گواہی دے، کہ حضورؐ خوش ہو گئے ہیں"[4]

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے نزدیک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و محبت دین حق کی شرطِ اولین تھی، کیونکہ اگر اسی میں کمی ہوگی، تو پھر سب کچھ نامکمل ہے۔ اسی محبت و عقیدت کی بدولت کی بدولت مومن کے بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔

آپؒ نے ہندوستان کے کسی مقام کا ایک واقعہ بیان فرمایا، کہ ایک بزرگ گنگا کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں انہوں نے ایک جوگی کو دیکھا کہ وہ بیٹھا اپنے چیلوں کو توجہ دے رہا ہے۔ یہ بھی تماشے کے طور پر وہاں بیٹھ گئے۔ بس بیٹھنا تھا، کہ ان کو یہ محسوس ہوا، کہ ان کے دل میں جو کچھ نور تھا، وہ سب بالکل سلب ہو گیا، اور بجائے نور کے ایک سیاہی تمام دل پر چھا گئی، اور یہ جی چاہنے لگا، اور اس کا بے حد تقاضا ہوا، کہ بس اب تو اسی کے قدموں میں رہ کر ساری عمر گزار دوں، اب تو بڑے گھبرائے کہ یہ کیا بلا آئی۔ بہتیرا اس خیال کو دفع کرتے ہیں، مگر وہ بجائے دفع ہونے کے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۲۔ مآثر حکیم الامت، ڈاکٹر عبدالحیؒ، ص ۲۷۹

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۸ ۴۔ ایضاً، ص ۲۷۹

آخر کار ان کو اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ بس یہ خیال کیا کہ جہاں تک ہو سکے نفس کے اس تقاضے کے خلاف کرو ، اور یہاں سے چل دو۔ چنانچہ یہ وہاں سے چلے آئے ، مگر اس کے بعد بھی ان کی وہی حالت رہی ۔ اب یہ نہایت پریشان ، کہ کیا کروں ، مگر کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی ، اسی حالت میں ان کی آنکھ لگ گئی ، خواب میں دیکھا ، کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ یہ حضورؐ کی خدمت حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہؐ میری دستگیری فرمایئے ، میں تو برباد ہو گیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ پھر تم نے ایسی حرکت ہی کیوں کی تھی ۔ یعنی اس کے پاس کیوں بیٹھے تھے ۔ انہوں نے عرض کیا ، یا رسول اللہؐ مجھ سے حماقت ہوئی ، توبہ کرتا ہوں ۔ آئندہ کبھی ایسے شخص سے نہ ملوں گا ۔ اس پر حضورؐ نے ان کے سینے پر اپنا دستِ مبارک پھیرا ۔ دستِ مبارک کا پھیرنا تھا ، کہ وہ سیاہی ان کے دل سے بالکل ختم ہو گئی ، اور پھر وہی نور پیدا ہو گیا اور بالکل اطمینان اور سکون پیدا ہو گیا ۔[۱]

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ اہلِ باطل کی اسی تصرف کی قوت کی وجہ سے حدیث میں ارشاد ہے کہ جب تم سنو کہ دجال آیا ہے تو اس سے دور بھاگو ۔[۲]

اندازہ کیجئے ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت ، کس قدر نافع اور فائدہ مند ہے اگر ایک عاشق ، حضورؐ کو اتنا یاد کرتا ہے ، تو اللہ کے رسولؐ بھی اسے فراموش نہیں کرتے ، یہ حُبِّ نبی کا صدقہ ہے ۔

حضرت تھانویؒ نے حضورؐ کی محبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ، کہ ایک انگریز مصنف کا کہنا ہے کہ "کسی اُمتی کو اپنے نبی سے اتنی محبت نہیں جس قدر مسلمانوں کو اپنے رسولؐ سے محبت ہے ۔"

واقعی محبت کے بغیر کچھ نہیں ہوتا ، بڑی چیز محبت ہے گو ظاہراً ادب اور تعظیم بھی زیادہ نہ ہو مگر محبت ہو ، اس سے سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ محبت میں محب اپنے محبوب کے خلاف نہیں کر سکتا ۔ اور ظاہر ہے کہ اتباع کتنی بڑی چیز ہے ۔ آج کل لوگ ادب و تعظیم کو بڑی چیز خیال کرتے ہیں ۔

حضورؐ کی محبت ہی کے کرشمے ہیں کہ حضورؐ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو جو قتل کیا ہے ۔

---

[۱] القول الجلیل ، ص ۴ ، ۵ قسط ہفتم

[۲] ایضاً ، ص ۵

وہ عاشقوں ہی نے کیا ہے، کسی خشک مولوی صاحب نے نہیں کیا، زیادہ جاہلوں ہی نے کیا ہے جن دل میں کامل محبت تھی، اور دیکھا تو یہی گیا ہے، کہ مسلمان اگر فاسق، فاجر بھی ہے، اس کے دل میں بھی حضورؐ کی محبت رچی ہوئی ہے۔

ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کوئی شخص تنخواہ دے کر بھی اس درجہ کا جان نثار نہیں بنا سکتا فرمایا کہ تنخواہ کیا چیز ہے، حضورؐ نے تو وہ چیز دی ہے جو دوسرا دے ہی نہیں سکتا، اُن کی ہی بدولت ایمان ملا۔ جنت ملی، اور حضورؐ کی محبت کی زیادہ وجہ یہ ہے، کہ خود حضورؐ ہی کو اُمت سے بہت زیادہ محبت تھی۔[1]

حضرت تھانویؒ کے جذبہ حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم تھا، کہ فرمایا کرتے تھے، کہ حضورؐ کے جانشینوں کی اتباع دراصل حضورؐ ہی کی اتباع ہے، یعنی وہ مبارک ہستیاں جو حضورؐ سے محبت رکھنے والی اور جن کا تعلق حضور سے ہو، وہ بھی ہمارے لیے محترم ہیں، ان کی بھی عزت کرنی چاہئے۔ اور ان سے محبت و عقیدت رکھنا اور ان کی اتباع کرنا حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے اور حضورؐ کی اتباع کرنے کی طرح ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک دفعہ فرمایا کہ

”رات ایک بات اللہ تعالےٰ نے میرے دل پہ القا کی ہے، چونکہ یہ بات الہامی ہے، اس لیے مجھے اس کے حصول پہ بہت مسرت ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل شامل ہے، ورنہ میری کوشش اور تصرف کو اس میں دخل نہیں۔

”وہ بات یہ ہے، کہ اصل متبوع اور اتباع کے لائق تو حضورؐ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں آپؐ کے بعد جو آپؐ کے جانشین ہیں، مثلاً فقہ کے اندر امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اتباع، اور تصوف کے اندر حضرت معین الدین چشتیؒ اور ان کے اتباع اور خود اپنا شیخؒ بھی، چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں۔ اس لیے ان کا اتباع بھی رسولؐ ہی کا اتباع ہے۔ مثلاً فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کا اتباع، درحقیقت اصلی متبوع یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے، اسی طرح تصوف اور تربیت باطنی میں اپنے شیخ کی تعلیم کا اتباع بھی درحقیقت حضورؐ کا اتباع ہے۔

---

[1] الافاضات الیومیہ، حضرت تھانویؒ، ج ۳، ص ۱۹۶

جب ثابت ہو گیا، کہ اتباعِ شیخ عین اتباعِ رسول ؐ ہے، اس لیے اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ہر امر میں اپنے شیخ ؒ کا اور اپنے شیخ کے مذاق کا اتباع کرے تاکہ اس طرح سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نصیب ہو جائے، تو اس کا طریقہ یہ ہے، کہ جو واقعہ اپنے کو پیش آئے اور اس میں اپنے شیخ ؒ کا مذاق مشاہدے سے معلوم نہ ہو، تو اس میں غور کرے، کہ اگر میرے شیخ کو یہ بات پیش آتی، تو وہ کیا کرتا، اس کے بعد جس شق کے متعلق معلوم ہو، کہ میرا شیخ ؒ اس شق پر عمل کرتا، بس اسی شق کو اختیار کرے کہ وہ شیخ ؒ کا اتباع اور بواسطہ اتباعِ شیخ ؒ کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہو جائے گا، اگر اسی طرح عمل کرے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی غلطی نہ ہو گی۔"[۱]

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت تھانوی ؒ کی ہر فکر کا منبع حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی تھا اور وہ ہر رنگ میں حضور ؐ ہی کی ذاتِ کریم کو پیشِ نظر رکھا کرتے تھے۔

حضرت تھانوی ؒ کی نگاہ میں ہر قسم کی نسبت کا تعلق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے عرض کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے، کہ فلاں بزرگ کی موسوی نسبت ہے، اور فلاں کی ابراہیمی نسبت ہے، فرمایا، وہ سب نسبتیں ہمارے حضور ؐ ہی کی ہیں۔ آپ ؐ میں سب انبیاؑ کے کمالات جمع تھے۔ ان ہی کے کمالات کے یہ القاب ہیں، اور وہ کمالات ہیں سب حضور ہی کے۔ پس ان صفاتِ کمال میں سے جس صفت کا کسی بزرگ پر غلبہ ہوا، تو اسی کی طرف اسی لقب سے وہ منسوب کر دیئے گئے ورنہ حقیقت میں وہ سب حضور ؐ ہی کی نسبتیں ہیں۔[۲]

حضرت تھانوی ؒ کی ذات بابرکات سے جو کچھ اُمتِ مسلمہ کو فائدہ پہنچا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ حضرت ؒ کے فیوضِ عامہ میں سے آپ کے مواعظ بھی ہیں، جو حضرت ؒ کی کھلی کرامت ہیں۔ علوم و معارف کا ارشاد وقت کے لحاظ سے ہونا فیضانِ خداوندی ہوتا ہے۔ جتنی خوبیاں کسی کلام میں ظاہری و باطنی ہو سکتی ہیں، وہ حضرت ؒ کے مواعظ میں بدرجۂ اتم موجود ہوتی تھیں۔ حضرت ؒ کے مواعظ میں علماؒ، طلبا اور عوام سب قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے اور اپنے اپنے مذاق کے موافق حظ اٹھاتے تھے۔ حضرت ؒ، قرآن کریم اور احادیث شریف میں جہاں کہیں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے اسی کو باحسن وجوہ حل فرمایا کرتے تھے اور عجیب و غریب نکات

---

۱ - القول الجلیل، ص، ۲۸ - ۲۹

کلمۃ الحق، ص ۲۹، قسط ہشتم

لطائف معرضِ ظہور میں آتے ہیں۔

یہ انہی خصوصیات کا نتیجہ تھا کہ فخر موجودات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت تھانویؒ کے مواعظ پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا جیسا کہ "اصدق الرویا" کے مندرجہ ذیل خواب سے ظاہر ہے، جو بستی کوگراں تحصیل کرانہ کے ایک مردِ صالح نے جمعرات ۵ شعبان ۱۳۵۲ھ کو دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اور آپؐ کی خدمت میں ہمارے حضرتؒ تھانویؒ اور دیگر علماء حضرات حاضر ہیں۔ ایک بڑا مکان ہے۔ سب علماء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ حضور وعظ فرمائیں۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ وعظ بیان کرنے والے بہت سے علماء موجود ہیں پھر دوبارہ علماء نے درخواست کی، تو حضورؐ نے دوبارہ جواب میں ہمارے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب مدظلہ العالی (اس وقت حضرتؒ حیات تھے) کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ وعظ انہیں بیان کرنا چاہیئے، یہ اچھا وعظ بیان کرنے والے ہیں۔ سب علماء چپ ہو گئے[۱]

اس سے ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی ہی مقبولیت مواعظ کا باعث تھی حضورؐ، حضرت تھانویؒ کے وعظ کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ ایک خواب کے ذریعہ تو حضور کا حضرت تھانویؒ کو سلام پہنچانا بھی ثابت ہے۔ "سیرت اشرف" میں ہے کہ

"ایک رات کو مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے دار الخلافہ ڈھاکہ کے ایک بزرگ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا کہ

"اشرف علی کو میرا سلام پہنچانا"

وہ بزرگ، حضرت تھانویؒ کے شناسا نہیں تھے اس لیے عرض کی کہ حضور میں تو ان سے ناواقف ہوں، ارشاد ہوا، "ظفر احمد کے ذریعے" جو ان کے واقف تھے، یعنی حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ (جو اس وقت حیات تھے) جو حضرتؒ کے حقیقی بھانجے ہیں، اور اس وقت ڈھاکہ میں رہائش پذیر تھے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی انہوں نے اس واقعہ کی مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو خبر کی، جو انہوں نے حضرت تھانویؒ تک پہنچائی۔ جب حضرت تھانویؒ کو یہ مژدۂ جانفزا پہنچا، تو آپؒ پر فرطِ

۱۔ سیرت اشرف، ص ۱۲۱، منشی عبدالرحمن، ادارہ نشر المعارف ملتان

ادب و مسرت سے ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "وعلیک السلام یا نبی اللہ" اور اس دن کے تمام معمولات موقوف کر کے سارا دن درود شریف پڑھنے میں مشغول رہے۔"[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر حضرت تھانویؒ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق و دیوانے تھے، تو حضورؐ بھی ان سے محبت رکھتے تھے۔ اسی لیے حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"شوق کی خاطر اور لذت حاصل کرنے کے لیے "یا رسول اللہ" کہنے کی اجازت ہے" !

اس لئے کہ اس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ کسی عاشق نے اسی لئے تو کہا تھا، کہ ؎

جانے کیا ہوگی تیرے قرب کی لذت اے دوست
نام تو جب لب پہ آتا ہے سکوں ملتا ہے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت تھانویؒ کی عقیدت و محبت کا تو یہ حال تھا کہ فرماتے تھے۔

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات شریفہ پاک تھے، اُن پر دوسرے کو قیاس نہیں کر سکتے۔"[2]

ہر مومن کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں حاضری دے۔ رسول اللہ کے روضہ انور پر صلوٰۃ و سلام پڑھے، اور مسجد نبویؐ میں بغیر کسی کوتاہی کے چالیس نمازیں ادا کرے، حضرت تھانویؒ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ہر مسلمان کو بہت محتاط طریقے سے رہنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں ایک تو دعا جلد قبول ہوجاتی ہے۔ دوسرے اگر کسی قسم کی گستاخی ہوجائے، تو تنبیہ بھی فوراً ہوجاتی ہے، اس لیے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران دل و دماغ کو حاضر رکھ کر گفتگو کرنی چاہیئے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ

مدینہ منورہ میں ایک صاحب نسبت بزرگ کی زبان سے اتنی بات نکل گئی تھی، کہ شام یا ہندوستان کا دہی یہاں کے دہی سے اچھا ہوتا ہے۔ حضورؐ نے عالم رؤیا یا عالم واقعہ میں فرمایا، کہ نکل جاؤ ہمارے یہاں سے، وہیں جا کر رہو جہاں کا دہی اچھا ہوتا ہے۔[3]

اس کے بعد آپ نے فرمایا "صاحبو یہ نقصان ہوتا ہے اس دربار میں پہنچ کر اپنے گھر بار کو یاد کرنے سے" اسی لیے حضرت عمرؓ حج کے بعد لوگوں کو مکہ و مدینہ سے نکالتے تھے اور کہتے تھے۔ یمن والو یمن جاؤ"

۱۔ سیرت اشرف، منشی عبدالرحمٰن، ص ۳۹۷

۲۔ کمالات اشرفیہ، مولوی محمد عیسیٰ، ص ۲۳

۳۔ الکلام الحسن، ص ۸۶

اور اہل عراق ، عراق جاؤ "

حضرت تھانویؒ تو مدینہ منورہ کی حاضری کو وصل حبیبؐ اور زیارت محبوبؐ خیال کرتے تھے کہ اس کے لیے اگر دل و جان کا اندازہ بھی پیش کیا جائے تو کم ہے۔ خرچ و اخراجات کا تخمینہ کیا لگانا۔ آپؒ فرماتے تھے۔

> مدینہ منورہ کے سفر کا خرچ حساب میں نہ لایا جائے کیونکہ یہ عاشقانہ ہے۔ پیدل ہو سکے تو پیدل ہی جاؤ مگر ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ عاشق کے لیے۔ بعض عاشق گنبدِ خضرا پہ نظر کرتے ہی گر کر مر گئے ہیں ۔ (۲)

اس سے حضرتؒ کی عقیدت و محبت اور تعلق کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

نبی کریمؐ کے موئے مبارک آج بھی کئی مقامات پہ محفوظ ہیں ، اور ان کی باقاعدہ زیارت کرائی جاتی ہے ، اکثر صحابہ کرامؓ کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اپنے پاس بطور تبرک رکھا کرتے تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے اپنی ٹوپی میں سی لیا تھا ، کہ کہیں گم نہ ہو جائے اور میں اس برکت سے محروم نہ ہو جاؤں۔

حضرت تھانویؒ بھی اس خواہش میں رہتے تھے ، کہ کہیں سے زیارت ہو جائے ، کیونکہ اس طرح حضورؐ کی زیارت کا ایک پہلو نکل آتا ہے۔ اپنے موئے مبارک حضورؐ نے کئی موقعوں پہ کچھ لوگوں میں تقسیم فرمائے تھے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں۔

> حضور نبی کریمؐ کا اپنا بال مبارک تقسیم کرنا ، اپنی تعظیم و عبادت کے لیے نہ تھا۔ بلکہ صحابہ کی محبت پہ نظر کرتے ہوئے ، ان کے لڑائی جھگڑے اور جنگ و جدل کو ختم کرنے کے لیے تھا ، اگر آپؐ اپنے بالوں کو دفن کر آتے ، تو یقیناً صحابہؓ زمین سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے ، اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آ جاتی (۱)

حضرت تھانویؒ ، صحابہ کرامؓ کا ذکر خاص طور پہ فرمایا کرتے تھے ، کہ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرنا ، صحیح معنوں میں آتا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ " جب حضورؐ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت کی ہے ، تو حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ آپ کے ہمراہ گئے

---

۲ - ایضاً

۱ - کمالات اشرفیہ ؛ ص ۱۰۸

ہیں۔ جب مدینہ پہنچے، تو انصار زیارت کی غرض سے جوق در جوق آنا شروع ہوئے۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ سے مصافحہ کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ آپ کی عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی، اس لیے وہ لوگ یہ سمجھے، کہ حضورؐ یہی ہیں حضرت صدیق اکبر برابر مصافحہ کرتے رہے، اور انکار نہیں کیا، کیونکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے تھکے ہوئے تھے، آپ نے حضورؐ کو تکلیف سے بچایا۔ جب حضورؐ پہ دھوپ آئی اور حضرت صدیق اکبرؓ نے حضورؐ پر اپنی چادر سے سایہ کیا، تب لوگ سمجھے کہ حضور یہ ہیں۔

اس کے بعد فرمایا، حضرت یہ ہے خدمت کا طریقہ، یہ باتیں ہیں جن سے صحابہؓ کے علوم اور حضورؐ کے ساتھ خلوص معلوم ہوتا ہے۔ آج کل لوگوں نے صرف جوتا اٹھا کر رکھ دینے کا نام محبت رکھا ہے، چاہے اس سے تکلیف ہی پہنچے مگر اپنا دل راضی ہو جائے۔"(۱)

جن صحابہ کرامؓ نے ایمان کی حالت میں حضورؐ کی زیارت کی وہ کس قدر خوش نصیب اور سعادت مند تھے جب بھی اس بات کا خیال آتا ہے، ہر مومن اپنے دل میں ایک تڑپ سی محسوس کرتا ہے۔ حضرت تھانویؒ بھی ان عاشقوں میں سے تھے۔ آپؒ فرماتے ہیں۔

"جس شخص کو بیداری میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف نصیب نہیں ہوا، اس کے لیے خواب میں زیارت سے مشرف ہو جانا، سرمایۂ تسلی اور بذات خود ایک نعمت عظمیٰ اور دولت کبریٰ ہے۔ اور یہ سعادت خود حاصل نہیں کی جا سکتی، بلکہ اللہ تعالےٰ کی عطا کا صدقہ ہے"(۲)

ہر مسلمان کی یہ انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم ایک بار ہی خواب میں حضورؐ کی زیارت ہو جائے، تاکہ دل کو تسلی اور روح کو سکون حاصل ہو جائے، ہزاروں ایسے ہیں جن کی عمریں اسی حسرت میں ختم ہو گئیں، لیکن کچھ لوگ ایسے تھے، جن کا مذاق انکساری و عاجزی ہی میں فنا ہو گیا تھا۔ ان میں حضرت حاجی امداد اللہؒ بھی تھے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ

ایک شخص نے حضرت حاجیؒ صاحب سے درخواست کی، کہ کوئی ایسا طریقہ بتلا دیجئے، کہ حضورؐ کی زیارت ہو جائے، فرمائے، تم بڑے حوصلے کے آدمی ہو، اتنی بڑی تمنا رکھتے ہو، ہم تو اسی کو غنیمت جانتے ہیں،

۱- مزید المجید، ص ۱۰۶، ۱۰۷
۲- مآثر حکیم الامت، ڈاکٹر عبدالحی، ص ۲۴۰
۳- کلمۃ الحق، ص ۱۲۵، قسط ہشتم

کہ حضورؐ کے مزار مبارک کے گنبد خضرا کی زیارت کریں۔"(۳)

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا ایک صحابی کا نام بھولتا ہوں، ان سے کسی نے حضورؐ اقدس کا حلیہ مبارک پوچھا۔ وہ فرماتے ہیں، کہ میں حضورؐ کا حلیہ تو اس وقت بیان کروں، جب میں نے حضورؐ کو کبھی نظر بھر کر دیکھا ہو، مگر عمر بھر اتنی تاب نہ ہوئی"(۴)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں، یہ ذوقی امور ہیں۔(۱)

البتہ میرا غالب گمان ہے کہ حضورؐ کی زیارت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں۔

کثرتِ درود شریف، کمالِ اتباعِ سُنّت اور غلبۂ محبت پر اس کا ترتب ہو جاتا ہے"(۲)

حضرت تھانویؒ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عقیدت و محبت تو تھی ہی حضورؐ کے والدین، چچا اور دیگر لواحقین کا بھی حد درجے کا احترام کیا کرتے تھے، حضرتؒ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ہر حال میں حضورؐ کی خوشنودی، رضامندی اور خوشی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ حضرتؒ فرماتے تھے،

"میں حضرت ابوطالب کو بلا لفظ "حضرت" کے ذکر نہیں کرتا، صرف اس تلبّس کی وجہ سے جو ان کو حضورؐ پر نور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم سے ہے' اور اسی کے تعلق کے سبب حضورؐ کے والدین کے بارے میں گفتگو کرنے کو بہت خطرناک سمجھتا ہوں، کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے"

"لاتسبوا الاموات فتؤذوا الاحیاء" (مردوں کو برا بھلا نہ کہو، اس سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے) اور ظاہر ہے کہ کسی کے والدین کو یہ کہنا کہ یہ بدمعاش کافر تھے، اس سے اولاد کو طبعی طور پہ رنج ہو گا اور قرآن شریف میں ہے:

"ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعدلھم عذابا مھینا"

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، ان پہ دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے، اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے۔

۳۔ کلمۃ الحق، ص ۱۴۵، قسط ہشتم ۴ : ایضاً، ص ۱۴۶

۱۔ کلمۃ الحق، ص ۱۴۶

۲ مآثر حکیم الامت، ص ۲۴۰۲

حضرتؒ فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ الصلوٰة والسلام کے والدین کے بارے میں بلا ضرورت گفتگو کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دینے کا سبب ہے
س سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرتؒ کو کس قدر حضورؐ کا خیال تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر محب اور عاشق اپنے محبوب کے عمدہ سے اوصاف، خوبیاں اور صفتیں بیان کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں اس کا محبوب ایک نرالی شے ہوتا ہے جسے وہ ہر چیز سے منفرد اور ممتاز سمجھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی، اس لئے انہوں نے اپنی محبت کا اظہار ہر رنگ میں کیا ہے ان کی نگاہ میں حضور ایک منزہ اور مصطفیٰ نور تھے جو ہر حال میں قابل اتباع ہیں اور ان سے محبت ہر مومن کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے اس سے ایک مومن کی عزت اور پہچان ہوتی ہے بقول علامہ اقبالؒ ؎

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰؐ است

تربیّت گاہِ اشرفیّہ

پروفیسر مسعود احسن علوی

مجالسِ حکیمُ الاُمّت

ایک بار حضرت حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ العزیز کی مجلسِ مبارک کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے یہ شعر پڑھا :-

؎ ہو بھی سکے گا مجھ سے بیانِ بزمِ یار کا
انداز ہ کر رہا ہوں دلِ بے قرار کا

پھر یہ شعر پڑھا ۔

؎ پھرتے ہیں آنکھوں میں اب تک جلوہائے بزمِ دوست
کیسی کیسی صحبتیں خواب پریشاں ہوگئیں

کیا زمانہ تھا اور کیسی مجلسیں تھیں اور کیسے اصحاب مجلس تھے اللہ اللہ !

اللہ تعالیٰ ہمارے حضرتؒ کے مراتبِ قرب بلند فرمائیں کہ انہوں نے اپنے مخصوص اندازِ رُشد و ہدایت سے اپنی مجالس میں سرورِ دو عالم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس کی تصویر کھینچ کر ہمارے تصوّرات کو نورانی بنا دیا۔ بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے :-

؎ جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی
مرا با جانِ جاں ہمراز کردی ۔

اس دورِ حاضر میں واقعی حضرتؒ والا کی مجلس ایک سچّے وارثِ نبی کی مجلس تھی ۔

؎ شرف تجھ کو ملا بزمِ ولا کی باریابی کا صحابی گو نہ تھا لیکن نمونہ تھا صحابی کا

آپ کو حضرتؒ کی مجلس کے حالات معلوم کرنے کا اشتیاق ہے اس لئے مجلس مبارک کا ایک ذہنی خاکہ آپ کے تصورات کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ اس مجدد ملت حکیم الامت کا اپنی مجالس میں طالبینِ حق کی رشد و ہدایت کے لئے کیا انداز مجالست و مخاطبت تھا۔ حضرتؒ کا لباس بہت ہی سادہ رہتا تھا کہ سفید ٹوپی، چکن کا سفید سادہ کُرتہ (گریبان کُھلا ہُوا) شرعی پاجامہ زیبِ بدن ہوتے ایک دستی رومال ساتھ رکھتے تھے۔ خانقاہ کی سہ دری میں فرش پر تشریف فرما ہوتے۔ فرش پر ایک دری کی جانماز گرمیوں میں اور سردیوں میں روئی کا معمولی گدا ہوتا تھا نشست کے سامنے ایک ڈیسک نما میز بھی جس پر مختلف قسم کی ضرورت کی چیزیں اور کچھ کتابیں رکھی رہتی تھیں۔

اب میں اپنے تصورات کو تازہ کر کے آپ کے سامنے اس مجلس کا نقشہ پیش کر رہا ہوں۔ ظہر و عصر کے درمیان کا وقت ہے (اور مدت دراز تک روزانہ یہی وقت مجلس عام کا مقرر رہا) کچھ لوگ قصبے کے اور کچھ لوگ باہر سے آئے ہوئے شریکِ مجلس ہیں عالم بھی ہیں اور عامی بھی، ذاکر و شاغل بھی ہیں اور کاروباری بھی سب کے سب ہمہ تن گوش بنے ہوئے عقیدتمندانہ صورت سے سر جھکائے بیٹھے ہیں جو لوگ حاضر ہیں اور جو دُور ہیں سب بیک وقت فیض یاب ہو رہے ہیں ؎

ساقی نے لطفِ خاص کے دریا بہا دیئے
نزدیک و دُور عام ہے فیضانِ مے کدہ

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جواب طلب خطوط کا ڈھیر ہے ایک ہاتھ میں خط ہے اور ایک ہاتھ میں قلم جواب تحریر فرماتے جا رہے ہیں اور اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر گفتگو بھی فرما رہے ہیں۔ کچھ خطوط سالکین کے ہیں جنہوں نے اپنے احوال و کیفیاتِ باطنیہ تحریر کئے ہیں ان کے جواب لکھے جا رہے ہیں۔ کچھ خطوط فقہی مسائل کے متعلق ہیں جن خطوط میں کچھ اہمیت و خصوصیت ہے ان پر نشان لگا کر علیحدہ رکھا جا رہا ہے تاکہ ان کی نقل کرا کے (بغیر نام) رسالہ "النور" میں شائع کیا جائے (یہ رسالہ خانقاہ تھانہ بھون سے ماہوار شائع ہوتا تھا) اس طرح بیک وقت سالکین کے احوال اور اُن کے جوابات پر مشتمل ایک ذخیرہ "تربیتُ السالک" کے نام سے جمع ہو رہا ہے اور وہ خطوط جن میں خاص

فقہی مسائل کے جوابات ہیں جمع کئے جا رہے ہیں جو "امداد الفتاویٰ" کے نام سے مرتب ہو رہے ہیں۔

منجملہ دیگر تصانیف کے یہ دو جلیل القدر کام اس مجددِ عصر کی مجالسِ روزانہ کا کارنامہ ہے جن کی افادیت و یادگار ان شاء اللہ تعالےٰ صدیوں تک قائم رہے گی اور تربیت السالک تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی مجددانہ چیز ہے جس کی مثال سلف میں کہیں نہیں ملتی۔ اب تک جو رموزِ باطنی اہلِ طریق کے سینہ بسینہ رہا کرتے تھے اُن کو اس مجددِ طریق نے علومِ سفینہ بنا دیئے۔ غرضیکہ یہ کام بھی ہو رہا ہے اور حضرتؒ والا گفتگو بھی فرما رہے ہیں اور یہ گفتگو بھی اہلِ دل حضرات قلمبند کرتے جا رہے ہیں جو "افاداتِ یومیہ" سے موسوم ہو کر جمع ہو رہے ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے رہے اور جن میں صدیوں تک کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف محفوظ کر لئے گئے۔

اسی اثناء میں اگر کوئی اجنبی شخص مجلس میں آگیا اور اس نے اپنا تعارف یا اپنی آمد کا مقصد ادھوری یا بے ڈھنگی باتوں سے ظاہر کیا تو حضرتؒ والا کے لہجے میں تغیر پیدا ہو جاتا تھا اور جب تک وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر لے اور بات صاف نہ کرے اس سے برابر جرح فرماتے رہتے تھے۔ فرماتے تھے مجھے ناتمام اور گول مول باتوں سے سخت الجھن ہوتی ہے کیونکہ اس سے سامع کے دل میں ناگواری اور گرانی پیدا ہوتی ہے۔ حضرتؒ کا اس طرح معاملہ کرنے سے خود اس شخص کو اور اہلِ مجلس کو اپنی اس قسم کی کوتاہیوں پر ہمیشہ کے لئے تنبیہ ہو جاتی تھی۔ اس فہمائشی مکالمے کے بعد حضرت والا پھر احبابِ مجلس کی طرف اسی خندہ روئی اور تبسم آمیز اندازِ گفتگو کے ساتھ متوجہ ہو جاتے۔

اب دیکھئے اور سنئے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اپنے احبابِ مجلس کے ساتھ کس قسم کی باتیں فرمایا کرتے تھے۔

مجلس میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ مختصر مختصر مختلف اور گوناگوں مضامین بیان فرماتے تھے۔ البتہ کبھی کسی خاص موضوع پر اتفاق سے تقریر ہو تو دیر تک اور خاص اثر انداز جذبہ سے طویل تقریر بھی فرمایا کرتے تھے۔ کبھی اگر کسی نے کوئی بات تحقیق طلب دریافت کی تو اس کی وضاحت فرما دیتے تھے۔ فقہی مسائل پر بہت کم گفتگو فرماتے تھے۔ اگر کسی نے کوئی مسئلہ

شرعی پوچھا تو فرماتے تھے کہ اس کے بتانے والے بہت ہیں جہاں چاہو پوچھ لو اور یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

مجھ سے تو بس اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت کی باتیں سُنو اور یہی محبت دین کے تمام شعبوں کی روح رواں ہے ؎

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الّا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

اور اسی اندازِ محبت میں تصحیح عقائد و زادِ راہ آخرت کی باتیں کر رہے ہیں۔ اتباع شریعت و اتباعِ سنّت کے لئے اہتمام اور اس کے حدود متعین فرما رہے ہیں۔ اصلاح باطن و تزکیۂ نفس کے طریق کو واضح کیا جا رہا ہے۔ حسنات و رذائل کی تشریح کی جا رہی ہے۔ اعمال ظاہر و باطن میں اختیاری و غیر اختیاری، مقصود و غیر مقصود کی حدیں قائم کی جا رہی ہیں۔ حکایات و روایات سے ان امور کو دل نشین کیا جا رہا ہے۔ آدابِ زندگی اور آدابِ انسانیت کی تعلیم کی جا رہی ہے۔ حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق النفس کے ادا کرنے کے طریقے بتائے جا رہے ہیں اور اس طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت دل میں اتاری جا رہی ہے۔ مجاہدہ اور حصولِ تقویٰ کا معیار قائم کیا جا رہا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اور خانگی حالات اور ازدواجی تعلقات میں خوشگواری پیدا ہونے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ ملکی و سیاسی حالات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

مختصر یہ کہ حیاتِ طیبہ حاصل کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے تمام معارف و حقائق سہل لفظوں میں بیان کئے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ بلا تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجالسِ رشد و ہدایت میں حضور رحمۃ للعالمین کی مجالسِ مبارکہ کی جھلکیاں پیدا فرما دیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی کے نمونے ہمارے سامنے پیش فرما دیئے۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو زیادہ سے زیادہ اُن کی مساعیٔ

دینیہ کا صلہ عطا فرمادیں اور اپنے مقاماتِ قرب و جوار میں پیہم ترقیٔ درجات نصیب فرمادیں اور ہم تشنگانِ حق کو اُن کی تعلیمات سے زیادہ سے زیادہ فیوض و برکات و توفیقِ عمل عطا فرمائیں ؎

یادِ آں روزے کہ در میخانہ منزل داشتم
جامِ مے در دست و ساقی در مقابل داشتم

شانِ مجلس

حضرت رحمۃ اللہ علیہ من جانب اللہ تعالےٰ منصب رشد و ہدایت لے کر آئے تھے۔ حقائق و معارف حضرتؒ کے مشاہدات میں سے تھے، باطن کی تعلیم و تربیت کا طریقہ اور اصلاح کا انداز عجیب و غریب تھا۔ ابنائے زمانہ کی نبضوں کو پہچانتے تھے۔ جب واردات و کیفیاتِ باطنہ کا اظہار فرماتے تو دورانِ گفتگو کبھی سالکین کو قبض و بسط کی لطافتوں سے بھر دیتے کبھی خالی کر دیتے۔ رہروانِ طریق کو ناز اور یاس سے بچا بچا کر رکھتے۔ اعتدال کی راہ پر چلاتے۔ خالی کرنے میں بھی کمال حاصل تھا اور بھرنے میں بھی۔ کوئی مجلس میں ناز لے کر جاتا اور فنا ہو کر آتا۔ کوئی یاس لے کر جاتا اور بشارت سُن کر آتا۔ جب سالک کو رذائل سے خالی کرنے پر آتے تو ندامت اور شکستگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اپنے عجز و نیاز کی حقیقت سامنے آجاتی۔ سالکین ندامت سے روتے اور اپنے کو ملامت کرتے۔ جب حسنات اور محبتِ الٰہی سے بھرنے پر آتے تو رحمتوں کے اعلان سُناتے۔ بشارتیں دیتے۔ دل جوئی اور دل نوازی فرماتے اور حاضرین اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا کھلا اثر محسوس کرتے اور اس طرح سالکین کو ہلکا پھلکا رکھتے۔ تشویشات سے بچاتے اور اصل کام میں سرگرم رکھتے۔ زبان میں اللہ تعالیٰ نے وہ تاثیر دی تھی کہ مجلس پر نظر ڈال کر کوئی مضمون ارشاد فرماتے تو ہر شخص یہی کہتا کہ میرے دل کی بات کہہ دی میرا عقدہ کھل گیا۔

؎ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اللہ تعالےٰ لوگوں کے قلوب کی حالت حضرتؒ پر منکشف فرما رہے

ہیں۔ حضرت وہی فرماتے جس کی اہلِ مجلس کو ضرورت ہوتی۔ حاضرین کے قلبی تاثرات کا احساس فرماتے ہوئے لب و لہجہ ایسا اختیار فرماتے کہ لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ۔

تاثراتِ مجلس

حضرتؒ کی مجلس کے تاثرات بڑے قوی اور دیرپا ہوتے تھے خود فرماتے تھے کہ "یہاں سے کوئی خالی نہیں جاتا کم ازکم کان سب کے کھول دیئے جاتے ہیں" آج بھی ہمارے دل و دماغ میں وہ آفتاب جگمگا رہا ہے۔ حضرتؒ کا لب و لہجہ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے تخیل اور تصور میں آج بھی اس مجلس کے تاثرات کارفرما ہیں۔

؎ کارفرما ہے ابھی تک جذبۂ پیرِ مغاں
مستیٔ رنداں وہی ہے گرمیٔ محفل وہی

اس آخر عمر میں حضرتؒ کا فیضِ روحانی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عالمِ برزخ سے فیض کی لہریں آتی ہوں۔ اسی جذبہ سے متاثر ہو کر کبھی کہہ دیتا ہوں کہ بھائی جتنی باتیں مجھ سے سننا ہوں سن لو۔ یہاں بیٹھ جاؤ میرے پاس اور میری بات سنو اور میری بات یہ ہے کہ حضرتؒ یوں فرماتے تھے :۔

"بزرگ بننا ہو، قطب بننا ہو، غوث بننا ہو کہیں اور جاؤ اور انسان بننا ہو تو یہاں آؤ۔"

اور فرماتے تھے کہ پہلے آدمی بنو۔ کیا بزرگی اور ولایت ڈھونڈتے پھرتے ہو آدمیت سیکھو۔ بزرگی بیچاری تو ایک دن میں ساتھ ہولیتی ہے مشکل چیز تو شرافت اور شعورِ انسانیت ہے۔

غور تو فرمائیے کہ حضرتؒ اپنی مجلس میں بار بار کیا اعلان فرماتے رہے کس چیز پر زور دیتے رہے اور کن باتوں پر تنبیہ اور مؤاخذہ فرماتے رہے۔ کیفیات، مکاشفات، ذوقیات، کرامات اور تصرفات کو تو چھوڑیئے۔ ایک درجہ میں حضرتؒ ان کو تو اہمیت دینے کے مخالف ہی رہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ واقف ہیں وہ بتائیں کہ معمولاتِ یومیہ مثلاً تہجد نوافل، ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف کے چھوٹ جانے پر کسی سالک پر کیا حضرتؒ کبھی

چیں بہ جبیں ہوئے؟ کیا اُن کے کسی عذر شرعی پر معمولات چھوٹ جانے سے کبھی تنبیہ اور مؤاخذہ فرمایا؟

لیکن اگر کوئی بے اصولی بات کرتا یا بے فکری کا ثبوت دیتا، حقوقِ واجبہ کا تارک ہوتا، معاملات میں بدانتظامی برتتا یا سلیقہ اور ڈھنگ سے کام نہ کرتا یا کسی کی ناگواری کا باعث ہوتا تو حضرتؒ فوراً تیور بدل لیتے۔ سخت اور تیز لہجہ بنا لیتے اور فوراً اصلاح فرماتے تمام اہلِ مجلس کو عموماً اور سالکین کو خصوصاً اس طرف توجہ دلاتے کہ یہ تمام چیزیں دوسروں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اور اذیت نہ پہنچانا واجب ہے اور تم سب اس کے مکلّف ہو، میں تو کہتا ہوں کہ اپنی ذات سے کسی کو ادنیٰ اذیت بھی نہ ہو یہی کل تصوف ہے۔

؎ کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

تمام بزرگی، قطبیت، غوثیت اور کشف و کرامات کو نظر انداز کر کے اور تمام غیر ضروری چیزوں کو حذف کر کے حضرتؒ طالبین و مریدین کی صرف دو صفات پر نظر رکھتے۔ فرماتے تھے کہ میرے یہاں تو طالبین کے اندر دو باتیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کے اندر انسانیت ہو یعنی اپنے قول و فعل میں اس چیز کا خیال رکھے کہ اس سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ دوسرے میں اس کی کوشش کرتا ہوں کہ سب سے اول طالب پر مقصود اور اس کے طریق کی حقیقت منکشف ہو جائے تاکہ عمل بصیرت سے ہو سکے۔

تو پہلے یہ معاملہ درست کر لو پھر مختلف کاروبار میں رہتے ہوئے بھی ہر مسلمان درویش بنے جیسے صحابہؓ درویش تھے۔ پھر ہر مسلمان ولی ہے جیسے صحابہؓ ولی تھے۔ ہر مسلمان عاشق ہے جیسے صحابہؓ عاشق تھے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

حضرتؒ والا طالبین کو ثمرات و کیفیات سے بتاکید شدید بالکل یکسو رکھتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ثمرات کی روح اجر و قرب ہے بس اس ثمرہ پر نظر رکھنا چاہیئے اور کسی ثمرہ کا منتظر نہ رہنا چاہیئے بلکہ جتنے زوائد طریق ہیں اُن سب کے متعلق معاملہ ہی ایسا فرماتے کہ طالب کو مجبوراً اُن سے ہٹ کر ضروریات و مقاصد طریق ہی میں مشغول ہونا پڑتا ہے مثلاً کسی نے کوئی خواب بغرض تعبیر پیش کیا تو بجائے تعبیر بتانے کے اکثر یہ فرما دیتے کہ مجھے تعبیر خواب سے

مناسبت ہی نہیں مجھ سے تو بیداری کی باتیں پوچھی جائیں ۔

؎ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

خوابوں میں کیا رکھا ہے بیداری کی حالت کا اعتبار ہے جو اختیاری ہے۔ اگر کوئی اپنی بیداری کی حالت کو درست نہ کرے تو خواب میں اپنے آپ کو عرش و کرسی کی بھی سیر کرتے ہوئے دیکھے تب بھی اس کو ذرہ برابر قرب نصیب نہیں ہوتا اور اگر کسی کی بیداری کی حالت بدرجہ مطلوبہ درست ہے تو چاہے خواب میں اپنے آپ کو دوزخ ہی میں دیکھے پھر بھی وہ مقرب ہے لیکن اس سے خواب کی نفی مقصود نہیں بلکہ عوام نے جو خوابوں کو مبشرات کے درجہ سے بھی آگے بڑھا دیا ہے اس سے متنزل کرنا ہے ۔ اھ

اور مثلاً اگر کسی نے یہ شکایت کی کہ پہلے رونا بہت آیا کرتا تھا اب نہیں آتا ، تو فرما دیتے کہ آنکھ کا رونا مطلوب نہیں دل کا رونا مطلوب ہے وہ حاصل ہے یعنی نہ رونے پر افسوس ۔ اھ

◆

مقاماتِ سلوک

از: مآثر حکیم الامتؒ

* * *

فیضانِ مُرشد

حضرت شیخ العرب والعجم شیخ العلماء والمشائخ امام الطریق حاجی شاہ محمد امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی قدس سرہٗ العزیز کی وہ مقتدر ہستی ہے جو سرچشمہ ہے جمیع انہار فیوض و برکات کا جن سے آج اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ بہ عنایاتِ الٰہیہ شرقاً و غرباً متمتع و منتفع ہو رہی ہے اور جن کے آب طاہر و مطہر سے دُنیائے اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ سیراب ہو رہا ہے جن سے حضرت حکیم الامت شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ العزیز کو شرفِ بیعت حاصل تھا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی بابرکت ہستی تھی کہ جس کے محض تصور سے اور ادنیٰ ذکر سے بھی قلب میں ایک انشراح اور روح میں ایک کیف پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ

> حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ادنیٰ ذکر سے بھی میرے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ میں اس وقت اپنے حواس میں نہیں رہتا گو دیکھنے والوں کو پتہ نہ چلے لیکن مجھ پر تو وہ حالت طاری ہوتی ہے مجھے تو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ (اشرف السوانح)

یہ حضرت حکیم الامتؒ کا انتہائی ادب و عقیدت اور انتہائی منت شناسی اور ادائے حق محبت تھا کہ ساری عمر اپنے تمام کمالات کو اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی طرف منسوب فرماتے تھے اور نہایت وثوق کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے تو اپنی

حالت بھی طرح معلوم ہے۔ اگر حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کے قبل بھی تو میں تحصیل علوم اور درس و تدریس میں لگا ہوا تھا لیکن وہ باتیں جو حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضری کے بعد ذہن میں آنے لگیں وہ اس سے پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھیں لہٰذا یہ حضرت حاجی صاحبؒ کا فیض نہیں تو اور کیا ہے۔

(اشرف السوانح ج ۲)

فرمایا جب میں حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہٗ کی خدمت میں رہتا تھا تو حضرت کی خدمت میں حاضری کے سوا اور اوقات میں تمام ضیاء القلوب کے اذکار و اشغال کو بہ ترتیب روزانہ عمل میں لاتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ان سب کا پورا کرنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ ایک روز حضرتؒ کی خدمت میں یہ قصہ عرض کیا۔ حضرت ہنسے اور فرمایا کہ یہ سبق نہیں ہے بلکہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ عطّار کی دکان پر اقسام مختلفہ کی ادویہ رکھی ہوتی ہیں تو ان کے رکھنے سے یہ غرض نہیں ہوتی کہ ہر مریض ان سب ادویہ کو استعمال کرے بلکہ غرض یہ ہے کہ جس مریض کے لئے جو دوا مناسب ہوگی وہ اس کو دی جائے گی۔ سو اسی طرح بہت سے طُرق جمع کر دیئے ہیں اور ہر طالب کے لئے جو شغل مناسب ہوتا ہے وہ اس کو بتلایا جاتا ہے پھر ہمارے حضرتؒ نے فرمایا کہ دسترخوان پر اطعمۂ مختلفہ رکھے جاتے ہیں نہ اس لئے کہ سب کھانوں کو سب ہی کھائیں بلکہ اس لئے کہ جو کھانا جس کو پسند ہو وہ اس کو کھالے۔ اصلی غرض عقلاء کی تعدد اطعمہ سے یہی ہے۔ گو اہلِ عرف اس کی حقیقت نہ سمجھیں اور فرمایا کہ حضرت حاجی صاحبؒ کی برکت سے یہ تحقیق نصیب ہوئی۔ (ملفوظات خبرت)

حضرتؒ والا یوں تو اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر بفضلہ تعالیٰ سب ہی باطنی دولتوں سے مالا مال ہوئے لیکن ان کی خدمت میں دورانِ قیام خاص طور پر توحید کا انکشاف بدرجۂ کمال ہُوا جو اساسِ شریعت و طریقت اور گویا فخرِ درویشی ہے اور جس کا ثمرۂ لازمی عبدیت ہے جو سلوک کا اعلیٰ ترین مقام ہے اور اسی قسم کی وہ دولتیں ہیں۔ جن کے حضرت حاجی صاحبؒ خاص طور سے حامل تھے اور جو

سلسلۂ امدادیہ کا طرۂ امتیاز ہیں اور جو حضرت حاجی صاحبؒ نے باذن اللہ تعالےٰ اپنے

سینۂ مبارک سے حضرتؒ کے سینۂ مبارک میں بہ تمام و کمال منتقل فرما کر ہمیشہ کے لئے ودیعت فرما دی تھیں جن کے آثار ہمیشہ حضرتؒ کے اقوال و افعال، اعمال و احوال، نشست و برخاست، حرکات و سکنات سبھی میں روزِ روشن کی طرح ظاہر و نمایاں ہیں اور ان ہی کی ودیعتِ باطنیہ کے آفتاب و مہتاب کی شعاعیں ہیں جو حضرتؒ کی تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے شرقاً و غرباً پھیلی ہوئی ہیں۔ (اشرف السوانح)

فرمایا کہ میں بڑی مشکل سے کسی سے بدگمان ہوتا ہوں، بڑی چشم پوشی کرتا ہوں اور جب کسی پر خفا ہوتا ہوں تو محض اصلاح کے لئے ہوتا ہوں بغض اس وقت بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ حضرت حاجی صاحبؒ کی برکت ہے۔ (انفاسِ عیسیٰ)

ہمارے حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد طریق زندہ ہُوا ورنہ مُردہ ہو چکا تھا۔ طریقت میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی تھی، منکرینِ طریق کا غلو انحراف کی حد کو پہنچ گیا تھا تو متبعین کا بدعات کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ اب طریق بحمد للہ بے غبار ہے۔ اب صدیوں تک کسی نئے نظام کی ضرورت نہیں رہی اور جب ضرورت ہو گی اللہ تعالےٰ اپنے کسی اور خاص بندے کو پیدا فرما کر اپنا کام لیں گے۔ الحمد للہ اس چودہویں صدی میں طریق کی حقیقت واضح ہو گئی ہے اور یہ سب حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی دُعا کی برکت ہے۔ یہ بزرگ اپنے زمانہ میں اس طریق کے مجدد تھے مجتہد تھے محقق تھے امام تھے۔ دیکھنے میں تو تھانہ بھون کے ایک شیخ زادے معلوم ہوتے تھے۔ علم درسی بھی بظاہر کچھ نہ تھا لیکن حالت یہ تھی

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

ان کے فیضِ روحانی اور نورِ باطنی سے تمام عالم منور ہو گیا ورنہ ہر چہار طرف سے زندقہ اور الحاد، نیچریت و دہریت نے دنیا کو گھیر لیا تھا۔ حق تعالےٰ نے ایسے پُرفتن ادوار اور پُرآشوب زمانہ میں ایسے شخص کو پیدا فرما کر اپنی مخلوق پر بڑا ہی فضل فرمایا اور انتہائی رحمت فرمائی۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے حضرت حاجی صاحبؒ ہی کی دعاؤں کا ثمرہ اور برکت ہے ورنہ میرے اندر کوئی بھی چیز نہیں۔ نہ علم ہے نہ فضل و کمال"۔ اس بیان

کے وقت حضرتؒ کے اندر ایک جوش کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اہلِ مجلس پر بے حد اثر تھا اور قریب قریب سب پر گریہ طاری تھی۔

انعاماتِ الٰہیہ

انعاماتِ الٰہیہ کے متعلق حضرتؒ والا اکثر نہایت تشکر و امتنان کے ساتھ فرمایا کرتے کہ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رات دن ایسی ایسی کھلی دستگیریاں اور عنایتیں ہوتی رہتی ہیں کہ بس آواز تو نہیں ہوتی لیکن معاملہ سب ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہر موقع پر یہ بھی فرماتے جاتے ہوں کہ دیکھ ہم نے تیرے ساتھ یہ عنایت کی۔ دیکھ تیری ہم نے یہ دستگیری کی۔ (اشرف السوانح ۲)

فرمایا اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ اس نے صحیح صحیح باتیں ذہن میں ڈال دی ہیں جن کی وجہ سے لوگ ظلمت سے نکل کر نور میں تو پہنچ گئے ہیں اور راستہ بالکل صاف نظر آنے لگا ہے جیسے بجلی والے بجلی جلادیں تو ظلمت دفع ہو کر راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اللہ میاں نے آنکھیں دی ہیں پاؤں دیئے ہیں۔ ان سے کام لیا جائے تو بے کھٹکے راستہ قطع کر کے جہاں جانا ہے وہاں بسہولت پہنچ سکتا ہے۔ اب اگر کوئی پاؤں ہی نہ اُٹھائے یا الٹے سیدھے قدم رکھتا ہو اور ٹھوکریں کھاتا ہُوا چلے یا آنکھیں بند کر کے چلے تو بجلی والوں کا کیا قصور؟ اللہ تعالےٰ نے جو قرآن شریف میں فرمایا ہے ھذا بصآئر من ربکم وھدی ورحمۃ۔ اس کے متعلق میرے ذہن میں یہی نکتہ آیا تھا کہ بصائر تو گویا آنکھیں ہیں اور ہدیٰ راستہ اور رحمت منزل ہے۔

(اشرف السوانح حصّہ دوم صہ ۳۴)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ ایک مدت سے بہت بڑا حصّہ تصوّف کا مردہ ہو چکا تھا۔ کام کرنے والوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہے بس اندھیری کوٹھڑی میں اندھا دھند چلے جا رہے تھے۔ کچھ ہوش نہ تھا خواہ سر پھوٹے یا ٹانگ ٹوٹے۔ اب الحمدللہ! طریق کافی طور پر واضح ہو گیا ہے۔ مدتوں کے بعد یہ طریق زندہ ہُوا ہے۔ گو اب بھی بدفہم لوگ اس فکر میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اصلاح کا باب بند

ہو جائے۔ مگر چاہا ہوا تو حق سبحانہٗ تعالےٰ ہی کا ہوتا ہے اور کسی کے چاہنے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا
مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اب انشاء اللہ تعالیٰ صدیوں تک کے لئے طریق صاف اور بے غبار ہو گیا اور پھر بھی اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو حق تعالےٰ اور کسی کو پیدا فرما دیں گے یہ اُن کی رحمت ہے جس سے چاہیں اپنا کام لیں کسی خاص شخص پر موقوف نہیں۔ اب بحمد اللہ طریق بے غبار ہے۔ صدیوں تک تجدید کی ضرورت نہیں جب ہو گی حق تعالےٰ کسی کو پیدا فرما دیں گے مگر اس چودہویں صدی میں تو ایسے ہی پیر کی ضرورت تھی جیسا کہ میں ہوں (لٹھ سخت)

(افادات الیومیہ ۸ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

فرمایا کہ الحمد للہ! اللہ تعالےٰ نے بس یہ مراقبہ اچھی طرح ذہن میں جما دیا ہے کہ اللہ تعالےٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انہیں اپنی مخلوق و محکوم کے ظاہر اور باطن میں ہر طرح کے تصرف فرمانے کا ہر وقت کامل اختیار اور پورا حق حاصل ہے کسی کو مجالِ چون و چرا نہیں اور حکیم ہونے کے اعتبار سے ان کا ہر تصرف حکمت پر مبنی ہوتا ہے گو ہماری سمجھ میں وہ حکمت نہ آوے چونکہ بفضلہٖ تعالےٰ، اللہ تعالےٰ کا حاکم اور حکیم ہونا اچھی طرح ذہن نشین ہو گیا ہے اس لئے بڑے سے بڑے حادثہ میں جس کو پریشانی کہتے ہیں وہ الحمد للہ مجھ کو کبھی نہیں ہوئی۔ طبعی اثر ہونا اور بات ہے۔

(اشرف السوانح ج ۳)

فرمایا مجھ کو سخت سے سخت حالات پیش آ چکے ہیں لہٰذا احوالِ باطنی کا ایسا تجربہ ہو گیا ہے کہ کسی سالک کی کتنی ہی الجھی ہوئی حالت ہو اور وہ کیسی ہی باطنی پریشانی میں مُبتلا ہو بحمد اللہ مجھ کو اس کے معالجے کے باب میں ذرا بھی تردد لاحق نہیں ہُوا اور بفضلہٖ تعالےٰ ایسی ایسی تدبیریں ذہن میں آ جاتی ہیں کہ ان کے استعمال سے وہ نہایت سہولت اور سرعت کے ساتھ اس حالت سے نکل جاتا ہے بالخصوص وساوس و خطرات کی تشخیص ماہیت اور تجویز علاج میں تو اللہ تعالےٰ نے مجھے ایسی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ آج کل کم لوگوں

میں ہو گی۔ فللہ الحمد والشکر۔ (اشرف السوانح)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ جو اصلاحِ نفس کی سہل سہل اور نافع تدابیر اللہ تعالے ذہن میں ڈال دیتے ہیں یہ سب طالبین ہی کی برکت ہے میرا کوئی کمال نہیں۔ اللہ تعالے کو منظور ہے کہ میرے بندوں کی اصلاح ہو اور نفع پہنچے لہٰذا ایک ناکارہ سے خدمت لے رہے ہیں۔ ماں یہ ناز نہ کرے کہ میں بچہ کو دودھ پلاتی ہوں بلکہ اللہ تعالے ہی کو منظور ہے کہ بچے کی پرورش ہو اس لئے اُس نے گوشت و خون میں بھی دودھ پیدا کر دیا ہے۔ اگر ماں بچے کو دودھ پلانا چھوڑ دے تو پھر دودھ ہی خشک ہو جائے۔ اسی طرح اگر کنوئیں میں ڈول نہ ڈالا جائے تو نیا پانی آنا بند ہو جائے گا۔ غرض شیخ اگر القا کرنا چھوڑ دے تو القاء ہونا بھی بند ہو جائے۔ اس لئے شیخ کو بھی ناز کا حق نہیں۔

اسرار نہ خود صاحبِ وارد کے لئے باعثِ قناعت ہوتے ہیں نہ اس کے متعلق کے لئے مگر ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ خود تو اسرار کی تلاش میں کاوش نہ کرے اور جو بیساختہ کوئی بات قلب میں آجائے اور قواعدِ شرع کے خلاف نہ ہو تو اس کو بیان کر دے جس سے یہ نفع ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے انا عند ظن عبدی بی۔

(تکمیل الانعام ص ۴)

شانِ استغناء

فرمایا کہ میں الحمد للہ کسی کو اپنا معاون و مددگار نہیں سمجھتا۔ اللہ تعالے کے سوا میری نظر کسی اور پر نہیں۔ کہنے کی تو بات نہیں لیکن اس وقت ذکر آ ہی گیا تو کہتا ہوں کہ میں دُنیا میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا سمجھتا ہوں۔ سوائے اللہ تعالے کی اکیلی ذات کے کسی کو اپنا نہیں سمجھتا۔ بس یہی سمجھتا ہوں کہ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں اور ایک اکیلے شخص کے ساتھ ایک اکیلی ذات ہے اور کوئی نہیں۔

لوگوں کی تو اپنے خدام اور محبت کرنے والوں پر نظر ہوتی ہے۔ میری کسی پر نظر نہیں۔ میں کسی کو اپنا محب اور معین و مددگار نہیں سمجھتا۔ یہ بھی ایک وجہ ہے میری خشکی کی کہ میں کسی کو اپنا محب بنانا یا رکھنا نہیں چاہتا۔ ہر شخص سے آزادی کے ساتھ جو مناسب سمجھتا ہوں

برتاؤ کرتا ہوں۔ الحمد للہ یہ کبھی وسوسہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسا برتاؤ نہ کرو کہ فلاں شخص ہمارا ساتھ چھوڑ دے اور یہ بات میں دعوے سے نہیں کہتا بلکہ یہ کہتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے کہ خدا جانے اس میں کتنی واقعیت ہے۔ اپنے نزدیک تو واقعیت کے خلاف نہیں کہہ رہا اگر کمی بیشی ہو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ جیسے مرنے کے وقت ہر شخص اکیلا ہی جائے گا۔ میں مرنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو اکیلا ہی سمجھتا ہوں کسی کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتا۔ (اشرف السوانح)

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ مجھ کو بحمد اللہ اپنے بزرگوں کی برکت سے اس کی پرواہ ہی نہیں کہ کوئی معتقد رہے گا یا غیر معتقد ہو جائے گا، جو جس کا جی چاہے کرے۔ اگر سارا عالم بھی ایک طرف ہو جائے مجھ کو بفضلِ خدا اس کی پرواہ نہیں۔ پرواہ کی تو صرف ایک ہی چیز ہے وہ رضائے حق ہے اگر یہ حاصل ہے تو پھر سارا عالم اس کے سامنے گرد ہے۔ مسلمان کے لئے صرف یہی ایک چیز ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے راضی کرنے میں لگا رہے۔ اگر وہ راضی ہیں تو اس نے سب کچھ پا لیا اور حاصل کر لیا اور اگر یہ نہیں تو اگر تمام دنیا و مافیہا بھی اسی کو مل جائے تو ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔

احوالِ خصوصی

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ العزیز نے ایک بار فرمایا کہ سالک کو اپنے حالات میں بیّن تغیر پیدا کرنا تو ضروری ہے لیکن رفتہ رفتہ ،، اس طور پر کرنا چاہیئے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور کوئی ایسی امتیازی صورت نہ اختیار کرے۔ لوگوں کی خواہ مخواہ نظریں اُٹھنے لگیں اور خواہ مخواہ بزرگ سمجھنے لگیں اور یہ خود حضرتؒ کا مذاقِ زندگی تھا واقعی حضرت کو پہچاننا بہت ہی مشکل تھا اور ہر شخص کا کام نہ تھا۔ بقول مجذوبؒ ؎

اہلِ ظاہر تجھے سمجھے نہیں اے سادہ جمال
کوئی اس حسن کو پوچھے ہم اداد انوں سے
لا ادھر جام کہ نا اہل ہیں منکر ساقی
درخور ہر کس و ناکس ترا پیمانہ نہیں

بلکہ جن لوگوں کو سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے پہچانا واللہ انہوں نے بھی کما حقہ نہیں پہچانا۔ آخر ایام زندگی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
وز درونِ من نہ جُست اسرارِ من

اکثر حضرت خواجہ صاحب مجذوبؒ کو مخاطب فرما کر فرماتے تھے کہ خواجہ صاحب! آپ نے مجھ کو پہچانا نہیں۔ آپ نے میری کچھ قدر نہ کی۔ کیوں نہ ہو کاملین کا پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ تمکین تام حاصل ہونے پر ان کی حالت عوام کی سی ہو جاتی ہے۔ حسبِ ارشاد حضرت اقدسؒ ع

خلوت و چلّہ برو لازم نماند

انہیں حضور دائم کی ہر وقت کیفیت حاصل رہتی ہے اور جب بضرورت تبلیغ مخلوق کی جانب متوجہ ہونا پڑتا ہے تو اس وقت بھی ان کی نظر بواسطہ حق تعالےٰ ہی کی طرف رہتی ہے اور توجہ الی المخلوق توجہ الی الخالق سے مانع نہیں ہوتی۔ جیسے آئینے میں محبوب کی شکل نظر آ رہی ہو تو آئینہ کا شیشہ اور چوکھٹا بھی پیشِ نظر ہوتا ہے لیکن عاشق کی ٹکٹکی محبوب کے عکس ہی پر بندھی رہتی ہے۔ نیز کاملوں کی نظر زیادہ تر قلب کی نگہداشت کی طرف رہتی ہے کہ وہ غافل نہ ہونے پائے۔ غرض کاملین کا پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے اور بالخصوص ایسے وارث الانبیاء بزرگ کا پہچاننا تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے جو سچا وارث ہو اس سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا جس کی شان میں لوگ یہ کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ، جو اس کا نمونہ ہو لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ جو اس کا مصداق ہو وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ۔ جس کی یہ حالت ہو دل بیار و دست بکار۔ جو با ہمہ بھی ہو اور بے ہمہ بھی ہو جس کو ہر وقت باطنی مقام شہود حاصل ہو اور ظاہری اشغال مانع مشاہدہ نہ ہوں جس کا حال یہ ہو ؎

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو
کہ بینی خندہ بر لبہا و آتش پارہ در دلہا

جس نے ہزاروں کو تو ذاکر و شاغل اور عابد و زاہد بنا دیا لیکن خود قلندرانہ مشرب رکھتا ہے یعنی بظاہر نہ زیادہ ذکر کرتا نظر آتا ہو نہ زیادہ عبادت بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی شغل ظاہری میں منہمک دکھائی دیتا ہو۔ کبھی تصنیف ہو رہی ہے کبھی خطوط لکھے جا رہے ہیں کبھی کسی سے علمی گفتگو ہو رہی ہے کبھی ملفوظات ہو رہے ہیں کبھی مزاح ہو رہا ہے کبھی کسی سے داروگیر ہو رہی ہے کبھی کسی کو زجر و توبیخ ہو رہی ہے۔ کبھی امانتوں کی تھیلیاں سامنے رکھی ہوئی ہیں اور ان کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ کبھی دواؤں کی شیشیاں سامنے رکھی ہوئی ہیں اور اُن پر چٹیں لگائی جا رہی ہیں۔ کبھی سامنے رکھی ہوئی چیزیں اُلٹ پلٹ کی جا رہی ہیں اور اُن کو مرتب کر کے رکھا جا رہا ہے اور حافظ اس غضب کا ہے کہ ہاتھ ان کاموں میں مشغول ہیں بلکہ دماغ بھی وقتِ تصانیف مضامینِ دقیقہ کی طرف متوجہ ہے اور زبان سے منزل کی تلاوت بھی ہو رہی ہے۔ ان سارے ظاہری اشغال کو تو سب دیکھ رہے ہیں اور باطن کی کسی کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

دل کو ہر وقت کس کی دھن لگی ہوئی ہے اور باطنی اعمال کیا کیا ہو رہے ہیں اور اُن سے کیا کیا ترقیات ہو رہی ہیں۔ چنانچہ خود فرمایا کہ قلندروں کے ظاہری اعمال تو زیادہ نہیں ہوتے لیکن باطنی اعمال میں وہ بہت زیادہ بڑھے ہوتے ہیں جن کا درجہ ظاہری اعمال سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ حوادث تو دن رات ہوتے رہتے ہیں اور ان کا قلب ہر حادثہ کے وقت ایک خاص معاملہ حق تعالے کے ساتھ کرتا ہے جو ایک عمل باطنی ہے اور جس کی خبر دوسروں کو نہیں ہوتی حالانکہ وہ برابر اعمالِ باطنہ میں مشغول ہیں اور برابر ترقی کر رہے ہیں۔ بمصداق اس شعر کے جو صرف نقشبندیہ ہی پر نہیں بلکہ سب کاملین پر صادق آتا ہے ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند
برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

اس موقع پر حضرت اقدس کے بعض اعمالِ باطنہ کا ذکر بہت مناسب ہے جن کو حضرت اگر خود اتفاقاً ذکر نہ فرما دیتے تو ہم جیسے بے بصروں کو کبھی ان کا پتہ بھی نہ چلتا۔

سب سے اعلیٰ اور سب سے ارفع عمل باطنی تو کیفیت فنا و عبدیت تھی جو ہر وقت

حضرتؒ پر نہایت شدت سے طاری رہتی تھی اور جس کے اثر سے متاثر ہو کر حضرت بارہا یہاں تک فرمادیا کرتے تھے کہ میں تو اپنے کو کتوں (اور .....) سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ اگر کسی کو یقین نہ ہو تو اس پر حلف اُٹھا سکتا ہوں اھ۔

اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے تواضع کا حقیقی تواضع اس کو کہتے ہیں اور واقعی جس پر حق تعالےٰ کی عظمت کا انکشاف ہو چکا ہو اس کی یہ کیفیت نہ ہو گی تو اور کیا ہو گی۔ چنانچہ ایک بار ایک صاحب نے اپنے خط میں کسی مضمون کے ضمن میں یہ مصرعہ لکھ دیا ؏

او بہ نازے عجبے من بہ نیازے عجبے

اس پر تحریر فرمایا کہ اس مصرعہ نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلادیا۔ کیا مجھے یہ پوری غزل مل سکتی ہے اھ۔

اس واقعہ سے اندازہ کر لیا جائے کہ حضرت اقدس پر حق تعالےٰ کی عظمت اور اپنی عبدیت کا کس درجہ انکشاف تھا۔ جب ہی تو اس مصرعہ نے " او بہ نازے عجبے من بہ نیازے عجبے " جو دونوں کیفیتوں کا جامع ہے حضرتؒ پر اس درجہ اثر کیا۔

فرمایا کہ بھلا کس چیز پہ ناز کیا جائے۔ ہمارا علم وعمل حال و مقام سب خدا کے قبضہ میں ہے ما یفتح اللہ للناس من رحمة ولا ممسک لها وما یمسک فلا مرسل له من بعده۔ اللہ تعالےٰ جس رحمت کو کشادہ کرنا چاہیں کوئی اس کا روکنے والا نہیں۔ اور جس رحمت کو روکنا چاہیں کوئی اس کا کشادہ کرنے والا نہیں۔ کوئی چیز انسان کے مستقل اختیار میں نہیں۔ (اشرف السوانح ج ۲)

محاسبۂ نفس

حضرتؒ والا ہر وقت اپنے نفس کی نگرانی اور دیکھ بھال رکھتے تھے اور بوجۂ دائمی مجاہدۂ نفس، دائمی ترقی فرماتے رہتے اور یہ وہ ترقی تھی جو ہر وقت ہو رہی تھی اور جس کا کسی کو عام طور سے پتہ بھی نہیں چلتا اور یہی وہ اعمالِ باطنہ ہیں جن کے بارے میں حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ وہ سالک کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں اور دوسروں کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا ایسے شخص کو " قلندر " کہتے ہیں۔ اس کو عبادات نافلہ کا اتنا اہتمام

نہیں ہوتا جتنا اپنے قلب کی نگہداشت کا اور اعمالِ قلبیہ کا۔ مثلاً جب کوئی واقعہ پیش آیا تو فوراً اس کے قلب نے اس واقعہ کے متعلق حق تعالےٰ کے ساتھ کوئی معاملہ صبر و شکر تفویض و عبدیت وغیرہ کا کر لیا۔ بس وہ ایک مستقل باطنی عمل ہو گیا اور اس درجہ کا ہُوا کہ وہ اس کی بدولت کہیں کا کہیں پہنچ گیا اور چونکہ واقعات بہ کثرت پیش آتے ہی رہتے ہیں اور وہ ہر وقت اپنے قلب کی نگہداشت میں رہتا ہے اس لئے وہ ہر وقت باطنی ترقی کرتا رہتا ہے اور اس شخص سے بڑھ جاتا ہے جس کو عباداتِ نافلہ کا تو بہت اہتمام ہوتا ہے لیکن قلب کی نگہداشت کا اہتمام نہیں۔ بمصداق ارشاد حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

سیرِ عابد ہر شبے یک روزہ را
سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ

(اشرف السوانح حصہ دوم ص ۲۲)

فرمایا ایک بات سُن کر آپ کو تعجب ہوگا مگر چونکہ وہ خدائے تعالےٰ کی نعمت ہے اس لئے ذکر کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ میں خود اپنے اوپر بھی احتساب کرتا رہتا ہوں۔ جیسے دوسروں پر کرتا ہوں بلکہ یہ کہنا بھی سچ ہوگا کہ اوروں سے زیادہ اپنا آپ احتساب کرتا ہوں یہ اللہ تعالےٰ کا بڑا فضل ہے جو مصداق ہے ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔

ایک بار فرمایا کہ جب میں کسی کے ہدیہ کو رد کرتا ہوں تو گو وجہ کے ساتھ ہو، لیکن بہت ڈرتا ہوں۔ کیونکہ غور کرنے سے کسی قدر شک کبر کا ہوتا ہے جس سے نہایت خوف ہوتا ہے اللہ تعالےٰ معاف فرمادیں۔ استغناء اور کبر میں فرق نہایت دشوار ہے۔ دونوں بہت متشابہ ہیں کبھی اس میں دھوکہ ہوجاتا ہے کہ جس کو ہم استغناء سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ہوتا ہے کبر۔ خدا ہی محفوظ رکھے تو انسان محفوظ رہ سکتا ہے ورنہ ہمارا ہر قول فعل، حال قال سب ہی پُر از خطر ہے۔ کوئی حالت خطرہ سے خالی نہیں۔ مجھے تو اب وہ شعر اکثر یاد آیا کرتا ہے جو کبھی بچپن میں پڑھا تھا ؎

من نگویم کہ طاعتم بہ پذیر   قلم عفو بر گناہم کش

بلکہ بروئے حدیث (یعنی قول حضرت عمرؓ کہ ہمارے جو اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہوئے ہیں وہ تو مقبول ہو جاویں اور حضورؐ کے بعد جو ہوئے ہیں اگر اُن پر مواخذہ نہ ہو تو غنیمت ہے اجر کی ہم ہوس نہیں کرتے) ہرگز۔ ہم تو کیا حق تعالےٰ خود ہماری طاعات کو معاف فرماوے اور طاعات تو خیر کیا قابلِ معافی ہوتیں مطلب یہ ہے کہ جو اُن میں کوتاہی ہے وہ معاف فرمائے۔ کیونکہ جن کو ہم اپنی طاعات سمجھ رہے ہیں وہ در حقیقت طاعات ہی کب ہیں۔ جس طرح کوئی بے ڈھنگے طور سے پنکھا جھل رہا ہو یا اور کوئی خدمت کر رہا ہو تو وہ تو اپنے جی میں بڑا خوش ہوگا کہ ہم خدمت کر رہے ہیں حالانکہ بعضوں کی خدمت سے سخت اذیت ہوتی ہے لیکن محض دل شکنی کی وجہ سے اُن کو منع نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ہماری طاعات ہیں۔ کبھی کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نے گھنٹہ بھر تک ماشاء اللہ کیا ہے کیا خبر قبول ہوا بھی کہ نہیں؟ ایسی طاعات پر میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں پر اگر مواخذہ نہ ہو تو غنیمت ہے۔ درجات کی تو اہلِ درجات تمنا کریں یہاں تو بس یہ التجا ہے کہ حق تعالےٰ سزا سے بچاویں خواہ جنت میں صفِ نعال ہی جگہ مل جائے۔ (منقول از حسن العزیز ج ۱۔ ملفوظ نمبر ۹۸)

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے کبھی درجوں کی ہوس نہیں ہوئی کہ مجھے جنت میں بڑا درجہ ملے۔ میں اس بات پر بالکل خوش اور راضی ہوں کہ عذاب سے نجات ہو جائے چاہے جنت میں جوتیوں ہی کی جگہ مل جائے۔ اگر سزا نہ ہو تو بھی بہت ہے۔ (الخضوع ص ۱۹)

میں اپنی نسبت کہتا ہوں کہ مجھے کبھی صحابی بننے کی تمنا نہیں ہوتی اس لئے کہ ہم جیسے ہیں معلوم ہے فطرت تو بدلتی نہیں۔ اگر اس وقت ہوتے تو جب بھی ایسے ہی ہوتے تو خدا جانے حضور صلی اللہ علیہ کے حقوق ہم سے ادا ہوتے یا نہ ہوتے۔ اگر نہ ہوتے تو مردود ہو جاتے۔ اس سے تو اس وقت ہی غنیمت ہیں کہ عیوب ہمارے مستور ہیں۔ بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ہم لوگ اُس زمانہ میں نہیں ہوئے۔ یہ صحابہؓ ہی کا کام تھا کہ حقوق نبوت انہوں نے اچھی طرح ادا کئے۔

فرمایا تعجب ہے کہ لوگوں کو اپنے عیوب ہی نظر نہیں آتے حالانکہ واللہ اگر آدمی کی حس

صحیح ہو تو گناہ ہیں اس کو اپنی طاعات بھی معاصی نظر آئیں۔ پھر یہاں جوش کے ساتھ تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ مجھ کو تو اپنی نماز، اپنے روزے اور اپنے ہر عمل بلکہ اپنے ایمان تک میں شبہ عدم خلوص کا رہتا ہے اور ہم لوگ تو کیا چیز ہیں صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر کون مخلص ہو گا۔ حدیث میں وارد ہے کہ اصحابِ بدر میں سے ستر حضرات ایسے تھے جن کو اپنے اوپر نفاق کا شبہ تھا کہ کہیں ہم منافق تو نہیں۔

حضرتؒ والا بار بار فرمایا کرتے کہ گو میں متقی اور پرہیزگار تو نہیں لیکن الحمد للہ اپنی اصلاح سے غافل بھی نہیں۔ ہمیشہ یہی ادھیڑبن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت میں فلاں تغیر کرنا چاہیئے، فلاں نقص کی فلاں طریقہ سے اصلاح کرنی چاہیئے۔ غرض مجھ کو اپنی کسی حالت پر قناعت نہیں۔

اسی طرح اس زمانے میں جب وعظ کثرت سے فرمایا کرتے تھے ایک بار فرمایا کہ جب میں اپنے اندر کوئی امر اصلاح طلب پاتا ہوں تو اس کے متعلق ایک وعظ کہہ دیتا ہوں جس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ چنانچہ وعظ الغضب اسی غرض سے کہا گیا تھا اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالے بڑے بڑے امراضِ نفس کے لئے ایسے ایسے ہی چٹکلے دل میں ڈال دیتے ہیں جن سے بفضلہٖ تعالے بسہولت اصلاح ہو جاتی ہے۔

(اشرف السوانح ج۲)

فرمایا کہ عام لوگوں میں سے تو اگر کسی کے اندر ننانوے عیب ہوں ایک بھلائی ہو تو میری نظر بھلائی کی طرف جاتی ہے اور ان ننانوے عیبوں پر نہیں جاتی اور جس نے اپنے آپ کو تربیت کے واسطے میرے سپرد کیا ہو تو اس میں اگر ننانوے بھلائی ہوں اور ایک عیب ہو تو میری نظر اس عیب پر جاتی ہے ان ننانوے بھلائیوں پر نہیں جاتی۔

اپنے نفس کے محاسبہ سے بحمداللہ کبھی غافل نہیں ہوتا جب کسی طالب یا سالک سے کچھ مواخذہ کرتا ہوں تو اپنے نفس پر بھی نظر رکھتا ہوں اور اللہ تعالے کے مواخذہ سے پناہ مانگتا رہتا ہوں۔

حضرتؒ نے اپنی نشست کی جگہ کے سامنے والی چھوٹی میز پر ایک کاغذ لکھ کر رکھ لیا تھا۔ اکثر اس پر نظر فرماتے رہتے تھے

کثرتِ ذکر، قلتِ تبیان
وقت ہیجانِ نفس، کفِ لسان

اکابرِ سلف کی کُتب میں بھی حضرتِ والا کے معمولات کی تائیدات بکثرت ملتی ہیں۔ جن کو دیکھ کر یا سُن کر حضرتؒ والا کو بہت بنان اور مسرور ہوتا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ گو میں نے کتابیں دیکھ دیکھ کر اپنے معمولات مقرر نہیں کئے لیکن الحمدللہ بزرگوں کی برکت سے قلب میں وہی باتیں آتی ہیں جو سلف کا معمول تھیں۔ لوگ تو سلف کی تائید سے افسردہ ہو جاتے ہیں کہ ہم موجد نہ رہے اور مجھ کو اس سے نہایت مسرت ہوتی ہے کہ الحمدللہ اب اپنی بات پر اطمینان ہو گیا۔ (اشرف السوانح ج۲)

کئی بار فرمایا کہ گو میں اعمال میں تو بہت کوتاہ ہوں لیکن الحمدللہ اپنی اصلاح سے غافل نہیں۔ ہمیشہ یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ فلاں حالت کی یہ اصلاح کرنی چاہیئے۔ فلاں حالت میں یہ تغیر کرنا چاہیئے۔ غرضیکہ کسی حالت پر قناعت نہیں اور گو میں نجات کو اعمال پر منحصر نہیں سمجھتا ہوں لیکن بندہ کے ذمے یہ اللہ تعالےٰ کا حق ہے کہ اُس کے اوامر کو بجا لائے اور نواہی سے اجتناب رکھے اس لئے مجھ کو اپنے اعمال کی کوتاہی پر سخت ندامت رہے اور ہمیشہ اپنی اصلاح کی فکر رہتی ہے۔

ایک بار مدرسۂ امینیہ دہلی میں حضرت والا کا وعظ ہُوا۔ ہزاروں آدمیوں کا اجتماع تھا۔ وعظ کے دوران حضرتؒ والا پر ایک خاص کیفیت طاری تھی اور بڑے والہانہ انداز میں تقریر فرما رہے تھے۔ درمیان میں رُک کر فرمایا، اس وقت میرے قلب پر ایک ایسا مضمون وارد ہُوا ہے جو اس سے قبل مجھ کو کبھی معلوم نہ تھا اور مجھے یقین ہے کہ یہ مضمون آپ لوگوں نے بھی کبھی نہ سُنا ہو گا اور نہ پڑھا ہو گا۔ مَیں تحدیث نعمت کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔

یہ کہہ کر حضرت والا کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ ایک نادر مضمون تحدیث نعمت کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ یہ انداز تحدیث نعمت کا تو نہیں ہے۔ یہ تو اپنے علم اور وارد کا اظہارِ فوقیت ہے جو صریحاً دعویٰ باطلہ ہے۔ مَیں اپنے تحدیث اظہارِ تحدیث نعمت پر توبہ کرتا ہوں۔ (بحوالہ ارشادِ گرامی حضرت

مولانا عبدالغفور عباسی مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ)۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا جلسۂ عام میں اپنے کبر نفس سے متنبہ ہو کر بلا تکلف بے ساختہ اظہارِ تاسف کرنا کمال خشیتِ الٰہی کی بے نظیر مثال ہے۔ ذالکَ فضل اللہ یُؤتیہ من یّشآء۔

کیفیّاتِ باطنی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات پر نظر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرتؒ کی فطرتِ سلیمہ میں کچھ ایسے ذوق اور جوہر ودیعت فرمائے تھے جن کا ہر دَور زندگی میں حضرتؒ کے معاملات و مصروفیات کے انداز میں ظہور ہوتا رہا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ذوق فطری کا رُجحان تصوّف کی طرف بھی تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں حضرتؒ کو تصوّف سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اکثر اس کے متعلق کتابیں مطالعہ کیا کرتے تھے۔

یہ بھی منجانب اللہ تعالےٰ حالات سازگار تھے کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں ایسے اساتذہ موجود تھے کہ جن کو اللہ تعالےٰ نے علومِ ظاہری و علومِ باطنی میں امتیازی درجۂ فضیلت عطا فرمایا تھا۔ ان میں اکثر اساتذہ حضرت شاہ محمد امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے حلقہ بگوش ارادت تھے۔

یہ اساتذہ جہاں اپنے طالب علموں کو درسیات کا سبق دیتے تھے وہاں اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی تعلیم و تربیت بھی فرماتے جاتے تھے۔ حضرتؒ والا کو بھی اس سعادت کے حاصل ہونے سے بہت نفع ہُوا اور ذوقِ تصوّف کی نشوونما ترقی پذیر ہوتی رہی۔ اُسی زمانہ میں حضرتؒ والا کا بھی غائبانہ تعلق حضرت حاجی صاحبؒ سے ہو گیا تھا۔ پھر جب حضرت والا تحصیل علوم سے فارغ ہو کر جامع العلوم کانپور میں بسلسلہ ملازمت درس و تدریس میں مشغول تھے۔ اُس زمانہ میں بھی ذکر و شغل کا ذوق و شوق روز بروز بڑھتا ہی رہا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں مذکور ہے۔ جو زیادہ تر حضرتؒ والا کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر اشرف السوانح ہی سے منتخب کئے گئے ہیں۔

انقباض وانشراح

حسب سُنّتِ عالیہ الٰہیہ سالک کی ترقیٔ باطن کا ایک اقرب طریق یہ بھی ہے کہ اس کو ایک حال پر نہ رکھا جائے۔ لہٰذا اکثر و بیشتر سالکین کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا یہی معاملہ رہتا ہے، چنانچہ ذکر و شغل اور تزکیۂ نفس کا اہتمام کرنے والوں پر کبھی کبھی شدید قبض و بسط یا خوف و رجاء یا ہیبت و انس یا عروج و نزول کی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں یا یہ کہا جائے کہ نشیب و فراز طریق حسب خصوصیات و استعدادِ سالک مختلف منازل پر مختلف ازمنہ میں مختلف الوان سے کم و بیش عمر بھر پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی سلوک و طریقت کا ایک ضابطہ کلیہ ہے کہ ایک سالک طریق کو کسی ماہر نفسیات و محقق مرشدِ کامل کی دستگیری کی سخت ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ان دشوار گزار اور صبر آزما منازل سے بخیر و عافیت گزر جائے۔

چنانچہ حضرتؒ والا نے بھی جب اس وادیٔ پُرآشوب میں قدم رکھا تو ایسے ہی صبر آزما مقامات سے گزرنا پڑا۔ عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا، ذکر و شغل میں شغف پیدا ہوگیا۔ فطری طور پر طبیعت میں حدت و جوش کا غلبہ تھا۔ دل میں التہاب و اضطراب نے شدت اختیار کرلی۔ معمولاتِ زندگی درہم برہم ہونے لگے۔ مگر حضرتؒ والا برابر اپنے مربی و شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ العزیز کو اپنے حالات سے مطلع کرتے رہے اور ان کی دعائیں اور توجہات خصوصی حضرتؒ کے شاملِ حال رہیں۔

اس کے علاوہ حضرتؒ اپنے محسن و مربی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو برابر اپنے حالات لکھتے رہے اور اکثر و بیشتر اُن کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے رہے اور اُن کے مشوروں پر عمل کرتے رہے۔ بعونہٖ تعالیٰ جس کی برکت سے حضرتؒ اپنے مقام پر ثابت قدم رہے اور حضرتؒ کے استقلال اور صبر و تحمل پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہونے پایا۔

ذیل میں اس موضوع کی تفصیل کے لئے اشرف السوانح حصہ سوم سے اجمالاً چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جو انشاء اللہ تعالےٰ رہروانِ طریق و سالکانِ تصوف کے لئے نہایت مفید و سبق آموز اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔

پہلا واقعہ

جس زمانہ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں درس وتدریس کے کام میں مشغول تھے۔ یک بیک قلب مبارک میں ایک پُرزور کشش غیبی نہایت شدومد کے ساتھ محسوس ہوئی اور ذکر وشغل کا ذوق شوق جو ابتدائے ارادت سے دل نشین تھا جوش وخروش کے ساتھ موجزن ہونے لگا۔ یہ جوش وخروش ۱۳۰۷ھ میں پیدا ہُوا۔

اِدھر تو آتشِ طلب دل میں مشتعل اور اُدھر حضرت پیرومُرشد کے درمیان دور دراز کا فاصلہ۔ اسی ہیجانی کیفیت کے زمانہ میں حضرتؒ کی ماموں صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ حضرتؒ کے ماموں صاحب ایک مشہور اور بڑے صاحبِ حال وقال بلکہ مغلوب الحال درویش تھے۔ حضرتؒ والا ان کی صحبت میں رہے تو اور بھی زیادہ جوش وخروش نے ترقی کی اور حضرتؒ بے ساختہ اپنے ماموں صاحب پیرجی کی طرف مائل ہوگئے اور اُن کی تعلیم کے مطابق خاص اہتمام کے ساتھ ذکر وشغل شروع کر دیا۔ اس طرح حضرتؒ والا کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔

بس ذکر وشغل کا اس طرح شروع فرمانا تھا کہ حضرت والا کا رنگ ہی بدل گیا شغل باطن سے یہاں تک دلچسپی بڑھی کہ دوسرے تعلقات سے نفرت ہوگئی اور حضرت حاجی صاحب سے بذریعہ عریضہ ترک ملازمت کا مشورہ لیا لیکن حضرت پیرومرشد نے خلق اللہ کو فیض دینی پہنچانے کی خدمت کو ترجیح دی اور ترکِ تعلق کی اجازت مرحمت نہ فرمائی۔ کیونکہ ابھی اس کا وقت نہ آیا تھا، تمکین کا انتظار تھا۔ چنانچہ حضرتؒ نے سلسلۂ درس وتدریس جاری رکھا اور ذکر وشغل میں بھی مصروف رہے۔

آخرکار ۱۳۱۰ھ میں اشتیاق وصول الی اللہ نے رفتہ رفتہ بڑھ کر اضطراب والتہاب کی صورت اختیار کر لی اور شدت وعجلت طلب نے حد درجہ بے چین کر دیا۔ اس کیفیت کو اصطلاحِ صوفیہ میں "شوق" سے تعبیر کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرتؒ والا نے ایسی حالت میں سکون واطمینان خاطر حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ اپنے پیرومُرشد کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔ غیب سے ایسے سامان مہیا ہوگئے کہ حضرتؒ اپنے شیخ کی منشاء کے مطابق چھ ماہ کے قیام کے ارادہ سے

مکۃ المکرمہ روانہ ہو گئے۔ مرکز پر پہنچنا تھا کہ سارا اضطراب و التہاب جو ایک عرصہ سے لاحق ہو رہا تھا مبدل بہ سکون و طمانیت ہو گیا اور اب وہ کیفیت رونما ہوئی جس کو اصطلاحِ صوفیہ میں "اُنس" کہتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ پہلے ہی سے منتظر تھے۔ حضرت کے پہنچنے پر بہت مسرور ہوئے۔ بس پھر کیا تھا خاص الخاص توجہات و عنایات بے غایات شروع فرما دیں۔

اُدھر حضرت حاجی صاحبؒ کی قوتِ افاضہ ادھر حضرتؒ والا کی قابلیتِ استفاضہ بس تھوڑے ہی عرصہ میں باہم اس درجہ مناسبت ہو گئی کہ حضرت حاجی صاحبؒ بیساختہ فرمانے لگے کہ بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔

حضرت شیخؒ کی خدمت و معیت میں رہ کر حضرتؒ والا ہمہ تن و ہمہ وقت ذکر و اشغال میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ حضرت حاجی صاحبؒ نے بطورِ خود حضرتؒ والا کو اپنے پاس رہنے کے لئے بلایا تھا اس لئے ہر وقت اپنی توجہات خصوصی سے نظر فرماتے رہے اور حضرتؒ کی ترقی پذیر استعداد و صلاحیت کا اندازہ فرماتے رہے۔ مدتِ قیام کے اختتام پر جب حضرتؒ رخصت ہونے لگے تو حضرت شیخؒ نے نہایت محبت و شفقت کے انداز میں فرمایا کہ الحمدللہ! اللہ تعالےٰ نے جو کچھ مجھے الہامی علوم باطنی و معارف و حقائق منکشف و عطا فرمائے ہیں وہ بعونہ تعالےٰ میں نے سب تمہارے قلب میں منتقل کر دیئے ہیں۔ انشاء اللہ تعالےٰ خلقِ کثیر کو تمہاری ذات سے نفع پہنچے گا۔ میری دعائیں اور توجہات ہمیشہ تمہارے شاملِ حال رہیں گی۔

بعد واپسی از مکۃ المکرمہ حضرتؒ والا کانپور پہنچ کر پھر اپنے مشاغلِ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ تک خوب ذکر و شغل کا ذوق و شوق و احوال و مواجہہ کا عرفان اور ورود اور افاضۂ باطنی کا جوش و خروش رہا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کو اپنے حالات کی اطلاع کرتے رہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے ایک والا نامہ میں ارقام فرمایا آپ کا خط موصول ہوا۔ کمال خوشی ہوئی۔ اللہ تعالےٰ ان عزیز کو مدام اپنی یاد اور ذوق و شوق و مواجہہ میں سرشار اور مخمور رکھیں۔

دُوسرا واقعہ

حضرتؒ اپنے معمولات پورے کرتے رہے اور جب رفتہ رفتہ مقامات محصلہ میں رسوخ ہو گیا تو اس شوق نے دوسرا رنگ اختیار کیا یعنی مقاماتِ متوقعہ کی طلب شدید پیدا ہو گئی۔ اور دوبارہ پھر وہی کیفیت اضطرابیہ والتہابیہ رونما ہو گئی، جیسی قبل قیام مکۃ المعظمہ ابتدائے حال میں طاری ہوئی تھی، لیکن ان دونوں کیفیتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا کیونکہ وہ کیفیت طلب ابتدائی سے ناشی تھی اور یہ اب طلبِ مزید ہے۔

چونکہ اللہ تعالٰے کو حضرتؒ والا کا رفع مراتب کرنا منظور تھا حضرت والا کی حالت باطنی نے پھر پلٹا کھایا اور پہلے سے بھی زیادہ تشنگی طلب نے زور دکھایا چنانچہ بمصداق النہایۃ ھی العود البدایۃ پھر ویسے ہی حیرانی اور پریشانی پیدا ہوئی جیسی قبلِ قیام مکۃ المکرمہ لاحق ہوئی تھی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر اس مرتبہ کے بے چینی بخلاف پہلی مرتبہ کی بے چینی کے بڑے مزے کی بے چینی تھی۔ کیونکہ یہ بے چینی غایت اُنس مع اللہ سے ناشی تھی۔ گویا شوق و اُنس دونوں سے مرکب تھی اور بجائے آثار اضطراب آثار اشتیاق نمایاں تھے جس کا یہ اثر ہوا کہ مدرسہ کا رنگ ہی بدل گیا۔ درسی کتابوں کا سبق ہو رہا ہے اور ادنیٰ مناسبت سے تصوف کے مضامین کی دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں اور طالب علموں پر کیفیت وجدیہ طاری ہو رہی ہے۔ بہت سے مدرسین اور طلباء نے ذکر و شغل شروع کر دیا اور حالاتِ عجیبہ و کیفیاتِ غریبہ کا وُرود ہونے لگا۔

حضرتؒ والا نے شروع شروع کے جوش افاضہ میں حلقہ توجہ بھی منعقد کر دیا تھا غرض مدرسہ مبدل بہ خانقاہ ہو گیا۔ اُس زمانے کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ خود حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بس یہ جی چاہتا تھا کہ ساری دُنیا کو ذاکر و شاغل اور ولی کامل بنا دوں۔

حضرتؒ والا اپنے تمام حالات سے اپنے پیر و مُرشد کو مطلع کرتے رہے، حضرت حاجی صاحبؒ کو حالاتِ اضطرابیہ اور کیفیاتِ اضطراریہ معلوم ہو کر بڑی تشویش ہوئی اور حضرتؒ کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ جب تک فقیر زندہ ہے آپ پریشان نہ ہوں۔ میں برابر آپ کے لئے دُعا کر رہا ہوں اور میری توجہات آپ کے شاملِ حال

ہیں۔ حضرتِ شیخ کے اس تسکین نامہ سے حضرت کا سارا اضطرابِ باطنی ختم ہو گیا اور پھر سکون کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ لیکن ماسواء سے قطع تعلقات کے جذبات ہمیشہ دل میں موجزن رہے۔ آخر کار کچھ عرصہ کے بعد ان مشاغل کو مقاصد متوقع کے حصول میں مانع محسوس کرتے ہوئے مدرسہ جامع العلوم کانپور سے سبکدوش ہونے کا ارادہ کر لیا اور رفتہ رفتہ حالات پر قابو پاکر کانپور کے قیام کو ترک کر دیا اور اپنے وطن تھانہ بھون میں تشریف لے گئے اور مستقلاً وہاں قیام کا عزم کر لیا۔ پھر اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قدیم خانقاہ و مدرسہ میں توکلاً علی اللہ مقیم ہو گئے اور آپ نے آئندہ زندگی کے لئے ایک خاص نصب العین کے ساتھ مستقل لائحہ عمل اور نظم الاوقات مقرر فرما لیا اور برابر نہایت سکون اور انشراح و انبساط کے ساتھ اُنس مع اللہ کے درجاتِ عالیہ طے فرماتے رہے۔ لیکن عشق و محبت کے کوچہ میں عافیتِ دائمی کہاں؟ اس سے مرتے دم تک بھی چین نصیب نہیں کیونکہ اکثر احوال میں نزول بلا عادتاً لوازمِ سلوک ہے۔

تیسرا واقعہ

قیامِ وطن کے تقریباً ایک سال بعد (دورانِ سلوک میں بہ سلسلہ ترقیاتِ باطنہ) ایک نہایت ہیبت ناک اور سنگین اور صبر آزما واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے قلب پر دفعتاً ایک ایسی سخت کیفیتِ باطنیہ کا وُرود ہُوا جس نے آنِ واحد میں اس سارے انشراح و سکون باطنی کو جو ایک عرصہ سے حاصل تھا یک قلم غارت کر دیا اور حضرت والا ایک شدید ترین قسم کے اندوہ و غم میں مبتلا ہو گئے۔

واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کے ایک رشتہ دار کو جو چرتھاول کے زمیندار اور پنشنر سب انسپکٹر تھے ایک مقدمہ کے سلسلہ میں دشمن کاشت کاروں نے شہید کر دیا۔ اس حادثۂ عظیمہ کی خبر پاتے ہی حضرتؒ والا وہاں پہنچے اور حضرتؒ والا ہی کے اہتمام اور نگرانی میں تجہیز و تکفین ہوئی۔ غسل میت بھی حضرتؒ والا ہی کے مواجہہ میں ہُوا۔ دورانِ غسل میں مرحوم مظلوم کا زخم رسیدہ سر اور اُن کی نعش کا حسرت ناک منظر برابر حضرتؒ والا کے

پیشِ نظر رہا اور حضرتؒ والا کے نازک اور پُرسوز و گداز قلب مبارک کو دزدیدہ طور پر سخت زخمی اور متاثر کرتا رہا۔ لیکن بظاہر اس وقت حضرتؒ والا کو کوئی خاص اثر محسوس نہ ہُوا اور نہایت سکون کے ساتھ تجہیز و تکفین کے اہتمام میں مشغول رہے مگر جب دفن سے فارغ ہو کر واپس تشریف لے آئے تو گھر کے اندر سے مستورات کے رونے کی آواز آئی۔ قلب تو زخمی ہو ہی چکا تھا بس سُنتے ہی اس پر ایک ایسی کاری چوٹ لگی کہ بے چین ہو گئے اور سخت اضمحلال قلبی عارض ہو گیا۔ یہاں تک کہ اختلاج کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

ابھی ایک تاثر سے قلب سبکدوش نہ ہونے پایا تھا کہ دو تین ہی دن بعد سسرال میں ایک اور غمی ہو گئی۔ اس واقعہ سے صدمہ زدہ قلب کو ایک اور صدمہ پہنچا اور چوٹ کھائے ہوئے دل پر ایک اور چوٹ لگی۔ گو اپنی حقیقت میں تو یہ دوسرا حادثہ پہلے حادثے کے برابر نہ تھا لیکن وہ پچھلے تاثر کے بڑھانے میں معین ہو گیا۔ اسی حال میں کہ قلب سخت ماؤف و متاثر ہو رہا تھا۔ پچھلی رات کو تہجد کے لئے وضو کرتے ہوئے یک بیک بلا اختیار ایک خطرۂ منکرہ کا ورود ہُوا جس کا حاصل چند الفاظ تھے جو دفعتہً متخیلہ میں واقع ہو گئے گو یہ کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ اس قسم کے خطرات سالکین کو پیش آتے ہی رہتے ہیں بلکہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم بھی خطرات سے خالی نہ تھے جیسا کہ حدیث ۔ ذاک صریح الایمان سے ثابت ہے اور خود حضرتؒ والا کو بھی اس سے قبل اور بعد میں اس قسم کے خطرات آئے ہوں گے لیکن اس مرتبہ اس قدر شدید اور مدید اثر ہُوا کہ حضرتؒ والا اپنی زندگی ہی سے بےزار ہو گئے ؎

ذوقے چناں ندارد بے دوست زندگانی
بے دوست زندگانی ذوقے چناں ندارد

یہاں تک کہ خودکشی تک کے وسوسے آنے لگے۔ چنانچہ خود فرماتے تھے کہ ایک بار ایک صاحب ملنے آئے اُن کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق موجود تھی۔ بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ اُن سے کہہ دوں کہ خدا کے لئے فائر کر کے میرے ناپاک وجود سے اس دُنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ میں اس حالت کو بُعد اور اُس بُعد کے وہم سے اپنے آپ کو فرعون اور ہامان سے بھی بدتر باوجود اپنے کو مومن اور اُن کو کافر سمجھنے کے سمجھتا تھا اور چونکہ یہ

ذوقیات ہیں اس لئے تقریب فہم کے لئے بس اس سے زیادہ شرح نہیں کرسکتا کہ یوں سمجھتا تھا کہ جس بلا میں وہ لوگ مبتلا تھے اُس سے تو اُن کو ایمان لاکر ایک منٹ میں چھٹکارا ہو سکتا تھا اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اُس سے سالہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں ۔ اھ

حضرتؒ نے اپنی اس ہیجانی و اضطرابی کیفیت کے دفع کرنے کے لئے یونانی علاج سے بھی رجوع کیا اور بطور خود بھی بعض تفریحات و دیگر مشاغل نافعہ کی طرف بھی متوجہ رہے۔ اس کے ساتھ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے برابر بذریعہ خطوط بھی اور حاضر ہو ہو کر بھی عرض حال کرتے رہے۔

حضرتؒ والا فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ شروع سے اخیر تک برابر اُسی ایک تجویز پر قائم رہے کہ خطرات منکرہ کی طرف التفات نہ کرو اور ہمیشہ اسی پر زور دیتے رہے جس سے مولانا کی اعلیٰ درجہ کی شانِ ارشاد معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دُعاء اور توجہ بھی خاص طور سے فرماتے رہے۔ حضرت والا یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا ایک یہی ارشاد کہ "خطرات کی طرف التفات نہ کرو، مولانا کے امام فن ہونے کی کافی دلیل ہے۔ اھ

اس کے علاوہ اپنے پیر و مرشد کو بھی اپنے حالات سے مطلع فرماتے رہے جس حالت کا بیان کیا جارہا ہے وہ بہت ہی شدید قسم کی حالت تھی جس کا اتنی مدت تک تحمل بعانت خداوندی و بہ توجہات بزرگان حضرت والا ہی جیسے عالی ظرف اور راسخ الایمان سے ہو سکا ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بدحواسی میں ضرور اپنی ایمان یا جان یا ایمان اور جان دونوں کا سخت نقصان کر بیٹھتا۔

بفضلہٖ تعالےٰ حضرتؒ والا سلوک کی اس دشوار گزار اور آخری گھاٹی سے بتوجہات و تدبیرات و دعوات بزرگاں پار ہو گئے اور حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ بشارت کہ انشاء اللہ تعالیٰ سب گھاٹیوں سے پار ہو جاؤ گے حضرت حاجی صاحبؒ کی حیات ہی میں پوری ہو گئی۔ کیونکہ حضرتؒ والا کی اس حالت کے فرو ہونے کے چند ماہ بعد ہی حضرت حاجی صاحبؒ رحلت فرما گئے۔ گویا اپنے سامنے ہی حضرتؒ والا کو سب گھاٹیوں سے

پار کرا گئے اور حضرت حافظ شیرازیؒ کا یہ شعر صادق آگیا ؎

آں پریشانیٔ شب ہائے دراز و غمِ دل
ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شُد

یہ ابتلائے شدید و مدید جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی حضرتؒ والا کے سلوک کی سخت ترین اور آخری گھاٹی تھی جس سے بعون اللہ تعالیٰ و بتوجہات بزرگاں حضرتؒ والا پار ہو کر بفضلہٖ تعالیٰ پھر جمعیت باطنی و انشراح قلبی سے مشرف ہو گئے اور پھر وہی سابقہ کیفیت بسط و اُنس اور ذوق و شوق کی عود کر آئی بمصداقِ اشعارِ ہذا ؎

باز آمد آب من در جوئے من
باز آمد شاہِ من در کوئے من
باز سودائی شدم من اے طبیب!
باز دیوانہ شدم من اے حبیب!

بلکہ اس شدید و مدید قبض کے بعد جو بسط و اُنس میسّر ہوا وہ بفضلہٖ تعالیٰ بے نظیر و لازوال اور ترقی پذیر تھا اور جو انشراح و سکون حاصل ہوا وہ نہایت راسخ و متمکن اور روز افزوں تھا اور اس انجام بخیر کے لحاظ سے حضرتؒ والا کا یہ ابتلاء شدید بالکل حضرت عراقیؒ کے اس شعر کا مصداق نکلا ؎

خوشا دردے کہ درمانش تو باشی
خوشا راہے کہ پایانش تو باشی

حاصل کلام یہ ہے کہ حضرتؒ والا کو بحمد اللہ تعالیٰ اس قبض شدید و مدید کے بعد پھر اس درجہ کا قبض کبھی پیش نہیں آیا اور بفضلہٖ تعالیٰ حالت باطنی میں ایک مستحکم کیفیت تمکن و رسوخ کی پیدا ہو گئی لیکن حسبِ تحقیقِ بالا عارضی تغیرات سے بالکل خالی کیونکر رہ سکتے ہیں۔ وہ عادۃً لوازم سلوک سے ہیں اور سالک کو صاحب مقام ہو جانے کے بعد بھی گاہ گاہ پیش آتے رہتے ہیں جن میں سے اکثر تو عام طور پر ظاہر بھی نہیں ہونے پاتے لیکن بعض ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔

(ماخوذ از اشرف السوانح ج ۲)

◆

تصوّف و سُلوک

از: ماثر حکیم الامتؒ

وضاحت و تجدیدِ سلوک

”ایک طالب علم نے ایک بڑے طویل اور مفصّل خط میں اپنے تمام حالات باطنی اور شکوک و اوہام لکھے تھے۔ اس کا مفصّل جواب حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا جس میں تمام تصوّف و سلوک کی حقیقت، واضح فرما دی۔“

بعد حمد و صلوٰۃ جواباً عرض ہے کہ مقصود اصلی طریق ہے رضا اور قرب حق ہے اور جتنے امور کو ان میں دخل ہے وہ بقدر دخل کے مامور بہ ہیں اور درجہ دخل کا بتلانا صرف درجہ شارع کا ہے خواہ صراحتاً بتلائیں یا دلالۃً، جس کا ظہور قیاس صحیح سے ہوتا ہے اور اسی جگہ سے کہا گیا ہے ”القیاس مُظہر لا مُثبت“ اسی طرح مجتنب عنہ اور مذمومِ اصلی کا درجہ سخط و بعد عن الحق ہے اور جتنے امور کو اس میں دخل ہے وہ بقدر دخل کے منہی عنہ ہیں خواہ صراحۃً یا دلالۃً جیسا کہ اوپر مامور بہ میں مذکور ہوا۔ ایک مقدمہ تو قابلِ استحضار کے یہ ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جتنے امور کو قُرب یا بُعد میں دخل ہے وہ سب امور اختیاریہ ہیں ان میں کوئی امر غیر اختیاری نہیں اور یہی معنی ہیں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا کے اور تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ امورِ اختیاریہ عام ہیں امور ظاہرہ قالبیہ و باطنیہ قلبیہ کو اور تتبع نصوص و رجوع الی الوجدان سے یقیناً ثابت ہے کہ امور ظاہرہ اعمال جوارح ہیں، حسنہ یا قبیحہ اور امور باطنہ دو قسم کے ہیں عقائد صحیحہ یا باطلہ اور اخلاق محمودہ یا مذمومہ۔ پس جن امور کو قرب حق میں دخل ہوگا وہ یہ ہیں اعمال

حسنہ اور عقائدِ صحیحہ اور اخلاقِ محمودہ اور یہی مامور بہا بھی ہوں گے اور جن اُمور کو بُعد عن الحق میں دخل ہو گا وہ یہ ہیں۔ اعمالِ قبیحہ اور عقائدِ باطلہ اور اخلاقِ مذمومہ اور یہی منہی عنہا ہوں گے۔ چوتھا مقدمہ جو دوسرے مقدمہ سے لازم آیا اور بدلیل مستقل بھی ثابت ہے کہ جو امور اختیار سے خارج ہیں اُن کو نہ قرب میں دخل ہے نہ بُعد میں۔ اس لئے نہ وہ مامور بہ ہوں گے اور نہ منہی عنہ ہوں گے اور پانچواں مقدمہ یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ اقسامِ کثیرہ ہیں لیکن جن پر بعض کو اشتباہ موجب قرب و بعد ہو جانے کا ہو جاتا ہے وہ صرف چند قسم کے ہیں۔ ایک احوالِ محمودہ اور کمالات وہبیہ باب قُرب میں اسی طرح باب بُعد میں وساوس و خطرات یا اقسامِ قبض یا کسی معصیت کی طرف میلانِ ضعیف یا قوی درجہ کا تقاضا ہونا اور ان اقسام امورِ غیر اختیاریہ پر قرب و بُعد کے مرتب ہونے کی نفی کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ بھی قُرب و بُعد پر مرتب نہیں ہوتے یہ ممکن ہے کہ حق تعالےٰ نے کسی کو کسی عمل یا محض فضل سے مقرب بنایا ہو پھر اس کو بعض کمالاتِ وہبیہ کے ساتھ موصوف کر دیا ہو۔ اسی طرح ممکن ہے کہ حق تعالےٰ نے کسی کو عملِ مذموم سے (نہ کہ بلا عمل) مطرود بنایا ہو۔ پھر اس کو بعض بلیات غیر اختیاریہ میں مبتلا کر دیا ہو مگر یہ بلیات سبب بعد نہ ہوں گے گو مسبب عن البعد ہوں جن کا تدارک صرف اعمالِ مبعدہ کے تدارک سے ہو سکتا ہے۔

حضرتؒ کا مسلک

حق تعالےٰ ہمارے حضرتؒ کے مدارج بلند فرمائیں۔ حضرت مقصود طریق کو اچھی طرح سمجھا کر بڑا ہی احسان فرما گئے ہیں۔ طالبانِ راہِ حق کے لئے بڑی تسکین کا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس مجددِ وقت نے مسلمانوں میں صحابہ کرام کا سا مذاق پیدا کرنا چاہا اور کسی نہ کسی درجہ میں پیدا بھی کر دیا۔ حصولِ انسانیت و شرافت کے لئے روح کی پاکیزگی اور باطن کی ترقی اور دنیاوی زندگی کے لئے شریعت و سُنت کے معیارِ کامل کی طرف نشاندہی فرما گئے۔

حضرتؒ کی تربیت گاہِ باطن میں نہ کیفیات و ذوقیات تھیں نہ وجد و حال اور نہ رسمی مراقبے تھے نہ مجاہدے، بس اہتمام تھا تو شریعت کے احکامات کی بجا آوری کا تھا، دُھن

تھی تو اپنے ہر اندازِ زندگی میں اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اندازِ زندگی کی اتباع کی تھی۔ فکر تھی تو نفس و شیطان کے ہتھکنڈے سے بچنے کی تھی اور تاکید تھی تو صرف یہ تھی کہ اپنے ظاہر کو بھی پاک و صاف رکھو اور اپنے باطن کو بھی طاہر و طیب۔ اگر ان باتوں کی توفیق نصیب ہو جائے تو سمجھ لو کہ دونوں جہان کی دولت ہاتھ آگئی۔ تم سے لاکھ کوئی کہے کہ شریعت کے فضائل اور ہیں اور طریقت کے لذائذ اور، تم مت دھوکہ کھانا ؎

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است　　　ہش دار و گوش را بہ پیامِ سروش را

حضرت فرماتے تھے "ہم کو تو اللہ تعالیٰ نے اپنے تعلق اور اپنی بندگی کا یہ راز بتایا ہے کہ دیکھو اپنی زندگی میں یہ کرنا اور یہ نہ کرنا، یہ بات ہم کو پسند ہے اور یہ ناپسند، یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام، یہ چیز پاک ہے اور یہ ناپاک۔ دیکھو اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے صحیح تعلق پیدا کرو، ہماری معرفت حاصل کرو اور ہماری محبت سے سرشار رہو تو پھر ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کامل کرو۔ پھر تو ہم خود ہی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ بتاؤ اس سے زیادہ بڑی نعمت و دولت تم اور کیا چاہتے ہو؟"

یہ تھی ہمارے حضرتؒ کی تعلیم و تربیت۔ فرماتے تھے "دینِ متین ہی کے ظاہر و باطن کا نام شریعت و طریقت ہے۔ جس طرح ظاہری اعمال کے لئے احکاماتِ الٰہیہ، فرائض و واجبات ہیں اسی طرح باطنی اعمال کے لئے بھی ہیں اور ہم دونوں کے ادا کرنے کے مکلف ہیں۔"

فرماتے تھے کہ اسی کے ساتھ ساتھ اور اسی طرح ضروری و لازمی حقوق العباد ہیں۔ تم پر اپنے والدین کے، اپنے بیوی بچوں کے، اپنے عزیز و اقارب کے، اپنے احباب اور کاروباری تعلق رکھنے والوں کے حقوق بھی کما حقہٗ ادا کرنا فرض و واجب ہے۔ ان میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرو گے تو تعلق مع اللہ کی تم کو ہوا تک نہ لگے گی، چاہے عمر بھر ہی کیوں نہ مروجہ رسمی تصوف کے مجاہد بنو، نوافل اور وظائف میں سر مارو، خدا کی مخلوق کو ناراض کرتے ہوئے بھی خدا کو راضی کر لو گے؟ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

ایک مرتبہ حضرتؒ والا نے طریقِ باطن کے تمام مقامات کا تذکرہ فرمایا۔ تعلق مع اللہ اور درویشی کی راہ میں چلنے والوں کے حالات کا تذکرہ کیا اور پھر فرمایا "سب کا خلاصہ یہ

ہے کہ فرائض وواجبات ادا ہو جائیں۔ احکاماتِ الٰہیہ کی تعمیل ہو جائے۔ حقوق العباد کی اہمیت واضح ہو جائے بس۔ اگر درویشی کا حاصل یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں"۔ اور حضرت کا یہی مذاق تھا کہ تعمیلِ احکامات کے دوران اگر باطنی کیفیات پیدا ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نور۔ اور اگر نہ ہوں تو کچھ پرواہ نہیں اور آخرت کا کوئی نقصان نہیں ؎

ہے یہی کیا کم کہ ہوں میں بھی حریمِ ناز میں
التفاتِ حسن سے بے خود سہی، غافل سہی!

تم عجز و نیاز کا سلیقہ تو حاصل کرو۔ تم احکاماتِ الٰہیہ کی پابندی کر کے رضائے الٰہی حاصل کرنے کی حتی المقدور کوشش تو کر لو پھر سب کچھ ہی مل جائے گا ؎

شاید یہی تسلیمِ محبت کا صلہ ہے
ہر دولتِ حسن و جہاں میرے لئے ہے

مگر تم عبادات و طاعات میں نفس کے غلط راستے سے آتے ہو اور نفس مقصود تک نہیں پہنچنے دیتا طلب لذات میں اُلجھا دیتا ہے شیطان راہ مار دیتا ہے۔ سالک کو کیفیات باطنیہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ کیفیتوں اور لذتوں پر نظر جم گئی مقصود سے نظر ہٹ چکی بس مطمئن ہے کہ طبیعت میں یہ کیفیت راسخ ہو جائے پھر تو جب چاہوں گا مار لوں گا نہ دین کا چھوڑوں گا نہ دنیا کا ؎

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے چارے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

شیخ کا کام یہ ہے کہ شیطانی راہوں سے نکال کر دین کے سیدھے راستہ پر لگا دے اس طریق میں جہاں جہاں ابلیسی و نفسانی وساوس و خطرات کا شائبہ تھا ہمارے حضرتؒ نے سب صاف کر دیا۔ اب مخدوش راستہ مت اختیار کرو۔ سیدھے راستہ پر ہو لو، سمجھ لو ایک دفعہ، آستانِ یار یہی ہے بس سیدھی سادی عبادت کئے جاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوتی رہے۔ کیفیات و ذوقیات سب فانی چیزیں ہیں۔ ان کی عطا ہیں اگر مل جائیں ورنہ دنیا و آخرت کی فلاح ان پر منحصر نہیں ہے۔ نماز کا ایک بے کیف سجدہ بھی بڑی حقیقت رکھتا ہے۔ اللہ اللہ! نفس و شیطان نے مزاحمت کی، ماحول مزاحم ہوا۔ حالات نے مخالفت کی، مشاغل نے روکا

مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اُمتی نے آکر آستانِ یار پہ سر رکھ ہی دیا۔ نماز میں مشغول ہو گیا۔ دل حاضر نہیں سکون نہیں، ذہن منتشر ہے۔ طبیعت مکدر ہے مگر سر ہے کہ آستانِ یار پہ رکھا ہوا ہے۔ یہ شخص جو اس وقت سر بسجود ہے ایک دفعہ سمجھ چکا ہے کہ آستانِ یار یہی ہے پھر لاکھ موانعات سامنے آئیں مگر یہ ثابت قدم ہی رہتا ہے ؎

جبہ سائی سے اگر کچھ نہیں حاصل نہ سہی
کس طرح چھوڑ دے سنگِ درِ جاناں کوئی

یہ کچھ معمولی بات ہے یہ بندہ اس آستانہ پر سر بسجود ہے کہ اس عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی کے علاوہ کسی کی مجال نہیں کہ وہاں باریاب ہو جائے۔ نہ ساجد ایسا نہ مسجود۔ ساجد و مسجود کا رشتہ برقرار رہنا چاہیئے۔ نفس کے اور ماحول کے تقاضے کچھ بھی ہوں، حالات کچھ بھی گزر جائیں۔ واقعات کیسے بھی آن پڑیں مگر عبد کا معبود سے رشتہ نہ ٹوٹنے پائے۔ حالات سب منقلب ہونے والے ہیں۔ کیفیات سب فانی ہیں۔ باقی رہنے والی جو کچھ چیز ہے وہ یہ عمل صالح ہے۔ بس یہ دیکھے جاؤ کہ توفیق سجدہ ہے یا نہیں یہ مت دیکھو کہ کیف ہے یا نہیں۔

یہ مسلک بظاہر خشک سا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اسی اتباعِ احکامات ہی سے ملے گا جو کچھ ملے گا۔ صورت نماز کی بنا لو۔ کیف ہو کہ نہ ہو۔ ضابطہ کا کام کرتے رہو پھر رابطہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ یہ ضابطہ کا سجدہ رنگ لائے بغیر نہ رہے گا۔ طلب صادق ایک دن ذوقِ کامل پیدا کر دے گی۔ جب تم عبادتوں کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کر لو گے اور یقیناً جلد ہی کر لو گے کیونکہ لذت و کیف کے تم طالب ہو نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی برکت سے تمہارے لئے کائنات کی ایک ایک شے افزونیٔ ایمان کا سبب بن جائے گی۔

مسلک کی وضاحت

بعض خاص اہلِ امتیاز و وجاہت نے حضرتؒ والا سے بیعت کی درخواست کی تو حضرتؒ نے پیشتر ہی سب معاملات کو صاف صاف مگر نہایت لطافت و متانت اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ تحریر فرمایا:-

"آپ نے اپنی محبت سے جو خدمت مجھ سے لینا چاہی ہے اگرچہ میں اس کا اہل نہیں مگر احباب کی خدمت سے انکار بھی نہیں، لیکن چونکہ آپ کے دلی خلوص اور بے تکلفی ہے اس لئے خیر خواہی سے حسبِ ذیل امور کو آپ کی نظر میں لانا چاہتا ہوں تاکہ بصیرت سے رائے قائم فرماسکیں کسی مغالطہ کا احتمال نہ رہے۔ پھر جو رائے قائم فرمائی جائے گی میں اُس کا اتباع کرنے کو تیار ہوں۔

۱۔ میں ایک خشک طالبعلم ہوں اس زمانہ میں جن چیزوں کو درویشی کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے جیسے محفل میلاد شریف، عرس، گیارہویں، نیاز، فاتحہ، قوالی و مثل ذلک میں اُن سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اسی خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔

۲۔ میں نہ صاحبِ کشف ہوں نہ صاحبِ کرامت نہ صاحب تصرف نہ عامل، بس اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں۔

۳۔ اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا نہ اپنی حالت چھپاتا ہوں نہ اپنی کوئی تعلیم نہ کوئی مشورہ امورِ دنیہ کا، پھر عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دُور دیکھ کر رنجیدہ ہوتا ہوں۔

۴۔ میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں نہ کسی کی سفارش، اسی لئے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک مزاج کہتے ہیں۔ میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں خواہ لفظی ہی اذیت ہو۔

۵۔ سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ، خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے لینا، خواہ آبرو کے متعلق ہو جیسے کسی کی تحقیر، کسی کی غیبت خواہ اذیت نفسانی ہو جیسے کسی ———— کو کسی تشویش میں ڈال دینا یا کوئی ناگوار و رنج دہ معاملہ کرنا اور اگر غلطی سے کوئی بات ایسی ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

۶۔ نمبر ۵ کا مجھ کو اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع کو خلافِ شرع دیکھ کر صرف شکایت ہوتی

ہے مگر نمبر ۵ کی کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُس سے نجات دے۔ (اشرف السوانح ص ۱۶۹، ص ۱۷۸ حصہ دوم)

یہ تھا ہمارے حضرتؒ کا مسلک جس کو ہم نے اپنی استعداد کے مطابق کچھ اجمالاً بیان کر دیا۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ ط

حقیقت خانقاہی

ارشاد فرمایا کہ بڑے بڑے بزرگانِ طریقت جنھوں نے روحانی سلاسل کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کے مقصد اس کے سِوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کی مرضی کے مطابق نفس کی اصلاح ہو جائے اور صحیح معنوں میں انسان انسان بن جائے۔

طالبینِ سلوک، نفس و شیطان کے کید اپنے شیخ سے بیان کرتے ہیں اور وہ علاج تجویز کرتے ہیں اور اس کے استعمال کے لئے تدبیریں بتلاتے ہیں اختلاف استعداد و ہمت کی بناء پر مشائخ سالک کو رذائل سے اجتناب اور حسنات کے اکتساب کے لئے ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کرتے ہیں، کسی کے لئے مراقبے اور کسی کے لئے ذکر و اذکار کسی طالب پر خوف کو غالب کرتے کسی کو رحمتِ الٰہی کی طرف متوجہ کرتے۔ جیسی جس کے لئے ضرورت سمجھتے اس کو اس طریق پر لگا دیتے۔ مقصود سب کا تزکیۂ باطن اور حصول رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ یہی حقیقت تھی خانقاہی اعمال اور خانقاہی اسرار کی۔ رفتہ رفتہ نااہل لوگ خانقاہوں پر قابض ہو گئے اور خانقاہی جانشینوں میں وہ صلاحیت نہ رہی جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو۔ واجب اور غیر واجب ضروری اور غیر ضروری کو سمجھیں، سُنّت اور بدعت میں فرق جانیں۔ مختلف رسومات اختراع کر کے اہلِ خانقاہ خود فریبی، ریاکاری اور شخصیت پرستی میں مُبتلا ہو گئے اور خانقاہیں صحیح تعلیم سے بیگانہ ہو گئیں۔ اتباعِ شریعت و سنت کی اہمیت اور اس کا اہتمام نہ رہا۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قطب العالم شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ گو اصطلاحی عالم نہ تھے مگر حضرتؒ کی طرف زیادہ تر اہلِ علم ہی گرویدہ تھے۔ آخر کوئی چیز تو حضرت حاجی صاحبؒ میں ایسی تھی جس کو یہ حضرات ان سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ بات وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ حضرت حاجی صاحبؒ تصوف کے مجتہد و مجدد تھے امام

تھے۔ مدتوں سے طریق مُردہ پڑا تھا۔ حضرتؒ کی برکت سے اس کی تجدید ہوئی۔ فی زمانہ خانقاہوں میں ہر جگہ بیٹھ تو گئے ریاکار اور منافق طریق۔ اب یہ تدابیرِ اصلاح نفس کی کون بتائے اور کون اس کا طالب ہو۔ حضرت حاجی صاحبؒ کے ادراکِ روحانی نے یہ بات محسوس کی اور منجانب اللہ اُن کے قلب و وجدان پر یہ القا ہُوا کہ تمام سلاسل کی اصلاح کر کے ان کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا جائے۔ کیونکہ مقصود سب کا انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہی تھا جس کا دوسرا عنوان تحصیل رضائے الٰہی ہے اور جس کا طریق یہی اعمال مامور بہا ہیں۔ رہے مجاہدے اور ریاضتیں اذکار و اشغال وغیرہ۔ یہ نہ تو مقصود ہیں اور نہ بذاتِ خود طریق ہیں۔ ایک درجہ میں طریق پر آنے کی اور رسوخ حاصل کرنے کی تدبیریں ہیں اور حصولِ مقصود کے لئے معاون و معین ہیں۔

اعلانِ حق

ایک مرتبہ حضرتؒ نے فرمایا۔ اجی حضرت کس کا ادا نہ اور کس کا اخفاء۔ میں تو حق کو علی الاعلان پُکار پُکار کر بانگ دُہل ظاہر کرتا ہوں اور دینِ مبین و شرع متین کی صداقت کو واضح کرتا ہوں۔ میں تو دین کے اصول اور فروع سب کُھلم کُھلا ظاہر کر دیتا ہوں۔ اس زمانہ میں اس کی ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں قسم کی گمراہیوں اور تلبیسوں میں لوگ مبتلا ہو رہے ہیں اور لاکھوں راہزن اس راہ پر لگے ہوئے ہیں اس لئے اظہارِ حقیقت کر کے ان کے مصنوعی منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے گمراہ کیا ہے اللہ کی مخلوق کو۔ اللہ تعالےٰ ہدایت عطا فرمائیں۔ آمین !

اصلاحِ رسومِ خانقاہی

تربیتِ باطن کے جو طریقے بزرگوں نے تزکیۂ نفس کے لئے تدبیر کے درجہ میں اختیار کئے تھے اور علاج کے لئے تجویز کئے تھے اہلِ خانقاہ انہی کو مقصود سمجھ بیٹھے تھے۔ نفس کُشی کا سلسلہ توہم پرستی، شخصیت پرستی، قبر پرستی، چلّے کشی، مراقبات، ذوقیات، کیفیات، خواب، مبشرات اور مکاشفات و کرامات و تصرفات اور کچھ غیر مسنونہ اوراد و وظائف اور ذکر و اذکار یہی سب کچھ میراث تھی۔ خانقاہیت کی جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ حضرت والاؒ نے دین کے پردے میں مسلمانوں کی اس طرح صریح گمراہی کے انجام سے متاثر ہو کر سب خانقاہی رسم و

بقیہ صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیں

نزلہ، زکام کا حملہ کھانسی کا زور

سردیاں کیا آئیں مصیبت آگئی

موسم سرما صحت و تن درستی کو بہتر بنانے کا موسم ہے۔ اگر نزلہ زکام اور کھانسی ہو جائے تو اس کا الزام موسم کو نہ دیجیے، یہ محض ہماری غفلت سے شدت اختیار کر لیتے ہیں۔

گھر کا ہر فرد اگر سردیوں کے آغاز ہی سے مناسب احتیاط برتے اور شعالین کی ایک دو ٹکیاں روزانہ باقاعدگی کے ساتھ استعمال کرے تو نزلہ، زکام اور کھانسی سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

شعالین کے چار قرص تیز گرم پانی میں گھول لیجیے،
جوشاندہ تیار ہے جو نزلہ، زکام اور کھانسی کے لیے بدرجہا مفید ہے۔
ایسی ایک خوراک صبح و شب پیجیے۔

SUALIN
50 TABL
A HERBAL CU
COUGH CO
AND
BRONCHI
شعالین
۵۰ ٹکیاں
SUALIN
A HERBAL CURE FOR COUGH COLDS AND BRONCHITIS
شعالین
نزلہ، زکام اور کھانسی کی مفید دوا
ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں
نوزو

Adarts SUA-4.84

تصنیفات و خطبات حکیم الامت رحمہ اللہ

محترم منشی عبدالرحمٰن خان صاحب۔ ملتان

امداد الٰہی

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تصنیفی کام پر بخوبی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب ان کی تصنیفات و تالیفات اور خطبات و ملفوظات کی تفصیل پیش خدمت کی جاتی ہے جو بظاہر ایک انسان کا نہیں بلکہ ایک بہت بڑے ادارہ یا اکیڈمی کا کام نظر آتا ہے اور جس کی طویل فہرست آپ کے لئے موجب حیرت ہو گی، جیسا کہ خود صاحب سیرت کے لئے موجب حیرت ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ ایک خادم نے آپ سے عرض کیا کہ آپ کا اتنی عمر میں اتنی کتابیں تصنیف کرنا تعجب معلوم ہوتا ہے فرمایا۔

"تالیف و تصنیف کے بعد اب میں بھی تعجب کرتا ہوں کہ مجھ سے اتنا کام کیسے ہو گیا اور تعجب کی ایک بات اور ہے کہ بعض اوقات بعض مضامین میرے لکھے ہوئے میری ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک جنگ میں ایک کافر پہلوان نے آکر للکارا کہ کہاں ہیں ابو عبیدہ؟ میرے مقابلہ میں آئیں؟ آپ نے جانے کا قصد کیا تو لوگوں نے کہا ہم حاضر ہیں، آپ اس دیو کے مقابلہ کو کیوں جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے مجھ کو غیرت آتی ہے کیونکہ اس نے میرا ہی نام پکارا ہے۔ چنانچہ تشریف لے گئے مقابلہ ہوا دونوں جانب سے وار ہوئے۔ دفعتہً دیکھا کہ اس کا سر کٹا ہوا علیحدہ پڑا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ فرمانے لگے حیرت ہے کہ یہ کیسے ہوا، عقل

کام نہیں کرتی۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ کہ یہ سب تو اللہ تعالیٰ کی امداد ہے، بجز اس کی عنایت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ایک اور صاحب نے حضرت کی تالیفات کی کثرت پر مدح و تعریف کی تو فرمایا :-

"جو کچھ کام ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی امداد و توفیق سے ہوا ہے جس سے چاہا اپنا کام لے لیا اس میں بندے کی کیا تعریف ہے۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی منشی نے ایک بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر اور اپنے ہاتھ میں لے کر خوشخط لکھ دیا۔ اب بچہ خوش ہو رہا ہے کہ میں نے لکھا ہے حالانکہ وہ منشی جی نے لکھا ہے۔" (تالیفاتِ اشرفیہ ص ۶)

اسبابِ کثرتِ تالیفات

کثرتِ تالیفات کی دوسری وجہ آپ نے یہ بیان فرمائی :-

"میرے مزاج میں حرارت ہے اس حرارت ہی کی وجہ سے اتنی حدت بھی ہے اگر دوسرے کا مزاج اتنا گرم ہو تو وہ اتنا ضبط نہ کر سکے، میں بہت ضبط کرتا ہوں اور اسی حرارتِ مزاج کا یہ بھی اثر ہے کہ اتنے تھوڑے سے زمانہ میں بحمداللہ اتنی تصانیف ہو گئیں۔ ٹھنڈے مزاج والے سے اتنی تصانیف تھوڑا ہی ہو سکتی ہیں۔"

مزید فرمایا :-

"اس میں حضرت حاجی صاحبؒ کی دعا کا بھی اثر ہے۔ مکہ معظمہ میں حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کے حکم سے "تنویر" کا ترجمہ لکھا کرتا تھا اور حضرت کو سنا بھی دیتا تھا۔ ایک بار حسبِ معمول سنایا تو حضرتؒ نے دریافت فرمایا کہ کتنی دیر میں لکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اتنے وقت میں، فرمایا اتنے سے وقت میں تو کوئی بھی اتنا مضمون نہیں لکھ سکتا اور بہت دعائیں دیں۔ میں نے ابھی (۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء تک کی، اپنی تصانیف کا شمار کیا تو پانسو اُنتیس ہوئی ہیں۔ ان کو اس طرح شمار نہیں کیا کہ مثلاً تفسیر کی بارہ جلدیں ہیں تو بارہ ہی

شمار کرلی گئی ہوں بلکہ اس کو ایک ہی شمار کیا گیا ہے۔ ایک کتاب اور لکھ رہا ہوں، انشاء اللہ ۵۳۰ ہو جائیں گی۔“

جدولِ مضامین

۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کے بعد کی تصنیفات و تالیفات اور خطبات (القول الجلیل) ملفوظات اور کتب الغنا کل کی تعداد نو سو سے زائد ہو جاتی ہے۔ اتنی کتب کے مضامین کا یاد رکھنا کہ کون سا مضمون کس کتاب میں ہے بڑا مشکل تھا اور فوری حوالہ دینے کی جب ضرورت ہوتی تو تلاش میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس مشکل کے حل کی آپنے ایک عجیب ترکیب نکالی جس کی تفصیل آپ کے اس بیان میں ملتی ہے۔ فرمایا :-

”میرا حافظہ ضعیف ہے اپنا بعض ضروری مضمون تلاش کرتا ہوں کہ کس جگہ اور کس کتاب میں ہے تو نہیں ملتا اس لئے میں نے سب کتابوں کو دیکھ کر بطور یادداشت کے ایک جدول بنائی ہے تاکہ اس کو دیکھ کر کتاب میں نکال لوں۔ جو جدول جدید مضامین کی ہے اس کا نام ”غراب الرغائب“ ہے۔ یہ مطبوع بھی ہے اور دوسری جدول جو قدیم مضامین کی ہے اس کا نام ”الدالّۃ علی الحکم الفاذلۃ“ ہے۔ اگر انہی مضامین کو ایک جگہ جمع کرتا تو محنت ہوتی اور خرچ بھی پڑتا۔ اب کوڑیوں میں کام نکل گیا بلکہ کوڑی بھی صرف نہیں ہوئی۔“

اہمیت و افادیّت

تصنیف و تالیف کوئی آسان کام نہیں ہے اور امورِ دین و اسلام کے متعلق کتب لکھنا تو اور بھی مشکل کام ہے کیونکہ اس سلسلہ میں خفیف سی لغزش کوتاہی اور تسامح کے نتائج بہت ہی مضرت رساں نکلتے ہیں۔

کسی کتاب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں مصنف یا مؤلف کو جن جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کا قارئین کرام کو قطعاً اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اتنی کثیر کتب

کے مصنف کو کن حالات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا اس کا اندازہ صرف "حیات المسلمین" کی تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے :۔

> "یہ کتاب ان اعمال کی فہرست ہے کہ جن سے یقینی طور پر دنیا کی بھی فلاح حاصل ہو گی اور دین کی بھی میں نے اس کو بہت سوچ سوچ کر لکھا ہے۔ اس کے لکھنے میں مجھ کو تعب ہوا ہے میں اول اس کے مضامین لکھتا تھا پھر ان کو سہل کرتا تھا اس کے بعد دیکھتا تھا، اگر کم سہل ہوئے تو پھر دوبارہ سہل کرتا تھا اور ہر ماہ میں اس کے دو ورق لکھتا تھا اور وہ دو ورق بھی بعض مرتبہ کئی کئی بار کے مسودے میں لکھے جاتے تھے۔ لوگ اس کو اردو میں دیکھ کر بے وقعت سمجھتے ہیں۔ اس کی قدر ان علماء کو ہو سکتی ہے جو حدیث شریف پڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھیں گے کہ کون سا اشکال کہاں پر کس ذرا سے لفظ سے حل ہو گیا ہے۔

گو حضرت کی کتابیں بے شمار ہیں اور ہر موضوع پر ہیں، مگر انسان خلوص کے ساتھ کسی ایک کتاب پر بھی عمل کر لے تو دینی اور دنیوی صلاح و فلاح یقینی ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے تھے :۔

> "اگر مناسبت ہو جائے تو انہی کتابوں کو لے کر بیٹھ جائے عمر بھر کے لئے رہبری کے واسطے کافی ہیں مثلاً "قصد السبیل"، "تعلیم الدین"، "تربیت السالک" وغیرہ۔" (ملفوظ مورخہ ۲۸ شوال ۱۳۴۴ھ)

اسی طرح حیات المسلمین کے متعلق فرمایا :۔

> "مجھ کو اپنی کسی تصنیف کے متعلق یہ خیال نہیں ہے کہ یہ میرا سرمایۂ نجات ہے، البتہ "حیات المسلمین" کے متعلق میرا غالب خیال قلب پہ ہے کہ اس سے میری نجات ہو جائے گی۔ اس کو میں اپنی ساری عمر کی کمائی اور ساری عمر کا سرمایہ سمجھتا ہوں۔" (تالیفاتِ اشرفیہ ص ۴)

مواعظ کے متعلق فرمایا :۔

> "لوگ مواعظ نہیں دیکھتے حالانکہ ان میں سب کچھ ہے۔ گو وہ چھپے ہوئے

ہیں مگر چھپے ہوئے ہیں۔ ان میں وہی باتیں ہیں جو علماء و صلحاء کی کتابوں میں ہیں کوئی جدید بات نہیں ہے صرف زمانہ کا لحاظ ہے جو شیخ الرئیس کے نسخے ہیں وہ بعینہٖ حکیم محمود خاں صاحب کے زمانہ میں کام نہیں آتے وہاں قدح بھر دوائیں ہوتی تھیں یہاں مختصر سے کام لیا جانے لگا۔" (ملفوظ مورخہ ۶ ذیقعدہ ۱۳۵۰ھ)

تردید و تنقید

حضرتؒ کی تحریروں میں دوسرے فرقوں کا براہِ راست رد نہ ملے گا۔ جیسا آپ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے:-

"میں نے قصداً کسی کا رد نہیں لکھا نہ اہلِ تشیع، نہ قادیانی، نہ غیر مقلدین نہ اہلِ بدعت کا۔ البتہ جس کسی نے کسی کے متعلق سوال کیا اس کا جواب لکھ دیا اور مجھ کو یاد نہیں رہتا کہ کس کے متعلق کیا لکھا ہے۔" (ملفوظ ۲۲ صفر ۱۳۵۲ھ)

آپ نے اپنی کسی کتاب پر تقریظ نہیں لکھوائی کیونکہ آپ فرماتے تھے:-

"میں نے اپنی تالیف پر کسی سے تقریظ لکھوانے کی کوشش نہیں کی، تحریر موجود ہے دیکھ لو تقریظ کی کیا ضرورت ہے۔"

موضوعِ تصنیف

حضرت تھانویؒ نے مختلف موضوعات پر حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

۱۔ علم القرآن

(۱) ترجمہ قرآن (۲) تفسیر بیان القرآن در ۱۲ جلد (۳) جمال القرآن (۴) تجوید القرآن (۵) آداب القرآن (۶) یادگارِ حق القرآن (۷) متشابہات القرآن (۸) ظہور القرآن (۹) اصلاح ترجمہ دہلویہ (۱۰) اصلاح ترجمہ حیرت (۱۱) التواجہ بما یتعلق بالتشابہ (۱۲) سبق الغایات فی نسق الآیات (۱۳) رفع الخلاف فی حکم الاوقاف (۱۴) تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبادات (۱۵) وجوہ المثانی (عربی) (۱۶) زیادات علیٰ کتب الروایات (۱۷) زنابات لما فی الزیادات۔

(۱۸) تنشیط الطبع فی اجراء السبع (۱۹) تقریر بعض البنات (۲۰) دفع البناء فی نفع السماء۔ (۲۱) احسن الاثاث فی النظر الثانی (۲۲) التقصیر فی التفسیر (۲۳) الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان (۲۴) تمہید الفرش فی تحدید العرش (۲۵) تبصر الزجاج۔

۲۔ علم الحدیث

(۲۶) جامع الآثار (۲۷) تابع الآثار (۲۸) حفظ اربعین (۲۹) المسک الذکی۔ (۳۰) الثواب الجلی (۳۱) اطفاء الفتن (۳۲) موخرۃ الظنون (۳۳) الادراک والتوصل الی حقیقۃ الاشراک والتوسل۔

۳۔ عقائد

(۳۴) الکسیر فی اثبات التقدیر (۳۵) فروع الایمان (۳۶) حفظ الایمان (۳۷) بسط البنان (۳۸) تغیر العنوان فی بعض عبارات حفظ الایمان (۳۹) احکام التجلی (۴۰) ظہور العدم بنور القدم۔ (۴۱) طلوع البدر فی سطوح القدر (۴۲) شق الجیب عن حق الغیب (۴۳) نموذج بعض معتقدات ابن العوج (۴۴) نافع الاشارہ الی منافع الاستخارہ (۴۵) جزاء الاعمال۔ (۴۶) احکام الایقان۔

۴۔ عبادات

(۴۷) القول البدیع (۴۸) زکوٰۃ الغرض (۴۹) سراج الزیت (۵۰) الساعات للطاعات (۵۱) تعلیم الدین (۵۲) حیات المسلمین (۵۳) باب الریان (۵۴) بیت الریان (۵۵) عیش الحیان۔ (۵۶) الخطب الماثورہ (۵۷) خطبات الاحکام (۵۸) کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم۔

۵۔ تصوّف

(۵۹) دخول و خروج بر نزول و عروج (۶۰) قصد السبیل (۶۱) تعلیم المطالب (۶۲) رفع الشکوک (۶۳) مسائل السلوک (۶۴) التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف چہار حصے (۶۵) تکمیل

التصرف (۶۶) محقق الانوار والتجلی (۶۷) مسائل مثنوی (۶۸) حقیقت الطریقت (۶۹) النکت الدقیقہ (۷۰) التکشف عن مہمات التصوف (۷۱) تائید الحقیقۃ (۷۲) انوار الوجود فی اطوار الشہود (عربی) (۷۳) التجلی العظیم فی احسن التقویم (۷۴) حق سماع (۷۵) کلید مثنوی (۷۶) عرفان حافظ (۷۷) معارف العوارف دو حصے (۷۸) مغاریف المعارف (۷۹) الابتلاء لاہل الاصطفاء (۸۰) تربیت السالک (۸۱) الجلاء والشوف فی الرضا والخوف (۸۲) ارضی الاقوال (۸۳) انوار النظر فی آثار الظفر (۸۴) الیم فی الستم (۸۵) الظم فی السم (۸۶) رفع الضیق عن اہل الطریق (۸۷) البصائر فی الدوائر (۸۸) الرفیق فی سواء الطریق دو حصے (۸۹) شمس الفضائل لطمس الرذائل (۹۰) لامع علامات الاولیاء (۹۱) التحریض علی صالح التعریض (۹۲) الارشاد الی مسئلۃ الاستعداد (۹۳) شجرۃ المراد (۹۴) الجعجعہ فی حکم الوسوسہ (۹۵) الاعتدال فی متابعۃ الرجال۔ (۹۶) القول الفصل فی بعض آثار الوصل (۹۷) تمیز العشق من الفسق (۹۸) مثنوی زیر و بم (۹۹) دو نمائے مثنوی (۱۰۰) حسن العلاج لسوء المزاج (۱۰۱) اصلاح المزاج۔

۶۔ منطق

(۱۰۲) تلخیص المرقات (۱۰۳) تلخیص الشریفیہ (۱۰۴) تسہیل المعانی (۱۰۵) تلخیص المنار۔ (۱۰۶) المدار (۱۰۷) درایۃ العصمۃ (۱۰۸) تلخیص ہدایۃ الحکمۃ (۱۰۹) تلخیص البدایہ (۱۱۰) تذئیل شرح عقائد (۱۱۱) عشرہ طروس (یہ سب عربی میں ہیں) (۱۱۲) تیسیر المنطق۔

۷۔ علم الکلام

(۱۱۳) اقامۃ الطامہ علی زاعم (۱۱۴) الانتباہات المفیدہ (۱۱۵) تعلیم الدین مع تکمیل الیقین۔ (۱۱۶) المصالح العقلیہ ۳ جلد (۱۱۷) الخطاب الملیح فی تحقیق المہدی والمسیح (۱۱۸) قائد قادیان (۱۱۹) القول الفاصل (۱۲۰) التادیب لمن لیس لہ (۱۲۱) التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی۔ (۱۲۲) ارسال العبود الی ارسال الهنود (۱۲۳) تقطیعت الثمرات فی تخفیف السطرات۔ (۱۲۴) الفتوح فیما یتعلق الروح (۱۲۵) الحق (۱۲۶) تقدیس القدسی عن تدلیس اللمی (۱۲۷) نہایت الادراک فی اقسام اشراک (۱۲۸) عمارۃ العالم بلارۃ الآدم (۱۲۹) بلوغ الغایۃ فی تحقیق خاتم الولایۃ (۱۳۰) حفظ الحدود لحقوق الجدود (۱۳۱) النعیم فی الجحیم (۱۳۲) دفع الزحمۃ من وسع الرحمۃ (۱۳۳) الکلمۃ التامہ فی النبوۃ العامہ (۱۳۴) تدویر الفلک فی

تطہیر الملک (۱۳۵) القول الانفع فی تحقیق امکان الابدع (۱۳۶) نعم العون فی تحقیق توبۂ فرعون (۱۲۲، تا ۱۳۶ تک سب عربی ہیں) (۱۳۷) القطر الشدید المعصر الجدید ۔

۸۔ اصلاحیات

(۱۳۸) تصحیح العلم فی تقبیح الفلم (۱۳۹) تحقیق تعلیم انگریزی (۱۴۰) التحقیق الفرید فی حکم آلۃ التقریب الصوت البعید (لاؤڈ سپیکر) (۱۴۱) تفصیل الکلام فی حکم تقبیل الاقدام (۱۴۲) اصلاح المعتوہ فی تعریف الحرام والمکروہ (۱۴۳) اصلاح الرسوم (۱۴۴) اصلاح الخیال (۱۴۵) اصلاح انقلاب دو حصہ (۱۴۶) آداب المعاشرت (۱۴۷) آداب الاخبار (۱۴۸) اخبار بینی (۱۴۹) افکار دینی (۱۵۰) فیصلہ ہفت مسئلہ (۱۵۱) نصیحت نامہ بجواب وصیت نامہ (۱۵۲) علاج الخیال سجادہ نشینی (۱۵۳) شذرات الحکم (۱۵۴) المواہب (۱۵۵) اغلاط العوام (۱۵۶) تسہیل الطریق ۔

۹۔ سیاسیات

(۱۵۷) الروضۃ المناظرہ (۱۵۸) حکایات الشکایات (۱۵۹) الصحف المنشورہ فی فضائل المآثر الماثورہ (۱۶۰) معاملۃ المسلمین (۱۶۱) صیانۃ المسلمین (۱۶۲) ضم شارد الابل فی ذم شارد الابل (۱۶۳) المحفوظ الکبیر للحافظ الصغیر (۱۶۴) احقر کے مسلک کی شرح (۱۶۵) احکام اسلام (۱۶۶) تنقید دیوبند (۱۶۷) تلبیس العرائک فی تصحیح اسٹرائک (ہڑتال) (۱۶۸) الشکر والدعا للنصر وبالنصر یوم اللقاء ۔

۱۰۔ معاملات

(۱۶۹) صفائی معاملات (۱۷۰) احق الصراح فی تحقیق اجرت النکاح (۱۷۱) التوزیع عن فساد التوزیع (چندہ) (۱۷۲) دافع الفتک عن منافع البنک (سود بنک) (۱۷۳) کشف الغشو عن وجہ الرشوۃ (رشوت) (۱۷۴) تحذیر الاخوان عن الربوا (سود) (۱۷۵) جلائل الانباہ (۱۷۶) آداب المعاشرت (۱۷۷) رد التواحد فی طلاق ذات التعدد (۱۷۸) الخطوب المذہبہ للقلوب المنیبہ (۱۷۹) تحقیق التشبہ باہل السفاح لمن لا یرید اداء المہر فی النکاح (۱۸۰)،

تعدیل اہل الدہر فی درجۃ تعابل المہر (۱۸۱) الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد ۔

۱۱۔ تذکار

(۱۸۲) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب (یہ اب حبیبِ خدا کے نام سے شائع ہوئی ہے) (۱۸۳) شم الطیب (۱۸۴) یادِ یاراں در ذکرِ محمود (۱۸۵) خوانِ خلیل (۱۸۶) الترتیب اللطیف فی قصۃ الکلیم والحنیف (۱۸۷) سیدنا یوسفؑ (۱۸۸) تعلیم الطالب شجرہ طیبہ چشتیہ عالیہ ۔ (۱۸۹) السنۃ الجلیلۃ فی الچشتیۃ العلیہ (۱۹۰) یادگار دربار پر انوار حضرت خواجہ اجمیریؒ (۱۹۱) حکایات موعظت (۱۹۲) انوار المحسنین (۱۹۳) احسن التطہیم لمقولہ سیدنا ابراہیمؑ (۱۹۴) تحسین دار العلوم تزئین انوار النجوم (۱۹۵) شریف الدرایات ۔

۱۲۔ اذکار

(۱۹۶) خیر الدلالۃ (۱۹۷) القول الصحیح فی تحقیق دوازدہ تسبیح (۱۹۸) اوراد رحمانی (۱۹۹) الاستبصار فی فضل الاستغفار (۲۰۰) قربات عند اللہ وصلوٰۃ الرسول (۲۰۱) تتمہ قربات عند اللہ (۲۰۲) طریقہ مولد شریف (۲۰۳) زاد السعید فی صلوٰۃ علی النبی (۲۰۴) امواج طلب (۲۰۵) مناجات مقبول ترجمہ قربات

۱۳۔ فتاویٰ

(۲۰۶) امداد الفتاویٰ جلدین اولین (۲۰۷) امداد الفتاویٰ جلدین آخرین (۲۰۸) تتمہ اولیٰ وثانیہ امداد الفتاویٰ (۲۰۹) تتمہ ثالثہ امداد الفتاویٰ (۲۱۰) تتمہ اربعہ امداد الفتاویٰ (۲۱۱) امداد الفتاویٰ تتمہ (۲۱۲) حوادث الفتاویٰ تتمہ (۲۱۳) فتاویٰ اشرفیہ اول (۲۱۴) فتاویٰ اشرفیہ دوم (۲۱۵) فتاویٰ اشرفیہ سوم (۲۱۶) تتمہ خامسہ امداد الفتاویٰ (۲۱۷) اکمل الدیان فی اہل اللسان (۲۱۸) الفصل المحرم فی فصل المحرم (۲۱۹) مسائل اہل الخطر (۲۲۰) القول الدلہی (۲۲۱) اعداد الجنۃ ۔

۱۴۔ اسلامیات

(۲۲۲) درجۃ الحسام من اشاعت الاسلام (۲۲۳) حقوق الاسلام (۲۲۴) حقوق العلم

(۲۲۵) ارشاد الہائم فی حقوق البہائم (۲۲۶) شہادت الاقوام (۲۲۷) آداب المساجد (۲۲۸) تنویر السراج (۲۲۹) تعدیل حقوق الوالدین (۲۳۰) شوقِ وطن (۲۳۱) تنبیہات وصیت (۲۳۲) ظل صفد (۲۳۳) العذر والنذر (۲۳۴) الاستحضار للاحتضار (۲۳۵) وصل السبب فی فصل السبب (۲۳۶) بیان الوفود فی اعوان ابن مسعود (۲۳۷) اخبار اہل المجد عن آثار اہل النجد (۲۳۸) بہشتی گوہر (۲۳۹) بوادر النوادر (۲۴۰) الانسداد لفتنۃ الارتداد ۔

۱۵۔ نسائیات

(۲۴۱) بہشتی زیور دس حصے (۲۴۲) بہشتی جوہر (۲۴۳) اصلاح النساء (۲۴۴) رفع الارتیاب عن مسئلۃ ثبوت الانساب (۲۴۵) کسوۃ النسوۃ (۲۴۶) ثبات الستور (۲۴۷) القاء السکینۃ (۲۴۸) الحیلۃ الناجزۃ (۲۴۹) القول الصواب فی مسئلۃ الحجاب (۲۵۰) کثرت الازواج ۔

۱۶۔ عملیات

(۲۵۱) التقی فی احکام الرقی (۲۵۲) اعمالِ قرآنی (۲۵۳) خواص فرقانی (۲۵۴) آثار تبیانی ۔

۱۷۔ متفرقات

(۲۵۵) اسکات المنکر لآفات المسکر (۲۵۶) تعدیل التقویم (۲۵۷) ترجیح الراجح (۲۵۸) کرامات امدادیہ (۲۵۹) امداد المشتاق (۲۶۰) سوادِ خوبی (۲۶۱) الطرائف والظرائف (۲۶۲) زوال السنہ فی اعمال السنہ (۲۶۳) نیل الشفا بنعل المصطفیٰ (۲۶۴) نصح الاخوان فی حروف الزمان (۲۶۵) القول الاحکم (۲۶۶) الحکم الحقانی (۲۶۷) صدق الرویا (۲۶۸) الشراب السراب (۲۶۹) بناء القبہ ۔

(۲۷۰) خاتمہ بالخیر (۲۷۱) تشنیف الاسماع (۲۷۲) لوح الالواح (۲۷۳) عبور البراری (۲۷۴) النخب من الخطب (۲۷۵) الکلم الدالہ (۲۷۶) موائد العوائد (۲۷۷) غرائب الرغائب (۲۷۸) الرق المنشور (۲۷۹) جمع العکوک فی قمع الشکوک (۲۸۰) چار جوئے بہشت (۲۸۱) تحصین دار العلوم (۲۸۲) الکلم الطیب (۲۸۳) جزل الکلام فی عزل الامام (۲۸۴) سبعہ سیارہ (۲۸۵) نفیری بشرع کلام نظیری (۲۸۶) ثغایات الا ب (۲۸۷) مائۃ دروس (۲۸۸) الطائف للطائف ۔

(۲۸۹) اماثل الاقوال لافاضل الرجال (۲۹۰) رفع الاغلط (۲۹۱) تفصیل محمودیت (۲۹۲) الشوارق فی الخوارق ۔

مکتوبات

(۲۹۳) خطاب الندوه (۲۹۴) خطوط خوبی (۲۹۵) المعلومات الارشادیہ (۲۹۶) مکتوبات
امدادیہ (۲۹۷) ضیاء الافہام (۲۹۸) مکتوب محبوب القلوب (۲۹۹) مکتوبات خبرت۔

ملفوظات

(۳۰۰) کمالاتِ امدادیہ (۳۰۱) المتن الامدادی (۳۰۲) حسن العزیز چہار حصہ (۳۰۳) مقالات
حسنہ (۳۰۴) مقالات حکمت (۳۰۵) مجادلات معدلت (۳۰۶) مزید المجید (۳۰۷) مجالس الحکمت
(۳۰۸) مقالات حسنہ (۳۰۹) الطاعون (۳۱۰) القول الجلیل (۳۱۱) السلسبیل لعابری السبیل
(۳۱۲) القطائف من اللطائف (۳۱۳) ملفوظات خبرت (۳۱۴) محفوظات (۳۱۵) مخطوطات۔
(۳۱۶) جدید ملفوظات (۳۱۷) ریاض الفوائد (۳۱۸) حکم الحکیم (۳۱۹) ارشاد الرشید (۳۲۰) الافاضات
الیومیہ (۳۲۱) ادب الاعتدال (۳۲۲) ادب الطریق (۳۲۳) ادب الترک (۳۲۴) ادب العشیر
(۳۲۵) ادب الاسلام (۳۲۶) ادب الاعلام (۳۲۷) ملفوظات بقلم حافظ صغیر احمد (۳۲۸)
خیر المحضور فی الکانپور (۳۲۹) خیر العبور فی سفر گورکھپور (۳۳۰) خیر الحدود (۳۳۱) سفرنامہ
پانی پت (۳۳۲) ذم الخلائق (۳۳۳) الصناعات فی العبادات (۳۳۴) المفتاح المعنوی
(۳۳۵) فیوض الخالق (۳۳۶) نیل المراد (۳۳۷) سفرنامہ دیوبند (۳۳۸) سفرنامہ کوٹہ (۳۳۹)
فضل العزیز (۳۴۰) رحمۃ العزیز دو جلد (۳۴۱) بصر النظر (۳۴۲) ناظر الباطہ (۳۴۳) انوار
الحقائق (۳۴۴) وصیۃ الوصی (۳۴۵) حسنِ یوسف دو حصہ (۳۴۶) بزمِ جمشید (۳۴۷) فرائد
الفوائد (۳۴۸) علو النازل (۳۴۹) نظر عنایت (۳۵۰) جبر الکسیر (۳۵۱) رحمتِ اعظم (۳۵۲)
اسعاد الاسد (۳۵۳) خیر الاختبار فی خبر الاختیار (۳۵۴) سفرنامہ گنگوہ (۳۵۵) کلمۃ الحق ۲ جلد
(۳۵۶) سنۃ المعصوم (۳۵۷) اسعاد الطالبین (۳۵۸) تصحیح الخیال (۳۵۹) کلام الحسن۔
(۳۶۰) ارمغان عید (۳۶۱) دنیا کی پستی اور دین کی مستی (۳۶۲) سرمایہ ہستی۔

تفصیل المواعظ

حضرت تھانویؒ کے جو مواعظ ضبطِ تحریر میں لائے گئے ان کی موضوع وار تفصیل

درجِ ذیل ہے :-

۱- اتباع واتقاء

(۳۶۳) حیاتِ طیبہ (۳۶۴) طاعت الاحکام (۳۶۵) حق الاطاعۃ (۳۶۶) الغالب
للطالب (۳۶۷) سبیل السعید (۳۶۸) الرحیل الی الخلیل (۳۶۹) اتباع المنیب (۳۷۰) الشریعۃ
(۳۷۱) صلوٰۃ الحزین (۳۷۲) سنت ابراہیم (۳۷۳) الاتباع (۳۷۴) اعانۃ للتقویٰ (۳۷۵) التقویٰ
(۳۷۵) طریق القرب (۳۷۶) العزت (۳۷۷) شرائط الطاعت۔

۲- اخلاص وایمان

(۳۷۸) الاخلاص حصہ اول (۳۷۹) الاخلاص حصہ دوم (۳۸۰) شرط الایمان
(۳۸۱) شعب الایمان۔

۳- اتحاد واخوت

(۳۸۲) الاتفاق (۳۸۳) الاعتصام بحبل اللہ (۳۸۴) اصلاح ذات البین (۳۸۵) الاخوۃ

۴- استغفار

(۳۸۶) ضرورۃ التوبہ (۳۸۷) تفصیل التوبہ (۳۸۸) الاستغفار (۳۸۹) استمرار التوبہ۔
(۳۹۰) الہدیٰ والمغفرۃ (۳۹۱) آثار المحوبہ فی اسرار التوبہ

۵- اسلام

(۳۹۲) تکمیل الاسلام (۳۹۳) احسان الاسلام (۳۹۴) درجات الاسلام (۳۹۵) السلام
التحقیقی (۳۹۶) محاسن الاسلام (۳۹۷) الدوام علی الاسلام (۳۹۸) الاسلام الحقیقی (۳۹۹)
الاتمام نعمۃ الاسلام تین حصے (۴۰۰) ازالۃ الفتنۃ۔

۶- اخلاق وآداب

(۴۰۱) سیرت الصوفی (۴۰۲) آداب المساجد (۴۰۳) اشرف المکالمہ (۴۰۴) السوال
(۴۰۵) النور (۴۰۶) الدعوۃ الی اللہ (۴۰۷) الرفع والوضع (۴۰۸) آداب التبلیغ (۴۰۹) رجاء
الغیوب (۴۱۰) اعانت النافع (۴۱۱) ابقاء العبد (۴۱۲) المحسنات (۴۱۳) التفقہ (۴۱۴) الارادہ
(۴۱۵) التوکل (۴۱۶) احسان التدبیر (۴۱۷) دستور سہارنپور (۴۱۸) اجابت
الداعی (۴۱۹) الاستقامۃ

۷۔ اصلاح الاعمال

(۴۲۰) تسہیل الاصلاح (۴۲۱) تیسیر الاصلاح (۴۲۲) التصدی للغیر (۴۲۳) الظاہر (۴۲۴) الباطن (۴۲۵) المجاہدہ (۴۲۶) الارتیاب والاغتیاب (۴۲۷) قرب الحساب (۴۲۸) ذم المکروہات (۴۲۹) تغافل الاعمال (۴۳۰) طریق النجات (۴۳۱) الافنضاح (۴۳۲) اطباع۔

۸۔ اصلاح نفس

(۴۳۳) اصلاح النفس (۴۳۴) نسیان النفس (۴۳۵) مراقبة الارض (۴۳۶) ذم النسیان (۴۳۷) زکوٰة النفس (۴۳۸) اسباب الغفلت (۴۳۹) ازالة الغین عن آلة العین (۴۴۰) وعظ تیر تقاول (۴۴۱) ترک مالا یعنی (۴۴۲) مظاہر الاقوال (۴۴۳) غض البصر (۴۴۴) تطہیر الاعضاء (۴۴۵) حفظ اللسان (۴۴۶) الارتعاظ بالغیر۔

۹۔ ترغیب و ترہیب

(۴۴۷) جمال الجلیل (۴۴۸) التوجہ (۴۴۹) الوصل الفصل (۴۵۰) العزت (۴۵۱) رفع الموانع (۴۵۲) الوصل والفصل۔

۱۰۔ تسلیم و رضا

(۴۵۳) قطع التمنی (۴۵۴) الخلط (۴۵۵) المعرق والرحیق (۴۵۶) الرضاء الحق دو حصے۔ (۴۵۷) التعرف بالتصرف (۴۵۸) فناء النفوس (۴۵۹) افناء المحبوب۔

۱۱۔ ذکر و فکر

(۴۶۰) تفصیل الذکر (۴۶۱) ذکر الرسول (۴۶۲) دواء الضیق (۴۶۳) المراقبہ (۴۶۴) اکبر الاعمال (۴۶۵) الذکر (۴۶۶) راحت القلوب (۴۶۷) القاف (۴۶۸) الاسعاد و الایعاد (۴۶۹) رطوبت اللسان

۱۲۔ دین و دنیا

(۴۷۰) ضرورة الاعتنا بالدین (۴۷۱) ضرورت العلم بالدین (۴۷۲) ضرورت العمل بالدین۔ (۴۷۳) الدین الخالص (۴۷۴) نفی الحرج (۴۷۵) ملت ابراہیم (۴۷۶) تفصیل الدین (۴۷۷) الحیوٰة (۴۷۸) تاسیس البیان (۴۷۹) الرضا بالدنیا (۴۸۰) متاع الدنیا (۴۸۱) مظاہر المآل

(۴۸۲) الفانی (۴۸۳) غریب الدنیا (۴۸۴) الاطمینان بالدنیا (۴۸۵) الدنیا (۴۸۶) الکمال فی الدین الرجال ۔

۱۳۔ دار الآخرت

(۴۸۷) تذکیر الآخرت (۴۸۸) الدنیا والآخرت (۴۸۹) ہم الآخرت (۴۹۰) المراد (۴۹۱) ترجیح الآخرت (۴۹۲) سبیل النجاح (۴۹۳) دار المسعود (۴۹۴) تجارت آخرت (۴۹۵) رجاء اللقاء ۔

۱۴۔ دعا و دوا

(۴۹۶) مہمات الدعا و حصے (۴۹۷) الاصابۃ فی معنی الاجابۃ (۴۹۸) نشر الرحمۃ (۴۹۹) الدعا (۵۰۰) دواء العیوب (۵۰۱) علاج الحرص (۵۰۲) الافتضاح (۵۰۳) علاج الکبر (۵۰۴) حب العاجلہ (۵۰۵) الخضوع (۵۰۶) الغضب (۵۰۷) غوائل الغضب (۵۰۸) القرض (۵۰۹) اوج قنوج ۔

۱۵۔ رد بدعات

(۵۱۰) تقویم الزیغ (۵۱۱) عقل الجاہلیۃ (۵۱۲) نقد اللبیب فی عقد الحبیب (۵۱۳) الحضور الامور الصدور

۱۶۔ حدود و حقوق

(۵۱۴) خیر الارشاد فی حقوق العباد (۵۱۵) اصلاح الیتامیٰ (۵۱۶) رمضان فی رمضان (۵۱۷) حرمات الحدود (۵۱۸) الحدود والقیود (۵۱۹) العبد الربانی (۵۲۰) حقوق البیت ۔ (۵۲۱) التبشیر (۵۲۲) الاسراف (۵۲۳) کف الاذیٰ (۵۲۴) حقوق السراء والضراء (۵۲۵) حقوق المعاشرت (۵۲۶) حفظ الحدود (۵۲۷) حقوق القرآن (۵۲۸) الوقت (۵۲۹) الباب لاولی الالباب (۵۳۰) نفحات فی الاوقات (۵۳۱) النشرہ (۵۳۲) الرغبۃ المرغوبہ ۔

۱۷۔ خیر و شر

(۵۳۳) عمل الذرہ (۵۳۴) ایواء الیتامیٰ (۵۳۵) الانسداد للفساد (۵۳۶) الظلم (۵۳۷) مفتاح الخیر (۵۳۸) التعاون علی الخیر ۔

۱۸۔ خوف وخشیت

(۵۳۹) خواص الخشیت (۵۴۰) مواعظ اشرفیہ کانپور (۵۴۱) العلم والخشیۃ۔ (۵۴۲) مواعظ اشرف (میرٹھ) (۵۴۳) ثمرات الخوف۔

۱۹۔ حرص وہوس

(۵۴۴) ذم الہوٰی (۵۴۵) منازعۃ الہوٰی (۵۴۶) الہوٰی (۵۴۷) الہوٰی والہدٰی۔

۲۰۔ حج وقربانی

(۵۴۹) ترغیب الاضحیہ (۵۵۰) تعظیم الشعائر (۵۵۱) روح الحج والثج (۵۵۲) السوال فی شوال (۵۵۳) الاجرۃ بذبح البقرہ (۵۵۴) تکمیل الانعام فی صورۃ ذبح الانعام (۵۵۵) الحج المبرور (۵۵۶) الحج (۵۵۷) روح الارواح۔

۲۱۔ صبروشکر

(۵۵۸) الصبر (۵۵۹) حقیقۃ الصبر (۵۶۰) ماعلیہ الصبر (۵۶۱) الاجر النبیل فی صبر الجمیل (۵۶۲) الجبر بالصبر (۵۶۳) الصبر والصلوٰۃ (۵۶۴) السبر بالصبر (۵۶۵) الشکر (۵۶۶) تحقیق الشکر (۵۶۷) شکر المثنوی (۵۶۸) النعم المرغوبہ (۵۶۹) شکر النعمۃ (۵۷۰) عمل الشکر (۵۷۱) شکر العطاء۔

۲۲۔ صوم وصلوٰۃ

(۵۷۲) قطر رمضان (۵۷۳) اکمل الصوم والعید (۵۷۴) احکام العشر الاخیر (۵۷۵) نداء رمضان (۵۷۶) الصیام (۵۷۷) شعبان فی الشعبان (۵۷۸) روح الجوار (۵۷۹) روح الافطار (۵۸۰) عصم الصنوف عن رغم الانوف (۵۸۱) النسوان فی رمضان (۵۸۲) اجر الصیام (۵۸۳) اجر الصیام بلا انصرام (۵۸۴) اکمال العدہ (۵۸۵) اصلات فی الصلوٰت (۵۸۶) تحصیل المرام (۵۸۷) الیسر مع العسر (۵۸۸) الصلوٰۃ (۵۸۹) مثلث رمضان (۵۹۰) التہذیب چھ حصے۔ (۵۹۱) العتق من النیران فی رمضان۔

۲۳۔ صحبتِ بزرگاں

(۵۹۲) دعاۃ لاتہ ہالملا مع تمر الحکمۃ (۵۹۳) اختیار الخلیل (۵۹۴) فوائد الصحبت (۵۹۵) انوار السراج (۵۹۶) البصیر بالبشیر۔

۲۴۔ سلوک وتصوّف

(۵۹۷) تقلیل الطعام (۵۹۸) تقلیل المنام (۵۹۹) تقلیل الکلام
(۶۰۰) تقلیل الاختلاط (۶۰۱) التحصیل والتسہیل (۶۰۲) المرابط
(۶۰۳) طریق القلندر۔

۲۵۔ عبادت

(۶۰۴) العبادہ (۶۰۵) آثار العبادہ (۶۰۶) اسرار العبادہ (۶۰۷) اصل العبادۃ
(۶۰۸) اداء الفضلیۃ (۶۰۹) علو العبادہ۔

۲۶۔ علم وعمل

(۶۰۵) طلب العلم (۶۰۶) تعلیم البیان (۶۰۷) نور الصدور (۶۰۸) تعلیم العلم مع تقسیم العلم۔
(۶۰۹) تعمیم التعلیم (۶۱۰) کوثر العلوم (۶۱۱) الفاظ القرآن (۶۱۲) وعظ شفاء العی السوال۔
(۶۱۳) الفاء المجازفہ (۶۱۴) فطار الاحوال (۶۱۵) التواصی بالحق (۶۱۶) الفصل والانفصال
(۶۱۷) الاکرمیتیہ بالاعلمتیہ والاعمالیۃ (۶۱۸) الجناح (۶۱۹) شرط التذکیر (۶۲۰) تجدید الامثال
تبعد الاعمال (۶۲۱) تعدد الامثال (۶۲۲) تکمیل الاعمال (۶۲۳) اول الاعمال (۶۲۴)
آخر الاعمال (۶۲۵) ضرورۃ العلماء (۶۲۶) العمل للعلماء۔

۲۷۔ عیدین

(۶۲۷) روح الصیام (۶۲۸) الفطر (۶۲۹) نمود العید (۶۳۰) عود العید (۶۳۱) العید والوعید

۲۸۔ میلاد النبی

(۶۳۲) الظہور (۶۳۳) السرور (۶۳۴) الحبور النور الصدور (۶۳۵) الشذور فی حقوق البدور
(۶۳۶) نور النور (۶۳۷) المولد الفرخی فی المولد البرزخی (۶۳۸) الرحمۃ علی الامۃ

۲۹۔ مال وجاہ

(۶۳۹) احکام المال (۶۴۰) مظاہر الاموال (۶۴۱) انفاق المحبوب (۶۴۲) المال والجاہ
(۶۴۳) خیر المال للرجال (۶۴۴) خیر الاثاث للاناث (۶۴۵) احکام الجاہ

۳۰۔ مضار المعصیۃ

(۶۴۶) استخفاف المعاصی (۶۴۷) ترک المعاصی (۶۴۸) مضار المعصیت

(۶۴۹) ترجیح المفسد (۶۵۰) الکاف ۔

۳۱۔ مصیبت وراحت

(۶۵۱) تادیب المصیبۃ (۶۵۲) التنبیہ (۶۵۳) التیسیر المتیسیر (۶۵۴) التراجم فی التراحم
(۶۵۵) الامتحان (۶۵۶) الجلاء للابتلاء (۶۵۷) الجلاء عن البلاء ۔

۳۲۔ محبت ومودت

(۶۵۸) مواسات المصابین دو حصے (۶۵۹) آثار المحبت (۶۶۰) وحدت الحب
(۶۶۱) اسباب الفتنۃ (۶۶۲) المودۃ الرحمانیہ

۳۳۔ موت وحیات

(۶۶۳) ذکر الموت (۶۶۴) خیر الحیات والممات (۶۶۵) التثبیت بمراقبۃ المیت ۔
(۶۶۶) یقظۃ النائم ۔

۳۴۔ فضائل

(۶۶۷) فضائل العلم والخشیۃ (۶۶۸) فضل العلم والعمل (۶۶۹) شعبان (۶۷۰) راس
الربعین (۶۷۱) التعمیم التعلیم القرآن الکریم (۶۷۲) اسباب الفضائل (۶۷۳) الجمعین بین
النفعین (۶۷۴) العشر (۶۷۵) الفضل العظیم (۶۷۶) الضحایا (۶۷۷) اشرف العلوم (۶۷۸)
شب مبارک (۶۷۹) روز مبارک (۶۸۰) ماہ مبارک ۔

۳۵۔ نسوانیات

(۶۸۱) اصلاح النسوان (۶۸۲) الباقی (۶۸۳) الغفر (۶۸۴) الکمال فی الدین للنساء
(۶۸۵) الاستماع والاتباع (۶۸۶) غایۃ النجاح فی آیت النکاح (۶۸۷) رفع الالتباس
(۶۸۸) برکت النکاح (۶۸۹) کساء النساء ۔

۳۶۔ متفرقات

(۶۹۰) اصلاح ذات البین (۶۹۱) الخیانت (۶۹۲) شوق اللقاء (۶۹۳)
الصلاح والاصلاح (۶۹۴) تحریم المحرم (۶۹۵) نیل البر (۶۹۶) اقسام الریا (۶۹۷)
جمال یوسف (۶۹۸) الطاعون (۶۹۹) الاستعداد (۷۰۰) الولایت (۷۰۱) الاستعداد
(۷۰۲) العاقلات الغافلات (۷۰۳) الدعویٰ (۷۰۴) العود الی المقاصد (۷۰۵)
التمدن (۷۰۶) المنبوعان (۷۰۷) السکن (۷۰۸) آثار المزاج (۷۰۹) سنت ابراہیم

(۱۰) نظام الحدیث (۱۱) احدی الحسنیین ۔

تفصیل اعتناء

بعض اہلِ علم نے حضرت تھانویؒ کی تالیفات کے ساتھ مختلف طریق سے اعتناء فرمایا۔ کسی نے تسہیل عبارت سے، کسی نے تلخیص انتخاب سے اور کسی نے دوسری زبان میں ترجمے سے تاکہ حضرتؒ کے علوم و معارف سے امت محمدیہ میں سے کوئی اعلیٰ و ادنیٰ اور عام و خاص محروم نہ رہے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

کُتب معتنیٰ بہ

(۱) امثال عبرت (۲) علم غیر منقول (۳) تفسیر المواعظ (۴) علوم امدادیہ (۵) ابیات حکمت (۶) عروس المواعظ (۷) اصول الوصول (۸) رفع الضیق (۹) الشفاء (۱۰) ترجمہ اردو زیروبم (۱۱) حواشی رسالہ انتباہات (۱۲) ابانۃ البیان (۱۳) تسہیل قصد السبیل (۱۴) الشراب الطہور (۱۵) حل الانتباہات (۱۶) مناجات مقبول (۱۷) معمولات اشرفی (۱۸) فرائد الفوائد۔ (۱۹) معمولاتِ سفر (۲۰) ترجمہ مائۃ دروس (۲۱) تسہیل شوقِ وطن (۲۲) صلوٰۃ السفر (۲۳) معمولات خانقاہ (۲۴) اشرف السوانح (۲۵) انفاس عیسیٰ (۲۶) النعمت فی اشعار حکمت (۲۷) بہشتی ثمر (۲۸) الحصون الحصینہ (۲۹) الوالۃ الوسن (۳۰) خلاصہ بیان القرآن (۳۱) کمالاتِ اشرفیہ (۳۲) الحبیص بیان القرآن (۳۳) تصحیح الاغلاط (۳۴) اشرف المعمولات (۳۵) افادۃ العوام (۳۵) ترجمہ خطبات الاحکام (۳۶) تسہیل تمہید حیات المسلمین (۳۷) عنوان التصوف (۳۸) مرآۃ المواعظ (۳۹) تالیفات اشرفیہ (۴۰) اشرف الجواب (۴۱) افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (۴۲) شریعت و طریقت ۔ ان کے علاوہ تقریباً ساٹھ مواعظ کی بھی تسہیل وغیرہ کی گئی ہے ۔

تالیفات مترجمہ

ان کے علاوہ حضرتؒ کی تالیفات کے بکثرت دوسری زبانوں میں بعض ارباب علم نے ترجمے بھی کئے۔ ان کی تفصیل تالیفاتِ اشرفیہ میں دیکھی جاسکتی ہے ۔

ماہنامے

حضرت تھانویؒ کے فیوض و برکات ظاہری و باطنی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے حسب ذیل ماہنامے خانقاہ امدادیہ اشرفیہ سے جاری ہوتے رہے۔

۱۔ النور

یہ ماہوار رسالہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون سے زیر ادارت مولانا شبیر علی صاحب ہر قمری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے مع ٹائیٹل ۳۶ صفحے تھے جو ۱۳۳۵ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال ماہ جمادی الاولی سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرتؒ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

۲۔ المبلّغ

اسے بھی مولانا شبیر علی صاحب تھانہ بھون سے شائع کیا کرتے تھے۔ ۴۰ صفحات کا یہ رسالہ ہر قمری مہینہ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۳۴۹ھ سے جاری ہوا۔ اس کا سال شوال المکرم سے شروع ہوتا تھا اس میں حضرتؒ کے جدید مواعظ شائع ہوا کرتے تھے۔

۳۔ الابقاء

یہ رسالہ دریبہ کلاں دہلی سے جناب محمد عثمان خاں صاحب تاجر کتب نے ہر قمری مہینہ کی پندرہ تاریخ کو شائع کرنا شروع کیا۔ اس میں مع ٹائیٹل ۳۶ صفحے ہوتے تھے۔ یہ رسالہ ۱۳۴۰ھ میں شائع ہوا۔ اس کا سال ماہ رمضان سے شروع ہوتا تھا اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کم یاب مواعظ شائع ہوتے تھے۔ یہ اب تک کراچی سے شائع ہوتا ہے۔

۴۔ الہادی

یہ رسالہ بھی دریبہ کلاں دہلی سے زیر اہتمام خان صاحب موصوف ہر قمری مہینہ میں

شائع ہوتا تھا۔ ۸۴ صفحے کا یہ رسالہ ۱۳۴۳ھ میں جاری ہوا۔ اس کا سال جمادی الاولیٰ سے شروع ہوتا تھا۔ اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ہر قسم کے علوم عقلیہ و نقلیہ شائع کئے جاتے تھے ۔

۵۔ الامداد

یہ رسالہ امداد المطابع تھانہ بھون سے رجب ۱۳۴۴ھ سے جاری ہوا ضخامت ۔ ۴۰ صفحات کی تھی۔ حضرتؒ کے ہر قسم کے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے ۔

۶۔ اشرف العلوم

یہ رسالہ دفتر اشرف العلوم سہارنپور سے محرم الحرام ۱۳۵۴ھ سے جاری ہونا شروع ہوا۔ ہر قمری مہینہ میں شائع ہوتا تھا۔ شروع میں یہ ۲۳۵ صفحات پر چھپتا رہا بعد میں اس کی ضخامت صرف ۔ ۴۰ صفحات کی رہ گئی ۔

۷۔ الاشرف

یہ ماہوار رسالہ انوار بک ڈپو لکھنؤ سے زیرِ ادارت مولوی محمد حسن صاحب نکلا کرتا تھا۔ یہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ سے جاری ہوا۔ اس کے نصف میں جدید ملفوظات اور نصف میں کتاب "بوادر النوادر" شائع ہوتی تھی ۔

(ماخوذ از سیرت اشرف)

◆

ختم شد

بقیہ از صفحہ ۴۶۲

رواج کو ختم کیا اور فرمایا کہ تم نے غیر مقصود کو مقصود سمجھ لیا، جو چیز مرکب ہے مذہب اور غیر مذہب سے اس کو تم نے فرض و واجب کا درجہ دے دیا۔ ان رسومات ہی کو تم نے منتہائے کمال سمجھ لیا۔ کشفیات اور تصرفات کو تصوف کا اصل ثمرہ سمجھ بیٹھے۔ تم مراقبوں اور حلقوں ہی میں گم کر رہ گئے۔ نفسانی کیفیات کو روحانی لذت اور وجد و حال کو ارفع حالت سمجھنے لگے۔ مبشرات، فتوحات اور کرامتوں کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنا لیا تعطل کو تفویض سمجھ لیا۔ مقصود تمہارے ہاتھ سے نکل گیا اور تم جادۂ شریعت و حقیقت سے دور جا پڑے ؎

رہ گئی پھنس کر حدودِ شوق میں　　　کچھ نہ نکلی ہمتِ پروازِ دل

ہمارے حضرتؒ نے تمام خانقاہی رسومات کو حذف کر دیا اور چاروں سلسلوں کی تعلیمات کی تجدید کی اور فرمایا یہ نہ سمجھنا کہ کیفیاتِ باطنیہ اور مقاماتِ روحانیت ہمارے یہاں نہیں الحمدللہ سب کچھ ہے کشف و کرامات و تصرفات وغیرہ اپنے مقام پر سب برحق۔ لیکن پھر بھی ان میں مادیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ حق، اہل اللہ کو اس سے بہتر اور قوی چیز عطا فرمائی ہے وہ ہے روحانیت اور اس کے لطائف و مدارج ہیں مگر روحانیت کی ترقی منحصر ہے تعمیلِ احکامِ شرع پر کیفیات اور مکاشفات کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ ساری طریقت اور تمام سلوک کا راز اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے اندر مضمر ہے۔

وہ کون لوگ ہیں جن پر انعامات ہوئے؟ انبیاء۔ صدیقین، شہداء و صالحین ہیں انہی کا مسلک اختیار کرو۔ انہی کی تقلید کرنے سے سب کچھ ملے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلے ہیں تم بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لو۔ ان کے یہاں صرف وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا　　　تواں یافت جز در پئے مصطفےٰ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید　　　کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

شریعت و طریقت میں صدیوں کے جتنے نشیب و فراز تھے حضرتؒ نے سب ہموار کئے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوکھٹ پر طالبانِ حق و سالکینِ طریق کو لا کر کھڑا کر دیا۔ تربیتِ باطن دربارِ رسالتؐ سے زیادہ اور کہاں میسّر ہو گی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

تجدید سلاسل

ہمارے حضرت نے جس طرح شریعت کی بدعات کو مٹایا، اسی طرح طریقت کی بدعات کو بھی ختم کیا اور چاروں سلسلوں چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ کی تجدید فرمائی اور صاف صاف وضاحت فرمادی کہ طریقت عین شریعت وسُنّت ہے، اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ زندقہ ہے ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا　　تواں یافت جُز در پئے مصطفےٰ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید　　کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید

ہمارے حضرتؒ چاروں سلسلوں میں بیعت فرماتے تھے اور یہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ العزیز کا مسلک تھا، مگر نہ کسی سلسلے کی وہاں کوئی روایات تھیں، نہ رسوم، نہ تعلیم وتربیت کے وہ کورانہ تقلید کے انداز تھے۔ روایتی حلقے، توجہ، مراقبے کچھ نہ تھے۔ چاروں سلسلوں کی تعلیم کے مطابق سالک میں جس کی بھی صلاحیت اور استعداد فطری ہوتی تھی اس کو اسی راہ پر لگادیتے تھے۔ تمام سلسلوں کے بزرگوں کا یہی نصب العین تھا کہ سالکین اور طالبینِ حق کی اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے لئے حسبِ ضرورت مجاہدے کرائے جائیں تاکہ اُن کے قلوب کی صلاحیتیں درست ہو جائیں اور کیفیت تقویٰ پیدا ہو جو ذریعہ ہے حصول رضائے حق اور تعلق مع اللہ کا۔ اس کے لئے وہ جو تدابیر اختیار فرماتے تھے وہ حدودِ شرع وسنّت کے مطابق ہوتی تھیں کیونکہ تزکیۂ نفس وہی ہے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم منجانب اللہ مامور تھے وَیُزَکِّیْ نَفْسَہٗ اور تزکیۂ نفس کے بارے میں آپ کی شان میں آیاتِ قرآنی شاہد ہیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامات ومنشائے الٰہی کے مطابق اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیتِ باطن و تزکیۂ نفس کی تعلیم فرمائی۔ وہ تعلیم تمام تر احادیثِ نبویؐ میں مدون ومحفوظ ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بعید ہوتا گیا۔ مسلمانوں کے اخلاق باطنیہ ماحول اور معاشرہ سے متاثر ہوتے گئے اور ان میں بہت سی کوتاہیاں اور گمراہیاں پیدا ہوتی گئیں۔ پھر جو خانقاہیں مسلمانوں کی اصلاحِ اخلاق کے لئے قائم ہوتی تھیں وہی خود ضلالت وبدعات کا مرکز بن گئیں مگر ہر سلسلہ میں کچھ نہ کچھ اہلِ حق ضرور باقی رہے۔ البتہ ایک سلسلہ والے کو دوسرے سلسلہ والے سے کوئی ربط خاص نہ رہا۔ بلکہ ایک دوسرے کی تعلیم وتربیت سے بیگانہ ہی رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عوام میں طریقت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا ہوگئیں اور خانقاہی اسرار و رموز کی بدولت طریقت کو شریعت سے کچھ جداگانہ چیز سمجھنے لگے۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اس عہدِ حاضر کا مجددِ طریقت بنایا تھا اس لئے حضرت والا رحؒ نے اُس کی حقیقت کو سمجھا اور سارا خانقاہی طلسم توڑ دیا اور طریقت کے تمام اسرار کو علی الاعلان ظاہر فرما دیا اور ساری طریقت کا احکامِ شریعت ہی کی اتباع میں منحصر ہونا واضح فرما دیا اور چاروں سلسلوں میں جو مغایرت پیدا ہو گئی تھی اور آپس میں رقابت اور غلط احساسِ فضیلت پیدا ہو گیا تھا اس کو رفع فرما دیا اور سب کا منبع و مرجع شریعت غرا ہی کے واحد مرکز پر قائم فرما کر حقیقت طریق کو مستند و معتبر بنا دیا۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

اسی طرح دوسرے سلسلوں کا بھی معاملہ ہے مگر ان قیود ہی کو لوگ مقصود بالذات سمجھنے لگے۔ جو شیخ چشتی ہو اُسے سب مریدوں کو طریق چشت ہی سے تربیت نہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح جو شیخ نقشبندی ہو اُسے سب کو نقشبندیت کے ساتھ تربیت نہ کرنا چاہیئے بلکہ سب مشائخ کو لازم ہے کہ طالب کی استعداد دیکھ کر جو طریقہ اس کے لئے مفید ہو وہ تجویز کریں۔ بس چشتی بھی دونوں طریقوں سے کام لیں اور نقشبندی بھی۔ اس طرح ہر ایک کے مریدوں میں کوئی چشتی ہونا چاہیئے کوئی نقشبندی۔

اس سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ نقشبندی بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل ہو تو جب ہی نقشبندی ہو بلکہ چشتیت نام ہے تخلیہ کے زیادہ اہتمام کا اور نقشبندیت نام ہے تحلیہ کے زیادہ اہتمام کا۔ پس جو تخلیہ کا زیادہ اہتمام کرے وہ چشتی ہے گو کسی خاندان میں داخل ہو اور جو تحلیہ کا زیادہ اہتمام کرے وہ نقشبندی ہے گو سلسلۂ چشتی ہی میں داخل ہو۔ ایک سلسلہ میں داخل ہو کر دوسرے سلسلہ کے طریق پر چلنا کچھ ممنوع نہیں بلکہ اگر دوسرے سے مناسبت ہو تو شیخ کو ضروری ہے کہ اس طریق پر چلائے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت بہاؤ الدین نقشبندی دونوں ایک ہیں۔ مقصود دونوں کا ایک ہے صرف طریق تربیت میں فرق ہے جو شخص ان کو باہم جُدا سمجھے گا اور کسی ایک کی تنقیص کرے گا وہ دونوں دروازوں سے محروم رہے گا ان کو دو سمجھنا ایسا ہے جیسا بھینگا آدمی ایک چیز کو دو سمجھتا ہے۔" اسی طرح سہروردیہ اور قادریہ سلسلوں کے متعلق بھی یہی فیصلہ کن بات ہے۔

حضرت تھانویؒ اور اُن کے خلفائے کرام
کے بارے میں صدیوں پہلے پیشین گوئی

مولانا وکیل احمد شیروانی

* * *

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ۔ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، ڈھاکہ و سابقہ مشرقی پاکستان تشریف لے گئے ، وہاں اپنے میزبان سے معلوم ہوا کہ بنارس میں ایک کتاب سنسکرت زبان میں ہے جس کی بیشمار جلدیں ہیں، اس کتاب کی ایک جلد یہاں ڈھاکہ میں اس خاندان کے ایک فرد کے پاس موجود ہے، اس جلد میں ممتاز دینی شخصیتوں کے حالات اور واقعات درج ہیں ۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو چل کر دیکھ لیں، حضرت قاری صاحب نے احقر کے نام اپنے ایک گرامی نامہ کے اندر اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش خدمت ہے ۔

وکیل احمد شیروانی غفرلہٗ
خادم مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان

السلام علیکم ، تحریر فرمودہ واقعہ میں تحریف ہوگئی ہے ، شاید ناقل کی یادداشت کی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے ۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ۳۵ سال قبل میں ڈھاکہ گیا تھا ، قیام حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے یہاں ہوا جو اصل سے لکھنؤ کے باشندے تھے ، باپ کے زمانہ سے ڈھاکہ میں آباد ہو گئے تھے نہایت ذکی اور ذہین تھے انہوں نے اتفاقی طور پہ ذکر کیا کہ بنارس کے رہنے والے ایک صاحب یہاں ہیں ان کا بیان ہے کہ ـــــ ایک کتاب جو سنسکرت میں لکھی ہوئی ہے ، اس کی بارہ جلدیں تھیں بنارس

میں ہیں اور باقی جلدیں (شاید دس بیس یا کم و بیش ہوں صحیح یاد نہیں رہا) ہر دوار میں ہیں، صرف ایک جلد کی نقل ان صاحب کے پاس ہے جو ہندوستان سے متعلق ہے، ان جلدوں میں ممتاز شخصیتوں کے حالات اور واقعات درج ہیں۔ میں نے حکیم صاحب سے عرض کیا کہ اس شخص سے تو ہمیں بھی ملاؤ شاید کچھ واقعات کا علم ہو، اس سے ملاقات کا وقت لے لیجئے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر ان سے ملاقات ہوئی، وہ صاحب نوجوان اور خوش رو تھے بات چیت شروع ہوئی، ان صاحب نے حکیم صاحب کے بیان کی تصدیق کی اور کہا کہ وہ کتاب میرے پاس موجود ہے میں کہا کہ اگر ہندوستان کی شخصیتوں کے حالات دریافت کروں تو آپ بتلائیں گے؟ انہوں نے کہا ضرور، مگر شرط یہ ہے کہ جن صاحب کے بارے میں معلوم کرنا ہو تو ان کا سن ولادت آپ بتلائیں، میں نے کہا بہت اچھا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ذکر

اس کے بعد میں نے کہا کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے بارے میں تبلائیے، اور ان کا سن ولادت میں نے تبلادیا، اس نے فوراً کتاب کھولی، اور بیان کرنا شروع کیا، یعنی اس میں سے پڑھ پڑھ کر سنایا کہ۔

"ہندوستان کی ایک یگانہ روزگار شخصیت ہوگی، علم بہت وسیع ہوگا، شہرت کافی ہوگی۔ ایسا رشی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ہزاروں آدمی مستفید ہوں گے۔ وطن تھانہ بھون ہوگا، ان کے ایک بھائی ہوں گے جو ذہانت اور ذکاوت میں اُن سے کم نہیں ہوں گے، مگر علمی لائن کے آدمی نہیں ہونگے۔ نہ شہرت یافتہ ہوں گے، مولانا کے اولاد نہ ہوگی، مگر روحانی اولاد بہت کثیر ہوگی، اور سب دیندار لوگ ہوں گے، متقی ہوں گے۔"

غرض حضرت تھانویؒ کی بڑی عظمت بیان کی، میں نے دل میں خیال کیا کہ حضرت تھانویؒ کی شخصیت معروف و مشہور ہے ممکن ہے کہ اس شہرت پرستی سنا کر باتیں نقل کردی ہوں، تو میں نے حضرت کے کچھ خانگی حالات پوچھے تو اس نے وہ بھی من وعن بیان کیئے جو عام لوگوں کے علم میں نہیں آسکتے تھے، تو پھر میں نے پوچھا کہ ان کے خلفا میں سے کسی کا حال بیان کیجئے، اس نے کہا کہ ان کی ولادت کا سن بتایئے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادیؒ خلیفہ تھانویؒ کا ذکر

میں نے حضرت کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب الٰہ آبادی کے متعلق پوچھا اور ان کا سن ولادت بتایا، تو اس نے کہا کہ۔

" یہ حضرت کے خلفاء میں ممتاز شخصیت ہیں، ان کی عمر اتنی ہے، حال ایسا ہے۔ (اور وہ صحیح کہا حتیٰ کہ اس نے کہا کہ) وہ اپنی جائداد وقف علی الاولاد کریں گے۔"

حالانکہ یہ واقعہ ایسا تھا کہ صرف میرے ہی علم میں تھا، مولانا اللہ یاری دیوبند تشریف لائے تھے، اور وقف علی الاولاد کے بارے میں مسودات ساتھ لائے تھے اور مجھے فرمایا کہ میں نے اس کا ذکر کسی سے نہیں کیا صرف تجھ سے کیا ہے، اس کا افشا نہ کیا جائے، مگر اس شخص نے کتاب سے پورا پورا واقعہ جو مجھ پر پیش آیا تھا سب بیان کر دیا۔

حضرت تھانویؒ کے خلفاءِ کرام کا ذکر

پھر اس کے بعد میں نے پوچھا کہ ان کے خلفاء کتنے ہیں؟ تو اس نے پوری فہرست سنادی، حالانکہ اس وقت بعض خلفاء کو اجازت بیعت ہوئی تھی، ان کے بعد پھر دوسروں کو ہوئی۔ مگر اس نے ان کے نام بھی بتلائیے۔

حضرت قاری طیب صاحبؒ کا ذکر

اس فہرست میں میرا نام بھی آیا، اس نے کہا کہ،

" ان کے ایک خلیفہ طیوب ہیں جو یہاں (دیوبند) کے رہنے والے ہیں۔"

حالانکہ میں نے ابھی اس سے اپنا تعارف نہیں کرایا تھا، نہ میزبان نے کرایا، اور نہ وہ مجھ سے واقف تھا، میں نے اپنا سن ولادت تبلایا، اور پوچھا کہ ان کے حالات کیا ہیں؟ اس نے کہا،

" بڑے عالم ہیں ان کی شہرت بہت ہونے والی ہے؟ اور وہ سفر کثرت سے کریں گے، حتیٰ کہ بیرون ہند کے سفر بھی بہت کریں گے۔"

اس وقت تک میں نے صرف افغانستان کا سفر کیا تھا، دوسرے ممالک کا جن میں ایشیاء، یورپ، مڈل ایسٹ اور افریقہ وغیرہ شامل ہیں ابھی تک سفر نہیں ہوا تھا، مگر اس نے ساری تفصیل بتلادی، پھر کہا کہ

" وہ تین بھائی ہیں، ایک نو عمری میں انتقال کر جائے گا دو بھائی زندہ رہیں گے، ان کی دو بہنیں ہوں گی، ایک نو عمری میں گذر جائے گی، دوسری زندہ رہے گی، اور وہ صاحب اولاد ہوگی، ان کے والد کی دو شادیاں ہوں گی، پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوگی یہ سب اولاد دوسری بیوی سے ہوگی "

اب یہ سارے واقعات خانگی تھے، جن کا علم میرے سوا شاید آج تک بھی کسی کو نہیں معلوم، پھر

اس نے میری شادی کا ذکر کیا اور رامپور (سسرال) کا قصہ بیان کیا کہ بیوی دہلی کی رہنے والی ہوگی اور اپنے گھر کی رئیسہ ہوگی، پھر میں نے مزید احتیاط کے طور پر کہا کہ ایک شخص مولوی وصی الدین میاں (جو اس وقت سفر میں میرے ساتھ تھے اور دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے) میں نے ان کے بارے میں پوچھا، اور ان کا سن ولادت بتایا اس نے مولوی وصی الدین کے خانگی حالات سنائے جو صرف مولوی صاحب ہی کے علم میں تھے۔ وہ بھی حیران رہ گئے۔

حضرت حکیم الامتؒ سے اس واقعہ کا ذکر۔ اور حضرتؒ کا ارشاد

اس سفر سے واپسی کے بعد تھانہ بھون حاضر ہو کر سارا واقعہ حضرت تھانویؒ کو سنایا حضرت نے فرمایا کہ:

"اس واقعہ کی تغلیط کی کوئی وجہ نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ سارے واقعات کتاب میں درج ہوں اور ممکن ہے کہ انبیاء سابقین پر منکشف ہوئے ہوں اور وہ لکھ لئے گئے ہوں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھر سے باہر تشریف لائیے اور آپ

شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن گھر سے باہر تشریف لیے اور آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں اور فرمایا۔

هٰذا كتابٌ من ربّ العٰلمين وهٰـذا كتـابٌ مـن الرّب العـٰلمين دائیں ہاتھ کی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ اس میں تمام ان بنی آدم کے نام اور حالات لکھے ہوئے ہیں جو جنتی ہونے والے ہیں، اور بائیں ہاتھ کی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ اس میں تمام ان لوگوں کے اسماء و احوال لکھے ہوئے ہیں جو جہنمی ہونے والے ہیں، اور پھر دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر ارشاد فرمایا تو دونوں کتابیں غائب تھیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شام میں ایک کتاب برآمد ہوئی جس میں خاص قواعد کے ذریعہ دنیا کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں واقعات کا استخراج کیا جاسکتا تھا، لوگوں میں اس کتاب کا چرچا ہوا اور وہ فتنہ کی صورت اختیار کر گیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کا سفر کیا، اور اس کتاب پر قبضہ کیا اور گیارہ قبریں کھودنے کا حکم دیا، جب قبریں تیار ہوگئیں تو ایک دن شب میں کسی وقت پہنچ کر اس کتاب کو ایک قبر میں دفن کر کے گیارہ کی گیارہ قبروں کو اوپر سے برابر کرادیا، جس سے یہ فتنہ ختم ہوگیا یہ ہے وہ واقعہ جس کے بارے میں آپ نے تصحیح

چاہی۔ فقط

محمد طیب رئیس عمومی دار العلوم دیوبند وارد حال لاہور ۱۲ جمادی الاول ۶۶؁

نیز حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور نے بھی ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے بھی اس کتاب کو دیکھا تھا، اور فرمایا تھا کہ اس کتاب میں حضرت تھانویؒ کی وفات کی تاریخ اور دن بھی درج تھا۔

ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہٗ نے اپنی مجلس میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا اور فرمایا کہ "جب مولانا طیب صاحب اس واقعہ کو بیان کرتے کرتے اس جملہ پہ پہنچے کہ" ایسا شخص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے" تو اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ فوراً دیوار سے ہٹ کر فرمایا" کہ میری ہی کیا خصوصیت ہے جو بھی آتا ہے اس کی نظیر صدیوں میں آتی ہے۔" حضرتؒ کے اس ارشاد سے تواضع، انکساریت اور فنائیت اتم درجے میں ظاہر ہوتی ہے۔"

نوٹ: حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی اصل تحریر مجلس صیانۃ المسلمین کے دفتر میں محفوظ ہے۔

دل میں کس کی بزمِ عشرت کا سماں رکھتا ہوں مَیں
اپنی نظروں میں جمالِ دو جہاں رکھتا ہوں مَیں
کنجِ تنہائی کی مونس شامِ غربت کی رفیق
ایک تصویرِ خیالی حرزِ جاں رکھتا ہوں مَیں

(مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی)

مجدد تھانوی اور صنفِ نازک

حضرت مولانا حکیم محمود احمد ظفر صاحب ۔ سیالکوٹ

الافاضات الیومیہ میں مولانا تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ہے :۔

"آج ایک بی بی کا خط آیا ہے۔ عرصہ تقریباً چالیس سال کا ہوا یہ مجھ سے بیعت ہوئی تھیں۔ یہ بی بی نہایت دیندار ہیں۔ خاوند کے ستانے اور بے مروتی اور بے وفائی کی شکایتیں لکھی ہیں جس کو پڑھ کر بے حد دل کو قلق اور صدمہ ہوا۔ فرمایا کہ ان عورتوں کے بارہ میں عدم ادائے حقوق کے متعلق لوگوں نے بے حد ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اس غریب نے یہاں تک لکھا ہے کہ روتے روتے میری بینائی کمزور ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں یا کنوئیں میں ڈوب مروں، مگر دین کے خلاف ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتی۔ دل کو سمجھا کر رُک جاتی ہوں۔ شب و روز سوائے رونے کے کوئی کام نہیں۔ فرمایا کہ کتنے ظلم کی بات ہے آخر رونے کے سوا اور بیچاری کرے بھی کیا۔ ان بی بی کے عقد ثانی کو تقریباً عرصہ سترہ برس کا ہوا۔ ان صاحب نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں سے نکاح کیا تھا۔ اُس وقت رنگ و روغن اچھا ہوگا۔ اس وقت تو سفارشیں کراتے پھرتے تھے۔ لٹو ہو رہے تھے۔ اب ضعیفی کا وقت ہے۔ اب بیچاری کو منہ بھی نہیں لگاتے، حتیٰ کہ نان و نفقہ سے بھی محتاج ہے، میاں عمر میں چھوٹے ہیں اور بیوی بڑی ہیں۔ فرمایا اتنے زمانہ تک رفاقت رہی یعنی سترہ برس اس کا ہی حق ادا کیا ہوتا۔ کیا ٹھکانہ ہے اس سنگدلی اور بے رحمی کا۔ کسی بات کا بھی اثر نہیں۔ اگر وہ بیچاری کہتی ہے کہ میری دیرینہ خدمات کا کیا یہی ثمرہ ہے تو کہتے ہیں کہ تو نے خدمات ہی کون سی کی ہے۔ فرمایا نہ معلوم خدمات کی فہرست اُن کے ذہن میں کیا ہے جس کو یہ پورا نہ کر سکیں۔" (جلد ۲ صـ ۱۴۲-۱۴۳)

یہ اقتباس حکیم الامت تھانویؒ کے ایک ملفوظ کا کچھ حصہ ہے۔ اس میں اُس عورت پر ظلم وستم کی داستان اور حضرتؒ کے تاثرات دونوں عیاں ہیں۔ دین کامل کی اصلاح و تجدید کرنے والا ذہن و قلب ایک کمزور اور بے ضرر مخلوق کی داستانِ ظلم سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت والاؒ نے اُس مظلوم کی داستانِ ظلم سناتے ہوئے اپنے تاثرات بھی بیان فرمائے۔ اور بتایا کہ لوگ کس طرح بعض دفعہ عورتوں کو گلدستۂ طاقِ نسیان بنا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا نان و نفقہ بھی بند کر دیتے ہیں جو ایجاب و قبول کے بعد اُن پر فرض ہو گیا تھا۔

انسان مجموعہ اضداد ہے۔ خیر و شر، محبت و عداوت اور ملکیت و شیطنت دونوں پہلو اس کی گھٹی میں ہیں۔ اگر ان میں سے برگزیدہ ہستیاں (انبیاؑ و رسل) منصۂ شہود پر آئیں تو ہامان، شداد، قارون فرعون، نمرود اور ابوجہل و ابولہب بھی انہیں انسانوں میں سے تھے۔ حق تعالےٰ کی صفت رحمت ہمیشہ اس کائنات پر سایہ فگن رہی اور غیب سے کچھ ایسے سامان مہیا ہوتے رہے جن سے بگاڑ، سنوار اور فساد و صلاح کی شکل اختیار کرتا رہا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت اور ربوبیت کا تقاضا تھا کہ انسانی توالد و تناسل کے سلسلہ کو جاری اور باقی رکھنے کے لیے مرد اور عورت کے نام سے دو جنس پیدا کیں اور ہر صنف میں ایک دوسرے کی طلب کا تقاضا پیدا فرمایا۔ ان میں جذب و کشش کے فطری جذبات ودیعت فرمائے۔ یہاں تک کہ ہر صنف دوسری صنف کے بغیر اپنی زندگی کو نامکمل اور ادھوری تصور کرتی ہے۔

اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں فطرت کے حدود پر انسانیت کو کھینچ کھینچ کر پہنچایا وہاں جنسی میلان کی راہوں میں بھی اعتدال و توازن قائم رکھنے کی تلقین کی۔

زمانہ جاہلیت میں عورت کا مقام

بعثت نبوی سے قبل عورت کی صنف نازک دنیا میں ایک مظلوم ترین صنف تھی مرد مرد نہیں بلکہ یہ صنف نازک کے مقابلہ میں جنگل کا ایک درندہ بن گیا ہوا تھا۔ چوپاؤں اور گھر کے دوسرے مال و متاع کی طرح عورتوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ مرد عورت پر اپنی جنسی اور نفسانی خواہشات کے لیے جبر و تشدد پر اتر آیا۔ یہاں تک کہ اپنی ہوس رانیوں کا ذریعہ بنانے کے ساتھ زرکشی کا ذریعہ بھی مردوں نے ان غریب عورتوں کو بنا لیا تھا۔ اسی وجہ سے اُس زمانے کے لوگوں کے لیے لڑکیوں کی پیدائش باعث ننگ و عار سمجھی جانے لگی۔ پھر بات یہاں تک بڑی کہ لڑکی کو زندہ درگور کر دینا بعضوں نے اپنی عزت و

شرافت کا اقتضا قرار دے رکھا تھا۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے۔

اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجهُهٗ مُسوَدًّا وَّهُوَ كَظِيم

جب اُن میں سے کسی کو اُس چیز کی خبر دی جاتی ہے جس کو وہ رحمٰن (یعنی حق تعالیٰ) کے لیے مخصوص کرتا ہے تو اُس کا چہرہ بے رونق ہوجاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے۔ (زخرف ۲)

اسی چیز کو حق تعالےٰ نے ذرا تفصیل سے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُم بِالاُنثٰى ظَلَّ وَجهُهٗ مُسوَدًّا وَّهُوَ كَظِيم. يَتَوَارٰى مِنَ القَومِ مِن سُوٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمسِكُهٗ عَلٰى هُونٍ اَم يَدُسُّهٗ فِى التُّرَاب

ان میں سے جب کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی ہے تو اُس کا چہرہ بے رونق پژمردہ ہوجاتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے۔ اس خبر کی عار سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے۔ اور اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ ذلت برداشت کرکے اس کو (زندہ) رکھے یا ذلت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس کو زمین میں گاڑ دے۔ (النحل : ۷)

اسی ذلت سے بچنے کے لیے بہت سے لوگ بچی کے پیدا ہوتے ہی اُس کو زندہ درگور کر دیتے تھے جیسا کہ تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مرقوم ہے اور قرآن حکیم میں بھی اس بات کا ارشاد ملتا ہے:

وَاِذَا المَوءُدَةُ سُئِلَت بِاَىِّ ذَنبٍ قُتِلَت۔

اور جس وقت اُس لڑکی سے جو زندہ درگور کر دی تھی پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور کے بدلے مار ڈالی گئی۔ (التکویر :)

ایک طرف تو زمانۂ جاہلیت میں عورت کو اپنی ذلت کا باعث سمجھا جاتا تھا اور دوسری جانب عورتوں کو کسب دنیا کے لیے زنا پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ سورۃ نور میں حق تعالےٰ نے فرمایا ہے!

"اپنی لونڈیوں کو زنا کرانے پر مجبور نہ کرو بالخصوص اُس وقت جب کہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں۔ (سوچو تو یہ صرف اس لیے کہ) تم کو دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ حاصل ہوجاتے۔ (النور :)

زنا پر مجبور کرنے کا معاملہ صرف لونڈیوں ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ بخاری کی حدیث کے مطابق جاہلیت میں جو چار قسم کے نکاح تھے وہ بھی دراصل زنا ہی کی ایک دوسری صورت تھی۔

معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ عورتیں زمین اور جائداد کی طرح گروی اور رہن رکھی جاتی تھیں چنانچہ سیدنا محمد بن مسلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں جب کعب بن الاشرف یہودی کے ہاں غلہ قرض لینے کے لیے گیا تو اُس نے کہا:۔ ارھنونی نساءکم ۔

تم اپنی عورتوں کو میرے پاس گروی کر دو۔

"ان قرض طلب کرنے والوں نے کہا کہ" تمہارے ہاں ہم اپنی عورتیں کیسے گروی اور رہن رکھ سکتے ہیں جب کہ تم عرب میں سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔"

(بخاری باب قتل کعب بن الاشرف)

دوسرے مذاہب میں عورت کی حیثیت

یہ تو تھی جاہلیت میں عرب کی حالت۔ عرب سے باہر جہاں دوسرے مذاہب کا دور دورہ تھا وہاں بھی عورت نہایت کس مپرسی کی حالت میں تھی۔

۱۔ یونان میں ڈاکٹر گستاولی بان کی شہادت کے مطابق" اسپارٹا میں اس بدنصیب عورت کو جس سے کسی کو قومی سپاہی پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی، مار ڈالتے تھے۔ جس وقت کسی عورت کے بچہ پیدا ہو جاتا تو ملک کے مفاد میں اُس عورت کو دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتاً لے لیتے۔" (تمدن عرب ص۳۷۳)

۲۔ یہودی مذہب میں "عورت موت سے زیادہ تلخ ہے"۔ (تمدن عرب ص۳۷۳)

۳۔ عیسائی مذہب میں بھی عورت کا کوئی مقام نہیں، بلکہ بائبل کی رو سے عورت "شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ خدا کے قانون کو توڑنے والی اور مرد کو غارت کرنے والی ہے۔

۴۔ اسی طرح ہندومت میں تو عورت کا اور بھی بُرا حال ہے۔ برہمنوں کے ہاں نیوگ کا رواج ہے کہ اولاد نہ ہونے کی صورت میں خسر وغیرہ کے حکم کو پا کر عورت رشتہ دار سے، دیور سے حسبِ دل خواہ اولاد حاصل کرے۔

"بانجھ عورت ہو تو آٹھویں برس اور اگر ہو کر مر جائے تو دسویں برس اور جو بدکلام ہونے والی ہو تو جلدی ہی اُس عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کرے۔ (ستیارتھ پرکاش باب ۴ ص۱۵۲)

"ہندوؤں کا قانون ہے کہ تقدیر، طوفان، موت، جہنم، زہر، زہریلے سانپ ان میں سے کوئی اس قدر خراب نہیں جتنی عورت۔" (تمدن عرب ص ۳۴۳)

یہ تو ویسے عورت کی حیثیت تھی۔ قبل از اسلام عورت کو اسی وجہ سے اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے ایک بہت بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ موجودہ صدی کے بہت بڑے مؤرخ علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:۔

"اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی و مدارج کے لیے لائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اس نظریے کے پابند تھے۔ عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا۔" (سیرت النبیؐ جلد ۶ ص ۱۷۱)

اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا؟

ان گھنگھور گھٹاؤں اور ظلم و ستم کے دبیز بادلوں میں جب اسلام کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوا تو اس نے اپنی نورانی کرنوں اور فرحت آفریں شعاعوں سے اس ظلمت کدہ دنیا کو فرحت و آشتی کی صبح سعادت سے ہم آغوش کیا۔ پامال اور روندی ہوئی انسانیت کو قعر مذلت کی تنگنائیوں سے نکال کر سعادت و نیک بختی کے بام عروج تک پہنچا دیا۔ مہجور انسانوں کو سینہ سے لگایا، قطروں کو دریا، ذروں کو آفتاب اور یتیموں کو در یتیم بنا دیا۔

افراط و تفریط کے سارے سوتے بند کر کے مظلوم عورت کو وہ مقام دیا کہ عورت عورت ہونے پر ناز کرنے لگی۔ ازدواجی تعلقات کے آئین و قانون کو حدود میں لا کر جنسی میلانات اور شہوانی رجحانات کو اعتدال ضابطہ کا پابند بنایا۔ ترک نکاح کے راہبانہ نظریہ کی حوصلہ شکنی کی اور عائلی زندگی کو خوشگوار ماحول کے قالب میں ڈھالا گیا۔ بدکاری اور بے آبروئی کے سارے چشموں کو بند کیا۔ ناموس نسوانی کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جور و ستم کی چکیوں میں پسنے والی صنف نازک رحمت اور سکینت کا مظہر بن گئی۔

اسلام اور عورت:

قرآن حکیم اور احادیث نبوی نے یہ بتایا کہ کوئی مرد ایسا نہیں جس کی پیدائش میں عورت شریک نہ ہو۔ پھر مرد کو کیا حق ہے کہ وہ مردوں کو تو باعزت اور عورتوں کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ انسانی جسم کی بناوٹ کے ساتھ عورت کا حصہ بھی شریک ہے۔

بلکہ جدید طبی تحقیقات نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ زیادہ حصہ عورت ہی کا اس کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔ عورت جب ماں بن کر بچے کو پیٹ میں ۹ ماہ رکھتی ہے، پھر اُسے جنم دیتی ہے، پرورش کرتی ہے۔ دودھ پلاتی ہے، اس کے مقابلہ میں مرد بچے کے لیے کیا کرتا ہے؟ پھر بھلا اس عورت کا وجود مرد کے ننگ اور معاشرہ کیلئے ننگ وعار کا باعث کیسے بن سکتا ہے۔ عورت ہی نے ہماری تربیت و پرداخت کی، ہمیں چلنا سکھایا، ہمیں بولنے کی صلاحیت عطا کی۔ سن شعور تک ہماری خدمت کی۔ بایں ہمہ عورت ذلیل ہوگئی۔ کتنے تعجب کی بات ہے!

اس کائنات میں ایک عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔ ماں ہے یا بیٹی یا بہن ہے اور یا بیوی ہے کسی بھی حیثیت میں ہو اسلام نے عورت کو خاندانی اور ملکی اقتدار سے محروم نہیں کیا۔ جب وہ ماں بنی تو جنت کو اُس کے قدموں میں رکھا۔ جب وہ بیوی کے روپ میں آئی تو اُس سے حسنِ سلوک کو خیریت سے تعبیر کیا۔ جب وہ بیٹی بنی تو اس کو دوزخ کی آگ سے ڈھال کے الفاظ سے تعبیر کیا اور جب وہ بہن کی حیثیت میں نمودار ہوئی تو اُس سے حسن اخلاق کو جنت کے پروانے کی خوشخبری سنائی۔ غرض کسی لحاظ سے بھی عورت کو خسارہ میں نہیں رکھا گیا۔

اسلام نے جہاں عورت کے حقوق کا تحفظ کیا اور معاشرہ میں اس کو اتنا اونچا مقام عطا کیا جتنا اُس کے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ وہاں عورت کی سب سے قیمتی چیز عفت وعصمت کی بھی حفاظت فرمائی۔ عورت کی عصمت کو اتنا اہم بتایا کہ اُس کا بدل بڑی سے بڑی دولت بھی نہیں بن سکتی۔ دولت عصمت کی حفاظت کے لیے صرف ہو سکتی ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت کی عصمت وناموس کی فروخت کو مال و دولت کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے۔ اسی وجہ سے اسلام نے نہ صرف زنا کو حرام قرار دیا بلکہ اُن تمام ذرائع کو بھی بند کر دیا جو انسان کو زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ زنا کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا۔ (ابن کثیر جلد ۳ ص ۳۸)

عورت کی عصمت وناموس کی حفاظت کے لیے اور مرد اور عورت کی جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے نکاح کو اسلام میں ضروری قرار دیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں فرمایا:۔

وَانکِحُوا الایَامٰی مِنکُمۡ وَالصّٰلِحِینَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَائِکُمۡ

اور تم میں سے جو بے نکاح ہوں اُن کا نکاح کر دیا کرو۔ اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں

جو اس لائق ہوں ان کا بھی۔ (النور : ۳۲)

اس آیت کے تفسیری ترجمہ میں حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا۔

"یعنی احرار میں جو بے نکاح ہوں، خواہ مرد خواہ عورت اور خواہ ابھی نکاح ہی نہ ہوا ہو یا وفات و طلاق سے اب تجرد ہو گیا ہو، تم اُن کا نکاح کر دو، اور اسی طرح تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو اُس نکاح کے لائق ہو یعنی حقوق زوجیت کو ادا کر سکے اُس کا بھی نکاح کر دیا کرو۔ اور محض اپنی مصلحت کے خیال سے باوجود غلام، لونڈیوں کو ضرورت ہونے کے ان کی اس مصلحت کو فوت مت کیا کرو۔ (بیان القرآن جلد ۸ ص۱۴)

حکیم الامت تھانویؒ اور خواتین

اس ساری بحث کا مقصود یہ ہے کہ عورت جس طرح زمانۂ جاہلیت میں مظلوم و مقہور تھی موجودہ تمدن اور مہذب زمانہ میں اُسی طرح مجبور و مظلوم ہے۔ لیکن اس جدید جاہلی دور میں خواتین کی اکثریت فیشنی مجبوری میں مبتلا ہے۔ حقوق نسواں کے نام پر یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک میں خواتین نے مردوں سے جو حقوقِ آزادی حاصل کئے ہیں وہ آزادی کے نام پر پابندی کے سوا کچھ نہیں۔ یورپ ——— میں عورت تو ایک اشتہار بن کر رہ گئی ہے۔ عصمت و ناموس نام کی کوئی چیز یورپی عورت میں نہیں رہی ہے۔ یہی کچھ صورت ترقی پذیر ممالک کی جدید تعلیم یافتہ عورت کی ہو رہی ہے۔ لیکن خواتین کا ایک طبقہ ہند و پاکستان میں ایسا بھی ہے جن کو مردوں کے ظلم و ستم نے مجبور و مقہور بنا کر رکھا ہوا ہے، انہی عورتوں میں سے ایک عورت کے خط کا اقتباس ہم اس مقالہ کی ابتداً میں حکیم الامت تھانویؒ کے ملفوظات سے نقل کیا ہے۔

حضرت تھانویؒ ایسے مجدد و مصلح تھے جنہوں نے دین کامل کی تجدید و اصلاح کی۔ معاملات، معاشرت، سیاست، عقائد و عبادات، دیانات، عمرانیات غرضکہ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارہ حضرت تھانویؒ نے تجدید و اصلاح نہ کی ہو اور اپنی کتابوں میں ان کے بارہ میں اصلاحی ہدایات نہ لکھی ہوں۔

عورت تو اس انسانی معاشرہ کا ایک بہت بڑا جز و لاینفک ہے۔ پھر کتاب و سنت میں جہاں مردوں کا تذکرہ ہے وہاں حق تعالیٰ نے عورتوں کا بھی ذکر فرمایا اس لیے یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ

حکیم الامت تھانویؒ عورت کے بارہ میں اپنی اصلاحی اور تجدیدی مساعی کو کام میں نہ لاتے اور اُن کے لیے تحریری ہدایات نہ دیتے۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ نے خواتین کی اصلاح کے لیے بہت سی کتابیں اور رسائل لکھے۔ اپنے مواعظ اور ملفوظات میں اُن کے مسائل اور اُن کی مشکلات کا حل پیش کیا بلکہ جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے کسی مجدد و مصلح نے خواتین کی اصلاح کے لیے اتنا مواد اپنی تجدیدی کتابوں میں مہیا نہیں کیا ہے جتنا حضرت تھانوی نے مہیا کیا ہے اس بارہ میں بہشتی زیور آپ کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے جسمیں مولانا تھانوی صاحبؒ نے الف یا سے کر عورتوں کے بارہ میں بڑے سے بڑے مسائل کو بیان فرمایا ہے۔

عورت اور دل جوئی

عورت مال و دولت سے زیادہ خاوند کی محبت، حسن سلوک اور دلجوئی کی بھوکی ہوتی ہے شوہر کی جانب سے اگر اُس کو محبت کے پھول ملتے رہیں اور نرم و نازک باتوں سے اگر اُس کی دل جوئی ہوتی رہے تو وہ غربت و افلاس میں بھی اپنی زندگی کے دن ہنسی خوشی گذار دیتی ہے لیکن اگر شوہر کی جانب سے اُسے ترش روئی اور جھڑکیوں کے طمانچے ملیں تو مال و دولت کے ڈھیر بھی اُس کے لیے کانٹوں کا بستر بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں مجددِ تھانویؒ نے فرمایا۔

"صرف نان و نفقہ ہی عورت کا حق نہیں ہے بلکہ یہ بھی حق ہے کہ اس کی دل جوئی کی جائے۔ حدیث میں "استوصوا بالنساء خیراً فانما ھن عوان عندکم" یعنی عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس مثل قیدی کے ہیں اور جو شخص کسی کے ہاتھ میں قید ہو، ہر طرح اس کے بس میں ہو۔ اس پر سختی کرنا جوانمردی کے خلاف ہے۔ دل جوئی کے معنی یہ ہیں کہ کوئی بات ایسی نہ کرو جس سے اُس کا دل دُکھے۔ دل کو تکلیف ہو۔ بیبیو! اس سے زیادہ اور وسعت کیا چاہتی ہو۔ نان نفقہ وغیرہ ضابطہ کے حقوق کو تو سب جانتے ہیں اور وہ محدود حقوق ہیں۔ لیکن دل جوئی ایسا مفہوم ہے۔ جس کی تحدید نہیں ہو سکتی کہ جس بات سے عورتوں کو اذیت ہو وہ مت کرو۔ بھلا اس کی تحدید کیسے ہو سکتی ہے۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ عورت کے حقوق غیر محدود ہیں۔"

رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بیوی جب شوہر کے ہاں آئے گی تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی عادات کچھ ایسی ہوں جو شوہر یا اُس کے گھر والوں کو پسند نہ آئیں، کیونکہ اُس کی تربیت ایک دوسرے خاندان اور دوسرے ماحول میں ہوئی ہے، لہٰذا مرد کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ صبر و ضبط کے

ساتھ بیوی کی ناپسند عادتوں اور باتوں کو برداشت کرے۔ یہی تلقین بیوی کو بھی کی گئی۔ مجدد تھانویؒ نے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا۔

„یہ ایسا اصول ہے کہ اگر اس کو میاں بیوی دونوں یاد رکھیں تو کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہو اور کوئی بدمزگی پیش نہ آوے۔ بیوی یاد کرے کہ میاں نے ہزاروں طرح کے ناز میرے اُٹھائے ہیں۔ ایک دفعہ سختی کی تو کچھ بات نہیں، اور خاوند خیال کرے کہ بیوی ہزاروں قسم کی خدمتیں میری کرتی ہے، ایک بات خلافِ طبع بھی سہی۔ حق تعالیٰ نے بھی یہ مضمون قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے"

„مردوں کو غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے کس عمدہ پیرایہ میں عورتوں کی سفارش کی ہے۔ فرماتے ہیں وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّجَعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ یہ ہے کتاب اللہ کہ اس کی ایک اسی تعلیم کو دیکھ کر عقلِ سلیم والا کہہ اُٹھے گا کہ بے شک قرآن کتاب اللہ ہے۔ فرماتے ہیں عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اور اگر کسی وجہ سے تم کو وہ ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالےٰ اس میں بہت بھلائیاں رکھ دیں۔ ظاہر ہے کہ ناپسند ہونا کسی وجہ ہی سے ہوگا، اور زیادہ تر عورتوں کے ناپسند ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور یہ بات مرد کے لیے باعثِ اذیت ہے۔

بداخلاقی کو برداشت کرنا معمولی حوصلے کا کام نہیں بڑے دل گردے کا کام ہے جن عورتوں کے ساتھ پہلے مرد بداخلاقی سے پیش آیا کرتے تھے اب مردوں کو کہا جا رہا ہے کہ اُن کی بداخلاقی کو خوشی و مسرت سے برداشت کرو۔ اس میں بہتری کا امکان ہے حکیم الامت کے الفاظ میں ہی سنیئے کہ یہ بات کس طرح خیرِ کثیر کی موجب ہے۔ فرماتے ہیں:

„مگر اللہ تعالےٰ کا گویا وعدہ ہے کہ عورتوں کی بداخلاقی وغیرہ کو بھی خیرِ کثیر کا سبب بنا دیں گے۔ اللہ تعالےٰ حکیم ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس سے اولاد ہی ہو جائے گی جو قیامت میں اس شخص کی دستگیری کرے گی۔ نیز عورتوں کی زبان درازی کی صورت میں خیرِ کثیر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ مرد اس کی ایذا رسانی پر صبر کرے اور صبر کی جزا جنت ہے ہی اور جنت کا خیرِ کثیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ دنیا میں جو عورت سے تکلیف پہنچی وہ تھوڑی تھی۔ چند روزہ تھی اور اس کے عوض جو آخرت میں جزا حاصل ہوگی وہ یقیناً زیادہ ہوگی کیونکہ وہ باقی اور دائمی ہوگی۔ تو عورتوں کا سبب خیرِ کثیر ہونا صحیح ہو گیا۔

ان صورتوں میں مرد کو چاہیئے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدے پر نظر رکھے اور بیوی کی بداخلاقی پر نظر نہ کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی پر روک ٹوک بھی نہ کرے، اصلاح ضروری کی جاوے مگر نرمی کے ساتھ اور کبھی دھمکانا بھی برا نہیں مگر ستاوے نہیں اور زیادہ دھمکانا بھی اچھا نہیں۔ جناب رسول اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیبیوں کے ساتھ ایسے عجیب تھے کہ آجکل کے مدعیان تہذیب سنیں تو شاید حیرت کریں، مگر ہمیں ان کی حیرت و استعجاب کی پرواہ نہیں۔ ہم ان کی اس بے وقوفی پر ہنسیں گے اور حضورؐ کے حالات و واقعات کو کسی کی نکتہ چینی کے خوف سے مخفی نہ رکھیں گے۔ ہمارا مذہب ایسا نہیں جس کی باتوں کو چھپا چھپا کر رکھا جاوے۔ ہم علی رؤس الاشہاد ان کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ کیا تھے اور حضورؐ اُن کو کس طرح قلب کی اتھاہ گہرائیوں سے محبت فرماتے تھے اس کا تذکرہ امت کے حکیم مولانا تھانویؒ ہی کی زبانی سنیئے

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اخلاق تھے اپنی بیبیوں کے ساتھ۔ حضرت عائشہؓ چونکہ سب بیبیوں سے کم عمر تھیں تو آپ اُن کی عمر کے موافق ان کی دل جوئی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضورؐ ایک مرتبہ اُن کے ساتھ دوڑے بھی ہیں۔ چونکہ حضرت عائشہؓ بچی اور چھریرے بدن کی تھیں اور حضورؐ بڑی عمر کے تھے۔ آپ کا جسم مبارک بھاری ہو چکا تھا۔ دوڑ میں حضرت عائشہؓ حضورؐ سے آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد حضورؐ پھر ایک مرتبہ دوڑے۔ اس مرتبہ حضورؐ آگے نکل گئے، کیونکہ اب حضرت عائشہؓ کا بدن ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ عورتیں بہت جلد بھاری ہو جاتی ہیں۔ ان کا نشوونما جلدی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ حضورؐ سے آگے نہ نکل سکیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم پہلے آگے نکل گئی تھیں۔ سبحان اللہ کیا ٹھکانا ہے۔ آپ کے اخلاق کا۔"

اس دوڑنے میں دل جوئی بھی ہے اور بے تکلفی بھی جس کا نتیجہ ناز و ادا بھی ہے۔ اور جب بیوی ناز و ادا کرے تو پھر روٹھنا بھی ایک فطری امر ہے۔ جب کبھی حضورؐ کی بیبیاں روٹھ جاتیں، تو آپ کیا کرتے، اس کی تفصیل بھی حضرت والاؒ ہی کی زبان سے سنیئے۔ فرمایا۔

"بعض دفعہ بیبیاں روٹھ جاتی تھیں اور حضورؐ ٹال دیتے۔"

اس کی ایک مثال بیان فرماتے ہوئے حضرت والاؒ نے لکھا ہے

"قصۂ افک میں جب عائشہؓ کی برأت میں وحی نازل ہوئی تو ان کے والدین نے ان سے کہا

قومی الیہ یعنی حضورؐ کے پاس جاؤ اور آپ کا شکریہ ادا کرو۔ تو آپؓ فرماتی ہیں لا و اللہِ لا اقوام الیہ ولا احمد الا اللہ ھو الذی انزل برأتی او کما قال۔ یعنی نہیں واللہ میں تو نہیں اٹھتی نہ میں کسی کا شکریہ ادا کروں سوا اللہ کے اسی نے میری برأت نازل فرمائی۔ ظاہر ہے یہ کتنا سخت لفظ ہے کہ حضورؐ کے منہ ہی پر کہتی ہیں کہ میں تو نہیں اٹھتی نہ میں کسی کا شکریہ ادا کروں۔ مگر حضورؐ کو اصلاً ملال نہ ہوا کیونکہ ناز محبوبانہ تھا۔"

اسی سلسلہ میں سیدہ عائشہ سلام اللہ علیہا کا ایک اور واقعہ مجدد تھانویؒ نے فرمایا ہے جس سے بیوی کے ناز محبوبانہ کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی خاوند کے ناز اٹھانے کا۔ آپ بھی سنیئے۔ فرمایا۔

" ایک مرتبہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میں پہچان جاتا ہوں جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو۔ عرض کیا کہ حضورؐ کس طرح پہچان لیتے ہیں۔ فرمایا جب راضی ہوتی ہو تو اپنی بول چال میں یوں کہتی ہو لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ۔ اور جب ناراض ہوتی ہو تو یوں کہتی ہو لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِیْمَ (اُس وقت رب محمدؐ نہیں کہتی ہو) کہا حضورؐ واقعی آپ کا خیال ٹھیک ہے، مگر میں غصہ کی حالت میں بھی صرف آپؐ کا نام چھوڑ دیتی ہوں یعنی دل سے آپ کو نہیں بھولتی جیسا حضورؐ کو عائشہؓ کے ساتھ بہت تعلق تھا۔ حضرت عائشہؓ بھی سب سے زیادہ آپ کی عاشق تھیں۔ ان ہی کا یہ شعر ہے ؎

لواحی زلیخا لو رأین جبینہ   لآثرن بالقطع القلوب علی الید

(زلیخا کی سہیلیاں اگر حضورؐ کو دیکھ لیتیں تو بجائے اپنے ہاتھ کاٹنے کے اپنے دل کاٹ لیتیں)

حضرت عائشہؓ حضورؐ کی عاشق زار تھیں مگر پھر بھی کبھی اینٹھ جاتیں اور حضورؐ کچھ نہ کہتے، کیونکہ در حقیقت یہ ناراضی نہیں تھی بلکہ ناز تھا۔ یہ ایسا ہے جیسے کبھی رعایا بادشاہ سے خفا ہو جاتی ہے اور وہ اُن کو سزا نہیں دیتا بلکہ ـــــــ اُن کے کہنے کے مطابق کر دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ انتقام سے عاجز ہے بلکہ نہایت درجہ شفیق ہے اور رعایا کی نازبرداری کرتا ہے۔ یہ ہے طرز معاشرت سنّت کے موافق اب جو لوگ متانت و وقار کو لیے پھرتے ہیں وہ اسی میں رہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بیوی پر اپنا رعب اتنا نہ بڑھانا چاہیئے کہ میاں بالکل ہوّا ہی ہو جائے کہ ادھر میاں نے گھر میں قدم رکھا اور بی بی کا دم فنا ہوا۔ ہوش حواس بھی جاتے رہے۔ بیچاری کے منہ سے کوئی بات نکلی یا کوئی چیز مانگی اور ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو گئی کہ تم بہت فضول خرچ ہو۔ اس چیز کی کیا ضرورت تھی۔ اُس چیز کی کیا

ضرورت ہے۔"

حضرتؒ کا اپنی اہلیہ سے حسن سلوک

گھر والوں کے آرام اور دل جوئی حضرت والاؒ کے نزدیک مرد کے فرائض میں سے ہے، عائلی زندگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کبھی کبھی مرد خود بھی مشقت برداشت کرے۔ یہ نہیں کہ ایک ظالم و جابر حکمران کی طرح بیوی پر ہی ہر وقت حکمرانی کرتا پھرے۔ اس سلسلہ میں حضرت والاؒ نے اپنی اہلی زندگی کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ فرمایا:۔

"حکومت کرنے کو تو سب کا جی چاہتا ہے محکوم پر اس کا مضائقہ نہیں مگر محکوم کے کچھ حقوق بھی تو ہیں۔ ان کی بھی تو رعایت کی ضرورت ہے۔" اس سلسلہ میں فرمایا:۔

"ذکر کرنے کی تو بات نہ تھی مگر چونکہ ضرورت ہے اس لیے کہتا ہوں کہ میرے گھر والوں سے معلوم کیا جائے کہ میں اپنے گھر والوں پر کس قدر حکومت کرتا ہوں اور اُن سے کیا کیا خدمتیں لیتا ہوں الحمدللہ! میں نہ تو خود مقید ہوتا ہوں نہ دوسروں کو مقید کرتا ہوں۔ بادشاہوں کی سی زندگی بسر ہوتی ہے میرا معمول ہے کہ گھر جا کر دیکھا کہ تازی روٹی نہیں پکی تو باسی کھالی۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیکھا کہ وہ کسی کام میں مصروف ہیں خود اپنے ہاتھ سے روٹی لے لی۔ پانی بھر کر پاس رکھ لیا۔ برتن لے کر اپنے ہاتھ سے سالن لے لیا اور بیٹھ کر کھا لیا۔ بلکہ یہاں تک کرتا ہوں کہ دیکھتا ہوں کہ وہ روٹی وغیرہ پکانے میں مشغول ہیں اور اُن کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ اکثر گھروں میں ایسا ہوتا ہے مثلاً پانی کی ضرورت ہے اپنے ہاتھ سے نل سے یا گھڑے سے لوٹا بھر کر دے دیتا ہوں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جا کر جب دیکھا کہ فارغ ہیں تو کہہ دیا کہ کھانا لاؤ۔ وہ بیچاری دے دیتی ہیں۔ ان باتوں کی رعایت رکھنا ضروری ہے۔ اور مشغولی عدم مشغولی ہی پر کیا موقوف ہے۔ انسان ہی تو ہے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت خادم کی طبیعت پر کسل ہوتا ہے، اور اپنی طبیعت بشاش دیکھی اپنے سب کام اپنے ہاتھ سے کر لیے۔ غرضیکہ اس کا کوئی معمول یا التزام نہیں کہ وہی کریں۔ سو اگر حد میں رہتے ہوئے اور اُن کے راحت و آرام کا خیال کرتے ہوئے اُن سے خدمت بھی لی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں آخر ہیں کس مرض کی دوا، لیکن بے مروتی اور بے رحمی اور ظلم کا درجہ تو نہ ہونا چاہیئے۔ یہ عورتوں کا طبقہ تو مردوں کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ کا مصداق ہوتا ہے۔ اُن کو ستانے سے کتنے رکعت کا ثواب

ملتا ہے؛ اگر ایسی ہی بہادری اور حکومت کا جوش ہے تو کسی قدرت والے پر آدمی حکومت کرے ہم تو جب جانیں۔ مثلاً کوئی ملازم ہو اور ٹرّا۔ اس کو ذرا کچھ کہیں۔ میاں کو حکومت کی حقیقت معلوم ہو جائے بعض بے رحم تو حدود سے گذر کر عورتوں کو زد و کوب کرتے ہیں جس کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ عورتوں پر اس قسم کے تشدد کرنا نہایت کم حوصلگی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ جو مرد کی شان کے خلاف ہے۔“

”یہ عرض کر رہا تھا کہ میں بہت سے کام اپنے ہاتھ سے کر لیتا ہوں تو مجھ کو کون سی تکلیف ہوتی ہے اور میرا کون سا کام ہونے سے رہ جاتا ہے۔ بلکہ جیسی مجھے اس سے راحت ہوتی ہے کہ وہ میری خدمت کرتیں اس سے بھی راحت ہوتی ہے کہ اُن کو راحت مل گئی۔ رات کو مجھ کو نیند کم آتی ہے تو گھر والوں کو سوتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُن کو تو نیند آ رہی ہے، ورنہ دو قلق جمع ہو جاتے۔ ایک اپنے نہ سونے کا اور نیند نہ آنے کا اور ایک اُن کا۔ پھر گھر سے چلنے کے وقت پوچھتا ہوں کہ کوئی ضروری کام میرے متعلق تو نہیں میں جا رہا ہوں۔ اگر کہا کوئی کام نہیں چلا آیا۔ اگر کہا کہ ہے بیٹھ گیا۔ مثلاً کوئی خط ہی لکھوانا ہے، سو اس کام کو پورا کر کے چلا آیا۔ کھانا کھا کے فارغ ہوا اور پان کو جی چاہا۔ پوچھ لیا کہ پاندان کہاں ہے؛ اُنہوں نے بتلا دیا اس میں سے پان نکال کر کھا لیا۔

(الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص ۱۴۳-۱۴۴)

جھگڑوں کو ختم کرنے والی چیز — محبت

جس گھر میں ایسا ماحول ہو اُس میں زوجین کے مابین کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہو سکتا ہے؟

حضرتؒ والا جیسا آدمی بڑھاپے میں بھی جب کہ خدمت کی اشد ضرورت ہوتی ہے اپنی اہلیہ کے ساتھ کس حُسنِ سلوک سے پیش آتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نکاح کا اصل مقصد ہی میاں بیوی کے مابین محبت و مودّت کا سلسلہ قائم کرنا ہے۔ محبت کے اسی چشمۂ صافی سے پھر خدمت، شفقت، حیا اور احسان کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ اس بارہ میں حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا۔

”نکاح جن مصالح کے لیے موضوع اور مشروع ہے وہ زیادہ تر سب موقوف ہیں توافق (باہمی موافقت) و دوستی اور توادد (آپس میں محبت) پر۔ والیہ الاشارۃ فی قولہ علیہ السلام

تزوجوا الولود والودود فانی اُباھی بکم الاُمم

(یعنی ایسی عورت سے نکاح کرو جو زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی ہو کیونکہ میں قیامت

کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا) حتی کہ توالد جو کہ غرض اعظم ہے نکاح سے جہاں اُس کے لیے صحت بدن و سلامت مزاج وغیرہ احوال طبعیہ شرط ہیں، وہاں بھی یہی توادُد (باہمی محبت) ہے کہ بمنزلہ جزو اخیر علت تامہ کے ہے توالد کے لیے (کیونکہ وہ موقوف ہے احبال (حمل ہونے) پر اور احبال طبا (طب کی رو سے) موقوف ہے توافق انزالین (دونوں کے ایک ساتھ انزال ہونے) پر اور ظاہر ہے کہ وہ محبت و مودت پر موقوف ہے۔ غرض بڑا امداد مصالح کا نکاح میں توادد ٹھہرا۔

(اصلاح انقلاب امت جلد ۲ ص ۳۷)

اصل شئ دین ہے

معلوم ہوا کہ زوجین کی خوشحالی اور خوشگوار زندگی کی ضمانت محبت و مودت ہے اور محبت و مودت کا انحصار کسی مادی شئی پر نہیں کیونکہ مادی تمام اشیاء ناپائیدار اور غیر مستقل ہیں۔ ان پر منحصر محبت بھی ناپائیدار ہوگی۔ مثال کے طور پر کوئی بیوی اگر مال کی وجہ سے اپنے میاں سے محبت کرتی ہے تو میاں کے پاس جب مال نہیں رہے گا محبت ختم ہو جائے گی۔ لہذا صحیح محبت و مودت کا انحصار پائیدار اور مستقل چیز پر ہونا چاہیے تاکہ محبت پائیدار اور اٹوٹ رہے۔ وہ پائیدار شئی کیا ہے؟ اس کو حکیم الامت تھانویؒ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔

"اور یہ یقینی بات ہے کہ توادُد (باہمی محبت) میں جس قدر دخل دین کو ہے اتنا کسی چیز کو نہیں۔ سب علائق (تعلقات) قطع ہو جاتے ہیں بجز دین کے۔" (اصلاح انقلاب امت جلد ۲ ص ۳۷)

دین کو چھوڑ کر دوسری ناپائیدار مادی اشیاء سے جن لوگوں نے محبت کا رشتہ استوار کیا ہے اُن کی ازدواجی زندگی اکثر و بیشتر تنازعات کا شکار رہتی ہے۔ اسی لیے شریعت اسلامیہ نے زوجین میں نکاح کے وقت سب سے زیادہ توجہ دین پر دی اور سب سے کم مال و جمال پر۔ اس بارہ میں حضرت والاؒ نے فرمایا:۔

"اس زمانہ میں منکوحہ میں زیادہ تر جمال کو، ناکح (نکاح کرنے والے) میں زیادہ تر مال کو دیکھتے ہیں، اور سب سے کم دین کو دیکھتے ہیں اور باقی اوصاف میں آرا مختلف ہیں۔ حالانکہ قابل التفات یہی مال و جمال ہے اور سب سے زیادہ قابل التفات دین ہی ہے۔ اسی واسطے حدیث میں عورت کے باب میں تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِاَرْبَعٍ لِحَسَبِهَا وَّلِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ لِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔ یعنی عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے۔ لے

تجھ کو دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہیئے - اور مرد کے باب میں۔

إِذَا جَآءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ خُلُقَهُ وَدِيْنَهُ فَزَوِّجُوْهُ إِنْ لَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ

(یعنی اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی (لڑکی) کا نکاح اُس سے کر دو - ورنہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا) وارد ہے - جس میں مال و جمال پر نظر نہ کرنے کا اور دین پر نظر کرنے کا امر فرمایا ہے۔" فتنہ اور بڑا فساد پھیلنے کی جو حدیث میں پیشن گوئی فرمائی گئی ہے - وہ اس لیے کہ ؎

عشق با مردہ نہ باشد پائدار　　عشق را باحی و باقیوم دار

یعنی مال و جمال ناپائیدار اور فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں - لہٰذا ان پر منحصر محبت و مودّت بھی ناپائیدار اور فانی ہوگی - اسی کو مولانا تھانویؒ نے یوں فرمایا :-

" خصوص مال و جمال کہ ان کی عمر تو بہت ہی کم ہے - مال تو ایک شب میں بے وفائی کر جاتا ہے اور جمال ایک بیماری میں ختم ہو جاتا ہے - اور بعض امراض میں پھر عود ہی نہیں کرتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے یا چیچک نکل آئے اور داغ نہ جائیں - یا سر کے بال گر جائیں و نحو ذالک"

" پھر جب مقصود مال و جمال تھا اور وہ رخصت بلا عوض ہو گیا تو تمام تر محبت و الفت بھی جو اس پر مبنی تھی وہ بھی ختم ہوئی - اور پھر زوجین میں ایک دوسرے کی نظر میں مبغوض ہو گیا اور نباہ ہمیشہ کے لیے مشکل ہو گیا - اور چندے (بعض اوقات) اس کو بقا ہی رہا - تب بھی جہاں دین نہیں وہاں دیکھا ہے کہ مال و جمال بقائے محبت کے لیے کافی نہیں - کیونکہ جہاں دین نہیں اور ظاہر ہے کہ بددین آدمی کے نہ اخلاق درست ہوتے ہیں نہ اعمال و معاملات - اور بداخلاقی و بدمعاملگی و بداعمالی کی جس میں مضاعت حقوق (حقوق ضائع کرنا) و خود پرستی و خود غرضی بھی آگئی، جو خاصہ ہے مبغوضیت پورا کر دینے کا، پس جب شب و روز ایسے اسباب برابر واقع ہوتے رہیں گے تو کہاں تک اُن میں محبت رہ سکتی ہے - پس باہم کدورت و نااتفاقی و غیظ و طیش پیدا ہونا شروع ہوگا - حتیٰ کہ تمام مصالح زوجیت ضائع ہو جائیں گے - ہم نے خود دیکھا ہے - بی بی حسن و جمال میں حور کا بچہ اور شوہر مال و منال میں قارون کے فرزند - مگر میاں کی بد دینی سے تو اکثر اور کہیں بی بی کی بدخلقی و بدمزاجی یا بدچلنی کے

سبب میاں بیوی میں بول چال تک نہیں ۔ وہ اس کو دیکھ کر منہ پھیر لے یہ اُس کو دیکھ کر ناک بھویں چڑھالے ۔ یہ دوسری جگہ روٹی پکواتے پھریں ۔ وہ باوجود مال ہونے کے الگ ایک ایک پیسہ کو ترسے بعض جگہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ بی بی غایت نفرت کے سبب میاں سے پردہ کرتی ہے ۔ یہ ثمرات ہیں بد دینی کے باوجود مال و جمال ہونے کے ۔ پس اس کا مقصود سمجھنا ہی حماقت ہے ۔ (صـ ۳۸)

شبہ ہو سکتا ہے کہ کیا صرف دینداری ہی تلاش کی جائے یا یہ بھی دیکھا جائے کہ میاں کچھ کماتا بھی ہے یا نہیں ۔ نکھٹو ہونا بھی بعض دفعہ نہیں بلکہ اکثر دفعہ نفرت کا سبب بن جاتا ہے ۔ اس کا جواب بھی حکیم الامت نے دفع دخل مقدر کے طور پر بیان فرما دیا کہ میاں میں تین باتیں دیکھ لو ۔

" ایک قوت لاکتساب (کمانے کی قوت) دوسرے کفاءت (برابری) ہیں زیادہ تفاوت نہیں تیسرے دینداری ہاں ان دونوں صورتوں میں زیادہ کاوش چھوڑ دے ورنہ وہی بات پیش آوے گی جس کا ذکر حدیث میں ہے کہ جب خلق و دین میں کفاءت ہو تو نکاح کر دیا کرو ورنہ زمین میں فساد کبیر ہوگا ۔ (صـ ۳۰-۳۱)

امت کے اس حکیم نے خدا گواہ ہے ایسی پتے کی باتیں ارشاد فرمائیں کہ ان کو پڑھ کر اور اُن کی معقولیت کو دیکھ کر اُن باتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ حضرتؒ نے اپنی کتابوں میں الزامی جوابات بہت کم دیے ہیں ۔ حضرتؒ نے زیادہ جوابات تحقیقی دیے ہیں ۔ لیکن آپ نے مسئلہ ذہن میں بٹھانے کے لیے یہاں تین الزامی جوابات بھی دیے ہیں، جن سے یہ بات صحیح طریقہ سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے ۔ فرمایا :

" اور تین جواب الزامی بھی اُن کے جواب میں قابل احتجاج ہیں : ایک یہ کہ جن صفات کو جس درجہ میں تم دوسروں میں ڈھونڈتے ہو، تم کو جس شخص نے لڑکی دی تھی جس کی بدولت آج اپنی لڑکی کے باپ بنکر یہ جولانیاں دکھا رہے ہیں کیا اُس شخص نے بھی تمہارے لیے ایسی ہی تفتیش و کاوش کی تھی ۔ اگر وہ ایسا کرتا تو تم کو عورت ہی میسر نہ ہوتی اور ان باتوں کے بنانے کا موقع ہی نہ ملتا ۔ غرض اُس نے ایسا نہیں کیا ۔ تو اس نے جب ایسا نہیں کیا تو تم نے یا تمہارے باپ نے دوسرے بھائی مسلمانوں کی بدخواہی کیوں کی ؟ کہ باوجود تمہارے اندر ان اوصاف کے علی سبیل الکمال مجتمع نہ ہونے کے اس کی لڑکی پر نکاحی قبضہ کر لیا ۔

دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ جب تم اپنی دختر کے لیے ان صفات کا شوہر تلاش کرتے ہو ۔ انصاف کرو تم جب اپنے فرزند کے لیے کسی کی لڑکی کی درخواست کی تھی، یا کرنے کا خیال ہی کیا، اپنے صاحبزادے میں بھی یہ صفات اسی درجہ کی دیکھ لی ہیں یا دیکھنے کا ارادہ ہے !

تیسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح لڑکوں میں بے شمار خوبیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں اگر دوسرا شخص تمہاری لڑکیوں میں اس سے عشر (دسواں حصہ) خوبیاں اور ہنر بھی دیکھنے لگے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام عمر ایک لڑکی بھی بیاہی نہ جائے۔ (ص۱۳)

نکاح سے قبل زوجین کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔

اسلام نے اس بات کو بھی نہایت ضروری قرار دیا کہ نکاح کرنے سے قبل زوجین سے اُن کی مرضی معلوم کر لینی چاہیے تاکہ نکاح کے بعد کی متأہل زندگی تلخیوں کی آماجگاہ نہ بن جائے۔ چنانچہ مولانا تھانویؒ نے فرمایا:۔

« (نکاح) کے قبل بھی خاص طور پر اُن (متناکحین) کی رائے دریافت کی جائے جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں جیسے ہم عمر دوست اور سہیلیاں، اُن کے ذریعہ سے اس طور پر کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے بزرگ ہم سے دریافت کر رہے ہیں۔ ان کا مافی الضمیر معلوم کر لیا جائے اور تجربہ کی بات ہے کہ اس طریقہ ضرور ان کے خیالات معلوم ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو بے دریافت کیے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور اولیاء تک وہ خبریں پہنچ جاتی ہیں۔»

بعض حضرات جن میں کچھ جاہل اور کچھ دین کا زبانی دم بھرنے والے لیکن دین کی روح سے ناواقف اپنی خیالی مصلحتوں کے پیش نظر متناکحین (جن دونوں کا نکاح ہو رہا ہے) سے نکاح سے قبل اس کی رائے معلوم نہیں کرتے اگر کرتے ہیں تو اس کا احترام نہیں کرتے۔ جس سے بہت سی خرابیاں واقع ہوتی ہیں اور زوجین کی باہمی زندگی کئی مفاسد کا باعث بنتی ہے۔ مولانا تھانویؒ نے اس معاملہ میں بڑی گہری باتیں کی ہیں۔ فرمایا:۔

« مگر ظلم و ستم یہ ہے کہ پھر بھی بعض مہمل موہوم مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس خیال کی پروا نہیں کی جاتی اور ان کو گھونٹ داب کر اس بلا میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ خصوصی اس زمانہ میں کہ بے حد ہوشیاری کا وقت ہے۔ اس کی بہت ضرورت ہے۔ بہت مقامات ایسے ہوئے ہیں کہ ناپسندیدگی کی حالت میں نکاح کر دیا گیا۔ پھر ناکح صاحب نے عمر بھر اس منکوحہ کی خبر نہیں لی اور فہمائش پر صاف جواب دے دیا کہ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کر دی تھی جنہوں نے اس پر بھی یہ عقد کیا ہے۔ نفقات (اخراجات)

کے وہ ذمہ دار ہیں۔" (اصلاح انقلاب امت جلد ۲ ص ۳۴)

جو لوگ متناکحین کی مرضی کے خلاف نکاح کر دیتے ہیں۔ وہ کتنا بڑا ظلم کرتے ہیں وہ بھی حکیم الامت تھانویؒ کی زبان حقیقت ترجمان سے سنیئے۔ فرمایا

" اب تبلایئے اس مصیبت کا کیا علاج؛ ان بوسیدہ عقل بزرگوں کی تو مصلحت ہوئی اور غریب مظلوم تمام عمر کے لیے قید غیر میعادی میں گرفتار ہوئی۔ کہاں ہیں یہ فرسودہ عقل؛ اب آئیں اور اس مظلومہ کی کچھ مدد کریں، مگر مدد کیا کرتے۔ اول تو اس وقت تک مر کھپ بھی گئے اور زندہ بھی رہ گئے تو ڈھیٹ، تو دیکھئے یہ کہہ کر صاف الگ ہو گئے کہ صاحب کوئی کسی کی قسمت میں تو گھس ہی نہیں نکلا۔ ہم کیا کریں۔ اس کی قسمت، ہائے غضب، کیا غضب کا جواب ہے جس سے وہ مظلومہ تو درکنار غیر آدمی کے تن بدن میں بشرطیکہ تھوڑا منصف ہو آگ لگ جاتی ہے۔ بھلے مانسوں کو قسمت کی خبر نہیں تھی اس کی تو خبر تھی کہ خود صاحب معاملہ کانوں پہ ہاتھ دھر رہا ہے جو ظاہراً و عادتاً اس کی علامت ہے کہ نتیجہ یہ بھی یوں ہی ہو گا کہ انجام اس کا پریشانی ہو گی۔"

" اور اگر ایسا ہی تمسک بتقدیر ہے تو بس کل کسی کو قتل کر دیجیو۔ جب سزائے موت کے لیے پکڑے جاؤ تو کہہ دینا کہ ہم نے تو صرف ایک گولی ماری تھی۔ تقدیر کی کیا خبر تھی کہ ایک گولی سے مر ہی جائے گا۔ دیکھیں تو سہی اس عذر سے تم کو کون چھوڑ دے گا۔ خدا نکردہ اگر وہ مقتول تمہارا ہی کوئی لگتا ہو تو دیکھیں گے کہ تم قاتل کا یہ عذر قبول کر لو گے۔ یہ بیہودہ باتیں۔ کاش! اگر بجائے اس کے اس وقت اپنی غلطی کا اعتراف ہی کر لیتے تو مظلوم کی کچھ تو تسلی ہو جاتی۔ ان بیہودہ جوابوں سے تو الٹا اس کے زخم پر نمک چھڑکا جاتا ہے کہ ایک تو مجھ کو پھنسایا پھر کیسی صفائی سے بری ہوتے ہیں۔ (ص ۳۴-۳۵)

مجدد تھانویؒ نے کتنے اچھے انداز میں اس بات کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ نکاح سے قبل مرد اور عورت سے جہاں انکا نکاح ہوتا ہے انکی رضامندی لینی ضروری ہے اور اگر رضامندی کیخلاف ان میں سے کسی کا نکاح کر دیا گیا اور نکاح کے بعد مرد یا عورت کو غیر رضامندی کے خلاف اُن میں سے کسی کا نکاح کر دیا گیا اور نکاح کے بعد مرد یا عورت کو غیر رضامندی کی وجہ سے کوئی تکلیف ہوئی تو بوسیدہ — عقل بزرگ اس کے ذمہ دار ہوں گے اور وہ یہ کہہ کر اپنی جان نہیں چھڑا سکتے کہ تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا۔ جدید تہذیب کے حامل اور عاشق حضرات جو اسلام پہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے متناکحین کو اپنی رضامندی

پیش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کا بھی رد کر دیا ہے۔ اور یہ بتایا کہ اگر کوئی مرد اور عورت نکاح سے قبل اُن کی رضامندی نہیں لیتا تو اس میں دین کا کوئی نقص نہیں بلکہ اُن لوگوں کی خرابی ہے جو اسلام کی روح سے ناآشنائی کے سبب ایسا نہیں کرتے۔

خرابی کی دوسری وجہ

اہلی زندگی کی ناخوشگواری کا ایک سبب مجدد تھانویؒ کے نزدیک یہ ہے کہ ہر شخص اپنے سے زیادہ مالدار لوگوں میں نکاح کرنا چاہتا ہے۔ جس میں بعد میں بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ اسی طرح اگر زیادہ مفلس لوگوں میں شادی کی جائے تو اس سے بھی کوئی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے بلکہ بعض دفعہ نوبت طلاق پر آجاتی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنے برابر والوں سے نکاح کا تعلق قائم کیا جائے۔ چنانچہ مجدد تھانویؒ نے فرمایا:۔

" ایک کوتاہی ناکحین (نکاح کرنے والوں) میں یہ ہے کہ منکوحہ کے مال کو دیکھتے ہیں اور درحقیقت یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ منکوحہ یا اُس کے اولیاء مرد کے مال کو دیکھیں، کیونکہ یہ تو کسی درجہ میں اگر اُس میں غلو نہ ہو امر معقول ہے، کیونکہ مرد پر نفقہ و مہر عورت کا واجب ہوتا ہے تو اس پر استطاعت کے کو دیکھنا مضائقہ نہیں بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے۔ البتہ اس میں ایک قسم کا غلو ہو جاتا ہے کہ اُس کو اور ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے، یہ مذموم ہے۔ لیکن عورت کے مالدار ہونے پر نظر کرنا محض اس غرض سے کہ ہم اس سے منتفع ہوں گے یا ہم پر نفقات وغیرہ کا بار کم پڑے گا بڑی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے ..... اس کے علاوہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مالدار عورت نادار مرد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، اس کو حقیر اور خادم سمجھتی ہے۔ اور ناکح کے والدین کا اس پر نظر کرنا کہ ایسی بہو کو بیاہ کر لائیں کہ جہیز بہت سا لائے اور بھی احمق ہیں۔ اُن کی بھی وہی مثل ہے کہ ع

چو موش بر سر دکّان روستا خورسند

اوّل تو وہ جہیز ملک بہو کا کسی کو اس سے کیا۔ لیکن اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ گھر ہی میں رہے گا تو ہمارے بھی کام آئے گا۔ اوّل تو وہی بے حمیتی۔ دوسرے اگر اس کو گوارا بھی کر لیا جائے تو اس خیال کی ناکح کو تو کسی درجہ میں گنجائش ہے مگر ساس سسر کو کیا واسطہ۔ آج صاحبزادہ صاحب اپنی رائے سے یا بہو کے کہنے سے جُدا ہو جائیں۔ بس ساری امیدوں پہ پانی پھر جائے۔"

" البتہ منکوحہ کے زیادہ مفلس نہ ہوتے پر ایک مصلحت کی تحصیل کے لیے اور ایک مضرت کے دفع

کرنے کیلیے نظر کی جائے تو وہ نازیبا نہیں بلکہ مناسب ہے۔ وہ منفعت تو یہی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفلس محض میں دو امر کی کمی ہوتی ہے۔ ایک سلیقہ کی دوسری سیر چشمی کی۔ پس سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی اور اس سے کلفت ہوتی ہے۔ اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچوں میں تنگی کرتی ہے جس سے بعض اہل حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں اور بعض مقامات پر شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ کسی مہمان کو روٹی کم دے دی۔ کسی سائل حاجت مند کو محروم کر دیا۔ اور اگر وہ بچپن سے کھانے پینے، دینے دلانے، کھلانے پلانے میں رہی ہوگی تو راحت اور انتظام کی زیادہ امید ہے۔ اور وہ مضرت یہ ہے کہ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتاً مال و دولت کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اور اچھلنے لگتی ہے۔ اور سلیقہ ہوتا نہیں۔ بس بے تمیزی سے اُس کو اڑانا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ اکثر نو دولتوں کو یا بخل کی بلا میں مبتلا پایا یا اسراف کی۔ ان میں اعتدال کم ہوتا ہے، کیونکہ عادت نہیں تھی اموال سے منتفع ہونے کی، جو اعتدال سکھتی۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اُس کو محبت نہیں ہوتی۔ نقد الگ، جنس الگ، کبھی ظاہر میں کبھی خفیہ جس طرح بن پڑتا ہے اپنے میکے والوں کو بھرنا شروع کر دیتی ہے اور عمر بھر یہی نزلہ بہتا رہتا ہے اور اس سے گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے مرد کماتا کماتا تھک جائے مگر وہ اڑانے سے نہیں تھکتی۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے برابر والوں میں تعلق نکاح کا کرے۔" (اصلاح انقلاب امت جلد ۲ صفحہ ۴۲-۴۳)

ملاحظہ فرمائیے امت کے تھانویؒ حکیم نے ہماری اہل زندگی کی خرابیوں کی کیسی صحیح تشخیص فرمائی۔ آج کل جہیز کی زیادتی کا جنون ہر لڑکے کے ذہن پہ سوار ہے بلکہ ناکح سے زیادہ اُس کے اولیا پر سوار ہے، کار، بنگلہ، ٹی۔ وی۔ فریج اس قسم کی دوسری فرمائشیں لڑکی والوں سے لڑکے والوں کا روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ اسی وجہ سے کئی غریب گھروں کی بچیاں جہیز نہ ہونے کے سبب اپنے والدین کے ہاں بوڑھی ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اسی طرح امریکہ، یورپ، کویت اور دوسری خلیجی ریاستوں میں کام کرنے والے نوجوان خواہ وہ اخلاقی اور دینی اعتبار سے کتنے ہی بد اخلاق اور بد دین کیوں نہ ہوں، پاکستان میں کام کرنے والے نوجوانوں کے مقابلہ چونکہ زیادہ پیسے کماتے ہیں اس وجہ سے ہر شخص اُن کو اپنا داماد بنانے کی کوشش اور تگ و دو کرتا ہے، خواہ نکاح کے بعد جلدی ہی طلاق تک نوبت پہنچ جائے۔ یہ طمع و لالچ اور حرص و آز کی ایک بدترین قسم ہے۔

نکاح سے قبل مرد کے عقیدہ اور عمل کی تحقیق ضروری ہے

یہ ساری خرابیاں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے بے دینی اور بد عقیدگی کی وجہ سے ہیں۔ وگرنہ اگر مرد کی دینی اور اخلاقی حالت اچھی ہو اور خدا کا خوف اُس کے دل میں موجود ہو تو یقین کیجئے کہ وہ خانگی جھگڑے پیدا ہی نہیں ہونے جو آج کل ہمارے معاشرہ میں بے دینی، بد عملی اور حرص و آز کی وجہ کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے حکیم الامت تھانویؒ نے کہا کہ نکاح سے قبل مرد کے عقیدہ و عمل کی چھان بین کر لینی چاہیئے۔ اور جو لوگ اپنی بعض خاص مصلحتوں کی وجہ سے مرد کے عقیدہ کی چھان بین کیے بغیر کسی بد عقیدہ شخص سے اپنی بچی کا نکاح کر دیتے ہیں وہ ایک تو اپنی بچی پر ظلم عظیم کرتے ہیں اور دوسرے بعد میں خود بھی کف افسوس ملتے ہیں، کیونکہ جن موہوم امیدوں کو تکمیل کے لیے وہ ایسا کرتے ہیں انجام کار انہیں وہ بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ چنانچہ حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا۔

" بعضے لوگ محض طمع مال یا جاہ میں یا براہ کم شفقتی بحال اولاد یا دیگر خاندانی مصالح موہومہ کے سبب اپنی لڑکیوں کا کسی بد عقیدہ یا بد عمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں۔ تو اگر وہ بد اعتقادی حدِ کفر تک پہنچی ہوتی ہے تو عمر بھر کے لیے علاوہ ظاہری کلفت کے بحالت عدم توافق فی الدین لازم ہے۔ یہ خرابی ہوتی ہے کہ ارتکاب زنا لازم آتا ہے۔ پھر اگر اولاد ہوئی وہ غیر حلالی۔ اور اگر حدِ کفر تک بھی نہ پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہان روح نقد حال رہتا ہے۔ " (ص۱۴)

مجدد تھانویؒ نے اس بارہ میں سخت احتیاط کی تاکید فرمائی ہے، کیونکہ نکاح کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔ کسی مسلمان عورت کا غیر مسلم سے نکاح شریعت اسلامیہ میں جائز نہیں اور اگر کسی نے کر دیا تو وہ نکاح نہیں ہوگا بلکہ سفاح (زنا) ہوگا۔ اور اُس سے جو اُولاد ہوگی وہ حلالی نہیں حرامی ہوگی۔ اور یہ اسلامی معاشرہ کے لیے بہت بڑی بد بختی ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا۔

" اس باب میں سخت احتیاط لازم ہے، خصوص اس کی تحقیق قبل نکاح نہایت ضروری ہے کہ ناکح کسی فرقہ ضالہ (گمراہ فرقہ) کے عقائد کا معتقد تو نہیں۔ اور قدیم گمراہ فرقوں میں سے نہ ہونے پر بھی قناعت نہ کی جائے۔ آج کل روزانہ نئے نئے فرقے نکل رہے ہیں۔ اور زمانہ آزادی کا ہے۔ اس لیے اس شخص کی ان نئے فرقوں میں سے نہ ہونے کی مستقل تحقیق ضروری ہے۔ اسی طرح اگر وہ انگریزی

خواں ہے تو دیکھ لیا جائے کہ جدید تعلیم کے اثر سے اُس کی آزادی استخفاف دین یا انکار ضروریات دین تک تو نہیں پہنچ گئی۔ ورنہ اگر ایک کلمہ بھی کفر کا منہ سے نکل گیا تو بدون تجدید اسلام و تجدید نکاح حرام کا ارتکاب ظاہر ہے، جس کو نہ غیرت انسانی قبول کرتی ہے نہ حمیت اسلامی" (ص۱۱۵)

مرد کی کس قسم کی بدعقیدگی اور بدعملی نکاح کے لیے مضر ہے حکیم الامت تھانویؒ نے اس بات کو بھی مبہم نہیں چھوڑا بلکہ اُس کی تشریح و تفصیل ان الفاظ میں بیان فرمائی:

"مرد کی بددینی تین طرح کی ہے۔ ایک[۱] اعتقادی اصولی دوسری[۲] اعتقادی فروعی۔ تیسری[۳] اعتقادی عملی"

پہلی قسم کی مثال حضرت والاؒ نے یہ دی کہ جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلم خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ ان کا نکاح درست نہیں۔ لیکن اگر مرد مسلمان ہو اور عورت غیر مسلم تو اس کی دو صورتیں ہیں، پہلی صورت یہ کہ عورت کتابی ہے یا غیر کتابی۔ اگر عورت غیر کتابی ہے، مثلاً ہندو یا سکھ تو اُس کا نکاح مسلمان مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ لیکن اگر عورت کتابی ہے تو اگرچہ نکاح اُس کا جائز ہے لیکن مناسب نہیں۔ کیونکہ

"اختلاط کافرہ کا لازم آتا ہے"

"اور اس اختلاط سے پھر بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں جن کے اثرات بعد میں اولاد پر پڑتے ہیں بلکہ بعض دفعہ اُس کافرہ سے اولاد بھی کافر ہوتی ہے، کیونکہ ماں کا اثر ہر لحاظ سے اولاد پر باپ کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

پھر جس کتابی عورت سے اسلام نے مسلمان کا نکاح جائز رکھا ہے۔ وہ کتابی عورت ہے جو عقائد کے لحاظ سے یہودی یا عیسائی ہو۔ لیکن اگر قوم کے اعتبار سے عیسائی یا یہودی ہو لیکن عقیدہ کے لحاظ سے ملحد یا دہریہ ہو۔ اُس عورت سے بھی مسلمان مرد کا نکاح جائز نہیں۔ اس زمانہ میں یورپ و امریکہ میں عورتوں کی اکثریت اللہ تعالیٰ ہی پر ایمان نہیں رکھتی لہذا اگرچہ اُن کو قوم کے لحاظ سے عیسائی اور یہودی سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں عیسائی یا یہودی نہیں ہیں لہذا اُن سے نکاح جائز نہیں۔ چنانچہ اس بارہ میں حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا۔

"بعضے لوگ بلاد یورپ سے ایسی عورت نکاح کرکے لاتے ہیں جو صرف قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب، سو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی عورت سے

ہرگز نکاح صحیح نہیں ہوتا۔ بعضے گو لاتے ہیں عیسائی ہی عورت مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے محض اجنبی ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا واجب التحرز ہونا بھی ظاہر ہے[۱۱۴]

مرد کے بد دین اور بد عقیدہ ہونے کی دوسری قسم یہ ہے کہ بدعتی گروہ سے ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حدّ کفر تک پہنچ جائے تو اس مرد سے بھی نکاح جائز نہیں۔ اور اگر کوئی مرد مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد یا صرف مسلمان ہی سمجھتا ہو اُس مرد سے بھی مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔ اور اگر مرد کی بدعت حدّ کفر تک نہیں پہنچی ہوئی تو وہ شخص اگرچہ مسلمان ہے لیکن دین کے لحاظ سے سنی عورت کا کفو نہیں۔ لہٰذا بعض صورتوں میں نکاح تو ہو جاتا ہے لیکن بعد میں بہت خرابیاں نکلتی ہیں اس لیے پرہیز لازم ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ مرد فاسق و فاجر ہو اور عورت نیک و صالحہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ

" فاسق مرد عورت صالحہ کا کفو نہیں۔ جیسے عورت صالحہ ہو اور بقول بعض فقہا دختر شخص صالح بھی بحکم صالحہ ہے، اور مرد فاسق ہو۔ اور بقول بعض فقہا معلن (جس کا فسق ظاہر ہو) ہونا بھی شرط ہے، تو یہ مرد اُس عورت کا کفو نہیں ہے۔ (ایسے نکاح میں بہت سی خرابیاں ہیں)

یہ تو دینی کفارت کا بیان ہے۔ اسلام میں نسبی کفارت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے تاکہ نکاح کے بعد زوجین کے تعلقات میں کوئی خرابی واقع نہ ہو۔ لہٰذا بہتر اسی چیز کو سمجھا گیا کہ نکاح اپنی ہی ذات برادری میں ہو۔ دوسری ذات برادری میں نکاح کرنے سے بہت سی خانگی خرابیاں جنم لیتی ہیں جن کے اثرات نہ صرف میاں بیوی پہ بلکہ اُن کی اولاد پر بھی اچھے نہیں پڑتے۔

اس سلسلہ میں عام طور پہ دو کوتاہیاں کی جاتی ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں ایک کو افراطی کوتاہی اور دوسری کو تفریطی کوتاہی کہتے ہیں۔ افراطی کوتاہی یہ ہے کہ نکاح کرنے والے مرد کے کسی وصف اور خوبی کو نظر میں نہ رکھا جائے۔ نہ لیاقت کو نہ دین و صحت کو اور نہ عمر اور وسعت مالیہ کو بلکہ یہ خیال ہو کہ

" میاں ہڈی بوٹی اچھی ہونی چاہیے "

یعنی مرد اپنے خاندان اور اپنی برادری کا ہو۔ یہ خیال بقول ایک ظریف

" ہم تو کتے نہیں جو فقط ہڈی بوٹی کو دیکھیں "

بالکل لغو محض ہے۔ کیونکہ نکاح سے اصل مقصود ہے، مصالح خاصہ اور اُس کے لیے کئی باتوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہوتا ہے نہ کہ صرف وصف اضافی کو یعنی آباء و اجداد کی طرف انتساب کو۔ اس سے بھی بہت سی خرابیاں جنم لیتی ہیں جیسے بعض دفعہ مرد محض نالائق، بے دین، یا مریض اور بیکار، یا بہت بوڑھا یا بالکل بچہ یا مالی لحاظ سے نہایت کمزور ہوتا ہے اور عورت کے لیے عمر بھر کا جیل خانہ یا پھانسی کا پھندا بن جاتا ہے۔

اور تفریطی کوتاہی بھی مفاسد کے لحاظ سے اس سے کم نہیں ہے اس جدید دور میں بعض جدید تعلیم یافتہ لوگ یا حب دین یا حب دنیا سے مغلوب حضرات دوسری خوبیوں کے ہوتے ہوئے نسب کا ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔ ایسے نکاح میں بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوجاتی جن سے بعض دفعہ نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے اور دو خاندانوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اگرچہ ایسے مرد اور عورت کا نکاح تو شرعی طور پر ہوجاتا ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورت کی نظر میں خاوند کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جس سے نکاح کی تمام مصلحتیں فوت ہوجاتی ہیں

٭ وہ (عورت) نابالغ ہے تو چونکہ نکاح کرنے والا باپ اور دادا نہیں اس لیے یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔ البتہ اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔

اس بارہ میں نہایت غفلت اور بے پروائی سے کام لیا جارہا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ دین سے ناواقفیت اور عدم وقعت کی وجہ سے بعض دفعہ ضروریات دین کا صاف اور قطعی انکار کردینے میں نہیں تو استخفاف دین تو اکثروں میں قدم قدم پر ہے۔ جس کی وجہ جدید لٹریچر کی بدولت خدا و رسول کی عظمت اور یوم آخرت کا خوف نہ ہونا ہے۔ دوسری طرف دنیا طلبی اور جاہ پرستی جو ہمارے ہر طبقہ پر مسلط ہے، اُس کی وجہ سے عوام تو ایک طرف ہمارے مشائخ اور علماء بھی معقول تنخواہ اور معزز عہدہ دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ بھی کسی عالم اور مولانا کو مسٹر کے مقابلہ میں ٹھکرا دیں گے۔ تعلیم یافتہ ان کے ہاں صرف مسٹر اور بی۔ اے، ایم اے ہے۔ درس نظامی کا فارغ التحصیل مولانا ان کے ہاں بھی غیر تعلیم یافتہ شمار ہوتا ہے۔ اسی دنیا طلبی اور جاہ پرستی کی وجہ سے داماد کے کفر و ایمان کی بھی انہوں نے تفتیش نہیں کی خواہ بعد میں لڑکی بیچاری پوری زندگی حرام کاری ہی میں مبتلا رہے۔

عورت کا نان ونفقہ

مرد پر عورت کا نان و نفقہ واجب ہے۔ لیکن اس بارہ میں بہت

ے مرد بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے یا دین سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سی کوتاہیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس بارہ میں مجدد تھانویؒ نے نفقہ کی ایک غامض صورت بیان فرمائی۔ فرمایا:

"ایک فرد نفقہ واجبہ کی ایسی غامض ہے کہ کسی کا ذہن بھی اس کی طرف منتقل نہ ہوا ہوگا اور عوام کا تو کیا ہوتا خواص کا بھی نہ ہوا ہوگا۔ اور اس فرد کے بتلانے سے پہلے ایک مقدمہ معروض ہے پھر اس فرد کو بتلایا جائے گا۔

"اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ نفقہ احتباس کی جزا بھی ہوتا ہے یعنی جو شخص کسی کی مصلحت یا خدمت کے لیے محبوس و مقید ہو اور احتباس کے سبب وہ اپنی معیشت کا انتظام نہ کر سکتا ہو تو اس شخص کا نفقہ اس پر واجب ہوگا جس کی مصلحت و منفعت کے لیے محبوس ہو۔ چنانچہ اس کی مشہور مثال جو فقہاء نے ذکر کی ہے رزق قاضی ہے۔ یعنی قاضی مسلمین چونکہ عامہ مسلمین کی شفقت کے لیے خدمت قضا میں محبوس و مشغول ہے، اس لیے اس کا گذارہ جس کو رزق و قوت کہتے ہیں عامہ مسلمین پر واجب ہے جس کی شکل یہ ہے کہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے کہ حقیقتہً اس کی مجمع اموال مسلمین ہے اور اس لیے اس میں دیے جانے کی حقیقت یہی ہے کہ عامہ مسلمین سے دلوایا جاتا ہے۔ ..... اور فقہاء نے زوجہ کے نفقہ کو بھی جزائے احتباس ہی کہا ہے۔"

(اصلاح انقلاب امت جلد ۲ صـ۱۹۰)

نفقہ کے بارہ میں عوام کیا خواص کو بھی کچھ غلط فہمیاں لاحق ہو گئی ہوئی ہیں، اور نان و نفقہ کی انھیں غلط فہمیوں کی وجہ سے بعض خانگی تنازعات پیدا ہوتے ہیں جو بعد میں کئی بڑے بڑے مفاسد کا باعث بنتے ہیں۔ مجدد تھانویؒ نے اس بارہ میں بھی تمام مسائل کو اجاگر کر کے رکھ دیا ہے اور عورتوں کے بارہ میں ایسا مسائلی مواد فراہم کیا ہے جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی ڈھونڈنے سے کم ہی ملتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامتؒ نے ایک غلطی فہمی کا ازالہ فرماتے ہوئے تحریر فرمایا۔

"ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بی بی کا نفقہ اس وقت واجب سمجھتے ہیں کہ وہ نادار ہو۔ اور اور اگر وہ مالدار ہو تو اس صورت میں اس کا نفقہ واجب نہیں سمجھتے۔ سو یہ بالکل غلط ہے۔ بیوی کا نفقہ دونوں مذکورہ حالتوں میں واجب ہوتا ہے۔ صرف اپنی شرط ہے کہ بی بی کی طرف سے تسلیم نفس میں بلا عذر کوتاہی نہ ہو۔ اور اگر عذر سے ایسا ہو جیسے مہر معجل کے لینے کے لیے اپنے نفس کو تسلیم نہ کرے

اس میں نفقہ واجب رہے گا۔" (ص ۱۸۲)

اسی طرح اگر عورت کم سن ہو اور مرد جوان و توانا۔ اور مرد اُس کو اپنے گھر میں صرف اپنا جی بہلانے کے لیے رکھے۔ معمولی خدمت کر سکے تو تسلیم نفس کے بعد شوہر کے ذمہ اُس کا نفقہ بھی واجب ہے۔ اسی طرح اگر جوان عورت کا کم عمر لڑکے سے عقد ہو گیا ہو۔ اُس عورت کا نفقہ بھی شوہر کے مال سے اگر وہ صاحب جائیداد اور نقدی کا مالک ہو، واجب ہو گا کیونکہ مانع تمتع مرد کی طرف سے ہے عورت کی طرف سے نہیں۔ ہاں جو عورت شوہر سے لڑ کر اپنے میکے جا بیٹھے اُس کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب نہیں۔

نفقہ کے بارہ میں مردوں کی زیادتی

عام مرد یہ سمجھتے ہیں کہ بس نکاح کیا اور عورت کو گھر پہ لائے اور خادمہ کی طرح اُس کو گھر میں روٹی کپڑا پہ رکھ لیا۔ اُس کی عام ضروریات کا وہ بالکل لحاظ نہیں رکھتے۔ چنانچہ اگر مرد صاحب جائداد بھی ہو اور ہزاروں روپیہ ماہانہ اس کی آمدنی ہو پھر بھی وہ عورت کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اُس کے لیے کھانا پکائے اور گھر کے دوسرے کام کاج کرے۔ مال و دولت ہوتے ہوئے بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ بیوی کو کوئی خادمہ رکھ دینی چاہیے بلکہ

”ایک کوتاہی بعض مردوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود فارغ البالی کے بی بی کے خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور اتنا کم دیتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے پکائے تو کافی ہو سکتا ہے۔ ورنہ ماما (خادمہ) رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حالانکہ مرد اگر ذی وسعت ہو تو اس کے ذمہ خادمہ کا خرچ بھی واجب ہے"

حکیم الامت تھانویؒ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ عورتوں سے جبراً گھر کا کام لیا جائے یا اُن سے اُن کی طاقت سے زیادہ اُن پہ کام کاج کا بوجھ ڈالا جائے۔ اس بارہ میں ایک صاحبؒ نے عرض کیا کہ

”عورتیں تو خود ہی گھر کے اس قدر کام کرتی ہیں اور مشقتیں اُٹھاتی ہیں کہ کسی وقت چین سے نہیں بیٹھتیں، وہ خود ہی اپنی راحت نہیں چاہتیں۔ فرمایا اُن کا ایسا کرنا اُن کی ذاتی مصلحت ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس سے اُن کی تندرستی ٹھیک رہتی ہے۔ مثلاً کھانا پکانا ہے، پیسنا ہے، کوٹنا ہے۔ خود ہمارے گھروں میں سب کام اپنا اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت ہو تو سیر دو سیر پیس بھی لیتی ہیں۔ سو وہ اگر اپنی رائے اور مصلحت سے مشقت اختیار کریں یہ دوسری بات ہے مگر ان پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا نہایت

بے رحمی اور بے مروتی کی بات ہے ،، (الافاضات الیومیہ جلد ۲ صـ ۱۴۴)

بیوی کے فرائض

جس بی بی کے خط کا اقتباس ہم نے مولانا تھانوی کے ملفوظ سے اس مقالہ کے شروع میں نقل کیا ہے اُس کے بارہ میں حضرت والاؒ نے فرمایا کہ اُن بی بی کے خاوند نے ایک مرتبہ مجھ سے خود شکایت کی تھی کہ یہ وظیفہ وظائف میں رہتی ہیں اور میری خدمت کی پروا نہیں کرتیں ۔ جواب میں حضرت والاؒ نے فرمایا :-

" بندہ خدا ایسی کون سی خدمات ہیں جو بغیر وظائف ترک کیے ہوئے نہیں ہو سکتیں ۔ مرد کی خدمات ہی کیا ہیں ۔ چند محدود خدمات ۔ یہ دوسری بات ہے کہ خدمات کا باب اس قدر وسیع کر دیا جائے جن کا پورا کرنا ہی بیچاری پر دوبھر ہو جائے ۔ "

مشقتوں کے اسی ہجوم اور فکر و غم کے اسی بارگراں کی وجہ سے عورتیں جلدی ضعف و ناتوانی کے قریب پہنچ جاتی ہیں ۔ غم کو اندر ہی اندر کڑوا گھونٹ کر کے پیتی ہیں اور کسی سے اس کا اظہار بھی نہیں کرتیں ۔ کتنی بے ضرر مخلوق ہیں ۔ فرمایا :-

" سو عورت کے اعضا کا جلد ضعیف ہو جانا اس کا سبب بھی زیادہ یہ ہی ہے کہ اُس پر ہر وقت غم اور رنج کا ہجوم رہتا ہے ۔ سینکڑوں افکار گھیرے رہتے ہیں ۔ امور خانہ داری کا انتظام بیچاری کے ذمہ ڈال کر مرد صاحب بے فکر ہو جاتے ہیں ۔ وہ غریب کھپتی ہے ۔ مرتی ہے ۔ اگر یہ حضرت دو روز بھی انتظام کر کے دکھا دیں ہم تو اُس وقت اُن کو مرد سمجھیں ۔ باوجود ان سب باتوں کے کمال یہ ہے کہ اپنی زبان سے اظہار بھی نہیں کرتی کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے ۔ یہ سبب ہے عورت کے جلد ضعیف ہونے کا ۔ "

" یہاں پر بعض عورتیں عیش اور راحت میں ہیں ۔ اور عمر اُن کی تقریباً چالیس چالیس پینتالیس پینتالیس برس کی ہے کم و بیش ۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سال دو سال کی بیاہی ہوئی آئی ہیں اور اُن کو کوئی پچیس برس کی عمر سے زائد نہیں بتلا سکتا ۔ تو بیوی کو عیش و آرام میں رکھتے ہیں ۔ ایک یہ بھی بڑی حکمت ہے کہ وہ تندرست رہے گی ۔ ضعیفی کا اثر جلد نہ ہوگا ۔ دراز مدت تک ان کے کام کی رہے گی ۔ مگر لوگ اپنی راحت و مصلحت کا خیال کر کے بھی تو ان کی رعایت نہیں رکھتے ۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ جورؤں کے غلام بن جاؤ ۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ حدود کی رعایت رکھو ظلم تک نوبت نہ پہنچاؤ ۔ اور اگر کبھی ضرورت ہو ۔ دباؤ بھی دھمکاؤ بھی ۔ کوئی حرج نہیں ۔ حاکم ہو کر رہنا چاہیئے اور محکوم کو محکوم بن کر ،

لیکن جیسے محکوم کے ذمہ حاکم کے حقوق ہیں۔ اسی طرح حاکم کے ذمہ محکوم کے بھی حقوق ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے برتاؤ کرنا چاہیئے۔" (الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص۱۴۵)

ساس کی خدمت بہو پر فرض نہیں

بعض لوگ کئی ایسی چیزوں کو بھی عورت کے فرائض میں سے سمجھتے ہیں جن کو شریعت اسلامیہ نے اُن کے ذمہ فرض نہیں کیا۔ چنانچہ خاوند کی ماں کی خدمت اُس کی بیوی کی ذمہ فرض نہیں ہے۔ اس بارہ میں بھی تھانویؒ ارشاد سن لیں۔ فرمایا

"بعض آدمی اس کو بڑی سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں اور اُس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے۔ تم سعادت مند ہو، خود خدمت کرو۔ خدمت کے لیے نوکر لاؤ۔"

(اصلاح انقلاب امت جلد ۲ ص۱۹۸)

جب میاں کی ماں کی خدمت میاں کی بیوی پر واجب نہیں تو اس کے اور رشتے دار کس شمار و قطار میں ہیں۔ اُن کی خدمت بھی بیوی پر ضروری اور واجب نہیں ہے۔

بیوی کو الگ گھر یا کمرہ دینا واجب ہے

بلکہ حکیم الامت تھانویؒ نے یہاں تک فرمایا کہ مرد پر بیوی کو کھانا پلانا ہی ضروری نہیں بلکہ اُس کو علیحدہ گھر یا گھر میں علیحدہ کمرہ دینا بھی واجب ہے۔ بعض مرد شادی کے بعد بیوی کو اپنے عزیزوں میں لاڈالتے ہیں یہ اچھا نہیں۔ ہاں اگر عورت ان عزیزوں میں طیب خاطر سے راضی ہو تو ٹھیک۔ وگرنہ مرد کو اُس کی رہائش کے لیے الگ جگہ مہیا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نان و نفقہ۔ چنانچہ حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا:

"اگر مرد کو قرائن تو یہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ (عورت) جدا رہنا چاہتی ہے، مگر زبان سے اُس کی درخواست نہ کر سکے تب بھی مرد کو (اپنے عزیزوں میں اس کو) شامل رکھنا جائز نہیں۔ البتہ اتنی گنجائش ہے اگر پورا گھر جدا نہ دے سکے تو بڑے گھر میں سے ایک کوٹھڑی یا کمرہ ایسا دینا کہ اُس کی ضروریات کو کافی ہو سکے، اور اس میں اپنا مال و اسباب مقفل کر کے رکھ سکے اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ اُٹھ سکے، بات چیت کر سکے۔ یہ واجب کے ادا کرنے کے لیے کافی ہوگا۔"

حضرت والاؒ نے نفسیاتی لحاظ سے کیسا اچھا تجزیہ فرما کر مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ آج کل ذہن سے واقفیت اور رسم و رواج کے اپنانے میں ہمارا وطیرہ ان باتوں سے بالکل جدا ہو گیا ہے۔ عائلی زندگی انہی چیزوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ خانگی جھگڑوں نے ہمارے ذہنی سکون و اطمینان کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم ان مشکلات کا حل اسلام سے نہیں رسم و رواج سے تلاش کرتے ہیں۔ اس بارہ میں حکیم الامت نے مزید فرمایا۔

"آج کل کے طبائع و واقعات کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر عورت شامل رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے سب اعزا ناخوش بھی ہوں۔ تب بھی مصلحت یہی ہے کہ عورت کو عزا سے جدا ہی رکھے۔ اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد ہے۔ اور گو اس میں چند روز کے لیے عزیزوں کا ناک منہ چڑھے گا، مگر اس کی مصلحتیں جب مشاہد ہوں گی سب خوش ہو جائیں گے۔ خصوص چولہا تو ضرور ہی علیحدہ ہونا چاہیئے۔ زیادہ تر آگ اس چولہے ہی سے بھڑکتی ہے۔ فقہاءؒ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ مرد کی اگر پہلی بیوی سے کچھ اولاد ہو تو دوسری بیوی کو اس کے ساتھ بھی شامل رہنے پر مجبور —— نہیں کر سکتا۔ اور آج کل واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص دوسری اولاد کے ساتھ شامل رہنا بڑے بڑے فسادوں کی جڑ ہے کہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ اتنا فساد نہیں ہوتا۔"

(اصلاح انقلاب امت جلد ۲ صـ ۱۸۷-۱۸۸)

مرد کا کھانا پکانا عورت پر واجب نہیں

ہندو پاکستان کے ہندوانہ معاشرہ نے ہمارے ہاں مردوں اور اُن کے عزیز و اقارب کے ذہن خراب کر دیئے ہوئے ہیں۔ ہندو معاشرہ میں عورت کی حیثیت بدترین خادمہ کی ہو کر رہ گئی ہوتی ہے بلکہ خادمہ اور نوکرانی کو تو مالک کے سامنے بولنے کا حق ہے، عورت سے یہ حق بھی چھین لیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں تو والدین اور عزیز اقارب بچہ کی شادی اس لیے کرتے ہیں کہ بہو آ کر ہماری خدمت کرے گی لیکن بیاہی جانے والی عورت کے حقوق اور اس کی شخصی آزادی کا نام بھی کبھی ان کی زبانوں پر نہیں آیا —— حضرت تھانویؒ کے نزدیک خود مرد کی روٹی پکانا بھی عورت کے ذمہ واجب نہیں، اگر عورت مرد کی روٹی پکانے سے انکار کرے تو مرد کو خود اس کا انتظام کرنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت والاؒ نے فرمایا۔

”ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ عورتوں کے ذمہ واجب ہے کھانا پکانا۔ میری رائے ہے کہ ان کے ذمہ واجب نہیں۔ میں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے عدم وجوب پر و من اٰیاتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو اُن کے پاس آرام ملے اور میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی) حاصل یہ ہے کہ عورتیں اس واسطے بنائی گئی ہیں کہ اُن سے تمہارے قلب کو سکون ہو، قرار ہو، جی بہلے۔ تو عورتیں جی بہلانے کے واسطے ہیں نہ کہ روٹیاں پکانے کے واسطے۔ اور آگے جو فرمایا کہ تمہارے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی ہیں کہا کرتا ہوں کہ مودۃ یعنی محبت کا زمانہ تو جوانی کا ہے اُس وقت جانبین میں جوش ہوتا ہے۔ اور ہمدردی کا زمانہ ضعیفی کا ہے دونوں کا۔ اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ ضعیفی کی حالت میں سوائے بیوی کے دوسرا کام نہیں آسکتا۔“ (ص ۱۴۵)

اس سلسلہ میں حضرت والاؒ نے دو واقعات بھی بیان فرمائے۔ ایک واقعہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کا اور دوسرا شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا فرمایا

”حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آخر وقت میں نکاح کیا تھا محض اس وجہ سے کہ حضرتؒ کو ناسور کا مرض ہو گیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال سوائے بیوی کے ہو نہیں سکتی تھی۔ وہ بی بی بیچاری برابر اپنے ہاتھ سے شب و روز میں کئی کئی مرتبہ دھوتیں اور صاف کرتی تھیں، نہایت خوشی کے ساتھ کوئی گرانی یا نفرت اُن کو نہ ہوتی تھی۔ دنیا میں کوئی اس تعلق کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔“

”حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آخر عمر میں نکاح کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت پیرانی صاحبہ نابینا ہو گئی تھیں۔ حضرتؒ نے محض خدمت کی غرض سے نکاح کیا تھا یہ بی بی حضرت کی بھی خدمت کرتیں اور پیرانی صاحبہ کی بھی۔“

”ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت محض شہوت کے لیے تھوڑا ہی ہوئی ہیں اور بھی مصالح اور حکمتیں ہیں۔“ (الافاضات الیومیہ جلد ۲ ص ۱۴۷)

بتانا یہ مقصود تھا کہ عورت کے ذمہ مرد کا کھانا پکانا بھی واجبات میں سے نہیں ہے چہ جائیکہ اُس کے والدین اور عزیز و اقارب کی خدمت اور طعام وغیرہ کا انتظام کرنا۔ مرد اگر مالدار ہے تو جیسا کہ

ذکر کیا جاچکا ہے مرد پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے نوکرانی کا انتظام کرے لیکن اگر شوہر تنگدست اور قلاش ہے تو عورت اُس کو نوکرانی رکھنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ چنانچہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا۔

" ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف یہ ہوتی ہے کہ باوجود شوہر کے تنگدست ہونے کے اُس کو مجبور کرتی ہیں کہ ماما (نوکرانی) لادے، حالانکہ شوہر کی تنگدستی کی صورت میں مرد اس پر مجبور نہیں ہے بلکہ دیکھا جائے گا کہ عورت اپنے کام پر قادر ہے یا نہیں؛ اگر قادر ہے تو اپنا کھانا بھی پکائیے اور شوہر کا بھی پکائیے اور اگر قادر نہیں خواہ کسی غرض کے سبب خواہ امیر کبیر ہونے کے سبب تو نہ شوہر ماما لانے پر مجبور اور نہ عورت کھانا پکانے پر بلکہ شوہر سے کہا جائے گا کہ تیار شدہ کھانا عورت کو لاکر دے خواہ بازار سے یا کہیں اور پکواکر۔ (کذا فی الدر المختار)" (اصلاح انقلاب امت جلد ۲ صـ ۱۸۳)

مرد کا مال فضولیات میں اڑانا جائز نہیں

اگرچہ عورت کا نان ونفقہ مرد پر واجب اور ضروری قرار دیا گیا، لیکن شریعت نے یہ اجازت ہرگز نہیں دی کہ عورت مرد کے مال کو فضولیات میں اڑاتی پھرے۔ بلکہ دینی مصارف میں بھی عورت شوہر کے مال میں سے اُس کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتی۔ مثال کے طور پر کسی سائل کو کچھ دینا، کسی مدرسہ یا مسجد میں چندہ دینا، کسی بیوہ، یتیم یا مسکین کی خدمت کرنا یہ سب چیزیں عورت اپنے ذاتی مال میں سے تو کرسکتی ہے لیکن اپنے شوہر کے مال میں سے اُس کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتی۔ کیونکہ اسلام میں میاں بیوی کی ملکیت الگ الگ تسلیم کی گئی ہے۔

" ان دونوں کی ملک جدا جدا ہے۔ یہ شوہر کے لیے بھی ظلم ہوگا اگر عورت کے مال میں بلا اُس کی رضا کے تصرف کرے، اور عورت کے لیے بھی خیانت ہوگی اگر مرد کے مال میں بلا اُس کی رضا کے تصرف کرے۔" (صـ ۱۸۶)

اسی بنا پر نان ونفقہ میں سے جو شئی مرد پر واجب ہے وہ تو مرد کو مہیا کرنی ضروری ہے۔ لیکن فضولیات اور تنعمات کا خرچہ شوہر کے ذمہ نہیں۔ وہ عورت اپنے مال میں سے کرے۔ وہ کون شئی اشیأ ہیں جن کا مہیا کرنا مرد کے ذمہ ضروری نہیں۔

" سب فضول اخراجات اور تمامی تنعمات کا خرچ بذمہ شوہر سمجھتی ہیں۔ خصوصی چھالیہ یا بعض چائے وکافی میں اس قدر زیادتی کرتی ہیں کہ خود بھی کھاتی پیتی ہیں اور آنے جانے والوں کو بھی تقسیم کرتی ہیں۔ اور یہ شوہر کے ذمہ جرمانہ سمجھتی ہیں۔ حالانکہ فقہأ نے یہاں تک تصریح کردی ہے کہ قہوہ اور حقہ اور

موسمی پھل بھی شوہر کے ذمہ نہیں، اگرچہ قہوہ اور حقہ کی عادت بھی ہو اور اُس کے چھوٹنے سے تکلیف ہو تب بھی شوہر کے مال میں یہ صرف نہ ڈالا جائے۔ . . .

" شوہر ان مصارف میں سے جتنے کا متحمل ہو جائے اُس کا احسان ہے اور شوہر کی شان کے لائق بھی یہی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ وسعت دے تو بی بی کو کہ اُس کے لیے سرمایۂ راحت پہنچانے میں دریغ نہ کرے۔ مگر عورت کو بھی مناسب نہیں کہ اس راحت پہنچانے کا یہ صلہ دے کہ اُس کو کلفت پہنچائے۔"

مجدد تھانوی نے فرمایا :۔ (ص ۱۸۴)

" بری کے جوڑے انبار کا انبار اُن کے صندوقوں میں ذخیرہ رہتا ہے پھر بھی روزانہ شوہر سے جوڑے بنوانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ شوہر کے گھر کے جوڑے جب تک موجود رہیں اُس وقت شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں۔ اور یوں وہ بنا دے اُس کا احسان ہے۔"

" اسی طرح عید بقر عید کے لیے شادیوں میں شرکت کے لیے مستقل جوڑا بنانا شوہر کے ذمہ نہیں تو اس کے مال میں سے بلا اُس کی رضا کے بنانا بھی عورت کے لیے جائز نہ ہوگا۔" (ص ۱۸۵)

ان سب چیزوں سے زیادہ ایک بڑی چیز کی بابت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا

" اکثر عورتوں کو بیکار چیزوں کی بے حد حرص ہوتی ہے کہ خواہ ضرورت بھی نہ ہو بس پسند آنے کی دیر ہے کہ فوراً ہی خرید لیتی ہیں اور ذخیرہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ پھر لطف یہ کہ نہ وہ کام میں آتی ہیں نہ اُن کی حفاظت کرتی ہیں، یوں ہی ضائع ہو جاتی ہیں۔ تو اس طرح سے خاوند کے مال کو اڑانا قیامت میں موجب باز پرس ہے۔ حدیث المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا الخ میں اس کی تصریح ہے۔

نان و نفقہ کے علاوہ بھی عورت کو بعض دوسرے اخراجات کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کو خرچ کرنے کی اجازت نہیں، لہٰذا بیچاری اُن اخراجات کے لیے رقم کہاں سے لائے۔ علاوہ ازیں کسی مدرسہ میں چندہ دینا ہوتا ہے، مسجد کے اخراجات کے لیے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بھی عورتوں کو چندہ وغیرہ دینا پڑتا ہے جس کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورتیں یہ رقم کہاں سے لائیں۔ حکیم الامت تھانویؒ نے اس بارہ میں بہت مفید مشورہ دیا ہے جو حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ فرمایا :۔

" چونکہ ایسے مصارف دینیہ و دنیویہ کی اکثر حاجت واقع ہوتی ہے۔ اور اکثر عورتوں کے پاس

جداگانہ مال نہیں ہوتا۔ اس لیے مردوں کو مناسب ہے کہ نفقۂ واجبہ کے علاوہ حسب وسعت کچھ خرچ ایسے مواقع کے لیے جداگانہ بھی دے دیا کریں۔ پھر اس کا حساب نہ لیا کریں تاکہ وہ اپنی مرضی کے موافق آزادی کے ساتھ بے تکلف ایسے مصارف میں صرف کر سکیں۔"

"نیز شوہر کے ذمہ عورت کے مملوکہ زیور کی زکوٰۃ یا اُس کی طرف سے صدقۂ فطر یا قربانی واجب نہیں۔ سو اگر ایسی رقم ان کو مل جایا کرے گی تو ان واجبات کی ادائیگی میں ان کو سہولت ہوگی، لیکن چونکہ شوہر پر واجب تو ہے نہیں اگر شوہر نے نہ دیا تو عورت اپنا زیور بیچ کر یہ سب حقوق اس سے ادا کرے۔ شوہر کے مال سے بلا اُس کی رضا کے ان عبادات میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا خوب سمجھ لینا چاہیئے۔ عورتیں اس میں سخت بے احتیاطی کرتی ہیں اور اس کے ناجائز ہونے کا ان کو وسوسہ تک بھی نہیں آتا۔ گویا شوہر کے مال کا اپنے کو بالکل مالک سمجھتی ہیں۔ سو یہ بنا ہی باطل ہے" (ص۱۸۵-۸۶)

عورت کا ایک اور حق — مہر

اسلام میں عورت کا ایک اور حق جو مرد پر واجب ہے، مہر ہے۔ اسلام میں اس کی سخت تاکید آئی ہے، بلکہ حدیث میں اس کو ادا نہ کرنے کی نیت سے اگر مقرر کر لیا تو بڑی سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

"جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اُس کا کچھ مہر ٹھہرائے۔ پھر یہ نیت رکھے کہ اس کے مہر میں سے اس کو کچھ نہ دے گا یا اُس کو پورا نہ دے گا تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا اور اللہ تعالےٰ سے زانی ہو کر ملے گا۔"

(کنز العمال جلد ۸ ص۲۴۸ بحوالہ اصلاح انقلاب امت جلد ۲ ص۱۲۷)

بلکہ حدیث رسولؐ کی تصریح کے مطابق نکاح اور زنا میں فرق ہی مہر سے ہوتا ہے چنانچہ حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا:-

"کتنی بڑی سخت وعید ہے کہ باوجود صورت نکاح پھر اس شخص کا شمار زانیوں میں ہوا تو کیا اب بھی یہ کوتاہی قابل تدارک نہیں ہے۔ اور ہر چند کہ عمل میں اور وعید میں من وجہ تعلق معلوم کرنے کی ضرورت نہیں لیکن تبرعاً ایک ظاہری وجہ پر متنبہ بھی کرتا ہوں۔ اس سے پہلے دو مقدمے جاننا چاہیئے" ایک یہ کہ بتصریح حدیث نکاح اور زنا میں فرق کرنے والے یہ امور ہیں۔ ولی بعض صورتوں میں اور دو گواہ اور مہر ...... دوسرا یہ کہ مہر مقرر کرنا ایک عمل ہے اور جب نیت دینے کی نہ ہو تو یہ مقرر کرنا

معتبر نہ ہوا۔ دوسرے مقدمہ کی رو سے۔ پس گویا مہر مقرر ہی نہیں ہے۔ اور مہر مقرر نہ کرنا خاصہ زنا کا ہے، مقدمہ اول کی رو سے۔ پس اس حیثیت خاص سے یہ نکاح مشابہ نکاح کے ہوا۔ اس لیے ناکح کو زانی فرمایا گیا۔ مراد یہ کہ مشابہ زانی کے ہے۔" (اصلاح انقلاب امت جلد ۲ صـ ۱۲۶)

مہر ادا نہ کرنے والا خائن اور چور بھی ہے

مہر ادا نہ کرنے کی نیت رکھنے والا نہ صرف زانی ہے بلکہ چور اور خائن بھی ہے یعنی ایسے شخص کے بارہ میں دو وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

"اسی حدیث مذکور میں ایک جزو اور بھی ہے وہ یہ کہ اگر کسی سے کوئی مال خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے، یا کسی کا کچھ دین ہو اور وہ اس کے ادا کی نیت نہ رکھے، یا کسی سے کچھ قرض لیا ہو اور اس کو ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خائن اور چور ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ مہر ایک دین ہے۔ جب اس کے ادا کی نیت نہ ہوئی تو حدیث کے اس دوسرے جزو کے مطابق یہ شخص خائن اور چور بھی ہوا تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوئے۔ زانی ہونے کا اور خائن اور چور ہونے کا۔" معلوم ہوا کہ مہر نہایت ضروری حق ہے عورت کا لہٰذا حقِ مہر مقرر کرتے وقت نیت ادا کی ہو اور کوشش یہ کرنی چاہیے کہ مہر جلد از جلد ادا کر دیا جائے۔ "لیکن بعض لوگ گفتگو میں بے دھڑک کہہ دیتے ہیں یہاں کون لیتا ہے۔ کون دیتا ہے۔۔۔۔ تو یہ لوگ اپنے اس اعتقاد کا صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے۔ دینے لینے کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ سو اول تو فی نفسہٖ بھی یہ دعویٰ غلط اور باطل ہے۔ مہر بنصِ شارع حق واجب اور لازم ہے اور مثل دیگر دیون مفترض الاداء۔"

مہر ادا کی نیت نہ رکھنے کا مطلب

اسی وجہ سے مہر اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق مقرر کرنا چاہیے اور ادا کرنے کی مصمم نیت رکھنی چاہیے۔

"مصمم نیت اسی عمل کی ہو سکتی ہے جس پر عادتاً قدرت ہو ورنہ نیت کا محض تخیل ہوتا ہے تحقق نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو سو روپیہ دینے کی قدرت نہ ہو وہ عادۃً لاکھ سوا لاکھ بلکہ دس ہزار اور پانچ ہزار دینے پر بھی قادر نہیں۔ جب قادر نہیں تو بحکم مقدمہ مذکورہ وہ اس کے ادا کی بھی نیت نہ رکھے گا۔" (صـ ۱۲۸)

شریعت میں کثرت مہر کی ناپسندیدگی

لہٰذا قلیل اور کم مہر مقرر کیا جائے" تاکہ نہ تو

نیت میں فتور آئے اور نہ ہی ادا کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ لوگوں کی اسی کمزوری کے پیشِ نظر کہ زیادہ رقم کی ادائیگی میں بعض دفعہ دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ حدیث میں زیادہ مہر مقرر کرنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور کم مہر کی ترغیب دی گئی ہے۔

" اسی واسطے حدیثوں میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہت اور کم ٹھہرانے کی ترغیب آئی ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا کہ مہروں میں زیادتی مت کرو، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کی بات یا اللہ کے نزدیک تقویٰ کی بات ہوتی تو سب سے زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کسی بی بی کا اور اسی طرح کسی بیٹی کا مُہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں ہوا (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

" عورت کا مبارک ہونا یہ بھی ہے کہ اُس کا مہر آسان ہو۔"

" ایک اور حدیث میں ہے کہ اچھا مہر وہ ہے جو آسان اور قلیل ہو۔ (کنز العمال ص ۲۴۸) اور حدیث میں ہے کہ آسانی اختیار کرو مہر میں (کنز ص ۲۴۹) اور اگر حضرت عمرؓ کی روایت پر کسی کو بڑھیا کے مشہور اعتراض کے بعد حضرت عمرؓ کے رجوع کا شبہ ہو تو جواب اُس کا یہ ہے کہ یہ رجوع اس کی ترجیح یا اُس کی ضد ہے کراہت نہیں ہے۔ بلکہ پہلے حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہو گئی تھی کہ اس کو ایک قانون بنا دیں کہ مقدار خاص سے زیادہ مقرر کرنا باطل قرار دیا جائے اور اُس کو واجب ہی نہ کہا جائے۔ سو اس سے آپ نے رجوع فرما لیا یعنی ایسا قانون نہیں بنایا۔"

دین کے بارہ میں دیدہ دلیری

اس دین ناآشنا معاشرہ میں ہر شخص اپنے آپ کو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے برابر سمجھتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ کوئی اُنہیں روکتا بھی نہیں کہ اللہ کے بندو! دین میں اس طرح دیدہ دلیری سے بات نہ کیا کرو۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں صحت کے بارہ میں جو کہہ دیں ہم نے کبھی اس میں دخل اندازی نہیں کی۔ انجینئر صاحب اگر اپنے فن کے بارہ کوئی مشورہ دیں تو ہم اُسے حتمی فیصلہ سمجھتے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں اگر کوئی فقیہ یا عالم دین جس کی پوری زندگی علم دین کے حصول میں گذری ہے، کوئی دین کی بات بتائے جو ہمارے مزاج یا رسم و رواج کے خلاف ہو تو ہم اُس پہ طرح طرح کے اعتراضات کرنے شروع کر دیتے ہیں اور اس کی بات

کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انہی مسائل میں سے جن میں ہم رسم ورواج کو ترجیح دیتے ہیں ایک مہر کا مسئلہ بھی ہے۔ لڑکے والوں کی حیثیت کروڑوں میں ہوگی۔ شادی پر وہ لاکھوں روپے صرف کردیں گے۔ اپنی ہونے والی بہو کو زیور تولوں میں نہیں سیروں میں ڈالیں گے۔ لیکن جب مہر کا معاملہ آئے گا تو کہیں گے کہ شرعی مہر ۳۲ روپے لکھ لو۔ معلوم نہیں یہ ۳۲ روپے شرعی حق مہر کہاں سے انہوں نے نکال لیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم از کم مہر دس درہم ہے۔ اگرچہ امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے کم بھی ہے لیکن ہندو پاکستان کی اکثریت حنفی ہے لہٰذا دس درہم سے کم مہر نہیں ہونا چاہیئے اور اختلاف کی صورت میں احوط بھی یہی ہے۔ دس درہم کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ۲ تولہ ۸ ماشہ ۵ رتی چاندی کی قیمت لگائی جائے چونکہ اس زمانہ میں قریباً ۱۶۵ روپے بنتی ہے۔ اس سے کم بیوی کا مہر نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ۳۲ روپے لوگوں کی زبان پر کچھ ایسا چڑھا ہوا ہے کہ وہ اسی کو شرعی حق مہر کہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ علمائے کرام بھی اس کی تصحیح نہیں فرماتے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص دس درہم سے کم مہر مقرر کرتا ہے تو بھی ۱۰ درہم ہی واجب ہوں گے۔

مہر اتنا ہو کہ ادائیگی میں گرانی نہ ہو

بہرحال مہر ۱۰ درہم سے کم نہیں ہونا چاہیئے اور مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے اور اتنا ہونا چاہیئے کہ مرد آسانی سے ادا کر سکے۔ اتنا زیادہ بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ ادا کرنے میں گرانی محسوس ہو۔ چنانچہ حکیم الامت تھانویؒ نے اپنے بارہ میں لکھا ہے کہ

” خود مجھ کو اس کا اندازہ ہوا کہ میری ایک اہلیہ کا مہر پانچ ہزار اور دوسری کا پانچ سو تھا۔ بفضلہ تعالیٰ دونوں ادا کئے گئے مگر اول مہر کے ادا میں جو کچھ گرانی ہوئی اگر والد صاحب مرحوم کا ذخیرہ اس میں اعانت نہ کرتا تو وہ گرانی ضرور کدورت کی صورت پیدا کرتی۔ اور دوسرا مہر صرف فتوحات یومیہ کی آمدنی سے بہت آسانی سے ادا ہو گیا۔ اس کا کوئی قابل ذکر بار قلب پر نہیں پڑا۔“ (ص ۱۳۳)

کثرت مہر کی خرابیاں

گویا کثرت مہر فی نفسہٖ خلاف سنت ہے۔ علاوہ ازیں وہ بہت سی خرابیوں کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔ وہ خرابیاں دینی بھی ہیں اور دنیوی بھی۔ دینی خرابی تو یہ ہے کہ ادا نہ کرنے کے ارادہ سے اگر زیادہ مہر مقرر کیا تو زانی، خائن اور چور بنا۔ اور دنیوی خرابی یہ ہے۔ کہ اگر میاں بیوی کی بن نہ آئی تو صرف اس لیے طلاق نہیں دی جاتی کہ مہر زیادہ ہے ادا نہیں کر سکتا یا ادا کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اور خطرہ یہ ہے کہ بیوی کے والدین یا عزیز

اقارب دعویٰ کر کے پریشان کریں گے ۔ لہٰذا

" کثرت مہر بجائے اس کے کہ عورت کی بہتری کا سبب ہوتا اُلٹا اس کی تکلیف کا سبب ہو گیا۔ بعض عقلاؔ اس کثرت مہر میں یہی مصلحت سمجھتے ہیں کہ مرد عورت کو چھوڑ نہ سکے گا۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ چھوڑ نہ سکنا ہر جگہ تو مصلحت نہیں ہوتی مثلاً اس صورت میں کیا مصلحت ہے ......

" یہ خرابیاں تو کثرت مہر کی اس وقت ہیں۔ جب ادا نہ کیا جائے یا ادا نہ کرنے کا ارادہ نہ ہو۔ اور اگر مرد پہ خدا کا خوف غالب ہو اور حقوق العباد سے اُس نے سبکدوش ہونا چاہا اور ادا کا قصد کیا تو اس وقت یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ اتنی مقدار کا ادا کرنا اس کے تحمل سے زیادہ ہوتا ہے۔ تو اس پر فکر اور تردد کا بار عظیم پڑتا ہے اور کما کما کر ادا کرتا ہے۔ مگر مقدار زیادہ ہونے سے وہ ادا نہیں ہوتا اور تمام تر اسی کا ذخیرہ اسی میں کھپتا چلا جاتا ہے اور طرح طرح کی تنگی برداشت کرتا ہے۔ پھر اس سے دل میں تنگی اور پریشانی ہوتی ہے۔ یہ تو مرد کی تکلیف ہوتی "

" پھر چونکہ سبب اس تمام تر تکلیف کا وہ عورت ہے اس لیے انجام کار اس مرد کے دل میں اس سے انقباض پھر انقباض سے تنفر پھر عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پس جو نکاح کہ موضوع تھا مصالح زوجین اور اتحاد باہمی کے لیے وہ بالواسطہ اس کے ایک حق خاص یعنی مہر کے اس طریق پر سبب ہو گیا اس کے ضد یعنی عداوت و کدورت کا۔ پس یہ صریح قلب موضوع (اُلٹا معاملہ) ہے جس کا سبب کثرت مہر ہے۔ پس قلب موضوع جب قبیح ہے اُس کا سبب بھی قبح سے خالی نہ ہو گا۔ اس حدیث کا یہی مطلب ہے۔ (صرف ترجمہ نقل کیا جاتا ہے)

" مہر کے اندر آسانی یعنی کمی اختیار کرو اس لیے کہ مرد عورت کو (زیادہ مہر دے) بیٹھتا ہے حتیٰ کہ اُس کے دینے سے اُس کے نفس کے اندر عورت کے متعلق دشمنی باقی رہ جاتی ہے۔ "

" اور اوپر جو خطبہ حضرت عمرؓ کا گذرا اُس میں یہ بھی ہے۔

إِن أَحدكم ليغلي صدقة المرأة حتى يكون لها عداوة في نفسه

تم میں سے کوئی عورت کو کثیر مہر ادا کرتا ہے یہاں تک کہ مرد کے دل میں عورت کے لیے عداوت بیٹھ جاتی ہے۔ "

ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت والاؒ نے کس حکمت کے تحت کثرت مہر کی دینی اور دنیوی خرابیوں اور

مفاسد کو عیاں کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دین میں واقعی بڑی برکت ہے اور ہم جو رضائی انفاق کے بجائے ریائی انفاق کے تحت دنیا کی نگاہ میں بڑا بننے کی خاطر یا معاشرہ میں اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے دین کے برعکس جو تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ انجام کار ان کا رسوائی اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔

چنانچہ یہی کثرت مہر اگر کوشش کے باوجود ادا نہ ہو سکا تو پھر

،، نفس میں ایک دوسری کم ہمتی جو خلاف غیرت ہے پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ عورت سے معاف کرایا جائے۔ پس اس سے درخواست کی جاتی ہے۔ سو اول تو اس درخواست کا پورا کرنا اس کے قبضہ میں ہے۔ اگر وہ پورا نہ کرے اُس کو اختیار ہے۔ دوسرے خود یہ درخواست ہی ذلت سے خالی نہیں۔ اس لیے حق تعالیٰ نے جہاں اس بار دوش سے سبکدوش کی دو صورتیں فرمائی ہیں۔

اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ ۔ (البقرۃ ! ۲۳۷)

مگر یہ ہے کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا رکھنا اور توڑنا ہے۔ (یعنی شوہر)

اس کے بعد ہی دوسری صورت کی ترجیح کی تصریح ہے:۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اس کے ساتھ ہی پہلی صورت کی اباحت بھی عام مفہوم سے ارشاد فرما دی ہے

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ پہلی صورت باوجود مباح ہونے کے مرجوح اور ناپسندیدہ ہے کیونکہ یہ غیرت کے خلاف ہے۔ تو دیکھئے یہی کثرت بعض صورتوں میں اخلاقی کمزوری کا بھی سبب بن گئی جو کہ پسندیدہ نہیں سمجھی گئی۔ اور یہ بھی اُس وقت تک ہے جب کہ مرد اس طلب معافی میں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا لحاظ رکھے فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْہُ نَفْسًا ،، (ص ۱۳۳-۱۳۴)

کثرت مہر کی مصلحتیں

امت کے اس حکیم نے ایک اور حکمت آمیز بات کی طرف ارشادہ فرمایا اور دفع دخل مقدر کے طور پہ اس خدشہ اور وسوسہ کا جواب بھی دے دیا کہ اگر کثرت مہر میں کچھ خرابیاں ہیں تو کچھ فائدے بھی تو ہیں اسی طرح کم مہر میں اگر کچھ مصلحتیں ہیں تو کچھ مفاسد بھی ہیں۔ مثال کے طور پہ اگر مہر قلیل ہو تو شوہر پہ اس کی ادائیگی میں کوئی

بار نہیں پڑتا لہذا اُس کو کوئی امر مانع نہیں ہوتا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کرے۔ لیکن اگر مہر کثیر ہو گا تو وہ عورت کو طلاق دینے میں مانع ہو گا، کیونکہ اُس کی ادائیگی شوہر پہ بار ہو گی۔

”اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ بہت ہی قلیل ہو بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتنا زیادہ نہ ہو جو اس کی دینی اور دنیوی تباہی کا سبب بن جائے۔ عدم ادا کی نیت میں بھی، ادا کی کوشش میں بھی اور بری ہونے کی تدبیر میں بھی بلکہ اس میں اعتدال ہو جس میں تمام مصالح محفوظ ہیں۔“

”دوسرے جس شخص کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو اُسے کوئی چیز کسی امر سے نہیں روک سکتی۔ کیا ایسے واقعات پیش نظر نہیں ہیں کہ بڑے بڑے مہروں کے مقروض ہیں باوجود اس کے منکوحہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتے اور نہ دوسری طرف متوجہ ہونے سے رُکتے ہیں۔ خواہ وہ حلال ہو یا حرام۔ ایسے ظالموں کا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ خواہ اس وجہ سے کہ وہ صاحب وجاہت ہے اس سے ڈرتے ہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں اور نرا جیل خانہ کرلنے سے کیا ملتا ہے۔ پھر داماد کے جیل جانے سے اپنی بیٹی کو کیا ملا۔“

ایک خود فریبی

حضرتؒ والا نے اس سلسلہ میں ایک خود فریبی بلکہ خدا فریبی کی طرف بھی توجہ دلائی کہ جب ایک بی بی کا حق مہر کثیر ہو۔ اور خاوند صاحب ادا تو کر نہیں سکتے یا ادا کر سکتے ہیں لیکن اتنی گراں رقم ادا کرنے میں گرانی محسوس کرتے ہیں، اس وجہ سے بیوی سے معافی کی درخواست کرتے ہیں یا پھر جبراً اس سے معاف کرانے کی کوشش کرتے ہیں وہ بیچاری جبر کی وجہ یا اس وجہ سے کہ اگر معاف نہ کیا تو خاوند صاحب ناراض ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ عائلی زندگی اجیرن ہو جائے۔ خاوند صاحب کو وہ مہر معاف کر دیتی ہے تو کیا مہر کی ایسی معافی شریعت کی نگاہ میں قابل قبول ہے فرمایا:۔

”طیب نفس کی رعایت کرے (یعنی یہ دیکھے کہ عورت نے خوش دلی سے معاف کیا ہے۔) ورنہ اگر غیرت کے ساتھ خوف خدا بھی مفقود ہے تو صرف لفظی معافی کی ناجائز تدبیریں لگائے گا یعنی یا عورت کو دھوکا دے گا یا اُس کو دھمکا دے گا، اس پہ جبر کرے گا جس سے وہ معاف کر دے۔ مگر یاد رہے کہ ایسی معافی عنداللہ ہرگز معتبر و مقبول نہیں۔ اس صورت میں یہ اللہ کے نزدیک اپنی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبا رہے گا۔ اور اگر اُس کو غیرت بھی ہوئی اور خشیت بھی ہوئی مگر وسعت نہ ہوئی ——— اس کی پوری مصیبت ہے کہ تمام عمر اسی میں گھلا کیا کہ میں کس طرح اس حق سے سبکدوش ہوں۔ دیکھئے

اس کثرت سے کیسے پھل پھول کھلے ہیں۔ گو اس صورت میں اگر یہ نیت پکی رہی کہ جب ہوگا اور جتنا ہوگا ضرور دے گا اور تھوڑا تھوڑا دیتا بھی رہا مگر پورا نہ ہو سکا تو آخرت میں امید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا، لیکن اس بے چارہ کی دنیوی زندگی تو تلخ ہو کر رہ گئی۔ اور جب شوہر کی زندگی تلخ ہے تو بی بی کی زندگی کیا بالطف ہو سکتی ہے۔"

کثرت مہر رسم پرستی ہے

ایسی تنقیحات نکالنا صرف تھانوی حکیم الامت ہی کا کام ہے۔ مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث اور اُس کے حسن و قبح کو واضح طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ آدمی کے ذہن میں کوئی تشنگی نہیں رہتی۔ لیکن انسانی ذہن رسم و رواج کے چنگل چھٹکارا حاصل نہ کرنے کے لیے اور اپنی جھوٹی تسلی کے لیے ہر بات میں جواز کی صورتیں نکالتا رہتا ہے۔ لہٰذا کہنا شروع کر دیا کہ قلت میں ذلت ہے اور کثرت میں عزت۔ حالانکہ یہ بھی ذہنی تسلی کی بات ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے، کیونکہ

"اوّل تو ہر قلت میں جب کہ درجۂ اعتدال پر ہو ذلت نہیں، دوسرے اگر یہ مصلحت بھی ہوئی تو مفاسد بے شمار ہوئے تو وہ مصلحت کب قابل تحصیل ہوگی تیسرے اگر تحصیل مصلحت تفاخر کے ساتھ قدرت علی الاداء کی کچھ بھی رعایت نہ ہو تو بقول میرے استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ) کے پھر اسی مقدار پر کیوں بس کی جاتی ہے۔ اس سے زیادہ مقدار میں اس سے زیادہ مقدار میں اس سے زیادہ عزت اور فخر ہے۔ تو بہتر ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا خراج بلکہ اس کا بھی دو چند بلکہ چند در چند مقرر کیا جائے کیونکہ نہ دینا نہ لینا۔ صرف نام ہی نام۔ تو اچھی طرح سے کیوں نہ نام کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رسم پرستی ہے ورنہ واقع میں مصلحت کچھ نہیں اور خرابیاں ہر قسم کی ہیں۔ لہٰذا اس کے واجب الاصلاح ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ پس رسم کو چھوڑو اور عقل و شرع کا اتباع کرو۔" (ص ۱۳۵)

مرض الموت میں مہر معاف نہیں ہوتا

مہر کم ہو یا زیادہ، قلیل ہو یا کثیر اس کی ادائیگی شریعت اسلامیہ کی رو سے ضروری ہے اور اگر مرد ادا کئے بغیر اس دنیا سے انتقال کر گیا تو اُس کے ذمہ یہ قرض رہے گا اور اُس کے ترکہ سے ادا کیا جائے گا۔ لیکن بعض عورتیں اپنے مرض الموت میں اپنے خاوند کو مہر کی رقم معاف کر دیتی ہیں۔ خاوند یہ سمجھتا ہے کہ میں اب آزاد ہو گیا ہوں لیکن معاملہ ایسا نہیں بلکہ

”یہ معافی وصیت للوارث کی فرع (وارث کے لیے وصیت کی ایک صورت) ہے اور یہ بدون رضا دوسرے ورثہ کے ناجائز ہے۔ پس اس معافی سے مہر معاف نہ ہوگا۔ البتہ زوج کو جس قدر میراث میں ملے گا وہ بے شک معاف ہوجائے گا، باقی اس کے ذمہ واجب الادا رہے گا جو دوسرے وارثوں کو دیا جائے گا۔ البتہ اگر سب وارث اس معافی کو جائز رکھیں تو کل معاف ہوجائے۔ اور اگر بعض نے جائز نہ رکھا یا بعض نابالغ ہوں تو اُن کے حصہ کے قدر معاف نہ ہوگا۔“

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شوہر مرض الموت میں مبتلا ہوتا ہے۔ عورت یہ سمجھتی ہے کہ اب یہ اس دنیا سے جا رہا ہے یا شوہر کے سکرات موت سے متأثر ہوکر عورت مہر معاف کر دیتی ہے عزیز و اقارب اور اہل خانہ یہ سمجھتے ہیں کہ مہر معاف ہوگیا لیکن

”اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر خوشی سے (یعنی طیب نفس سے) معاف کردے تو معاف ہوجاتا ہے۔ اور اگر عورتوں کی گھیرا گھیری سے معاف کرے تو (اگرچہ لوگوں کے نزدیک معاف ہوگیا) عنداللہ معاف نہیں ہوتا۔ اوپروالوں کو ایسے موقع پر اس طرح مجبور نہ کرنا چاہیے بلکہ بعض مواقع پر معاف کرنا مصلحت بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً میراث کا حصہ زوجہ کا اس کی گذر اوقات کے لیے کافی نہیں اور ورثاً سے بھی امید زندگی کفالت کی نہیں ایسے موقع پر تو بجائے ترغیب معافی کے معاف نہ کرنے کی رائے دینا مناسب ہے۔“

(ص ۱۳۷-۱۳۸)

نابالغہ عورت معاف کیا ہوا معاف نہیں ہوتا

مہر کی معافی کے سلسلہ میں حکیم الامت تھانویؒ نے ایک اور اہم بات بھی ارشاد فرمائی جس سے اکثر لوگ ناواقف و ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کہ بعض لوگ ویسے ہی طلاق دینے کے وقت اپنی نابالغ سے مہر معاف کرا لیتے ہیں۔

”سو یہ معافی معتبر نہیں لان تبرع الصغیر باطل (یعنی بچہ کا صدقہ وغیرہ کرنا باطل ہے) بعض جگہ اس سے بڑھ کر ہوتا ہے کہ ولی زوجہ نابالغہ کا طلاق کا مطالبہ زوج سے کرتا ہے اور یہ ولی ہی مہر معاف کر دیتا ہے۔ سو اس صورت میں اگر زوج نے طلاق دے دی تو طلاق تو واقع ہو جائے گی مگر مہر ساقط نہ ہوگا۔“ (صـ۱۳۶)

مہر لینا کوئی عیب نہیں

یہ بات خاص طور پہ ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ

عورت کے مرد پہ دو حق ہیں۔ ایک نان ونفقہ اور دوسرا حق مہر۔ لہٰذا ان دونوں کا مطالبہ عورت کا بنیادی حق ہے اور اگر عورت کو مانگے یا بے مانگے اُس کا شوہر اُس کو مہر دے تو وہ لینے میں نہ ہچکچائے بلکہ لے لے۔ کیونکہ بعض عورتیں مہر مانگنا یا لینا عیب سمجھتی ہیں۔ چنانچہ مجدّد تھانویؒ نے فرمایا:

"عورتیں مہر مانگنے کو یا بے مانگے لے لینے کو عیب سمجھتی ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو اُس کو بدنام کرتی ہیں، سو اپنے حق واجب کا مانگنا یا وصول کر لینا جب شرعاً کچھ عیب نہیں تو محض اتباعِ رسم سے اُس کو عیب سمجھنا گناہ سے خالی نہیں۔"

نفقہ اور مہر دو الگ حقوق

اسی طرح نفقہ کا معاملہ ہے۔ بعض عورتیں اس معاملہ میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر ہم نے مہر لے لیا تو پھر خاوند کے ذمہ ہمارا کوئی حق نہ رہے گا یا ہم نے مہر لیا تو نان ونقطہ کا حق شوہر سے ساقط ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں حقوق الگ الگ ہیں:

"ایک حق دوسرے پر مبنی نہیں۔ مہر لینے سے دوسرا کوئی حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور اس اعتقاد باطل کا یہ اثر ظاہر ہوا ہے کہ شوہر مہر ادا کرتا ہے اور عورت نہیں لیتی اور نہ معاف کرتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر شوہر پر ادائے حق کا غلبہ ہو اور مسائل سے ناواقف ہو تو بے حد پریشان ہوتا ہے کہ اب میری ذمہ داری سے فراغت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

یہ سوال کتنا پیچیدہ اور گنجلک ہے، لیکن حضرت والاؒ نے اس کا کتنا آسان جواب ارشاد فرمایا:

"اس صورت میں اگر شوہر مہر کا مال زوجہ کے سامنے اس طرح رکھ دے کہ وہ اس کے قبضہ پر قادر ہو اور رکھ کر یہ کہہ دے کہ یہ تمہارا مہر ہے، اور یہ کہہ کر اس مجلس سے اُٹھ جائے تو مہر ادا ہو گیا، خواہ عورت اُٹھا لے یا نہ اُٹھائے۔ اگر اُس نے نہ اُٹھایا اور دوسرا کوئی اُٹھا کر لے گیا تو وہ زوجہ کا ہو گیا۔ اور اگر یہ خیال ضائع ہونے کے خاوند اٹھا لے گا تو وہ اس کے پاس زوجہ کی امانت رہے گا، شوہر کی ملک نہ ہو گا۔"

عورت کی اولاد کو مہر کی رقم نہ دینا

بعض لوگ جن میں دیندار حضرات بھی شامل ہیں۔ دین سے ناآشنائی کے باعث ایک غلطی کرتے ہیں کہ اگر فوت شدہ بیوی کے وارثان متوفیہ کے والدین یا بھائی وغیرہ ہوں تب تو ان کے مطالبہ پر اُن کو مہر کی رقم سے اُن کا حصہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اُسی شوہر کی اولاد وارث ہو، تو چونکہ وہ اولاد مجھے

کے ناطے مہر کی رقم کا مطالبہ نہیں کر سکتے اس وجہ سے باپ اُن کی متوفیہ والدہ کی مہر کی رقم کا حصہ ادا نہیں کرتا۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ باپ کی نیت اُس رقم کے کھانے کی ہو، بلکہ بعض دفعہ بے شعوری سے مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہے۔ لیکن اُس کا ایسا کرنا۔

"سراسر ظلم اور خیانت ہے۔ (یہ رقم) ان کا حق امانت ہے۔ اُس کو اولاد کے نام سے جمع رکھنا چاہیئے اور خاص اُن کے مصالح میں صرف کرنا چاہیئے۔ خود خرچ کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اُن بچوں کو جو رقم ماں کی طرف سے میراث میں پہنچی ہو ان سب کی حفاظت اس (باپ) کے ذمہ فرض ہے۔ اس میں بلاوجہ خرچ کرنا حرام ہے۔"

شادی سے قبل لڑکی والوں سے رقم لینا

حضرت تھانویؒ واقعی حکیم الامت تھے۔ ان کی دوررس نگاہ کس طرح معاشرہ کی نبض پر تھی اور کیسی اچھی تشخیص فرما کر اُن بیماریوں کے کیسے اچھے علاج شریعت کی روشنی میں تجویز فرماتے اور کوتاہیوں اور غلط فہمیوں بلکہ بدفہمیوں کا کس طرح ازالہ فرمایا۔ اسی طرح ایک اور غلط فہمی بلکہ بدفہمی جو بعض حضرات میں بلکہ بعض علاقوں میں بکثرت پائی جاتی ہے جس میں نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی جن میں علماً اور مشائخ بھی شامل ہیں، مبتلا ہوتے ہیں کہ رشتۂ نکاح سے قبل یا رخصتی سے پہلے کچھ رقم اس مقصد کے لیے لی جاتی ہے کہ وہ شادی کے اخراجات میں خرچ کی جائے گی۔ اور جب اُن کو اس بات سے روکا جاتا ہے کہ یہ رشوت اور حرام ہے۔ تو وہ اپنی بدفہمی سے اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ رقم جو ہم نے شوہر سے لی ہے یہ مہر کی رقم ہے یا مہر کی رقم کا ایک حصہ ہے۔ یہ تاویل دراصل اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے یا پھر جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکہ دینا ہے کیونکہ

"اگر یہ واقعی مہر ہے تو اس کی مالک عورت ہے۔ اور کسی کے مال میں اس کے خوش دلی سے اجازت دینے کے بغیر تصرف کرنا حرام ہے۔ سو ان لوگوں نے عورت سے کب پوچھا ہے اور اُس نے کب خوشی سے اجازت دی ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اذن لاحق (بعد میں اجازت دینا) بھی مثل اذن سابق (پہلے اجازت دینے) کے ہے۔ اور اذن دلالۃً بھی مثل اذن صراحۃً کے ہے (یعنی عرف عام کے اعتبار سے جس کو اجازت سمجھا جائے وہ بالکل واضح طور پر اجازت دینے کے مانند ہوتا ہے) تو جواب یہ ہے کہ یہ بالکل مسلم ہے، لیکن اذن کی حقیقت کا تو پایا جانا ضروری ہے اور حقیقت اس کی وہاں ہوگی جہاں

عدم اذن پر بھی قدرت ہو۔ سو ظاہر ہے کہ یہاں بوجہ اتباع رسم کے اس کے روکنے یا اس کا ضمان (جرمانہ) اور بدل لینے کی عورت ہی نہیں۔ پس اذن کہاں پایا گیا؟ خلاصہ یہ کہ اگر یہ مہر نہیں تو رشوت ہے اور اگر مہر ہے تو غصب ہے۔ اور دونوں حرام ہیں۔

حرص سب بیماریوں کا سبب ہے

مردوں کی طرف سے عورتوں پر مہر اور نان و نفقہ کے سلسلہ میں جو زیادتی ہو رہی ہے اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے جس کو امت کے حکیم نے "حرص" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ حرص کی مثال سمندر کے پانی کی ہے۔ سمندر کے پانی کو آپ جتنا پئیں گے اتنی ہی زیادہ پیاس بھڑکتی ہے چنانچہ حدیث میں بھی فرمایا کہ "ابن آدم مال کا اس درجہ حریص ہے کہ اگر اس کے پاس مال کی دو وادیاں بھی بھری ہوں تو تیسری کے لیے بدستور تڑپتا رہے گا۔ اور اس کے پیٹ کو قبر کی مٹی کے سوا کوئی چیز بھر نہیں سکتی۔"

"وادی کہتے ہیں اس نشیبی زمین کو جس میں پانی بہتا ہو جیسے ندی، نالہ تو اس لفظ میں زیادہ مبالغہ ہے کہ اگر اس کے پاس چاندی سونا اس کثرت سے ہو کر پانی کی طرح بہتا ہو تب بھی وہ زیادہ کا طالب رہے گا۔ چنانچہ اگر اس کے پاس دو وادیاں بھی ہوں تو تیسری کا طالب رہے گا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تین بھی ہوں تو چوتھی کی تلاش میں رہے۔" (وعظ علاج الحرص ص ۸)

یہ حرص ہی ہے جو نہ صرف بیوی کا نان و نفقہ اور حق مہر میں زیادتی سکھاتی ہے بلکہ معاشرہ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اپنی مالی اور جاہی منفعتوں کے حصول کے لیے بھی ظلم و استبداد پر اکساتی ہے تھانوی حکیم الامت کے نزدیک اس کا علاج صرف اور صرف دین ہے۔

"ہر حال میں شریعت کے موافق چلو۔ اس میں دین و دنیا کی سب راحت ہی راحت ہے شریعت پر چل کر پریشانی پاس نہیں آسکتی۔"

نفسی اور معاشرتی جتنی بھی پریشانیاں آج معاشرے کو لاحق ہیں ان سب کا سبب صرف حرص ہے۔

"حرص تمام پریشانیوں کی جڑ ہے . . . اور ایسا مرض ہے کہ اس کو "ام الامراض" کہنا چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں، ———— اس کی وجہ سے مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے۔ پھر ان فسادات کی بھی نوبت

نہ آئے (نہ انفرادی، نہ اجتماعی نہ قومی اور بین الاقوامی)

" بدکاری اور چوری وغیرہ کا منشا بھی حرص ہی ہے کہیں حرص مالی اور کہیں حرص لذات۔ نیز اخلاق رذیلہ کی جڑ بھی یہی حرص ہے۔ عارفین کا قول ہے کہ تمام اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر کا منشا بھی ایک گونہ حرص ہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ بھی حرص ہی کی ایک فرد ہے۔ کیونکہ تکبر طلب جاہ کا نام ہے تو یہ جاہ کی ہوس ہے۔ بلکہ غور کیا جائے تو مال کی بھی حرص ہے۔ طلب جاہ اس واسطے کی جاتی ہے کہ صاحب جاہ کو ضروریات معاش سہولت سے مل جاتی ہیں۔ اس کی حاجتیں آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں۔ جو کام دوسروں کا سینکڑوں کے خرچ سے ہوتا ہے وہ صاحب جاہ کی زبان ہلنے سے ہو جاتا ہے۔"

" اس لیے صوفیائے صاحب جاہ کے آداب میں لکھا ہے کہ ایسا شخص اپنے حوائج کو ظاہر نہ کرے کیونکہ اس سے لوگ فکر میں پڑ جاتے ہیں۔ ہر شخص اس کی حاجت کو پورا کرنا چاہے گا۔۔۔۔ امام غزالیؒ نے جاہ کی حقیقت ملک القلوب (دلوں پر قبضہ) لکھی ہے اور ملکِ قلوب سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہمارے کام سہولت سے نکلتے رہیں۔ پس تکبر کا منشا بھی حرص ہوا۔ اور تکبر تمام رذائل کی جڑ ہے۔ تو حرص منشا ہوا تمام معاصی کا۔ مشاہدہ ہے کہ زنا اتفاقی کا منشا بھی حرص ہے اور تفاخر کا منشا بھی یہی ہے کیونکہ مال و دولت کا دکھلانا جمع مال ہی کے بعد ہو سکتا ہے اور وہ جمع ہوتا ہے حرص سے۔۔۔۔۔ یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا کہ حُبُّ الدنیا رأسُ کلِ خطیئۃٍ حب دنیا ہی کا نام تو حرص ہے"

(وعظ علاج الحرص ص ۱۲۰)

یہ بھی حرص ہی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے کسب معاش میں حلال و حرام کی تمیز اٹھا دی۔ حالانکہ خدا سے تعلق رکھنے والی معاشی زندگی کا اہم و اقدم سوال کسب نہیں کسب حلال ہے جس کے بغیر تمام عبادات اپنے ثمرات و برکات سے خالی رہتی ہیں اور دعا جو عبادات کا مغز یا عبدیت و بندگی کی جان ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی نگاہ میں لائق قبول و توجہ نہیں رہتی بلکہ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور بخاری کی وہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ

" ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی کھانے کمانے میں حلال حرام کی بالکل پروا یا تمیز نہ کرے گا"

مشتبہ چیزوں سے پرہیز موجودہ زمانے میں یہی کچھ ہو رہا ہے کہ حلال و حرام کی فکر و تمیز

کے بغیر کسب وحصول یا "معیار زندگی بلند" کرنا کرانا رہ گیا ہے۔ انفرادی طور پہ بھی ایسا ہو رہا ہے اور اجتماعی او حکومتی سطح پر بھی اسی نظریے کی آبیاری کی جا رہی ہے، حالانکہ اسلام میں زندگی کی "بلند معیاری" کے حصول وکسب میں سارا زور حلال وحرام کی تمیز پر ہے۔ حلال وحرام تو بہت بڑی چیز ہے اسلام نے تو "مشتبہ" چیزوں کے قریب جانے سے بھی روکا ہے تاکہ آدمی مشتبہ سے تجاوز کرتا ہوا کہیں حرام میں داخل نہ ہو جائے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے:-

"حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں (جن کا حلال یا حرام ہونا قطعیت کے ساتھ نہیں بتایا گیا) پس جس نے ان مشتبہ چیزوں کے معاملہ میں تقویٰ سے کام لیا، اُس نے اپنے دین کو (حق تعالےٰ کی نظر میں) اور اپنی آبرو کو (لوگوں کی نظر میں) بچا لیا۔ اور جس نے اس کی پرواہ نہ کی بلکہ مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سمجھ لو کہ حرام ہی میں مبتلا ہو گیا۔ جیسے وہ چرواہا جو ممنوعہ چراگاہ کے بالکل کنارے (اپنے مویشی) چراتا ہے۔ اندیشہ ہے کہ ایک نہ ایک دن ممنوعہ حدود میں جا پڑے۔ یاد رکھو! ہر بادشاہ کی ایک محفوظ یا ممنوع چراگاہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالےٰ کی ممنوعہ چراگاہ، اُس کے محارم ہیں (یعنی وہ چیزیں جن کو اُس نے حرام و ناجائز قرار دے دیا ہے)

کسب حرام قبول نہیں

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کسب کی ایسی راہوں سے روکا ہے جس سے دل کا بگاڑ، آپس کا تنفر اور آخرت کی بربادی ہو۔ چنانچہ مختلف احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں شے کی قیمت یا اُس کے کسب کو خبیث یا پلید ٹھیرایا۔ فلاں چیز کی قیمت کی ممانعت فرمائی۔ فلاں چیز کی آمدنی یا کھانے پر لعنت فرمائی، فلاں شے کی بیع یا تجارت کو حرام قرار دیا۔ مثال کے طور پہ آپؐ نے کتے کو خبیث فرمایا، زنا کی خرچی کو خبیث فرمایا، پچھنے لگانے والے کے کسب کو بھی خبیث فرمایا۔ اسی طرح آپؐ نے کتے کی قیمت، زنا کے مہر اور کاہن کی اجرت سے روکا۔ سود کھانے والے پر لعنت فرمائی۔ اور تصویر بنانے والے پر لعنت فرمائی۔ اسی طرح اللہ اور اُس کے رسولؐ نے شراب، مردار، سؤر اور بتوں کی تجارت اور خرید فروخت حرام فرمائی اور ادا نہ کرنے کی نیت سے مہر مقرر کرنے والے کو زانی فرمایا۔ ان سب احادیث میں سارا زور کسب پر نہیں بلکہ کسب حرام سے ممانعت اور احتیاط پر ہے یہاں تک کہ حرام کمائی کو اگر صدقہ کر دے یعنی کسی کار خیر میں دے دے تو وہ بھی عنداللہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

"کوئی شخص حرام مال کماتا ہے پھر اس کو صدقہ کرتا ہے تو ایسا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور نہ ایسے مال کو خود اپنے اوپر خرچ کرنے میں برکت ہوتی ہے۔ اور اگر ایسے مال کو ترکہ میں چھوڑ مرا تو وہ اُس کے حق میں دوزخ کا توشہ بن جاتا ہے کیونکہ خدا برائی کو بُرائی سے نہیں مٹاتا بلکہ بھلائی سے بُرائی کو مٹاتا ہے۔"

رائے پر محنتانہ جائز نہیں

بات درمیان میں آگئی جی چاہتا ہے اجمالی طور پر اس کے بارہ میں بھی کچھ بتا دیا جائے کہ یہ حلال و حرام کی تمیز عوام تو کیا بڑے بڑے مشائخ اور علماء سے بھی اُٹھتی جا رہی ہے۔ "شریعت اسلامیہ میں رائے پر محنتانہ لینا جائز نہیں بہ رشوت محض ہے۔" فرمایا:

"شریعت نے جس چیز کو متقوم (قیمت والی) نہیں قرار دیا اُس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ مثلاً آپ کا حق شفعہ تھا۔ آپ نے سَو روپیہ لے کر اس کو چھوڑ دیا تو اس روپیہ کا واپس کرنا واجب ہے۔ اور حق شفعہ بھی اب باقی نہیں رہا۔ کیونکہ شریعت نے شفعہ کی کوئی قیمت نہیں مقرر کی ہے یا مثلاً کسی نے لڑکی کے عوض روپیہ لیا تو یہ حرام ہے کیونکہ شریعت نے بیٹی (کو اس طرح فروخت کرنے) کی کوئی قیمت نہیں رکھی ہے۔"

یا مثلاً کسی نے حاکم سے سفارش کر دی اور پچاس روپے لیے یہ بھی حرام ہے۔ اکثر لوگ رشوت، مقدمات میں کچھ لینے کو کہتے ہیں حالانکہ یہ بھی رشوت میں داخل ہے۔ حاکم سے سفارش کرنا بھی ایسا ہی فعل ہے کہ شریعت نے کوئی قیمت اس کی مقرر نہیں کی ہے۔ ہاں جس میں کوئی محنت و مشقت ہو اُس کی قیمت مقرر کی ہے۔

اس اصول کے تحت کسی مقدمہ میں کچھ رائے اور مشورہ دینے کا محنتانہ لینا رشوت ہے۔ چنانچہ دنیا دار تو ایک طرف رہے کچھ نام نہاد مولوی بھی محض کسب دنیا کے لیے دین کے مسائل کو چیر پھاڑ کر کسی کی مرضی کے مطابق مسئلہ بتاتے ہیں اور اس کی بھاری قیمت لیتے ہیں حالانکہ

"سچا مسئلہ بتا کر بھی رشوت لینا جائز نہیں چہ جائیکہ دین میں تحریف کر کے۔ حکیم الامت تھانویؒ کی اصلاحی رائے تو اس معاملہ میں یہ ہے کہ مثلاً کتابت کی اُجرت لینا جائز ہے جیسے فرائض (وراثت کا مسئلہ) لکھتے ہیں"

"مگر اس کے اثر پر بھی نظر کیجیے تو یہ بھی بُرائی سے خالی نہیں۔ وہ اثر یہ ہے کہ میں نے خود دیکھا

کہ لوگ مفتی سے فرمائش کرتے ہیں کہ مولانا فلاں وارث کا نام نہ لکھیئے گا۔ ایسی فرمائش اس لیے کرتے ہیں کہ کچھ دیتے ہیں۔ ایک شخص نے خود میرے سامنے فرمائش پیش کی اور کہا کہ جلدی مل جائے اور ایک روپیہ میرے سامنے پھینکا اور کہا کہ یہ اس کا حق المحنت ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا کاغذ اٹھا لیجئے اور جائیے ..... مجھ کو ان کے جلدی مچانے پر رنج نہیں ہوا بلکہ اپنے بھائیوں (علماً) پہ رنج ہوا کہ نہ وہ لیتے اور نہ لوگوں کو ایسی جرأت ہوتی"۔

میری اپنی رائے ہے کہ امیر آدمی خواہ وہ کتنا ہی دیندار کیوں نہ ہو جائے "امارت" کا خناس اُس کے ذہن سے نہیں نکلتا (الا ماشاء اللہ) لہٰذا ایسے ہی کتنے اچھے اچھے لوگوں کے ہاتھوں علماً کی تحقیر و تذلیل کی نوبت آئی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ایک آدمی کا واقعہ حضرت والاؒ نے اپنا ذاتی بیان فرمایا ہے کہ

"ایک صاحب، رئیس بطور مہمان میرے یہاں تشریف لائے۔ ایسی حماقت کی کہ مجھ کو حیرت ہو گئی کہ اتنی معمولی بات کی بھی سمجھ نہیں تو ریاست کیا کرتے ہوں گے۔ حرکت یہ کی کہ جب کھانا کھا چکے تو ایک روپیہ نکال کر میری طرف پھینکا کہ لیجئے، جیسے بھٹیارے کے ہاں پھینک دیتے ہیں۔ ..... میں نے وہ روپیہ ان ہی پر پھینک مارا کہ آپ کو اتنی بھی تمیز نہیں۔"

مقدس ڈاکو

یہ سب کچھ علماً کی حرص بے تمیزیوں کی وجہ سے ہے۔ یہی حال مشائخ کا بھی ہے حرص و آز میں وہ علماً سے بھی دو قدم آگے ہیں ان قبری پیروں نے مریدی کا بکس لگا کر جاہل عوام کی جہالت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے بلکہ خوب جیب تراشی کی ہے حضرت والاؒ کی مریدین کے بارہ میں بھی رائے تھی کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے پیر میں حرص پیدا ہو۔ چنانچہ فرمایا:-

"مرید کے ذمہ بھی یہ امر ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے شیخ کے اخلاق خراب ہوں۔ اگر پیر میں مرید کے عمل سے حرص پیدا ہو گئی تو اس نے پیر کا ناس کر دیا" ایسے ہی مریدوں کی جیب پر نظر رکھنے والے ایک پیر کا واقعہ حضرت والاؒ نے نقل فرمایا ہے

"کہ وہ میرے یہاں آئے اور کہا کہ مجھ پر قرض ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیسے؟ کہا مرید کھا گئے، دو دو مہینے پڑے رہے اور وصول ان سے کچھ ہوا نہیں۔ میں نے اس توقع پر قرض لے کر کھلایا کہ نذرانہ دیں گے ..... کہا کہ آپ پریذیڈنٹ صاحب بہاولپور کو سفارشی خط دیجئے کہ وہ مجھ کو چھ ہزار روپیہ قرض دے دیں۔ میں نے کہا آپ ادا کہاں سے کریں گے؟"

مریدوں کی جیب پر نظر رکھنے والے پیر کا جواب سنیئے۔ کہا کہ

"مریدوں سے جو ملے گا اس سے ادا کر دوں گا۔ میں نے کہا۔ اب بھی آپ مریدوں کو نہیں بھولے۔ ان کی وجہ سے تو یہ نوبت پہنچی۔۔" (ص ۳۳)

گویا چور چوری کرتے اس کو چھپاتے اور اپنے کو مجرم جانتے ہیں لیکن یہ "فتوحات" والے دن دہاڑے دین و دنیا دونوں پر ڈاکہ ڈالنے کے باوجود مرتے دم تک اپنے کو مقدس ہی یقین کرتے رہتے ہیں۔

علما اور مشائخ کی بات تو جملہ معترضہ کے طور پہ درمیان میں آ گئی تھی کہ "چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی" کے تحت جب علما اور مشائخ ہی سے حلال و حرام کی تمیز اٹھ گئی تو دوسروں کا کیا رونا رویا جائے۔ اگر دنیادار شخص اپنی بیوی کا مہر ہڑپ کر جاتا ہے تو اس کا کیا گلہ کیا جائے۔ مہر ہڑپ کرنا اور بیوی سے معاف کرانا خواہ غلط طریقے ہی سے معاف کرایا جائے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ معاف کرانے والے میں کم از کم اتنا تو احساس ہے کہ اگر معاف نہ ہوا تو قیامت کو باز پرس ہوگی، لیکن ان فقری پیروں اور حریص علما کے دل میں تو اتنا بھی خوف نہیں رہا کہ مریدین اور معتقدین کو لوٹنے میں قیامت کے روز حق تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

بات ہو رہی تھی عورتوں کے مہر کی کہ ان کی ادائیگی ہر حال میں مرد پر واجب ہے اور اللہ تعالیٰ نے مرد سے اس کو حاصل کرنے کا عورت کو حق دیا ہے۔ اور مردوں کو بتایا گیا کہ عورت اگر معاف بھی کر دے پھر بھی مرد کی غیرت و حمیت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کو ادا کرے۔

روحانی نفقہ

حکیم الامت تھانویؒ نے نہایت واضح انداز میں عورتوں کے حقوق کو بیان فرمایا کہ شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو چھوڑی ہو بلکہ مادی نفقہ کے ساتھ ساتھ حضرتؒ والا نے "روحانی نفقہ" کے عنوان سے کچھ ایسی باتیں بھی ذکر فرمائیں جو دوسرے مصلحین کی کتابوں میں اس ترتیب کے ساتھ شاید ہی ملیں۔ حضرت والاؒ کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتؒ نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کے مالہ و ما علیہ پر پوری تفصیل سے بحث سے اور موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہا۔ مال کے بارہ میں خواہ وہ بیوی کا ہو یا اولاد کا اسلام نے ایک اصول بیان کیا کہ

اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ اِمْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِنْہُ

یعنی خبردار! کسی مسلمان کا مال بدون اس کے طیب خاطر (خوش دلی) کے حلال نہیں۔ اسلام کے

اس مسلّمہ اصول کے خلاف جہاں بھی کسی سے مال لیا جائے گا وہیں مال کا حصول شریعت کی نگاہ میں جائز نہیں ہوگا، خواہ وہ مال مسجد یا دینی مدرسہ ہی کے لیے حاصل کیا گیا ہو۔ لیکن مال کے حصول پر شریعت نے جس قدر پابندیاں لگائی ہیں اتنے ہی لوگ اس معاملہ میں بے پروا ہیں اور اباحت تصرف مالی میں نہایت کوتاہ نظر۔ حضرت والاؒ نے اس بات کو اپنے ایک ذاتی واقعہ سے ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہر شخص ایک تو اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھے کہ وہ اس بارہ میں کتنا محتاط ہے۔ دوسری حضرت والاؒ کی عمیق نظری کی داد دے کہ اس مزاج شناس رسول کی نظر کہاں تک جاتی تھی۔ فرمایا۔

"میرے یہاں ایک مولانا مہمان آئے۔ گھر سے اُن کے لیے کھانا آیا۔ تو آپ نے ایک دوسرے ہم وطن کو اصرار کر کے کھانے میں شریک کر لیا۔ میرے ملازم نے کہا کہ بلا اجازت مالک کے یہ تصرف جائز نہیں معلوم ہوتا۔ فرمانے لگے ہم تحقیق کر لیں گے۔ مگر ان کے نزدیک یہ اتنا مہتم بالشان ہی نہ تھا جو تحقیق کو ضروری سمجھتے۔ چنانچہ تحقیق نہیں فرمائی۔ اسی طرح کئی روز گذر گئے۔ آخر میں نے ہی ایک روز ان سے تذکرہ کیا۔ تو فرماتے ہیں۔ میں یہ سمجھا کہ یہ سب میرے ہی لیے ہے۔ اور تھا زیادہ اس لیے دوسرے کو شریک کر لیا۔ میں نے کہا حیرت ہے۔ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل تھی کہ یہ "تملیکاً" آیا ہے؟ بلکہ ظاہر تو یہی تھا کہ اباحۃً آیا ہے اور اباحت مقید ہے تصرف خاص کے ساتھ کہ وہ آپ کا نوش فرمانا ہے۔ اور زیادہ اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ مہمان کو کمی نہ رہے اور شاید وہ دوبارہ مانگتا ہوا شرمائے۔ تو آپ نے یہ دوسرا تصرف کس بنا پر کیا؟"

بن بلائے کسی کو دعوت میں لے جانا

ایک اور کوتاہی کے بارہ حضرت والاؒ نے بیان فرمایا! اور وہ کوتاہی ایسی ہے جس کی عوام تو کیا خواص بھی پرواہ نہیں کرتے اور بے دھڑک اور بے کھٹک اس میں مبتلا ہیں کہ

"اپنے ساتھ دعوت میں دو چار کو یا اس سے بھی زیادہ کو لے جاتے ہیں اور اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ صاحبِ دعوت کی اجازت ہو ہی گی۔ حالانکہ بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ صاحب دعوت کو گراں گذرتا ہے مگر ان کو کچھ بحث نہیں۔ ان میں بعضے اجازت کی ضرورت بھی سمجھتے ہیں مگر خود اجازت کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اجازت لینا وہ ہے جہاں اجازت دینے والا آزادی سے انکار بھی کر سکے۔ جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک مقام پر دعوت میں ایک زائد شخص کی اجازت لی مگر اس کے ساتھ ہی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثار خادموں کو اس قدر بے تکلف کر رکھا تھا کہ جب اُن کی رائے نہ ہوتی تو صاف انکار بھی کر دیتے۔ چنانچہ ایک فارسی کا شوربا پکانا اور آپ کی دعوت کرنا اور آپ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے پوچھنا اور اُس کا انکار کر دینا، اور آپ کا بُرا نہ ماننا۔ اور اسی طرح حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے مغیث رض کی سفارش فرمانا اور اس کا انکار کر دینا حدیثوں میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ کیا آج کسی مرید کی ہمت ہے کہ وہ اس طرح پیر کی اجازت لینے پر انکار کر سکے۔ یا کسی پیر کی ہمت ہے کہ مرید کے ایسے انکار کو بشاشت کے ساتھ قبول کر لے۔ قیامت قائم ہو جائے۔ تو ایسی اجازت کا نہ لینا معتبر نہ دینا معتبر، سو ان صاحبوں کو اجازت کی حقیقت سے ہی آگاہ نہیں۔" (اصلاحی انقلاب امت جلد ۲ صـ ۳۰۰)

تربیت تعلیم سے ضروری ہے

حضرت والا رح نے یہ صرف دو واقعات نقل فرمائے ہیں۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات دنیا میں بکھرے پڑے۔ یہ سب نتیجہ ہے تربیت نہ ہونے کا تعلیم کے ساتھ اگر تربیت نہ ہو تو اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لیے مشائخ نے تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیا ہے کیونکہ صحیح عمل کی روح دراصل تربیت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

"بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لیے ضروری سمجھتے ہیں مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے۔ تعلیم درسی سے تو ہر اعتبار سے اور مطلق تعلیم سے بعض وجوہ سے۔ تعلیم درسی سے تو اس لیے کہ وہ فرض عین نہیں۔ بہت صحابہ رض علوم درسیہ سے خالی تھے مگر ان پر کبھی اُن کو لازم نہیں کیا گیا۔ اور تربیت یعنی تہذیب نفس ہر شخص پر فرض عین ہے اور مطلق تعلیم سے اس لیے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم علم دینا ہے اور تربیت عمل کرانا، اور علم سے مقصود عمل ہی ہے اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہی ہے۔ اور اس سے اعمال جوارح (انسانی اعضا) سے متعلق اعمال صالحہ کا عقائد سے اہم ہونے کا اشکال لازم نہیں آتا۔ کیونکہ عقائد تو خود علوم مقصودہ بالذات ہیں اور گفتگو ان علوم میں ہے جو عمل کے لیے مقصود ہیں۔ اور من وجہ (ایک طرح) اس لیے کہا گیا کہ بعض حیثیتوں سے یہ علوم افضل ہیں اعمال سے کہ علم اصل اور بنا ہے اور عمل اس کی فرع اور اس پر مبنی ہے بہر حال تربیت تعلیم سے اہم ہے یا اس کے برابر ہی سہی، مگر اس سے قطع نظر کرنے کی اور ضروری نہ سمجھے

کی کسی حال میں گنجائش نہیں۔" (ص ۱۹۶)

شریعت سے پتہ چلا کہ تربیت نہایت ضروری ہے بلکہ بعض حالات میں تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے اس لیے شریعت مزاج شناس حکیم الامت نے جہاں مرد کے ذمہ عورت کے مادی نفقہ کی ضرورت پر زور دیا وہاں روحانی نفقہ جس کو دوسرے لفظوں میں دینی تعلیم و تربیت کہا جا سکتا ہے، اُس کی بھی نہایت تاکید فرمائی بلکہ اس روحانی نفقہ کو جسمانی پرورش سے زیادہ ضروری قرار دیا۔

"بہت لوگ اپنے گھر والوں کو نہ کبھی دین کی بات بتلاتے ہیں اور نہ کسی بڑے کام پر اُن کو روک ٹوک کرتے ہیں۔ اُن کا حق صرف اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ اُن کو ضروریات کے مطابق خرچ دے دیا اور سبکدوش ہو گئے۔ حالانکہ قرآن مجید میں نص صریح ہے (حضرت والاؒ نے یہاں قرآنی آیات و احادیث رسول نقل فرمائی ہیں۔ اور بعد میں فرمایا) یہ سب نصوص دلالت کر رہے ہیں تعلیم و تربیت دونوں کی مطلوبیت پر۔"

اصل چیز دینی تربیت ہے

بعض حضرات اگرچہ تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن دینی کو نہیں بلکہ رواجی اور عرفی تربیت کو۔ تاکہ اُن اہلیہ یا اولاد سوسائٹی اور معاشرہ کے رسم و رواج سے پوری طرح واقف ہو سکے۔

"چنانچہ اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں، گو وہ شریعت مقدسہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ ایک معزز تعلیم یافتہ کا جو طبیب بھی تھے میں نے بچشم خود یہ واقعہ دیکھا کہ اُن کی گود میں اُن کا ایک بچہ تھا۔ ایک صاحب اُن سے ملنے آئے تو بچے کو حکم دیا کہ ان کو سلام کرو۔ اس بچے نے کہا "السلام علیکم" تو حکیم صاحب فرماتے ہیں نہیں کہو "آداب عرض"۔ وہ ملاقاتی دیندار آدمی تھے۔ بہت بگڑے کہ افسوس بچہ تو سنت پر عمل کرے اور آپ اس کو بدعت کی تعلیم دیتے ہیں۔"

"اس کی وجہ یہی ہے کہ تہذیب شرعی ان کی نظر میں کوئی چیز نہیں، حالانکہ مسلمان کو جس تہذیب کا امر ہے وہ تہذیب شرعی ہے۔"

"بلکہ تہذیب عرفی جو تہذیب شرعی کے منافی ہو اس قابل بھی نہیں کہ اُس کو تہذیب کہا بھی جائے۔ احقر تو اس کو تعذیب (مصیبت) کہا کرتا ہے، کیونکہ اس کی حقیقت تکلف ہے اور تکلف سے جو کلفتیں ہوا کرتی ہیں ظاہر ہیں۔ بلکہ تکلف کو تکلف کہتے ہی اس لیے ہیں کہ ان میں کلفتوں کو برداشت

کرنا ہوتا ہے۔“

آخر میں حضرت والاؒ نے ایک بڑے پتے کی بات ارشاد فرمائی جو ہر مسلمان کا مطمحِ نظر ہونی چاہیئے کیونکہ مسلمان ہونے کے ناطے اسلام کو ہر معاملہ میں ترجیح دینا ضروری ہے۔ فرمایا۔

“آخری بات یہ ہے کہ اگر تہذیب غیر شرعی میں کلفت بھی نہ ہو اور تہذیب شرعی میں راحت بھی نہ ہو تب بھی جب مسلمان کے لیے ایک ممنوع ہے اور دوسری مامور بہ تو مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک کا ترک اور دوسرے کا فعل لازم ہوگا۔ جیسے اگر نماز کے لیے اُٹھنے میں مشقت ہو اور گرم بستر میں راحت ہو۔ مگر اس مشقت کو اس راحت پہ ترجیح ہوگی۔ پھر اس کا بھی مشاہدہ کھلی آنکھوں پر عامل کرے گا کہ یہ مشقت راحت چند روزہ ہے۔ پھر تو ایسا ذوق صحیح عطا ہوگا کہ موافقت شرع کے برابر کسی سے میں راحت اور مخالفت شرع کے برابر کسی چیز میں کلفت نہ ہوگی ؏

چند روزے جہد کن باقی بخند

تربیت ابتداء سے ہو

معلوم ہوا کہ شرعی تہذیب کی تربیت نہایت ضروری ہے چنانچہ شوہر پر جس طرح بیوی کا مادی نان و نفقہ واجب ہے اسی طرح اس کا روحانی نفقہ یعنی شرعی تعلیم و تربیت بھی واجبات میں سے ہے بلکہ مادی نفقہ سے زیادہ ضروری ہے۔ جس طرح والدین کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت ابتداء ہی سے کرنی چاہیئے اسی طرح شوہر کو بھی اپنی بیوی کی تربیت اول روز ہی سے شروع کر دینی چاہیے کیونکہ

“ابتداء ہی سے جو تعلیم و تربیت ہو اس کا جو اثر ہوتا ہے کہ علوم و اعمال امور فطریہ و طبیعہ کی طرح ہو جاتے ہیں۔ وہ بات بعد میں نہیں ہوتی۔“ ابتدائی تعلیم و تربیت کا کیا نتیجہ ہوتا ہے

“جہالتیں اور بد اخلاقیاں طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ پھر بعد میں جو شخص اس کا اہتمام کرنا چاہے مثلاً عورت کے لیے شوہر اور مردوں کے لیے استاد و پیر، ان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے اور بعض ناگواری درجۂ منافرت تک پہنچ جاتی ہے۔“ شاگرد اور استاد پیر اور مرید کے درمیان اگر منافرت پیدا ہو جائے تو نقصان اگرچہ اُس سے بھی اچھا خاصا ہوتا ہے لیکن میاں بیوی کے مابین اگر تربیت نہ ہونے کے باعث منافرت پیدا ہوگئی تو وہ منافرت اور ناگواری صرف دو افراد کے مابین نہ ہوگی بلکہ دو خاندانوں کے مابین ہوگی اور ہر خاندان کئی کئی افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کیونکہ

"میاں بیوی کا تعلق ایسا ہے کہ ہر وقت کا سابقہ رہتا ہے۔ اور مرد اپنی مصلحتوں سے قطع تعلق کو پسند نہیں کرتا اور نہ عورت کی جہالتوں کو برداشت کرتا ہے تو یہاں ہمیشہ کے لیے لڑائی جھگڑے کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے جس کے نتائج جانبین کے حق میں بُرے سے بُرے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور دونوں کی زندگی موت سے بھی تلخ تر ہو جاتی ہے اور ان سب کا سبب اکثر وہی ابتدا میں اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔ لیکن اگر ایسا اتفاق ہو گیا تو یہی نہیں کہ ان لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا جائے بلکہ جب قدرت ہو تب بھی اس کی سعی کرنا ضروری ہے۔"

تہذیب شرعی پر عمل کا طریقہ

جب یہ معلوم ہو گیا کہ تہذیب شرعی یا شرعی تربیت زوجہ اور اولاد کے لیے نہایت ضروری ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پر عمل درآمد کا طریقہ کیا ہے؟ عملدرآمد کے لیے سب سے پہلی شرط قدرت ہے، کیونکہ جس پر اختیار نہیں اُس کی تربیت کیسے کی جا سکتی۔

"قدرت کی دو قسمیں ہیں۔ ارادیؔ اور قہریؔ۔ سو ارادی تو پیر اور اُستاد کی ہے اور قہری حاکم کی ہے۔ خواہ بحکومت عامہ ہو جیسے سلطان اور نائب سلطان، خواہ بحکومت خاصہ جیسے عورت کے لئے شوہر یا غلام کے لیے آقا۔ سو مردوں کے لیے حکومت قہریہ کے اسباب بہت کم مجتمع ہوتے ہیں، کیونکہ سلاطین کو تو اس طرف توجہ ہی نہیں۔ اور غلام کسی کے ہیں نہیں۔ اب رہ گئی حکومت ادار یہ سو جس کے اثر سے نکل جانا ہر وقت اُن کے اختیار میں ہے۔ اس لیے مردوں کی اصلاح کے اسباب بے شک ضعیف ہیں البتہ عورتوں کے لیے عادتاً شوہر کا ہونا لازم ہے۔ اور کبھی اس کی مدت کم بھی ہوتی ہے مگر اکثر طویل ہی ہوتی ہے سو عورتوں کی اصلاح کا طریق کار بہت سہل ہے۔"

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ ماں باپ یا پرورش کنندہ کے ذمہ بچوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہوتی اور شوہر کے ذمہ بیبیوں کی۔"

(مضمون کا باقی حصہ جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں)

تعلیمات

مجدد الملت رحمہ اللہ

حضرت حکیم محمد اختر صاحب ، کراچی

* * *

کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ مے خانہ

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، عصرِ حاضر کے اکابر علماء کی رائے میں آپ نہ صرف اس صدی کے مجدد تھے بلکہ جامع المجددین تھے۔ حضرت مولانا اصغر میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اُمت میں ایک ایسا جامع عالم پیدا نہیں ہوا۔ یہ بات مجھ سے میرے شیخ حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی جو حضرت حکیم الامتؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے اور عمر میں حضرت حکیم الامتؒ سے صرف سات سال چھوٹے تھے، اور یہ بھی فرمایا کہ مولانا اصغر میاں صاحب حضرت حکیم الامتؒ کے معاصرین میں سے تھے مرید نہیں تھے۔ مرید کا قول تو محض عقیدت پر مبنی ہو سکتا ہے لیکن معاصرین کا اعتراف معنی رکھتا ہے۔ بغرض اکابر ہوں یا معاصر ہوں یا اصاغر سب ہی حضرت حکیم الامت کے بارے میں انتہائی حسنِ ظن رکھتے تھے اور ان کے ارشادات اگر جمع کیے جائیں تو ایک کتاب بن جائے جس کا اس وقت موقع نہیں اور ضرورت بھی نہیں کیونکہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

کیا خوب شعر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے ؎

؎ اس زمانے میں ہے محرومِ ازل کی پہچانت
یعنی جو معتقدِ حضرتِ مولانا نہیں

علمِ دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حضرتِ والا کی راہنمائی اور تصنیف موجود نہ ہو۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف و سلوک قرأت و تجوید منطق و فلسفہ وغیرہ تمام علوم و فنون میں حضرت حکیم الامتؒ کی ایک منفرد شان ہے ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن اس وقت احقر محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی مجددانہ اصلاحات و تعلیمات اور تزکیہ و تربیت نفوس کے متعلق ان چند ارشادات کو تحریر کر رہا ہے جن سے اُمتِ مُسلمہ کے روحانی بیماروں نے شفا پائی ہے اور نسبتِ باطنی اور تعلق مع اللہ کی دولت سے مشرف ہوئے۔

امراضِ نفس اور حکیمُ الاُمّت رحمۃ اللہ علیہ کا علاج

ایک عظیم کید نفس کا علاج

ایک طالب اصلاح نے حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ میں حُسن سے بیحد متاثر ہوتا ہوں اور جب کسی حسین شکل کو دیکھتا ہوں تو نگاہ ہٹانے کی قدرت نہیں پاتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مجبور ہوں اور مجھے حسینوں سے نگاہ بچانے کی طاقت نہیں۔

جواب ارشاد فرمایا کہ فلسفہ کا قاعدہ مسلّمہ ہے کہ قدرت ضدین سے متعلق ہوتی ہے، پس اگر حسینوں کو دیکھنے کی آپ کو طاقت ہے تو لامحالہ آپ کو نہ دیکھنے کی بھی طاقت حاصل ہے یعنی جس فعل کو آدمی کر سکتا ہے وہ اس فعل کے نہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے، یہ عقلی مسلّمات سے ہے۔

سبحان اللہ! کیا حکیمانہ جواب ہے، طالب کے نفس کا یہ کید تھا کہ خود کو مجبور تصور کر کے ہمیشہ بدنگاہی کرتا رہے لیکن حکیم الامت نے کس عجیب عنوان سے متنبہ فرمادیا کہ تم مجبور نہیں ہو، آدمی جس

فعل کے کرنے کی قدرت رکھتا ہے اُس کے نہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کا ہاتھ اگر مرضِ رعشہ سے کانپ رہا ہے تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ شخص ہاتھ کی حرکت پر قادر ہے، کیونکہ وہ رعشہ کی ضد یعنی سکون پر قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ رعشہ پر مجبور ہے لیکن جو شخص اپنے ہاتھ کو ساکن رکھنے پر قادر ہے وہ اس کی حرکت پر بھی قادر ہے کیونکہ قدرت ضدین سے متعلق ہوتی ہے پس جو شخص دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے نہ دیکھنے پر بھی قادر ہے اور نگاہ کو حسینوں سے بچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ (رُوح کی بیماریاں اور اُن کا علاج، حصہ اوّل)

عشقِ مجازی کے متعلق ایک اہم انتباہ

غیر محرم عورت یامرد (لڑکے) سے کسی قسم کا علاقہ (تعلق) رکھنا خواہ اس کو دیکھنا یا اس سے دل خوش کرنے کے لیے ہمکلام ہونا یا تنہائی میں اس کے پاس بیٹھنا یا اس کی پسند کے مطابق اسکے خوش کرنے کو اپنی وضع یا کلام کو آراستہ و نرم کرنا، میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اس تعلق سے جو جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور جو جو مصائب پیش آتے ہیں احاطہ تحریر سے خارج ہیں، انشاء اللہ تعالیٰ کسی رسالہ میں ضمناً اس کو کسی قدر زیادہ لکھنے کا ارادہ ہے۔ (جزاء الاعمال)

حسن پرستی کا علاج

فرمایا کہ شہواتِ دُنیا موجبِ نقص نہیں بلکہ یہی موجب کمال ہیں ٹاٹ کا پردہ اگر زانی نہ ہو تو کیا کمال ہے، اندھا نظرِ بد نہ کرے تو کیا کمال ہے بلکہ کمال تو یہ ہے کہ حُسن کا ادراک ہو اور اسی طرف طبیعت کا بھی میلان ہو پھر بھی نامحرم کو نظر اٹھا کر نہ دیکھے کشش و میلان کا بالکل زائل ہو جانا تو عادتاً غیر ممکن ہے، البتہ تدابیر سے اس میں ایسا ضعف و اضمحلال ہو جاتا ہے کہ مقاومت (مقابلہ) میں تکلیف نہیں ہوتی اور وہ تدبیر صرف اس میں منحصر ہے کہ عملاً اس کشش کے تقاضا کی مخالفت کی جائے خواہ کتنی ہی تکلیف ہو اس کو برداشت کیا جائے۔ (بصائر حکیم الامت صـ ۴۲۷)

تکبّر اور اس کا علاج

فرمایا کہ تکبّر کا حاصل یہ ہے کہ کسی کمالِ دنیوی یا دینی میں اپنے کو باختیارِ خود دُوسرے سے اس طرح بڑا سمجھنا کہ دُوسرے کو حقیر سمجھے تو اس میں دو چیز ہوں گے۔ (۱) اپنے کو بڑا سمجھنا (۲) دُوسرے کو حقیر سمجھنا یہ تکبّر کی حقیقت ہے جو حرام ہے اور معصیت ہے اور یہ جو قید لگائی گئی ہے کہ دُوسرے کو حقیر سمجھے، یہ اس لیے کہ اگر

کوئی واقعی بڑائی چھٹائی کا اس طرح معتقد ہو کہ دوسرے کو ذلیل نہ سمجھے تو وہ تکبر نہیں، جیسے ایک بیس برس کی عمر والا شخص دو برس کے بچہ کو سمجھے کہ یہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے، یا ایک ھدایہ پڑھنے والا طالبعلم نحو پڑھنے والے طالبعلم کو سمجھے کہ یہ مجھ سے پڑھائی میں کم ہے، یا ایک مالدار آدمی کسی مسکین کو یہ سمجھے کہ مجھ سے مال میں کم ہے مگر اس کو حقیر نہیں سمجھتا تو یہ کبر نہیں۔

اور ایسی چھٹائی بڑائی کا اعتقاد اگرچہ کبر نہیں لیکن اگر وہ محل تفاوت عرفاً یا شرعاً کمال ہو تو یہ اعتقاد کبھی کبر تک پہنچا دیتا ہے، اس لیے حفظ ما تقدم کے طور پر اس کا بھی وہی علاج کرنا چاہیے جو کبر کا علاج ہے اور وہ ایک خاص مراقبہ ہے جس کی ایسے وقت میں تجدید کر لی جائے جب اپنے کمال کی طرف التفات ہو، وہ مراقبہ یہ ہے:۔

(۱) اگرچہ میرے اندر یہ کمال ہے مگر یہ میرا پیدا کیا ہوا نہیں حق تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔

(۲) عطا بھی کسی استحقاق سے نہیں ہوا بلکہ محض موہبت اور رحمت ہے۔

(۳) پھر عطا کے بعد اس کا بقا میرے اختیار میں نہیں حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کر لیں۔

(۴) اور اگرچہ اس دوسرے شخص میں فی الحال یہ کمال نہیں ہے مگر فی الحال ممکن ہے کہ میرے کمال سے زیادہ اس کو یہ کمال اس طرح حاصل ہو جاوے کہ میں اس کمال میں اس کا محتاج ہو جاؤں۔

(۵) اور اگر فی المآل کمال نہ بھی ہو تو فی الحال ہی اس شخص میں کوئی کمال ایسا ہو جو مجھ سے مخفی ہو اور حق تعالیٰ کو معلوم ہو جس کے اعتبار سے اس کے اوصاف کا مجموعہ میرے اوصاف کے مجموعہ سے اکمل ہو۔

(۶) اور اگر کسی کمال کا بھی احتمال قریب ذہن میں نہ آوے تو یہ احتمال قائم کرے کہ شاید یہ شخص علم الٰہی میں مقبول ہو اور میں غیر مقبول ہوں اور اگر میں بھی مقبول ہوں تو شاید یہ مجھ سے زیادہ مقبول ہو، پس مجھ کو کیا حق ہے کہ اس کو حقیر سمجھوں۔

(۷) اور اگر بالفرض سب امور میں یہ مجھ سے کم ہی ہے تو ناقص کا کامل پر حق ہوتا ہے، جیسا کہ مریض کا صحیح پر، ضعیف کا قوی پر، فقیر کا غنی پر، تو مجھ کو چاہیے کہ اس پر شفقت و رحم کروں اور اس کی تکمیل میں کوشش کروں، پس اس کی تکمیل میں سعی شروع کر دے اور طبعی خاصہ ہے کہ جس کی

تکمیل تربیت میں کمی کرتا ہے اس سے محبت ہو جاتی ہے اور محبت کے بعد تحقیر نہیں ہوتی۔

(۸) اور یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کے ساتھ لطف و اخلاق سے کبھی کبھی بات چیت کر لیا کرے اور اس کا مزاج پوچھ لیا کرے اس سے ایک دوسرے کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے تعلق کے بعد تحقیر معدوم ہو جاتی ہے۔ (اقتباس از ملفوظ ۳۴۴، کمالاتِ اشرفیہ ص۹۴)

خالی الذہن ہو کر عمل کرنا بھی مقبول ہے

فرمایا کہ اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی قبول ہو جاتا ہے اور اخلاص بھی نہ ہو تو خالی الذہن ہو کر بھی عمل مقبول ہو جاتا ہے، خالی الذہن کے معنیٰ یہ ہیں کہ نہ دکھاوے کی نیت ہو نہ خدا کے لیے نیت ہو۔

ف: حضرت حکیم الامتؒ کا یہ چھوٹا سا ملفوظ حضرت کی شانِ مجددانہ کا حامل ہے ؎

بظاہر تو ہیں چھوٹی چھوٹی سی باتیں
جہاں سوز لیکن یہ چنگاریاں ہیں

عام لوگ تو کیا خواص بھی یہی سمجھتے کہ جس عمل میں نیت اخلاص کی نہ ہو اگرچہ ریاء بھی نہ ہو وہ قبول نہ ہوگا لیکن یہ دقتِ نظر اور باریک بینی حضرت حکیم الامت مجدد الملت ہی کا حصہ ہے کہ خالی ذہن کے ساتھ بھی عمل مقبول ہے کیونکہ جو عمل مخلوق کے لیے نہیں وہ خالق ہی کے لیے شمار ہوگا اگرچہ نیت رضاء خالق کی نہ ہو۔

اصلاحِ سیاست

فرمایا کہ اگر قدرت ہو تو قتال اور قدرت نہیں تو صبر شرعی دستور العمل ہے اور درمیانی صورتیں مثلاً جتھوں کا جیل جانا، پٹنا، بھوک ہڑتال وغیرہ سب نصوص کے مقابلہ میں اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا حق ہم کو نہیں اور نصوص کے خلاف کرنا جرمِ عظیم ہے۔ یہ سب جیل جانا وغیرہ خودکشی کے مترادف ہے اور اگر خودکشی سے کسی کو فائدہ پہنچے تب بھی تو باوجود موجب فوائد ہونے کے جائز نہیں ہے چہ جائیکہ کوئی فائدہ بھی نہ پہنچے تو اس کا درجہ ظاہر ہے یعنی اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ خودکشی کرنے سے کفار پر اثر ہوگا تو خودکشی کرنا کیا جائز ہو جائے گا۔ اگر کوئی نفع بھی خودکشی پر مرتب ہو تو یہ خود ہی اتنا زبردست نقصان ہے کہ جس کا پھر کوئی بدل کبھی نہیں، حضرت ہر منفعت کا اعتبار نہیں، اس کی تو بالکل ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ فلاں شخص

کی جان بچ سکتی ہے، اگر تم کنوئیں میں گر جاؤ تو اس کی جان بچانے کی غرض سے کیا کنوئیں میں گرنا جائز ہوگا؟

فرمایا کہ جن چیزوں کی حاجت خیر القرون میں نہیں ہوئی اور خیر القرون کے بعد حاجت پیش آئی ہو اور نصوص ان کے خلاف نہ ہوں وہ تو مسکوت عنہا ہو سکتی ہیں، مظالم حکام تو ہمیشہ ہی پیش آتے رہے لیکن پھر بھی نصوص میں جہاد یا صبر ہی کا حکم ہے تو اس اعتبار سے یہ جدید مخترعہ تدابیر (جیل جانا، بھوک ہڑتال وغیرہ) مسکوت عنہا نہ ہوں گی بلکہ منہی عنہا ہوں گی کہ باوجود ضرورت کے متقدمین نے ان کو ترک کیا تو اجماع ہوا اس کے ترک پر اس لیے ممنوع ہیں۔ اور ان مخترع طریقوں کے متعلق فرمایا کہ ایسے وقت میں شریعت میں دو ہی صورتیں ہیں، قوت کے وقت مقابلہ اور عجز کے وقت صبر و دعا، خدا معلوم یہ تیسری صورت بخوشی گرفتار ہو جانے کی کہاں سے نکالی (بس یورپ ہی سے سبق لیا ہے۔ (کمالات اشرفیہ ص ۹۷، ص ۱۱۷، ص ۲۲)

تصوف کے متعلق علماء خشک اور جاہل صوفیا کی غلط فہمی کا جواب

تصوف کے اصول صحیحہ قرآن و حدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف قرآن و حدیث میں نہیں ہے، بالکل غلط ہے یعنی غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے اور خشک علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں، مگر دونوں غلط سمجھے خشک علماء تو یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں، یہ سب واہیات ہے۔ بس نماز روزہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اسی کو کرنا چاہیئے، یہ صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں تو ظاہری احکام ہیں تصوف علم باطن ہے۔ ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن و حدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فرقے قرآن و حدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں، پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن و حدیث کو۔

اے صاحبو! کیا غضب کرتے ہو، خدا سے ڈرو، اس کے متعلق میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں لکھی ہیں، ایک تو "حقیقت الطریقت" جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے۔ ایک رسالہ مستقل (مسائل السلوک) جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ

تصوف کے مسائل قرآن مجید سے ثابت ہیں، ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث تصوف سے لبریز ہیں اور واقعی وہ تصوف نہیں جو قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔ (وعظ طریق القلندر ص۲۲ بحوالہ بصائر حکیم الامت ص۱۰۰)

فرمایا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ حدیثوں میں تصوف نہیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ حدیث ہی نہیں جس میں تصوف نہیں یعنی ہر حدیث میں تصوف ہے مگر لوگ تصوف کی حقیقت نہیں جانتے۔ (حسن العزیز مطبوعہ ملتان ص۱۵)

میں نے تو قرآن وحدیث سے تصوف کے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں اور اگر غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر سکتا تھا۔ (اشرف السوانح)

مسائلِ تصوف قرآن پاک کی روشنی میں

احقر نمونہ کے طور پر بیان القرآن سے چند مسائل السلوک نقل کرتا ہے جس میں حضرت حکیم الامت نے مسائلِ تصوف کو قرآن مجید سے ثابت فرمایا ہے:-

ضرورتِ شیخ کا ثبوت قرآن سے

لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (پ۱۳ سورۃ ابراہیم)

(ترجمہ) ”اے موسیٰ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ“

حضرت حکیم الامت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مقام پر حق تعالیٰ شانہٗ نے تاریکیوں سے نکالنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی (اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ پ۳) اور اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف فرمائی۔ وَاِسْنَادُ الْاِخْرَاجِ اِلَى النَّبِیِّ مَعَ كَوْنِ الْمُخْرِجِ الْحَقِیْقِیِّ هُوَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَقْوٰی دَلِیْلٍ عَلٰی اَنَّ لِلشَّیْخِ مَدْخَلًا عَظِیْمًا فِیْ تَكْمِیْلِ الْمُرِیْدِ۔ (مسائل السلوک سورۃ ابراہیم پ۱۳ بیان القرآن)

(ترجمہ) ”حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں باوجود اس کے کہ مخرج حقیقی اللہ تعالےٰ ہے پھر اخراج کی نسبت نبی کی طرف کرنا قوی دلیل ہے اس بات کی کہ تکمیل مرید شیخ کو عظیم دخل ہے۔“

شیخ کا بعض مرید سے زیادہ محبت کرنا

(۱) اذ قال یوسف لابیہ الخ

(۲) اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا۔ اس میں دلالت ہے کہ شیخ کو جائز ہے کہ اپنے مریدین میں سے کسی مرید سے دوسروں سے زیادہ محبت کرے جبکہ اس میں اوروں سے زیادہ رشد کے آثار پائے جاویں۔

(مسائل السلوک بیان القرآن پ۱۳ سورہ یوسف)

مرید اپنے مرشد کے علاوہ کسی سے اپنا حال بیان نہ کرے

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰٓی اِخْوَتِكَ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بیٹے یوسف اپنے بھائیوں کے سامنے اپنے خواب کو مت بیان کرنا۔

(۱) اس میں دلالت ہے کہ مرید کو جو حالات پیش آویں اس کو اپنے شیخ سے بیان کرے جیساکہ اذ قال یوسف لابیہ میں اشارہ ہے۔

(۲) دوسری میں دلالت ہے کہ اپنا حال غیر شیخ سے نہ کہے کہ اس میں ضرر کا احتمال ہے۔

(مسائل السلوک پ۱۳ سورۃ یوسف بیان القرآن)

داعی الی اللہ اور شیخ کو عارف ہونا چاہیئے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ۔ (پ۱۳ سورۂ یوسف)

بحوالہ روح المعانی حضرت حکیم الامت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: فی الروح اشارۃٌ الی انہٗ ینبغی للداعی الی اللہ تعالیٰ ان یکون عارفاً بطریق الایصال الیہ سبحانہٗ عالماً بما یجب لہٗ تعالیٰ۔

(ترجمہ) داعی الی اللہ کو طریقِ ایصال کا ماہر ہونا چاہیئے اور حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا عارف ہونا چاہیئے۔ (مسائل السلوک بیان القرآن پ۱۳)

مشائخ کا بعض مریدین کو خلافت عطا فرمانا

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔ (پ۵ سورۃ النساء)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دو۔

حضرت حکیم الامت مسائل السلوک میں ارقام فرماتے ہیں:-

ان اخذ العموم فی الامانات دلت الآیۃ علی امر الشیوخ بایصال المعارف واعطاء الخلافۃ من کان اھلًا لھا۔

یعنی اگر امانت کو عام لیا جاوے تو آیت میں مشائخ کو بھی امر ہوگا کہ معارف اور برکات کو ان کے اہل تک پہنچادیں اور جو اُن میں خلافتِ ارشادیہ کا اہل ہو اُن کو اجازت دیں۔

عدم مناسبت کے سبب بعض مریدین کو حلقۂ ارادت سے نکال دینا

هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ

(پ۱۶ سورۃ الکھف)

حضرت تھانوی فرماتے ہیں:-

ھو اصل لامر المرید بالفراق اذا لم یتوقع مناسبۃ ووفاق وظھر کثیر خلاف وشقاق۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس مرید سے مناسبت نہ ہو اور آئندہ بھی موافقت کی توقع نہ ہو تو اس کو الگ کر دینا چاہیے کہ بدون مناسبت دونوں کے اوقات ضائع ہوں گے۔ (مسائل السلوک بیان القرآن)

مشائخ کے لیے مُریدین پر عفو وکرم کی تعلیم

ولا یأتل اولوا الفضل منکم .....الخ (پ۱۸ سورۃ النور)

(۱) اس آیت سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ ان کو اولوالفضل سے خطاب فرمایا گیا۔

(۲) وفی الروح اشارۃ الی انہٗ ینبغی للشیوخ والاکابر ان لا یھجروا اصحاب العثرات واھل الزلات من المریدین وان لا یقطعوا احسانھم وفیوضاتھم عنھم۔

روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ مشائخ اور اکابر کو اپنے مریدین سے ان کی لغزشوں کے سبب قطع تعلق نہ کرنا چاہیے اور اسی طرح اپنے احسانات اور فیوضات کو ان پر بند نہ کرنا چاہیے۔ (مسائل السلوک از بیان القرآن پ۱۸)

اہل اللہ کی دینی شدت و حمیت سوءِ اخلاق نہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی: والقی الالواح واخذ برأس اخیه یجرّهٗ الیه۔ ر پ۹ سورہ اعراف)

ترجمہ مع تفسیر اور دینی حمیت کے جوش میں جلدی سے توریت کی تختیاں ایک طرف رکھیں اور جلدی میں ایسے زور سے رکھی گئیں کہ اگر غور نہ کرے تو شبہ ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں اور ہاتھ خالی کر کے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کا سر یعنی بال پکڑ کر اُن کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے کہ تم نے کیوں پورا انتظام نہ کیا اور چونکہ غلبۂ غضب میں ایک گونہ بے اختیاری ہو گئی تھی اور غضب بھی دین کے لیے تھا اس لیے اس بے اختیاری کو معتبر قرار دیا جائے گا اور اس اجتہادی لغزش پر اعتراض نہ کیا جاوے گا۔

مسائل السلوک حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے نادان لوگ بعض اہل اللہ کی دینی شدت، غضب اور فرطِ حمیت کو سوءِ اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں حاشا ھم عن ذٰلك اور وہ پاک ہیں اس الزام سے، اور اسی واقعہ سے شیخ کے غضب کا جواز مرید پر ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ کاملین سے اجتہادی خطا کا صدور منافیٔ کمال نہیں اور اُن جاہل مریدوں کی بد اعتقادی کا بھی رد ہوا جو اپنے پیروں کو خطاؤں سے معصوم سمجھتے ہیں۔ (بیان القرآن پ۹ ص۴۲ مطبوعہ دہلی)

اہل اللہ کی مخالفت کرنا مخالفین کے فسادِ استعداد کی دلیل ہے

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ (سورہ یٰس) کافروں نے کہا (رسولوں سے) کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں، ان رسولوں نے فرمایا قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے، اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ کیا تم اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جاوے بلکہ تم حد سے گذرنے والے لوگ ہو۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ بحوالہ روح المعانی تحریر فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ان نالائقوں پر قحط مسلط ہوا یعنی بارش روک دی گئی یا سب کے سب

کوڑھی ہوگئے۔ وھذا عادۃ اللہ اذا انکر الناس علی اولیائہ۔ اور یہی عادت اللہ ہے کہ جب اولیاء اللہ کے ساتھ گستاخی کی جاتی ہے تو اسی طرح کا وبال آتا ہے اور قَالُوْا طَآئِرُکُمْ مَعَکُمْ میں اشارہ ہے کہ ان کی استعداد ہی فاسد تھی۔

مُصلحین کو اقوالِ مخالفین کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے

فَلَا یَحْزُنْكَ قَوْلُھُمْ ..... الخ میں اشارہ ہے کہ مخالفین کے اقوال کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے، حق تعالیٰ شانہ خود آگاہ ہیں مناسب انتقام لے لیں گے۔ (مسائل السلوک بیان القرآن پ ۲۳)

مسائل السلوک کا اِستنباط احادیثِ مُبارکہ کی روشنی میں

علم غیر نافع کا جہل ہونا

اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ جَھْلًا۔ (الحدیث) (ترجمہ) بعض علم جہل ہے۔

ف: اس میں صوفیاء کی اس عادت کی اصل ہے کہ وہ ایسے علم کو جہل کہتے ہیں جو موصل الی اللہ نہ ہو کما قال الشیرازی علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است۔ (التشرف صفحہ ۳۷)

مجالس صوفیاء کی فضیلت

اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا۔ (الحدیث للترمذی) وتمامہ فی الاحیاء قیل وما ریاض الجنۃ قال مجالس الذکر۔ اھ

(ترجمہ حدیث) ”جب تم جنت کے باغوں پر گذرا کرو تو (ان میں) چرا کرو (یعنی ان سے غذائے روحانی حاصل کیا کرو۔ (ترمذی) اور پوری روایت احیاء میں اس طرح ہے، عرض کیا گیا کہ جنت کے باغ کیا ہیں، ارشاد ہوا ذکر کی مجلسیں۔

ف:- اس میں کھلی فضیلت صوفیاء کی مجالس کی ہے کیونکہ وہ مجالس خالص ذکر ہی ہیں خواہ علماً خواہ عملاً (یعنی وہاں افادہ علوم کا ہوتا ہے یا تسبیح و تہلیل کا شغل ہوتا ہے)۔ (التشرف صفحہ ۳۸)

تائید عادتِ صوفیاء

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً ۔ (بخاری)
(ترجمہ) بعض اشعار حکمت ہیں۔

ف :۔ اس میں تائید ہے اس عادت کی جس کو اکثر صوفیاء نے اختیار کیا ہے کہ علوم و حقائق (معارف) کو اشعار میں ضبط کرتے ہیں۔

ولولہ و عشق

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے باتیں کرتے اور ہم آپ سے باتیں کرتے مگر جب نماز کا وقت آجاتا تو آپ کی یہ حالت ہو جاتی گویا نہ آپ ہم کو پہچانتے ہوں اور نہ ہم آپ کو، اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اذان سنتے تھے تو یہ حالت ہو جاتی کہ گویا آپ کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔

ف :۔ یہ وہی از خود رفتگی اور عشق ہے جس کے اکثر اہل ظاہر منکر ہیں اور صوفیاء اس کے قائل ہیں۔ (التشرف ص۵۱)

حقیقتِ چلّہ

ابو نعیم نے **حلیہ** میں ابو ایوب کی حدیث سے یہ روایت کی ہے کہ جو شخص چالیس دن اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اختیار کرے حکمت (و علم) کے چشمے اس کے قلب سے اس کی زبان پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ف :۔ اس حدیث میں اصل ہے چلّہ کی (کیونکہ اس کا حاصل بھی چالیس روز تک اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا ہے) اور برکات ہیں چلّہ کے اور اثبات ہے علمِ لدنّی کا کیونکہ جس علم کا اس میں ذکر ہے بلاواسطہ کسب وہ ثمرۂ عمل و اخلاص کا ہے۔ (التشرف ص۵۰)

الہام کا ثبوت

حدیث :۔ میری اُمت میں کچھ لوگ محدَّث و مکلَّم بھی ہوں گے (یعنی جن کو الہام صحیح ہوتا ہو) روایت کیا اس کو بخاری نے ابوہریرہؓ کی حدیث، پہلی اُمتوں میں محدث لوگ ہوا کرتے تھے پس اگر میری اُمت میں کوئی ایسا ہوگا تو عمرؓ ضرور ہیں، روایت کیا اس کو مسلم نے حضرت عائشہؓ کی حدیث سے۔

ف :۔ اس حدیث میں الہام کے صحیح ہونے کا مذکور ہے۔

(التشرف ص۹۱)

شیخ سے محبت میں نفع عظیم ہے

حدیث :- ایک شخص کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے اور اس کو ان کے درجہ تک رسائی نہیں ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص ان ہی کے ساتھ ہوگا جن سے محبت رکھتا ہے، روایت کیا اس کو بخاری ومسلم نے ابن مسعودؓ کی حدیث سے۔

ف :- اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی محبت سے نفع عظیم ہوتا ہے اسی لیے اہل طریق کو اس کا بہت اہتمام ہے۔ (التشرف صـ ۹۸)

اصلاحِ باطن اصل چیز ہے

حدیث :- عزیزی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو (جن میں اعمالِ ظاہرہ مخصوصہ بھی آگئے کہ وہ بھی خاص ہیئات ہیں صورت کی) اور اموال کو نہیں دیکھتے لیکن تمہارے قلوب اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔ روایت کیا اس کو مسلم اور ابن ماجہ نے ابوہریرہؓ سے۔

ف :- یہ حدیث صریح ہے اصلاحِ باطن کے اصل ہونے میں (اور اعمال کا ذکر اس کے منافی نہ سمجھا جائے) کیونکہ اعمال بھی بدون اصلاحِ باطن معتد بہا نہیں ہیں (چنانچہ عقیدہ صحیحہ و اخلاص اعمال میں شرط ہے اور یہ دونوں باطن ہیں) اور مولانا رومیؒ کا یہ شعر گویا اس حدیث کا ترجمہ ہے ؎

ما بروں را ننگریم وقال را — ما دروں را بنگریم وحال را

شیخ وطالب کے درمیان مناسبت کی شرط

حدیث :- ارواح (اپنے عالم میں) جمع کی ہوئی جماعتیں ہیں سو جن (ارواح) میں (وہاں) تعارف ہوگیا (یہاں) ان میں باہم الفت ہوگی اور جن میں (وہاں) اجنبیت رہی (یہاں) ان میں باہم اختلاف رہے گا۔ روایت کیا اس کو مسلم نے ابوہریرہؓ کی حدیث سے اور بخاری نے معلقاً حضرت عائشہؓ کی حدیث سے۔

ف :- اس حدیث میں اصل ہے اس مسئلہ کی جو صوفیاء کے نزدیک مقرر ہے کہ شیخ اور طالب میں مناسبت شرط ہے کیونکہ اہم مقصود اس واقعہ کی خبر دینے سے یہی ہے۔

(التشرف صـ ۱۳۲)

ہر وقت اِصلاح کا اِہتمام

حدیث:۔ حضرت جابرؓ کی حدیث ہے کہ ہر بندہ اسی حالت پر مبعوث ہوگا جس پر مرا ہے۔ روایت کیا اس کو مُسلم نے۔

ف :۔ چونکہ موت کا کوئی وقت نہیں اور بعث ہوگا موت کی حالت میں اسی لیے تم صوفیاء کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنی اصلاح ظاہر و باطن کا ہر وقت شدت سے اہتمام کرتے ہیں (التشرف ص۱۳۶)

قلب مدارِ اصلاح ہے

حدیث:۔ بدن میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے وہ جب سنور جاتا ہے تو تمام جسد سنور جاتا ہے۔ (مراد قلب ہے کہ اس کی اصلاح سے تمام جسد کے اعمال درست ہو جاتے ہیں)۔ (بخاری و مسلم)

ف :۔ یہ حدیث صریح ہے اس میں کہ اصلاحِ قلب اصل مدار ہے تمام اِصلاح کا اور یہ مسئلہ گویا فنِ تصوف کی رُوح ہے۔ (التشرف ص۱۳۷)

حق مرشد کی عظمت

حدیث:۔ جو شخص آدمیوں کے احسان کا حق ادا نہیں کرتا اس نے حق تعالیٰ کے احسان کا حق ادا نہیں کیا۔ (ترمذی)

ف :۔ اور چونکہ شُکر باندازۂ نعمت ہوتا ہے اور کوئی نعمت ذرائع قرب الی اللہ کی رہنمائی سے بڑھ کر نہیں تو جو شخص ایسی راہنمائی کرے اس کا احسان ماننا ہر منعم سے اعظم ہوگا اور ایسا رہنما پیر ہے تو پیر کا حق بہت بڑا ہُوا اور مُرشدوں کے حقوق کا پہچاننا مریدوں کے لیے مثل امر طبعی کے ہوگیا ہے اور شریعت کا طبیعت بن جانا یہ انتہائی کمال ہے، اس سے اس جماعت صوفیا کی فضیلت سمجھ لو۔ (التشرف ص۲۵۲)

اہل اللہ کو وہبی علوم عطا ہونا

حدیث:۔ جو شخص زُہد فی الدنیا اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بدون اس کے کہ وہ کسی سے علم سیکھے علم عطا فرماتا ہے اور بدون اس کے کہ کوئی اس کو ہدایت کرے اس کو ہدایت فرماتا ہے اور اس کو صاحبِ بصیرت بنا دیتا ہے اور اس سے کورباطنی دور فرما دیتا ہے۔

ف :۔ مراد اس علم و ہدایت سے مراد احکام منقولہ نہیں، وہ ہر حال میں محتاج نقل ہیں

بلکہ مراد اسرار و معارف ہیں جو علوم مکاشفہ سے ہیں اور دقائق سلوک ہیں ذوقیات ہیں جو علوم معاملہ میں سے ہیں، ایسے ہی علوم کے عطا ہونے کا مولانا فرماتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستاد

اور اہل اللہ میں اس شان کا ہونا کھلا مشاہدہ ہے جس سے اس جماعت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (التشرف صـ ۴۳۷)

اللہ تعالیٰ کے ہمنشین

حدیث:۔ اللہ تعالیٰ کے ہم نشین (یعنی مقربین) کل کے روز (یعنی قیامت کے دن) وہ لوگ ہیں جو اہل ورع ہیں، (یعنی حرام چیزوں سے بچتے ہیں) اور جو دنیا سے بے رغبت ہیں (یعنی دنیا کی چیزوں سے رغبت نہیں رکھتے گو ان میں سے مباحات کا استعمال کرتے ہوں مگر ان سے ایسی رغبت نہیں رکھتے جو اللہ تعالیٰ سے یا اس کے احکام سے غافل کردے)

ف :۔ ظاہر ہے کہ یہ شان خاص جماعت صوفیاء کی ہے تو اس سے اس جماعت کی فضیلت عظیمہ ثابت ہوئی۔ (التشرف صـ ۳۸۵)

احقر مؤلف محمد اختر عرض کرتا ہے کہ مولانا رومیؒ کا یہ شعر اسی حدیث کی روایت بالمعنی معلوم ہوتا ہے ؎

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا　　گو نشیند با حضور اولیاء

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ اہل اللہ جب جلساء حق ہیں اور جلیس کا جلیس جلیس ہوتا ہے تو ان کے جلیس کا جلیسِ حق ہونا لازم ہے۔

مشائخ کو بھی اپنی اصلاح سے غافل نہ رہنا چاہیئے

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیز گرمی کے دن بقیع کی طرف چلے اور لوگ آپ کے پیچھے چلتے تھے، جب آپ نے جوتیوں کی آواز سنی تو آپ کے قلب پر یہ امر گراں گذرا پس آپ بیٹھ گئے یہاں تک کہ لوگوں کو اپنے آگے کر دیا تاکہ کوئی اثر بڑائی کا آپ کے قلب میں نہ واقع ہو جائے۔ (روایت کیا اس کو ابن ماجہ نے)

ف: میں عرض کرتا ہوں کہ اس حدیث میں غور کرنے سے ناقص تو ناقص کاملین کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں اور ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو زعم کمال کے بعد اپنی نگرانی حال سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ اکابر کو فارغ ہو کر بیٹھنا نہ چاہیئے مثل مُبتدی کے اہتمام اصلاح اعمال اور اندیشۂ تغیر حال میں لگا رہنا چاہیئے اور یہی خیریت ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ فلا یامن مکر اللّٰہ الا القوم الخٰسرون ○ ونعم ما قیل ؎

غافل مرو کہ مرکب مردانِ زہد را در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ اندان بادہ نوش ناگہہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(التکشف۔ بحوالہ بصائر حکیم الامت ص۵۴۳)

اہلِ اللہ کو خوش کرنے کے لیے کوئی طاعت یا خدمت کرنا ریا نہیں

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم مجھ کو گذشتہ شب میں دیکھتے تو بہت خوش ہوتے، میں تمہارا قرآن پڑھنا سن رہا تھا، واقعی تم کو داؤد علیہ السلام کی خوش الحانی کا حصہ عطا ہوا ہے۔ روایت کیا اس کو بخاری و مسلم و ترمذی نے، اور برقانی کی روایت میں مُسلم سے اتنا اور زیادہ ہے کہ ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! واللہ مجھ کو معلوم ہوتا کہ آپ میرا قرآن سُن رہے ہیں تو میں آپ کی خاطر اس کو خوب ہی بنا سنوار تا۔

ف: بزرگوں کا دل خوش کرنے کے لیے اگر کوئی طاعت یا خدمت اچھی طرح کی جائے کہ مخلّی بالطبع ہو کر اس طرح نہ کرتا تو ظاہر میں اس میں شُبہ ریا کا معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ تطییب قلب اہل اللہ بلکہ قلب مسلم خود عبادت ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک عبادت کو دُوسری عبادت کے واسطے اچھی طرح کرتا ہے اس لیے ہرگز یہ ریا نہیں ہے۔ حدیث میں اس کے استحسان پر صاف دلالت ہے۔ اس نادان کو مُدتوں یہ شُبہ رہا کہ اکثر کسی کی فرمائش سے جو قرآن جو عمدہ طرح پڑھنے کی عادت ہے شاید یہ اچھا نہ ہو۔ الحمد للہ کہ اس حدیث کا سِرّ دقیق جس کی ابھی تقریر کی گئی ہے قلب میں فائض ہوا اور یہ شُبہ بالکل دفع ہو گیا۔ پھر اس حدیث پر

نظر پڑنے سے اس کی اور تائید ہوگئی اور حدیث میں دوبارہ غور کرنے سے مقبولانِ الٰہی کی بڑی فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ ان کی طلب رضاء مثل رضائے حق کے ہے جب کہ دونوں میں تعارض نہ ہو اور راز اس میں یہی ہے کہ ان کی رضاء کو رضائے حق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے پس مطلوب بالذات طلب رضائے حق ہی ہے۔ (التکشف بحوالہ بصائر حکیم الامت ص ۵۳۲)

حاصل تصوّف

فرمایا کہ وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا یہ ہے کہ جس طاعت میں سُستی محسوس ہو سُستی کا مقابلہ کرکے اس طاعت کو کرے اور جس گناہ کا تقاضا ہو تقاضے کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔ (وعظ التقویٰ بحوالہ بصائر حکیم الامت ص ۱۰۶)

دَورِ حاضر میں صُحبتِ اہلُ اللہ فرضِ عین ہے

حضرت حکیم الامت مجدد الملت نے فرمایا کہ میں تو اس زمانے میں اہل اللہ کی صُحبت کو فرضِ عین کہتا ہوں اور فتویٰ دیتا ہوں کہ اس زمانے میں اہل اللہ اور خاصانِ حق کی صُحبت اور ان سے تعلق رکھنے کے فرضِ عین ہونے میں کسی کو کیا شُبہ ہوسکتا ہے اور تجربے سے معلوم ہوا کہ آجکل ایمان کی سلامتی کا ذریعہ صرف اہل اللہ کی صحبت ہے۔ اس تعلق کے بعد بفضلہٖ کوئی جادو اثر نہیں کرتا۔ (بصائر حکیم الامت ص ۱۳۶)

اصلاحِ نفس کیلئے اصلی چیز صحبتِ اہل اللہ ہے

فرمایا کہ اصلی چیز اصلاح کے لیے صحبت ہے علم چاہے ہو یا نہ ہو بلکہ علم بھی بلا صُحبت کے بیکار ہے۔ "صاحبِ صُحبت بلا علم" کی اصلاح زیادہ ہوتی ہے، صاحبِ علم بلا صُحبت سے۔ صحابہؓ سب کے سب عالم نہ تھے۔ صرف صُحبت سے پایا جو کچھ پایا اور ہمیشہ اہل اللہ نے صُحبت ہی کا التزام رکھا، اتنی توجہ علم کی طرف نہیں کی جتنی صحبت کی طرف کی۔ (کمالات اشرفیہ ص ۱۴۲)

علم کی نسبت عمل زیادہ قابلِ اہتمام ہے

فرمایا کہ صوفیا علم کے اہتمام سے زیادہ عمل کا اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے اُمت! میں تمہارے متعلق ان چیزوں سے زیادہ اندیشہ نہیں کرتا جن کا تم کو علم نہیں، کیونکہ علم کی کمی میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے وہ بیباکی کی دلیل نہیں، اس لیے جُرم خفیف ہے لیکن یہ دیکھو کہ جن چیزوں کا تم کو علم ہے اُن میں تم کیسا عمل کرتے ہو۔ (کمالاتِ اشرفیہ صـ۹۳)

اہل اللہ کی صُحبت کے بغیر نورِ فہم حاصل نہیں ہوتا

فرمایا کہ نورِ فہم کسی باقی باللہ فانی فی اللہ کی صحبت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اس کے بغیر علم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے طوطے کو بعض لوگ قرآن کی سورتیں یا فارسی جُملے یاد کرا دیتے ہیں۔ (کمالاتِ اشرفیہ صـ۱۰۸)

مشائخ بھی اپنی اِصلاح سے بے فکر نہ رہیں

فرمایا کہ جو شیخ صاحبِ نظر صحیح ہو تو وہ اپنے واسطے کسی کو شیخ تجویز کر لے، اپنے احوالِ خاصہ میں اس کی رائے سے عمل کیا کرے اپنی رائے سے عمل نہ کرے کیونکہ اپنے خیالات و واقعات میں اپنی نظر تو ایک ہی پہلو پر جاتی ہے اور دوسروں کی نظر ہر پہلو پر جاتی ہے اور جس شخص کو دوسرا شیخ نہ ملے تو وہ اپنے چھوٹوں ہی سے مشورہ کیا کرے اس طرح بھی غلطی سے محفوظ رہے گا۔ جب میں مشائخ کے لیے بھی اس کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ وہ بھی کسی کو اپنا بڑا بنا دیں اور اپنے معاملاتِ خاصہ میں محض اپنی رائے سے عمل نہ کریں تو غیر مشائخ کے لیے تو اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ پس ہر شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی رائے سے اپنے کو نفع متعدی کا اہل سمجھ لے، ان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیئے ؎

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار   دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

(بصائرِ حکیم الامت صـ۱۴۴)

گناہ سے دل بے چین رہتا ہے

فرمایا کہ گناہوں کی آگ خدائی آگ ہے جس کی خاصیت یہ ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ۔ اس کا اصل محل قلب ہے اور دعوٰی سے کہا جاتا ہے کہ گنہگار کا دل بے چین ہوتا ہے اس کو راحت و چین نصیب نہیں ہوتا، گناہ سے دل ضعیف اور کمزور ہو جاتا

ہے جس کا تجربہ نزولِ حوادث (یعنی مصیبت) کے وقت ہوتا ہے کہ متقی اس وقت مستقل مزاج رہتا ہے اور گنہگار کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۱۲)

گناہوں کو عظیم سمجھ کر توبہ نہ کرنا کبر ہے

فرمایا کہ بندہ اگر اس وجہ سے توبہ نہ کرے کہ میرے گناہ اس قدر ہیں یا اس درجہ کے ہیں کہ توبہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، یہ بھی حماقت اور شیطان کا جال ہے کیونکہ اگرچہ یہ صورۃً شرمندگی ہے لیکن حقیقت میں یہ کبر ہے کہ اپنے کو اتنا بڑا سمجھتا ہے کہ گویا اس نے حق تعالیٰ کا کچھ ایسا نقصان کر دیا ہے کہ اب اس کو وہ معاف نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو یہ برتاؤ بالکل مساوات کا سا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کاملہ کے سامنے تمہاری اور تمہارے افعال کی ہستی ہی کیا ہے، سارا عالم بھی نافرمان ہو جاوے تو ان کا ذرہ برابر بھی کچھ نقصان نہیں ہو سکتا نہ ان کو عفو و کرم سے مانع ہو سکتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک مچھر بیل کے سینگ پر جا بیٹھا، جب وہاں سے اڑنے لگا تو بیل سے معذرت چاہی کہ معاف کیجئے گا آپ کو میرے بیٹھنے سے بڑی تکلیف ہوئی ہوگی، بیل نے کہا ارے بھائی مجھ کو تو خبر بھی نہیں ہوئی کہ تو کب بیٹھا کب اُڑا۔

اور فرمایا کہ اگر بندوں کو رحمتِ حق کا مشاہدہ ہونے لگے تو گناہوں کو بڑا سمجھنے پر شرمندگی ہوگی۔ نا اُمیدی تو بھلا کیا ہوتی۔

اور فرمایا کہ اگر ساری زمین گناہوں سے بھر جاوے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے۔ دیکھئے بارود ذرا سی ہوتی ہے مگر بڑے بڑے پہاڑوں کو اُڑا دیتی ہے۔

گناہوں سے ڈر کر توبہ کرنا علامتِ ایمان ہے

فرمایا کہ مومن اپنے گناہوں سے ڈرتا ہے گو ادنیٰ ہی گناہ ہو، بخلاف فاجر کے کہ وہ گناہ کو مثل مکھی کے سمجھتا ہے کہ آئی اور اُڑا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ کو سخت سمجھ کر توبہ کرنا علامت ایمان کی ہے اور اس کو ہلکا سمجھنا علامت بے ایمانی کی ہے اور اوپر جو آیا ہے کہ گناہ کو بڑا نہ سمجھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا نہ سمجھے کہ توبہ سے مانع ہو جاوے اور یہاں بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا نہ سمجھے کہ توبہ کی ضرورت نہ سمجھے۔ غرض اصل چیز توبہ ہے۔ جو اعتقاد توبہ سے مانع ہو وہ مذموم ہے خواہ بڑا ہونے کا اعتقاد ہو خواہ چھوٹا

ہونے کا۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۵۷، ص۵۸)

گناہوں کے چھوڑنے کا عجیب و غریب طریقہ

فرمایا کہ ایک طریقہ گناہوں کے چھوڑنے کا یہ بتلایا کرتا ہوں کہ مکان میں کیواڑ (یعنی دروازہ) بند کر کے سوتے وقت روز حق تعالیٰ سے دُعا کیا کرو کہ یا اللہ میں بڑا کمبخت ہوں، نالائق اور پاجی ہوں، غرض خوب سخت سخت الفاظ اپنے لیے استعمال کر کے کہو کہ یا اللہ میری ہمت تو ان گناہوں کے ترک کے لیے کافی نہیں آپ ہی مدد فرمائیں، یہ ترکیب کر کے دیکھو انشاء اللہ ایک دو ہفتہ ہی میں سب گناہ ختم۔ مگر کوئی کرتا ہی نہیں، جیسے کوئی لڑکا سبق یاد نہ کرے اور میاں جی سے کہے کہ تمہیں سبق یاد کرا دو۔ (اقتباس از ملفوظ ص۱۳۱ کمالاتِ اشرفیہ)

گناہ سے مادۂ معصیت اور قوی ہو جاتا ہے

فرمایا کہ درحقیقت یہ شیطان کا ایک دھوکا ہے کہ گناہ کر لینے سے تقاضا کم ہو جائے گا مگر اس کا اثر یہ ہوگا کہ آئندہ کے لیے مادۂ معصیت قوی ہو جائے گا اور ازالہ قدرت سے باہر ہو جائے گا۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۵۷)

وصول الی اللہ کا راستہ

فرمایا کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ جاتے رہیں، حمیدہ پیدا ہو جائیں، معاصی چھوٹ جائیں، طاعت کی توفیق ہو جاوے، غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جاوے۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص۱۷۱)

حکیم الامت کے وہ ارشادات جن کو خواجہ صاحبؒ نے منظوم فرمایا تھا اس کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

سستی کا علاج

فرما گئے ہیں حکیم الامتؒ
سستی کا علاج بس ہے چستی

نفس سے جہاد مسلسل مطلوب ہے

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبا لے کبھی تو دبا لے

مایوسی کا علاج

جو نا کام ہوتا رہے عمر بھر بھی
بہر حال کوشش تو عاشق نہ چھوڑے
یہ رشتہ محبت کا قائم ہی رکھے
جو سو بار ٹوٹے تو سو بار جوڑے

بری خواہش کے غلبہ کا علاج

طبیعت کی رو زور پر ہے تو رک
نہیں تو یہ سر سے گذر جائے گی
ذرا دیر کو تو ہٹا لے خیال
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی

نفس پر عدم اعتماد

بھروسہ کچھ نہیں اس نفس امارہ کا اے زاہد
فرشتہ بھی یہ ہو جائے تو اس سے بدگماں رہنا

اختیاری اور غیر اختیاری

نگارہ اسی میں جو ہے اختیاری
نہ پڑ امر غیر اختیاری کے پیچھے
عبادت کیے جا مزہ گو نہ آئے
نہ آدھی کو بھی چھوڑ ساری کے پیچھے

وساوس کا علاج

وساوس جو آتے ہیں اس کا ہو غم کیوں
عبث اپنے جی کو جلانا برا ہے
خبر تجھ کو اتنی بھی ناداں نہیں ہے
وساوس کا لانا کہ آنا برا ہے

عقل، طبع، شرع

رکھ ہمیشہ نظر میں دو باتیں
اے دو عالم کی خیر کے طالب
طبع غالب نہ عقل پر ہو کبھی
اور نہ ہو عقل شرع پہ غالب

دنیا کی لذت اور معصیت

ترکِ دنیا کر نہ ہر لذت کو چھوڑ
معصیت کو ترک کر غفلت کو چھوڑ

نفس و شیطاں لاکھ در پے ہوں مگر — تُو نہ ہرگز ذکر اور طاعت کو چھوڑ

یہ چند نمونے مختصراً سلوکِ منظوم پیش کیے گئے جو درحقیقت حکیم الامتؒ کے مجددانہ اور حکیمانہ ارشادات ہیں جن کو حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب نے نظم کیا تھا۔ بس ان کا مطالعہ دراصل حضرت حکیم الامتؒ ہی کے ارشادات کا مطالعہ ہے۔

اور آخر میں حضرتؒ کے ایک ملفوظ پر اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں جو نچوڑ ہے سارے تصوف کا اور دین سیکھنے اور حق تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا سب سے آسان اور لذیذ طریقہ ہے۔

محبتِ حق حاصل کرنے کا آسان طریقہ

فرمایا کہ محبتِ حق پیدا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ محبت والوں کے پاس بیٹھنا شروع کر دے

آہن کہ بپارس آشنا شُد — فی الحال بصورت طلا شد

(کمالات اشرفیہ ص۵۸)

(ترجمہ:۔ لوہا جب پارس پتھر کی صحبت پا جاتا ہے تو فی الفور سونا بن جاتا ہے اور کیسا بن جاتا ہے بس لوہے کو چاہیے کہ پارس کے پاس بیٹھ کر تجربہ کر لے۔ مؤلف)

حضرت حکیم الامت کی شان میں کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکوں کی جھنکاریں
ترے دستِ توکل میں تھیں استغناء کی تلواریں
جلالِ قیصری بخشا جمالِ خانقاہی کو
سکھائے فقر کے آداب تُو نے بادشاہی کو
کہیں مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستورِ میخانہ

اللہ تعالیٰ اس مقالہ کو قبول فرمائیں اور اُمتِ مسلمہ کے لیے نافع اور احقر کے لیے صدقۂ جاریہ بنائیں اور ہم سب کو حضرت حکیم الامت کی تعلیمات پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔

ملفوظات

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ماخوذ از "کلام الحسن"
مرتب : حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسریؒ
تلخیص حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب

◆

(۱) فرمایا آداب تلاوت تو بہت ہیں مگر میں ایک ہی ادب بیان کرتا ہوں جس میں سب آجائیں اور وہ یہ ہے کہ یوں خیال کرے کہ اللہ تعالے نے مجھ سے فرمائش فرمائی ہے کہ تم پڑھو ہم سنتے ہیں تو جس طرح کسی کو سنانے کے وقت خاص اہتمام سے سنوار سنوار کر پڑھتا ہے ویسا پڑھنا چاہیئے اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح سنانے کے وقت تو مخلوق کو خوش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ ریاء ہے تو تلاوت میں گویا معصیت سے اعانت لی گئی۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ مخلوق کو خوش کرنا دو طرح سے ہوتا ہے ایک یہ کہ خوش ہو کر میرے معتقد ہو جاویں اور ان سے کچھ مجھ کو اس وجہ سے نفع پہنچے تو یہ ریاء ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان کا جی خوش کرنا عبادت ہے۔ پس اگر اپنے پڑھنے میں مخلوق کی دوسری قسم کی خوشی ملحوظ رکھے تو جائز ہے بلکہ موجب اجر ہے۔ جیسا حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ رات تم قرآن پڑھ رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ انہوں نے عرض کیا اگر مجھ کو معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو لحبّرت تحبیرًا یعنی میں اس کو اور بھی زیادہ سنوار کر پڑھتا۔ پس یہ پڑھنا ان کا جس کا عزم انہوں نے ظاہر کیا اگر ریا منہی عنہ ہوتا تو حضور صلعم ایسی قرأت سے منع فرما دیتے مگر آپ کا منع نہ فرمانا دلیل ہے کہ کسی کا دل خوش کرنے کو پڑھنا ریاء نہیں۔ تلاوت قرآن عزیز کا یہ ادب مجھ کو بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا۔ اب رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں فرمائش کی ہے کہ یہ تلاوت کرے اور میں سنوں اس کا جواب یہ ہے کہ جا بجا اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے اتلُ[1] ما اوحی الیک من الکتاب اسی طرح حدیث شریف میں ہے

---

[1] آپ تلاوت فرمایئے جو آپ کی طرف کتاب سے وحی کی گئی ہے۔

ما اذن[1] بشیٔ ما اذن لنبی یتغنی بالقرآن۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کان کا لگانا نبی ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ تغنی بالقرآن کی وجہ سے ہے پس اس سے ثابت ہوا کہ ہم گویا اللہ میاں کو اس کی فرمائش کے بعد قرآن سنا رہے ہیں۔

پھر اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح سنوار کر پڑھنے سے پھر جلدی تلاوت نہ ہوسکیگی تو تلاوت کی مقدار کم ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پڑھنے والا یوں خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی یوں فرمایا ہے کہ جلدی جلدی پڑھو۔ یعنی بدون ترسیل کے خواہ ترتیلاً یا حدراً ۔

(۲) امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالےٰ سے خواب میں استفساراً عرض کیا کہ آپ کا قرب کس چیز سے زیادہ ہوتا ہے۔ فرمایا قرآن شریف پڑھنے سے امام احمدؒ نے پوچھا بفہم او بلا فہم (یعنی سوچ سوچ کر پڑھنے سے تب قرب بڑھتا ہے یا بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے بھی) تو جواب ملا بفہم و بلا فہم (یعنی سوچ سمجھ کر پڑھنے سے بھی اور بلا سوچے پڑھنے سے بھی)

(۳) فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ اگر تدبر سے تلاوت کرتا ہوں تو مقدار کم رہتی ہے اور اگر بلا تدبر کرتا ہوں تو معانی کا خیال نہیں ہوتا۔ میں نے اس سے کہا تلاوت دو وقت کیا کرو ایک وقت میں تدبر سے پڑھو اور دوسرے وقت میں محض تلاوت کو مقصود سمجھ کر فرفر پڑھتے چلے جاؤ۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

(۴) فرمایا بڑے بننے کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بنے پھر خود بخود اس میں یہ اثر ہے کہ بڑا بن جائے گا۔ مگر بڑے بننے کی نیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سلاطین اور مشائخ کی تصنیفات میں ایسی تو ہزاروں حکایات منقول ہیں کہ انہوں نے تواضع کی۔ مگر کسی نے ان کے تکبر کی حکایات مدح میں نقل نہیں کیں اور اس میں ذلت نہیں ہے ذلت کی حقیقت صرف عرض حاجت ہے پس بوجھ اٹھانا یہ گاڑھا پہننا ذلت نہیں یہ تو ترجیح ہے۔

(۵) فرمایا استغناء اور کبر میں بڑا فرق ہے۔ کبر تو مذموم ہے اور استغناء محمود ہے۔ مگر غلو استغناء میں بھی اچھا نہیں۔ البتہ غلو فی الاستغناء یعنی اہل کبر کے مقابلہ میں عالی دماغی اچھا ہے اور خلو سب سے اچھا ہے یعنی کسی طرف بھی التفات نہ ہو۔

---

[1] خدا تعالیٰ کسی چیز کی طرف کان نہیں لگاتا۔ جیسا کان لگاتا ہے نبی کی طرف جب کہ وہ قرآن مجید کی خوش الحانی سے تلاوت فرماتے ہیں۔

(۶) فرمایا مولانا محمد قاسمؒ صاحب جب رامپور تشریف لے گئے۔ آپ کو نواب کلب علی خان والئے رامپور نے بلایا۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ آداب شاہی سے ناواقف ہوں۔ اس واسطے آپ کو میرے آنے سے تکلیف ہوگی۔ انہوں نے کہا ہم خود آپ کا ادب کریں گے نہ کہ آپ سے ادب کا مطالبہ کریں۔ ضرور تشریف لائیے مجھ کو بیحد اشتیاق ہے۔ اس پر مولاناؒ نے فرمایا سبحان اللہ اشتیاق تو آپ کو اور ملنے کو میں آؤں۔ دعا کرو کہ مجھے بھی اشتیاق پیدا ہو جائے پھر ملاقات کر لوں گا۔

(۷) فرمایا جھوٹ تو سیاہ ہوتا ہے۔ خدا جانے اس محاورہ کی کیا وجہ ہے کہ یہ سفید جھوٹ ہے کیونکہ معاصی سب ظلمات ہیں۔

(۸) ایک اہل علم نے سوال کیا کہ نسبت کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا نسبت تعلق کا نام ہے۔ اور اس کے لئے دو چیزیں لازم ہیں۔ (۱) ذکر۔ (۲) طاعت۔ مگر یہ دو قسم کی ہے ایک ضعیف دوسری قوی اور راسخ پہلی قسم تو مطلق ایمان کے سبب فساق اہل ایمان کو بھی حاصل ہے۔ قال اللہ تعالیٰ اللہ ولی الذین آمنوا دوسری قسم مخصوص ہے اولیاء کے ساتھ قال اللہ تعالیٰ الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون

(۹) فرمایا صاحب الیواقیت نے لکھا ہے کہ صوفی کی حقیقت عالم باعمل ہے۔ کیسی جامع تفسیر ہے۔

(۱۰) ایک صاحب علم نے سوال کیا کہ قلب پر معصیت سے جو سیاہی ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ فرمایا اس کی حقیقت ہے ایک خاص قسم کی ظلمت جس کا اثر طاعات سے بے رغبتی پیدا اور معاصی کی رغبت ہو۔ اور اس کے برخلاف اعمال صالحہ سے نور پیدا ہوتا ہے اور نور کے معنی حسی روشنی نہیں ہے بلکہ نور کی حقیقت ہے "ظاہر[3] فی نفسہٖ ومظہر لغیرہٖ" اور اس کے کئی اقسام ہیں۔ ایک قسم کا نور جو عبادت سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ وجدانی شئی ہے جس کا اثر ہے عبادت میں قلب کا انشراح اور رغبت اور معاصی سے نفرت اس پر احقر[4] نے عرض کیا کہ قلب سے مراد شکل صنوبری ہے یا کچھ اور تو فرمایا کہ صوفیہ کی اصطلاح میں قلب ایک لطیفہ ہے جو مجرد ہے۔ اور صوفیہ نے کشف سے اشیاء حادثہ میں پانچ چیزیں مجرد مانی ہیں۔ (۱) قلب (۲) روح

---

[1] اللہ تعالیٰ ولی ہے اہل ایمان کا۔ [2] سن لو کہ اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔ [3] جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کر دے۔

[4] المراد بہ مولانا محمد حسین سلمہ ربہ ۱۲

(۳) سر (۴) خفی۔ (۵) اخفیٰ۔ یہ سب لطائف کہلاتے اور ان کے محل بھی تجویز کئے ہیں۔ اور بعض نے چھ لطائف لکھے ہیں جن میں ایک نفس ہے اور واقع میں وہ قوت مادیہ باعث علی الشر ہے لیکن تغلیباً اس کو بھی مجردات میں شمار کر لیا ہے۔ لیکن متکلمین تجرد کو واجب کے خواص میں سے تسلیم کرتے ہیں اور صوفیہ کے قول کو غلط کہتے ہیں لیکن صوفیہ و فلاسفہ کے نزدیک اخص صفات واجب الوجود صرف وجوب بالذات ہے اس لئے ممکنات میں بھی مجردات کے قائل ہوئے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ فلاسفہ نے مجرد کو قدیم بالزمان مانا ہے۔ اور صوفیہ سوائے واجب الوجود کے جملہ مجردات کو حادث بالزمان کہتے ہیں۔ پس صوفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ روح مجرد ہے اور بدن کے ساتھ اس کا تعلق حلول کا نہیں بلکہ محض تدبر کا ہے۔ اور متکلمین روح کو جسم لطیف مانتے ہیں اور اس کا تعلق بدن کے ساتھ سرایت کا مانتے ہیں۔ اور اس کی نسبت بدن کے ساتھ ایسی مانتے ہیں جو جسم تعلیمی کو جسم طبعی کے ساتھ ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جسم تعلیمی عرض ہے اور روح مجرد ہے (اس پر احقر نے عرض کیا ان فی الجسد لمضغة سے تو جسم صنوبری ہی قلب کا مصداق معلوم ہوتا ہے، فرمایا تلبس کی وجہ سے جسم صنوبری کو قلب کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر اس کو مضغہ کہہ دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ سیاہی اور رین جو معاصی کی وجہ سے ہوتا ہے وہ قلب مجرد ہی پہ ہوتا ہے۔

(۱۱) فرمایا شاہ عبدالعزیز صاحب سے کسی نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں جمعہ کی نماز پڑھنا کیسا ہے۔ فرمایا جیسے جمعرات کی نماز پڑھنا۔ اسی طرح کسی نے شاہ صاحب سے سوال کیا کہ فاحشہ عورت کا جنازہ پڑھنا جائز ہے فرمایا اس کے آشناؤں کا کیسے جائز سمجھتے ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو سائل کے فہم کے موافق جواب دینے میں اللہ تعالیٰ نے کمال عطا فرمایا تھا۔

(۱۲) فرمایا خواجہ عزیز الحسن صاحب نے سوال کیا تھا کہ عذاب ابدی اور رحمت حق کو جب موازنہ کر کے خیال کریں تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اس وقت قلب میں یہ جواب پیدا ہوا کہ یہ استبعاد اپنے انفعال سے پیدا ہوتا ہے مثلاً انسان جب اپنے دشمن کو سزا دیتا ہے تو اس کی حالت زار کو دیکھ کر رحم کرتا ہے۔ یہ انفعال اور اللہ تعالیٰ انفعال سے پاک ہیں۔ ان کا عذاب اور قہر ارادی ہے اور اختیاری ہے جو ان کے کفر پر تجویز کیا گیا ہے تو یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے جہنم میں گرتے ہیں اور خلاف رحم تب ہوتا کہ جب پہلے سے پتہ نہ دیا ہوتا باقی ایسے

علوم میں زیادہ غور کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ علوم واجب کے ارادہ اور علم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ارادہ اور علم صفات واجب میں سے ہے۔ اور ان کا ادراک بالکنہ محال ہے۔ اس لئے ایسے علوم کی حقیقت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی واسطے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے مسائل کی تحقیق سے منع فرما دیا ہے اور ان کے سمجھنے کو کوئی قرب حق میں دخل ہے بلکہ اس کے عدم فہم میں قرب حق ہے کہ ہمارے روکنے سے ہمارا بندہ رک گیا۔ اور جن جن مسائل کی تحقیق مزید سے منع فرمایا ہے جیسے مسئلہ قدر وغیرہ وہ سب ایسی ہی ہیں۔ گو ایسی تعلیمات حاکمانہ ہیں۔ مگر قرآن کا طرز زیادہ حاکمانہ ہی ہے۔ چنانچہ شیطان کے دلائل کے جواب میں اخرج فرمانا اور اس کے مقدمات و دلائل کا جواب نہ دینا اس کی دلیل ہے اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ حکیمانہ جواب سے یہ طریق حاکمانہ زیادہ مفید ہے۔

(۱۳) فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب سے سیوہارہ میں کسی نے مجلس مولد کے بارہ میں دریافت کیا تو فرمایا نہ تو اتنا برا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور نہ اچھا ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔

(۱۴) فرمایا مولوی تراب صاحب اور مفتی سعد اللہ صاحب میں مسئلہ مولد میں اختلاف تھا۔ مولوی تراب صاحب مولد کے قائل تھے اور مفتی صاحب مانع تھے ایک باہم ملاقات ہوئی نے کہا ابھی تک آپ کا انکار ہی چلا جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا اور ابھی تک آپ کا اصرار ہی چلا جاتا ہے مولوی تراب صاحب نے کہا واللہ ہم صرف محبت سے کرتے ہیں مفتی صاحب نے کہا ہم صرف متابعت کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔ اس پر مولوی تراب صاحب نے کہا الحمد للہ ہم دونوں ناجی ہیں۔

(۱۵) فرمایا آج کل عورتیں میمیں بن گئیں اور مرد ایم اے بن گئے۔

(۱۶) فرمایا امور طبعیہ مذمومہ سے طبعی مسرت ہونا معصیت نہیں ہے۔ مثلاً رشوت کا مال ملنے سے جو مسرت ہوتی ہے وہ طبعی ہے۔ عقیدہ میں تو اس کا قبح ہی ہوتا ہے۔

(۱۷) فرمایا، خلافت قریشی کے لئے ہے۔ غیر قریشی بادشاہ کو سلطان کہا جائے گا۔ لیکن اطاعت اس کی واجب ہوگی۔ اور گو نصب خلیفہ واجب ہے لیکن واجب کے لئے قدرت شرط ہے۔ اور قدرت اس وقت مفقود ہے۔ اس واسطے گو عالم اس وقت خلیفہ سے خالی ہے لیکن بایں حالات خلیفہ کے نہ ہونے سے کوئی گناہ نہیں۔ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ غیر قریشی بھی خلیفہ ہو سکتا ہے تو یہ نص کا خلاف ہے یعنی الائمۃ من قریش نیز حضرات انصار پر جب یہ نص پیش کی گئی تو انہوں نے بھی اس کو تسلیم فرمایا۔ بس گویا اس پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔ البتہ جن لوگوں کے قبضہ میں سلطنتیں ہیں وہ اگر قریشی کو جبکہ اس میں اہلیت ہو خلیفہ نہ بناویں تو مجرم ہونگے

(۱۸) فرمایا۔ ادب کی حقیقت راحت رسانی ہے جس برتاؤ میں تکلیف ہو وہ ادب نہیں گو صورۃً ادب ہو۔ دیکھئے حضرات صحابہ کرامؓ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہ وسلم سے بے تکلف رہتے تھے۔

(۱۹) فرمایا بزرگوں کے تبرکات میں ایک عام بے عنوانی ہو رہی ہے کہ ان میں میراث جاری نہیں کرتے حالانکہ وہ کسی کی ملک ہی تھے۔ اس لئے کسی ایک کا مثلاً صاحب سجادہ کا ان پر قبضہ رکھنا جائز نہیں۔ سندھ میں ایک بزرگ نے جو کہ پیر جھنڈا مشہور ہیں اپنے اخیر وقت میں اپنے ورثاء کو وصیت کی تھی کہ میرے بعد جو معاملات پیش آئیں تھانہ بھون سے فتویٰ منگا کر عمل کرنا۔ ان کے یہاں تبرکات بھی تھے۔ میں نے ان کے متعلق بھی ان لوگوں کو لکھ دیا تھا۔ کہ ان میں میراث جاری کرنا واجب ہے۔ اور وقف کی تاویل اس لئے نہیں ہو سکتی کہ منقول غیر معتاد الوقف کا وقف جائز نہیں۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

(۲۰) فرمایا حقائق میں افراط و تفریط ہو گئی ہے۔ اگر ادب کرتے ہیں تو تکلف کرنے لگتے ہیں اور بے تکلفی کرتے ہیں تو گستاخی کرنے لگتے ہیں۔ گویا کہ اعتدال کوئی چیز ہی نہیں۔

(۲۱) فرمایا مولانا حسین احمد صاحب بہت شریف طبیعت کے ہیں۔ باوجود سیاسی مسائل میں اختلاف رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حدود ان سے نہیں سنا گیا۔

(۲۲) فرمایا جب میں گھر جاتا ہوں تو راستہ میں محلے کے بچے سب پاس آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر دروازہ تک ساتھ آتے ہیں۔ دروازہ میں پہنچا کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ایک شخص کا مقولہ نقل کیا کہ بچوں کا میلان کسی شخص کی طرف یہ مقبول ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ ان کا قلب تو صاف ہوتا ہے۔ خیر مقبول ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ مگر اس سے کسی قدر تو طمع ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ رحم فرمائیں گے۔

(۲۳) فرمایا میری سادگی کی تو ایک سی حالت رہتی ہے۔ بعضے لوگ اس کو تواضع کہنے لگتے ہیں بعضے تکبر کہنے لگتے ہیں اور واقع میں نہ وہ تواضع ہے نہ تکبر ہے۔ بیساختگی ہے۔

(۲۴) فرمایا۔ ہر شخص خدا تعالیٰ کا قائل ہے چاہے وہ اپنے قصد سے انکار ہی کرے۔ کیونکہ کسی نہ کسی کو فاعل حقیقی مانے ہی گا اور فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ اس طرح سے بلا قصد اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے گو غیر فاعل کو فاعل سمجھ گیا ہے۔ حدیث[1] لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر میں اسی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ خدا تعالیٰ ہی زمانہ ہے۔

(۲۵) ایک مہتمم مدرسہ نے لکھا کہ میں مدرسہ کی قلم دوات سے اپنا خط نہیں لکھتا۔ اس میں نفس کا کوئی قید تو نہیں؟ فرمایا اس میں قید نفس نہیں بلکہ قید نفس ہے جس میں صید نفس ہے۔

(۲۶) ایک شخص نے خط لکھا کہ میرے لئے دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اولاد عنایت فرما دیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جب آپ اپنے لئے دعا نہیں فرماتے تو میرے لئے کیسے دعائیں گے۔ اسی پر فرمایا کہ تمہارے لئے دعا کروں گا۔ کیونکہ مجھے تو اولاد کی خواہش نہیں تعلقات سے جی گھبراتا ہے اور تم کو خواہش ہے تمہارے لئے دعا کروں گا پھر فرمایا کہ میں تو مجنون ہو جاتا اگر اولاد ہوتی۔

(۲۷) فرمایا۔ اگر کسی سے عقیدت اور محبت ہو تو اس کے ساتھ خواہ اختلاف ہو جائے مگر خلاف نہ ہونا چاہیئے

فرمایا۔ دین سے کامل مناسبت بزرگوں کی صحبت ہی سے ہوتی ہے۔ کتابوں سے نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے کسی نے کہا ہے ؎

جملہ اوراق وکتب در نار کن   سینہ را از حق گلزار کن

(۲۸) فرمایا۔ رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں ایک عبادت خاص ہے جس کو اعتکاف کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بلا ضرورت شدید مسجد سے نہ نکلے۔ خواہ مسجد میں سوتا ہی رہے۔ خواہ پڑا رہے۔ البتہ نماز پنجگانہ ادا کرے اور گناہ سے بچتا رہے۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت یا ذکر و اذکار وغیرہ اس کے لئے شرط نہیں ہیں اعتکاف پر جو ثواب موعود ہے وہ اس حالت میں بھی مل جائے گا۔ کیسی عجیب عبادت ہے کہ کرا کرایا کچھ بھی نہیں یعنی کوئی مشقت کا کام نہیں کیا اور ثواب مفت کا ہاتھ آگیا۔ اس کی عقلی وجہ بیان کرنا ضروری تو نہیں مگر میں تبرعاً بیان کرتا ہوں۔ آپ نے مسجد کی حقیقت ہی نہیں سمجھی۔ مسجد کی حقیقت ہے دربار خداوندی اور آستانۂ شاہی۔ اسی واسطے اس کے آداب میں سے ہے کہ بازاروں کی طرح اس میں آوازیں بلند نہ کریں۔ طہارت اور صفائی کو لازم سمجھیں اب اعتکاف کی حقیقت سمجھئے۔ اس کی حقیقت ہوئی دربار خداوندی میں پڑا رہنا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کسی دنیا دار انسان کے دروازہ پر کتا بھی پڑا رہے تو دو چار دن تو شاید تغافل کرے آخر اس کو روٹی دے دیتا ہے کہ میرے دروازے پر پڑا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ تو ارحم الراحمین ہیں وہ ایسے شخص پر کیوں نہ عنایت فرمائیں گے۔ خوب کہا گیا ہے ؎

خسرو غریب است وگدا افتادہ در کوئے شما   باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

اور حدیث میں اعتکاف کی ایک خاص فضیلت آئی ہے۔ یعکف الذنوب ویجری لہ من

الحسنات کعامل الحسنات کلہا۔ رواہ ابن ماجہ۔ پہلے جملے کا مضمون تو ظاہر ہے کہ سب معاصی سے بچنے کا ثواب ملتا ہے کیونکہ واقع میں وہ سب معاصی سے بچا رہا۔ لیکن دوسرے جملہ میں یہ سوال ہے کہ جب واقع میں اس نے سب حسنات نہیں کیں تو پھر سب حسنات کا ثواب کیسے ملے گا۔ سو اس حدیث کا مطلب جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ حسنات سے مراد یہاں خاص وہ حسنات ہیں جن کو اعتکاف میں بیٹھنے کی وجہ سے ادا نہیں کرسکتا۔ مثلاً نماز جنازہ۔ عیادت مریض وغیرہ۔ پس اگر معتکف کو ان کا ثواب نہ ملتا تو یہ حسرت ہوتی کہ اچھا اعتکاف کیا۔ ایک عبادت کے سبب ہزاروں ثواب کی باتوں سے رہ گئے تو حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وعدہ فرمالیا کہ نہیں ان سب کا ثواب تم کو ملے گا کیونکہ نیت تو رفع موانع کی حالت میں عمل کرنے کی تھی اس واسطے ثواب مل گیا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث میں حسنات تو مطلق ہیں اس لئے یہ تخصیص کہ وہی حسنات مراد ہوں جن کو اعتکاف کی وجہ سے ادا نہیں کرسکا ٹھیک نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ممکن ہے مگر جو صورت میں نے بیان کی ہے وہ ذوق سے زیادہ قریب ہے گو حق تعالیٰ کسی کے ذوق کے پابند نہیں اور اجتناب عن المعاصی کا ثواب ملنے میں بھی ایک قید سمجھا ہوں وہ یہ کہ جن معاصی کے ارتکاب سے بچنے کی نیت سے اعتکاف کیا خاص ان سے بچنے کا ثواب ملے گا۔ کل معاصی سے بچنے کا ثواب مراد نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ معاصی تو لاکھوں کروڑوں ہیں مثلاً ایک عورت سے زنا کرنا دوسری سے زنا کرنا الیٰ مالا یتناہی ایک شخص کو قتل کرنا دوسرے کو قتل کرنا الیٰ مالا یتناہی اگر سب پر ثواب ملے تو چاہیئے کہ ہر آن میں ہر شخص کو غیر متناہی ثواب ملا کرے اور یہ بہت ہی بعید ہے۔ نیز اس کا کوئی قائل بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلق ترک معصیت موجب اجر نہیں بلکہ جو ترک بطور کف کے ہو اس پر اجر ملتا ہے۔ اور کف عن المعاصی کا وہی حاصل ہے کہ اس سے بچنے کی نیت ہو پس اعتکاف کو جس کف عن المعاصی کا مقدمہ بنایا ہے۔ ان ہی معاصی سے کف پر ثواب ملے گا نہ کہ کل معاصی سے بچنے کا اور اگر کوئی معاصی اور حسنات دونوں میں تعمیم کی امید رکھے تو خدا تعالیٰ کی رحمت میں کیا تنگی ہے۔ اس امید پر معتکف کو لاکھوں گناہوں کے ترک کا اور لاکھوں حسنات کے مباشرت کا ثواب بدون مباشرت عمل کے مل سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اقرب الی القواعد تو دونوں جگہ تقلید و تخصیص ہے۔ لیکن اگر کوئی حسنات کو عموم پر رکھے اور ایسا ہی معاصی کو بھی اطلاق و عموم کے درجہ میں سمجھے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ پس نفی عموم سے غموم میں نہ پڑے۔

دوسری عبادت رمضان شریف میں لیلۃ القدر کا قیام ہے۔ لیلۃ القدر کی تعیین میں نوویؒ نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ مگر راجح قول یہ ہے کہ وہ عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں ہے۔ پھر اس میں بھی دو احتمال

ہیں ایک یہ کہ معین ہے ۔ دوسرا یہ کہ دائر ہے۔ کبھی اکیسویں میں اور کبھی ستائیسویں میں مثلاً اور دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے۔ پھر حق تعالیٰ کی اس میں حکمت دیکھئے کہ عشرۂ اخیرہ کی ہر رات کو شب قدر کی تلاش کے لئے مقرر نہیں فرمایا بلکہ وتر (طاق) راتیں مقرر کیں تاکہ درمیان میں ایک رات آرام کر لیا کریں ورنہ عشاق تو آنکھیں ہی پھوڑ لیتے کیونکہ دن کو سونے میں اتنی راحت نہیں جتنی رات کے سونے میں ہوتی ہے تو اس صورت میں دسوں راتیں جاگنے ہی میں گذرتیں اور اس رات فضیلت یہ ہے کہ اس میں ہزار مہینہ کی عبادت سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ ہزار مہینہ کے برابر ہے یہ غلط ہے خیر من الف شہر میں اس کی تصریح ہے۔ آگے صرف یہ سوال رہا کہ اس زیادت کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ سو ظاہر ہے کہ حد اور قید کی کوئی دلیل نہیں اس لئے لاکھ اور کروڑ اور ارب سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ محاورہ میں جب یہ کہتے ہیں کہ ہزار سے بہتر تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہزار سے تو زیادہ مگر ہزار سے قریب جیسے کہتے ہیں سو کے قریب تو معنیٰ اس کا ہوتا ہے کچھ زیادہ۔ پس اسی طرح یہاں مراد ہونا چاہیئے۔ تو لاکھوں کروڑوں کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سو پہ قیاس غلط ہے۔ کیونکہ عربی محاورہ میں سو سب سے بڑا عدد نہیں اور الف کا لفظ سب سے بڑا عدد ہے۔ یعنی اس کے اوپر مفرد عربوں کے ہاں نہیں ہے۔ پس خیر من الف شہر کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہارے نزدیک جو سب سے بڑا عدد ہے اس سے بھی —— زیادہ (یا بہتر) ثواب ہوگا۔ اگر قرآن شریف اردو زبان میں ہوتا تو اس مقصود کے ادا کے لئے یوں فرماتے کہ سنکھ سے بہت بہتر ثواب ہوگا پس اس بنا پر اگر کوئی یوں امید رکھے کہ بیشمار ثواب ہوگا جو شمار ہی میں نہیں آتا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کو انا عند ظن عبدی بی کے مطابق اس طرح ملے گا۔ حق تعالیٰ بندے کے ساتھ اس کے ظن کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

اور وتر یعنی طاق راتیں وہ ہیں جن کے بعد طاق عدد کا روزہ ہو مثلاً بیسواں دن گذر کر جو رات آئے گی وہ اکیسویں ہو گی وعلیٰ ہذا کیونکہ شریعت میں رات پہلے آتی ہے دن اس کے بعد آتا ہے بجز حج کی رات کے کہ اس میں شریعت نے عوام کی آسانی کے لئے ان ہی کے محاورہ کے موافق مقرر فرما دیا یعنی جیسے عوام کے محاورہ کے مطابق دن پہلے ہوتا ہے رات پیچھے ہوتی ہے۔ اسی کے موافق راتیں احکام کے لئے مقرر فرما دیں۔ سبحان اللہ وہ بندوں کے ضعف کی کس قدر رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی اپنی بے سمجھی سے نویں تاریخ دن کے وقت عرفات نہ پہنچ

سکے تو چونکہ اس کے زعم میں اگلی رات نویں رات ہے اس لیے اس رات کو بھی نویں مقرر فرما دیا۔ پس اگر عرفات میں اس رات کے کسی حصے میں بھی چلا گیا تو حج ہو جائے گا۔ اب یہ بات رہ گئی کہ ان راتوں میں جاگنے کی کیا مقدار ہونا چاہیئے۔ سو میرا یہ خیال ہے کہ لیالی قدر میں بقیہ راتوں کی نسبت معمول سے زیادہ جاگنا کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ ساری رات جاگے اب یہ بات رہ گئی کہ ان میں کونسی عبادت کرنا زیادہ بہتر ہے۔ سو سب سے بہتر عبادت اس رات میں نفل پڑھنا ہیں۔ کیونکہ قیام کی فضیلت ہے۔ اور قیام نفلوں میں ہو سکتا ہے۔ اگر کچھ تلاوت اور ذکر بھی کر لے تو بہتر ہے۔ مگر ذکر میں صوفیہ کی قیود کی پابندی ضروری نہیں کیونکہ ان قیود میں ایک خاص مصلحت ہے باقی عبادت وہ بھی ہے جو ان سے خالی ہو اور خود صوفیہ بھی جب منتہی ہو جاتے ہیں ان قیدیوں کو ترک کر دیتے ہیں مثلاً ضربیں وغیرہ لگانا۔ جہر کرنا کوئی خاص ہیئت بنانا وغیرہ۔

(۲۹) فرمایا کتب درسیہ کے بعد قرآن شریف کی تفسیر پڑھنے سے لغات اور اصطلاحات میں خلط ہو جاتا ہے۔ اور اس سے بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً لفظ ظن کو قرآن شریف میں ملاحسن کے "ظن" کی اصلاح میں سمجھ گئے پھر اس سے احکام میں خبط ہونے لگا۔ حالانکہ قرآن شریف میں اور اسی طرح محاورات عرب میں ظن یقین سے لے کر خیالات باطلہ تک بولا جاتا ہے۔ مثلاً انہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین الذین یظنون میں ظن بمعنی یقین ہے اور ان نظن الا ظنا میں ظن بمعنی خیالات باطلہ مستعمل ہے اور باقی مراتب کی مثالیں تم خود سمجھ لو گویا کہ علم کے جمیع مراتب پر ظن کا اطلاق آتا ہے جیسا قرینہ ہو۔ اب یہ اشکال نہ رہا کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً سے بعض مسائل کی تخصیص کی جائے کیونکہ فروع فقہیہ میں تو ظن بمعنی جانب راجح معتبر ہے بلکہ آیت میں ظن سے مراد خیال بلا دلیل ہے اور اس قسم کا ظن اثبات حق کے لئے کافی نہیں باقی جو ظن مستند الی الدلیل ہو وہ مثبت حکم ظنی ہو سکتا ہے (جامع عرض کرتا ہے کہ حضرت نے اس آیت کے ذیل میں تفسیر بیان القرآن میں خوب تفصیل فرمائی ہے)۔

(۳۰) فرمایا آیت "لو علم اللہ فیھم خیرا لاسمعھم ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون۔" کا سہولت کے ساتھ سمجھنا بھی فنون پر موقوف ہے۔ کیونکہ ظاہراً اسمعھم حد اوسط ہے۔ پھر بھی حد اوسط گرانے کے بعد نتیجہ صحیح نہیں نکلتا کیونکہ یہ نتیجہ ہو گا۔ لو علم اللہ فیھم خیرا لتولوا اور اس کا فساد ظاہر ہے اور جواب بعنوان منطق یہ ہے کہ یہ اسمعھم حد اوسط ہی نہیں۔ کیونکہ مقدمۂ اولیٰ میں اسماع مع وجدان الخیر ہے جیسا لفظ لو چاہتا ہے اور دوسرے مقدمہ میں اسماع مع عدم وجدان الخیر ہے پس حد اوسط ہی مکرر نہیں تو نتیجہ کیسے نکلتا۔

(۳۱) فرمایا۔ قرآن شریف کا طرز مصنفین کی طرز پر نہیں۔ بلکہ محاورہ و بول چال کے طرز پر ہے۔ نہ اس میں اصطلاحی الفاظ کی پابندی ہے۔ ناواقف لوگ اس کو عام تصانیف کے طریق پر منطبق کرنا چاہتے ہیں اس لئے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ قیامہ میں شروع میں بھی قیامت کا ذکر ہے اور آخیر میں بھی۔ اور درمیان میں فرمایا لا تحرك به لسانك لتعجل به اب اسی خیال سے اس کا سیاق وسباق سے ربط تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اس غلطی کا منشا صرف قرآن کو عام تصانیف کی طرح سمجھنا ہے۔ اگر اس کو محاورہ کے طرز پر دیکھیں تو پھر اس کی بعینہٖ ایسی مثال ہوگی کہ باپ کھانے کے وقت اپنے بیٹے سے کوئی تقریر کر رہا ہو۔ ابھی تقریر ختم نہیں ہوئی کہ بیٹا جلدی جلدی کھانے لگا۔ باپ اس تقریر کو چھوڑ کر اس تقریر کے درمیان بیٹے کو متنبہ کرے گا کہ جلدی جلدی مت کھاؤ اور اس کے بعد پھر بدستور بقیہ تقریر کا سلسلہ جاری کر دے گا۔ یہ انتظار نہ کرے گا کہ تقریر کو ختم کر کے کھانے کے متعلق پھر بیٹے سے خطاب کرے اور یہ انتظار نہ کرنا غایت شفقت ہوگی۔ پس اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول وحی کے وقت اس کے یاد کرنے کے لئے جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اس لئے پہلی تقریر بند کر کے اس سے آپ کو روک دیا۔ اس کے بعد پھر وہی تقریر یعنی قیامت کا مضمون شروع فرما دیا۔ اس مضمون کو غالباً صاحبِ کشاف نے بھی لکھا ہے۔ طالب علموں کی اس عادت کو کہ قرآن کا طرز عام تصانیف کا سمجھتے ہیں۔ دیکھ کر میں کہا کرتا ہوں کہ ضروری صرف ونحو اور کسی قدر ادب پڑھا کر قرآن شریف کا سادہ ترجمہ پڑھا دینا مناسب ہے کیونکہ کتب درسیہ کی تحصیل کے بعد دماغ میں اصطلاحات رچ جاتی ہیں پھر قرآن شریف کو اسی طرز پر منطبق کرنے لگتا ہے۔ اس طرح پر اول قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر پھر فنون ضرور پڑھے۔ کیونکہ بعض مقامات قرآنیہ بدون فنون کے حل نہیں ہوتے۔ مثلاً سورۂ انعام میں کفار کے متعلق فرمایا ہے۔ لو شاء الله ما اشركوا الآیۃ اس میں اس کا صاف اثبات ہے کہ ان کا شرک ہماری مشیت سے ہے اگر ہم عدم اشتراک متحقق ہوتا اور اسی سورت میں کفار کا قول نقل فرمایا۔ لو شاء الله ما اشركنا الآية اور پھر اس پر رد فرمایا جس میں اس کی نفی ہے۔ بظاہر ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں مشیت تکوینیہ بمعنی ارادہ مراد ہے یعنی تکوینی طور پر حکمت ومصلحت کیلئے ہم نے ان کے شرک کا ارادہ کیا اور دلیل اس کی اسی آیت کا سیاق وسباق ہے چنانچہ اوپر ارشاد اتبع ما اوحی الیك اور بعد میں ارشاد ہے۔ وما جعلناك عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی فرما رہے ہیں۔ کہ تبلیغ کے بعد آپ

معلوم نہ ہوں۔ کیونکہ ان کے شرک کا ارادہ بنا بر حکمت کے ہم نے کیا ہے۔ پس اس مشیت کا تو اثبات ہے اور دوسری آیت میں مشیت تشریعیہ بمعنے رضا مراد ہے۔ کفار اپنے دین کی حقانیت کے مدعی تھے اور استدلال میں یہ کہتے تھے اگر ہمارا کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرضی و پسندیدہ نہ ہوتا تو ہم شرک نہ کرتے یعنی ہم سے صادر نہ ہونے دیتے۔ حق تعالےٰ اس مشیت کی نفی فرما رہے ہیں۔ پس تعارض نہ رہا اس جواب سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس جواب کے سمجھنے کے لئے اس وقت فنون درسیہ کی ضرورت ہے۔ اس دوسری آیت کو دیکھ کر یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ قرآن کا طرز مناظرانہ نہیں ہے۔ کیونکہ کفار کے اس قول کا ابطال کسی دلیل مناظرانہ سے نہیں فرمایا ورنہ اس طرز پر جواب یہ ہوتا ہے کہ اس تمہارے استدلال سے ہماری رضا ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس دلیل سے تو تمہارے مزعوم کا خلاف بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ مومنین سے عدم شرک بھی واقع ہو رہا ہے تو لازم آتا ہے کہ تمہارے مزعوم اور اس کی نقیض دونوں پر اللہ تعالےٰ کی رضا ثابت ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے سو اگر قرآن کا طرز مناظرانہ ہوتا تو جواب کا یہ طرز ہوتا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ صرف اس کے بطلان کا حکم فرما دیا اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں محض شفقت کا طرز اختیار فرمایا گیا ہے۔

(۳۲) فرمایا۔ اگر قرآن شریف میں موجودہ سیاست کو داخل کیا جائے تو پھر لازم آتا ہے۔ قرآن مجید کو کفار نے جمہور علماء سے بلکہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے زیادہ سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کا سمجھنا عمل کی برکت سے ہوتا ہے۔ اس لئے ان حضرات نے زیادہ سمجھا۔

اسی سلسلہ میں فرمایا۔ میرے خیال میں ہے کہ قالب تو ہو نیا اور قلب ہو پرانا (یعنی عقائد اور طرز تو سلف کا ہو باقی تدابیرات بوجہ ضرورت خواہ وقتیہ ہوں مگر حدود کے اندر ہوں)۔

(۳۳) فرمایا۔ اسباب ظنیہ کو چھوڑ دینا یہ اصلاحی توکل ہے مثلاً نوکری زراعت وغیرہ چھوڑ دینا۔ کیونکہ یہ اسباب عرف عادیہ اکثریہ ہیں۔ غالب عادۃ اللہ یہی جاری رہی ہے کہ ان اسباب سے رزق ملتا ہے لیکن عادۃً شرط نہیں اور اسباب عادیہ یقینیہ کو جو کہ عادۃً شرط ہوں ترک کرنا توکل نہیں ہے۔ مثلاً ہاتھوں سے کھانا کھانا۔ تو جو شخص یہ قصد کرے کہ میں اپنے ہاتھوں سے کھانا نہ کھاؤں گا وہ متوکل نہیں۔

(۳۴) فرمایا۔ دنیا بھر میں قابل تحصیل صرف ایک چیز ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ صحیح تعلق ہے باقی سب ہیچ ہے۔

(۳۵) فرمایا۔ مجھ کو اپنی حالت پر کبھی ناز اور تکبر نہیں ہوا۔ اس وجہ سے کہ خدا جانے قیامت میں کیا

معاملہ ہوگا۔ بس یہ ایک ہی خیال عصاء موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے جو سب کو نگل جاتا ہے۔

(۳۶) فرمایا۔ قیامت میں بہت سے عالم جو تدقیقات کے خوگر ہیں تمنا کریں گے۔ کہ کاش ہم اس اعرابی جیسے ہوتے کہ اس کا ایمان صحیح نکلا۔

(۳۷) فرمایا۔ سنن عادیہ میں ثواب اس واسطے ہوتا ہے کہ وہ علامت اس کی ہے کہ اس کو حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت ہے اور یہ محبت عین عبادت ہے۔

فرمایا۔ میں مبتدی کو صرف فرائض اور سنن مؤکدہ کی تاکید کرتا ہوں اور سنن زائدہ میں کاوش کرنے سے روکتا ہوں تاکہ اس کی وجہ سے فرائض بھی ترک نہ کر دیوے اور ظاہر بین سمجھتے ہیں کہ سنن سے روکتا ہے

(۳۸) فرمایا۔ طریق میں مقصود تحصیل اعمال ہے نہ کہ تسہیل۔ لوگ تسہیل ہی کو مقصود سمجھتے ہیں ہاں فن میں طرق تسہیل بھی ہیں مگر اس تسہیل کا اصل طریق بھی تحصیل ہی ہے۔ یعنی اس کو بار بار کرنا عمل کو بار بار کرنے سے تسہیل بھی ہو جاتی ہے جیسا مثلاً ایک آیت کو بار بار تلاوت کرنے سے حفظ ہو جاتی ہے۔ اور پھر پڑھنے میں تسہیل ہو جاتی ہے۔ باقی دوسرے طرق تسہیل مختلف ہیں جن کا تجویز کرنا شیخ کا کام ہے مگر شروع میں تو شیخ یہی کہے گا کہ محنت کرو۔ تسہیل کی تدبیر بتلانا ہمارے ذمہ نہیں جب وہ کام میں لگا ہوا دیکھے گا آپ ہی تسہیل کی تدبیر بتلائے گا۔

(۳۹) فرمایا مجتہدین میں ایک مخصوص بات یہ ہوتی ہے کہ وہ نصوص سے ایسے اصول کو مستنبط کر سکتے ہیں کہ وہ اصول کہیں ٹوٹتے نہیں اور جو اصول متاخرین نے مجتہدین کی تصریحات سے استنباط کئے ہیں وہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ فرمایا ذوق سے عوام بھی خالی نہیں ہوتے اور یہی ذوق بعض دفعہ منشأ ہوتا ہے احکام کا مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الرَّاكِدِ تو عامی بھی سمجھتا ہے کہ القاء البول بھی مثل بول منع ہے۔ کیونکہ مقصود تو تنظیف الماء ہے اور وہ دونوں میں فوت ہوتا ہے۔ مگر داؤد ظاہریؒ نے کہا کہ بول فی الماء تو منع ہے۔ القاء البول فی الماء ممنوع نہیں۔ یہ قول نوویؒ نے ذکر فرمایا ہے اسی طرح نہی عن الجمع بین الرطب والبسر کو علماء نے معلول بعلۃ لکھا ہے گو علت میں اختلاف ہے لیکن جب سب علل مرتفع ہوں جمع کی اجازت ہے مگر ظاہریہ کہتے ہیں۔ جمع بین الاختین کی طرح جمع بین البسر والرطب بھی بذاتہ حرام ہے۔

(۴۰) فرمایا۔ اکثر غیر مقلدی کے لوازم سے ہے سلفؒ کے ساتھ بدگمانی اور پھر بدزبانی۔ ان کو بھی

گمان رہتا ہے کہ سلف نے بھی حدیث کا خلاف کیا۔

(۴۱) فرمایا۔ عارفین کی نظر میں حق تعالیٰ کے وجود پر جو دلائل ہیں وہ حقیقت میں دلیل نہیں کیونکہ دلیل عادۃً مدلول سے اوضح ہوتی ہے۔ اور واجب تعالیٰ سے زیادہ کوئی شے واضح تر نہیں بلکہ واجب سب سے اوضح ہے ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

(۴۲) فرمایا۔ تنویر جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے وہ ابن عطاء اسکندری کی کتاب ہے اس میں پوری کتاب کی روح صرف ایک مسئلہ ہے یعنی ارادہ و تجویز کا فنا کرنا اور اس میں وہ بہت مبالغہ فرماتے ہیں حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اخفاء قرأت کا اور حضرت عمرؓ کی جہر قرأت کا واقعہ صلوٰۃ تہجد میں ذکر کرکے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے کی کہ حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا کہ ذرا بلند پڑھو اور حضرت عمرؓ کو فرمایا ذرا آہستہ پڑھو جس پر یہ بیان فرمائی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود دونوں کے ارادہ کا فنا کرنا تھا کیونکہ جو وہ صاحبان کر رہے تھے وہ اپنے ارادہ سے کر رہے تھے اس لئے دونوں سے ارادہ کو ترک کرایا اور انہیں بزرگ کی دوسری کتاب حکم جس کی شرح اکمال الشیم ہے بہت عمدہ کتاب ہے کوزہ میں دریا کو بند کر دیا ہے اسی سلسلہ میں مدارج السالکین کا ذکر فرمایا جو ابن القیمؒ کی کتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن قیمؒ بھی فن کے واقف اور ماہر ہیں گو اس کا متن بہت موحش ہے لیکن ابن القیمؒ جیسا کہ مشہور ہے اگر ایسے خشک ہوتے تو اس ماتن پر کفر کا فتویٰ لگاتے مگر بجائے فتوے کے اس کی بہت عمدہ شرح لکھی ہے۔

(۴۳) فرمایا۔ مولانا اسمٰعیلؒ کی کتاب تقویۃ الایمان کی اس عبارت پر مخالفین نے شبہ کیا ہے کہ "اگر خدائے تعالیٰ چاہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سینکڑوں بنا ڈالے" اس پر دو شبہے کئے گئے ہیں ایک تو لزوم امکان نظیر اور یہ بالکل مہمل ہے فان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ دوسرا لفظ "بنا ڈالنے" سے تحقیر کا مفہوم ہونا اور یہ محاورہ کے تابع ہے جو ذوقی شے ہے۔ اگر ہم پر کوئی اعتراض کرتا تو ہم تو یہ طالب علمانہ جواب دیتے کہ اس کا موہم تحقیر ہونا ثابت کرو۔ مگر حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ یہ تحقیر فعل کی ہے مفعول کی نہیں یعنی صنع سہل ہے مصنوع حقیر نہیں مگر معترض نے تسلیم نہیں کیا۔ مولانا خاموش ہو گئے۔ بزرگوں کا یہی طریقہ ہے۔ دو چار دن کے بعد وہی سائل مولانا کے پاس آیا اور کہنے لگا حضرت آپ نے بخاری شریف طبع فرمائی ہے مشکوٰۃ طبع فرمائی ہے ایسے میں بیضاوی بھی چھاپ ڈالتے تو اچھا تھا۔ اس پر مولانا نے فرمایا توبہ کرو یہ "ڈالنا" وہی

تحقیر کا لفظ ہے۔ اس میں بیضاوی کی تحقیر ہوئی ——— اور بیضاوی شامل ہے کلام اللہ کو اور تحقیر کل کی تحقیر جزو کی ہوتی ہے اور تحقیر کلام اللہ کی کفر ہے۔ پس پھر تو اس سائل کی آنکھیں کھلیں اور کہنے لگا اب سمجھ میں آیا کہ واقعی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے کلام میں تحقیر فعل کی ہے مفعول کی نہیں "بیضاوی چھاپ ڈالنے" میں میرا بھی مقصود تھا کہ سامان تو سب موجود ہی ہے۔ طبع کرنا کچھ مشکل نہیں نہ کہ بیضاوی کی تحقیر۔

(۴۴) فرمایا۔ صالحین کی اولاد کی بھی رعایت ضروری ہے۔ عبد اللہ بن مبارکؒ کا قصہ عجیب و غریب ہے کہ ایک سیدزادہ نے دیکھا کہ لوگ عبد اللہ بن مبارکؒ کا بہت ادب کرتے ہیں اور مجھکو کوئی پوچھتا بھی نہیں میرا ادب نہیں کرتے عبد اللہ بن مبارکؒ سے اس کے متعلق سوال کیا انہوں نے فرمایا یہ میرا ادب نہیں بلکہ درحقیقت تمہارا ہی ادب ہے کیونکہ میرا ادب صرف اس وجہ سے ہے کہ میرے اندر علم ہے اور وہ آپ کے گھر کی چیز ہے اور تمہارے اندر جو چیز ہمارے گھر کی ہے یعنی جہالت بے ادبی اس کی ہے۔ رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں دونوں کو نصیب ہوئی ادھر تو عبد اللہ بن مبارکؒ کو فرمایا میری اولاد کو تم نے طعن سے رنجیدہ کیا اور ادھر سید کو فرمایا کہ عبد اللہ بن مبارکؒ جو میرا نائب ہے تم نے ان کے ساتھ بے ادبی کی گفتگو کیوں کی چنانچہ صبح ہوتے ہی دونوں صاحب اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو راضی کرنے کے واسطے چلے راستہ میں ملے وہ ان سے معذرت کر رہے اور یہ ان سے۔

(۴۵) فرمایا۔ مولانا فضل حق صاحب سے کسی نے پوچھا تھا کہ مولانا شہیدؒ کیسے ہیں فرمایا وہ ایسے ہیں کہ ان کے مقابل کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ وہ ان کا مقابل ہے پھر شاہ اسحٰق صاحب کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا اس وقت تو انسانوں کا قصہ ہو رہا ہے جب فرشتوں کا ذکر ہوگا ان کے ساتھ ان کے متعلق پوچھنا

(۴۶) فرمایا۔ اب تو بس مسلمانوں کو چاہئیے کہ سب لپٹ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ اللہ میاں دعا قبول نہیں کرتے اور یہ محض خلاف واقعہ ہے مسلمانوں کی دعا تو درکنار اللہ تعالیٰ نے تو شیطان کی دعا کو بھی رد نہیں فرمایا۔ منظور فرمائی اور ایسی حالت میں جبکہ وہ مردود کیا جا رہا تھا چنانچہ ارشاد ہے۔ قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ اور پھر دعا بھی اتنی بڑی کی ہے کہ کسی نبی نے بھی آج تک نہیں کی۔

(۴۷) فرمایا۔ بعض لوگوں کو باوجود اعمال کی قلت کے نسبت مقصودہ حاصل ہوجاتی ہے تو لوگ سمجھتے

ہیں کہ یہ وصول بدون اعمال اور مجاہدہ کے ہوگیا حالانکہ یہ نہیں وہاں بھی اعمال ہی سبب ہیں۔ مگر وہ باطنی ہوتے ہیں جیسے کف النفس عن المعاصی اور ظاہر ہے کہ یہ سب اعمال ہیں کیونکہ ہر وقت ہر قسم کے گناہوں سے یعنی کان کے آنکھ کے قلب کے سب گناہوں سے رکنا ہر وقت ایک آرہ نفس پر چلانا ہے اور یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے۔

پس قلت اعمال ظاہرہ پر وصول اگر ہوا ہے تو وہ ان اعمال باطنہ سے ہوا ہے خواہ اس کو کوئی قلیل ہی سمجھے پھر بھی عمل گو تھوڑا ہو مگر ہو باقاعدہ تو وہ موجب برکت ہوتا ہے جیسے ضروری صرف و نحو اگر یاد ہو اور باقاعدہ ہو اس سے کام لے تو اس تھوڑی اور باقاعدہ ہی کا اثر مقصود میں اچھا ہوتا ہے بہ نسبت بے اصول تکثر کے اس طرح اگر کثیر عمل ہو مگر ہو باقاعدہ تو وہ مقصود میں کچھ زیادہ دخیل نہیں۔

(۴۸) فرمایا۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی دو رکعت غیر عارف کی دو لاکھ رکعت سے افضل ہیں کیونکہ عارف میں بصیرت اور اخلاص زیادہ ہوتا ہے اور ان کو عمل کی فضیلت میں خاص دخل ہے چنانچہ بصیرت کے دو نمونے نقل کرتا ہوں کہ مثنوی شریف کے درس کے بعد حضرت خفیہ دعا فرمایا کرتے تھے ہم نے دل میں کہا کہ معلوم نہیں کیا دعا فرماتے ہوں گے۔ ایک دن فرمایا دعا کرو کہ اس کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں اے اللہ تعالیٰ ہم کو بھی نصیب فرما۔ سبحان اللہ کیسی جامع دعا فرمائی۔ ایک دن یہ دعا فرمائی اے اللہ تعالیٰ ایک ذرہ محبت ہم کو بھی نصیب فرما۔ پھر بشارت فرمائی کہ الحمد للہ سب کیلئے دعا قبول ہوئی

(۴۹) فرمایا۔ مولوی محب الدین صاحب ولایتی حضرت کے خلیفہ ہیں بہت صاحب کشف ہیں۔

(۵۰) فرمایا۔ اللہ تعالیٰ حق کو باطل کے ساتھ خلط ہونے سے ہمیشہ بچا دیں گے ایک جماعت دنیا میں رہے گی جو حق و باطل میں فرق کرتی رہے گی۔

(۵۱) فرمایا۔ طاعون سے جو موت ہوتی ہے اس میں عین مرنے کے وقت آثار بشاشت اور انبساط کے نمایاں ہوتے ہیں اور کتاب شوق وطن میں تو مسلمان کے لئے جہنم کو بھی رحمت ثابت کیا ہے کیونکہ وہ مسلمان کے لئے میل کچیل دور کرنے کا گویا حمام ہے جیسا کہ آیت وَلَا يُزَكِّيهِمْ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۵۲) فرمایا۔ پہلے اکابر علماء جس میں حب جاہ کا مرض دیکھتے تھے اس کو اپنے حلقۂ درس سے نکال دیتے تھے۔ اب اس کا کوئی اہتمام ہی نہیں۔

(۵۳) فرمایا مختلف وفود جو مدرسہ میں محاسبہ کے لئے آتے ہیں ان کو کچھ جواب نہ دیا جاوے اور نہ مدرسہ

کے بارے میں ان سے کچھ گفتگو کی جائے بلکہ صاف یہ کہہ دیں کہ جو کچھ کہنا ہو اہل شوریٰ سے کہیں پھر وہ ہم سے کہیں اور ہم سے جواب لیکر تم سے کہدیں۔ یہ باقاعدہ جواب۔

(۵۴) فرمایا۔ مسجد دارالعمل ہے اور مدرسہ دارالعلم سو جس طرح مساجد متعدد ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ اس طرح مدارس کے متعدد ہونے میں بھی کوئی حرج نہ ہونا چاہیئے مگر حالت یہ ہے کہ مدرسوں کے متعدد ہونے سے گرانی ہوتی ہے سو ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خوشی ہونی چاہیئے کہ کام کرنے والے بہت ہو گئے۔ مگر چونکہ مدارس میں اکثر غلبہ امراض نفسانیہ کو ہوتا ہے اس لئے ان کے تعدد میں گرانی ہوتی ہے۔

(۵۵) فرمایا۔ کرامات امدادیہ میں حضرت حاجی صاحبؒ کے کرامات میں نے اس لئے جمع کئے تھے کہ عوام الناس کی عقیدت میں اس سے قوت ہو جاتی ہے۔

(۵۶) فرمایا۔ طاعون کے دفع کرنے کے لئے اذانیں کہنا بدعت ہے۔ اس طرح قبر پر دفن کے بعد بھی اور اسی طرح بارش اور استسقاء کے لئے بھی بدعت ہے۔

(۵۷) فرمایا۔ مولوی احکام دان کو کہتے ہیں عربی دان کو نہیں کہتے عربی دان ابوجہل بھی تھا مگر لقب تھا ابوجہل نہ کہ عالم۔

(۵۸) فرمایا۔ ایک طالب علم مولانا فتح محمد صاحب کے صاحب کے پاس پڑھا کرتے تھے ان کا نام نور احمد تھا نو عمر ہی تھے۔ جب مولانا کا انتقال طاعون میں ہوا تو اس نے گھر جانے کے لئے اسباب باندھا۔ پھر بخار اور طاعون میں مبتلا ہو گیا۔ ان کی عجیب حالت تھی۔ کسی نے ان سے کہا تم اچھے ہو جاؤ گے کہا ایں مت کہو۔ اب تو حق تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کا ایک ہم سبق طاعون سے جلال آباد فوت ہو چکا تھا مگر اس کے مرنے کی خبر اس کو نہ دی گئی تھی کہ ہراساں نہ ہو۔ مرنے کے وقت خود ان سے پوچھا کہ اس میرے ساتھی کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا اچھا ہے کہا کیوں جھوٹ بولتے ہو وہ تو مر چکا ہے۔ میرے پاس کھڑا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس نے عالم برزخ کی کائنات کو عالم ناسوت کی کائنات سے امتیاز کر لیا۔ اس کے جنازہ پر انوار اور کشش تھی جنازہ اس کا میں نے ہی پڑھایا تھا۔

(۵۹) فرمایا۔ مرنے کے وقت ایمان سلب نہیں ہوتا جیسا عوام میں مشہور ہے۔ پہلے ہی سلب ہو چکتا ہے اور کسی فعل اختیاری سے سلب ہوتا ہے البتہ اس کا ظہور مرنے کے وقت ہوتا ہے کیونکہ وہ انکشاف کا وقت ہوتا ہے یوں سمجھا جاتا ہے کہ اب مرنے کے وقت سلب ہوا ہے۔ اور بعض لوگوں کے اس وقت بھی ہوش وحواس درست ہوتے ہیں اور اس حالت میں شیطان ان کو بہکاتا ہے اور وہ باختیار خود بہکانے

میں آجاتے ہیں اسی واسطے دعا کی تعلیم فرمائی گئی ہے

باقی بیہوشی میں اگر کوئی کفری قول و فعل صادر ہو جاوے اس پہ مواخذہ نہیں۔ اور اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ابلیس کو اضلال کی اسی درجہ کی عقل ہے جیسی حضرات انبیاء علیہم السلام کو ہدایت کی عقل ہے۔

(۶۰) احقر نے عرض کیا کہ موت کے وقت کبھی شیخ بھی حاضر ہوتا ہے۔ فرمایا اس کی دو صورتیں ہیں۔ کبھی واقعی شیخ ہوتا ہے۔ اور یہ کرامت ہے اور اس کا وقوع شاذ و نادر ہوتا ہے اور کبھی حق تعالیٰ کسی لطیفۂ غیبیہ کو بشکل شیخ متشکل فرما دیتے ہیں کیونکہ وہ اسی شکل سے مانوس ہے تو اس کے ذریعہ سے اس کو حق کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے۔

(۶۱) کرامات علامات قرب نہیں کیونکہ غیر اختیاری سے قرب نہیں ہوتا۔ اور فرمایا کہ مجھے اس مسئلہ کے متعلق کہ غیر اختیاری سے قرب نہیں ہوتا ایک شبہ تھا اور وہ برسوں رہا اور میں نے کسی سے اس لئے دریافت بھی نہیں کیا کہ کسی سے حل ہونے کی امید نہ تھی اور وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے ابھی دو چار دن سے حل ہوا ہے وہ شبہ یہ تھا کہ نبوت بھی غیر اختیاری ہے لیکن اس کو قرب میں دخل عظیم ہے چنانچہ نبی ہونے کے بعد تمام علماء کا اجماع ہے کہ قرب زیادہ ہو جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اختیاری چیز سے بھی قرب بڑھ جاتا ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ قرب ۲ دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جس کی تحصیل مامور بہ ہے۔ یہ قسم اسباب غیر اختیاریہ سے حاصل نہیں ہوتی دوسرا وہ کہ اس کی تحصیل مامور بہ نہیں۔ یہ قسم ثانی بدون اسباب غیر اختیار کے حاصل ہو جاتی ہے نبوت کا قرب اس میں داخل ہے اور جب سے یہ جواب سمجھ میں آیا ہے بیحد مسرت ہے۔

(۶۲) فرمایا جس زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحبؒ اور مولانا شیخ محمد صاحبؒ یہاں موجود تھے اس وقت کے مشائخ اس مقام کو دوکان معرفت اور ان حضرات کو اقطاب ثلاثہ کہتے تھے۔

(۶۳) فرمایا اس زمانہ میں تو معاش کے لئے مباشرت اسباب ہی مصلحت ہے کیونکہ ترک اسباب سے تقدس کا شبہ ہو جاتا ہے اور مباشرت اسباب کی صورت میں اس شبہ سے نجات ہے۔

(۶۴) فرمایا۔ کرامت کا درجہ بتصریح اکابر مجرد ذکر لسانی سے بھی متاخر ہے چنانچہ ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا افضل ہے کرامت سے کیونکہ وہ سبب ہے قرب کا اور کرامت قرب کا سبب نہیں بلکہ قرب کا مسبب ہے،

(۶۵) فرمایا غالباً اکمال الشیم میں جو یہ لکھا ہے کہ ہر وقت کے کچھ حقوق ہیں وہ دوسرے وقت میں ادا نہیں ہو سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے وقت میں اس دوسرے وقت کے حقوق ہیں تو سب کو جمع کیسے کرے گا البتہ بلا اختیار ان کے فوت ہو جانے پر زیادہ قلق نہ کرے کیونکہ اس قلق کا منشا یہ ہوگا کہ میں ناقص ہوں سو یہ کامل ہی کب ہو سکتا۔ ہر حال میں ناقص ہی رہے گا مگر ان حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی تحصیل فرض نہیں ورنہ شرعاً ان کی قضا ہوتی۔

(۶۶) فرمایا حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا غالب طرز یہ تھا کہ طالب بیعت سے انکار نہ کرتے تھے بجز ایک صورت کے کہ وہ پہلے کسی کا مرید ہو ایسے شخص کو بیعت نہ کرتے تھے اس کا منشا طریق کا ادب ہے اور اس وسعت میں حکمت یہ فرماتے تھے کہ اس سے دو مسلمانوں میں خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ قیامت میں ان میں سے جو مرحوم ہوگا وہ غیر مرحوم کو کھینچ لے گا اور عکس کا احتمال نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ عَلٰی غَضَبِیْ۔ سبحان اللہ

(۶۷) فرمایا۔ نفس اور شیطان کے گناہ کرانے میں اکثری فرق یہ ہے کہ اگر بار بار ایک ہی گناہ کا تقاضا ہو تو یہ نفس کی جانب سے ہے اور اگر ایک دفعہ ایک گناہ کا تقاضا ہو پھر اس سے رک جانے کے بعد دوسرے کا تو یہ شیطان کی جانب سے ہے کیونکہ شیطان کو تو مقصود صرف گناہ کرانا ہے چاہے کوئی بھی گناہ ہو اور خود شیطان کو اس میں کوئی حظ نہیں تاکہ کسی معین گناہ پر اصرار ہو۔ بخلاف نفس کے کہ نفس کو ان میں حظ ہوتا ہے اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ نفس ہیچ ہے۔ شیطان صرف مشورہ دیتا ہے جیسا کہ دَعَوْتُکُمْ سے پتہ چلتا ہے اور اس میں بھی اصل داعی نفس ہے کیونکہ شیطان کو بھی اسی نفس ہی نے گمراہ کیا اور فرمایا علاج کلی یہ ہے کہ معاصی میں نفس میں جو تقاضا ہوتا ہے اس تقاضا پر عمل نہ کرے۔ اصل علاج تو یہ ہے۔ باقی ذکر اس میں معین ہوتا ہے کیونکہ ذکر سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ دستگیری فرماتے ہیں اس دستگیری سے سہولت ہو جاتی ہے۔ یہ صورت ہوتی ہے اعانت کی۔ لیکن خالی ذکر سے کچھ نہیں ہوتا۔ پھر اس اصل علاج میں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے پھر شیخ کے معاملہ میں طالب کے ذمہ دو چیزیں ضروری ہیں ایک اتباع (یعنی شیخ کا) دوسری اطلاع (یعنی احوال کی)

(۶۸) فرمایا۔ ذکر ایک ہی دفعہ کا کیا ہوا باقی رہتا ہے جب تک کہ اس کا مصادم نہ پایا جائے جیسا ایمان پہلا ہی باقی رہتا ہے ذہول ہو جانے سے زائل نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا کوئی مصادم نہ پایا جائے۔ اسی

واسطے ذاکر کو سونے کے وقت بھی ذاکر کہیں گے کیونکہ ارادہ ذکر ہی کا تھا انقطاع کا ارادہ نہ تھا گو اضطراراً انقطاع ہوگیا۔ اسی بقاء کے سلسلہ میں فرمایا ایک شخص مرض الموت کی غشی میں عقد انامل کر رہا تھا لوگوں نے اس کو رسوخ ذکر کی دلیل سمجھا۔ ایک معترض نے کہا اس حرکت کی عادت تھی رسوخ ذکر سے اس کا کیا تعلق ایک بچے نے جواب دیا کہ اگر عادت کی وجہ سے کرتا تو منہ کی طرف ہاتھ لاکر کھانے کی شکل کیوں نہ بنائی کیونکہ یہ زیادہ پرانی عادت تھی۔

(۶۹) فرمایا مولانا فیض الحسن صاحب سے کسی نے وہابی۔ بدعتی کے معنی پوچھے انہوں نے عجیب ترجمہ فرمایا یعنی وہابی کا ترجمہ تو بے ادب باایمان اور بدعتی کا باادب بے ایمان۔ اور فرمایا ایک بار ایسے ہی سوال کے جواب میں کہا کہاں کے وہابی کے معنی پوچھتے ہو کیونکہ حیدرآباد کے وہابی کے معنی اور ہیں اور ہندوستان کے وہابی کے معنی اور ہیں۔ علی ہذا القیاس بدعتی۔ وجہ یہ کہ عوام کی اصطلاح میں وہابی کا اصل مفہوم ہے رسوم کا مخالف۔ اور رسوم ہر جگہ کی علیحدہ علیحدہ۔ ہر جگہ کی رسوم کا مخالف وہاں کا وہابی ہے۔

(۷۰) فرمایا۔ کسی عورت نے مجھ سے اپنے نکاح کے متعلق مشورہ پوچھا۔ میں نے جواب دیا کہ میرے دو کام ہیں ایک مسائل و احکام بتلانا جو مجھے یاد ہیں ان کو کوئی پوچھے تو بتلا دیتا ہوں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ دعا کر دیتا ہوں اور میں تیسرے کام کا نہیں ہوں خصوص مشورہ کی عادت کئی وجہوں سے نہیں ہے اول یہ کہ جب تک تمام جانب کا احاطہ نہ ہو جاوے مناسب نہیں اور احاطہ اکثر حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اکثر لوگ آخر میں اس کام کو مشیر کی طرف منسوب کرتے ہیں اور بدنام کرتے ہیں تیسرے یہ کہ بعضے مشورہ کو حکم سمجھتے ہیں اور اپنی رائے کو چھوڑ دیتے ہیں یہ بھی غلو ہے اس لئے مشورہ کا معمول نہیں اور اگر اس پر بھی کوئی بالکل ہی مجبور کرے تو اس طرح کہہ دیتا ہوں کہ دونوں شقوں کے مضار اور منافع ظاہر کر کے پھر قضیہ شرطیہ کے طور پر کہہ دیتا ہوں کہ اگر یہ صورت ہو تو اس شق کو ترجیح ہے اور اگر دوسری صورت ہو تو دوسری شق کو ترجیح ہے۔ غرض ذمہ دار وہ خود رہتا ہے۔

(۷۱) فرمایا۔ ایک شخص نے اصحاب کہف کے نام خط میں پوچھے ہیں میں نے لکھ دیا ہے کہ اصحاب کہف کے اعمال پوچھو تم ہی اصحاب کہف کی طرح ہو جاؤ گے۔

(۷۲) فرمایا۔ حدیث میں مُصَرَّح ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَيَدِهٖ مگر کس کو یہ فکر نہیں کہ ہم سے کسی کو اذیت تو نہ ہوگی۔

(۳) فرمایا۔ میں جو سخت مشہور ہوں تو وجہ یہ ہے کہ میری غرض صرف یہ ہے کہ لوگ اعمال کی فکر کریں اور لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جو لوگ اصلاح بھی کرانا چاہتے ہیں وہ بھی اعمال کا اہتمام نہیں کرتے مگر میں باوجود سخت سمجھے جانے کے اس قدر رعایت کرتا ہوں کہ عین عتاب کے وقت میں بھی مخاطب کی اصلاح کا خیال رکھتا ہوں اور اگر اپنے سے مناسبت نہیں دیکھتا تو دوسرے مصلح کا پتہ بتلا دیتا ہوں تاکہ کسی مسلمان کو نقصان نہ ہو۔

(۴) فرمایا جیسا بعض درختوں پر دو پھول آتے ہیں اول ایک آتا ہے وہ گر جاتا ہے اس کے بعد دوسرا آتا ہے۔ اور باغبان اگر ناواقف ہو تو اس کے گر جانے سے غم کرتا ہے مگر ماہر جانتا ہے کہ اصلی پھول دوسرا ہے۔ وہ ابھی آئے گا پھر اس کے بعد پھل لگے گا۔ یا جیسا صبح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صادق دوسری کاذب پس اسی طرح احوال کی بھی دو قسم ہیں۔ ایک ناقص۔ دوسرے کامل۔ پہلے احوال پیدا ہو کر مضمحل ہو جاتے ہیں۔ پھر دوسرے احوال ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور وہ راسخ ہوتے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(۵) فرمایا۔ حدیث میں متاخرین کے ایمان کو اعجب فرمایا ہے اکمل نہیں فرمایا۔ اکمل تو صحابہؓ کا ایمان ہے۔

(۶) فرمایا۔ محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں پانچ سو کا مگر علماء نے لکھا ہے کہ یہ پچیس نمازیں محلہ والے کے لئے کیف میں پانچ سو سے افضل ہیں اسی طرح تقدیم عمل ضروری علی رمضان کا ثواب بہ نسبت عمل فی رمضان کے کم میں تو کم ہوگا مگر کیف میں زیادہ ہوگا۔ پس حدیث میں جو اعمال رمضان کا تصاعف آیا ہے اس کا مطلب نہیں کہ اگر رمضان کے قبل مثلاً صدقہ کی حاجت ہو تو رمضان کا انتظار کرے پس مقصود تاخیر عن رمضان سے ممانعت ہے نہ کہ تقدیم علی رمضان سے۔

(۷) فرمایا عقائد کا اثر اعمال پر بھی پڑتا ہے اس لیے عقائد سے یہ اثر بھی مقصود ہے مثلاً مسئلہ توحید میں ایک محقق نے اس اثر کو ظاہر کیا ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس   ہمین ست بنیاد توحید و بس

اس کی تائید آیت سے بھی ہوتی ہے چنانچہ سورۂ حدید میں تعلیم مسئلہ قدر کے بعد اس کی ایک غایت

اس طرح ارشاد فرماتی ہے لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ کیونکہ یہاں کوئی نہ کوئی عامل ضرور مقدر ہوگا اور وہ جو ماقبل کے مناسب ہو اور وہ اَخْبَرَ ہے اَخْبَرَ عَنْ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ لِكَيْلَا تَاْسَوْا الخ تو اس بنا پر تقدیر کا یہ اثر ثابت ہوا کہ اس سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور عجب نہیں ہونا اسی طرح پر عقیدہ سے کسی نہ کسی عمل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے غور سے معلوم ہو سکتا ہے۔

(۷۸) فرمایا۔ ایک مقام سے ایک خط آیا ہے کہ ایک سو پچیس روپیہ مدرسہ کے لئے ارسال کیا گیا ہے اگر اس کی رسید نہ آئی تو اگلے سال ارسال نہ ہوگا۔ سو میں خود اس کو بھی واپس کر دوں گا اور وجہ یہ لکھوں گا کہ ہم نے تم سے مطالبہ اس کا کب کیا ہے جو رسید پر ایسا زور دیتے ہو۔ رسید کو تو وہ ضروری سمجھے جو رقم کی تحریک کرے۔ لہٰذا اسی سال سے واپس ہے۔

(۷۹) فرمایا۔ اہل علم میں استغناء کی شان ہونا چاہئے کہ اصل ذلت عرض حاجت میں ہے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں ذلت نہیں اور استغناء میں نیت دین کے اعزاز کی ہونا چاہئے اس نیت سے ثواب بھی ہوگا اور دنیاداروں کے پاس ملنے بھی نہ جاویں باقی غریب کے پاس جانے میں ذرا ذلت نہیں۔

(۸۰) فرمایا پانی پت کے قریب ایک جگہ ہے "محمد پور" وہاں کے ایک رہنے والے — مجھ سے بیعت بھی ہیں پندرہ روپیہ ہمارے مدرسہ کے لئے پیش کئے مجھے کچھ وہم ہوا اور مجھے اکثر وہم بلا وجہ نہیں ہوتا یا قرائن سے ہوتا ہے یا بعض دفعہ دل میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، میں نے ان سے کہا کہ پانی پت تم سے قریب ہے اور وہاں بھی مدرسہ ہے اور قریب کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ تم نے یہ روپیہ وہاں کیوں نہ دیا۔ کہا یہ خیال ہوا کہ وہاں دنیا رہا ہے۔ میں نے کہا مجھ کو تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہاں دینے میں یہ مصلحت ہے کہ پیر بھی راضی ہوں گے کہ ہمارے مدرسہ میں دیا اور اللہ میاں بھی۔ سو ہم ایسی شرکت کی رقم مدرسہ میں نہیں لینا چاہتے۔ اور رقم واپس کر دی۔ صبح کو انہوں نے آکر اقرار کیا کہ واقعی میری نیت خراب تھی۔ اب میں اس نیت سے توبہ کر چکا ہوں اور توبہ کر کے پھر پیش کرتا ہوں۔ میں نے کہا اب لاؤ۔

(۸۱) فرمایا۔ میں جب نواب صاحب کے بلانے پر "ڈھاکہ" گیا تو وہاں بنگال کے اہل علم اطراف سے ملاقات کو آئے۔ میں نے سب سے کہہ دیا کہ کھانا بازار سے کھانا چاہئے۔ جب نواب صاحب کو پتہ چلا تو اپنے بھتیجا سے کہ وہی منتظم تھے، کھانے کے لئے فرمایا۔ کہ ان سب کا کھانا ہمارے یہاں ہوگا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں نے کہا کہ وہ میرے احباب ہیں۔ طفیلی نہیں ہیں۔ میں ان سے نہیں کہتا۔ آپ خود ان کی

دعوت کیجئے ۔ وہ اگر منظور کرلیں ان کی مرضی ۔ پھر ایک ایک کی تلاش کرکے دعوت کی تب وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے اور میرے اس طرح نہ کہنے سے طفیلی بن کر کھاتے ۔ اور ان صاحبوں نے مجھ سے پوچھا ۔ میں نے اجازت دیدی ۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ ملاحظہ فرمائیے عزت اس میں ہے یا اس میں کہ طفیلی بن کر شامل دعوت ہوتے ۔

(۸۲) فرمایا طب میں یہ تحقیق ہوچکا ہے کہ بچہ والدہ کی منی سے بنتا ہے ۔ والد کی منی سے محض عورت کے مادہ کا انعقاد ہوتا ہے ۔ اور بعض احکام شرعیہ میں بھی اس کی رعایت ملحوظ کی گئی ہے ۔ مثلاً سادات نسب میں حضرت فاطمہؓ کے تابع اسی طرح اَمَۃ یعنی لونڈی کی اولاد صفت رق میں اس کے تابع ہوتی ہے مرکز کے تابع نہیں ہے ۔ اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام سے عیسٰی علیہ السلام کا پیدا ہونا فطرت کے خلاف نہیں ہوا کہ نفخ جبریلؑ کا اثر صرف مادہ کا انعقاد تھا اور جہاں ولد کو باپ کے تابع بنایا گیا ہے وہاں مصلحت تربیت کو اس اصل طبعی پر ترجیح دی گئی ہے ۔

فرمایا مقولہ من لا شیخ لہ فشیخہ الشیطٰن کا معنی یہ ہے کہ من لا متبوع لہ
جس کا شیخ نہ ہو اور اس کا شیطان شیخ ہے جس کا کوئی مقتدا نہ ہو ۔
تو اس سے شیخ عرفی کا اتخاذ لازم نہیں آتا اور یہ قول حدیث نہیں ہے ۔ البتہ ایک اور حدیث میں یہ مضمون ہے
الشیخ فی قومہ کالنبی فی اُمتہ   شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا نبی اپنی امت میں
مگر اس حدیث میں شیخ سے مراد معمر آدمی ہے اور حدیث کا مدلول تنبیہ ہے احترام میں اور مصلح ہونے میں یہاں بھی پیر کا معنی نہیں ۔ اور اس حدیث کی تخریج عراقی نے کی ہے ۔

(۸۳) فرمایا ۔ اکثر اہل کشف متفق ہیں کہ مردہ کو سلام وغیرہ کا ادراک ہوتا ہے ۔ یہ مسئلہ کشفی ہے جو ظن کا درجہ رکھتا ہے ۔ اور اہل ظاہر اس میں اختلاف کرتے ہیں ۔ سیوطیؒ نے ایک عجیب حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص اپنی والدہ کی قبر پر جا کر قرآن پڑھتا تھا تو والدہ نے خواب میں کہا کہ پہلے تھوڑی دیر چپکے بیٹھ جایا کرو کیونکہ جب تم آتے ہی قرآن شریف پڑھنے لگ جاتے ہو تو انوار اس قدر تم کو محیط ہو جاتے ہیں جس سے تمہارا چہرہ چھپ جاتا ہے اور میں تمہارا چہرہ نہیں دیکھ سکتی اور ترستی رہ جاتی ہوں ۔ اس واسطے تم پہلے تھوڑی دیر چپکے بیٹھ جایا کرو پھر پڑھا کرو تاکہ میں جی بھر کر دیکھ سکوں ۔

(۸۴) فرمایا میں نے ایک غیر مقلد عالم کے سوال کے جواب میں اہل قبور کے افادے کو اس حدیث سے ثابت کیا کہ ایک صحابی نے بیان کیا کہ ”میں نے ایک قبر کے اندر سے سورۂ ملک کی آواز سنی“

پس قرآن شریف کا سننا فائدہ ہے اور سنانا افادہ ہے۔ اور یہ فائدہ میت سے حاصل ہوا پس مطلوب ثابت ہوگیا۔ اسی سلسلہ میں یہ حکایت تائیداً بیان کی کہ مولانا گنگوہیؒ کو ایک ثقہ شخص نے خواب میں دیکھا فرمایا کہ مجھ کو مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے خلافت دے دی۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ تصرف کا اذن مل گیا۔ وجہ استخلاف یہی تصرف ہے اور یہ عام نہیں۔ بعض بزرگوں کو بعد وفات کے ملجاتا ہے۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ وہ کس قسم کا تصرف ہوتا ہے۔ فرمایا مثلاً کسی کو کیفیت باطنیہ حاصل ہوگئی یا اس میں ترقی ہوگئی۔

(احقر نے کہا کہ کیا اس کا ادراک زندہ کو ہوتا ہے) فرمایا مثلاً اس بزرگ کی قبر پہ جانے سے ذوق و شوق میں ترقی ہوگئی۔ تو یہ ترقی اس بزرگ کے تصرف و توجہ کا اثر ہوتی ہے جو مدرک ہوتا ہے۔

کسی نے اہل مجلس میں سے کہا کہ گھر بیٹھے بھی تو یہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ فرمایا قبر سے مردہ کو خاص تعلق ہوتا ہے۔ وہاں اس کی زیادہ توقع ہے۔

(۸۵) سلسلۂ مذکورہ میں فرمایا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہ تشریف لے جاتے تھے۔ ایک بار ان کو خیال ہوا معلوم نہیں حضرت کی روح کو اس کی اطلاع ہوتی ہے یا نہیں۔ پس ان کی روح نے متمثل ہو کر شاہ صاحبؒ سے خطاب کیا اور یہ شعر نظامی کا پڑھا ؎

مرا زندہ پندار چوں خویشتن　　من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

(۸۶) فرمایا قبر پہ قرآن شریف پڑھنے سے مردہ کو انس ہوتا ہے۔

(۸۷) فرمایا۔ عورتوں پہ جو آسیب کا اثر ہو جاتا ہے تو اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ کبھی جن کا غضب مشاہدہ اور کبھی اس کی شہوت جیسا بعض عورتوں کو ہم بستری وغیرہ کا ہوتا ہے۔

(۸۸) فرمایا۔ قبور کی زیارت سے یہ قصد ہونا چاہیئے کہ موت یاد آتی ہے اور یہ کہ میری دعا سے اہل قبور کو فائدہ پہنچے گا۔

(۸۹) فرمایا۔ حضرت شاہ فضل الرحمٰن صاحب مجذوب رنگ کے تھے اور بہت استغراق غالب تھا۔ افاقہ بھی ہوتا ہے۔

(۹۰) فرمایا۔ ترک تقلید پر قیامت میں موخذہ تو نہ ہوگا۔ کیونکہ کسی قطعی کی مخالفت نہیں۔ مگر بے برکتی

اس میں یقینی ہے۔

(۹۱) فرمایا۔ اختلافِ احادیث کی صورت میں مجتہدین کے نزدیک اصل یہ ہے کہ ایک حدیث کو ذوق سے اصل قرار دیتے ہیں۔ اور یہی ذوق اجتہاد ہے اور بقیہ احادیث کو اس کی طرف راجع کرتے ہیں۔ یا ان کو عوارض پر محمول کرتے ہیں اور جہاں کہیں کسی مجتہد کی مستدل حدیث ضعیف ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مجتہد نے جس حدیث سے تمسک کیا ہو وہ اور ہو۔ یا اگر یہی ہو تو اس کو قوی سند سے پہنچی ہو اور ہمارے لئے خود کیونکہ مجتہد کا تمسک اس حدیث سے اس کی قوت اور صحت کی دلیل ہے اور اگر اس کے کسی راوی میں اختلاف ہو اور کسی مجتہد کا تمسک ضعیف راوی کی روایت پہ ہو تو اس میں یہ کیا جائے گا کہ امام کی توثیق اس کے تمسک کے لئے کافی ہے۔ دوسرے کی تضعیف اس پر حجت نہیں۔ اور اگر کسی حدیث کے مدلول میں کوئی احتمال ہمارے خلاف ہو تو تمسک میں مضر نہیں کیونکہ یہ خود ہمارا عقیدہ ہے کہ مسائل اجتہادیہ ظنیہ ہیں کہ دوسرے کا مذہب بھی صواب کا احتمال رکھتا ہے تو اس صورت میں دوسرا احتمال کیا مضر ہوا۔ چنانچہ مجھ سے اگر کوئی طالب علم یہ سوال کرتا تھا کہ اس حدیث میں تو دوسرا احتمال بھی ہے تو میں کہتا تھا کہ پھر کیا ضرر ہوا کیونکہ ہمارا عقیدہ یہی ہے۔

مذهبنا صواب مع احتمال الخطأ و مذهب الغير خطاء مع احتمال الصواب

ہمارا مذہب درست ہے مع احتمال الخطا اور غیر کا مذہب خطا ہے مع احتمال الصواب۔

(۹۲) فرمایا۔ اگر طریق سلوک سے کسی کو مناسبت ہو اور میری تالیفات دیکھتا رہے اور کبھی کبھی پاس بیٹھتا رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

(۹۳) فرمایا ایک رئیس ہندو یہاں آیا اس کے ساتھ اس کا گرو بھی تھا اس نے سوال کیا کہ قرآن شریف آپ کے نزدیک اللہ کا کلام ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کے زبان ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا پھر کلام کیسے صادر ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا یہ مقدمہ ہی غلط ہے کہ کلام کا صدور بلا زبان نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے انسان تو بواسطہ لسان کے گفتگو کرتا ہے مگر لسان بالذات متکلم ہے۔ لسان کو تکلم کے لیے کسی دوسری لسان کی حاجت نہیں۔ اسی طرح انسان آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور آنکھ خود بالذات دیکھنے والی ہے اس کو کسی دوسری آنکھ کی حاجت نہیں۔ اسی طرح انسان کان سے سنتا ہے۔ ناک سے سونگھتا ہے مگر ان اعضاء کے لئے ان کے افعال میں دوسرے اعضا کی حاجت نہیں یہ خود بلا واسطہ اور بالذات

نتھنے سونگھتے ہیں۔ پس اگر اسی طرح اللہ تعالیٰ بالذات متکلم ہوں اور ان کو لسان کی حاجت نہ ہو تو کیا استبعاد ہے۔ اس کو سن کر بہت محظوظ ہوا اور اپنے گروہ سے کہنے لگا کہ دیکھا علم اس کو کہتے ہیں۔

(۹۴) فرمایا۔ صوفیہ کی بعض تدبیراتِ ریاضت ہنود سے اخذ کی ہوئی ہیں جیسا حبسِ دم وغیرہ مثلاً اور وہ دراصل تخیلاتِ مشوشہ کا علاج ہے اور کفار سے ایسی تدابیر کو اخذ کرنا جائز ہے جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے سے حفرِ خندق کی تدبیر جو کفار فارس کی تدبیر تھی لے لی گئی۔ اور چونکہ وہ نہ صرف دین کی بات تھی۔ نہ کفار کا شعار قومی تھا اس لئے اس کو جائز کہا جائے گا۔

(۹۶) فرمایا۔ طاعون میں مکان چھوڑ کر باہر صحرا میں جانا جائز ہے لیکن پہلے اپنے اعتقاد کو اچھی طرح دیکھ لے۔

(۹۷) فرمایا تراویح کے متعلق مولوی ظفر احمد نے اعلاء السنن میں بہت عمدہ تحقیق لکھی ہے اور مجھ کو سب سے زیادہ اس کتاب کا خیال ہے کہ یہ کتاب جلدی چھپ جائے گو کچھ نکاسی بھی نہ ہو۔ آخر کسی نہ کسی طرح اہل علم کے تو ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔

(۹۸) فرمایا۔ مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نے اول ہی قادیانی کی براہین کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ اس کی طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد لوگوں کو گمراہ کرے گا۔

(۹۸) فرمایا۔ بوعلی سینا ایک بزرگ کی ملاقات کے واسطے گیا اور ان بزرگ کے سامنے ایسی تقریریں بگھاریں جن میں اپنے علم کا اظہار تھا اور واپس آنے کے بعد حاضرین سے پوچھا کہ شیخ نے میری نسبت کیا رائے ظاہر کی۔ کسی نے کہا انہوں نے یہ فرمایا ”بوعلی اخلاق ندارد“ بوعلی اخلاق نہیں رکھتا۔ ابن سینا نے فوراً علم اخلاق میں ایک کتاب تصنیف کر کے ان بزرگ صاحب کے پاس بھیج دی تاکہ معلوم ہو جاوے کہ ان کا فیصلہ غلط ہے انہوں نے کتاب کو دیکھ کر فرمایا ”من نگفتم کہ اخلاق نداند بلکہ گفتم اخلاق ندارد“ میں نے یہ نہ کہا تھا کہ بوعلی اخلاق نہیں جانتا بلکہ میں نے کہا تھا کہ اخلاق نہیں رکھتا۔ اور تصنیف کو استلزام داشتن (یعنی رکھنے) کو نہیں۔

(۹۹) فرمایا۔ تراویح پر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی مواظبت حکمی تھی کیونکہ اگر مانع نہ ہوتا یعنی خشیتِ افتراض تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مواظبت حقیقی ہی فرماتے اس لئے اس کو بھی مواظبت ہی کے حکم میں رکھا جائے گا۔

(۱۰۰) فرمایا۔ ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملائکہ کا سجدہ کرنا جیسا ان کے یعنی آدم علیہ السلام کے کمال کی دلیل ہے ویسا ہی ابلیس کا سجدہ نہ کرنا بھی ان کے کمال کی دلیل ہے کیونکہ اگر ابلیس بھی سجدہ کرتا تو اہل کمال کو یہ شبہ ہوتا کہ شیطان کو آدم علیہ السلام سے کچھ مناسبت ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کو ان کی طرف میلان ہوا اور ان کو سجدہ کیا۔ اب سجدہ نہ کرنے کی صورت میں یہ تحقیق ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور ابلیس کے درمیان کوئی مناسبت نہیں کیونکہ الجنس یمیل الی لجنس۔ جنس اپنی ہی جنس کی طرف راغب ہوتی ہے۔

(۱۰۱) فرمایا۔ حدیث میں ہے کہ نیکی کرنے سے عمر زیادہ ہوتی ہے۔ اس پر عام طور سے شبہ کیا جاتا ہے کہ عمر تو تقدیر میں مقرر ہے پھر عمر کیسے زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب حافظ ابن قیمؒ نے نہایت عمدہ دیا ہے کہ عمر ہی کی کیا تخصیص ہے سب کائنات کا یہی حال ہے۔ رزق، صحت وغیرہ جملہ اشیاء مقدر ہیں جن کے واسطے ہم اسباب تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ رزق کے لئے ذرائع اور صحت کے لئے معالجات۔ اور یہی اشکال سب میں ہوتا ہے۔ پھر عمر ہی کی کیا تخصیص ہے۔ سو جس طرح اور اسباب اور مسببات میں تعلق ہے اور کوئی اشکال نہیں کیا جاتا اسی طرح بِر اور زیادت عمر میں سبب و مسبب کا تعلق ہے۔

(۱۰۲) فرمایا۔ وعظ اس کو کہنا زیبا ہے جس کی کم از کم کتابیں تو ختم ہو گئی ہوں۔ وہ امید ہے کہ مسائل صحیح بیان کرے گا۔ اور جاہل پر کیا اطمینان ہے۔ اور اگر کتابیں پورا کئے بغیر وعظ کہے گا تو تحصیل علوم سے محروم رہے گا۔ اور دوسری دقیق شرط واعظ کے لئے یہ ہے کہ سلوک میں مشغول نہ ہو۔ وعظ کہنا شغل سلوک کو بھی مضر ہو گا کہ واعظ کو عوام کے تعلق سے چارہ نہیں اور اس کا مضر ہونا ظاہر ہے۔

(۱۰۳) فرمایا۔ عملیات میں اصل اثر خیال کا ہوتا ہے۔ باقی کلمات وغیرہ سے یہ خیال مضبوط ہو جاتا ہے کہ اب ضرور اثر ہو گا۔ گو عامل کو اس تحقیق کا پتہ بھی نہ ہو۔

(۱۰۴) فرمایا میں نے مولانا رفیع الدین صاحب کے ہمراہ توکل شاہ صاحب کی زیارت کی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میں جب اللہ کا نام لیتا ہوں تو زبان میٹھی ہو جاتی ہے اور خیالی نہیں حسًّا میٹھی ہو جاتی ہے۔

(۱۰۵) فرمایا۔ بعض لوگ صرف برکت کے قصد سے آتے ہیں۔ اصلاح کا قصد کچھ نہیں کرتے نہ کچھ سمجھنے کا قصد کرتے ہیں۔ تو ایسے آنے سے کیا فائدہ۔

(۱۰۶) فرمایا۔ احضار قلب کی ضد غفلت ہے۔ یعنی احضار قلب کا قصد نہ کرنا صرف اغفال نہیں یعنی عدم

اختصار کا قصد اور اخلاص اور اختصار قلب یہ احسان کے اجزاء ہیں یا شرائط ہیں۔

(۱۰۷) فرمایا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فرمایا۔ اس شخص کی صحبت اختیار کرو جو صوفی بھی ہو محدث بھی ہو۔ میں کہتا ہوں محقق ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے۔

۱۰۸۔ فرمایا۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں مکہ مکرمہ میں ایک شخص نے ہرن کا چمڑا بطور ہدیہ پیش کیا کہ فلاں شخص نے بھیجا ہے۔ فرمایا اس سے بوئے وطن آتی ہے۔ لانے والے سے معلوم ہوا کہ جنہوں نے بھیجا ہے انہوں نے تھانہ بھون کے جنگل میں شکار کیا تھا۔ اسی طرح ایک آدمی تھانہ بھون کا ان کی مجلس میں حاضر ہوا اور ہجوم کے سبب آخر مجلس میں بیٹھ گیا اس خیال سے کہ فراغت کے بعد پاس جا کر سلام کروں گا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اس مجلس میں کوئی شخص تھانہ بھون کا ہے۔ تب یہ پاس آ کر ملے۔

(۱۰۹) فرمایا ایک شخص مسجد میں نماز پڑھنے کے واسطے آیا۔ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ صاحب دونوں تشریف رکھتے تھے۔ دونوں صاحبوں میں اختلاف ہوا۔ ایک صاحب نے فرمایا یہ لوہار ہے۔ دوسرے نے فرمایا یہ بڑھئی ہے جب وہ شخص نماز سے فارغ ہو کر جانے لگا تو اس کو بلا کر دریافت کیا کہ تم کیا کام کرتے ہو اس نے عرض کیا میں پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا اور اب لوہار کا کام کرتا ہوں۔

اسی طرح ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ شکل دیکھ کر نام بتا دیا کرتے تھے۔ اور اتنا ذوقاً میں بھی سمجھ لیتا ہوں کہ اس کا نام اس کے مناسب ہے۔ بہت کم نام ایسے ہوں کہ ان میں اپنے مسمّٰے سے مناسبت وجداناً محسوس نہ ہو۔ اکثر ناموں میں اور ان کے مسمی میں مناسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کسی لغت کو سن کر فرما دیتے تھے کہ اس کے ایسے معنے ہوں گے گویا حروف کے خواص ان پر منکشف ہو جاتے تھے

(۱۱۰) فرمایا ایک حکیم صاحب ذوق فرماتے ہیں کہ نمازی اور غیر نمازی کے قارورے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا نور ہوتا ہے۔ اور بے نمازی کے قارورے میں وہ نور نہیں ہوتا۔ اس پر میں نے شبہ کیا کہ نجاست میں کیا نور ہوتا۔ شاہ لطف رسول صاحب نے فرمایا کہ حدیث میں ہے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ دَمِيْ نُوْرًا — اے اللہ میرے خون میں نور عطا فرما

اس سے معلوم ہوا کہ دم میں نور ہے حالانکہ دم نجس ہے۔ میں نے دو جواب دیئے۔ اول یہ کہ نجس جب تک اپنی معدن میں ہو تو وہ طاہر ہوتا ہے حتیٰ کہ بول بھی اور یہاں ذکر ہے بول منفصل کا اور اصل نور

قلب میں ہوتا ہے۔ اور دوسرے اعضاء میں اس کی حلاوت بوجہ تلبس کے سرایت کر جاتی ہے اور یہ نور وہ کیفیت ہے جس سے عبادت میں انشراح اور بسط اور ذوق اور خشوع وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اور نفس نور کی حقیقت یہ ہے کہ

ظَاهِرٌ بِنَفْسِهٖ وَمُظْهِرٌ لِغَيْرِهٖ جو خود ظاہر ہو اور دوسری چیز کو ظاہر کرنے والا ہو۔

دوسرے یہ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فضلات شریف پاک تھے ان پر دوسرے کو قیاس نہیں کر سکتے۔

(۱۱۱) فرمایا مدرسہ میں جو چندہ آتا ہے اس سے مہمان کو کھانا کھلانا جائز نہیں کیونکہ دینے والے کی غرض تو مصارف مدرسہ میں صرف کرنے کی ہوتی ہے اور یہ اس میں داخل نہیں اور مہتمم صرف امین اور وکیل ہوتا ہے۔ مالک نہیں ہوتا کہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ احقر نے عرض کیا چندہ میں سے ثلث لے کر چندہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ فرمایا نہیں۔ احقر نے کہا حدیث سرایا سے بعض لوگوں نے تمسک کیا ہے فرمایا

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ

اُجرت کو غیر اجرت پر قیاس کر لیا۔ وہاں تو امیر عامہ کو لشکر پر حسب مصلحت تقسیم کرنے کا حق ہے۔ اور خود مال مباح ہے۔ اور یہاں قفیز طحان کے علاوہ جہالت اُجرت کا فساد موجود ہے۔

(۱۱۲) فرمایا بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو آوے اس کو بیعت کر لیا جاوے ورنہ کسی بدعتی پیر کے ہاتھ میں پھنس جاوے گا۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے تو اپنے اس فعل سے اس کو بدعتی کے ہاتھ میں پھنسنے سے روکا ہے کیونکہ میرے اس دیر کا حاصل یہ ہے کہ یہ کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے جلدی نہ کرے۔ اور بالفرض اگر خاص وہ ایک شخص کسی بدعتی کے یہاں پھنس بھی گیا تو دوسرے پچاسوں آدمی سوچ سمجھ کر پیر تجویز کریں گے اور بدعتیوں سے بچیں گے۔ سمجھیں گے کہ جلدی کرنا اچھا نہیں۔ پس میرا یہ فعل تو بدعتیوں سے دور رہنے کا سبب ہے نہ کہ ان کے پاس جانے کا ذریعہ۔ غرض ہم اس کے پھنسنے کا سبب نہیں ہیں۔ وہ خود اپنے فعل کا معاشر بالاختیار ہے۔

(۱۱۳) فرمایا۔ اُمراء کی اصلاح کا طریق یہ ہے کہ ان سے ذرا استغنا کرے۔ اگر مصلح ان کو زیادہ لگے لپٹے گا تو وہ ذلیل اور خود غرض سمجھ کر نفرت کریں گے میں نے نواب ڈھاکہ سے اسی مصلحت سے صرف ایک شرط لگائی تھی کہ کچھ ہدیہ پیش نہ کرنا۔ صرف اتنی ہی بات سے اتنے معتقد ہوئے کہ باصرار بیعت کی

درخواست کی ۔ مگر میں نے منظور نہیں کی کیونکہ جو غرض تھی بیعت سے وہ حاصل تھی یعنی اتباع اور دیکھنے والوں سے سنا ہے کہ جب میرا ذکر آتا تھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور کہتے تھے کہ صحابہ کا نمونہ اگر کسی کو دیکھنا ہو تو اس کو (یعنی حضرت تھانوی دامت برکاتہم کو) دیکھ لے ۔ یہ سب کچھ تھوڑے سے استغنا کی برکت تھی ۔

(۱۱۴) فرمایا ہر شبہ کا علمی جواب دینا مناسب نہیں ۔ قرآن مجید میں دیکھو شیطان سجدہ نہ کرنے پر استدلال پیش کرتا ہے اور کہتا ہے ۔

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۔ میں آدمؑ سے بہتر ہوں

یہ دعویٰ ہے ۔

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۔ آپ نے مجھے آگ سے اور ان کو مٹی سے پیدا کیا۔

یہ دلیل کا ایک مقدمہ ۔ اور دوسرا مقدمہ مطویہ ہے یعنی

اَلنَّارُ خَيْرٌ مِّنَ طِيْنٍ ۔ آگ مٹی سے اچھی ہے ۔

مگر اللہ تعالیٰ و تبارک اس کے کسی مقدمہ پر جرح نہیں فرماتے جواب صرف یہ ملتا ہے ۔

اُخْرُجْ مِنْهَا ۔ یہاں سے نکل جا ۔

حالانکہ ابلیس کا استدلال کوئی قوی استدلال نہیں ہے ۔ اس کا جواب تو ہم جیسے طالب علم دے سکتے ہیں کہہ سکتے ہیں کہ تمہارے سب مقدمات غلط ہیں پہلے یہ ثابت کرو کہ نار بہتر ہے مٹی سے ۔ نیز اس کی تسلیم پر بھی یہ کہہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ ترکیب سے خاصیات بدل جائیں اور یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ سجدہ کا مدار فضیلت پر نہیں حکم پر ہے ۔ قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ۔ حکیم کا کلام ہے قادر مطلق کا کلام ہے اس لئے اس میں ایسے جوابات نہیں جو مغلوب الغضب لوگوں کے کلام میں ہوتے ہیں ۔

(۱۱۵) فرمایا حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا بیحد ادب فرماتے تھے ایسا کہ جیسا شیخ کا ادب کیا جاتا ہے ۔ میرے سامنے حضرت گنگوہیؒ کا دیا ہوا عمامہ ایک شخص نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت حاجی صاحب نے اس کو آنکھوں سے لگایا سر پر رکھا اور فرمایا کہ مولانا تبرک ہے ۔

(۱۱۶) فرمایا ۔ ایک محقق انگریز نے لکھا ہے کہ اسلام ہندوستان میں تلوار سے نہیں پھیلا بلکہ دو فرقوں

نے اسلام زیادہ پھیلایا۔ ایک صوفیہ نے۔ دوسرے تجار نے۔ لوگوں نے تبلیغ سے زیادہ ان کی صدق و امانت اور حالت معاملات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا۔

(۱۱۷) فرمایا۔ میں قانع علماء کے متعلق جن پر لوگ الزام لگاتے ہیں کہ یہ ترقی نہیں کرتے۔ وعظوں میں ایک مثال بیان کیا کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ایک رئیس کے پاس مثلاً ایک باورچی نوکر ہے اور بہت جاں نثار ہے۔ روٹی بھی پکاتا ہے۔ پنکھا بھی ہلاتا ہے پاؤں بھی دباتا اور تنخواہ اس کی دس روپے ہے۔ مثلاً اتفاق سے اس کے گھر کوئی مہمان آگیا۔ باورچی کی خدمات اور سلیقہ دیکھ کر اس سے اس نے تحقیق کیا کہ تمہاری تنخواہ کتنی ہے۔ اس نے کہا دس روپے۔ اس پر اس سے مہمان کہتا ہے کہ ہمارے ساتھ چلو ہم تم کو پچیس روپے دیویں گے اور چار آدمی کا کھانا بھی دیویں گے۔ اب میں معترض سے پوچھتا ہوں کہ تم مشورہ دو کہ وہ باورچی کیا کرے بس جو تمہارا فیصلہ اس باورچی کے متعلق ہوگا وہی فیصلہ علماء کے لئے تجویز کر لو۔ ظاہر ہے کہ جاں نثاری کا تقاضا تو یہی ہے اور تم بھی یہی کہو گے خصوص اگر وہ تمہارا نوکر ہو کہ نہ جاوے اور اپنے مالک کی خدمت میں کم تنخواہ پر ہی پڑا رہے۔ اور اگر وہ ایسا کرے تو اس کی مدح کرو گے پست خیال ہرگز نہ کہو گے۔ عین اسی طرح یہ علماء حق تعالیٰ کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں جو وفادار باورچی اپنے مالک کے ساتھ جاں نثاری کرتا ہے۔ پھر ان کو پست خیال کیوں کہا جاتا ہے۔

(۱۱۸) فرمایا۔ ایک سب انسپکٹر صاحب جو مرید بھی ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ شام اور عشاء اور صبح کی نمازیں تو جماعت کے ساتھ پڑھ لیتا ہوں اور ظہر و عصر کے وقت بازار سے گذرنا پڑتا ہے اس میں یہ خطرہ ہے کہ ایک تو لوگ ادب و تعظیم کے واسطے اٹھتے ہیں۔ دوسرے اس میں رعب نہیں رہتا۔ اور اس محکمہ کو رعب کی بیحد ضرورت ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ مجھکو کچھ حیا بھی آتی ہے لوگوں کے ساتھ دن میں نماز پڑھتے سے۔ میں نے لکھا کہ اگر کسی ایسی جگہ تبدیل ہو جاؤ جہاں مسلمان ہونے سے حیاء اور عار آوے تو کیا ایسی جگہ میں اسلام کو چھوڑ دو گے۔ اور ہیبت کم ہونے کا جواب یہ ہے کہ اس سے ہیبت کم نہیں ہوتی بلکہ محبت کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ البتہ نفرت کم ہو جاتی ہے جس کا نام تم نے ہیبت رکھا ہے۔

(۱۱۹) فرمایا۔ لکھنؤ میں ایک ترقی یافتہ مجمع کی درخواست پر میرا وعظ ہوا میں نے آیۃ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ الآیہ کا بیان کیا اور استباق کی حقیقت ترقی بتلا کر میں نے کہا صاحبو! تم تو ترقی کو عقلاً واجب کہتے ہو گے اور ہم شرعاً واجب کہتے ہیں تو ہم ترقی کے زیادہ حامی

ہوئے۔ کیونکہ ہم جب اس کو شرعاً واجب کہتے ہیں تو اس کے ترک پر گناہ کے بھی قائل ہوں گے غرض تم اور ہم اس پر تو متفق ہوئے کہ ترقی مطلوب ہے اور اس پر بھی تم کو اتفاق کرنا پڑے گا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں کیونکہ اگر بدن پر مثلاً ورم ہو جاوے تو وہ بظاہر ترقی جسمانی ہے مگر تم بھی اس کا علاج کراتے پھرو گے اسی طرح اگر سِمَن مفرط ہو جاوے تو اس کا بھی علاج کرانا ضروری سمجھو گے۔ پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ ترقی وہ مقصود ہے جو نافع ہو اور جو ضار یعنی نقصان دہ ہو وہ مطلوب نہیں۔ پس اتنے حصہ میں تو ہمارا تمہارا اتفاق ہے اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ کونسی مضر سو تم صرف دنیاوی ترقی کو نافع سمجھتے ہو اگرچہ آخرت میں مضر ہو اور ہم دینی ترقی کو مطلقاً نافع سمجھتے ہیں اور دنیاوی ترقی کو قید عدم ضرر کے ساتھ ورنہ ترقی فی الورم والسمن کی طرح مضر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اس نافع ترقی کا حکم فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ میں فرمایا ہے کیونکہ خیر نافع کو کہتے ہیں۔ باقی مولویوں پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ مولوی تو جائز دنیوی ترقی کا بھی وعظ نہیں کرتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیوی ترقی کا بھی وعظ نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیوی ترقی کا وعظ جب کہتے جبکہ تم لوگ اس کو نہ جانتے ہوتے تو وعظ سے اس کی ضرورت کو بتلایا جاتا۔ تم تو خود اس قدر زیادہ اس میں مشغول ہو کہ حدود سے بھی نکل گئے ہو۔ پھر ہمارے وعظ کی آپ کو اس ترقی کے متعلق کیا ضرورت رہ گئی بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تم جو حدود سے نکل گئے ہو اس سے تم کو روکا جائے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نہایت تصریح کے ساتھ صاف کر دیا ہے۔ یعنی اول قارون کی دنیوی زندگی کا ذکر فرمایا ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ	جب وہ اپنے حشم خدم لیکر ساز و سامان کیساتھ نکلا ہے

پھر دنیوی ترقی کے مقصود سمجھنے والوں کا قول نقل فرمایا ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ	دنیا دار لوگ کہنے لگے کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ
الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ	ساز و سامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے۔
قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝	واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے۔

اس کے بعد مولویوں کا جواب ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ	اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوا تھا وہ کہنے لگے ارے
ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ	تمہارا ناس ہو اللہ کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے

صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ
اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

یہ تو دنیا داروں اور دین داروں کے اختلاف کی حکایت تھی آگے اللہ تعالیٰ ان میں فیصلہ فرماتے ہیں اور فیصلہ بھی عملی فیصلہ۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ
فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ

پھر ہم نے قارون کو اور اس کے محل سرا کو زمین میں دھنسا دیا سو کوئی ایسی جماعت نہ ہوئی جو اس کو اللہ کے عذاب سے بچا لیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بچا سکا۔

جب اللہ تعالیٰ کا یہ عملی فیصلہ دیکھا تو دنیوی ترقی کے طالبوں ــ کی رائے بدل گئی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ
بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ
اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَوْلَآ اَنْ
مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَاَنَّهٗ
لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اور کل جو لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کر رہے تھے وہ کہنے لگے کہ بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جسکو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی سے دیتا ہے۔ اگر ہم پر اللہ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسا دیتا۔ بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی۔

اور میں بقسم کہتا ہوں کہ تم بھی عملی فیصلہ کے وقت اقرار کروگے کہ مولوی ٹھیک کہتے تھے مگر یہ فیصلہ کب ہوگا جبکہ موت آوے گی۔ اس وقت اپنی غلطی کا اقرار کروگے کہ ہائے علماء حق پر تھے۔

(۱۲۰) ایک شخص نے ایک پیسہ ہدیہ دیا بایں صورت کہ اکنی حضرت والا کو پیش کردی اور کہا کہ تین پیسے واپس دیدیجئے۔ مجلس میں تحقیق کرکے اس اکنی کے چار پیسے بھنائے گئے پھر تین پیسے مہدی کو واپس دیئے اور پیسہ خود رکھ لیا اور فرمایا بھلا اب اس ہدیہ میں ریا کا کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

(۱۲۱) فرمایا۔ طالب علموں کو زمانہ طالب علمی میں ذکر و شغل تو نہیں چاہیئے مگر اعمال کی اصلاح اور اخلاق کی اصلاح کرنا فرض ہے۔

(۱۲۲) فرمایا مدینہ منورہ کے سفر کا خرچ حساب میں نہ لادے کیونکہ وہ عاشقانہ سفر ہے پیادہ ہو سکے

تو بیدل ہی جاؤ مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ عاشق کے لئے بعض عشاق گنبد خضراء پر نظر کرتے ہی گر کر مر گئے۔

(۱۲۳) فرمایا۔ ترک دنیا ایسی اچھی اور پسندیدہ چیز ہے کہ طالبین دنیا کو بھی ان ہی لوگوں سے محبت ہوتی ہے جو تارک ہیں اور تارک الدنیا کو طالبین دنیا سے محبت نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ ترک دنیا طالبین دنیا کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

(۱۲۴) فرمایا جب جن کبھی نظر آویں تو اذان کہدے اور احتلام کی کثرت کسی کو ہو تو عامل لوگ اس کا علاج بتلاتے ہیں کہ سورۂ نوح پڑھ کر سو جاوے بعض کا قول ہے کہ حضرت عمرؓ کا اسم مبارک سینہ پر لکھ لے۔ بعض یہ بتلاتے ہیں کہ اس سے خطاب کر کے کہے کہ بیشرم حضرت آدمؑ کو تو سجدہ کرنے سے تجھے عار آئی تھی اور مجھ سے برا کام کراتا ہے تجھے شرم نہیں آتی۔

(۱۲۵) فرمایا۔ ملائکہ بھی حق تعالیٰ کی عظمت سے ڈرتے ہیں اور لرزاں و ترساں ہیں حالانکہ معصوم ہیں اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام بھی۔

(۱۲۶) فرمایا وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر ضلال میں سے عدم اجابت دعاء کافر پر استدلال کرنا جیسا بعض کا قول ہے یہ شبہ سیاق و سباق پر نظر نہ کرنے سے پڑا ہے۔ اس سے پہلے عذاب آخرت کا ذکر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ	اور دوزخی داروغہ جہنم سے کہیں گے
ادْعُوْا رَبَّكُمْ اِلٰى قَوْلِهٖ قَالُوْا فَادْعُوْا	تم خدا سے دعاء مانگو۔

پس کافر جہنم سے نکلنے کی اگر دعا کریں تو وہ دعا قبول نہ ہوگی ورنہ عام طور پر یہ حکم نہیں چنانچہ ابلیس کی دعا قبول ہونا منصوص ہے۔

(۱۲۷) فرمایا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ایک زمانہ میں مطبع مجتبائی میں دس روپے کے مشاہرہ پر کام کرتے تھے۔ جب حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ حضرت اگر آپ مجھے مشورہ دیں تو ملازمت چھوڑ دوں۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا "مولانا ابھی تو آپ مشورہ ہی لے رہے ہیں۔ مشورہ دلیل ہے تردد کی۔ اور تردد دلیل ہے خامی کی اور خام کو ترک اسباب نہیں چاہیئے"۔ یہ جواب وہی دے سکتا ہے جس کے سامنے حقائق پورے طور سے حاضر ہوں۔ اہل درس اپنے ذہن کو ٹٹول کر دیکھ لیں۔

ان سے ہرگز یہ جواب نہ بن سکے گا اور قیامت تک وہ ایسے مقدمات مرتب نہ کر سکیں گے۔

(۱۲۸) فرمایا بعض مشائخ حرام نوکری کے ترک کا اس لئے مشورہ نہیں دیتے کہ بعض اوقات گناہ کفر کا وقایہ ہو جاتا ہے مگر گناہ کو برا سمجھے۔ گناہ کو چھوڑ کر کفر میں مبتلا نہ ہو جاوے۔

(۱۲۹) فرمایا سفر حج میں ایک مالدار اور ایک غریب کا عجیب مکالمہ ہوا۔ غریب کو ناداری سے کچھ تکلیف پہنچی۔ اسے دیکھ کر امیر نے کہا ناخواندہ مہمان کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے اور جب تم کو بلایا نہیں گیا تو آئے کیوں۔ ہمیں دیکھو اللہ میاں نے بلایا ہے تو کس طرح کا آرام پہنچایا ہے غریب نے کہا کہ تم سمجھے نہیں۔ ہم تو گھر کے آدمی ہیں۔ تقریبات میں گھر والوں کی رعایت نہیں ہوا کرتی جیسی براتی مہمان کی ہوتی ہے مگر وہ اجنبی ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی خاطر کی جاتی ہے چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو کہ سب سے زیادہ مقرب ہیں ظاہری ساز و سامان کم ملتا ہے اس لئے ہماری پوچھ کم ہے تمہاری زیادہ ہے

(۱۳۰) فرمایا۔ حضرت میاں جی نور محمد صاحب (دادا پیر) رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں ایک صاحب مولوی محمد اشرف مصنف تفسیر سورہ یوسف منظوم شروع شروع میں کچھ گستاخی کے کلمات کہا کرتے تھے بعد ازاں تائب ہو کر حضرت میاں جی صاحبؒ سے بیعت ہو گئے۔ مدت کے بعد حضرت نے ان سے فرمایا بھائی میں براہِ تدیّن کہتا ہوں کہ تم کو مجھ سے فائدہ نہ ہوگا کیونکہ میں جب فائدہ پہنچانے کی غرض سے تمہاری طرف متوجہ ہوتا ہوں تو تمہارے وہ گستاخانہ کلمات دیوار بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ وہ حائل نہ ہوں مگر میں مجبور ہوں۔ اسی طرح ایک شخص نے کچھ ایسی حرکت کی تھی جس سے مجھ کو تکلیف ہوئی۔ پھر تعلق کی تجدید چاہی۔ میں نے کہا دل نہیں ملتا۔ اس نے کہا اس کی بھی کوئی تجویز فرمائی جاوے میں نے کہا جیسے تم نے مخالفت کا اعلان کیا تھا اسی طرح اپنی غلطی کا بھی اعلان کر دو۔ اس نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے کہا وضوحِ حق کے بعد بھی حق کے اعتراف سے کون مانع ہے۔ کہا استکبار اور عار مانع ہے۔ میں نے کہا تو ایسے متکبر سے میں تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ پھر ان کے والد نے سفارش کی۔ میں نے کہا وہی شرط ہے اعلان کی جیسا سیر کی روایت میں ہے کہ ابلیس نے ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی میں کلام کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ اگر ایسے وقت میں میری نسبت بھی کچھ عرض کر دیجئے کہ اب بہت ہو چکی معافی ہو جاوے تو بڑی عنایت ہو گی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے وعدہ تو فرمایا۔ مگر جب قرب خداوندی حاصل ہوا تو بھول گئے۔ خاص اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

یاد دلایا کہ تم نے جو شیطان سے وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرو۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی تو جواب ملا ہاں۔ ہمیں معاف کرنا کیا مشکل ہے مگر اس کو کہدو کہ اب قبر آدم علیہ السلام کو سجدہ کر لیوے موسیٰ علیہ السلام اس سے بہت خوش ہوئے کہ یہ سجدہ کیا مشکل ہے۔ خوشی خوشی شیطان سے آکر ذکر کیا اس نے کہا واہ آپ نے خواب کہی۔ میں نے زندہ کو تو سجدہ کیا ہی نہیں اب مُردہ کو سجدہ کروں گا اسی طرح میرے یہاں بھی وہی شرط ہے۔ اس شخص نے اول درخواست میں یہی کہا تھا آپ اگر توجہ فرمادیں تو دل بھی مل سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ غیر اختیاری ہے۔ دیکھئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون صاحب خلق ہوگا مگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حمزہؓ کے قاتل کو فرمایا تھا۔

وَهَلْ تَسْتَطِيْعُ اَنْ تَغِيْبَ وَجْهَكَ عَنِّيْ۔ کیا تم یہ کرسکتے ہو کہ مجھ سے اپنا منہ چھپالو۔

حالانکہ وہ مسلمان ہو چکے تھے جس کی خاصیت یہ ہے:

اَلْاِسْلَامُ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ۔ اسلام لانا پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے

پس اس صورت میں تحقیق یہی ہے کہ یہ سب غیر اختیاری بات ہے تو میں کیسے دل ملاؤں مگر کئی سال کے بعد ان کو اس اعلان کی توفیق ہوئی۔ اب میرا بھی دل صاف ہے۔

(۱۳۱) فرمایا۔ جب میں کانپور سے تعلق چھوڑ کر وطن آیا تو میرے ذمہ ڈیڑھ سو روپیہ کے قریب قرضہ تھا۔ میں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمادیں کہ قرض اتر جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا اگر ارادہ ہو تو دیوبند ایک مدرس کی جگہ خالی ہے میں وہاں لکھدوں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ جب کانپور سے تعلق چھوڑو تو پھر کسی جگہ ملازمت کا تعلق نہ کرنا۔ لیکن اگر آپ فرمادیں تو میں کرلوں گا اور یوں خیال کروں گا کہ یہ بھی حضرت حاجی صاحبؒ کا ہی حکم ہے۔ گویا ایک ہی ذات کے دو حکم ہیں۔ مقدم منسوخ ہے اور مؤخر ناسخ ہے کیونکہ میں آپ کے حکم کو بھی بجائے حضرت کے حکم کے سمجھتا ہوں (کاتب الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ جواب محض علماء ظاہر اگر اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو یہی فیصلہ کریں گے کہ ہرگز نہ دے سکتے ۱۲) حضرت مولانا نے فرمایا نہیں نہیں جب حضرت نے ایسا فرمادیا ہے تو ہرگز اس کے خلاف نہ کریں باقی میں دعا کرتا ہوں۔

(۱۳۲) فرمایا۔ خوف ہر چند کہ مطلوب ہے مگر اس میں بھی ایک حد ہے یعنی خوف اتنا ہو جو معاصی سے روک دے۔ اسی طرح شوق کی بھی ایک حد ہے اور اس حد کے لئے دو قیدیں بتلائی گئی ہیں اول حسنؒ

غَیْرِ ضَرَّاءَ مُضِرَّۃٍ دوسری وَلَا فِتْنَۃٍ مُضِلَّۃٍ قید اول میں ضرر بدنی مراد ہے یعنی شوق اتنا زائد نہ ہو جس سے ضرر بدنی لاحق ہو جیسا مثلاً غلبۂ شوق سے بھوک نہ لگنا جس سے نحیف ہو کر بیکار ہو جائے۔ دوسری قید میں ضرر دینی مراد ہے فتنۃ مضلۃ اس کا قرینہ ہے اس لئے کہ غلبۂ شوق میں بعض اوقات بے تکلفی اور گستاخی پیدا ہو جاتی ہے جیسا بعض مجذوبین سے صدور ہو جاتا ہے۔ سو گستاخی کی حد تک شوق بڑھ جانا ضرر دینی ہے اس لئے یہ قید لگائی بس ہر چیز میں حدود ہونا چاہئے مگر یہ سب مقصود بالغیر میں ہے اور مقصود بالذات میں کوئی حد نہیں جیسے ایمان۔

(۱۴۳) فرمایا۔ سیاہ مرچ کا چبانا بیداری کی اچھی تدبیر ہے۔ اور دماغ کو بھی مفید ہے ذکر کی حالت میں جن لوگوں کو نیند کا غلبہ ہو ان کے واسطے یہ علاج ہے کہ فلفل سیاہ کا ایک دانہ منہ میں چباتے جاویں (اور شہد میں ملانے سے مقوی دماغ بھی ہے کذا فی مطب عبدالخالق عفی عنہ)

معاملات سے متعلق فتوے میں توسّع

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ایک بصیرت افروز فقہی تحقیق

حضرت حکیم الامتؒ کے مواعظ کا ایک مجموعہ زیرِ مطالعہ تھا اس کے ایک وعظ "آداب المصاب" میں حضرتؒ نے رزقِ حلال کی اہمیت بیان فرمائی ہے — اسی سلسلہ میں حضرتؒ کا یہ ارشاد نظر سے گذرا جس میں امت کے لیے یقیناً بڑی وسعت اور سہولت ہے — فرمایا کہ:۔

> "بلکہ اس باب میں میری رائے تو یہ ہے کہ اگر معاملات میں کسی وقت اپنے مذہب میں تنگی ہو اور دوسرے ائمہ مجتہدین کے اقوال میں گنجائش ہو تو عوام کو تنگی میں نہ ڈالا جائے بلکہ دوسرے ائمہ کے قول پر فتویٰ دے دیا جائے، میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے اس رائے کی صریح تائید حاصل کر چکا ہوں" (وعظ آداب المصاب، سلسلہ تبلیغ صـ ۱۳۹)

اِس دور کے بہت سے اصحاب فتویٰ کے مزاج میں شدت پسندی دیکھی جاتی ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت اور دین کا مزاج وہی ہے جو حضرت حکیم الامتؒ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے۔

(محمد زکریا ندوی خادم تدریس العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

حکیم الامت رحمہ اللہ

اور

رضاخانی اتہامات کا تحقیقی جائزہ

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر، گوجرانوالہ

ترجمانِ اہلِ سنت حضرت مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر دامت برکاتہم العالیہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

ذیل کا مضمون دراصل مولانا موصوف کی مایہ ناز کتاب "عباراتِ اکابر جلد اول" کے اس حصہ پر مشتمل ہے جس میں مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی اور ان کے پیروؤں کی طرف سے حضرت تھانویؒ پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

مولانا موصوف سے اس نمبر کے لیے حضرت تھانویؒ پر مقالہ لکھنے کی درخواست کی گئی تھی مگر اپنی تدریسی و تصنیفی مصروفیات نیز علالت و کبرسنی کی وجہ سے مفصل مقالہ تحریر نہیں فرما سکے بلکہ ایک مختصر تأثراتی تحریر ارسال کی ______ ہم اس مختصر تحریر اور "عباراتِ اکابر" سے اخذ کیے گئے مضمون کو ان کے شکریہ کے ساتھ شاملِ اشاعت کر رہے ہیں۔ (شبیر احمد نقیبی)

* * *

ضلع مظفر نگر، تحصیل کیرانہ میں مظفر نگر سے ۱۸ میل شمال مغرب میں پختہ سڑک پر راجہ بھیم کے نام سے ایک قصبہ آباد ہے جس کا نام تھانہ بھیم تھا جو بعد کو تھانہ بھون کے نام سے مشہور ہوا، مسلمانوں نے اس کا نام محمد پورہ رکھا تھا مگر مشہور نہ ہو سکا۔ اور جہاد ۱۸۵۷ء میں یہ قصبہ مجاہدین کا مرکز رہا، مجاہدین

نے اپنی بساط کے مطابق خوب جہاد کیا اور تحصیل[1] کیرانہ پر مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی علیہ الرحمۃ (المتوفی سنہ ھ) کی قیادت میں مجاہدین نے قبضہ کیا اور دیگر مجاہدین نے شاملی پر قبضہ کر لیا۔ قاضی عنایت علی خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مجاہدین کی مالی امداد کرتے رہے اور ان کے بھائی قاضی عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ظالم انگریز نے پھانسی دے دی۔ یہ قصبہ اور اس کے ملحقہ قصبات بڑے مردم خیز اور تعلیم دین کے بڑے ادارے تھے۔ اس قصبہ تھانہ بھون میں ۵ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ بدھ کے دن بوقت صبح صادق حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، والد ماجد کا نام منشی عبدالحق صاحب تھا (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) اور کئی پشتوں پر یہ سلسلہ نسب سیدنا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے اور ننہال کی طرف سے آپ سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتے ہیں۔ آپ کی پیدائش کا مادہ تاریخ کرمِ عظیم ہے، آپ کے نانا میر نجابت علی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے جو اعلیٰ درجہ کے فارسی دان اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی ولادت کے چودہ ماہ بعد ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اکبر علی رکھا گیا جنہوں نے انگریزی تعلیم میں بڑی دسترس حاصل کی۔ پانچ سال کی عمر میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا اور پھر والد مرحوم ہی پدری شفقت کے ساتھ مادری شفقت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔

ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں اور قرآن کریم جناب حافظ حسین علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یاد کیا، پھر تھانہ بھون آ کر حضرت مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عربی کی ابتدائی کتابیں اور فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد آخر ذوالقعدہ سنہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر بقیہ نصاب کی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہما جید اساتذہ کرام سے تکمیل کی۔ صفر سنہ ۱۳۰۱ھ میں کانپور میں مدرسہ فیضِ عام میں ۲۵ روپے ماہانہ پر مدرس ہوئے اور اونچے درجہ کی کتابیں آپ نے عمدہ طریقہ سے پڑھائیں، سب نے آپ کا سکہ مان لیا۔ آخر صفر سنہ ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے تھانہ بھون منتقل سکونت اختیار

---

[1] جہادِ شاملی کے موقع پر شاملی ہی تحصیل تھی، کیرانہ بعد کو تحصیل بنی۔ ۱۲

کرلی اور پھر مدت العمر تھانہ بھون ہی میں ظاہری اور باطنی علوم کی نشر و اشاعت کرتے رہے اور کئی سو کتابیں تصانیف فرما کر حکیم الامت کا خطاب پایا۔ (یہ لقب سب سے پہلے مولانا مرزا محمد بیگ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مالک محبوب المطابع دہلی نے تجویز کیا، جس طرح حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۱۰۶۷ھ) نے حضرت احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو مجدد الف ثانیؒ کا لقب دیا تھا اور پھر ساری دُنیا کی زبان پر یہ لقب جاری ہو گیا جو اُن کے اصلاحی کارناموں پر دلالت کرتا ہے) اور خلقِ خدا کی علمی اور رُوحانی پیاس بجھائی، اور بیعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کی ہے۔ پہلا حج حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ نے اپنے والد مکرم علیہ الرحمۃ کی معیت میں ۱۳۰۱ھ میں کیا، اس کے بعد والد محترمؒ کی وفات کے بعد ۱۳۱۰ھ میں دُوسرا حج کیا، اور چھ ماہ اپنے مُرشد کامل حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت اقدس میں رہ کر شایان شان استفادہ کیا اور ۱۳۱۱ھ میں پھر واپس کانپور مدرسہ جامع العلوم تشریف لائے اور پھر صفر ۱۳۱۵ھ میں تھانہ بھون تشریف لے گئے اور خلقِ خدا کی دینی تربیت اور تصنیفِ کتب میں مصروف ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی کتابوں کو وہ مقبولیت دی جو اس زمانہ میں کسی اور کو حاصل نہ ہوئی۔

چنانچہ ایک بزرگ جناب شریف احمد صاحب سقہ گنج پوری تحصیل و ضلع کرنال (رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ) نے ایک خواب دیکھا جس میں انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و بارک وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی زیارت کی، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و بارک وسلم نے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس کو قریب آنے دو یہ اشرف علی صاحب کا خادم ہے، اور نیز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و بارک وسلم نے شریف احمد صاحب علیہ الرحمۃ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اشرف علی صاحب کی کتابوں پر عمل کرتے رہنا اور دُوسروں کے کہنے سے مت رُکنا۔ (محصلہ مقدمہ بوادر النوادر ص۵)

آپ نے دو شادیاں کیں مگر اولاد کوئی نہیں ہوئی، گو جسمانی اولاد تو حاصل نہیں ہوئی مگر رُوحانی اولاد اس کثرت سے ہے کہ احصاء و شمار سے باہر ہے۔ جب والد محترم نے حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کو عربی تعلیم میں اور دُوسرے بھائی اکبر علی صاحب علیہ الرحمۃ کو انگریزی میں لگایا کیونکہ والد محترم دونوں کی استعداد کو تاڑ گئے تھے کہ ان کا مزاج اور طبیعت کا فطری رُخ یہی ہے تو حضرت

حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی محترمہ چچی صاحبہ علیہا الرحمۃ نے اُن کے والد سے کہا کہ ایک کو تو انگریزی پر لگا دیا یہ تو کما کھائے گا، لیکن دُوسرے کو عربی میں لگا دیا ہے یہ بھلا کیا کما کھائے گا؟ لیکن ان کو بھلا کیا معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو کس طرح حلال روزی سے نوازا اور حیاتِ طیبہ عطا فرمائی۔ بالآخر منگل کی رات ۱۷ رجب سنہ ۱۳۶۲ھ ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء کو آپ بیاسی سال تین ماہ اور گیارہ دن کی عمر پا کر دُنیا سے رخصت ہو گئے اور دیکھنے والوں نے دیکھا اور مسلسل دیکھا کہ وفات سے قبل آپ کی درمیانی اور شہادت کی اُنگلی کے درمیان سے ہتھیلی کی پُشت سے ایک تیز روشنی نکلتی تھی جس کے سامنے برقی قُمقمے ماند پڑ جاتے تھے، یہ اُن کی تحریری خدمت کا صلہ ہے جس سے رہتی دُنیا تک لوگ استفادہ کرتے رہیں گے۔

ہندوستان کے نامور اور مشہور علماء کرام میں سے جو اپنے دَور میں علوم شریعت و طریقت میں اپنی نظیر آپ تھے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی تھے جن کی ساری زندگی مذہب اسلام کی نشر و اشاعت اور مخلوقِ خدا کی اصلاح اور بہتری میں گذری اور جنہوں نے قرآن کریم کی تفسیر سے لے کر ایک معمولی مسئلہ تک جو چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار سے اوپر ہے (اور ایک اندازہ کے مطابق تیرہ سو سے متجاوز ہے) اور پاک و ہند میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں جید علمائے کرام ان سے روحانی فیض حاصل کر کے انکے خلفاء کے زمرہ میں شامل ہوئے اور اپنے اپنے حلقہ میں عوام کی روحانی پیاس کو بجھاتے رہے اور اب بھی بفضلہٖ تعالیٰ بے شمار حضرات موجود ہیں جو شمع رشد و ہدایت کو بادِ مخالف میں بھی فروزاں کیے ہوئے ہیں لیکن مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے کفر کی کُند چھری سے ان کا گلا بھی نہیں بچا گو کٹا نہیں مگر یہ ظالم چھری ان کے گلے پر رگڑی ضرور گئی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے خانصاحب کی عبارت بقیدِ حروف نقل کریں اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اپنی عبارات پیش کریں تاکہ آفتاب نیمروز کی طرح حقیقت بے نقاب ہو جائے۔

پہلا اعتراض

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:-

اور اس فرقہ وہابیہ شیطانیہ کے بڑوں میں سے ایک شخص اسی گنگوہی کے دم چھلوں

ہیں ہے جسے اشرف علی تھانوی کہتے ہیں، اُس نے ایک چھوٹی سی رسیلیا (رسالہ کی تصغیر ہے۔ صفدر) تصنیف کی کہ چار ورق کی بھی نہیں اور اس میں تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا جیسا علم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے ایسا تو ہر بچے اور ہر پاگل بلکہ ہر جانور اور ہر چارپائے کو حاصل ہے اور اس کی ملعون عبارت یہ ہے:۔

" آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب؟ اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے ایسا علم غیب تو زید و عمر بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کیلئے بھی حاصل ہے، الیٰ قولہ (درمیان کی عبارت خان صاحب ہضم کر گئے ہیں، ہاں علمی گرفت سے بچنے کے لیے الیٰ قولہ لکھ دیا ہے کیونکہ اس درمیانی عبارت میں حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے مختصر سی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حاصل ہے کے بعد عبارت یوں ہے:۔ "کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دُوسرے شخص سے مخفی ہے تو چاہیئے کہ سب کو عالم الغیب کہا جاوے پھر اگر زید اس کا التزام کرلے کہ ہاں میں سب کو عالم الغیب کہوں گا تو پھر علم الغیب کو منجملہ کمالاتِ نبویہ شمار کیوں کیا جاتا ہے جس امر میں مومن بلکہ انسان کی بھی خصوصیت نہ ہو وہ کمالاتِ نبوت سے کب ہو سکتا ہے اور التزام نہ کیا جاوے تو نبی غیر نبی میں وجہ فرق بیان کرنا ضرور ہے۔ (حفظ الایمان ص ۹ طبع امدادیہ دیوبند) اور اگر تمام علوم غیب مُراد ہیں اس طرح کہ اس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل نقلی و عقلی سے ثابت۔ (اھ) میں (احمد رضا خان) کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کی مہر کا اثر دیکھو یہ شخص کیسی برابری کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور چنیں وچناں میں۔ اھ۔ (حسام الحرمین ص ۱۰۹)

الجواب خان صاحب اور ان کے اتباع نے اپنی افتادِ طبع اور سُوءِ مزاج سے مجبور ہو کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عبارت ایسا علم غیب الخ کے فقرہ میں لفظ ایسا کو محض سینہ زوری سے برابر یا تشبیہ کے معنیٰ میں لے کر قائل کی اپنی مراد کے خلاف اس کا مطلب لیا اور پھر ان پر کفر کی بمباری شروع کر دی، حالانکہ اردو زبان میں لفظ ایسا کے متعدد معانی آتے ہیں۔ چنانچہ امیر مینائی مرحوم اپنی مشہور کتاب امیر اللغات میں لفظ ایسا کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) اس قسم کا، اس شکل کا فقرہ ایسا قلمدان ہر ایک سے بننا دشوار ہے، آتش ؎

مجوب نہیں باغ جہاں میں کوئی ایسا   بو رکھتا ہے گل ایسی نہ لذت ثمر ایسی

(۲) اس قدر، اتنا فقرہ ایسا مارا کہ ادھموا کر دیا، برقؔ ؎

اس بادہ کش کا جسم ہے ایسا لطیف وصاف   زنار پر گماں ہے موج شراب کا

(امیر اللغات جلد دوم صـ ۳۰۴)

لفظ ایسا سے اس قسم کا یا اس قدر یا اتنا کوئی معنیٰ مراد لیں اس کے پیشِ نظر حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی مذکورہ عبارت بالکل بے غبار اور بے داغ ہے اور انہوں نے معاذ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی ہرگز کوئی توہین نہیں کی اور نہ ان کے وہم میں بھی اس کا خیال گذرا ہے، مگر خان صاحب بلا وجہ ان کو کافر بنانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

مولانا مرحوم کی مراد یہ ہے کہ اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وبارک وسلم کی ذات گرامی کی کیا تخصیص ہے ایسا یعنی اس قدر اور اتنا علم غیب کہ جس کے اعتبار سے تم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کو عالم الغیب کہتے ہو اور اطلاق لفظ عالم الغیب کے لیے جتنے اور جس قدر کی ضرورت سمجھتے ہو یعنی مطلق بعض مغیبات کا علم تو یہ زید وعمر بلکہ ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات اور بہائم کو بھی حاصل ہے تو چاہیئے کہ سب کو معاذ اللہ تعالیٰ عالم الغیب کہا جائے کیونکہ ان قائلین کے نزدیک کسی کے عالم الغیب کہنے کے لیے محض اتنا ہی کافی ہے کہ اس کو غیب کی کسی نہ بات کا علم ہو اور ان چیزوں کو بھی بعض مغیبات کا علم ضرور ہے اور نہ سہی تو کم از کم ذات باری تعالیٰ ہی کا علم ہے اور وہ بھی منجملہ مغیبات سے ہے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی معاذ اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ جیسا علم غیب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کو حاصل ہے ویسا ہی ان چیزوں کو حاصل ہے اور نہ یہ کہ العیاذ باللہ تعالےٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کے مساوی اور برابر علم ہر صبی ومجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کو حاصل ہے، جیسا کہ خان صاحب لکھتے ہیں کہ یہ شخص کیسی برابری کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور چنیں وچناں ہیں۔ اھ

خان صاحب کا پہلے تو یہ فریضہ تھا کہ تکفیر جیسے سنگین قدم اٹھانے سے پہلے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ان کی مراد دریافت کر لیتے اگر ان کی مراد سے توہین کا ادنیٰ احتمال بھی نکلتا تو

بلاشبہ ان کی تکفیر کرتے بلکہ یوں کہتے کہ تھانوی ڈبل کافر ہے، اور دوسرے درجہ پر ان کا یہ فریضہ تھا کہ جب حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنی مراد بیان کر دی اور اس وجہ اور مطلب و مراد کو کفر کہا جس کو لے کر خان صاحب ان کی بلا وجہ تکفیر کر رہے ہیں تو خانصاحب کے لیے مناسب تھا کہ وہ اپنے اس ظالمانہ فتوٰی سے رجوع کرتے اور اخبارات و اشتہارات میں اسے شائع کرتے کہ میں نے تھانوی صاحب کی عبارت سے جو مراد سمجھی تھی تھانوی صاحب خود بھی اسے کفر کہہ رہے ہیں اس لیے میں اپنے فتوٰی سے رجوع کرتا ہوں اور تھانوی صاحب اور اُن کے معتقدین سے معافی کا خواستگار ہوں جن کو میرے اس غلط فتوٰی سے تکلیف پہنچی ہے مگر خان صاحب کا تو مشن ہی ان کو کافر بنانے کا تھا وہ بھلا کس طرح اور کیوں اپنے اس ناروا فتوٰی سے رجوع کرتے۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ "حفظ الایمان" کی جس متنازع فیہا عبارت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی معاذ اللہ تعالیٰ توہین کا جو پہلو خانصاحب کے نزدیک نکلتا ہے وہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی مراد بھی ہرگز نہیں اور وہ ان کے نزدیک خالص کفر ہے اور وہ پہلو خانصاحب کے نزدیک بھی کفر ہے لیکن بایں ہمہ وہ اس پر مُصر ہیں کہ تھانوی صاحب کافر ہیں کیونکہ معاذ اللہ تعالیٰ توہین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کے مُرتکب ہو رہے ہیں ہر عقلمند آدمی اس سے بخوبی یہ اخذ کر سکتا ہے کہ خانصاحب حضرت تھانوی کو کافر کہنے پر بہر کیف تُلے ہوئے ہیں۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اس عبارت کے سلسلہ میں حضرت مولانا سید مُرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) نے ایک خط لکھا جس کا بعینہٖ مضمون یہ ہے:۔

باسمہٖ تعالیٰ حامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا

بخدمت اقدس حضرت مولانا المولوی الحافظ الحاج الشاہ اشرف علی صاحب مدت فیوضکم العالیہ

بعد سلام مسنون عرض ہے کہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی یہ بیان کرتے ہیں اور "حسام الحرمین" میں آپ کی نسبت لکھتے ہیں کہ آپ نے "حفظ الایمان" میں اس کی تصریح کی کہ غیب کی باتوں کا علم جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے ایسا ہر بچے کو اور ہر پاگل کو بلکہ ہر جانور اور چارپائے کو حاصل ہے، اس لیے امور ذیل دریافت طلب ہیں:۔

(۱) کیا آپ نے "حفظ الایمان" میں یا کسی اور کتاب میں ایسی تصریح کی ہے؟

(۲) اگر تصریح نہیں تو بطریق لزوم بھی یہ مضمون آپ کی کسی عبارت سے نکل سکتا ہے؟

(۳) یا ایسا مضمون آپ کی مراد ہے؟

(۴) اگر آپ نے نہ ایسے مضمون کی تصریح فرمائی نہ اشارۃً مفادِ عبارت ہے نہ آپ کی مراد ہے تو ایسے شخص کو جو یہ اعتقاد رکھے یا صراحۃً یا اشارۃً کہے اُسے آپ مسلمان سمجھتے ہیں یا کافر؟

بینوا توجروا۔ بندہ مُرتضیٰ حسن عفی عنہ

اس کا جواب جو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے دیا وہ بلفظہٖ درج ذیل ہے:۔

الجواب! مشفق مکرم سلمہم اللہ تعالیٰ، السلام علیکم! آپ کے خط کے جواب میں عرض کرتا ہوں میں نے یہ خبیث مضمون (یعنی غیب کی باتوں کا علم الخ) کسی کتاب میں نہیں لکھا اور لکھنا تو درکنار میرے قلب میں بھی اس مضمون کا کبھی خطرہ (وہم) نہیں گذرا۔

(۲) میری کسی عبارت سے یہ مضمون لازم نہیں آتا چنانچہ اخیر میں عرض کروں گا۔

(۳) جب میں اس مضمون کو خبیث سمجھتا ہوں اور میرے دل میں بھی کبھی اس کا خطرہ نہیں گذرا جیسا کہ اوپر معروض ہوا تو میری مراد کیسے ہو سکتی ہے؟

(۴) جو شخص ایسا اعتقاد رکھے (یعنی غیب کی باتوں کا علم الخ) یا بلا اعتقاد صراحۃً یا اشارۃً یہ بات کہے میں اُس شخص کو خارج از اسلام سمجھتا ہوں کہ وہ تکذیب کرتا ہے نصوصِ قطعیہ کی اور تنقیص کرتا ہے حضور سرورِ عالم فخرِ بنی آدم صلی اللہ علیہ وسلم کی، یہ تو جواب ہوا آپ کے سوالات کا، اب آخر میں اس جواب کی تتمیم کے لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ "حفظ الایمان" کی اس عبارت کی مزید توضیح کردوں جس کی بنا پر یہ تہمت مجھ پر لگائی گئی ہے گو وہ خود بھی بالکل واضح ہے۔ اوّل میں نے دعویٰ یہ کیا ہے کہ علمِ غیب جو بلا واسطہ ہو وہ تو خاص ہے حق تعالےٰ کے ساتھ اور جو بواسطہ ہو وہ مخلوق کے لیے ہو سکتا ہے مگر اس سے مخلوق کو عالم الغیب کہنا جائز نہیں اور اس دعویٰ پر دو دلیلیں قائم کی ہیں وہ عبارت دوسری دلیل کی ہے جو اس لفظ سے شروع ہوئی ہے: "پھر یہ کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر الخ" مطلب ہے کہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا محض اس بنا پر کہ علومِ غیبیہ بواسطہ حاصل ہیں آپ کو عالم الغیب کہنا اگر صحیح ہو تو اس سے اگر کل غیر متناہیہ مراد ہوں تو وہ نقلاً و عقلاً محال

ہے اور اگر بعض علوم مراد ہوں گو وہ ایک ہی چیز کا علم ہو اور گو وہ چیز ادنیٰ ہی درجہ کی ہو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید و عمر وغیرہ کے لیے بھی حاصل ہے تو لفظ ایسا کا یہ مطلب نہیں کہ جیسا علم واقع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔۔ الخ نعوذ باللہ منہا بلکہ مراد اس لفظ ایسا سے وہی ہے جو اوپر مذکور ہے یعنی مطلق بعض علم گو وہ ایک ہی چیز کا ہو اور گو وہ چیز ادنیٰ درجہ ہی کی ہو کیونکہ اوپر بھی مذکور ہو چکا ہے کہ بعض سے مراد عام ہے اور عبارت آئندہ بھی اس کی دلیل ہے، وہو قولہ۔ کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے پس اگر زید ہر مخفی ادنیٰ چیز کے علم حاصل ہونے کو بھی علم الغیب کے اطلاق صحیح ہونے کا سبب بناتا ہے تو زید کو چاہیئے کہ ان سب کو عالم الغیب کہا کرے کیونکہ ان کو بھی بعض مخفی چیزیں معلوم ہیں خود اس عبارت میں سرسری نظر کرنے سے یہ مطلب واضح ہو رہا ہے۔ الخ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ طویل جواب بسط البنان کے نام سے ماہ شعبان ۱۳۲۹ھ کو شائع ہوا جو حفظ الایمان کے ساتھ ہی ملحق ہے اور اس جواب کے شائع ہونے کے بعد تقریباً گیارہ سال خان صاحب زندہ رہے ہیں (کیونکہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کی وفات ۱۳۴۰ھ میں ہوئی ہے) لیکن باوجود حضرت تھانوی صاحبؒ کی اس وضاحت اور تصریح کے خان صاحب اپنی کفری ضد سے باز نہ آئے حالانکہ شرعاً اور اخلاقاً ان کا فریضہ تھا کہ اپنے اس ناروا فتویٰ سے رجوع کر لیتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ ان کا تو مشن ہی یہ تھا کہ دیگر اکابر علمائے دیوبند سمیت حضرت تھانوی کو بہر قیمت کافر بنانا ہے۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اصل عبارت بھی بالکل صاف تھی مگر ان کی توضیحی اور تشریحی عبارت نے تو سونے پر سہاگہ کا کام دے دیا، البتہ یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ حضرت تھانوی نے جس انداز اور جس عبارت سے (اور اگر بعض علوم مراد ہوں گو وہ ایک ہی چیز کا علم ہو اور گو وہ چیز ادنیٰ ہی درجہ کی ہو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے ایسا علم غیب تو زید و عمر وغیرہ کے لیے بھی حاصل ہے اھ) اس مطلب کو بیان کیا ہے کیا اس کی نظیر علمائے سابقین سے بھی ملتی ہے یا یہ انداز بیان اور طرز ادا حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اپنی اختراع ہے؟ علمی اور تحقیقی طور پر اس کا مطالبہ حضرت تھانویؒ اور آپ کے متوسلین سے کیا جا سکتا ہے اور ہر صاحب فہم کو اس کا حق حاصل ہے سو اس کا ثبوت خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے

باحواز بیان فرمادیا ہے۔

فلاسفہ نے اپنے خیال کے مطابق نبی کے لیے تین خصوصیات بیان کی ہیں: ایک یہ کہ نبی کے لیے کسب و تعلیم کے بغیر اپنی باطنی صفائی کے ذریعہ ماضی، حال اور استقبال کے مغیبات پر اطلاع ضروری ہے چنانچہ ان کا دعویٰ باین الفاظ منقول ہے۔

احدھا ای احد الامور المختصۃ بہ ان یکون لہٗ اطلاع علی المغیبات الکائنۃ والماضیۃ والآتیۃ۔ اھ

یعنی نبی کے ساتھ جو امور مختص ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو فی الحال اور گذشتہ اور آنے والے مغیبات پر اطلاع ہونی چاہیے۔

(مواقف مع الشرح ص۶۶۳ طبع نولکشور لکھنؤ)

ان کے اس باطل نظریہ اور فاسد عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے ترجمان اہل سنت والجماعت رئیس المتکلمین قاضی عضد الدین عبد الرحمٰن بن احمد الایجی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۵۶ھ) اپنی مشہور (علم کلام کی) کتاب مواقف میں اور اس کے شارح امام اہل عربیت و سند علماءِ کلام امیر المحققین سید شریف علیؒ بن محمد الجرجانی الحنفیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) شرح مواقف میں یوں لکھتے ہیں:۔

قلنا ماذکرتم مردود بوجوہ اذ الاطلاع علی جمیع المغیبات لایجب للنبی اتفاقا منا ومنکم ولھذا قال سید الانبیاء وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ والبعض ای الاطلاع علی البعض لایختص بہ ای بالنبی کما اقررتم بہ حیث جوزتموہ للمرتاضین والمرضی والنائمین فلا یتمیز بہ النبی عن غیرہ۔ اھ

(مواقف مع الشرح طبع نولکشور ص۶۶۳، ص۶۶۴ وطبع مصر جلد ۳ ص۱۲۵)

ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ تم نے بیان کیا وہ کئی وجوہ سے مردود ہے کیونکہ تمام مغیبات پر مطلع ہونا نبی کے لیے واجب نہیں اس پر ہمارا اور تمہارا اتفاق ہے اور یہی وجہ ہے کہ سردار انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں خیر زیادہ حاصل کرتا اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی اور بعض مغیبات پر مطلع ہونا نبی کے ساتھ مختص نہیں ہے جیسا کہ خود تمہارا اقرار ہے جبکہ خود تم نے بعض مغیبات پر مطلع ہونا، ریاضت کرنے والوں، بیماروں اور سونے والوں کے لیے جائز قرار دیا ہے، سو اس وجہ سے نبی غیر سے ممتاز نہیں ہو سکتا۔

بعض زائغین نے اس ٹھوس اور معنی خیز عبارت سے یوں ناکام گلوخلاصی کی کوشش کی کہ یہ قاضی عضدؒ اور علامہ سید شریفؒ کا عقیدہ نہیں بلکہ وہ فلاسفہ کو الزاماً ایسا فرما رہے ہیں اور اس کا قرینہ اقررتم اور جوزتموہ کے الفاظ ہیں مگر یہ سب کچھ باطل اور مردود ہے۔

اولاً: اس لیے کہ قلنا ما ذکرتم مردود۔ الخ سے یہ دونوں بزرگ جو جواب فرما رہے ہیں اس میں فلاسفہ کی واقعتہً تردید ہے اور اپنا عقیدہ بیان کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ علامہ سید شریفؒ قرآن کریم کی آیت بھی بطور استدلال پیش کرتے ہیں حالانکہ فلاسفہ کو قرآن کریم سے کیا واسطہ؟ یہ اس امر کی کھلی دلیل ہے کہ اس عبارت میں یہ بزرگ اپنا اسلامی عقیدہ بیان فرماتے ہیں نہ یہ کہ نرا الزام مقصود ہے۔

وثانیاً۔ اگر محض الزام ہے تو اس صورت میں فلاسفہ کا مدعی ثابت ہو جائے گا اور مصنف کی ساری تردیدی تقریر بیکار ہو جائے گی جیسا کسی بھی صاحب فہم پر یہ مخفی نہیں ہے۔

وثالثاً۔ غیر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بعض مغیبات پر مطلع ہونا ایک بدیہی بات ہے اس کا انکار قاضی عضدؒ اور علامہ سید شریفؒ تو کجا کوئی بھی عقلمند نہیں کر سکتا پھر اس سے یہ تاثر دینا کہ یہ دونوں بزرگ اس کے منکر ہیں یا یہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ محض الزاماً کہا ہے قطعاً باطل ہے اور اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ الغرض یہ جو کچھ انہوں نے فرمایا اہل اسلام اور اہل سنت والجماعت کی ترجمانی کی اور اپنا عقیدہ بیان کیا ہے۔

فلاسفہ کے اسی بے بنیاد نظریہ کا مفسر قرآن علامہ ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر البیضاویؒ (المتوفی ۶۹۶ھ) نے ان الفاظ سے رد کیا ہے:۔

وقد اورد على هذا بانهم ان ارادوا بالاطلاع الاطلاع على جميع الغايبات فهو ليس بشرط فى كون الشخص نبيا بالاتفاق وان ارادوا الاطلاع على بعضها فلا يكون ذلك خاصة للنبى اذ ما من احد لا يجوز ان يطلع على بعض

اور اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر فلاسفہ کی مراد یہ ہے کہ نبی کے لیے تمام مغیبات پر اطلاع ہونی چاہیے تو یہ بالاتفاق نبی کے لیے کسی کے نزدیک بھی شرط نہیں ہے اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ بعض مغیبات پر اطلاع ہونی چاہیے تو یہ نبی کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کو بغیر کسی سابق

الغائبات من دون سابقة تعلم و تعليم وايضاً النفوس البشرية كلها متحدة بالنوع فلا يختلف حقيقتها بالصفاء والكدر فما جاز لبعض جاز ان يكون لبعض آخر فلا يكون الاطلاع خاصة للنبي۔ انتهى

تعلیم و تعلم کے بعض مغیبات پر اطلاع ہو جانی جائز نہ ہو علاوہ ازیں نفوس بشریہ نوع کے لحاظ سے سب متحد ہیں لہٰذا ان کی حقیقت صفائی اور کدورت (عدم صفائی) میں مختلف نہیں ہو سکتی سو جو بات بعض کے لیے ممکن ہے وہ سب کیلئے ممکن ہے پس اطلاع علی الغیب بھی نبی کا خاصہ نہ رہا۔

(مطالع الانظار شرح طوالع الانوار ص۴۰۸ طبع استنبول و ص۱۹ طبع مصر)

اور حضرت امام محمد بن عمر فخر الدین الرازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:۔

يجوز ان يكون غير النبي فوق النبي في علوم لا تتوقف نبوته عليها (تفسیر کبیر جلد ۵ ص۹۵م)

جائز ہے کہ غیر نبی نبی پر ان علوم میں بڑھ جائے جن پر نبی کی نبوت موقوف نہ ہو۔

یہ عبارت بھی اپنے مفہوم و مدلول کے اعتبار سے بالکل روشن ہے، آپ نے غور فرمایا کہ جیسی تعبیر حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اختیار کی ہے ویسی ہی تعبیر ان اکابر علمائے کرام علیہم الرحمۃ نے بھی اختیار کی ہے۔ اگر معاذ اللہ تعالیٰ یہ اکابر اس تعبیر کی وجہ سے کافر ہیں تو ایسا ہی ایک کافر حضرت تھانوی کو تصور کریں، اور اگر یہ سب بزرگ اس تعبیر کے اختیار کرنے کی وجہ سے کافر نہیں ہیں اور یقیناً کافر نہیں تو یہ ایک حقیقت اور منصفانہ بات ہے کہ حضرت تھانوی بھی شرعی لحاظ سے کافر نہیں ہیں، یہ الگ بات ہے کہ خان صاحب بریلوی ان کو مسلمان تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور ان کو کافر قرار دیئے بغیر ان کو چین نہ آئے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی اس تشریح و تصریح کے بعد مزید کچھ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر اس پہلو کی تکمیل کیلئے ایک اور بات بھی عرض کرنا مناسب معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ۱۷ صفر سنہ ۱۳۲۴ھ کو حیدر آباد دکن کے چند مخلص دوستوں نے ایک مولوی صاحب کی وساطت سے ایک طویل (خط) حضرت تھانوی کو لکھا جس میں (بسط البنان کی عبارتوں کا حوالہ بھی ہے اور جس میں) یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

غرض ان تصریحات و تنقیحات کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی نہ کسی خلاف مقصود

یا نعوذ باللہ تعالیٰ سوءِ ادب کا اصلاً ابہام رہا پس اس بنا پر واقعی ترمیمِ عبارت کی مطلق ضرورت نہیں لیکن لیکن اسلامی دُنیا میں چونکہ ہر فہم کے لوگ ہیں یا قصداً شُبہ ڈالنے والے موجود ہیں جو شُبہ ڈالنے میں کچھ مصالح سمجھے ہوئے ہیں خواہ وہ مصالح دینیہ ہوں جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے یا دُنیویہ ہوں، جیسا کہ واقع ہے، اس لیے کم فہموں کی رعایت سے تاکہ نہ ان کو خود شُبہ ہو نہ دُوسرا کوئی شبہ ڈال سکے اگر اس عبارت میں ایسے طور سے ترمیم کر دی جاوے جس میں مُعنوَن محفوظ رہے اور عنوان بدل جاوے تو امید ہے کہ موجبِ اجر ہوگا، گو یہ ترمیم درجۂ ضرورت میں نہ ہوگی، صرف درجۂ استحسان ہی میں ہوگی، آئندہ جو رائے ہو۔ فقط

اس خط کا جواب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں تحریر فرمایا۔

جواب۔ جزاکم اللہ تعالیٰ بہت اچھی رائے ہے چونکہ اس کے قبل کسی نے واقعی بناء نہیں ظاہر کی، اس لیے ترمیم کو دلالت علیٰ خلاف المقصود کے اقرار کے لیے مستلزم سمجھا اور اقرار بالکفر کفر ہے اس لیے ترمیم کو ضروری تو کیا جائز بھی نہیں سمجھا۔ اب سوال ہذا میں جو بنا بیان کی گئی ہے، ایک امر واقعی ہے لہٰذا قبولاً للمشورہ اس کو لفظ اگر" کے بعد سے عالم الغیب کہا جاوے" تک اس طرح بدلتا ہوں، اب "حفظ الایمان" کی اس عبارت کو جو کہ اس سوال کے بالکل شروع میں مذکور ہے اس طرح پڑھا جاوے، اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا تخصیص ہے مطلق بعض علومِ غیبیہ تو غیر انبیاء علیہم السلام کو بھی حاصل ہیں تو چاہیئے کہ سب کو عالم الغیب کہا جاوے۔ اھ (ص ۱۸)

یہ جواب ۱۰ صفر ۱۳۴۲ھ کو تغییر العنوان کے نام سے شائع ہوا اور یہ مکتوب بھی حفظ الایمان کے آخر میں ملحق ہے، خانصاحب بریلوی تو اُس وقت موجود نہ تھے انہوں نے جہاں جانا تھا وہاں تشریف چلے تھے، لیکن حیف بر حیف ہے کہ خان صاحب کے غالی متوسلین اور معتقدین اس کے بعد بھی حضرت تھانوی کو کافر کہتے اور ان کے اسلام و کفر پر مناظرہ کرتے رہے اور بعض ابھی تک اس پر بضد اور مُصر ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ کا اختلاف نہیں بلکہ حضرت تھانویؒ کی ذات ہی دیگر اکابر علمائے دیوبند کی طرح اس کفر ساز ٹولہ کو کانٹے کی طرح چبھتی ہے خواہ انہوں نے دین و مذہب کی جتنی بھی خدمت کی ہے بہر شکل معاذ اللہ تعالیٰ وہ ان کے نزدیک کافر ہیں اس لیے کہ ان کو کافر ہی کہنا اور کافر ہی بنا

ہے خواہ کچھ ہو جائے، قارئین کرام داد دیجئے اس دیانت کی اور خانصاحب کی اس دُہائی کی۔

مسلمان مسلمان اے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی تجھے اپنے دین و ایمان کا واسطہ کیا اس ناپاک ملعون گالی کے صریح گالی ہونے میں تجھے کچھ شبہ گذر سکتا ہے، معاذ اللہ تعالیٰ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت تیرے دل سے ایسی نکل گئی ہو کہ اس شدید گالی میں ان کی توہین نہ جانے اور اگر اب بھی تجھے اعتبار نہ آئے تو خود انہیں بدگویوں سے پوچھ دیکھ کہ آیا تمہیں اور تمہارے اُستادوں و پیر جیوں کو کہہ سکتے ہیں کہ اے فلاں تجھے اتنا ہی علم ہے جتنا سُور کو ہے، تیرے استاد کو ایسا ہی علم تھا جیسا کُتے کو ہے، تیرے پیر کو اسی قدر علم تھا جس قدر گدھے کو ہے۔۔۔ الخ

(حسام الحرمین ص ۱۱، ۱۲)

ملاحظہ فرمائیے کہ خانصاحب کس طرح بزور توہین کا پہلو اور معنی کشید کرتے ہیں، حالانکہ نہ قائل کی مراد یہ ہے اور نہ ان کے وہم و گمان ہی میں یہ معنی ہیں اور پھر خانصاب ہیں جو دُہائی دیتے جا رہے ہیں "مسلمان مسلمان" گویا مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے بلاوجہ کھیل رہے ہیں اور جب مولوی محمد عمر صاحب اچھروی کی باری آتی ہے تو وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اور خوفِ خدا کو دل سے نکال کر نہ تو مؤلف حفظ الایمان کی اپنی بیان کردہ مراد کو پڑھنے، دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ بسط البنان اور تغییر العنوان کی عبارات کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں بلکہ بلا سبب جوش اور طیش میں آ کر حفظ الایمان کی تھوڑی سی عبارت نقل کر کے آگے لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن مجید جو آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں یا رسول اللہ یہ تمام غیبی خبریں ہیں اور مصنف حفظ الایمان نے یہ کہا ہے کہ ایسے علوم غیبیہ تو صبی و مجنون اور کُتے بِلّے، خنزیر کو بھی حاصل ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض علوم غیبیہ جن کو قرآن شریف کہا جاتا ہے ہر فرد حیوان اور صبی اور مجنون پر بھی نازل ہیں تو میرے خیال میں مصنف مذکور کو جو قرآن شریف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا ہے اُس کی اِتباع کی کیا ضرورت ہے کسی لڑکے یا دیوانے یا کُتے وغیرہ کے نازل شدہ قرآن پر ہی ایمان لے آئے اور آؤ آؤ کرتا پھرے تاکہ غلامانِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے اور نہ مصنف مذکور اس توہینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذابِ الیم میں گرفتار ہو، ورنہ اس عقیدہ رکھنے والے کو توہینِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ایمان کا کچھ حصہ نصیب نہیں اور مصنف

مذکور پر صرف ہم نے ہی نہیں بلکہ بعض دیوبندیوں نے بھی اس عبارت پر فتویٰ کفر ثابت کیا ہے" (المہند صـ۳۰) ہمارے نزدیک متعین ہے کہ جو شخص نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم کو زید و بکر و بہائم و مجانین کے علم کے برابر سمجھے یا کہے وہ قطعاً کافر ہے" دیوبندیوں کے بعض اکابرین نے مصنف مذکور یعنی مولوی اشرف علی تھانوی پر بھی بہتیرے فتوے کفر کے جڑے لیکن حکیم صاحب اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ پر ہی ثابت قدم ہے، پنجابی مثل مشہور ہے: "گورو جنہاں دے ٹپنے چیلے جان چھڑپ" جس امت دیوبندیہ کے حکیم کا یہ حال ہے ان کے مریضوں کے کیا ہی کہنے ہیں؟ انتہی بلفظہٖ ۔ (مقیاسِ حنفیت صـ۲۱۱)

حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ نے اپنی حفظ الایمان کی عبارت کا جو معنیٰ اور مطلب بیان کیا ہے وہ مفصل پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کو پھر ملاحظہ کر لیجئے اور مولوی محمد عمر صاحب کی کوڑھ مغزی، کم فہمی اور تعصب کی داد دیجئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور حضرت تھانوی جیسے ولیٔ کامل اور خدا رسیدہ بزرگ سے عداوت رکھ کر کیا کہا؟ اور یہاں تک کہنے سے نہیں چوکے کہ تھانوی صاحب کسی لڑکے یا دیوانے یا گتے وغیرہ کے نازل شدہ قرآن پر ہی ایمان لے آئے اور اؤ آؤ کرتا پھرے..... الخ

اہل لسان جانتے ہیں کہ گتے وغیرہ کے نازل شدہ قرآن الخ کے جملہ میں کے نازل شدہ کا یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ کہ کسی لڑکے یا دیوانے یا گتے نے بھی کوئی قرآن شریف نازل کیا ہے اور مظلوم تھانویؒ کو اس پر ایمان لانا چاہیئے، اس میں پروردگارِ عالم، قرآن کریم، سیدنا حضرت جبرائیل علیہ السلام بلکہ جناب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وبارک وسلم کی جو توہین ہوتی ہے وہ کسی مسلمان سے مخفی نہیں ہو سکتی اور اگر لفظ کے کو پر کے معنیٰ میں لے کر یہ مراد لی جائے جیسا کہ بظاہر مولوی محمد عمر صاحب کی بھی مراد معلوم ہوتی ہے کہ العیاذ باللہ تعالیٰ کسی لڑکے دیوانے اور گتے پر بھی کوئی قرآن نازل ہوا ہے اور مظلوم تھانوی کا فریضہ ہے کہ وہ اس قرآن پر ایمان لائے، تو اس مراد میں بھی ربّ العزت، روح الامین، قرآنِ پاک اور امام الانبیاء والمرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی کھلی توہین ہے۔ معاذ اللہ تعالیٰ آپ نے دیکھا کہ یہ بریلوی حضرات کس طرح اکابر علمائے دیوبند کی عبارات کے اُن کی مراد اور مرضی کے سراسر خلاف اپنی طرف سے بزور معانی کشید کرتے اور مطالب لیتے ہیں اور پھر دیوبندیوں پر توہین کی مشین گن چلاتے ہیں۔

مولوی محمد عمر صاحب نے حفظ الایمان کی ادھوری عبارت نقل کرنے اور اس پر اعتراض کرنے سے پہلے اس پر یہ عنوان اور سُرخی قائم کی ہے۔ "دیوبندیوں کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسا علم تو معاذ اللہ کتے بلّے خنزیر کو بھی ہے۔" (مقیاس حنفیت ص ۲۱۰)

العیاذ باللہ تعالیٰ دیوبندیوں کے ساتھ عداوت نے بریلویوں کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ وہ ان کا نام لے کر معاذ اللہ تعالیٰ دیدہ دانستہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وبارک وسلم کی توہین کرتے ہیں اور معاذ اللہ تعالیٰ کُتے بلے اور خنزیر کے علم کے ساتھ مساوات قائم کر کے سانس لیتے ہیں اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی کمینگی ہو سکتی ہے؟

یہ یاد رہے کہ نہ تو کسی دیوبندی عالم نے حضرت تھانوی کی تکفیر کی ہے اور نہ خانصاحب اور ان کے ٹولے کے علاوہ کسی اور متدین عالم نے ایسا کیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں صحیح حکیم الامۃ تھے اور بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں فخر ہے کہ ہم ان کی حکمت ِ ربانیہ اور دینی نسخوں سے استفادہ کر کے صحتیاب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے حضرات کے دامن سے ہمیں وابستہ کیا ہے ؎

اولٰئک آبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

المہند کے حوالے سے عوام کو مولوی محمد عمر صاحب نے جو یہ مغالطہ دیا ہے کہ اس سے وہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی تکفیر کرتے ہیں، یہ نرا دھوکہ ہے جس کا دیگر تحریفات، بدعات اور زیادتیوں کی طرح ان شاء اللہ تعالیٰ مولوی صاحب ضرور خمیازہ اب بھگت رہے ہوں گے اور ان بڑی بڑی منہ مانگی رقموں کا بھی جن کو حاصل کر کے وہ شرک و بدعت پھیلاتے رہے، اب خوب مزہ چکھ رہے ہوں گے۔ المہند میں تو اپنا اور اپنے اکابر اور حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کا صحیح عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم ایسے عقیدہ والے کو جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر کسی اور کا علمی تفوق تسلیم کرتا ہو قطعاً کافر سمجھتے ہیں پھر بھلا ہمارا یہ عقیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔

المہند کو اوّل سے آخر تک پڑھ لیں اور انصاف کریں کہ کیا اس میں حضرت تھانویؒ کی تکفیر کی گئی ہے یا تکفیر سے ان کی براءت بیان کی گئی اور کیا اس کتاب میں ان کی تردید کی گئی ہے یا تصدیق اور تقریظ حاصل کی گئی ہے؛ مگر ؎

یہ مُلّا کافروں کو دعوتِ اسلام کیا دے گا   اسے کافر بنانا بس مسلمانوں کو آتا ہے

دُوسرا اعتراض ایک خواب کی تعبیر اور مرید کی خطا کی وجہ سے ان کی تکفیر

بریلوی جماعت کے بعض حضرات کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر یہ اعتراض بھی ہے اور اس کی وجہ سے انکی (معاذ اللہ تعالیٰ) تکفیر بھی کی گئی ہے کہ ان کے ایک مرید نے خواب میں یوں کلمہ پڑھا: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ اَشْرَفُ عَلِیٌّ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۔ اور پھر اس نے بیداری کی حالت میں دُرود شریف اس طرح پڑھا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَنَبِیِّنَا وَمَوْلَانَا اَشْرَفُ عَلِیٌّ ۔ اور خواب کی تعبیر بھی انہوں نے یہ بتائی کہ اس واقعہ میں تسلی تھی کہ جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو وہ بعونہٖ تعالیٰ متبع سُنّت ہے۔ اس پر اعتراض کا تجزیہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ:-

(۱) معاذ اللہ تعالیٰ مولانا تھانویؒ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔

(۲) اور صاحب واقعہ کو سرزنش اور تنبیہ نہیں کی حالانکہ وہ اس کا مستحق تھا اور اس کو توبہ و استغفار اور تجدید ایمان و نکاح کی تلقین بھی نہ کی جبکہ قائل کافر تھا اور حضرت تھانویؒ اس کے کفر پر خوش اور راضی رہے اور انکار نہ کیا لہٰذا وہ بھی کافر ہو گئے۔ (معاذ اللہ تعالےٰ) کیوں کہ رضا بالکفر کفر ہے۔

(۳) ایسے شیطانی وسوسہ کو حالت محمودہ پر کیوں حمل کیا اور اس کی تعبیر کیوں دی گئی؟ مولوی محمد عمر صاحب نے اس واقعہ پر یہ سُرخی قائم کی ہے:-

”دیوبندیوں کا کلمہ بھی مسلمانوں سے علیحدہ ہے۔“ (مقیاس حنفیت ص ۱۹۶)

الجواب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے اس واقعہ کو خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس ارادتمند کے اپنے الفاظ میں بقدر ضرورت نقل کریں اس کے بعد پھر کچھ عرض کریں، وہ صاحب لکھتے ہیں کہ:-

اور سو گیا کچھ عرصہ کے بعد خواب دیکھتا ہوں کہ کلمہ شریف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ پڑھتا ہوں لیکن محمد رسول اللہ کی جگہ حضور کا نام لیتا ہوں، اتنے میں دل کے اندر خیال پیدا ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوئی کلمہ شریف کے پڑھنے میں، اس کو صحیح پڑھنا چاہیے، اس خیال سے دوبارہ کلمہ شریف پڑھتا ہوں، دل پر یہ ہے کہ صحیح پڑھا جاوے لیکن زبان سے بے ساختہ بجائے

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام کے اشرف علی نکل جاتا ہے حالانکہ مجھ کو اس بات کا علم ہے کہ اس طرح درست نہیں لیکن بے اختیار زبان سے یہی کلمہ نکلتا ہے، دو تین بار جب یہی صورت ہوئی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں اور بھی چند شخص حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کے پاس تھے لیکن اتنے میں میری یہ حالت ہو گئی کہ میں کھڑا کھڑا بوجہ اس کے کہ رقت طاری ہو گئی زمین پر گر گیا اور نہایت زور سے چیخ ماری اور مجھ کو معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر کوئی طاقت باقی نہیں رہی، اتنے میں بندہ خواب سے بیدار ہو گیا لیکن بدن میں بدستور بے حسی تھی اور وہ اثر ناطاقتی بدستور تھا، لیکن حالت خواب اور بیداری میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کا ہی خیال تھا لیکن حالت بیداری میں کلمہ شریف کی غلطی پر جب خیال آیا تو اس بات کا ارادہ ہوا کہ اس خیال کو دل سے دور کیا جاوے اس واسطے کہ پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے، بایں خیال بندہ بیٹھ گیا اور پھر دوسری کروٹ لیٹ کر کلمہ شریف کی غلطی کے تدارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہتا ہوں اللّٰھم صلِّ علیٰ سیدنا ونبینا ومولانا اشرف علی۔ حالانکہ اب بیدار ہوں خواب نہیں لیکن بے اختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان اپنے قابو میں نہیں۔ اس روز ایسا ہی کچھ خیال رہا تو دوسرے روز بیداری میں رقت رہی، خوب رویا اور بھی بہت سے وجوہات ہیں جو حضور (یعنی حضرت تھانوی رحمہ اللہ) کے ساتھ باعث محبت ہیں، کہاں تک عرض کروں۔ انتہی بلفظہ۔ (الامداد ص ۳۵ ماہ صفر ۱۳۳۶ھ)

اس عبارت میں اس کی تصریح ہے کہ کلمہ طیبہ میں غلطی خواب میں ہوئی اور صاحب خواب اس پر خاصا پریشان ہوا اور خواب میں بھی اپنی غلطی کا احساس کرتا رہا لیکن بیساختہ زبان سے غلط کلمہ نکلتا رہا اور جب بیداری میں درود شریف غلط پڑھتا رہا ہے تو اس میں بھی صراحت سے وہ کہتا ہے کہ بے اختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان قابو میں نہیں، اور پھر اس پر بھی وہ خوب رویا ہے۔ اس مقام پر چند باتیں قابل غور ہیں جن کو ٹھنڈے دل سے ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

پہلی بات! خواب کی ایک صورت ہوتی ہے اور اس میں پنہاں ایک حقیقت ہوتی ہے جس کو تعبیر کہتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر خواب بڑا خوشنما اور مژدہ افزا معلوم ہوتا ہے لیکن اس

کی حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے' اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بادی النظر میں خواب نہایت تاریک، اندوہناک اور وحشت انگیز دکھائی دیتا ہے مگر اس کا باطنی پہلو اور تعبیر بہت ہی خوش کن اور خوش آئند ہوتی ہے اور تعبیر سامنے آجانے کے بعد خواب دیکھنے والے کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، اس دوسری مد کے خوابوں کے بارے میں اختصاراً چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:-

(الف) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم کی چچی حضرت ام الفضل بنت الحارث رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک خواب دیکھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! آج رات میں نے ایک بُرا خواب دیکھا ہے (حلما منکرا) آپ نے فرمایا کہ وہ کیا خواب ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ بہت ہی سخت ہے (انہ شدید) آپ نے فرمایا کہ بتائیں تو سہی وہ کیا ہے؟ حضرت ام الفضلؓ نے عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے گویا آپ کے جسم مبارک سے ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ تم نے بہت اچھا خواب دیکھا ہے (اس کی تعبیر یہ ہے) کہ انشاء اللہ تعالیٰ میری لختِ جگر بیٹی (سیدہ حضرت) فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا جو تمہاری گود میں کھیلے گا۔ چنانچہ (سیدنا حضرت) حسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پیدا ہوئے اور میری گود میں کھیلے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا (مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۵۷۲ اصح المطابع)

ملاحظہ کیجئے کہ بظاہر کس قدر بُرا خواب تھا کہ خود حضرت ام الفضل رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس سے گھبرا رہی تھیں اور بتلانے پر بھی آمادہ نہ تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کے مکرر استفسار پر انہوں نے آخر بیان ہی کر دیا، اور پھر جب آپ نے اس کی تعبیر بیان فرمائی تو وہ کس قدر خوش کن اور خالص خوشخبری تھی۔

(ب) اگر کوئی شخص خواب میں یہ دیکھے کہ اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں تو وہ یقیناً اس سے گھبرائے گا اور ضرور پریشان ہوگا، لیکن سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ:-

احب القید واکرہ الغل والقید ثبات فی الدین۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۰۳۹ و مسلم جلد ۲ ص ۲۴۱ واللفظ لہ و مستدرک جلد ۴ ص ۳۹۰)	میں بیڑیوں کو پسند کرتا ہوں اور گردن کے طوق کو مکروہ سمجھتا ہوں بیڑیاں دین کے معاملے میں ثابت قدمی کی دلیل ہے۔

اس میں بھی خواب کی صورت اور ظاہری پہلو دیکھئے کیا ہے؟ اور اس کے اندر جو حقیقت اور اس کی تعبیر ہے وہ کیا ہے؟

(ج) حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مزار اقدس پر پہنچے اور وہاں پہنچکر مرقد مبارک کو اکھاڑا (العیاذ باللہ تعالیٰ) پس اس پریشان کن اور وحشت انگیز خواب کی اطلاع انہوں نے اپنے اُستاد کو دی اور اس زمانہ میں حضرت امام صاحب علیہ الرحمۃ مکتب میں تعلیم پاتے تھے، ان کے اُستاد نے فرمایا اگر واقعی یہ خواب تمہارا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ تم جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی احادیث کی پیروی کرو گے اور شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کی پوری کھود کرید کرو گے۔ پس جس طرح ان کے اُستاد نے بیان کیا تھا یہ تعبیر حرف بحرف اسی طرح پوری ہوئی۔ (تعبیر الرؤیا کشوری ص۳۷)

اور مختلف الفاظ کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ بغداد للخطیبؒ جلد ۱۳ ص۳۳۵ طبع مصر، اور الخیرات الحسان ص۶۴ طبع مصر و کتاب الانساب سمعانیؒ ورق ص۱۹۶ طبع مصر و مناقب کردریؒ جلد ۱ ص۲۳ طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن اور مفتاح السعادۃ جلد ۲ ص۱۰ طبع حیدر آباد دکن میں بھی موجود ہے۔ غور فرمائیں کہ اس خواب کی صورت کیا ہے؟ اور اس کی تہہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی احادیث کی پیروی اور فقہی رنگ میں علم دین کی خدمت جو زرین خدمت کی خوشخبری اور بشارت موجود ہے، وہ کیا ہے؟

(د) تاریخ کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید علیہ الرحمۃ کی بیوی زبیدہ علیہا الرحمۃ نے خواب میں دیکھا کہ کثیر التعداد مخلوق جمع ہو کر سب باری باری اس سے مجامعت کرتی ہے، جب آنکھ کھلی تو وہ بے حد پریشان ہوئی، گھبراہٹ کی کوئی انتہا نہ تھی، آخر کار جب اس خواب کی تعبیر بتلائی گئی تو معلوم ہوا کہ ان سے کوئی ایسا کام ہو گا جس سے بیشمار مخلوق فیضیاب ہو گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا اُس نے نہر زبیدہ کھدوائی جو عرب کے ایک بہت بڑے حصہ کو سیراب کرتی ہے اور ایام حج میں مشرق و مغرب کے مسلمان اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ جو اسی خواب کی تعبیر ہے۔

(محصلہ رشاد الاخیار ص۵ طبع جید برقی پریس دہلی)

(ھ) امام الحسینؒ بن ابو جرالباوردیؒ فرماتے ہیں کہ میں شہر الحان میں تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ میں

نے خواب میں دیکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم کی وفات ہو گئی ہے تو میں نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر تیرا خواب سچا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ کوئی ایسا امام فوت ہو گا کہ اس زمانہ میں اس کی نظیر نہ ہو گی، اور ایسے ہی خواب حضرت امام شافعی حضرت امام ثوری اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کی وفات کے وقت دیکھے گئے تھے، چنانچہ شام سے پہلے ہی یہ خبر آگئی کہ شیخ الاسلام الحافظ ابو موسیٰ المدینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۵۸۱ھ) وفات پا چکے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص۱۲۵، ۱۲۶ للذہبیؒ)

یہ چند خواب ہم نے باحوالہ اس لیے نقل کیے ہیں تاکہ یہ بات بالکل آشکارا ہو جائے کہ بسا اوقات خواب کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے اور باطن کچھ اور ہوتا ہے اور اس کو وہی حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم و بصیرت کے ساتھ ساتھ فن تعبیر کی باریکیوں اور مضمر نکات حل کرنے کی توفیق سے نوازا ہوتا ہے ہر کہ ومہ کی یہاں بات نہیں چلتی ؎

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

دوسری بات خواب نیند کی حالت میں دیکھا جاتا ہے اور نیند کی حالت میں جو کلمات زبان سے سرزد ہوتے ہیں شریعت میں ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

بالفرض اگر کسی سے بحالتِ نیند کلماتِ کفریہ سرزد ہوں تو اس پر کفر و ارتداد کا کوئی فتویٰ نہیں لگ سکتا کیونکہ وہ شرعاً مرفوع القلم ہے اور نیند کی حالت میں ایسے کلمات صادر ہونے کی وجہ سے وہ مجرم نہیں ہو گا۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ:-

رفع القلم عن ثلاثة عن النائم حتی یستیقظ وعن المبتلی حتی یبرأ وعن الصبی حتی یکبر (حم د ن ہ ك) صحیح (الجامع الصغیر ج ۲ ص۲۴)

تین شخص مرفوع القلم ہیں (یعنی شرعی قانون کی زد سے محفوظ ہیں) سونے والا جب تک کہ بیدار نہ ہو، اور جنون میں مبتلا یہاں تک کہ اس کو افاقہ ہو، اور بچہ جب تک بڑا (یعنی بالغ) نہ ہو جائے۔

اور سیدنا حضرت عمر اور سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے:-

رفع القلم عن ثلاثة عن المجنون

تین شخص مرفوع القلم ہیں، مجنون جس کی عقل پر جنون

المغلوب علی عقلہ حتی یبرأ وعن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم رحم دلک۔ (الجامع الصغیر جلد ۲ ص۲۴)	کا پردہ پڑا ہو حتی کہ وہ تندرست نہ ہو جائے، اور سونے والا جب تک بیدار نہ ہو جائے، اور بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے۔

اور ایک روایت میں آتا ہے سیدنا حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم نے فرمایا:۔

انہ لیس فی النوم تفریط، انما التفریط فی الیقظۃ۔ (ترمذی ج ۱ ص۲۵ وقال حسن صحیح)	یعنی نیند کی حالت میں کوئی کوتاہی اور جرم نہیں ہاں بیداری کی حالت میں کوتاہی ہو تو اس میں جرم ہے۔

اس قسم کی روایات کے پیشِ نظر حضرات فقہاءِ احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم نے یہ قاعدہ اور ضابطہ اخذ کیا ہے کہ نیند کی حالت میں کوئی بات بھی کسی درجہ میں قابلِ اعتبار نہیں ہے نہ تو خواب میں اسلام لانا اور (معاذ اللہ تعالیٰ) کفر و ارتداد معتبر ہے اور نہ نکاح و طلاق بلکہ حضرات فقہائے کرامؒ تصریح فرماتے ہیں کہ نیند کی حالت کی بات پرندوں کی آواز سے کچھ زیادہ وُقعت نہیں رکھتی (چنانچہ علامہ محمد امین بن عمر الشامی الحنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:۔

ولذا لا یتصف بصدق ولا کذب ولا خبر ولا انشاء وفی التحریر وتبطل عبارتہ من الاسلام والردۃ والطلاق ولم توصف بخبر ولا انشاء وصدق وکذب کالحان الطیور۔ اھ (شامی جلد ۲ ص۵۸۵ طبع مصر فی مطلب طلاق المدہوش)	اور اسی لیے سونے والے کا کلام صدق وکذب اور خبر و انشاء سے متصف نہیں ہوتا اور تحریر الاصول میں ہے کہ سونے والے کا کلام (مثلاً اسلام لانا یا مرتد ہو جانا یا بیوی کو طلاق دینا وغیرہ) یہ سب لغو اور بیکار ہے نہ اس کو خبر کہا جا سکتا ہے اور نہ انشاء اور نہ سچ اور نہ جھوٹ جیسے پرندوں کی۔

اور آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ومثلہ فی التلویح فہذا صریح فی ان کلام النائم لا یسمی کلاما لغۃ ولا شرعا بمنزلۃ المہمل۔ اھ (ایضاً)	اور ایسا ہی تلویح میں ہے پس اس عبارت سے صراحۃً معلوم ہوا کہ نیند کی حالت کا کلام نہ لغۃً کلام ہے اور نہ شرعاً جیسے مہمل۔

حدیث اور فقہ کے ان صریح حوالوں سے معلوم ہوا کہ نیند اور غیاب کی حالت کی بات پر کوئی فتویٰ صادر نہیں ہو سکتا۔ جب مسئلہ کی حقیقت یہ ہے تو حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ اس شخص پر کیسے فتویٰ لگاتے اور کس طرح اس کو کافر اور مرتد قرار دیتے؟

تیسری بات

بیداری کی حالت میں غیر اختیاری طور پر زبان سے جو بات سرزد ہو جاتی ہے گو وہ بات کفر ہی کیوں نہ ہو، شریعت اس پر بھی کفر و ارتداد وغیرہ کا کوئی حکم اور فتوے نہیں لگاتی، قرآنِ کریم میں مومنوں کی زبان سے یہ دعا اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائی ہے: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا۔۔۔ (الآیۃ) یعنی اے ہمارے رب اگر ہم سے کوئی بھول یا خطا سرزد ہو تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا۔

اور حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص۳۴۳ طبع مصر بحوالہ مسلم)

اور سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ:۔

ان اللہ تجاوز عن امتی الخطاء والنسیان	بیشک اللہ تعالیٰ نے میری اُمت سے خطا اور نسیان اور جس چیز پر انکو
وما استکرھوا علیہ	مجبور کیا گیا ہو کے مواخذہ سے درگذر فرمایا ہے۔

(مشکوٰۃ ج ۲ ص۵۸۴، رواہ ابن ماجہ ص۱۴۸ والبیہقی ج ۷ ص۳۵۶ والطحاوی ج ۲ ص۵۶ والحاکم جلد ۲ ص۱۹۸، عن ابن عباس وصححہ والسیوطی فی الجامع الصغیر ج ۲ ص۲۴ عن ثوبان رض وقال صحیح)

اس سے معلوم ہوا کہ خطا کی صورت میں اگر کفر وغیرہ کا کوئی کلمہ زبان سے نکل جائے تو اس پر شرعاً کوئی گرفت نہیں ہے۔ سیدنا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں آتا ہے، آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندہ کی توبہ پر اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جیسے کوئی مسافر کسی بے آب وگیاہ لق و دق میدان میں جا رہا ہو اور وہاں اس کی سواری کا اونٹ جس پر اس کے کھانے پینے کا سامان بھی لدا ہوا ہو اس سے گم ہو جائے اور وہ اِدھر اُدھر تلاش کر کے اس سے ناامید ہو کر مرنے کے لیے کسی درخت کے سایہ میں آلیٹے، پھر اسی حال میں اس کی آنکھ بھی لگ جائے پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھ کھلے تو وہ یہ دیکھے کہ اس کا اونٹ

مع اپنے ساز و سامان کے اس کے پاس کھڑا ہوا ہے اور اس کی زبان سے بے انتہاء خوشی میں یہ لفظ نکل جائیں۔

اللّٰھم انت عبدی وانا ربك
اے پروردگار تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ اخطاء من شدۃ الفرح کہ زیادہ خوشی کی وجہ سے اس کی زبان سے خطا سرزد ہوئی۔ (مسلم جلد ۲ ص ۳۵۵ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۲۰۳)

یعنی وہ بیچارہ کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ اے میرے رب تو میرا آقا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں، مگر کہہ اُلٹ گیا، حالانکہ یہ شخص نہ تو دیوانہ ہے اور نہ اس پر غشی طاری ہے اور نہ نشہ میں مست ہے اور نہ سویا ہوا ہے، بیداری کی حالت میں ہے مگر بے ساختہ اور بے اختیار اس کی زبان سے وہ کچھ نکل رہا ہے جس کو وہ چاہتا نہیں، ارادہ کسی اور بات کے نکالنے کا ہے مگر نکلتی کچھ اور ہے۔ حضرات فقہاء احنافؒ نے خطا کی تعریف و تشریح اور حکم کے بارے میں خاصی تفصیل کی ہے۔ چنانچہ امام حسن بن منصور المعروف بقاضی خان الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

والخاطی من یجری علی لسانه من غیر قصد کلمة مکان کلمة۔

اور خطا کرنے والا وہ ہے جس کی زبان پر بغیر قصد کے ایک کلمہ کی جگہ کوئی دوسرا کلمہ نکل جائے۔

(فتاویٰ قاضی خان جلد ۴ ص ۸۸۳ طبع نولکشور لکھنؤ)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

الخاطی اذا جری علی لسانه کلمة الکفر خطاء بان کان اراد ان یتکلم بما لیس بکفر فجری علی لسانه کلمة الکفر خطاء لم یکن ذلك کفرا عند الکل بخلاف الهازل لان الهازل یقول قصدا الا انه لا یرید حکمه۔ (ج ۴ ص ۸۸۳)

اور بہر حال خاطی کی زبان پر جب خطاءً کفر کا کلمہ جاری ہو گیا مثلاً وہ ایسا کلمہ بولنا چاہتا تھا جو کفر نہیں لیکن خطاءً اس کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا تو تمام (فقہاء کرامؒ) کے نزدیک یہ کفر نہ ہوگا۔ بخلاف دل لگی کرنے والے کے کیونکہ دل لگی کرنے والا کہتا تو اپنے قصد و اختیار سے ہے مگر اس کے حکم کا ارادہ نہیں کرتا۔

اس عبارت میں خطا کی فقہی تعریف اور پھر اس پر جو فقہی حکم مرتب ہوتا ہے دونوں باتیں بصراحت

آگئی ہیں مشہور محقق العلامہ الشیخ عبدالعزیز بن احمدؒ بن محمد علاؤالدین البخاری الحنفی (المتوفی ۷۳۰ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

فدل ان بالتکلم بکلمۃ الکفر فی حالۃ السکر لایحکم بالردۃ کما لایحکم بھا فی حالۃ الخطاء والجنون فلا تبین منہ امرأتہ۔ (کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدویؒ جلد ۴ صـ ۳۵۵ طبع مصر)

سو اس سے ثابت ہوا کہ نشہ کی حالت میں کلمہ کفر نکل جانے کی وجہ سے مُرتد ہونے کا حکم نہیں دیا جائے گا جس طرح کہ خطاء اور جنون کی حالت میں ایسا کلمہ نکل جانے کی وجہ سے ارتداد کا حکم نہیں لگایا جاتا سو اس کی وجہ سے اس کی بیوی اس پر بائن نہ ہوگی۔

علامہ شامی رقمطراز ہیں کہ:۔

ومن تکلم بھا مخطئاً اومکرھا لا یکفر عند الکل۔ (شامی)

جس شخص سے خطاءً کلمہ کفر سرزد ہو گیا یا کسی نے زبردستی اس سے کلمہ کفر کہلوایا تو سب کے نزدیک اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اور ملا علی ن القاری لکھتے ہیں کہ:۔

بان الخاطئ اذا اجری علی لسانہ کلمۃ الکفر خطأً لم یکن ذٰلک کفراً عند الکل۔

کہ خطأً اگر کسی کی زبان سے کلمہ کفر نکلا تو سب کے نزدیک یہ کفر نہ ہوگا۔

(شرح فقہ اکبر صـ ۱۹۸ کانپور)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر اور ارتداد کے لیے قصد اور ارادہ لازمی ہے اور خطاء و اکراہ میں قصد و ارادہ نہیں ہوتا اور جب کفر و ارتداد ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے قصد و ارادہ درکار ہے تو طلاق و عتاق وغیرہ کی طرح اس میں محض زبانی تلفظ ہی کفایت نہیں کرتا بخلاف ہزل اور مسخرہ پن اور استخفاف کے کہ ان میں کلمہ کفر جو زبان سے نکلتا ہے اس میں متکلم کا قصد اور ارادہ شامل ہوتا ہے ہاں اگر وہ اس پر فتویٰ کفر لگنے کے فقہی اور شرعی حکم سے ناراض ہو تو اس کی عدم رضا سے حکم کفر نہیں ٹلتا۔ فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔

واما الهازل والمستهزئ اذا تكلم بالكفر استخفافاً ومزاحاً واستهزاء يكون كفراً عند الكل وان كان اعتقاده خلاف ذلك۔ (جلد ۴ ص ۸۸۳ طبع نولکشور)	بہرحال دل لگی اور استہزاء کرنے والا جب کلمۂ کفر زبان سے نکالے محض اس کو ہلکا سمجھتے ہوئے اور مزاح واستہزاء کے طور پر اگرچہ اس کا اعتقاد اس کے خلاف ہو پھر بھی وہ تمام فقہائے کرامؒ کے نزدیک کافر ہو جائے گا۔

حافظ محمد بن عبدالواحد ابن الہمام الحنفیؒ (المتوفی سنہ ۸۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

الردة تنبئ عن تبدل الاعتقاد (فتح القدیر ج ۴ ص ۴۰۴ طبع مصر)	ردت کا لفظ ہی اعتقاد کی تبدیلی کو بتلا رہا ہے۔

اور اسی فتح القدیر جلد ۴ ص ۴۱ میں لکھتے ہیں کہ:۔

ركنها الاعتقاد۔	ارتداد کا رکن ارتداد ہے۔

اور امام اکمل الدین محمدؒ بن محمودؒ البابرتی الحنفیؒ (المتوفی سنہ ۷۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

ان الركن في الردة الاعتقاد۔ (العنایہ جلد ۴ ص ۴۰۳ بر ہامش فتح القدیم)

ارتداد کا رکن اعتقاد ہے یعنی ردت میں اعتقاد کی تبدیلی کا دخل ہے اور بغیر اس کے ارتداد کا تحقق فقہی طور پر نہیں ہو سکتا۔

غرضیکہ خطا کی صورت میں انسان ایک حد تک مجبور ہوتا ہے اور اس حالت میں اس پر فتویٰ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ اور خود مولوی احمد رضا خان بریلوی کو بھی اس قاعدے کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں رہا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"شریعت میں احکام اضطرار احکام اختیار سے جدا ہیں"۔

(ملفوظات حصہ اوّل ص ۶ طبع آفسٹ پریس کراچی)

اب اس ساری بحث کو ملحوظ رکھ کر انصاف سے دیکھنا چاہیئے کہ جو شخص خود چلا چلا کر کہتا ہے کہ بے اختیار ہوں، مجبور ہوں، زبان قابو میں نہیں، اور اس پر بعد میں روتا بھی ہے ایسے شخص کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کیوں کافر کہتے؟ اور جب وہ خود کافر نہیں تو رضا بالکفر کس طرح ثابت ہوئی؟ اور حضرت تھانویؒ کیوں کافر قرار پائے؟ جبکہ خانصاحب بریلوی کا فتویٰ بھی احکام اضطرار میں وہی ہے جو حضرات فقہائے کرامؒ کا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا میرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کو خواب کی اس تعبیر پر اصرار بھی نہیں ہے انہوں نے اپنی دانست کے مطابق اس خواب کی اچھی تعبیر بیان فرما دی لیکن ساتھ ہی اپنے عدم اصرار کا تذکرہ بھی فرما دیا، چنانچہ وہ خود تصریح فرماتے ہیں کہ:۔

باقی مجھ کو اس پر اصرار نہیں، اگر یہ خواب (وسوسہ) شیطانی ہو یا کسی مرض دماغی سے ناشی (پیدا) ہوا ہو اور اس کی تعبیر نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے لیکن غلط تعبیر دینا (صرف) ایک وجدان کی غلطی ہوگی جس پر کوئی الزام نہیں ہو سکتا۔" بلفظہٖ۔ (الامداد، بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ ص ۲۰)

جس طرح حدیث کی تصحیح و تضعیف میں اجتہادی غلطی واقع ہو سکتی ہے اور جس طرح کسی فقہی حکم میں مجتہد سے غلطی کا واقع ہونا ناممکن نہیں ہوتا، اسی طرح خواب کی تعبیر میں بھی غلطی ہو سکتی ہے اور جس طرح پہلی صورتوں میں مخطی معذور ہے بلکہ بمضمون حدیث ماجور ہوتا ہے، اسی طرح تیسری صورت میں بھی اس پر کوئی ملامت نہیں ہو سکتی۔

چوتھی بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کلام میں نبوت اور رسالت کے بے بنیاد دعوے کی بو تک موجود نہیں ہے بلکہ وہ صاحبِ خواب کو یہ تحریر فرما کر تسلی دیتے ہیں کہ اس واقعہ میں تسلی تھی کہ جس کی طرف تم رجوع کرتے ہو وہ بعونہٖ تعالیٰ متبعِ سنت ہے۔ لفظ متبع سنت لکھ کر یہ بتلا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وبارک وسلم سے صرف غلامی کی نسبت ہے اور آپ کی سنت پر چلنا اپنے لیے باعثِ نجات سمجھتا ہوں، یہاں (معاذ اللہ تعالیٰ) نبوت اور رسالت کے دعویٰ کا کیا سوال؟ اگر بریلوی حضرات کے استدلال کا یہی نہج ہے تو ہم ان کے مشکور ہوں گے کہ وہ ذیل کے واقعات میں بھی ایسا ہی تکفیری فتویٰ نافذ کرکے اس کی اسی طرح تبلیغ و اشاعت کریں جس طرح کہ وہ حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر علمائے دیوبند کے خلاف کرتے ہیں، اور اگر نہیں کرتے تو بیّن طور پر وجہ فرق بیان کریں۔

① سلطان العارفین سراج السالکین حضرت خواجہ نظام الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ) نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں ایک شخص مرید

ہونے کے واسطے حاضر ہوا۔ شیخ شبلی علیہ الرحمۃ نے ارشاد فرمایا کہ میں تجھ کو ایک شرط پر مرید کرتا ہوں کہ جو کچھ میں ارشاد فرماؤں تو اس کو بجا لاوے، اس نے قبول کیا۔ شیخ شبلی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اچھا کلمہ کس طرح پڑھتے ہو؟ اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھا، آپ نے فرمایا کہ اس طرح پڑھو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شِبْلِیْ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ چونکہ یہ شخص عقیدہ میں راسخ تھا فوراً پڑھنے لگا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شِبْلِیْ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فوراً رو پڑے اور ارشاد فرمایا کہ میں کون ہوں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و بارک وسلم کے غلام سے خود کو منسوب کرنا بے ادبی سمجھتا ہوں چہ جائیکہ ان کی برابری کا دعویٰ کروں یہ امر صرف تیری حسن عقیدت کے دریافت کے واسطے تھا۔ (فوائد الفوائد اردو ترجمہ ص۲۵۱)

اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت شبلی علیہ الرحمۃ اور ان کے عقیدتمند مرید اور حضرت خواجہ نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جنہوں نے بلا انکار و تردید یہ واقعہ نقل فرمایا اور ان کے ملفوظات کے جمع کرنے والے حضرت امیر حسن علاء سنجری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جنہوں نے بلا نکیر یہ واقعہ ملفوظات میں درج کیا، کیا یہ سب کے سب حضرات کافر ہیں؟ (العیاذ باللہ تعالیٰ) اگر یہ کافر ہیں تو بریلوی حضرات نے ان کے کفر کی اشاعت کب کی، کس کتاب میں کی؟ اور اگر نہیں کی تو کیوں نہیں کی؟ اور ان کے خلاف یہ تکفیری محاذ کیوں قائم نہیں کیا؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اور اگر یہ بھی حضرات مسلمان ہیں تو وہ کس تاویل اور کس توجیہہ سے مسلمان ہیں؟ کیا یہ کلمہ کفر نہیں ہے؟ آخر خدارا کچھ تو فرمائیں ؎

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر
بندہ پرور منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر

(۲) حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (المتوفی ۶۲۵ھ) کی سوانح عمری مقلب بہ انوار خواجہ میں مذکور ہے کہ ایک شخص حضرت خواجہ صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت میں مرید ہونے کے واسطے حاضر ہوا، آپ نے اس کے سامنے وہی شرط پیش کی جو حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مرید کے سامنے پیش کی تھی، اس شخص نے وہ شرط قبول کی تو آپ نے فرمایا کہ پڑھو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ معین الدین رسول اللہ، اس نے پہلے انکار کیا لیکن جب دیکھا کہ اس شرط کے بغیر بیعت محال ہے تو جبراً و قہراً اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

معین الدین رسول اللہ پڑھا۔ اس کے بعد حضرت خواجہ معین الدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ محض تمہاری عقیدتمندی کا امتحان تھا، عقیدہ وہی رکھنا جو تمہارا تھا، میں تو صرف آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وبارک وسلم کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ (ارشاد الخیار ص۵۴)

بریلوی حضرات سے دریافت طلب یہ بات ہے کہ کیا ان کے نزدیک حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کافر ہیں؟ (العیاذ باللہ تعالیٰ) اگر نہیں تو کس بنا پر الفاظ تو بظاہر کفریہ ہیں، پھر ان الفاظ کفریہ کے سرزد ہونے کے بعد ان کے نہ کافر ہونے کی کیا وجہ ہے؟

اور عجیب تر بات یہ ہے کہ ان حضرات نے عین بیداری میں محض امتحان لینے کی خاطر یہ ساری کاروائی اپنے قصد و اختیار سے کی ہے اور بایں ہمہ وہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ اپنے اور اپنے سے بعد آنے والے دور میں وہ جلیل القدر اولیائے کرامؒ میں سمجھے جاتے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بریلوی حضرات کو صحیح سمجھ عطا فرمائے کہ وہ ہر چیز کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھ سکیں اور ان کو تعصب و عناد اور ہٹ دھرمی سے بچائے تاکہ وہ محض دنیائے دنی کے دھندوں میں اُلجھ کر اپنی آخرت ہی برباد نہ کر بیٹھیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ تمام مسلمانوں کو توحید و سُنّت کا گرویدہ اور اہلِ توحید اور اہلِ سُنّت کا صحیح معنے میں مُحب و شیدائی بنائے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ حق اور حق کے ساتھ عداوت، دشمنی اور عناد سے محفوظ رکھے اور ہمیشہ حق والوں کا ساتھی بنائے اور ان کی معیت نصیب فرمائے، آمین ثم آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ وخاتم
انبیائہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ
وجمیع متبعیہ الیٰ یوم الحساب۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

اور

قادیانی اتہامات کا تحقیقی جائزہ

حضرت مولانا علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب (پی ایچ ڈی) لندن

* * *

الحمد للہ و سلام علیٰ عبادہٖ الذین اصطفیٰ ء اللہ خیر اما یشرکون

اما بعد —— قادیانیوں نے حکیم الامت حضرۃ مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کی کتاب "المصالح العقلیہ" میں بعض عبارات کو مرزا غلام احمد قادیانی کی عبارات سے لفظاً لفظاً ملتے پایا تو انہوں نے دعویٰ کیا کہ حضرۃ تھانویؒ نے یہ عبارات مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے لی ہیں، اور یقیناً انہی سے لی ہیں۔

ان کے دوست محمد شاہد نے ۵ مئی اور ۶ مئی ۱۹۸۳ء کے الفضل ربوہ میں پہلی بار یہ انکشاف اور پھر پھر ان کے ہفت روزہ لاہور نے اس مضمون کو بڑے اہتمام سے شائع کیا اور دعویٰ کیا کہ مولانا تھانویؒ نے یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے لئے ہیں اور یہ بھی الزام لگایا کہ مولانا تھانویؒ نے کہیں نہیں لکھا کہ یہ مضامین انہوں نے کسی اور مصنف سے لئے ہیں۔

دوست محمد صاحب کے اس الزام نے علم میں ایک عجیب پریشانی پیدا کر دی کہ مولانا تھانویؒ جیسے جلیل القدر عالم نے مرزا غلام احمد کی عبارت کو اپنا کیوں ظاہر کیا ہے مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ مولانا تھانویؒ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں صاف لکھ دیا ہے کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں بعض مضامین کسی اور کتاب سے لئے ہیں اس میں بہت سی باتیں غلط بھی تھیں اگرچہ اس میں کچھ صحیح مضامین بھی تھے اسلئے مولانا تھانویؒ نے اس کتاب کا نام ذکر نہ کیا تاکہ اس میں لوگوں کی غلط رہنمائی کا گناہ ان پر نہ آئے۔

المصالح العقلیہ کے اس مقدمہ میں حضرت تھانویؒ کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیے :۔

"احقر نے غایت بے تعصبی سے اس میں بہت سے مضامین کتاب مذکورہ بالا سے بھی

جو کہ موصوف بصحت سمجھے گئے اور ایسے احکام مشہورہ کی کچھ کچھ وہی مصلحتیں مذکور ہونگی جو اصول شرعیہ سے بعید نہ ہوں اور افہام عامہ کے قریب ہوں مگر یہ مصلحتیں نہ سب مخصوص ہیں نہ سب مدار احکام اور نہ ان میں انحصار ہے[1] "

ہم نے حضرت تھانویؒ کی یہ تصریح دیکھی تو قادیانی خیانت کا پردہ چاک ہو گیا ۔ وہ حیرت جاتی رہی جو دوست محمد شاہد قادیانی کے مذکورہ سابقہ مضمون سے پیدا ہوئی تھی مگر اس پر حیرت ضرور ہوئی کہ دوست محمد قادیانی کو اتنا صریح جھوٹ بولنے اور مغالطہ دینے کی جرأت کیسے ہوئی کہ مولانا تھانویؒ نے کسی قسم کا حوالہ دیئے بغیر دوسروں کی عبارات کو اپنا ظاہر کیا ہے ۔ اگر وہ یوں کہتے کہ مولانا تھانویؒ نے اس کتاب کے مصنف کا نام نہیں لیا جہاں سے بعض عبارات انہوں نے لی ہیں تو بیشک انہیں اس سوال کا حق پہنچتا تھا لیکن اس حوالے کا سرے سے ذکر نہ کرنا اور لوگوں کو یہ "تأثر" دینا کہ مولانا تھانویؒ نے یہ عبارات بغیر کسی قسم کا حوالہ دیئے اپنے نام سے پیش کر دی ہیں ۔ قادیانیوں کی کھلی خیانت اور ان کے صریح جھوٹ کی ایک اور مثال ہے ۔

ہم نے ماہنامہ "الرشید" ساہیوال کی اگست ۱۹۸۳ء کی ایک اشاعت میں دوست محمد شاہد سے مطالبہ کیا کہ وہ اس غلط بیانی کی برسرِعام معافی مانگیں مگر افسوس کہ انہیں اس کی توفیق نہ ہوئی، البتہ ان کے ایک ایڈوکیٹ نے محمد شبیر ہرل نے ہفت روزہ لاہور کی ۲۷ اگست کی اشاعت میں دوست محمد صاحب کی اس خیانت کو حق بجانب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ۔ ہم نے ہفت روزہ خدام الدین لاہور کی ۱۶ ستمبر کی اشاعت میں عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے عنوان سے اس کا پورا تعاقب کیا ۔ قادیانیوں کے دو پہلوان دوست محمد اور محمد شبیر ہرل چت گرے تو ان کی طرف سے بورے والا کے عبدالرحیم بھنڈ "ہفت روزہ" لاہور کی ۲۹ اکتوبر کی اشاعت میں سامنے آئے اور ایک ایسا مضمون لکھا جو تضاد بیانی، حیرت سامانی اور بوکھلاہٹ میں اپنی مثال آپ ہے اور اس لائق نہیں کہ اس کی تردید کی کوئی ضرورت محسوس ہو ۔

یہ قادیانی مضمون نگار اگر یہ کہتے کہ مولانا تھانویؒ نے اپنے اس مقدمہ کتاب میں صرف ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے ۔ حالانکہ ان کی کتاب المصالح العقلیہ میں مرزا صاحب کی ایک کتاب سے نہیں ان کی پانچ کتابوں کے اقتباسات ہیں تو پھر بھی کوئی بات تھی اور ہمارے ذمہ ہوتا کہ ہم حضرت تھانویؒ کی طرف سے جواب گذارش کریں ۔

مگر افسوس کہ دوست محمد قادیانی نے اپنے اس انکشاف کی خشتِ اوّل ہی کچھ ایسی ٹیڑھی رکھی کہ اس پر جو دیوار بنی گئی ٹیڑھی بنتی گئی ۔ یہاں تک کہ عبد اللہ امین زئی نے اس پر ایک رسالہ "کمالاتِ اشرفیہ" لکھ

---

[1] المصالح العقلیہ صہ ۱۴/۱۵ ۔

مارا، اس طنز آمیز نام سے کتاب کی خوب اشاعت کی۔ ایمن زئی صاحب نے بھی کہیں ذکر نہ کیا کہ مولانا تھانویؒ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھ دیا ہے کہ انہوں نے ایک کتاب کے بعض مضامین اپنی اس کتاب میں لئے ہیں۔ اگر وہ یہ بات لکھ دیتے تو ان کی یہ نشان دہی "مذہبی دنیا میں زلزلہ" کیسے بنتی اور وہ اپنے اس رسالہ کو "عقل گم کر دینے والے انکشافات" کیسے کہتے۔

ع تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے۔

افسوس کہ یہ لوگ ایک ہی لکیر پیٹتے رہے کہ مولانا تھانویؒ نے یہ مضامین مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے بغیر کسی قسم کا حوالہ دیئے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ہم نے ان قادیانی مضمون نگاروں کے ہر مضمون پر ان کا نوٹس لیا اور انہیں اس غلط بیانی اور خیانت سے رجوع کرنے کی دعوت بھی دی مگر افسوس کہ ان حضرات نے کہیں بھی اپنی اس خیانت پر پشیمانی کا اظہار نہ کیا اور نہ انہیں اس علمی خیانت سے توبہ کی توفیق ہوئی۔

عقلی حکمتیں مولانا تھانویؒ کی نظر میں

حضرۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک نہایت بلند پایہ اور راسخ فی العلم عالم دین تھے، ان کے ہاں احکام دین کی یہ مصلحتیں نہ منصوص نہ مدارِ احکام، بلکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ لوگ اس قسم کے مباحث میں نہ پڑیں لیکن وہ انہیں اس سے روکنے پر قادر نہ تھے، مجبوراً انہوں نے انہیں ایک صحیح سمت موڑا،

آپؒ نے ان میں سے وہ مضامین جو ان کے نزدیک اصول شریعت سے بعید نہ تھے لے لئے اور اس کتاب کے مؤلف کا نام نہ بتایا تاکہ ان کی نشاندہی پر لوگ اس کتاب کی طرف نہ دیکھیں جو تمام تر رطب و یابس سے پُر تھی اور عامۃ الناس کو اس کا دیکھنا سخت مضر تھا۔ مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں:-

> "غرض اس میں کوئی شک نہ رہا کہ اصل مدار ثبوت احکام شرعیہ فرعیہ کا نصوص شرعیہ ہیں لیکن اس طرح اس میں بھی شبہ نہیں کہ باوجود اس کے پھر بھی ان احکام میں مصالح اور اسرار بھی ہیں اور اگر مدار ثبوت ان احکام کا ان پر نہ ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا لیکن ان میں یہ خاصیت ضرور ہے کہ بعض طبائع کیلئے ان کا معلوم ہو جانا احکام شرعیہ میں مزید اطمینان پیدا کرنے کے لئے ایک درجہ میں معین ضرور ہے گو اہل یقین راسخ کو اس کی ضرورت نہیں۔" (المصالح العقلیہ ص ۱۳)

حضرۃ مولانا تھانویؒ کی اس عبارت سے یہ واضح ہے کہ انہوں نے اس ایک کتاب سے مضامین اس لئے نہیں لئے کہ مولانا کو خود ان کی ضرورت تھی یا وہ انہیں کسی درجہ میں علم و معرفت کا سرمایہ سمجھتے تھے بلکہ محض اس لئے کہ ان کے بیان سے وہ علم و یقین کے ضعفاء کو کسی درجہ میں کچھ تسلی دے سکیں۔ حضرۃ مولانا تھانویؒ کی اس تصریح کے باوجود جناب عبداللہ ایمن زئی حضرت مولانا تھانویؒ کو اس آب حیات کا متلاشی بتلا رہے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ حضرۃ مولانا جیسے راسخین فی العلم کے ہاں ان مضامین عقلیہ کا کچھ وزن نہیں وہ حضرت مولاناؒ کو اس "چشمہ فیض"

سے سیراب ہوتا یا آبپاشی کرتے ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل پانچ پیرے ملاحظہ کیجیے۔

(۱) حضرت تھانویؒ اس نکتے پر غور فرما رہے تھے کہ خنزیر کو حرام قرار دینے کا عقلاً کیا جواز ہے۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں جو لٹریچر تخلیق ہوا، اور بڑے بڑے علماء و مفسرین نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا وہ سب حضرت تھانویؒ کی نظر میں تھا مگر انہوں نے یہ سارا سرمایۂ معرفت ایک طرف رکھ دیا اور مرزا صاحب نے اپنی کتاب میں حرمت خنزیر کے جو اسباب بیان کیے تھے وہ اپنی کتاب میں نقل کر دیئے۔ ۲؎

(۲) حضرت تھانویؒ اپنی کتاب کی تصنیف کے وقت غور فرما رہے تھے کہ نماز پنجگانہ میں کیا حکمتیں ہیں اسی دوران میں" ان کی نظر سے مرزا صاحب کی مذکورہ کتاب گذری" اس میں بیان کردہ حکمتیں حضرت تھانویؒ کو اس قدر پسند آئیں کہ لفظ بہ لفظ اپنی کتاب میں نقل فرما دیں"۔ ۳؎

(۳) حضرت مولانا تھانوی کتاب کے لئے اس موضوع پر غور و فکر اور مطالعہ فرما رہے تھے تلاش و تحقیق کے دوران مرزا صاحب کی کتاب "نسیم دعوت" انہیں ملی انہوں نے یہ کتاب پڑھی" اور محسوس کیا انسانی قویٰ کے استعمال کے جو طریقے مرزا صاحب نے قرآن شریف پر تدبر کرنے کے بعد بیان کئے ہیں ان سے بہتر نکات بیان نہیں کئے جا سکتے"۔ ۴؎

(۴) روح اور قبر کے تعلق کے بارے میں صدیوں تک علماء اور حکماء اسلام نے بحث کی اور آخر یہی نتیجہ نکالا کہ قبر کے ساتھ روح کا تعلق کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ حضرت تھانویؒ کے پیش نظر بھی یہی مسئلہ تھا.... اسی دوران میں حضرت تھانویؒ کی نظر سے مرزا صاحب کی ایک تقریر گذری... ... مرزا صاحب کی تقریر کی ساری عبارت حضرت تھانویؒ نے اپنی کتاب میں شامل کر لی ۵؎

۵۔ حضرت مولانا تھانویؒ نکاح اور طلاق کی حکمتوں پر غور فرما رہے تھے۔ مرزا صاحب۔ اپنی کتاب آریہ دھرم میں نکاح و طلاق کی حکمتوں پر بحث کر چکے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس سے استفادہ کیا، مولانا مغفورؒ مرزا صاحب کی بحث کو پڑھ کر اسے اپنے رنگ میں اور اپنے الفاظ میں بیان کر سکتے تھے.... مگر حضرت تھانویؒ کو خراج تحسین ادا کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے دھوکہ فریب سے کام لینے کی بجائے مرزا صاحب کی یہ ساری بحث مرزا صاحب ہی کے الفاظ میں اپنی کتاب کی زینت بنا دی ۶؎

ان پانچوں اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ ان مسائل میں واقعی ضرورت مند تھے اور مرزا صاحب کی کتابوں میں ان کی مشکل کا حل موجود تھا اور انہوں نے اپنی یہ مشکل مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی

۲؎ کمالات اشرفیہ ص [illegible] ۳؎ ایضاً ص [illegible] ۴؎ ایضاً ص [illegible] ۵؎ ایضاً ص ۲۷

حل کی جناب عبداللہ امین زئی نے یہ عبارات لکھتے ہوئے حضرت تھانویؒ کے اس جملہ کو چھوا تک نہیں جو حضرت تھانویؒ اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھ چکے تھے اور اس سے پوری حقیقتِ حال سے پردہ اٹھتا تھا۔ وہ جملہ یہ ہے۔

> اہل یقین اور راسخ کو اس کی ضرورت نہیں لیکن بعض ضعفاء کے لئے تسلی بخش اور قوت بخش بھی ہے ——

اب آپ ہی غور کریں کہ حضرت تھانویؒ تو ان مضامین عقلیہ کو کوئی علم و عرفان کا موضوع قرار نہیں دے رہے۔ ضعفاء ایمان کے لئے محض ایک تسلی کا سامان کہہ رہے ہیں اور عبداللہ امین زئی صاحب ہیں کہ خلاف مرادِ متکلم حضرت تھانویؒ کو ان مضامین میں تحقیقِ حق کا جویا بتلا رہے ہیں۔ حضرت تھانویؒ کو غور و فکر میں ڈوبا ہوا ظاہر کر رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ حضرت تھانویؒ کو مرزا صاحب کے ہی سرچشمہ فیض سے ہی سیرابی نصیب ہوئی

جو شخص بھی حضرت تھانویؒ کے اس مقدمہ کو پڑھے گا اور پھر امین زئی صاحب کی ان عبارات کو دیکھے گا وہ بلا تامل کہے گا کہ امین زئی صاحب نے ان عبارات میں حق و انصاف کا خون کیا ہے، کچھ بھی خدا کا خوف نہیں کیا۔ جو بات حضرت تھانویؒ نے صرف ضعفاء ایمان کے لئے تسلی کا سامان کہی تھی اسے امین زئی نے خود حضرت تھانوی جیسے راسخ فی العلم کے لئے سرمایہ یقین ٹھہرا دیا ہے۔ یہ کھلی خیانت نہیں تو اور کیا ہے؟

عقلی حکمتیں اور روحانی معارف

عبداللہ امین زئی نے یہ جانتے ہوئے کہ مولانا تھانویؒ کے نزدیک احکام اسلام کی مصلحتوں اور حکمتوں کا علم کے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ وہ اسے کسی پہلو میں روحانی معارف میں جگہ دیتے ہیں۔ مولانا تھانویؒ کی کتاب المصالح العقلیہ کو روحانی معارف کی کتاب سمجھ لیا ہے۔ امین زئی صاحب یہ بھی نہ سمجھ سکے کہ مولانا تھانویؒ تو سرے سے ہی ان کے خلاف تھے، انہیں محض ضعیف الاعتقاد لوگوں کے لئے سامانِ تسلی سمجھتے تھے۔ کاش کہ امین زئی صاحب حضرت تھانویؒ کی یہ عبارت ہی مقدمہ میں دیکھ لیتے۔

> "ہمارے زمانہ میں تعلیم جدید کے اثر سے جو آزادی طبائع میں آ گئی ہے اس سے بہت سے لوگوں میں ان مصالح کی تحقیق کا شوق پیدا ہو گیا ہے اور گو اس کا علاج تو یہی تھا کہ ان کو اس سے روکا جائے۔" [لہ]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ کے ہاں ان کی یہ کتاب کوئی روحانی معارف کی کتاب نہ تھی، انہوں نے ادنیٰ سمجھ والوں کیلئے احکام اسلام کی یہ چند مصلحتیں ذکر کی تھیں تاکہ عوام کو ان میں رغبت ہو۔ افسوس کہ امین زئی صاحب نے انہیں روحانی معارف کا خزانہ یا قرآن مجید کی کوئی بہت بڑی تفسیر سمجھ لیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ دیکھو مولانا تھانویؒ جیسا جلیل القدر عالم مرزا صاحب سے روحانی معارف کا سبق لے رہا ہے۔ امین زئی صاحب لکھتے ہیں۔

[لہ] المصالح العقلیہ ص ۱۲

لاکھوں انسانوں کے پیشوا حضرۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی مشہور و معروف کتاب احکام اسلام عقل کی نظر میں ایک ایسی پر معارف تصنیف ہے جس کے اسرار و معارف مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی مختلف اور متعدد کتابوں سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۵۲

پھر ایمن زئی صاحب یہ بھی لکھ گئے :-

> اپنے زمانے کا اتنا بڑا عالم جس نے لاکھوں انسانوں کو علم دین پڑھایا، وہ اپنی کتاب احکام اسلام عقل کی نظر میں لکھتے ہوئے اتنا بے بس ہو گیا کہ روحانی معارف بیان کرنے کے لئے اسے مرزا صاحب کی کتابوں کا سہارا لینا پڑا۔ ۵۳

مولانا تھانویؒ تو اپنی اس کتاب کو روحانی معارف کا خزانہ بالکل نہیں کہہ رہے بلکہ صراحت کر رہے ہیں کہ راسخ العلم اہل یقین کو اس کی کوئی ضرورت نہیں صرف ضعفاء اسلام کے لئے اس میں کچھ تسلی کا سامان ہے مگر ایمن زئی صاحب ان کی کتاب پر عقیدت کا وہ حاشیہ چڑھا رہے ہیں جو حضرت تھانویؒ کے مریدین میں سے بھی کسی کو آج تک نہیں سوجھا ہوگا۔ یہ اس لئے نہیں کہ انہیں حضرت تھانویؒ سے عقیدت ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے اس اظہار سے مرزا غلام احمد کے بارے میں اپنے ذہن کو کچھ تسکین دینا چاہتے ہیں۔

مولانا تھانویؒ کی کتاب میں غیر مسلموں کی نقول

مولانا تھانویؒ نے اپنی اس کتاب میں احکامِ اسلام کی بعض حکمتیں غیر مسلموں سے بھی نقل کی ہیں۔ آپ ایک مقام پر ایک جرمن مقالہ نویس سے اسلام کے حفظِ صحت کے اصولوں میں ایک حکمت ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں :-

> "اسلام نے صفائی اور پاکیزگی اور پاکبازی کی صاف و صریح ہدایات کو نافذ کر کے جراثیم ہلاکت کو مہلک صدمہ پہنچایا ہے غسل اور وضو کے واجبات نہایت دور اندیشی اور مصلحت پر مبنی ہیں غسل میں تمام جسم اور وضو میں ان اعضاء کا پاک صاف کرنا ضروری ہے جو عام کاروبار یا چلنے پھرنے میں کھلے رہتے ہیں۔ منہ کو صاف کرنا اور دانتوں کو مسواک کرنا، ناک کے اندرونی گرد و غبار وغیرہ کو دور کرنا یہ تمام حفظ صحت کے لوازم ہیں اور ان واجبات کی بڑی شرط آب رواں کا استعمال ہے جو فی الواقع جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ نے لحم خنزیر اور بعض ممنوع جانوروں کے اندر امراض ہیضہ و ٹائی فائیڈ بخار وغیرہ کا خطرہ دریافت کر لیا تھا۔ ۵۴

عبداللہ ایمن زئی کیا اس جرمن مقالہ نویس کو قرآنی معارف کا سرچشمہ کہیں گے کہ مولانا تھانوی جیسا بڑا عالم اسلامی احکام کی ایک حکمت اس غیر مسلم سے نقل کر رہا ہے۔ مولانا تھانویؒ نے جرمن کے ڈاکٹر کوخ کی بھی

---

۵۲ کمالات اشرفیہ ص۵ ۵۳ ایضاً ص۵ ۵۴ المصالح العقلیہ ص۲۹۸ منقول از اخبار وکیل ۱۸ جون ۱۹۱۳ء

ایک تجربہ احکام اسلام کے مصالح عقلیہ میں پیش کی ہے۔ ہم اس کا بھی ایک اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔

> جس وقت سے مجھ کو نوشادر کا دارالکلب کے لئے تیر بہدف علاج ہونا دریافت ہوگیا ہے اس وقت سے میں اس عظیم الشان کی خاص طور پر قدر و منزلت کرتا ہوں۔ اس انکشاف کی راہ میں مجھ کو انہیں کے مبارک قول کی شمع نور نے روشنی دکھائی۔ میں نے ان کی وہ حدیث پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس برتن میں کتا منہ ڈالے اس کو سات مرتبہ دھولو چھ مرتبہ پانی سے اور ایک مرتبہ مٹی سے دیکھ کر مجھ کو خیال آیا کہ **محمد** جیسے عظیم الشان پیغمبر کی شان میں فضول گوئی نہیں ہوسکتی، ضرور اس میں کوئی مفید راز ہے اور میں نے مٹی کے عنصروں کی کیمیائی تحلیل کر کے ہر ایک عنصر کا دارالکلب میں الگ استعمال شروع کیا آخر میں نوشادر کے تجربہ کی نوبت آتے ہی مجھ پر منکشف ہوگیا کہ اس مرض کا یہی علاج ہے۔ [1]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے احکام اسلام کے مصالح عقلیہ بیان کرنے میں کچھ مضامین غیر مسلموں سے بھی لئے ہیں۔ ڈاکٹر موریس فرانسیسی، مسٹر آرنلڈ وہائٹ، مسٹر ایڈورڈ براؤن کی تحریرات کے ساتھ ساتھ آپ نے گورو بابا نانک سے بھی کچھ باتیں نقل کی۔ یہ کوئی دینی سند یا قرآن وحدیث کی تفسیر نہیں جو غیر مسلموں سے نقل کی جارہی ہے۔ مباحث عقلیہ میں غیر مسلموں سے کوئی بات لے لینا ہرگز کسی پہلو سے ممنوع نہیں، کوئی پڑھا لکھا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے اس جرمن مقالہ نویس یا ڈاکٹر کوخ سے یا ان دوسرے غیر مسلم مضمون نگاروں سے روحانی معارف حاصل کئے ہیں۔ اب آپ نے اگر ان غیر مسلموں میں سے مرزا غلام احمد سے بھی کچھ باتیں مباحث عقلیہ میں لے لیں تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا جو امین زئی صاحب ان الفاظ میں نکال رہے ہیں۔

> ”راقم تو اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اگر علامہ تھانوی جیسے عالم بے بدل اور لاکھوں مسلمانوں کے روحانی پیشوا نے روحانی علم مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے چشمہ علم و معرفت سے حاصل کیا تو پھر اس زمانے میں علم دین اور روحانیت کا سرچشمہ تو مرزا صاحب ہوئے“ [2]

محترم! اگر آپ اپنی اس عبارت کا یہ آخری جزء یوں لکھتے تو آپ کی دیانتداری کس درجہ میں لائق تسلیم ہوتی اور پھر ہم اس کا کچھ جواب بھی عرض کرتے:

> ”مسلمانوں کے روحانی پیشوا نے روحانی علم جرمنی کے غیر مسلم مستشرق، جرمنی کے ڈاکٹر کوخ، بابا نانک اور مرزا غلام احمد قادیانی کے چشمۂ علم و معرفت سے حاصل کیا ہے۔“

امین زئی صاحب کا اس مقام پر صرف مرزا غلام احمد کا ذکر کرنا ان کے رازِ درون کا پتہ دے رہا ہے۔ اور

---

[1] المصالح العقلیہ صـ ۳۰۲ منقول از اخبار مدینہ بجنور ۹ مارچ ۱۹۱۷ء

[2] کمالات اشرفیہ صـ ۴۸۔

کی عبارت میں خط کشیدہ لفظ اگر ہم نے اس لئے لکھا ہے کہ واقعۃً حضرت تھانویؒ نے مرزا غلام احمد کی کتابوں سے کوئی بات بھی نہیں لی اور محض الفاظ اور عبارات کے ملنے سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرۃ تھانویؒ نے یہ مضامین واقعی غلام احمد کی کتابوں ہی سے لئے ہیں، علمی اور منطقی پہلو سے کسی طرح صحیح نہیں۔ آئندہ ہم اس پر تفصیل سے بات کریں گے — یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ کی اس کتاب کا موضوع سرے سے روحانی معارف نہیں۔ یہ سب مباحث عقلیہ ہیں جو اس کتاب میں پائے جاتے ہیں اور ان میں غیر مسلم کی بات لے لینی کسی پہلو سے بھی محل کلام نہیں۔ مولانا تھانویؒ کی اس کتاب میں احکام اسلام کی ہزاروں عقلی مصلحتیں مذکور ہیں، ان میں سے جو باتیں مرزا غلام احمد کے ساتھ مشترک ہیں وہ مولانا تھانویؒ کی بیان کردہ کل مصالح عقلیہ کا ۱/۱۰۰ حصہ بھی نہیں جس کا دل چاہے گن کر دیکھ لے اور موازنہ کر لے اور پھر اس پر قادیانیوں کے اس دعوے کو بھی منطبق کرے کہ یہ سب روحانی معارف مرزا غلام احمد سے ہی ماخوذ ہیں۔ ہم بطور اصول تسلیم کرتے ہیں کہ مصالح عقلیہ کے اخذ کرنے میں ماخوذ منہ کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے حکمت کی بات مومن کی اپنی متاع گمشدہ ہے جہاں سے اسے ملے وہ اسی کی ہے۔

ایمن زئی صاحب کی عقیدت حضرۃ تھانویؒ سے صرف لفظی ہے

جناب عبداللہ ایمن زئی گو اپنے آپ کو قادیانی نہیں کہہ رہے لیکن ان کی سطر سطر راز درون پردہ کا پتہ دے رہی ہے۔ حضرۃ تھانویؒ کی عقیدت میں بھی وہ رطب اللسان ہیں لیکن ان کی ایک بات پر بھی وہ پورا یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مولانا تھانوی کی وہ کونسی بات ہے جسے ایمن زئی صاحب تسلیم نہیں کر رہے۔ وہ حضرۃ تھانویؒ کا یہ بیان ہے کہ انہوں نے یہ مضامین ایک کتاب سے لئے ہیں۔

> احقر نے غایت بے تعصبی سے اس میں بہت سے مضامین کتاب مذکورہ بالا سے جو کہ موصوف بصحت تھے لے لئے ہیں [1]

ایمن زئی صاحب نے کمالات اشرفیہ کے ص۸ ص۱۶ ص۲۰ ص۲۷ ص۳۳ پر جو لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرۃ تھانویؒ نے مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے اقتباسات لئے ہیں۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک کتاب سے (اور وہ بھی مرزا غلام احمد کی نہیں) یہ مضامین لئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جو شخص حضرۃ تھانویؒ کی بات کا اعتبار نہیں کرتا وہ کہاں تک ان کا معتقد ہو سکتا ہے۔ سو ایمن زئی صاحب کی حضرت تھانویؒ سے عقیدت محض ایک لفظی کھیل ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

حضرۃ تھانویؒ کے حوالہ میں مصنف کا نام کیوں نہیں

حضرۃ تھانویؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں یہ حوالہ تو دیا کہ

---

[1] احکام اسلام عقل کی نظر میں ص۱۶

انہوں نے اس کے بعض مضامین ایک کتاب سے نقل کئے جس میں رطب ویابس ہر طرح کے مضامین تھے جو مضامین ان کے ہاں رو بصحت تھے انہوں نے ان میں سے بہت سے مضامین لے لئے — لیکن یہ سوال باقی تھا کہ اس کتاب کا مصنف کون ہے اور یہ کہ حضرۃ تھانویؒ نے اس کا نام کیوں نہیں لیا ؟

اس کا جواب معلوم کرنے سے پہلے آپ اس مصنّف کے بارے میں حضرت تھانویؒ کی رائے معلوم کریں اور پھر خود سوچیں کہ آپ کے لئے اس کا نام لینا مناسب تھا یا نہ تھا ؟ اور آپ نے اس کا نام نہ لے کر مسلمانوں کے ساتھ اور خود اس مصنّف کے ساتھ خیرخواہی کی ہے یا بدخواہی ؟

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ حکیم الاُمت تھے ان کے ہر عمل میں دینی حکمت جھلکتی ہے وہ ایک کم علم اور کمزور فکر آدمی کا تعارف کرا کر اس کے غلط افکار کی اشاعت میں حصہ دار بھی بننا نہیں چاہتے اور جو باتیں اس کے قلم سے صحیح نکلیں انہیں بفحوائے حدیث ضائع جانے دینا بھی نہیں چاہتے کہ حکمت کی بات مؤمن کی گمشدہ چیز ہے جہاں سے بھی ملے وہ اسے لے لے۔ اس نازک مرحلہ پر حضرت حکیم الاُمۃ ایک بیچ کی راہ پر چلے، کتاب کا ذکر کر دیا کہ انہوں نے کچھ باتیں ایک کتاب سے لی ہیں جسکا مصنف علم و عمل کی کمی کے باعث اس کتاب میں رطب و یابس لے آیا ہے اور اس کتاب کا نام نہ لیا کہ لوگ اس کے غلط مندرجات سے گمراہ نہ ہوں اور نہ مصنف کا نام لیا تاکہ اس کی مزید رسوائی نہ ہو۔ حکیم الاُمت اس نازک موڑ پر ایک ایسی راہ چلے ہیں جو ان کے پیروؤں کے لئے واقعی ایک نمونہ ہے۔ کوئی غیر محتاط عالم ہوتا وہ کبھی نہ اس سلامتی سے اس منجدھار سے باہر نکلتا حضرت تھانویؒ نے اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں جو رائے تحریر فرمائی ہے اسے ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں اس کی روشنی میں اس کتاب اور اس کے مصنّف کا نام ذکر نہ کرنے میں جو دینی حکمت تھی وہ خود آپ کے سامنے آجائے گی آپ لکھتے ہیں۔

> چنانچہ اس وقت بھی ایک ایسی کتاب ہے جس کو کسی صاحب قلم نے لکھا ہے مگر علم و عمل کی کمی کے سبب تمام تر رطب و یابس و غث و سمین سے پُر ہے ایک دوست کی بھیجی ہوئی میرے پاس دیکھنے کی غرض سے رکھی ہے اس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا، کہ ایسی کتابوں کا دیکھنا تو عامہ کو مُضر ہے مگر عام مذاق کے بدل جانے کے سبب بدوں اس کے کہ اس کا دوسرا بدل لوگوں کو بتلایا جاوے اس کے مطالعے سے روکنا بھی خارج من القدرۃ ہے اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسا مستقل ذخیرہ ان مضامین کا ہو جو ان مفاسد سے مُبرّا ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے مہیا کیا جائے تاکہ اگر کسی کو ایسا شوق ہو تو وہ اس کو دیکھ لیا کریں۔ کہ اگر مورث منافع نہ ہوگا تو دافع مضار تو ہوگا (البتہ جس طبیعت میں مصالح کے علم سے احکام الٰہیہ کی عظمت و وقعت کم ہو جائے یا وہ ان کو مدار احکام سمجھنے لگے کہ ان کے انتفاء سے احکام کو منتفی اعتقاد کرے یا ان کو

مقصود بالذات سمجھ کر دوسرے طریق سے ان کی تحصیل کو بجائے اقامت احکام کے قرار دے لے جیساکہ اوپر بھی ان مضار کی طرف اجمالاً اس قول میں اشارہ بھی کیا گیا ہے "چنانچہ بعض اوقات یہ مذاق مضر بھی ہوتا ہے"۔

تو ایسے طبائع والوں کو ہرگز اس کی اجازت نہیں ہے۔ احقر نے غایت بے تعصبی سے ایسے بہت سے مضامین کتاب مذکورہ بالا سے بھی جو کہ موصوف بصحت تھے لے لئے ہیں اور ایسے احکام مشہورہ کی کچھ کچھ وہی مصلحتیں مذکور ہوں گی جو اصولِ شرعیہ سے بعید نہ ہوں اور فہم عام کے قریب ہوں، مگر یہ مصلحتیں نہ سب منصوص ہیں نہ سب مدار احکام ہیں اور نہ ان میں انحصار ہے"[1]

یہ عبارت خود بول رہی ہے کہ حضرت تھانویؒ نے اس کتاب یا اس کے مصنّف کا نام کیوں نہیں لیا۔ افسوس کہ قادیانی مضمون نگار اس بات کو پا نہ سکے انہوں نے مصنّف کا نام نہ لکھنے کی یہ وجہ تصنیف کی:

"اگر حضرۃ مولانا تھانویؒ اپنی کتاب میں مرزا صاحب کا نام یا ان کی کسی کتاب کا نام درج کر دیتے تو متعصب اور تنگ نظر لوگ ان کی جان کے دشمن ہو جاتے اور ان کی کتاب کو نذرِ آتش کر دیتے۔ یقین ہے کہ انہیں اپنے وطن (تھانہ بھون) کو بھی خیر باد کہنا پڑتا، اس لئے حضرت مولاناؒ نے فتنہ و فساد سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مرزا صاحب کا حوالہ دیئے بغیر ان کے بیان کردہ معارف اپنی کتاب میں درج کر دیئے"[2]

جواباً گذارش ہے کہ مصنّف کا نام نہ لکھنے کی اگر یہی وجہ ہوتی اور حقیقت میں فیض حاصل کرنا پیش نظر ہوتا تو حضرۃ تھانویؒ چلتے چلتے مصنّف پر یہ تبصرہ ہرگز نہ کرتے جاتے کہ موصوف علم و عمل کی کمی کے باعث رطب و یابس میں فرق کرنے کے لائق نہیں۔ مولانا کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حضرتؒ کے دل میں اس کی کوئی عظمت نہ تھی نہ حضرتؒ نے اس سے کوئی اکتسابِ فیض کیا تھا، انہوں نے اس کا نام محض اس لئے نہ لیا کہ اسے مزید بے آبرو نہ کیا جائے نہ اس کتاب کی غلط اشاعت سے اپنے اوپر کوئی گناہ کا بار لیا جائے۔

کم علم اور بے عمل آدمی کے کلام میں اسرار حکمت کہاں

رہا یہ سوال کہ ایک کم علم اور بے عمل آدمی کے کلام میں یہ اسرار حکمت کہاں سے آگئے؟ جواباً گذارش ہے کہ یہاں علم سے مراد علم قرآن و سنّت ہے مصنّف مذکور کو کم علم اسی پہلو سے کہا گیا ہے رہے عقلی مباحث اور خیالی باتیں تو ان میں بعض دفعہ ان پڑھ لوگ بھی بڑی دور کی بات کہہ جاتے ہیں۔ حضرۃ تھانویؒ کی اس کتاب کا موضوع کوئی علمی معارف

---

[1] المصالح العقلیہ ص۱۴/۱۵

[2] کمالات اشرفیہ ص[illegible]

نہ تھے محض عقلی باتیں تھیں جو ضعفاء ایمان کو کسی درجہ میں تسلی دے سکیں۔ ایسی بعض باتیں اگر کسی کم علم اور کم عمل شخص پر بھی کھل جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی کم علم آدمی علماء سلف کی تحریروں میں غور وفکر کرتے کرتے اور ان سے اس قسم کا سرمایہ دانش اکٹھا کرتے کرتے بات سے بات نکالنے میں اس درجہ کامیاب ہو جائے کہ اس کے بعض مضامین جو ردِ بدعت ہوں اور اصولِ شرعیہ سے نہ ٹکراتے ہوں وہ بعض راسخ فی العلم اہلِ یقین کو پسند آ جائیں اور وہ انہیں اپنے الفاظ میں بدلنے کی محنت کئے بغیر اس کے اپنے لفظوں میں ہی انہیں نقل کر دیں اور سرقہ کے الزام سے بچنے کے لئے محض اتنا کہہ دیں کہ انہوں نے بعض مضامین کسی اور کتاب سے لئے ہیں۔

حضرۃ تھانویؒ نے جس کتاب سے مضامین مذکورہ لئے اس کا مصنّف اسی قبیل کا شخص معلوم ہوتا ہے اور یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ حضرت تھانویؒ نے یہ مضامین ہرگز ہرگز مرزا غلام احمد کی کتابوں سے نہیں لئے ان کا ماخذ صرف ایک کتاب ہے نہ کہ مرزا صاحب کی پانچ کتابیں۔ کشتی نوح، آریہ دھرم، اسلامی اصول کی فلاسفی، نسیم دعوت اور برکات الدعاء۔

عبارات ملنے سے کیا ضروری ہے کہ وہ انہی کتابوں سے لی گئی ہوں؟

حضرت تھانویؒ جیسے جلیل القدر عالم کی کتاب میں مرزا غلام احمد کی کتابوں کی بعض طویل عبارات کا من وعن پایا جانا ہمیں اس باب میں زیادہ غور وفکر اور تحقیق وتفحص پر مجبور کرتا ہے۔ عبارات ملنے سے کیا یہ ضروری ہے کہ وہ مرزا صاحب کی ہی کتابوں سے لی گئی ہوں؟ کیا اس میں اور کسی احتمال کی گنجائش نہیں؟

کیا انسانی عقل وتجربہ یہاں کسی اور احتمال کو جگہ نہیں دیتے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی اور مصنف نے مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے یہ اقتباسات بلا حوالہ اپنی کتاب میں لئے ہوں یا مرزا صاحب نے انہیں اس سے لے کر اپنی پانچ کتابوں میں جگہ دی ہو اور حضرۃ تھانویؒ نے انہیں اس مصنف کی اصل کتاب سے لیا ہو؟ ان سب احتمالات کے ہوتے ہوئے ایک ہی رٹ لگائے جانا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی لئے ہیں اور انہیں عقل گم کر دینے والے انکشافات کے نام سے عوام کے سامنے لانا قادیانی علمِ کلام کی یہی انتہا ہے

قادیانی حضرات کہتے ہیں کہ یہ سب احتمالات عقلی ہیں اور ایسے موضوعات میں محض امکان کوئی وزن نہیں رکھتا صرف اسی احتمال کو اہمیت دی جا سکتی ہے جو ناشی عن الدلیل ہو۔ ہم جواباً کہیں گے کہ حضرۃ تھانویؒ نے جب واشگاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ انہوں نے یہ اقتباسات ایک کتاب سے لئے ہیں (نہ کہ پانچ کتابوں سے) تو کیا یہ دلیل اس احتمال کو جگہ نہیں دیتی کہ حضرت تھانویؒ کے سامنے واقعی کوئی اور کتاب ہو۔ اس ناشی عن الدلیل احتمال کو کلیۃً نظر انداز کرنا اور اس پر اصرار کرنا کہ حضرۃ تھانویؒ نے یہ مضامین لازماً

مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی لئے محض ضد نہیں تو اور کیا ہے؟

دوست محمد شاہد، محمد شبیر ہرل اور عبداللہ ایمن زئی میں کچھ بھی تحقیق کا پاس ہوتا تو وہ اس کتاب کی ضرور تلاش کرتے جسمیں مرزا صاحب کی کتابوں کے پانچ اقتباسات ایک ہی جگہ مل جائیں مگر افسوس کہ انہیں اس کی توفیق نہ ہوئی۔ حضرۃ تھانویؒ کی اس بات کو صحیح مانا جائے کہ انہوں نے یہ مضامین واقعی ایک کتاب سے لئے ہیں تو پھر ان دو احتمالات میں سے ایک کو جگہ دینی ہوگی اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرۃ تھانویؒ نے یہ عبارات یقیناً مرزا صاحب کی کتابوں سے نہیں لیں۔ ہم نے دوست محمد شاہد کے اس انکشاف کا مطالعہ کیا اور پھر ایمن زئی صاحب کی بھی زلزلہ فگن کتاب دیکھی تو اس یقین سے چارہ نہ رہا کہ حضرۃ تھانویؒ نے قطعاً یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے نہیں لئے اس پر ہم نے ہفت روزہ خدام الدین لاہور کی ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں اس عنوان کے تحت لکھا۔

صورت حال کا صحیح جائزہ

"قادیانیوں نے اس بحث میں اب تک جتنے مضمون لکھے ہیں ان میں سے کسی میں حضرت مولانا تھانویؒ کی دیانت اور نیت پر کوئی الزام نہیں لگایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صدق مقالی پر انہیں بھی عمومی اتفاق ہے۔

مولانا تھانویؒ المصالح العقلیہ کے مقدمہ میں تصریح کرتے ہیں کہ انہوں نے کئی مضامین ایک ایسی کتاب سے نقل کئے ہیں جس میں بیشتر باتیں غلط تھیں۔ مولانا تھانویؒ نے اس ایک کتاب کے سوا اور کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایسی کتاب ایک ہی تھی۔

مگر دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ حضرت تھانویؒ کی اس کتاب المصالح العقلیہ میں مرزا صاحب کی پانچ کتابوں کی عبارات ملتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ اپنے مقدمہ میں اگر ایک کتاب کا ذکر کر سکتے تھے تو پانچ کتابوں کا ذکر کرنے میں انہیں انکار کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ کوئی نہیں! سو ہم یقین کرنے پہ مجبور ہیں کہ آپ کے سامنے واقعی ایسی کتاب ایک تھی جیسا کہ آپؒ نے بیان کیا نہ کہ پانچ۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ المصالح العقلیہ میں مرزا صاحب کی پانچ کتابوں کی عبارات موجود ہیں۔

قادیانی مضمون نگار اپنے کسی مضمون میں اس تعارض کو حل نہیں کر پائے۔ نہ انہوں نے کوئی اور خارجی حوالہ پیش کیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ مضامین بعینہٖ مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے ہی اخذ کئے ہیں۔

رفع تعارض

رفع تعارض کے لئے تمام عقلی احتمالات سامنے لائے جاتے ہیں۔ یہاں رفع تعارض اس صورت میں ہوتا ہے کہ کسی اور کتاب کو مرزا صاحب اور حضرت مولانا تھانویؒ میں واسطہ بنایا جائے اور سمجھا جائے کہ اس کتاب میں مرزا صاحب کی پانچوں کتابوں کے مضامین بلا حوالہ منقول ہوں گے اور مولانا تھانویؒ نے اس کتاب سے وہ مضامین اپنی کتاب میں لئے ہوں گے

رفع تعارض کیلئے سب احتمالات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ راقم الحروف نے اگر اس رفع تعارض کیلئے عین ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے

کے پہلوؤں پر اگر توجہ دلائی ہے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب محمد شبیر پر علمی مضامین اور تاریخی تحقیقات کے کوچہ میں کبھی بھول کر بھی نہیں گذرے ورنہ وہ کبھی اسے عُذرِ گناہ بدتر از گناہ کا عنوان نہ دیتے۔"

قادیانی حضرات اس پر بہت سیخ پا ہوئے لیکن علمی طور پر وہ ان دو احتمالات کی راہ بند نہ کر سکے، ہمارے پیش کردہ احتمال ناشی عن الدلیل تھے اور قادیانیوں کو انہیں قرارِ واقعی جگہ دینی چاہیئے تھی مگر وہ تو اسی نشہ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ انہوں نے واقعی عقل کو گم کر دینے والے انکشافات کئے ہیں۔ ہم عرض کریں گے کہ ان سے عقل تنہا ہی گم ہوئی ہے جنہوں نے اور طرف سوچنا ہی چھوڑ دیا ہماری نہیں جنہوں نے صورتِ حال کا صحیح جائزہ لیا۔

قادیانیوں کو نصف صدی بعد یہ انکشاف کیوں ہوا،

حضرت مولانا تھانویؒ کو دُنیا سے رخصت ہوئے تقریباً نصف صدی ہو رہی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قادیانیوں نے اب اس مسئلہ کو کیوں اُٹھایا اور نصف صدی کے قریب اس پر کیوں خاموش رہے؟ اگر یہ بات اس وقت اُٹھائی جاتی جب حضرت تھانویؒ کے وہ احباب و خلفاء موجود تھے جو اپنے وقت کے اساطینِ علم بھی تھے اور حضرت تھانویؒ سے بھی بہت قریب کا تعلق رکھتے تھے تو وہ فوراً بتا دیتے کہ حضرۃ تھانویؒ نے کس ایک کتاب سے یہ اقتباسات لئے۔ لیکن قادیانیوں نے یہ بات اس وقت اُٹھائی جب حضرۃ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ، محدث العصر حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوریؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ جونہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی وفات ہوئی قادیانی یہ انکشاف لے کر سامنے آ گئے کہ شاید اب اس دور کا کوئی شخص نہ ملے جو حضرت تھانویؒ کی اس تالیف کا پس منظر سامنے لا سکے۔

قادیانیوں کی اتنی طویل خاموشی خود اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ عبارات مرزا صاحب کی کتابوں سے نہیں لیں لیکن محض اس اُمید پر کہ اب شاید اس دور کا کوئی آدمی نہ رہا ہو جو صورتِ واقعہ کی عینی شہادت دے سکے وہ اچانک یہ انکشاف سامنے لے آئے۔

اہلِ اسلام کی طرف سے جوابی کاروائی

ہم نے دوست محمد شاہد کے اس انکشاف کو پڑھتے ہی مذکورہ احتمالات جو ناشی عن الدلیل تھے پیش کر دیئے تھے تاکہ فریقین اس ایک کتاب کی تلاش کریں جہاں سے مرزا صاحب اور مولانا تھانویؒ دونوں نے یہ اقتباسات لئے ہیں لیکن بجائے اس کے کہ ہماری اس درخواست پر کچھ عمل کیا جاتا، عبداللہ امین زئی نے کمالاتِ اشرفیہ کے نام سے ایک رسالہ اس پر لکھ مارا اور وہی لکیر پیٹتے رہے کہ کچھ بھی ہو حضرۃ تھانویؒ نے یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی لئے ہیں۔

دوست محمد شاہد تو اس مذکورہ انکشاف کے بعد سامنے نہیں آئے ممکن ہے انہیں وہ کتاب مل گئی ہو جہاں سے حضرۃ تھانویؒ نے یہ اقتباسات لیے تھے لیکن ان کی جماعت کے محمد شبیر بہل اور عبدالرحیم بھٹہ بورے والا کے اس پر برابر مصر رہے ہے کہ حضرۃ تھانویؒ نے "بہ کسب فیض" مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی کیا ہے دوست محمد شاہد کو بھی چاہیئے تھا کہ اگر انہیں وہ کتاب مل گئی تھی تو اپنے ان ساتھیوں کو بھی اس کا پتہ دے دیتے

یہ صحیح ہے کہ ہم نے ان قادیانی مضمون نگاروں کا پورا تعاقب کیا اور ان کے مبلغ و مورخ سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے اور ہم نے انہیں یہ اصولی بات سمجھائی کہ حضرۃ تھانویؒ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں جس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ ایک کتاب ہے اور حضرت نے یہ باتیں سب اسی کتاب سے لی ہیں نہ کہ مرزا صاحب کی پانچ کتابوں سے اور انہیں (قادیانیوں کو) حضرت تھانویؒ کی اس بات کو صحیح جاننا چاہیئے اور حضرت کا دیا ہوا حوالہ ذکر کرنے کے بغیر اپنے اس انکشاف کو آگے نہ پھیلانا چاہیئے کیونکہ پھر یہ ایک انکشاف نہ ہوگا ایک خیانت ہوگی۔

حضرۃ تھانویؒ کے اصل ماخذ کی نشاندہی

یہ کتاب مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک ہم عصر مولوی محمد فضل خان کی کتاب ہے جو موضع چنگا بنگیال تحصیل گوجرخان ضلع راولپنڈی کے رہنے والے تھے۔ انگریز حکومت کے خاصے مداح تھے۔ ایک مجلس کی طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں انہوں نے جو لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مقلد تھے۔ مرزا غلام احمد کی پانچوں کتابوں کے اقتباسات اس کتاب میں مختلف مواقع پر من وعن موجود ہیں ـــــ اس مؤلف نے مرزا صاحب کی کتابوں سے یہ مضامین لئے ہیں یا مرزا صاحب نے اس کے مسودات سے یہ مضامین نقل کئے ہیں یا دونوں نے اپنے سے پہلے کی کسی کتاب سے لئے ہیں سردست ہم اس پر بحث نہیں کرتے اس وقت صرف حضرۃ تھانویؒ کی براۃ پیش نظر ہے کہ حضرۃ نے یہ مضامین مرزا غلام احمد کی کتابوں سے ہرگز نہیں لئے اصل ایک کتاب سے لیے ہیں۔ اور اس کتاب کا نام اسرار شریعت ہے۔

کتاب اسرار شریعت کا تعارف

اسرار شریعت تین ضخیم جلدوں میں ایک اردو تالیف ہے۔ مؤلف نے شریعت کے جملہ مسائل و احکام کو عقلی اور فطری استناد مہیا کرنے کی ایک بھرپور کوشش کی ہے۔ ناپختگیٔ علم کے باعث جابجا ٹھوکریں بھی کھائی ہیں اور بے بنیاد باتیں بھی بہت کی ہیں۔ تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف مذکور کو اس عظیم مہم کو سرانجام دینے میں تیرہ سو سال کے علماء اسلام اور فلاسفہ حکمت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ یہ کاوش ان کی پوری زندگی کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ضمنی طور پر بعض مسائل شریعت کو عقل کے ڈھانچے میں نہیں ڈھالا گیا۔ بلکہ جملہ مسائلِ شریعت کو باب در باب عقلی اور فطری استناد مہیا کیا گیا ہے۔ سو اس باب میں یہ کتاب اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے بڑی جامع

اور ضخیم کتاب ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی پانچ کتابوں میں جہاں یہ بحثیں کی ہیں۔ ان کتابوں کا موضوع مسائل شریعت کا فطری جائزہ نہیں سوائے ایک کتاب کے (اسلامی اصول کی فلاسفی) باقی سب کتابوں کے موضوع دوسرے ہیں۔ مرزا صاحب نے ان میں ضمناً یہ عقلی مباحث ذکر کئے ہیں کتابوں کے نام خود ان مختلف موضوعات کا پتہ دے رہے ہیں۔ کشتی نوح، دآریہ دھرم، برکات الدعاء، نسیم دعوت وغیرہ سو اس میں شک نہیں کہ کتاب اسرار شریعت اس موضوع کی ایک اصولی کتاب ہے اور مرزا صاحب کی کتابیں ضمناً کہیں کہیں ان عقلی مباحث کو لے آئی ہیں۔ اسرار شریعت تین جلدوں کی ایک ضخیم کتاب ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف کے کم از کم پندرہ بیس سال اس کتاب کی تالیف پر لگے ہوں گے۔ مؤلف نے اس کے سرورق پر لکھا ہے:-

> "یہ کتاب صرف میری طبع زاد یا خیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اسلام میں تیرہ سو سال سے اس زمانہ تک جو بڑے بڑے مشہور و معروف روحانی فلاسفر اور ربانی علماء کرام اسلام گزرے ہیں اکثر مسائل کے اسرار و فلاسفیاں ان کی تقاریر مقدسہ سے بھی اخذ کی گئی ہیں۔ الغرض اسلامی تائید کے لئے اردو زبان میں جامع و بے نظیر اس فن میں یہی ایک کتاب شائع ہوئی ہے اور اسلامی علوم کے اسرار بیان کرنے میں بحر محیط ہے۔"

اہل علم اور اہل قلم پر مخفی نہیں کہ تیرہ سو سال کے بڑے بڑے علماء کی کتابوں کو کھنگالنا' ان کے خلاصے نکالنا اور ان پر غور و فکر کرنا اور پھر انہیں اپنے الفاظ میں باب وار لانا اور تین ضخیم جلدوں پر ایک بحر محیط پیش کوئی ایسا کام نہیں جو چار پانچ سال کی پیداوار ہو۔ یہ عظیم کام پندرہ بیس سال سے کم کس طرح اس نہج پر ترتیب نہیں پا سکتا۔ مؤلف کی پوری زندگی کا حاصل ہے۔ اس کتاب کے اس مختصر تعارف کے بعد اب ہم چند انکشافات ہدیہ قارئین پیش کرتے ہیں:-

انکشاف نمبر ۱

مرزا غلام احمد کی وفات سنہ ۱۳۲۶ھ میں ۶۸ سال کی عمر میں ہوئی۔ اسرار شریعت سنہ ۱۳۲۷ھ میں شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مرزا غلام احمد کی زندگی میں ہی کتاب نے ترتیب پائی اور جونہی کتاب شائع ہوئی قادیانی سربراہ حکیم نورالدین نے بیس کتابوں کا آرڈر دیدیا اور اسے عام تقسیم کیا۔ قادیانیوں کی اس قسم کی کارروائی پتہ دیتی ہے کہ قادیانی علمی حلقے اس کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کتاب سے واقف تھے اور انہیں اس کی اشاعت کا شدید انتظار تھا ورنہ کسی کتاب کا اشتہار دیکھ کر انسان پہلے وہ کتاب منگاتا ہے اسے صحیح پائے تو مزید نسخوں کا آرڈر دیتا ہے۔ اسرار شریعت جلد دوم کے آخری صفحہ پر مؤلف مولوی محمد فضل خاں صاحب لکھتے ہیں:-

> "علامہ حکیم نورالدین صاحب امام فرقہ احمدیہ نے کتاب اسرار شریعت کا اشتہار دیکھتے ہی محض ازراہ امداد اسلامی بیس نسخے خریدنے کا خط خاکسار کو لکھا اور بعد طبع سالم قیمت پر بیس نسخے خرید

لیے ـــــ"

یہ خط کب لکھا گیا ؟ کتاب کی طباعت سے پہلے، کتاب چھپنے پر سالم قیمت پر بیس کتابیں خریدلی گئیں ـــ کتاب کب شائع ہوئی سنہ ۱۳۲۲ھ میں ـــ ظاہر ہے کہ یہ خط کتاب کے اشتہار پر ایک دو سال پہلے لکھا گیا ہوگا۔ اُن دِنوں کتابوں کے اِشتہار ان کی اشاعت سے کافی پہلے نکلتے تھے۔ خود مرزا غلام احمد کی کتاب براہینِ احمدیہ کا اشتہار اس کے چھپنے سے کتنا پہلے نکلا تھا۔؟ سو اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ حکیم نورالدین صاحب کا یہ خط خود مرزا صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور متبادر یہی ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے ایماء سے ہی لکھا گیا ہوگا۔ ہاں جس وقت مؤلف نے مذکورہ بالا نوٹ لکھا اس وقت حکیم نورالدین صاحب بیشک جماعت کے امام بن چکے تھے۔ اگر یہ خط واقعی مرزا صاحب کے ایما سے لکھا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ مرزا صاحب اس کتاب کی اشاعت سے پہلے اس سے اچھی طرح باخبر تھے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسودہ یا مؤلف کی بعض تحریرات خطوط کی شکل میں ان کی نظر سے گذری ہوں اور مؤلف نے ان کی علمی امداد کے لیے انہیں بھیجی ہوں۔

انکشاف نمبر ۲

حکیم نورالدین صاحب سے زیادہ کون مرزا غلام احمد کے قریب ہوگا اور ان سے زیادہ کس کی مرزا صاحب کی کتابوں پر نظر ہوگی ؟ انہوں نے کتاب اسرارِ شریعت اتنے شوق سے منگائی بھی اور پڑھائی بھی۔ اور اس میں بعض لمبے لمبے مضامین کو مرزا صاحب کی کتابوں سے لفظ بلفظ ملتے بھی پایا اور یہ بھی ملاحظہ کیا کہ مصنّف نے ان عبارات کے آگے مرزا صاحب کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ اِس پر حکیم نورالدین صاحب اور ان کے حلقے کے لوگ برابر خاموش رہے اور کسی نے یہ بات نہ اُٹھائی کہ اس کے بعض مندرجات مرزا صاحب کی پانچ کتابوں کے مندرجات سے ہوبہو ملتے ہیں۔ حکیم صاحب یا ان کے کسی ساتھی نے یہ آواز کیوں نہ اُٹھائی ـــ ؟ اور عقل کو گُم کر دینے والا اچنبا انکشاف آج نصف صدی بعد مولانا تھانویؒ کے خلاف ہو رہا ہے وہ اسی وقت مولوی محمد فضل خاں آف گوجر خاں کے خلاف کیوں نہ ہو سکا۔؟

اس کا ایک ہی جواب ہے جو قرینِ قیاس ہے وہ یہ کہ اس وقت مولوی محمد فضل خاں زندہ تھے جو اس بات پر واضح طور پر کہہ سکتے تھے کہ مرزا غلام احمد نے ان مضامین کا کسب فیض خود ان سے کیا ہے اور یہ کہ مرزا صاحب کی عادت تھی کہ اپنی کتابوں کے دَورانِ تصنیف وہ وقت کے دیگر اہلِ قلم سے علمی امداد لیتے رہتے تھے۔ اگر اس بات کے کھلنے کا ڈر نہ تھا تو بتلایئے حکیم نورالدین صاحب اور ان کے احباب اس پر بالکل خاموش کیوں رہے؟ اور پوری جماعت پون صدی تک اس پر خاموش کیوں رہی؟ ـــــ آئندہ ہم ان اقتباسات کو جو دوست محمد شاہد یا عبداللہ ایمن آبادی نے مرزا غلام احمد اور حضرۃ تھانویؒ کی عبارات کے تقابلی مطالعہ میں پیش کئے ہیں۔ مولوی محمد فضل خاں اور مرزا غلام احمد کی تقابلی عبارات میں پیش کریں گے

انکشاف نمبر ۳

یہ گمان نہ کیا جائے کہ مولوی محمد فضل خان نے ان مضامین پر مرزا غلام احمد کا حوالہ اس لئے نہ دیا ہوگا کہ عام لوگ ان کے مخالف نہ ہو جائیں۔ یہ وہ توجیہ ہے جو عبداللہ امین زئی نے حضرت تھانویؒ کے بارے میں اختیار کی ہے۔

امین زئی صاحب حضرت تھانویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”انہوں نے مرزا صاحب کی کتابوں کے صفحات نقل کرتے ہوئے ان کی کُتب کے حوالے کیوں درج نہیں کئے …… اگر حضرت تھانویؒ اپنی کتاب میں مرزا صاحب کا نام یا ان کی کسی کتاب کا نام درج کر دیتے تو متعصب اور تنگ نظر لوگ ان کی جان کے دشمن ہو جاتے اور ان کی کتاب کو نذرِ آتش کر دیتے۔“[۱]

ممکن ہے قادیانی مضمون نگار مولوی محمد فضل خاں کے بارے میں بھی یہی توجیہہ اختیار کریں۔ ہم جواباً عرض کریں گے۔ یہاں ایسا کوئی احتمال سرے سے نہیں ہے۔ مولوی محمد فضل خاں نے اس کتاب اسرارِ شریعت میں بعض مضامین مرزا غلام احمد کے دوسرے ساتھیوں سے لئے ہیں اور انہیں ان کا حوالہ دے کر اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ —— غلامی کی فلاسفی پر مولوی محمد علی لاہوری کا ایک پورا مضمون مصنف نے اپنی اس کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ ۲۶۵ پر دیا ہے جو صفحہ ۳۲۹ تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھا ہے:-

”حقیقت غلامی کا مضمون رسالہ ریویو آف ریلیجنز مؤلفہ علامہ مولوی محمد علی سے لیا گیا ہے۔“[۲]

مؤلف نے ایک مقام پر مرزا غلام احمد کا بھی نام لیا ہے اور انہیں ایسے الفاظ سے ذکر کیا ہے جسے دیندار مسلمان کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے لیکن مؤلف نے کسی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مرزا صاحب کا نام واضح طور پہ لیا ہے۔ حکیم نور الدین صاحب کا حوالہ بھی ایک جگہ دیا ہے[۳]۔ مرزا غلام احمد کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں:

”مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم اور ان کے حلقہ کے لوگ حضرت عیسےٰ کو فوت شدہ مانتے اور ان کے نزول بروزی و ظہور مہدی و خروج دجال کے قائل ہیں۔“[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے متعلق مؤلف مذکور جمہور مسلمانوں کے متفقہ عقیدہ کے خلاف واشگاف لفظوں میں لکھتا ہے اور اسے یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”درحقیقت یہ سیر کشفی تھا جو بیداری سے اشد درجہ پر مشابہ ہے …… یہ سیر اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا۔“[۲]

ان تصریحات کے ہوتے ہوئے اس احتمال کو قطعاً کوئی راہ نہیں کہ مؤلف نے عامۃ الناس کے دباؤ کے تحت ان اقتباسات کو مرزا صاحب کے نام سے نہ لکھا ہوگا —— حق یہ ہے کہ اس نے یہ مضامین مرزا

---

[۱] کمالات اشرفیہ ص۳۴۵، ص۳۴۶ [۲] اسرار شریعت جلد ۲ ص۳۲۹

[۳] اسرار شریعت جلد دوم ص۳۸۰

۲۷۴

صاحب کی کتابوں سے ہرگز نہیں لیے۔ نہ اسے دوسروں کی محنت کو اپنے نام سے پیش کرنے کا شوق تھا، اگر وہ مولوی محمد علی لاہوری کا مضمون اس کے نام سے پیش کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا تو مرزا صاحب کی باتیں ان کے نام سے پیش کرنے میں اسے کیا خوف محسوس ہو سکتا تھا۔ سو یہ واضح ہے کہ اس نے یہ عبارات مرزا صاحب سے چرائی ہیں

انکشاف نمبر ۴

ممکن ہے قادیانی کہیں کہ مرزا صاحب ملہم ربانی تھے اور مولوی محمد فضل خاں ایک عام مؤلف اور دونوں ایک زمانے کے تھے۔ سو قرین قیاس یہ ہے کہ مولوی محمد فضل خاں نے مرزا صاحب سے مضامین لیے ہوں نہ کہ مرزا صاحب نے مولوی محمد فضل خاں سے

جواباً گذارش ہے کہ مولوی محمد فضل خاں بھی اپنی جگہ مدعی الہام تھے اور اپنے آپ کو مرزا صاحب سے کم نہ سمجھتے تھے ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

> کئی ایام سے میں اسی مضمون بعث اخروی کو مرتب کر رہا ہوں، پرسوں دوپہر کے وقت لکھتے ہوئے مجھ پر نیند غالب آگئی اور بین النوم والیقظہ مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی جس کو میری روح اور جسم دونوں نے یکساں محسوس کیا اور مجھے معلوم ہوا، کہ حشر اجسام ضرور ہوگا اور قبر و حشر میں عذاب و ثواب روح و جسم دونوں پر وارد ہوگا...... لیکن اس اجمال کی تفصیل منکشف نہیں ہوئی۔[1]

مؤلف جب خود اس روحانی مقام کے مدعی ہیں کہ ایسی کیفیات ان پر اجمالاً منکشف ہوں تو ظاہر ہے کہ انہیں مرزا صاحب کی کتابوں سے ان اقتباسات کو بلا حوالہ لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی، سو قرین قیاس یہی ہے کہ خود مرزا صاحب نے ہی ان سے قلمی استفادہ کیا ہوگا۔ ورنہ انکی جماعت کے لوگ اسرار شریعت کے ان مندرجات پر ضرور سوال اٹھاتے۔

ایک سوال

یہ بات کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مولوی محمد فضل خاں کے قلمی مسودات سے یا ان کے خطوط سے یہ مضامین لیے ہوں تبھی لائق تسلیم ہو سکتی ہے کہ مرزا نے کبھی اپنی کتابوں کے دوران تالیف وقت کے دوسرے اہل علم سے مدد مانگی ہو اور انہیں کہا ہو کہ وہ اپنی کتابوں میں ان کے مضامین کو بھی حسب موقع جگہ دیں گے اور اس طرح اسلام کی ایک مشترکہ خدمت ہوگی۔

جواباً عرض ہے کہ ہاں مرزا غلام احمد کی واقعی عادت تھی کہ وہ وقت کے دیگر اہل علم سے علمی مدد مانگتے اور انہیں برملا کہتے کہ وہ اسے اپنی کتابوں میں حسب موقع جگہ دیں گے۔ سو یہ کیا ممکن نہیں کہ مرزا صاحب نے مولوی محمد فضل خانصاحب سے بھی اسی قسم کی مدد مانگی ہو اور یہ اقتباسات مولوی محمد فضل خاں کے ہوں جنہیں مرزا صاحب نے اپنی پانچ کتابوں میں حسب موقع پھیلا دیا ہے۔

انکشاف نمبر ۵

مرزا غلام احمد قادیانی کی عام عادت تھی کہ وہ اپنی کتابوں کے دوران تالیف وقت کے دوسرے اہل علم سے مدد مانگتے تھے۔ اس سلسلے میں ہم مرزا صاحب کے ہی

لہ اسرار شریعت جلد ۳ صہ ۳۲۶ ۲ہ ایضاً صلا ۲۶ ۳ہ ایضاً جلد ۳ صہ ۴۹۔

چند خطوط پیش کرتے ہیں جو انہوں نے مولوی چراغ علی صاحب (متوفی سنہ ۱۸۹۵ء) کو لکھے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سیکرٹری انجمن ترقی اردو بسلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان سنہ ۱۹۵۰ء میں چند ہم عصر کے نام سے مولوی چراغ علی صاحب کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

> "جس وقت ہم مولوی صاحب مرحوم کے حالات کی جستجو میں تھے تو ہمیں مولوی صاحب کے کاغذات میں سے چند خطوط مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم کے بھی ملے جو انہوں نے مولوی صاحب کو لکھے تھے اور اپنی مشہور اور پُرزور کتاب براہین احمدیہ کی تالیف میں مدد طلب کی تھی![ے]

مرزا غلام احمد قادیانی کے دوسروں سے کسبِ فیض کرنے کے بارے میں یہ ایک غیر جانبدار شہادت ہے مولوی عبدالحق صاحب کا مرزا غلام احمد کے نام کے ساتھ مرحوم لکھنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب قادیانی اختلافات میں جمہور علمائے اسلام کے ساتھ نہ تھے اور مرزا صاحب کی تکفیر نہ کرتے تھے۔ سو ان کی شہادت ایک غیر جانبدار شہادت ہے جسے تسلیم کیا جانا چاہیئے ممکن ہے اسی طرح کے خطوط مرزا صاحب نے مولوی محمد فضل خاں کو بھی لکھے ہوں۔

اب ہم یہاں مرزا صاحب کے چار خط نقل کرتے ہیں جو آپ نے مولوی چراغ علی صاحب کو لکھے معلوم نہیں اس قسم کے اور کتنے لا تعداد خطوط ہوں گے جو مرزا صاحب نے وقت کے دیگر اہل علم کو لکھے ہوں گے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا خط بنام مولوی چراغ علی صاحب؛

آپکا افتخار نامہ محبت آمود عز ورود دیا۔ اگرچہ پہلے سے مجھ کو بنیت الزام خصم اجتماع براہین قطعیہ اثبات نبوت وحقیقت قرآن شریف میں ایک عرصہ سے سرگرمی تھی مگر جناب کا ارشاد موجب گرمجوشی وباعث اشتعال شعلہ حمیت اسلام علی صاحبہ السلام ہوا اور موجب ازدیاد تقویت وتوسیع حوصلہ خیال کیا گیا کہ جب آپ سا اولوالعزم صاحب فضیلت دینی ودنیوی تہہ دل سے حامی ہو اور تائید دین حق میں دل گرمی کا اظہار فرماوے تو بلاشائبہ ریب اس کو تائید غیبی خیال کرنا چاہیئے۔ جزاکم اللہ نعم الجزاء۔

ماسوا اس کے اگر اب تک کچھ دلائل یا مضامین[لہ] آپ نے نتائج طبع عالی سے طبع فرمائے ہوں وہ بھی مرحمت ہوں ———

[ے] چند ہم عصر ص۴۶ انجمن پریس کراچی طبع سنہ ۱۹۵۰،

[لہ] مرزا صاحب یہاں وہ مضامین مانگ رہے ہیں جو کہیں چھپے ہوئے نہیں۔ مولوی صاحب کے اپنے طبعزاد اور انکی اپنی فکر کا نتیجہ ہوں، مرزا صاحب یہاں انہیں اپنے مضامین میں جگہ دینا چاہتے ہیں اسی طرح اگر مرزا صاحب نے مولوی محمد فضل خاں سے علمی مدد مانگی ہو یا ان کے قلمی مسودوں سے استفادہ کیا ہو تو یہ بالکل قرین قیاس ہے کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مرزا غلام احمد کا دُوسرا خط بنام مولوی چراغ علی صاحب

آپ کے مضمون اثبات نبوت کی میں نے انتظار کی پر اب تک نہ کوئی عنایت نامہ نہ مضمون پہنچا اس لئے آج مکرر تکلیف دیتا ہوں کہ براہ عنایت بزرگانہ بہت جلد مضمون اثبات حقانیت فرقان مجید تیار کر کے میرے پاس بھیج دیں اور میں نے بھی ایک کتاب جو دس حصہ پر مشتمل ہے تصنیف کی ہے اور نام اس کا براہین احمدیہ علیٰ حقانیت کتاب اللہ القرآن والنبوۃ المحمدیہ رکھا ہے اور صلاح یہ ہے کہ آپ کے فوائد جرائد بھی اس میں درج کروں اور اپنے محقر کلام کو ان سے زیب و زینت بخشوں سو اس امر میں آپ توقف نہ فرماویں اور جہاں تک جلد ہو سکے مجھ کو مضمون مبارک اپنے سے ممنون[1] فرماویں۔

مرزا غلام احمد کا ایک اور خط مولوی چراغ علی صاحب کے نام

—— (یہ خط ۱۹ فروری ۱۸۷۹ء کا ہے) ——

فرقان مجید کے الہامی اور کلام الٰہی ہونے کے ثبوت میں آپ کا مدد کرنا باعث ممنونی ہے نہ موجب ناگواری۔ میں نے بھی اسی بارہ میں ایک چھوٹا سا رسالہ تالیف کرنا شروع کیا ہے۔ خدا کے فضل سے یقین کرتا ہوں کہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائیگا۔ آپ کی اگر مرضی ہو تو وجوہات صداقت قرآن جو آپ کے دل پر القا ہوں[2] میرے پاس بھیج دیں تاکہ اسی رسالہ میں حسب موقع اندراج پا جائے یا سفیر ہند میں ...... لیکن جو براہین (جیسے معجزات وغیرہ) زمانہ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہوں ان کا تحریر کرنا ضروری نہیں کہ منقولات مخالف پر حجت قویہ نہیں آ سکتیں جو نفس الامر میں خوبی

---

[1] معلوم ہوا مرزا صاحب کی عادت تھی کہ وقت کے دوسرے اہل علم سے بذریعہ خط و کتابت علمی استفادہ کرتے تھے اور ان کے طبع زاد مضامین کو اپنی کتابوں میں جگہ دیتے تھے۔ مرزا صاحب کی کتابوں میں اسرار شریعت کے مضامین اسی قبیل سے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسروں کے مضامین کو اپنی کتابوں میں جگہ دینا اور انہیں اپنے "محقر کلام" میں ملا دینا، مرزا غلام احمد کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ——

[2] قرآن مجید کی صداقت پر مولوی چراغ علی کے دلائل اپنے رسالہ میں مختلف مواقع پر درج کرنا مرزا صاحب کے ذوقِ تصنیف کا پتہ دے رہا ہے مضامین القاء تو ہوں مولوی چراغ علی کے دل میں چھپیں مرزا غلام احمد کے نام سے سلطان القلم کا یہ عجیب ذوق تصنیف ہے۔

[3] دوسروں کے مضمونوں کا انتظار اور ان کی طلب میں یہ لجاجت اور عاجزی آج تک کسی ایسے شخص کے کلام میں نہیں دیکھی گئی جو آسمانی امامت کا مدعی اور الہامی علوم کا دعویدار ہو۔ مرزا صاحب کی یہ عاجزی یا وقت کے ان اہل علم کے سامنے ہوتی ہے جن سے انہیں علمی مدد ملتی ہو یا انگریزوں کے سامنے جن کے مراحم خسروانہ مرزا صاحب کے شامل حال ہوتے تھے۔

اور عمدگی کتاب اللہ میں پائی جائے یا جو عند العقل اس کی ضرورت ہو وہ دکھلانی چاہیئے۔ بہر صورت میں اس دن بہت خوش ہوں گا کہ جب میری نظر آپ کے مضمون پر پڑے گی آپ بمقتضاء اس کے کہ الکریم اذا وعد وفیٰ مضمون تحریر فرماویں۔ لیکن یہ کوشش کریں کہ حتی ما اتفق مجھ کو اس سے اطلاع ہو جائے۔

مرزا غلام احمد کا ایک خط بنام مولوی چراغ علی

—— (یہ خط ۱۰ مئی ۱۸۷۹ء کا ہے۔) ——

کتاب (براہین احمدیہ) ڈیڑھ سو جز ہے جس کی لاگت تخمیناً نو سو چالیس روپے ہے اور آپکی تحریر ملحق ہو کر اور بھی زیادہ ضخامت ہو جائے گی۔

مولوی عبدالحق صاحب ان خطوط کو نقل کرنے کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں اور یہ رائے ہماری سرائے کے بہت قریب ہے:

"ان تحریروں سے ایک بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نے مرزا صاحب مرحوم کو براہین احمدیہ کی تالیف میں بعض مضامین سے مدد دی ہے۔"[1]

اس انکشاف کے بعد اس بات کے جاننے میں کوئی دقت نہیں رہی کہ مولوی محمد فضل خان کے بعض مضامین شائع ہونے سے پہلے مرزا صاحب کی کتابوں میں کیسے آ گئے ——

حرمت خنزیر

مرزا صاحب حرمت خنزیر پر بحث کرتے ہوئے "اسلامی اصولوں کی فلاسفی" میں یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ حرمت خنزیر اسلام کی خصوصیات میں سے ہے جو پہلی شریعتوں میں نہ تھی (ملاحظہ ہو اسلامی اصولوں کی فلاسفی بحث حرمت خنزیر) حالانکہ قرآن شریف نے ہی خنزیر کو حرام قرار نہیں دیا اس سے پہلے توراۃ میں بھی اس کی حرمت بیان کی گئی تھی جس طرح مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی اصول کی فلاسفی دیکھو کہ خنزیر جیسے نجاست خور اور بے غیرت جانور کو حرام کیا گیا۔ یہودی بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصول تمہارے ہاں ہی کار فرما نہیں ہمارے ہاں بھی اسی طرح کار فرما ہے۔

توراۃ میں ہے "اور سور تمہارے لئے اسی سبب سے ناپاک ہے کہ اس کے پاؤں تو چرے ہوئے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا تم نہ ان کا گوشت کھانا نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگانا۔" (کتاب مقدس استثناء، باب ۱۴ آیت ۶، ۷، ۸)

---

[1] چند ہم عصر ص۵

ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسے وجوہ حرمت خنزیر میں تو ذکر کیا جا سکتا ہے تقابلی جلسہ مذاہب میں نہیں جلسہ مذاہب میں وہی بات ہوتی ہے جو اور کسی مذہب میں نہ ہو تاکہ اپنے مذہب کا امتیاز ظاہر کیا جا سکے معلوم نہیں مرزا غلام احمد قادیانی نے حرمت خنزیر کا یہ مسئلہ جلسہ مذاہب میں کیسے پیش کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں مضمون میں لکھ لیا گیا ہو۔ اور اسمیں اسرارِ شریعت سے استفادہ کیا گیا ہو۔

مرزا صاحب نے اسے جن الفاظ میں پیش کیا ہے اس میں عبارت کی غلطیاں ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے"

اسمیں اور کے بعد نیز کا لفظ لائق غور ہے اور کا بھی وہی معنی ہے جو نیز کا ہے۔ مرزا صاحب سے اس قسم کی غلطی عجیب فاش غلطی ہے۔ مرزا صاحب کے یہ الفاظ بھی ہم نے دیکھے ہیں۔

"غذاؤں کا بھی انسان کی رُوح پر اثر ہے"

ذہن اس طرف گیا کہ عبارت یوں ہونی چاہیئے روح پر اثر ہوتا ہے۔ مرزا غلام احمد کی اور تحریرات بھی ہم نے دیکھی ہیں۔ وہ صاحب قلم آدمی تھے اس قسم کی غلطیاں ان سے متصور نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت انہوں نے کسی اور صاحب قلم کے مسوّدہ سے لی ہے اور اسے اپنا بنانے کے لئے کہیں کہیں بدلا ہے اور اسی کوشش میں ان سے یہ غلطیاں ہوئی ہیں۔

مولوی محمد فضل خاں کی کتاب اسرارِ شریعت (جس کے مسوّدہ سے مرزا صاحب نے یہ مضامین لئے)	"مرزا غلام احمد کی اسلامی اصولوں کی فلاسفی"
اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، بے غیرت و دیوث ہے اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہو۔ کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلمہ ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی ہوگا۔ جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو	اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور رُوح پر پلید ہی ہو، کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑیگا جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا

بڑھاتا ہے۔ (اسرارِ شریعت جلد ۲ صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷) | ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۵)

یہ دونوں مصنف ایک دور کے ہیں جو مولانا تھانویؒ سے قریباً ربع صدی پہلے ہوئے۔ مولانا تھانویؒ نے جیسے وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھ گئے ہیں کہ انہوں نے بعض مضامین ایک کتاب سے لئے ہیں۔ یہ مضمون اسرارِ شریعت سے لیا ہے۔ خواہ مخواہ کہے جانا کہ انہوں نے یہ مضامین مرزا صاحب کی کتابوں سے ہی لئے ہیں منہ زوری اور سینہ زوری سے زیادہ کچھ وزن نہیں رکھتا۔ اسرارِ شریعت میں اور نیز کے الفاظ نہیں۔ مولانا تھانویؒ کی عبارت میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں ان کی عبارت اسرارِ شریعت کے مطابق ہے اس میں ہے:

"کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی انسان کی رُوح پر ضرور ہوتا ہے۔" صفحہ ۲۳۶

مولانا تھانویؒ کی عبارت بھی یہی ہے لیکن مرزا صاحب نے اسے اس طرح لکھا ہے:

"کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہے۔"

اب آپ ہی یہ فیصلہ کریں کہ حضرت تھانویؒ نے یہ اقتباس اسرارِ شریعت سے لیا ہوگا یا مرزا غلام احمد کی کتابوں سے اور عبداللہ امین زئی کی اس غلط بیانی کی بھی دل کھول کر داد دیں۔

دیکھیے "مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ ہم ثابت کر چکے ہیں حضرت تھانویؒ نے ان الفاظ کو اس طرح تبدیل کر دیا ہے کہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلم ہے۔ دیکھیے کیا یہ الفاظ اسرارِ شریعت کے نہیں؟ اب امین زئی صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت تھانویؒ نے یہ الفاظ بدلے ہیں کس قدر کھلا جھوٹ ہے۔ جو قادیانیوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

اسرارِ شریعت کی عبارت اصل معلوم ہوتی ہے مباحثہ عقلیہ میں اپنے خیالات اور نتائج فکر سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ یہاں امورِ مسلمہ پیش کئے جاتے ہیں۔ مولوی محمد فضل خاں کا یہ کہنا کہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلم ہے۔ ایک وزن رکھتا ہے اور مرزا صاحب کا یہ کہنا کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں۔ یہ محض ان کا ایک اپنا نتیجہ فکر ہے جس کی عام مباحث عقلیہ میں جگہ نہیں ہو سکتی۔

دونوں عبارتوں کو غور سے دیکھو دونوں میں زیادہ صحیح اور موقعہ کے مطابق اسرارِ شریعت کی عبارت ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے یہی اصل عبارت ہے۔ مرزا غلام احمد کی عبارت اس میں چند غلطیاں ملا کر مرتب ہوئی ہے، اسرارِ شریعت کا مرزا صاحب کی وفات کے ایک سال بعد چھپنا اس سے اس احتمال کی نفی نہیں ہوتی کہ مرزا صاحب کی نظر سے اسرارِ شریعت کے کچھ حصے بصورت مسودہ بطریق خط و کتابت نہ گذرے ہوں گے خصوصاً جب کہ مؤلف اسرارِ شریعت قادیان سے بہت قریب کا تعلق رکھتے تھے۔ دونوں عبارتیں خود بول رہی ہیں کہ اصل کونسی عبارت ہوگی۔ پھر کس نے کس سے لیا ہوگا۔

مرزا صاحب نے اس عبارت میں ایک اور بے ڈھب اضافہ کیا ہے اور وہ قانونِ قدرت کے الفاظ ہیں ان پر غور کیجیے:

اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن پر پلید ہو۔ یہ عبارت اسرارِ شریعت میں ان خط کشیدہ الفاظ کے بغیر ہے اور حضرۃ تھانویؒ کی کتاب میں بھی اسی طرح ہے مگر مرزا غلام احمد کی عبارت میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ آپ ان الفاظ پر غور کریں اور ان کے بغیر عبارت کو آگے پیچھے سے پڑھ کر دیکھیں کہ یہ الفاظ جلی طور پر زائد اور بعد میں ملے ہوئے معلوم ہوں گے۔

ایک پڑھا لکھا آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ اسرارِ شریعت کی عبارت یقیناً پہلے کی ہے۔ گو چھپی بعد میں ہو اور مرزا صاحب کی عبارت اس میں چند غلطیوں کا اضافہ ہے گو وہ چھپی پہلے ہو اور مرزا صاحب نے اس کے مسودات سے اکتسابِ فیض کیا ہو جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ وہ معاصر اہلِ قلم سے علمی امداد لیا کرتے تھے۔

کچھ بھی ہو یہ کوئی علمی معارف یا قرآن کریم کی کوئی عمیق تفسیریں نہیں جو ان مصنفین پر ہی کھلی ہوں بلکہ وہ باتیں جو ان دونوں نے قبل از اسلام کے یونانی طبیبوں سے لی ہیں اور دونوں عبارات میں اس کا واضح اعتراف موجود ہے۔ اب اگر حضرۃ تھانویؒ نے بھی یہ عبارات اسرارِ شریعت سے لے لیں تو اس میں کیا اعتراض ہے یہ وہ باتیں ہیں جو کافروں سے بھی لی جا سکتی ہیں اور اس پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں یہ حضرۃ تھانویؒ کا کمالِ دیانت ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں صاف لکھ دیا کہ انہوں نے بعض مضامین ایک کتاب سے لئے ہیں۔

عبداللہ امین زئی کا ایک اور جھوٹ

امین زئی صاحب حضرۃ مولانا تھانویؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> "اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں جو لٹریچر تخلیق ہوا، اور بڑے بڑے علماء و مفسرین نے اس مسئلے پر جو کچھ لکھا وہ سب حضرۃ تھانویؒ کی نظر میں تھا، مگر انہوں نے یہ سارا سرمایہ معرفت ایک طرف رکھ دیا اور مرزا صاحب نے اپنی کتاب میں حرمت خنزیر کے جو اسباب بیان کئے تھے وہ اپنی کتاب میں نقل کر دیئے۔[لہ]

امین زئی صاحب نے خط کشیدہ الفاظ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مولانا نے اس موضوع پر پہلے لکھے گئے لٹریچر کو بالکل درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور مرزا صاحب کی عبارت کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ ہم نے حضرۃ تھانویؒ کی کتاب پھر اس مقام سے دیکھی۔ آپ نے اسرارِ شریعت کی عبارت نقل کرنے کے بعد اس موضوع پر پھر اور مواد بھی فراہم کیا ہے اور اسرارِ شریعت کی عبارت میں جو کمی رہ گئی تھی اسے دیگر مصنفین کی عبارات سے پُر کیا ہے بقول امین زئی صاحب اسے یوں سمجھئے کہ مرزا صاحب کی عبارت میں جو کمی رہ گئی تھی وہ حضرۃ تھانویؒ نے

[لہ] کمالات اشرفیہ ص

مخزن الادویہ سے پوری کی ہے۔ حضرۃ تھانوی ؒ لکھتے ہیں:۔

صاحب مخزن الادویہ "فساد گوشت خوک (خنزیر)" اور اس کی حرمت کے وجوہ ذیل تحریر کرتے ہوئے ظاہر فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرتِ انسانی کے برخلاف ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"گوشت خوک مولد خلط غلیظ است و مورث حرص شدید و صداع مزمن و دار الفیل و اوجاع مفاصل و فساد عقل و زوال مروت و غیرت و حمیت و باعث فحش است و اکثرے از فرق غیر اسلامی آزا مے خورند و قبل ظہور نور اسلام گوشت آں را در بازار مے فروختند و بعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع و موقوف گردید بسیار کثیف و بدہیبت است۔"

نیز اس کا گوشت کھانے سے انسان پر فوراً سوداوی امراض حملہ آور ہوتے ہیں[1]

ناظرین غور فرمائیں کہ حضرۃ تھانوی ؒ نے دوسروں کی تحقیقات کیا یکسر نظر انداز کی ہیں یا انہیں بھی اپنی اس کتاب میں نقل کیا ہے۔

تاثیر دعا،

مولوی محمد فضل خان نے اسرار شریعت میں حقیقت دعا و قضا پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور بات اس طرح واضح کی ہے گویا وہ اصولی طور پر دعا، و قضا کی حقیقت سمجھا رہے ہیں۔ مرزا غلام احمد کا اس موضوع پر سر سید احمد خاں سے واسطہ پڑا تھا۔ آپ نے اپنی عمومی بحث ترک کر کے سرسید کو مخاطب بنایا ہے۔ اسرار شریعت مباحث نقلیہ کے موضوع کی ایک اصولی کتاب ہے اور ایسی کتابوں کا پیرایہ بیان عام ہوتا ہے ایسی کتابوں میں خاص افراد سے خطاب نہیں ہوتا۔ اب آپ دونوں کتابوں کو دیکھیں اور خود فیصلہ کریں کہ اصل عبارت کونسی ہوگی اور اسے کس نے بدل کر اپنے خاص موضوع میں پیش کیا ہوگا۔ کچھ بھی ہو حضرۃ تھانوی ؒ نے یہ عبارت اسرار شریعت سے لی ہیں اور یہ بات ان کے دیئے حوالے کے عین مطابق ہے۔ مرزا صاحب کی کتابوں سے انہوں نے انہیں نقل نہیں کیا۔

اسرار شریعت مولوی محمد فضل خاں	برکات الدعاء مرزا غلام احمد
اگرچہ دنیا کی کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں تاہم	اگرچہ دُنیا کا کوئی خیر و شر مقدر سے خالی نہیں تاہم قدرت
قدرت نے اس کے حصول کیلئے اسباب مقرر کر رکھے	نے اس کے حصول کیلئے ایسے اسباب مقرر کر رکھے
ہیں جن کے صحیح اور سچے اثر میں کسی عقل مند کو کلام نہیں	ہیں جن کے صحیح اور سچے اثر میں کسی عقلمند کو کلام نہیں
مثلاً اگرچہ مقدر پر لحاظ کر کے دوا کا کرنا نہ کرنا در حقیقت	مثلاً اگر مقدر کا لحاظ کر کے دوا کا کرنا نہ کرنا در حقیقت
ایسا ہی ہے جیسا کہ دعا یا ترک دعا مگر کیا کوئی یہ رائے	ایسا ہی ہے جیسا کہ دعا، یا ترک دُعا۔ مگر کیا سید
ظاہر کر سکتا ہے کہ مثلاً علم طب سراسر باطل ہے اور	صاحب یہ رائے ظاہر کر سکتے ہیں کہ مثلاً علم طب

---

[1] المصالح العقلیہ۔

حکیم حقیقی نے دواؤں میں کچھ بھی اثر نہیں رکھا جب کہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تربد اور سقمونیا اور سنا اور حب الملوک میں تو ایسا قوی اثر رکھے کہ ان کی پوری خوراک کھانے کے ساتھ ہی دست چھوٹ جاتے ہیں یا مثلاً سمُ الفار اور بیش اور دوسری ہلاہل زہروں میں وہ غضب کی تاثیر ڈالدی کہ ان کا کامل قدر شربت چند منٹوں میں ہی اس جہان سے رخصت کر دے تو پھر کیونکر یہ امید کی جائے کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدوں کی توجہ اور عقد ہمت اور تضرع کی بھری ہوئی دعاؤں کو فقط مُردہ کی طرح رہنے دے جن میں ایک ذرہ بھی اثر نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نظامِ الٰہی میں اختلاف ہو اور وہ ارادہ جو خدا تعالیٰ نے دواؤں میں اپنے بندوں کی بھلائی کیلئے کیا تھا وہ دواؤں میں مرعی نہ ہو۔ جو شخص دواؤں کی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہ رکھتا ہو اور استجابت دعا کا قائل نہ ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک مدت تک ایک پرانی اور سال خوردہ اور مسلوب القویٰ دوا کو استعمال کرے اور پھر اس کو بے اثر پا کر اس دوا پر عام حکم لگا دے کہ اس میں کچھ بھی تاثیر نہیں۔ (جلد اول صفحہ ۲۲۵)

سراسر باطل ہے اور حکیم حقیقی نے دواؤں میں کچھ بھی اثر نہیں رکھا...... خدا تعالیٰ اس بات پر تو قادر تھا کہ تربد اور سقمونیا اور سنا اور حب الملوک میں تو ایسا قوی اثر رکھیں کہ ان کی پوری خوراک کھانے کے ساتھ ہی دست چھوٹ جائیں یا مثلاً سم الفار اور بیش اور دوسری ہلاہل زہروں میں وہ غضب کی تاثیر ڈال دی کہ ان کا کامل قدر شربت چند منٹوں میں ہی اس جہان سے رخصت کر دے لیکن اپنے برگزیدوں کی توجہ اور عقد ہمت اور تضرع کی بھری ہوئی دعاؤں کو فقط مُردہ کی طرح رہنے دے جن میں ایک ذرہ بھی اثر نہ ہو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نظامِ الٰہی میں اختلاف ہو اور وہ ارادہ جو خدا تعالیٰ نے دواؤں میں اپنے بندوں کی بھلائی کے لئے کیا تھا وہ دعاؤں میں مرعی نہ ہو۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں جو خود سید صاحب دعاؤں کی حقیقی فلاسفی سے بے خبر ہیں اور انکی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہیں رکھتے اور انکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک مدت تک ایک پرانی اور سال خوردہ مسلوب القویٰ دوا کو استعمال کرے اور پھر اسکو بے اثر پا کر اس دوا پر عام حکم لگا دے کہ اس میں کچھ بھی تاثیر نہیں۔

(برکات الدعا صفحہ ۳)

دونوں عبارتوں کے آخری خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اسرارِ شریعت کی عبارت میں کاتب کی غلطی سے دُعا کی بجائے دَوا کا لفظ لکھا گیا جبکہ مرزا صاحب کی عبارت میں لفظ دُعا لکھا ہوا ہے۔ اسرارِ شریعت کی عبارت اگر مرزا صاحب کی کتاب سے ماخوذ ہوتی تو اس میں یہ غلطی نہ ہوتی اس قسم کی غلطیاں عام طور پر پہلی تحریر میں ہی ہیں اور زیادہ تر وہیں ہوتی ہیں جہاں کاتب قلمی مسودوں سے لکھ رہے ہوں غلطیوں کی اصلاح بعد میں ہوتی ہے مرزا غلام احمد کی عبارت اصلاح شدہ ہے اور اس میں اسرارِ شریعت کے کتابت شدہ مسودہ کو بھی درست کیا گیا ہے —— حقیقت حال کچھ بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ حضرۃ تھانویؒ نے مرزا غلام احمد کی پانچ کتابو

سے عبارات نہیں لیں۔ جیسا کہ امین زئی صاحب کا دعویٰ ہے بلکہ ایک کتاب سے لی ہیں۔ اور وہ اسرارِ شریعت ہے جس میں مرزا صاحب کی پانچوں کتابوں کی زیرِ بحث عبارات موجود ہیں۔ اس میں کوئی شخص اختلاف کرے کہ ان دو میں سے پہلا لکھنے والا کون ہے۔ بیشک اسے اس اختلاف کا حق ہے ہم اس میں دخل نہیں دیتے۔ اپنی رائے ہم نے عرض کر دی ہے لیکن یہ بات ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مرزا غلام احمد کی کتابوں سے کوئی عبارت نہیں لی۔ اسی ایک کتاب سے آپ نے یہ عبارت لی ہیں اور آپ نے اسی کا حوالہ دیا ہے۔

نمازِ پنجگانہ کی عقلی حکمتیں

اسرارِ شریعت مولوی محمد فضل خاں	کشتی نوح مرزا غلام احمد
الغرض پنجگانہ نمازیں کیا ہیں وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے۔ تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ	پنجگانہ نمازیں کیا چیز ہیں وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے۔ تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیر ہیں
تغیر ہیں جو تم پر وارد ہوتے اور تمہاری فطرت کے لئے ان کا وارد ہونا ضروری ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے پہلے جب کہ تم مطلع کئے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہو یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلی اور خوش حالی میں خلل ڈالا کیونکہ اس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہوا۔ اس کے مقابل پر نماز ظہر متعین ہوئی جس کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے (اسرارِ شریعت ج ۱۔ ص۱۲۰)	جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں اور تمہاری فطرت کے لئے ان کا وارد ہونا ضروری ہے (۱) پہلے جب کہ تم مطلع کئے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہوا یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلی اور خوشحالی میں خلل ڈالا سو یہ حالت زوال کے وقت سے مشابہ ہے کیونکہ اس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہوا۔ اس کے مقابل نماز ظہر متعین ہوئی جس کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہوتا ہے (کشتی نوح ص۴۳، ۴۴)

مرزا صاحب کی عبارت میں ان الفاظ پر غور کیجیے:-

" تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیر ہیں جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں "

بلا کے وقت کے یہ الفاظ اسرارِ شریعت کے نہیں ہیں۔ اسرارِ شریعت میں پنجگانہ نمازوں کا جو نقشہ دیا گیا ہے اس میں پانچویں نماز (نماز فجر) کو بلا کا وقت نہیں نجات کا وقت بتلایا گیا ہے۔ چار وقت بلا کے تھے اور یہ پانچواں نجات کا۔ مرزا صاحب نے بھی پانچویں نماز کو نجات کا وقت بیان کیا ہے سو یہ عبارت کہ پانچ تغیر بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں بعد میں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے سیاق و سباق سے ملتی عبارت وہی ہے جو اسرارِ شریعت میں دی گئی ہے۔ مرزا صاحب نے اس نقل کرنے میں جو اضافے کئے سب زائد عبارتیں معلوم ہوتی ہیں۔

مولوی محمد فضل خان صاحب نے اس کے بعد اپنی تائید میں کچھ ارشاداتِ نبوی اور بعض اطباء کے اقوال بھی درج کئے ہیں انہیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث اور اقوال مولوی صاحب کے مضمون کا جزو ہیں مرزا صاحب کی کتاب میں یہ موجود نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنی کتاب کشتی نوح میں اسرارِ شریعت کے مسودے سے حسبِ خواہش تلخیص کی ہے۔ مرزا صاحب نے اسرارِ شریعت کی جو عبارت چھوڑ دی ہے اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال کی ساعت کی نسبت فرمایا ہے کہ اس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اس وقت میرا کوئی عمل آسمان کی طرف صعود کرے فرمایا رات کے

فرشتوں سے پہلے دن کے فرشتے آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور دن کے فرشتوں سے پہلے رات کے فرشتے صعود کرتے ہیں۔

اس وقت کے تغیرات کے آثار جو جسمِ انسانی پر ظاہر ہوتے ہیں طبیبوں نے اپنی طبی کتابوں میں بیان فرمائے ہیں چنانچہ مفرح القلوب شرح قانونچہ میں لکھا ہے ..... الخ (ص ۱۰)

اب عبد اللہ امین زئی کی ان سطور پر بھی غور کرو جب خدا کا خوف نہ رہے تو انسان اس قسم کے جھوٹ سے بھی پرہیز نہیں کرتا۔ امین زئی صاحب لکھتے ہیں:۔

"بیان کردہ حکمتیں حضرت تھانوی کو اس قدر پسند آئیں کہ لفظ بہ لفظ اپنی کتاب میں نقل فرما دیں البتہ اتنا کیا کہ مرزا صاحب کی بیان کردہ حکمتوں کی مزید تشریح کے لئے ارشاداتِ نبوی، شرح وقایہ اور اطباء کے اقوال درج کر دیئے" (کمالات اشرفیہ ص ۱۶)

اسرارِ شریعت کی وہ عبارات جو مرزا صاحب نے چھوڑ دیں ان میں واقعی کچھ ارشاداتِ نبوی اور کچھ اقوالِ اطباء موجود ہیں۔ حضرت تھانوی کی عبارت میں بھی یہ ارشاداتِ نبوی اور اقوالِ اطباء موجود ہیں۔ اس سے یہ حقیقت نصف النہار کی طرح عیاں ہے کہ حضرت تھانوی نے یہ مضامین اسرارِ شریعت سے لئے ہیں نہ کہ مرزا صاحب کی کتابوں سے ——— اسرارِ شریعت اور المصالح العقلیہ کی عبارات ایک دوسرے کے مطابق ہیں اور مرزا غلام احمد کی تلخیص کچھ مختلف ہے۔ دونوں (مولوی محمد فضل خان اور حضرۃ مولانا تھانویؒ) کی عبارت میں وہ پورے مضامین موجود ہیں۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ حکیم الامۃ حضرۃ تھانویؒ نے یہ مضامین مرزا غلام احمد کی کتابوں سے لئے ہیں۔ امین زئی صاحب نے غلط کہا ہے کہ مولانا تھانویؒ نے شرح وقایہ اور اطباء کے اقوال درج کئے ہیں۔ اقوالِ اطباء اسرارِ شریعت سے ماخوذ ہیں اور شرح وقایہ کا تو اس عبارت میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں معلوم نہیں امین زئی صاحب کو اس میں شرح وقایہ کا نام لانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ شرح قانونچہ کو شرح (وقایہ) پڑھتے رہے ہوں۔

نماز عصر کی بحث میں ایمن زئی صاحب نے حضرت مولانا تھانویؒ کی عبارت کو مرزا صاحب کی عبارت کے بالمقابل نقل کرتے ہوئے معلوم نہیں یہ فقرہ کیوں حذف کر دیا ہے۔

صریح نظر آتا ہے کہ اب غروب نزدیک ہے جس سے اپنے کمالات کے زوال کے احتمال قریب پر استدلال کرنا چاہیئے۔ اس روحانی حالت کے مقابل نماز عصر مقرر ہوئی (کمالات اشرفیہ ص۱۸۰)

ایمن زئی صاحب نے خط کشیدہ فقرہ شاید اس لئے حذف کر دیا ہے کہ یہ عبارت مرزا صاحب کی عبارت کے مقابل بالکل وہی دکھائی دے اور وہ کہہ سکیں کہ حضرت تھانویؒ نے لفظ بلفظ مرزا صاحب سے نقل کی ہے اسلئے اس فقرے کا حذف کرنا ضروری تھا۔

اسرار شریعت	کشتی نوح
خدا تعالیٰ نے تمہارے فطری تغیرات میں پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کی ہیں اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدے کیلئے ہیں۔ پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچتے رہو تو پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہارے اندرونی اور روحانی تغیرات کا ظل ہیں۔ نمازیں آنیوالی بلاؤں کا علاج ہیں تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کسی قسم کی قضا و قدر تمہارے لئے لائے گا پس تم قبل اس کے جو دن چڑھے اپنے مولا کی جناب میں تضرع کرو کہ تمہارے لئے خیر و برکت کا دن چڑھے۔ (خاتم اولیا اسرار شریعت جلد ۱ ص۱۰۶)	اور خدا نے تمہارے فطری تغیرات میں پانچ حالتیں دیکھ کر پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کیں اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدے کے لئے ہیں پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچے رہو تو پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہارے اندرونی اور روحانی تغیرات کا ظل ہیں۔ نمازیں آنیوالی بلاؤں کا علاج ہیں' تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کس قسم کی قضا و قدر تمہارے لئے لائے گا۔ پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولا کی جناب میں تضرع کرو کہ تمہارے لئے خیر و برکت کا دن چڑھے۔ (کشتی نوح ص۶۵)

ان دونوں عبارتوں میں اختلاف الفاظ کا جائزہ لیجئے۔ انسانی زندگی کے یہ پانچ تغیرات ہی اس کی پانچ حالتیں جن میں پانچ نمازیں مقرر کی گئی ہیں۔ تغیر حالت بدلنے کو ہی کہتے ہیں اور یہ پانچ تغیرات پانچ حالتیں ہی ہیں۔ پانچ تغیرات میں پانچ حالتیں بالکل بے معنی بات ہے۔

اسرار شریعت میں ہے: خدا تعالیٰ نے تمہارے فطری تغیرات میں پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کی ہیں ص۱۰۶

اور مرزا غلام احمد کی عبارت یہ ہے:-

خدا نے تمہارے فطری تغیرات میں پانچ حالتیں دیکھ کر پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کیں۔ کشتی نوح ص۶۵

یہاں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ اصل عبارت کونسی ہے اور نقل کونسی۔ فطری تغیرات میں پانچ حالتیں وہی کہہ سکتا ہے جو تغیر کے معنی حالت بدلنا نہ جانے۔ اصل عبارت اپنی جگہ پوری طرح واضح اور صحیح ہے اور مرزا صاحب کی عبارت

واقعی ایک بدلی عبارت معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح اس عبارت کے آخری حصہ میں مرزا غلام احمد کے الفاظ "پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولیٰ کی جناب میں تفرع کرو" کا مولوی محمد فضل خاں کے الفاظ "بس تم قبل اس کے جو دن چڑھے اپنے مولیٰ کی جناب میں تفرع کرو" سے مقابلہ کرو لفظ تم کو مقدم لانے میں جو زور ہے وہ پچھلی عبارت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ مرزا صاحب کی عبارت اسی میں ایک تبدیلی معلوم ہوتی ہے۔

پھر اس فقرہ کو اس کے سیاق میں دیکھئے:۔

"نمازیں آنے والی بلاؤں کا علاج ہیں۔" اسرارِ شریعت

اور مرزا غلام احمد کے اس فقرہ پر بھی غور کیجئے "نمازوں میں آنے والی بلاؤں کا علاج ہے" جس سیاق و سباق میں اس مضمون پر بحث کی گئی ہے وہ مختلف حالتوں کا بیان ہے اس کے پیشِ نظر اسرارِ شریعت کا فقرہ صاف طور پر نظر آرہا ہے اور مرزا صاحب کا پیرایہ یہاں وہ وزن نہیں رکھتا معلوم ہوتا ہے وہ نماز کی تعریف کر رہے ہیں پنجگانہ نمازوں کی تعریف نہیں کر رہے۔ حالانکہ موضوع وہی تھا۔ سو بات وہی صحیح ہے جو اسرارِ شریعت کے مصنف نے کہی کہ نمازیں آنے والی بلاؤں کا علاج ہیں۔

مولوی محمد فضل خاں نے جہاں اس بات کو ختم کیا ہے وہاں خاتم اولیاء کا حوالہ دیا ہے۔ مرزا غلام احمد نے جہاں یہ بات ختم کی ہے وہاں کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ مولوی محمد فضل خان نے یہ مضمون خاتم اولیاء سے لیا ہے۔ مرزا صاحب سے نہیں۔ افسوس کہ مرزا صاحب نے اسے خاتم اولیاء یا اسرار شریعت کا حوالہ دیئے بغیر نقل کیا ہے۔

صورت حال کچھ بھی ہو یہ ہمارا اصل موضوع نہیں ہاں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرۃ مولانا تھانویؒ نے عبارت زیرِ بحث اسرارِ شریعت سے لی ہے۔ مرزا غلام احمد کی کتاب کشتیٔ نوح سے نہیں۔ اختلافِ الفاظ میں مولانا تھانوی کی عبارت اسرارِ شریعت کے موافق ہے کشتیٔ نوح کے موافق نہیں۔ اس تقابلی مطالعہ سے دوست محمد شاہد یا امین زئی صاحب کا یہ دعویٰ کہ مولانا تھانویؒ نے یہ عبارت مرزا غلام احمد کی کتابوں سے ہی لی ہیں اعلانیہ طور پر غلط ٹھہرتا ہے۔

قویٰ انسانی کا استعمال

عبداللہ امین زئی نے کمالاتِ اشرفیہ ص۳۰ پر یہ عنوان قائم کیا ہے اور لکھا ہے:۔

> حضرت مولانا تھانویؒ اپنی کتاب کے لئے اس موضوع پر غور و فکر و مطالعہ فرما رہے تھے۔ تلاش و تحقیق کے دوران مرزا صاحب کی کتاب نسیمِ دعوت انہیں ملی۔ انہوں نے یہ کتاب پڑھی اور محسوس کیا کہ انسانی قویٰ کے استعمال کے جو طریقے مرزا صاحب نے قرآن شریف پر تدبر کرنے کے بعد

بیان کئے ہیں ان سے بہترین نکات بیان نہیں کئے جاسکتے چنانچہ انہوں نے مرزا صاحب کی کتاب کا اقتباس پسند فرمایا اور اپنی کتاب کو اس سے آراستہ فرمایا[1] ص ۲

سابقہ الزامات کی طرح یہ الزام بھی بالکل بے وزن ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے مرزا صاحب کی کتاب سے یہ اقتباس لیا نہ اس سے اپنی اس کتاب کو آراستہ کیا۔ یہ مضمون بھی آپ نے اس کتاب (اسرار شریعت) سے لیا ہے جس کا آپ نے اپنی اس کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا تھا۔ یہی عبارت نہیں۔ حضرت تھانویؒ نے پچھلے کئی عنوانات سے اس کتاب کے مضامین آگے لا رہے ہیں ہم دونوں کے عنوانات درج ذیل کرتے ہیں:

(۱) برتن میں مکھی پڑنے سے اس کو اس میں ڈوبا دے کر نکالنے کی وجہ۔ اسرار شریعت جلد ۲ ص ۳۶۶
(۲) پانی اور برتن میں سانس لینا و پھونکنا منع ہونے کی وجہ۔ " " ص ۳۶
(۳) انسان کیلئے گوشت کھانا کیوں جائز ہوا؟ " " ص ۳۶۹
(۴) گوشت و ترکاری کھانے سے انسان کے روحانی اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ " " ص ۳۶۹
(۵) انسان میں قوت غضبیہ و حلم وغیرہ کی حکمت۔ " " ص ۳۷۰

حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب کے عنوانات بھی یہی ہیں:-

(۱) برتن میں مکھی پڑنے سے اس کو اس میں غوطہ دے کر نکالنے کی وجہ۔ احکام اسلام عقل کی نظر میں ص ۲۲۰
(۲) پانی اور برتن میں سانس لینا و پھونکنا منع ہونے کی وجہ " " ص ۲۲۰
(۳) انسان کیلئے گوشت کھانا کیوں جائز ہوا؟ " " ص ۲۲۱
(۴) گوشت ترکاریاں کھانے سے انسان کے روحانی اخلاق کیسے پیدا ہوتے ہیں " " ص ۲۲۲
(۵) انسان میں قوت غضبیہ و حلم وغیرہ کی حکمت ص ۲۲۳

آپ نے دیکھا یہ عنوانات کس طرح ہو بہو ایک دوسرے کے مطابق آرہے ہیں۔ پانچویں نمبر کا عنوان ہے جس کے تحت وہ عبارت درج ہے جسے امین زئی صاحب مرزا صاحب کی کتاب سے لیا گیا اقتباس کہہ رہے ہیں جب حضرۃ تھانویؒ کے پچھلے چار عنوانات اسرار شریعت سے منطبق چلے آرہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب کا موضوع نہیں تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضرۃ نے یہ مضامین اسرار شریعت سے لئے ہیں نہ کہ غلام احمد سے اور امین زئی صاحب کا یہ کہنا کہ مرزا غلام احمد صاحب کی کتاب سے لئے ہیں، ہمیں کسی طرح کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ پھر ان دونوں کتابوں (مولوی محمد فضل خاں اور حضرت تھانویؒ کی کتابوں) کے مذکورہ پانچویں عنوان کو جو مناسبت ان کے چوتھے عنوان سے ہے وہ بتا رہی ہے کہ مولوی محمد فضل خاں کا یہ مضمون اپنے ماقبل سے مسلسل اور مربوط ہے اور یہ صورت اس بات کی شاہد ہے کہ یہ مضمون اسرار شریعت میں اصل ہے نسیم دعوت میں نہیں۔ اب اسے مرزا صاحب کی کتاب نسیم دعوت میں دیکھئے انہوں نے یہاں کوئی ایسے عنوانات نہیں

---

[1] کمالات اشرفیہ

ذیئے البتہ پیرا بندی ضرور کی ہے جو ایک مضمون کو دوسرے سے جُدا کرتی ہے ہم ان پیراجات کے ابتدائی الفاظ درج کرتے ہیں:۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہم نے اس جگہ انجیل کی تعلیم کا ذکر نہیں کیا — نسیم دعوت ص۶
علاوہ اس کے یہ بھی سخت غلطی ہے کہ انجیل کی تعلیم کو کامل کہا جائے — " " ص۱۱
اب دیکھو اس آیت میں دونوں پہلوؤں کی رعایت رکھی گئی ہے۔ — " " ص۴۲
اب ہم آریہ مذہب میں کلام کرتے ہیں — " " ص۴۲

وہ عبارت جو اسرارِ شریعت اور حضرت تھانویؒ کی کتاب میں مشترک ہے وہ مرزا صاحب کے مندرجہ بالا پیراجات میں سے دوسرے کے تحت دی گئی ہے کہ "یہ بھی سخت غلطی ہے کہ انجیل کی تعلیم کو کامل کہا جائے۔"

اب جو شخص ان تینوں کتابوں کو دیکھے اسے اس یقین سے چارہ نہ رہے گا کہ حضرت تھانویؒ کی کتاب ان کے عنوانات اور سیاق و سباق اسرارِ شریعت سے ملتے جلتے ہیں نہ کہ مرزا صاحب کی کتاب نسیم دعوت سے۔

اب عبداللہ امین زئی کے کہنے پر کیسے باور کر لیا جائے کہ حضرت تھانویؒ نے مضمون زیرِ بحث مرزا صاحب کی کتاب نسیم دعوت سے لیا ہے۔

پھر مرزا صاحب کی عبارت میں یہ جملہ بھی لائقِ غور ہے:۔

اگر انسان میں خدا نے ایک قوتِ حلم اور نرمی اور درگذر اور صبر کی رکھی ہے تو اسی خدا نے اس میں ایک قوتِ غضب اور خواہشِ انتقام کی بھی رکھی ہے (کمالات اشرفیہ ص۲۱)

اب اسے حضرت تھانویؒ کی کتاب میں بھی دیکھئے:۔

اگر خدا نے انسان میں ایک قوت علم اور نرمی اور درگذر اور صبر..... الخ (از کمالاتِ اشرفیہ ص۲۱)

اب آیئے دیکھیں کہ یہ جملہ اسرارِ شریعت میں کس طرح ہے پھر آپ ہی فیصلہ کریں کہ حضرت تھانویؒ نے اسے اسرارِ شریعت سے لیا ہے یا نسیم دعوت۔ اسرارِ شریعت میں یہ جملہ اس طرح ہے۔

اگر خدا نے انسان میں ایک قوتِ حلم اور نرمی اور درگذر اور صبر کی رکھی ہے۔ اسرارِ شریعت ص۲۷

اب بھی کیا کسی پڑھے لکھے آدمی کو یہ کہنے کی ہمت ہے کہ حضرت تھانویؒ نے مرزا صاحب کی کتاب نسیم دعوت سے یہ اقتباس لیا ہوگا۔

جہاں تک اسرارِ شریعت اور نسیم دعوت کے تقابلی مطالعہ کا تعلق ہے اسرارِ شریعت کی عبارت اپنے محل اور سیاق و سباق میں خوب چسپاں دکھائی دیتی ہے اور ذہن گواہی دیتا ہے کہ اصل عبارت یہیں کی ہے اور مرزا صاحب نے اسے جس محل میں سمویا ہے وہاں اسے تکلف سے چسپاں کیا گیا ہے۔ پس اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ مرزا صاحب نے اسرارِ شریعت کے مسودے سے کسی نہ کسی طرح استفادہ ضرور کیا ہے۔

پھر امین زئی صاحب نے کمالاتِ اشرفیہ ص۲۲ پر مرزا صاحب کا ایک نو سطری اقتباس درج کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ :-

"مرزا صاحب کی جو عبارت حضرت تھانویؒ نے حذف کر دی ہے وہ یہ ہے۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص۲۲)

جواباً عرض ہے کہ یہ نو سطریں اسرارِ شریعت میں جہاں سے حضرت تھانویؒ یہ عبارت لے رہے ہیں نہیں ہیں وہاں عبارت اسی طرح ہے جیسے حضرت تھانویؒ نے پیش کیا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ امین زئی صاحب اقرار کریں کہ حضرت تھانویؒ نے واقعی مرزا صاحب کی نسیم دعوت سے یہ اقتباس نہیں لیا۔ اُلٹا یہ دعوے کر رہے ہیں کہ حضرت تھانویؒ نے ان نو سطروں کو حذف کر دیا ہے انہیں اگر یہ الزام کسی پر لگانا ہی تھا تو مولوی محمد فضل خان صاحب پر لگاتے نہ کہ حضرۃ تھانویؒ پر۔ امین زئی صاحب کی اس جسارت پر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ ..

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

پردہ کی حکمتیں

اسرارِ شریعت جلد دوم ص۲۴۲ پر مولوی محمد فضل خان صاحب نے یہ عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت لکھا ہے۔

مستورات و مردوں کیلئے اسلامی پردہ کے وجوہات

پردہ کے متعلق اسلام نے مرد و عورت کے لئے ایسے ایسے اصول بتائے جن کی پابندی سے انکی عفت و عزت پر حرف نہ آئے وہ بدی کے ارتکاب سے محفوظ اور مصئون رہیں چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ..... الخ

یہاں مولوی محمد فضل خان صاحب نے سورۃ النور بنی اسرائیل اور الحدید کی آیتیں دی ہیں اور ان کا ترجمہ کیا ہے حضرت تھانویؒ نے ان آیات کا ترجمہ اسی مؤلف سے لے کر اپنی کتاب کے ص۱۶۶ اور ص۱۶۷ میں دیا ہے جس کا دل چاہے دونوں کتابوں اسرارِ شریعت اور احکامِ اسلام کا تقابلی مطالعہ کر کے دیکھ لے۔

افسوس کہ امین زئی صاحب نے یہاں بھی وہی بات ہانکی ہے اور اسی لکیر پہ چلے ہیں کہ حضرت تھانویؒ نے ان آیات کا ترجمہ مرزا صاحب کی کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی کے ص۲۵ سے لیا ہے اور اسی پر لکھا ہے :-

"اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت تھانویؒ مرزا صاحب کے ترجمے کو مستند سمجھتے تھے۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص۲۹)

امین زئی صاحب کو سوچنا چاہیئے تھا کہ حضرت تھانویؒ تو خود مترجم قرآن اور مفسر قرآن ہیں کیا وہ یہاں اپنا ترجمہ بآسانی نہ دے سکتے تھے لیکن مضمون چونکہ وہ اسرارِ شریعت سے لے رہے تھے اور اس کا وہ اجمالی حوالہ بھی دے چکے تھے اس لئے انہوں نے ان آیات کا ترجمہ بھی اسی مؤلف سے لے لیا۔ اب ایسی خواہ مخواہ مرزا صاحب

کو لاحل کرنا کہ ہو نہ ہو مولانا تھانویؒ نے یہ ترجمہ مرزا صاحب سے ہی لیا ہے سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟

مولوی محمد فضل خاں نے ان آیات کے ترجمہ اور تشریح کے بعد لکھا ہے:-

اسرارِ شریعت مولوی محمد فضل خاں	اسلامی اصول کی فلاسفی - مرزا صاحب
ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ دوسرا، کانوں کو نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا۔ نامحرموں کے قصے سننا اور ایسی تمام تقریبوں سے جن میں اس فعل بد کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا۔ اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام ہی سے خاص ہے اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوت کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا۔ ......" الخ	ان آیات میں خدا تعالیٰ نے احصان یعنی عفت حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ اپنے تئیں پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ دوسرا کانوں کو نامحرموں کی آواز سے سننے سے بچانا، نامحرموں کے قصے سننا اور ایسی تمام تقریبوں سے جن میں اس فعل بد کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا۔ اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔ اس جگہ ہم بڑے دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام ہی سے خاص ہے اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوت کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا۔ ...... الخ"
اسرارِ شریعت جلد ۲ صـ ۲۲۵، ۲۲۶	اسلامی اصول کی فلاسفی صـ ۲۹ صـ ۳۰

ان دونوں عبارتوں میں خط کشیدہ فقرات کے سوا کوئی فرق نہیں۔ اب آیئے حضرۃ تھانویؒ کی کتاب سے اس عبارت کو لیں یہ "احکام اسلام عقل کی نظر میں" کے صـ ۱۹۸ میں درج ہے اور اس میں یہ خط کشیدہ فقرے درج نہیں ہیں اس کی عبارت اسرارِ شریعت کے مطابق ہے۔ اب اس یقین سے چارہ نہیں کہ حضرت تھانویؒ نے یہ اقتباسات مرزا غلام احمد کی کتاب سے ہرگز نہیں لئے۔

رہی یہ بات کہ اسرارِ شریعت کے مؤلف نے مرزا غلام احمد سے یہ مضامین لئے ہیں یا مرزا صاحب نے اسرارِ شریعت کے مسودہ سے استفادہ کیا ہے اس سلسلہ میں ان دو عبارتوں پر مزید غور فرما دیں۔

اسرارِ شریعت	اسلامی اصول کی فلاسفی
سو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ	سو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں

کارروائیوں کا موقع بھی نہ ملے اور ایسی کوئی بھی تقریب
پیش نہ آوے جس سے بدخطرات جنبش کر سکیں۔
اسلامی پردہ کا یہی راز ہے اور یہی ہدایت شرعی
ہے خدا کی کتاب میں پردہ سے یہ مراد نہیں کہ فقط عورتوں
کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے ....

اور ہر ایک پرہیز گار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا
ہے اس کو نہ چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے
بے محابا نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرے۔

(اسرار شریعت جلد ۲ ص۲۹۶)

کا بھی موقع بھی نہ ملے اور ایسی کوئی بھی تقریب پیش نہ
آوے جس سے بدخطرات جنبش کر سکیں۔
اسلامی پردہ کا یہی راز ہے اور یہی ہدایت شرعی ہے
خدا کی کتاب میں پردہ سے یہ مراد نہیں کہ فقط عورتوں
کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے ....

اور ہر ایک پرہیز گار جو دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کو
نہ چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا
نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۳۱)

حضرت مولانا تھانویؒ نے "احکام اسلام عقل کی نظر میں" کے ص۲۹۶ پر اسرار شریعت سے اقتباس لیتے ہوئے خط کشیدہ سطور نہیں لیں اور آگے یہاں سے مضمون لے لیا ہے۔

اور ہر ایک پرہیز گار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے ...... الخ

اب امین زئی صاحب کی ہوشیاری دیکھئے آپ نے کمالاتِ اشرفیہ کے ص۳۱ پر یہ بات ثابت کرنے کے لئے کہ مولانا تھانویؒ اور مرزا صاحب کی عبارت ہو بہو ایک ہیں مرزا صاحب کی عبارت نقل کرتے ہوئے یہ چھ سطریں حذف کر دی ہیں۔ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے اس قسم کی کتر و بیونت کیا کسی خدا پرست کو زیب دیتی ہے۔ اس بحث میں مرزا غلام احمد کی اس عبارت پر غور کریں۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ اپنے تئیں پاکدامن رکھنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۳۰)

یہاں اپنے تئیں سے خدا کی ذات مراد نہیں تو اور کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تئیں پاکدامن رکھنے کے لئے کیا کسی علاج کی ضرورت ہے؟ سو اصل عبارت وہی ہوگی جو اسرار شریعت کی ہے:۔

"ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ انسان کو پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج بھی بتلا دیئے" (اسرار شریعت جلد ۲ ص۲۹۶)

ان دونوں عبارتوں کو پھر سے دیکھو اور یہ معلوم کرو کہ اصل عبارت اور صحیح بات کونسی ہوگی اور کس نے بات کو بگاڑا ہوگا۔

اس بات سے امین زئی صاحب بے خبر نہ تھے آپ نے کمالات اشرفیہ کے ص۲۹ پر مرزا غلام احمد کی عبارت نقل کرتے ہوئے یہ اپنے تئیں کے الفاظ اسرار شریعت کے الفاظ سے بدل دیئے ہیں۔ اصلاح نری بات

نہیں لیکن اس عبارت کو مرزا غلام احمد کے نام سے پیش کرنا اگر خیانت نہیں تو اور کیا ہے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار

نکاح وطلاق کا فلسفہ

امین زبی صاحب کمالات اشرفیہ کے صہ ۳۳ پر لکھتے ہیں:۔

> مرزا صاحب اپنی کتاب آریہ دھرم میں نکاح اور طلاق کی حکمتوں پر بحث کر چکے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس سے استفادہ کیا۔

اب آئیے اس باب میں بھی اسرارِ شریعت اور آریہ دھرم کا تقابلی مطالعہ کریں۔

اسرارِ شریعت	آریہ دھرم
واضح ہو مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے جسمیں مَرد کی طرف سے مہر اور تعہد نان ونفقہ اور اسلام اور حسنِ معاشرت شرط ہے اور عورت کی طرف سے عفت اور پاکدامنی اور نیک چلنی اور فرمانبرداری شرائط ضروریہ میں سے ہے اور جیسا کہ دوسرے معاہدے شرائط کے ٹوٹ جانے سے قابلِ فسخ ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی یہ معاہدہ بھی شرطوں کے ٹوٹنے کے بعد قابلِ فسخ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جسم تو اسی وقت سے تیرا جسم نہیں رہا جبکہ تُو نے اس کو کاٹ کر پھینک دیا۔	مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مَرد کی طرف سے مہر اور تعہد نان ونفقہ اور اسلام اور حسنِ معاشرت شرط ہے اور عورت کی طرف سے عفت اور پاکدامنی اور نیک چلنی اور فرمانبرداری شرائط ضروری میں سے ہے اور جیسا کہ دوسرے معاہدے شرائط کے ٹوٹ جانے سے قابلِ فسخ ہو جاتے ہیں ایسا ہی یہ معاہدہ بھی شرطوں کے ٹوٹنے کے بعد قابلِ فسخ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ جسم تو اسی وقت سے تیرا جسم نہیں رہا جبکہ تُو نے اس کو کاٹ کر پھینک دیا۔
اسرارِ شریعت جلد دوم صہ ۱۸۷ و ۱۸۸	آریہ دھرم صہ ۳۴ صہ ۳۵ مطبوعہ ۱۹۰۳ء

اسرارِ شریعت کی اس عبارت میں اور آریہ دھرم کی اس عبارت میں لفظ ہم کا فرق ہے۔ دونوں کتابوں سے اس جملہ کو لیجیے:۔

مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بداثر نہیں پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی کی منکوحہ ہو کر...... الخ (اسرارِ شریعت جلد ۲ صہ ۱۸۸)

مطلقہ کی حرکات سے شخص طلاق دہندہ پر کوئی بداثر نہیں پہنچتا یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں .... الخ آریہ دھرم صہ ۳۴

دونوں عبارتوں میں ہم کا لفظ فارق ہے اسی طرح اسرارِ شریعت کی عبارت واضح ہو کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے جبکہ آریہ دھرم کی یہ عبارت اس سے شروع نہیں ہوتی۔

اب آیئے دیکھیں کہ حضرت تھانویؒ کی عبارت میں واضح ہو اور ہم کے الفاظ ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو انہوں نے یہ عبارت اسرارِ شریعت سے لی ہے ورنہ آریہ دھرم سے۔

احکام اسلام عقل کی نظر میں میں یہ عبارت ص۱۵۴ سے شروع ہو کر ص۱۵۵ تک چلی گئی ہے۔ یہاں شروع میں واضح ہو کے الفاظ بھی موجود ہیں اور درمیانِ عبارت میں ہم کا لفظ بھی نہیں جو مرزا صاحب کی عبارت میں تھا۔

سو امین زئی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حضرت تھانویؒ نے آریہ دھرم سے ہی یہ اقتباس لیا ہے کسی طرح بھی لائق پذیرائی نہیں اور حضرت تھانویؒ پر یہ ایک بہتان ہے۔

(نوٹ) مرزا غلام احمد نے حسب دعویٰ خویش یہ مضمون ایک ہندو عورت رام دئی سے لیا ہے آرم دھرم ص۳۲ پر لکھتے ہیں:-

> پھر رام دئی نے پنڈت کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا تھا کہ یہ جو تُو نے کہا کہ آریوں میں نیوگ ایسا ہے جیسا کہ مسلمانوں میں طلاق۔ اس سے معلوم ہوا کہ تم اس گند کو کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتے...... بھلا پنڈت جی طلاق کو نیوگ سے کیا مناسبت اور نیوگ کو طلاق سے کیا نسبت۔ مسلمان ہمارے پڑوسی ہیں اور اس بات کو ہم خوب جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مرد کی طرف سے مہر تعہد نان و نفقہ اور اسلام اور حسن معاشرت شرط ہے۔ (آریہ دھرم ص۳۲)

مرزا غلام احمد نے یہ قرآنی معارف رام دئی سے لیے ہیں۔ یہ اس وقت زیر بحث نہیں لیکن ایک عام مطالعہ کنندہ یہاں یہ سوال اٹھائے بغیر نہیں —— ...... —— کہ ادھر بات تو طلاق یا نیوگ کی ہو رہی تھی اور وہی زیر بحث تھے۔ مرزا صاحب یہ نکاح کی بحث یہاں کہاں سے لے آئے؟ دونوں مضمونوں میں کوئی قریب کا ربط نہیں سیاق مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ عبارت کسی اور جگہ کی تھی جو مرزا صاحب نے خواہ مخواہ رام دئی کے الفاظ سے یہاں جوڑ دی ہے۔ اسرارِ شریعت میں جہاں یہ مضمون شروع ہوتا "مسلمانوں میں نکاح ایک معاہدہ ہے ..... الخ" وہاں اس سے پہلے واضح ہو کے الفاظ موجود ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت اصلاً یہیں کی تھی جو مسودے سے لے کر آریہ دھرم میں نقل کر دی گئی۔

روح کا قبر سے تعلق

عبداللہ امین زئی نے کمالات اشرفیہ میں اس عنوان پر بھی مرزا صاحب اور حضرۃ مولانا تھانویؒ کی عبارات نقل کی ہیں ہم اس سلسلہ میں بھی اسرارِ شریعت سے عبارت نقل کرتے ہیں۔ مؤلف نے جلد ۳ ص۲۲۶ پر یہ سرخی قائم کی ہے "قبور سے تعلق ارواح کی حقیقت" ہم اس موضوع کی آخری بحث یہاں نقل کرتے ہیں

اور اس کے مقابل مرزا صاحب کی عبارت پیش کرتے ہیں:۔

اسرارِ شریعت	مرزا غلام احمد
ہم اپنے ذاتی تجربے گواہ ہیں کہ روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے۔ روح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔ (اسرارِ شریعت جلد ۳ ص۲۲۹)	ہم اپنے ذاتی تجربے گواہ ہیں کہ روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے۔ رُوح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے، جہاں اس کے لئے ایک مقام مِلتا ہے۔ (آریہ دھرم ص۳)

امین زئی صاحب نے ص۳۸ سے لے کر ص۴۲ تک مرزا صاحب اور حضرۃ تھانویؒ کی عبارات ایک دوسرے کے سامنے درج کی ہیں ہم بھی مرزا صاحب کی ان عبارات کو اسرارِ شریعت کے بالمقابل درج کر سکتے ہیں لیکن بات طویل ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسرارِ شریعت میں یہ عبارات ص۲۲۶ سے لے کر ص۲۲۹ تک پھیلی ہوئی ہیں اور یہ وہی عبارتیں ہیں جو امین زئی صاحب نے مرزا غلام احمد کے نام سے نقل کر کے حضرۃ تھانویؒ کو ان سے استفادہ کرنے والا بتایا ہے۔

ہم دونوں کتابوں سے ایک دو جُملے نقل کئے دیتے ہیں:۔

دو جُداگانہ مزوں سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری پس اگر حسِ لسان ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا فیصلہ کوئی کیا کرے گا۔ (اسرارِ شریعت جلد ۳ ص۲۲۸)

اب مرزا غلام احمد کی عبارت بھی دیکھئے:۔

دو جُداگانہ مزوں سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری لیکن اگر حسِ لسان ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا فیصلہ کوئی کرے گا۔ (الحکم ۲۳ جنوری)

پھر یہ فرق بھی ملحوظ رہے۔

غرض روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ (اسرارِ شریعت جلد ۳ ص۲۲۹)

روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ از مرزا غلام احمد۔ (کمالات اشرفیہ ص۴۲)

اب آیئے دیکھیں کہ حضرۃ تھانویؒ کی عبارت میں لفظ پس ہے یا لیکن اور آخری عبارت کے شروع میں غرض کا لفظ ہے یا نہیں۔

احکام اسلام عقل کی روشنی میں کے ص۲۶۳ پر پہلا جُملہ یوں ہے۔

پس اگر کسی میں حسِ لسانی ہی نہیں تو نمکین اور شیریں کا وہ کیا فیصلہ کرے گا۔

اسی طرح آخری عبارت میں بھی لفظ غرض موجود ہے جو بتا رہا ہے کہ حضرت تھانویؒ کے سامنے اسرارِ شریعت

تھی نہ کہ مرزا غلام احمد کی کوئی کتاب ـــــ رہی یہ بات کہ پھر اس آخری عبارت کے شروع میں جو جملہ ہے کہ "ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں" اس کا مطلب کیا ہوگا؟ یہ تو مرزا صاحب کی بات معلوم ہوئی جو الہامات کے مدعی تھے کیا مولوی محمد فضل خان بھی اسی قسم کے تجربات کے مدعی تھے؟

جواباً عرض ہے ہاں! مولوی فضل محمد خاں بھی بیشک اس قسم کے تجربات کے مدعی تھے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

بین النوم والیقظہ مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی جس کو میری روح اور جسم دونوں نے یکساں محسوس کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ حشر اجسام ضرور ہوگا۔ (اسرار شریعت جلد ۳ ص۴۹)

سنہ ۱۳۲۸ھ کی شب کو میں نے رویا دیکھا ..... آدمیوں کی شکل میں ملائکہ بھی کھڑے ہوئے دیکھے اور میرے خیال میں آیا کہ وہ قضاء و قدر کے ملائکہ ہیں .... (اسرار شریعت جلد ۲ ص۱۵۳)

کیا اب بھی کوئی عاقل شخص اس فقرے کو کہ "ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں" مرزا صاحب کے ساتھ خاص کر سکے گا، حقیقت حال آپ کے سامنے آچکی اب اس پر امین زئی صاحب کا تبصرہ بھی سُنیئے:-

"یہاں تک حضرت تھانویؒ نے مرزا صاحب کی عبارتیں بلا تکلف نقل فرما دیں مگر اس کے بعد مرزا صاحب نے ایک جملہ لکھا تھا وہ حذف کر دیا یہ جملہ اس طرح تھا:-

"ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں کہ رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔"

اس مقام پر پہنچ کر حضرت تھانویؒ کی دیانتداری اور راست بازی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے یہ الفاظ چھوڑ دیئے کیونکہ انہیں اس قسم کا دعویٰ نہ تھا اور نہ وہ کشفِ قبور کے معاملے میں صاحبِ تجربہ تھے۔ انہوں نے ایک غلط دعویٰ کر کے اپنے دامن صداقت کو داغدار کرنے سے محفوظ رکھا"

(کمالاتِ اشرفیہ ص۴۴)

ہم نے جب یہ ذاتی تجربہ رکھنے والی عبارت اسرارِ شریعت جلد ۳ ص۴۹ سطر ۹ میں دیکھی تو مرزا غلام احمد کے اس قسم کے تجربات کا دعویٰ اور زیادہ کمزور نظر آیا۔ ہم نے بار بار سوچا کہ مرزا صاحب اسے اپنا ذاتی تجربہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ پہلے کبھی مرے بھی تھے اور ان کی روح کا تعلق ان کی قبر سے قائم ہوا ہوگا؟ ان کا کوئی اندھا معتقد اس بات کو مان لے تو مان لے لیکن ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تحریر سے پہلے کبھی مرے نہ تھے اور نہ ان کی روح کا ان کی قبر سے کوئی ایسا تعلق قائم ہوا تھا جس کی گواہی وہ اپنے ذاتی تجربہ سے دے رہے ہیں۔

اس پر ہمیں مرزا صاحب کا ایک ایسا تجربہ یاد آیا اسے بھی ملاحظہ کیجیے، مرزا صاحب لکھتے ہیں:-

"راقم کو تجربہ ہے کہ اکثر پلید طبع اور سخت گندے اور ناپاک اور بے شرم اور خدا سے نہ ڈرنے والے اور حرام کھانے والے فاسق و فاجر بھی سچی خوابیں دیکھ لیتے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ ص۴۸)

مرزا صاحب اسے اپنا تجربہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ واقعی ان صفات کے حامل تھے جو انہوں نے ذکر کی ہیں؟ مرزا صاحب کو اگر یہ دعویٰ تھا کہ وہ سچی خوابیں دیکھتے ہیں تو کیا وہ اس تمہید کے بغیر یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے؟ ان کی سیرت لوگوں کے سامنے کیا ایسی ہی تھی کہ اس کے بغیر کوئی ان کے اس دعوے کو سننے کے لئے تیار نہ تھا؟

یہ تجربہ کہ روح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ مولوی محمد فضل خاں کا تھا انہوں نے اسرار شریعت میں اسے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"بین النوم والیقظہ مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی جس کو میری روح اور جسم دونوں نے یکساں قبول کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ حشر اجسام ضرور ہوگا اور قبر و حشر میں عذاب و ثواب روح و جسم دونوں پر وارد ہوگا ——" (اسرار شریعت جلد ۳ ص ۴۹)

مرزا غلام احمد کے پورے لٹریچر میں ان کا کوئی اس قسم کا تجربہ یا مشاہدہ مذکور نہیں سو یہ بات اصل میں مولوی محمد فضل خاں صاحب کی تھی حضرت تھانویؒ نے اگر اس جملے کو حذف کیا ہے تو اسرار شریعت کی عبارت سے حذف کیا ہے نہ کہ مرزا غلام احمد کی عبارت سے۔ اور یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح روشن ہے کہ حضرت تھانویؒ نے یہ مضامین زیر بحث اسرار شریعت سے لئے ہیں نہ کہ مرزا غلام احمد کی کتابوں سے —— اور یہ بات حضرت تھانویؒ اپنے کتاب کے مقدمہ میں لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے یہ مضامین ایک کتاب سے لئے ہیں جو تمام رطب و یابس اور غث وسمین سے پُر ہے[لہ] ...... احقر نے غایت بے تعصبی سے اسی سے بہت سے مضامین کتاب مذکورہ بالا سے بھی جو کہ موصوف بصحت تھے لے لئے ہیں۔

قادیانی حضرات اگر شروع سے ہی اس کتاب کی طرف رجوع کرتے اور حضرت تھانویؒ کی اس بات پر یقین کرتے کہ یہ مضامین انہوں نے واقعی ایک ایسی کتاب سے لے لئے ہیں تو یہ بات اتنا طول نہ پکڑتی نہ عبداللہ ایمن زئی صاحب کو "کمالات اشرفیہ" لکھنی پڑتی مگر افسوس کہ دوست محمد قادیانی اور ان کے دوسرے مضمون نگاروں نے حضرت تھانویؒ کی عبارات ان کے مقدمہ میں دیئے گئے اس حوالے کے بغیر نقل کر کے مسلمانوں کو نہیں خود اپنے آدمیوں کو بھی ایک بڑا مغالطہ دیا ہے۔ ایمن زئی صاحب نے اسے مذہبی دنیا میں ایک زلزلہ کہا اور اسے عقل گم کر دینے والے انکشافات قرار دیا اور یہ نہ سوچا کہ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ جیسا جلیل القدر اور ثقہ عالم جو کروڑوں مسلمانوں کا مرشد اور روحانی پیشوا ہو وہ مرزا غلام احمد کی کتابوں سے کس طرح ان اقتباسات کو لے سکتا تھا۔

ہم نے ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کی ۲۹ جولائی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں قادیانیوں کی اس خیانت پر نوٹس لیا اور دوست محمد شاہد اور ان کے دوسرے رفقاء سے مطالبہ کرتے رہے کہ وہ اپنی اس علمی خیانت کی برسرعام معافی مانگیں مگر افسوس کہ انہوں نے حقیقت حال کا نہ اعتراف کیا اور نہ اپنے اس الزام سے رجوع کیا

[لہ] احکام اسلام عقل کی روشنی میں صہ ۲۶

کہ حضرۃ تھانویؒ نے یہ اقتباسات مرزا غلام احمد کی کتابوں سے ہی لئے ہیں (معاذاللہ)

حوالہ دینے کی اصُولی ذمّہ داری ،

حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ صراحت کی کہ انہوں نے بعض مضامین ایک کتاب سے لئے ہیں محض اس لئے کردی کہ وہ دوسروں کے الفاظ کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہ کرتے تھے اور یہ بات بھی ان کے پیشِ نظر ہوگی کہ کوئی شخص ان پر سرقہ کا الزام نہ لگائے لیکن آپ نے جو اس مصنّف (مولوی محمد فضل خان) کا نام نہیں لیا اس کا مقصد محض اسے مزید رسوائی سے بچانا تھا۔ اس پر بعض دوسرے حلقوں نے سوال اٹھایا کہ اصولی طور پر کس قدر حوالہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ حوالہ پوری تفصیل سے دیا جائے ؟

جواباً گذارش ہے کہ مصنف کا نام بتانا صرف افضل ہے کسی درجے میں ضروری نہیں۔ جامع ازھر کے کلیہ اصول الدین کے استاذ عبدالوھاب عبداللطیف جنہوں نے تدریب الراوی پر تحقیقی کام کیا ہے ایک مقام پر لکھتے ہیں :۔

قال الشوکانی و داب المصنفین الاخذ من کتب من سبقھم نعم الافضل ان یعزو القول لصاحبه ترجمہ :۔ مصنفین کا عام دستور سلف کی کتابوں سے استفادہ ہے البتہ بہتر یہی ہے کہ ہر قول کی نسبت اصل قائل کی طرف جائے۔

امام سیوطیؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام الفارق بین المؤلف والسارق ہے اپنی عبارت میں پہلی عبارت سے تھوڑا سا فرق بھی آجائے تو علماء اسے پہلوؤں کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ امام سیوطیؒ جو اجتہاد مقید کے درجہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ علامہ زین الدین العراقی، علامہ زرکشی، شیخ بلقینی کی عبارات کی عبارات تدریب الراوی میں لاتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ حوالہ نہیں دیتے اور پہلے اجمالی حوالوں پر ہی اکتفا کرلی جاتی ہے۔

الاستاذ عبدالوھاب ایک مقام پہ لکھتے ہیں :۔

وتری ایضاً فی تدریب الراوی فانه یلخص فیه بعض عبارات الزین العراقی والزرکشی والبلقینی وتارۃ لا یعزو ذلك الی احد منھم لعدم اخذہ بالنص (مقدمہ تدریب ص ۴۲)

ترجمہ :۔ تدریب الراوی میں علامہ عراقی زرکشی اور بلقینی کی عبارات کی تلخیص نظر آئے گی اور بعض اوقات علامہ سیوطیؒ اس کی تصریح بھی نہیں فرماتے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اہلِ علم پر مخفی نہیں کہ حوالہ جس درجہ میں دیا جائے اس کا احترام ضروری ہے۔ حضرت تھانویؒ نے جو اجمالی حوالہ دیا ہے وہ کافی ہے اور اسے خُفیۃً چھپا کر اخذ و اقتباس اور سرقہ و اختلاس کی کوشش کرنا اہلِ علم کا طریق نہیں۔

◆

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی افکار

حضرت مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب۔ کراچی

⁂

حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر شعبے میں جو عظیم خدمات لیں اُن کی نظیر ماضی کی کئی صدیوں میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی دینی ضرورت کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا کوئی مفصل یا مختصر کام موجود نہ ہو، حضرتؒ کی تصانیف، مواعظ اور ملفوظات اپنے دور کی دینی ضروریات پر مشتمل ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دین کی تعلیمات کو انہوں نے کسی نہ کسی شکل سے واضح کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔

اس وقت میرے پیشِ نظر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے سیاسی افکار کی تشریح و توضیح ہے۔ اگرچہ حضرتؒ کی شخصیت کسی بھی حیثیت سے کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھی اور نہ سیاست آپ کا خصوصی موضوع تھا، لہٰذا آپ کی کوئی تصنیف خالصتاً سیاست کے موضوع پر موجود نہیں ہے لیکن چونکہ اسلام کے احکام دین کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست سے بھی متعلق ہیں اس لیے اسلامی احکام کی تشریح و وضاحت کے ضمن میں حضرتؒ نے اسلام کے سیاسی احکام پر بھی اپنی تصانیف اور مواعظ و ملفوظات میں مختصر مگر جامع بحثیں فرمائی ہیں جن میں اسلامی احکام کی توضیح کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کے دوسرے سیاسی نظاموں اور سیاست کے میدان میں پائی جانے والی فکری اور عملی

گمراہیوں پر بھی بھرپور تبصرے شامل ہیں۔ اس مقالے میں انہی بحثوں کا ایک ایسا مطالعہ مقصود ہے جس کے ذریعے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے بیان کے مطابق سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک واضح تصور ابھر کر سامنے آسکے۔

آج کی دنیا میں جو سیاسی نظام عملاً قائم ہیں ان کے دیے ہوئے تصورات لوگوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ اُن کے اثرات سے اپنی سوچ کو آزاد کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ان سیاسی نظاموں نے کچھ چیزوں کو اچھا اور کچھ کو بُرا قرار دے کر اپنے ان نظریات کا پروپیگنڈا اتنی شدت کے ساتھ کیا ہے کہ لوگ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اول تو اس لیے کہ پروپیگنڈے کی مہیب طاقتوں نے ذہن ہی ایسے بنا دیئے ہیں کہ انہوں نے ان نظریات کو ایک مسلّم سچائی کے طور پر قبول کر لیا ہے، اور دوسرے اس لیے کہ اگر کوئی شخص عقلی طور پر ان نظریات سے اختلاف بھی رکھتا ہو تو ان کے خلاف کچھ بولنا دنیا بھر کی ملامت اور طعن و تشنیع کو دعوت دینے کے مترادف ہے، لہٰذا وہ خاموشی ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔

اس بناء پر جب آج کی دنیا میں اسلام کی سیاسی تعلیمات کی تشریح کی جاتی ہے تو اچھے اچھے لوگ، جن میں بہت سے علماء بھی داخل ہیں اپنے ذہن کو زمانے کے ان فیشن ایبل تصورات سے آزاد نہیں کر پاتے، اور اس کے نتیجے میں جب وہ اسلام کے مطلوب سیاسی ڈھانچے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو ان تصورات کو مستعار لے کر اس ڈھانچے میں فِٹ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور اس طرح اس نازک موضوع پر التباس اور خلط مبحث کی اتنی تہیں چڑھتی چلی گئی ہیں کہ حقیقتِ حال چھپ کر رہ گئی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے اللہ تعالیٰ نے چودہویں صدی میں دین کی تجدید کا عظیم الشان کام لیا، اور یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس پر قرآن و سنّت اور مآخذِ شریعت کا پختہ رنگ اس طرح چڑھا ہوا ہو کہ کوئی دوسرا رنگ اس پر نہ چڑھ سکے! ایسا شخص زمانے کو جانتا ضرور ہے، لیکن قبول وہی بات کرتا ہے جو اس پختہ رنگ کے مطابق ہو۔ وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھتا ہے، لیکن گرد و پیش میں ہونے والے پروپیگنڈے کے شور و شغب سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا کسی ایک سمت میں چلی جائے تب بھی وہ اللہ تعالےٰ

کی توفیقِ خاص سے اسی بات پر ڈٹا رہتا ہے جو مآخذ شریعت کی رُو سے سچی اور کھری بات ہو اور اس کے اظہار میں کوئی مرعوبیت یا شرم یا مخلوق کا خوف اس کے آڑے نہیں آتا۔

سیاست کے معاملے میں بھی حکیم الامت قدس سرہٗ نے دین کی صراطِ مستقیم پر اسی ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمایا، اور اس دور میں جب بہت سے باطل نظریات کی آمیزش نے سیاست کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو دھندلا کر دیا تھا، حضرتؒ نے اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص سے ان تعلیمات کو اپنی صحیح شکل وصورت میں پیش کیا اور پروپیگنڈے کے کسی شوروشغب سے مرعوب نہیں ہوئے۔

چونکہ آجکل کی سیاست (جس میں وہ سیاست بھی داخل ہے جس کا مقصد اسلام کا نفاذ بتایا جاتا ہے) ایک خاص رُخ پر چل رہی ہے، اور اس میں بعض باتوں کو اصولِ موضوعہ کے طور پر اس طرح مسلّم سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے خلاف کا تصور ہی ذہنوں میں نہیں آتا، اس لیے حضرتؒ کے یہ سیاسی افکار اُن سیاسی ذہنوں کو یقیناً اچنبھے محسوس ہوں گے جو بنیادی طور پر مغربی اندازِ سیاست سے متاثر ہیں، لیکن حضرتؒ کے یہ افکار آپ کے ذاتی افکار نہیں ہیں، بلکہ ان کی بنیاد قرآن وسنّت اور خلافتِ راشدہ کے طرزِ عمل پر ہے اور اُن کے پیچھے نقلی اور عقلی دلائل کی مضبوط طاقت ہے، اس لیے ان کا مطالعہ اور ان پر ٹھنڈے دل اور غیر جانبدار ذہن سے غور کرنا ضروری ہے تاکہ حقیقتِ حال واضح ہو سکے۔

حضرتؒ کے سیاسی افکار کو میں تین حصّوں میں منقسم کر کے پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) اسلام میں سیاست کا مقام۔

(۲) اسلام کا نظامِ حکومت اور حکومت کے فرائض۔

(۳) اسلام میں سیاسی جدوجہد کا طریق کار۔

① اسلام میں سیاست کا مقام

سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دین میں سیاست کا مقام کیا ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے؟ عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور ہے کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو، اور کلیسا کا حق کلیسا کو"۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کا سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور مذہب وسیاست دونوں کا دائرہ عمل مختلف ہے، دونوں کو اپنے اپنے

دائرے میں ایک دوسرے کی مداخلت کے بغیر کام کرنا چاہیے، دین و سیاست کی تفریق کا یہی نظریہ عہدِ حاضر میں ترقی کرکے "سیکولرزم" کی شکل اختیار کرگیا جو آج کے نظام ہائے سیاست میں مقبول ترین نظریہ سمجھا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات چونکہ ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لیے اسلام میں سیاست کو دین و مذہب سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

چنانچہ عہدِ حاضر میں بہت سے مسلمانوں نے عیسائیت اور سیکولرزم کے اس باطل نظریے کی پُرزور تردید کی، اور یہ ثابت کیا کہ سیاست کو دین سے الگ نہیں کیا جاسکتا، بقولِ اقبال مرحوم ؎

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لیکن سیکولرزم اور دین و سیاست کی تفریق کے اس نظریے کی پُرزور تردید کرتے ہوئے بہت سے مسلمان مفکرین اور اہلِ قلم سے ایک نہایت باریک غلطی واقع ہوگئی جو دیکھنے میں بڑی باریک اور معمولی تھی، لیکن اس کے اثرات بہت دُور رس تھے۔ اس باریک غلطی کو ہم مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو اُسے اس طرح تعبیر کرسکتے ہیں کہ انہوں نے "سیکولرزم" کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنادیا، کہنا یوں تھا کہ "سیاست" کو دین سے الگ نہ ہونا چاہیے، لیکن کہا یوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست و حکومت سے متعلق ضرور ہیں اور ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ہر مسلمان اسلام کے دوسرے احکام کی طرح ان احکام پر بھی بقدرِ استطاعت عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے، حاکم کا فرض ہے کہ وہ اسلامی احکام کو نافذ کرنے اور انہی احکام کے مطابق حکومت کرے، اور عوام کا فرض ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق ایسی حکومت کے قیام کی کوشش اور اگر وہ قائم ہوجائے تو اس کی اطاعت کریں ——

لیکن عہدِ حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین، جنہوں نے سیکولرزم کی تردید میں کام کیا، تردید کے جوش میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے سیاست کو حکومت کو اسلام کا مقصودِ اصلی، اس کا

حقیقی نصب العین اور بعثتِ انبیاء کا مطمحِ نظر بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دے دیا، اور اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ کو نہ صرف ثانوی حیثیت دے دی بلکہ انہیں اسی مقصودِ اصلی، یعنی سیاست، کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیدیا۔

اس انتہا پسندی کا پہلا زبردست نقصان تو یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب (ORDER OF PRIORITY) اُلٹ کر رہ گئی، جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن کر ہر وقت دل و دماغ پر چھا گئی، اور جو مقصد تھا وہ ایک غیر اہم وسیلہ بن کر پس منظر میں چلا گیا، چنانچہ اس طرزِ فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح کا بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصدِ زندگی سیاست و حکومت کی اصلاح ہونا چاہیئے، کام وہی کام ہے جو اس راستے میں انجام دیا جائے، قربانی وہی قربانی ہے جو اس راہ میں پیش کی جائے، اور مثالی انسان وہی انسان ہے جس نے اس کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر دن رات اس کے لیے وقف کر رکھے ہوں۔ اور دین کے دوسرے شعبوں مثلاً طاعات و عبادات، زہد و تقویٰ، نفس اور خشیت و انابت وغیرہ کی نہ صرف یہ کہ کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی، بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اُس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ گویا وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے اور دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصدِ اصلی سیاست و حکومت قرار پایا، اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہو گئی تو یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان بھی کرنا پڑتا ہے، اور مقصد کے حصول کے لیے اگر کبھی کسی وسیلے میں کچھ اونچ نیچ یا کمی بیشی بھی ہو جائے تو وہ گوارا کر لی جاتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ انتہا پسندی کے نتیجے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی بھی ہو جائے تو وہ قابلِ ملامت نہیں، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہوئی ہے۔

سیاست کو دین کا ایک شعبہ نہیں بلکہ دین کا مقصودِ اصلی قرار دینے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تجارت و معیشت بھی دین کا ایک شعبہ ہے، اس حیثیت سے دین کے بہت سے احکام

تجارت و معیشت سے بھی متعلق ہیں بلکہ کسبِ حلال کے بہت سے فضائل بھی احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اب اگر ان فضائل کے پیشِ نظر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ دین کا اصل مقصد ہی تجارت و معیشت اور کسبِ حلال ہے، تو یہ بات اتنی غلط ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بعینہٖ اسی طرح سیاست اس معنیٰ میں دین کا ایک شعبہ ضرور ہے کہ دین کے بہت سے احکام اس سے متعلق ہیں اور اس کے بہت سے فضائل بھی قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں لیکن ان فضائل کی بنیاد پر اس کو دین کا مقصودِ اصلی قرار دینا ایسی ہی غلطی ہے جیسے تجارت و معیشت کو دین کا اصل نصب العین قرار دینا۔

لیکن چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں جب سے مسلمانوں میں مغربی استعمار سے آزاد ہونے کی تحریکات شروع ہوئیں، اس وقت سے وہ انتہا پسندانہ طرزِ فکر عام ہوتا گیا جس میں سیاست کو "خلافت فی الارض" اور "حکومتِ الٰہیہ" وغیرہ کے عنوانات سے دین کا بنیادی مقصد قرار دے لیا گیا، طرزِ فکر کی اس غلطی نے مسلمانوں میں اتنی آہستگی سے اپنی جگہ بنائی کہ اچھے اچھے لوگوں کو یہ احساس نہ ہو سکا کہ ان کے فکر و عمل کا کانٹا تبدیل ہو گیا ہے، "سیاسی استقلال" کی ضرورت و اہمیت اس درجہ ذہنوں پر چھائی ہوئی تھی کہ اس باریک مگر دور رس غلطی پر غور کر کے "دین میں سیاست" کا صحیح مقام متعین کرنے کی فرصت ہی نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تصور بعض حضرات نے شعوری طور پر اختیار کیا اور بعض نے غیر شعوری طور پر، اور تحریکات کے اجتماعی عمل نے اس پر ایسی مُہر ثبت کر دی کہ اچھے اچھے اہلِ علم کو بھی کانٹے کی اس تبدیلی کا احساس نہ ہو سکا۔

اس ماحول میں احقر کے علم کے مطابق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس باریک غلطی کو دو ٹوک لفظوں میں واضح فرمایا اور قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا کہ دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے؟ حضرتؒ فرماتے ہیں:-

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

(ترجمہ) "وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔"

اس سے واضح ہے دیانات مقصود بالذات ہیں، اور سیاسیات و جہاد مقصودِ اصلی نہیں، بلکہ اقامتِ دیانت کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکامِ دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا، بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی دی گئی ورنہ نہیں۔ وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کے لیے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکین فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے، اور وہ یہ ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ۔

(ترجمہ) "تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں اُن سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ اُن کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا۔"

یہاں ایمان و عملِ صالح کو شرط قرار دیا جا رہا ہے تمکین فی الارض کی جس سے تمکین و سیاست کا مقصودِ اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عملِ صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے، پس دین پر سیاست و شوکت موعود ہوئی لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔

> (ترجمہ) "اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے"
>
> جس میں اقامتِ تورات وانجیل وقرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعتِ رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان وعملِ صالح پر شوکت وقوت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں جو بطور خاصیت اس پر مُرتب ہوں گی، نہ کہ مقصود جو اس کی غایت کہلائے۔
>
> بہر حال! واضح ہوا کہ سیاست ودیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصودِ اصلی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصودِ اصلی نہیں اور دیانت خود مقصودِ اصلی ہے۔" (اشرف السوانح جلد۴ (خاتمۃ السوانح) ص۲۸، ۲۹ طبع ملتان)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ نے ایک صفحے کی اس مختصر مگر انتہائی پُرمغز اور جامع تقریر میں اللہ تعالیٰ کی توفیقِ خاص سے موضوع کو اس قدر واضح فرما دیا ہے کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست وحکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے، اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصلی مقصد سیاست وحکومت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے جس کا مظاہرہ عبادات و طاعات کے ذریعے ہوتا ہے۔ سیاست وحکومت بھی اسی مقصد کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے جو نہ بجائے خود مقصد ہے اور نہ اقامتِ دین کا مقصد اس پر موقوف ہے، بلکہ وہ حصولِ مقاصد کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے۔ لہٰذا اسلام میں وہی سیاست وحکومت مطلوب ہے جو اس مقصد میں مُمد ومعاون ہو، اس کے برعکس جو سیاست اس مقصد کو پورا کرنے کے بجائے دین کے اصل مقاصد میں کتربیونت کرکے انہیں مجروح کرے، وہ اسلامی سیاست نہیں ہے، خواہ اس کا نام "اسلامی" رکھ دیا گیا ہو۔

(۴) اسلام کا نظامِ حکومت

قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے اندر جو شخصی حکومتیں عام طور سے رائج رہی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہتیں تھیں جن میں بادشاہ کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر کوئی قانونی قدغن عائد نہیں ہوتی تھی۔ اس مطلق العنان حکمرانی کے نتیجے میں ظلم وستم اور ناانصافیوں کا بازار گرم رہا، اس لیے اس کے خلاف یورپ میں شدید ردِ عمل ہوا، "شخصی حکومت" کو بذاتِ خود نہایت معیوب سمجھا جانے لگا اور اس کی جگہ "جمہوریت" کو ایک مثالی طرزِ حکومت کے طور پر پیش کیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شخصی حکومتیں ختم ہوگئیں، اور ان کی جگہ جمہوری نظام حکومت وجود میں آیا، بیشتر ملکوں میں جمہوریت قائم کی گئی، یہاں تک کہ جمہوریت کو ایک ایسا آئیڈیل نظام حکومت سمجھا جانے لگا جو سیاست میں عدل وانصاف اور حق وصداقت کا ضامن ہے۔ چنانچہ گذشتہ (ہجری) صدی سے لے کر اب تک جتنی سیاسی تحریکیں اُٹھی ہیں، اُن کے ذہن میں "جمہوریت" کی حیثیت معاذ اللہ ایک ایسے "کلمۂ طیبہ" کی ہوگئی ہے جس کے بغیر آج کے دور میں سیاست کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا بھر پر چھائے ہوئے اس پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ حاضر میں جو سیاسی جماعتیں اسلام کا نام لے کر اُٹھی ہیں، ان کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ جمہوریت کو ایک مُسلّم اصول قرار دے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ انہوں نے بھی اپنے مقاصد میں جمہوریت کے قیام کو سرِ فہرست رکھا ہے اور خود اپنی جماعت کو بھی جمہوری ڈھانچے پر تعمیر کیا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہ دعوے بھی بکثرت کیے گئے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے بلکہ اسلام نے جمہوریت ہی کی تعلیم دی ہے، کسی نے بہت احتیاط کی تو یہ کہہ دیا کہ جمہوریت کے جو اجزاء اسلام کے خلاف ہیں، ہم اُن کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا ہماری جمہوریت "اسلامی جمہوریت" ہے۔

یہ تصورات ہمارے دور میں اس قدر مشہور ہوگئے ہیں کہ ان کے خلاف کچھ سوچنا یا کہنا دنیا بھر کی لعنت وملامت کو اپنے سر لینے کے مترادف ہے، اور اگر ایسے ماحول میں کوئی شخص جمہوری حکومت کے بجائے شخصی حکومت کی حمایت کرے تو ایسا شخص تو آج کی سیاسی فضا میں تقریباً کلمۂ کفر کہنے کا مرتکب سمجھا جانے لگا ہے۔

لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور خالص دین کی دعوت وتجدید کے لیے

منتخب فرمایا ہو، وہ زمانے پر چھائے ہوئے تصورات اور خوشنما نعروں سے مرعوب و متاثر نہیں ہوتا، بلکہ ہر حال میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی یہ تسلیم نہیں فرمایا کہ اسلام نے جمہوریت کی تعلیم دی ہے یا جمہوریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے متعدد مواعظ و ملفوظات اور تصانیف میں جمہوریت پر نہایت جاندار تنقیدیں کی ہیں اور اپنے دینی نقطۂ نظر سے اس کی خرابیوں کو واضح فرمایا ہے۔

عام طور سے جمہوریت کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں صرف اتنا خیال رہا کہ مطلق العناں بادشاہت کے مقابلے میں یہ نظام عوام کو آزادیٔ اظہارِ رائے عطا کرتا ہے اور حکمرانوں پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کے ذریعے وہ بے مہار نہ ہو سکیں۔ اور چونکہ اسلام نے "مشاورت" کا حکم دیا ہے، اس لیے "جمہوریت" کو "مشاورت" کے ہم معنیٰ سمجھ کر لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جمہوریت عین اسلام ہے۔ حالاں کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے، درحقیقت "جمہوری نظامِ حکومت" کے پیچھے ایک مستقل فلسفہ ہے جو دین کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا، اور جس کے لیے سیکولرزم پر ایمان لانا تقریباً لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمہوریت کی حقیقت واضح کرتے کے لیے یہ جملہ مشہور ہے کہ:۔

"IT IS A GOVERNMENT OF THE PEOPLE BY THE PEOPLE FOR THE PEOPLE"

جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے جو عوام کے ذریعے اور عوام کے فائدے کے لیے قائم ہوتی ہے۔

لہٰذا "جمہوریت" کا سب سے پہلا رکنِ اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکمِ اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہو، وہ واجب التعمیل اور ناقابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے۔ کثرتِ رائے کے اس فیصلے پر کوئی قدغن اور کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اگر دستورِ حکومت عوامی نمائندوں کے اختیارِ قانون سازی پر کوئی پابندی

بھی عائد کر دے۔ (مثلاً یہ کہ وہ کوئی قانون قرآن و سنّت کے یا بنیادی حقوق کے خلاف نہیں بنائے گی) تو یہ پابندی اس لیے واجب التعمیل نہیں ہوتی کہ یہ عوام سے بالاتر کسی اتھارٹی نے عائد کی ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جسے ہر حال میں ماننا ضروری ہے، بلکہ صرف اس لیے واجب التعمیل سمجھی جاتی ہے کہ یہ پابندی خود کثرتِ رائے نے عائد کی ہے۔ لہٰذا اگر کثرتِ رائے کسی وقت چاہے تو اسے منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جمہوریت نے کثرتِ رائے کو (معاذ اللہ) خدائی کا مقام دیا ہوا ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر مغربی ممالک میں بد سے بدتر قوانین کثرتِ رائے کے زور پر مسلسل نافذ کیے جاتے رہے ہیں، اور آج تک نافذ کیے جا رہے ہیں۔ زنا جیسی بدکاری سے لے کر ہم جنسی جیسے گھناؤنے عمل تک کو اسی بنیاد پر سندِ جواز عطا کی گئی ہے، اور اس طرزِ فکر نے دنیا کو اخلاقی تباہی کے آخری سرے تک پہنچا دیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے کثرتِ رائے کے اس جمہوری فلسفے پر جا بجا تبصرے فرما کر اس کی کمزوری کو واضح کیا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(ترجمہ) ”اور اگر آپ زمین والوں کی اکثریت کی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔“

کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے خلاف اس سے زیادہ واشگاف اعلان اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن زمانے پر چھائے ہوئے نظریات سے مرعوب ہو کر مسلمانوں میں بھی یہ خیال تقویت پا گیا کہ جس طرف کثرتِ رائے ہو گی، وہ بات ضرور حق ہو گی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی تالیفات اور مواعظ و ملفوظات میں بہت سے مقامات پر اس پھیلی ہوئی غلطی کی تردید فرمائی ہے، ایک وعظ میں فرماتے ہیں:۔

”آجکل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرتِ رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے، صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر یہ بھی معلوم ہے کہ

رائے سے کس کی رائے مراد ہے؟ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انہی کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا، ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انہوں نے کیوں توحید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی؟ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا؟ اسی لیے کہ وہ قوم جاہل تھی، اُس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔"

(فضائل العلم والخشیہ ص۳۰ ومعارف حکیم الامتؒ ص۶۱)

مطلب یہ ہے کہ عوام کی کثرتِ رائے کبھی معیارِ حق نہیں ہوسکتی، کیونکہ عوام میں اکثریت عموماً بے علم یا کم علم لوگوں کی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد حسین الہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو، کیونکہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ دُنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ، تو اس قاعدے کی بناء پر کثرتِ رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔"

(تقلیل الاختلاط مع الانام ص۔ ومعارف حکیم الامتؒ ص۶۲۶)

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

"(غزوہ احد میں) اُن پچاس آدمیوں میں جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین تھے، اختلاف ہوا، بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے، اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کے لئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا، وہ غرض حاصل ہوچکی، اس لئے حکمِ قرار بھی ختم ہوگیا اب یہاں سے ہٹنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی، اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیئے، ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں، ہم کو مالِ غنیمت جمع کر لینا چاہیئے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا تھا کہ بدون میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اس لئے ہم کو بدون آپ

> کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہیئے، مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے، یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسر اُن کے رہ گئے (اس واقعہ میں کثرتِ رائے غلطی پر تھی اور قلّتِ رائے صواب پر تھی، جو لوگ کثرتِ رائے کو علامتِ حق سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے سبق حاصل کریں")

(ذم النسیان ص ۱۲، معارف حکیم الامت ص ۶۱۸)

اسی وعظ میں آگے چل کر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے کثرتِ رائے کی لازمی حقانیت کے خلاف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل کی مثال بھی دی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو آپ نے اُن کے خلاف جہاد کا ارادہ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت بیشتر صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد نہ کیا جائے، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی رائے پر قائم رہے اور اسی کے مطابق فیصلہ بھی ہوا اور بعد میں سب لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ صائب رائے یہی تھی۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے کثرتِ رائے کو معیارِ حق قرار دینے کے نظریے پر شرعی اور عقلی دونوں قسم کے دلائل سے تنقید فرمائی ہے اور سادہ سادہ لفظوں میں ایسے حقائق بیان فرما دیئے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کریگا۔ اسی نتیجے تک پہنچے گا۔ چنانچہ جدید علم سیاست کے بعض حقیقت پسند ماہرین نے بھی "جمہوریت" کے ان نقائص کو تسلیم کیا ہے، ایک مشہور ماہر سیاسیات ایڈمنڈ بورک (Burke) لکھتا ہے:

> "اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرنا کوئی فطرت کا قانون نہیں ہے، کم تعداد بعض اوقات زیادہ مضبوط طاقت بھی ہو سکتی ہے، اور اکثریت کی حرص و ہوس کے مقابلے میں اس کے اندر زیادہ معقولیت بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ مقولہ کہ: "اکثریت کے فیصلے کو قانون بننا چاہیئے"، اس میں افادیت اور پالیسی کی بھی اتنی ہی کمی ہے، جتنی حقانیت کی"۔[1]

---

[1] Quoted by A. Appadorai, The Substance of Politics, Oxford University Press 9th ed. 1961 p.133.

حکیم الامت قدس سرہٗ ایک اور وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

> "اوّل تو کثرتِ رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے، ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہوگی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوالی جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے کہ ہم یوں کہیں گے، تم یوں کہہ دینا، جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں، اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی"۔[۲]

بعض جمہوریت پرست لوگوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس تبصرے کو ایک سطحی تبصرہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک ایسے بزرگ کا تبصرہ ہے جنکا میدان علم سیاست نہیں تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی نگاہ اپنی گوشہ نشینی کے باوجود زمانے کی دُکھتی ہوئی رگوں پر ہوتی تھی۔ ان کا اصل ماٰخذ قرآن و سنت تھے اور وحی کی اسی روشنی نے انہیں وہ نور فراست عطا فرما دیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ان مسائل کو انتہائی سادگی سے بیان فرما گئے ہیں، جن کو لوگوں نے ایک مستقل فلسفہ بنا رکھا ہے چنانچہ یہ تبصرہ بھی اسی فراستِ ایمانی کا نتیجہ تھا۔ علم سیاست بیشک آپ کا اصل میدان نہیں تھا، لیکن جو سچائی وحی کے نور سے معلوم ہوئی ہو، اُسے رسمی علوم کی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن اس علم سیاست کے وہ ماہرین بھی جنہوں نے پروپیگنڈے سے ذرا آزاد ہو کر سوچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بھی بالآخر اسی نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر اے اپادو رائے برصغیر میں اپنی سیاسی تصانیف کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ وہ "جمہوریت" کے تعارف اور اس کی کامیابی کی شرائط پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> "جمہوریتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ شرائط (جن کے وجود پر جمہوریت کی کامیابی موقوف ہے) شاذ و نادر ہی پوری ہوئی ہیں۔ عملی اعتبار سے جمہوریت دراصل جہالت کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کی ساری توجہ کمیّت اور تعداد (quantity) پر رہتی ہے۔ کیفیت (quality) پر نہیں۔

---

[۲] وعظ "الانسداد" ماخوذ از اصلاح المسلمین ص ۵۱۰ مطبوعہ ادارۂ اسلامیات، لاہور

اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں، انہیں تولا نہیں جاتا۔ شہریوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی حکومت کو اپنے بنیادی وظائفِ زندگی میں سے نہیں سمجھتی، چنانچہ اسکو حکومت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، وہ کام کرتی اور کھیلتی رہتی ہے، اپنے پیشہ وارانہ اور فنی کاموں کو انجام دیتی رہتی ہے، ہل چلاتی، بیج بوتی، فصلیں کاٹتی اور انہیں بیچتی رہتی ہے، اور یہ بھول جاتی ہے کہ وہ دراصل ملک کی حاکم ہے۔ جمہوریت میں یہ حقیقی خطرہ موجود ہے کہ شہریوں کی ایسی ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی۔ جس کے ذریعہ وہ اُن مسائل کے حقیقی مفہوم کا ادراک کر سکیں جو انتخابات کے موقع پر ان کے سامنے فیصلے کے لئے آتے ہیں، لہٰذا وہ طبقاتی جذبات اور نعروں سے گمراہ ہو سکتے ہیں، سر ہنری مین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جمہوریت کبھی بھی اکثریت کی حکمرانی کی نمائندگی نہیں کر سکتی کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ عوام تو محض اپنے لیڈروں کی آراء کو تسلیم کرتے ہیں۔" [1]

مغرب کے مشہور مورخ اور فلسفی کارلائل کا یہ اقتباس علمِ سیاست میں کافی شہرت پا گیا ہے کہ:

Surely, of all "rights of man", this right of the ignorant man to be guided by the wiser, to be, gently or forcibly, held in the true course by him, is the indisputablest. Nature hereself ordains it from the first, society struggles towards perfection by enforcing and accomplishing it more and more.. .. In Rome and Attens, as elsewhere if you look practical we shall find that it was not by loud voting and debating of many, but by wise inright and ordering of a few that the word war done. So is it ever, so will it ever be".

"انسانی حقوق" میں یقینی طور پر جاہل افراد کا یہ حق سب سے زیادہ غیر متنازع

---

[1] A. Appadorai, op cit p. 133

ہے کہ عقل مند افراد ان کی رہنمائی کریں اور انہیں نرمی سے یا طاقت کے ذریعہ سیدھے راستے پر رکھیں۔ فطرت کا شروع سے یہی حکم ہے، اسی حکم کو نافذ کر کے اور اس کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کر کے ہی سوسائٹی کمال تک پہنچنے کی جدوجہد کرتی ہے ------ اگر ہم عملی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ روم اور ایتھنز میں دوسرے مقامات کی طرح بلند آواز سے رائے شماری کرنے اور بہت سے لوگوں کے بحث مباحثے کے ذریعے نہیں بلکہ گنے چنے افراد کے حکم سے کام چلتا تھا۔ یہ بات ہمیشہ سے سچ رہی ہے۔ لہٰذا آئندہ بھی یہی بات سچ رہے گی۔" [1]

شخصی حکومت

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہٗ نے جمہوریت پر تنقید فرماتے ہوئے کئی مقامات پر اس کے مقابلے میں "شخصی حکومت" کی حمایت فرمائی ہے۔ آج کے جمہوریت پرست دور میں شخصی حکومت کی حمایت کلمۂ کفر کی طرح نشانۂ ملامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بنیادی سبب دو ہیں، ایک یہ کہ جمہوریت کی حمایت میں پروپیگنڈا اس قدر زور شور کے ساتھ کیا گیا ہے کہ کسی مخالف نظام حکومت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر ہی ذہن آمادہ نہیں ہوتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ "شخصی حکومت" کا نام آتے ہی ذہن ان مطلق العنان بادشاہوں کی طرف چلا جاتا ہے، جن کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی تھی اور ان پر کوئی بالاتر پابندی عائد نہ تھی، یا پھر اس نام سے اُن فاشسٹی حکمرانوں کا تصور آجاتا ہے۔ جن کے نزدیک حکومت کی بنیاد محض زور زبردستی پر تھی، حالانکہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ "شخصی حکومت" سے وہ "مثالی اسلامی حکمران" مراد لیتے ہیں جسے امیر المومنین یا خلیفۂ وقت" کہا جاتا ہے۔

اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں جو غیر اسلامی شخصی حکومتیں رائج

---

[1] Chartism (1839) as quoted by Appadorai, op cit p. 128

رہی ہیں، ان کی خرابیوں اور مفاسد کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

① ان "شخصی حکومتوں" کی بنیاد بادشاہتوں میں عموماً خاندانی وراثت پر تھی اور فاشزم کے فلسفے میں صرف "قوت" پر، جسکا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو قوی ہو، وہ کمزور پر حکومت کا حق لے کر آیا ہے۔ لہٰذا ان شخصی حکومتوں کے قیام میں سنجیدہ غور و فکر اور مناسب انتخاب کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تھا۔

② ان شخصی حکمرانوں کے لئے کوئی ایسی لازمی صفات اہلیت ضروری نہیں تھیں جن کے بغیر وہ حکمرانی کے منصب تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔

③ یہ شخصی حکومتیں عموماً ایسے آسمانی قوانین کی پابند نہیں تھیں جو اُن کے فیصلوں کو لگی بندھی حدود میں محدود رکھ سکیں۔ لہٰذا قانون ساز وہ خود تھے اور مطلق العنان ہونے کی بنا پر ان کی زبان قانون بن گئی تھی۔

④ ان حکومتوں میں کوئی ایسا لازمی ادارہ موجود نہیں تھا جو ان کے اقدامات ان کے صادر کئے ہوئے احکام اور ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کسی لگے بندھے معیار پر پرکھ سکتا اور ان کی طرف سے آسمانی قانون کی خلاف ورزی اپنی حدودِ اختیار سے تجاوز یا کسی ظلم و ستم کی صورت میں ان کے اقدامات کی تلافی کر سکتا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر شخصی حکومتوں میں لوگوں کے حقوق پامال ہوئے اور انسان انسان کا غلام بن گیا۔ ورنہ اگر یہ خرابیاں موجود نہ ہوں تو بیشتر ماہرین سیاست اس بات پر متفق ہیں کہ شخصی حکومت میں بذاتِ خود کوئی خرابی نہیں۔ وہ جمہوریت کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب اور عوام کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ روسو نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ:

> "حکومت کا بہترین اور سب سے فطری انتظام یہ ہے کہ عقل مند ترین انسان کو کثرت پر حکومت کرنی چاہیئے۔ بشرطیکہ اس بات کی ضمانت مل جائے کہ وہ اس کثرت کے مفاد کے لئے حکومت کریں گے، نہ کہ اپنے مفاد کے لئے"[1]

---

[1] Roussian, The Social Contract, bk III, Ch.V. as quoted by Appadorai, op cit p. 127

کار لائل لکھتا ہے کہ:

"کسی بھی ملک میں وہاں کے قابل ترین آدمی کو دریافت کرو، پھر اُسے اُٹھا کر اطاعت کے لئے اعلیٰ ترین مقام پر رکھدو اور اس کی عزت کرو، اس طرح تم اس ملک کے لئے ایک مکمل حکومت دریافت کر لوگے، پھر بیلٹ بکس ہے، یا پارلیمنٹ میں ہونے والی فصاحت و بلاغت یا رائے شماری یا دستور سازی یا کسی بھی قسم کی کوئی اور مشینری اس حکومت میں کوئی بہتر اضافہ نہیں کر سکے گی۔ یہ ایک مکمل ریاست ہوگی اور وہ ملک ایک مثالی ملک ہوگا۔" ؎

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ جس "شخصی حکومت" کو اسلام کا تقاضا قرار دے رہے ہیں، وہ شخصی حکومت کی مذکورہ بالا خرابیوں سے خالی ہے۔ وہ اس معنیٰ میں بے شک "شخصی حکومت" ہے کہ اس میں جمہوری انداز کی پارلیمنٹ مختارِ کل نہیں ہے اور اختیاراتِ حکومت بڑی حد تک "خلیفہ" یا "امیر المؤمنین" کی ذات میں مرکوز ہیں، لیکن سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس "خلیفہ" یا "امیر المومنین" کا تعین وراثت یا قوت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اہلِ حل وعقد کے انتخاب کے ذریعے ہوتا ہے اور اس انتخاب کے لئے "خلیفہ" میں کچھ معیاری اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے، جن کے بغیر اہلِ حلّ وعقد کے لئے کسی شخص کا انتخاب جائز نہیں۔ ان اوصاف میں علمی قابلیت کے علاوہ کردار کی اعلیٰ ترین پختگی اور رائے کی اصابت بھی داخل ہے۔ آجکل کی جمہوریتوں میں سربراہ کے انتخاب کے لئے عموماً نہ کوئی قابلیت شرط ہوتی ہے، نہ کردار وعمل کی کوئی خوبی، لیکن "خلیفہ" کے لئے اسلام میں نہایت کڑی شرائط تجویز فرمائی گئی ہیں اور اہلِ حلّ وعقد کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ ان شرائط کا مکمل اطمینان حاصل کرنے کے بعد خلیفہ کا انتخاب کریں۔

پھر یہ خلیفہ بھی، جو اعلیٰ ترین علمی اور عملی اوصاف کا حامل ہے، مطلق العنان قانون ساز نہیں ہوتا، بلکہ قرآن وسنت اور اجماعِ اُمت کا پابند ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی

؎ G.N. Sabine, A History of Political Theory p. 764 (Appadorai p. 122)

حکومت قانون وضع نہیں کرتی، بلکہ ایک ایسے آسمانی قانون کی بنیاد پر وجود میں آتی اور اسی کو نافذ کرتی ہے۔ جو کائنات کی اعلےٰ ترین اتھارٹی کا بنایا ہوا ہے اور قرآن وسنت کی صورت میں محفوظ ہے، ہاں قرآن وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے انتظامی قوانین اور احکام جاری کرنا حکومت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی اس پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے اہلِ شوریٰ سے مشورہ لے، اس مشورے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ لازمی طور پر کثرتِ رائے کی پابندی کرے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجائیں اور ان کو مدِ نظر رکھنے کے بعد وہ اپنی بہترین قابلیت اور اللہ تعالےٰ کے بھروسے پر خود فیصلہ کرے۔

اس کے علاوہ سربراہِ حکومت کا ہر اقدام، اس کا ہر حکم اور اس کا بنایا ہوا ہر قانون چونکہ قرآن وسنت کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت یہ سربراہ قرآن وسنت کے احکام سے تجاوز کرے یا عدل وانصاف کے خلاف کوئی کام کرے تو قاضی کی عدالت سے اس کے خلاف چارۂ کار حاصل کرنا ہر ادنیٰ شہری کا ناقابلِ تنسیخ حق ہوتا ہے۔

اس نظامِ حکومت کی تمام تفصیلات کو بیان کرنا اس مقالے کی حدود سے باہر ہے، لیکن یہاں بتلانا صرف یہ تھا کہ حکیم الامت قدس سرہٗ نے اسلام میں جس ”شخصی حکومت“ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس میں قدیم بادشاہتوں اور جدید فاشی حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی خرابی کے بنیادی اسباب موجود نہیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے جمہوریت اور شخصی حکومت پر اپنے متعدد مواعظ اور ملفوظات میں تبصرہ فرمایا ہے۔ جن میں سے غالباً سب سے جامع اور مفصل بحث اس وعظ میں فرمائی ہے جو ”تقلیل الاختلاط مع الانام“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے چند مختصر اقتباسات ذیل میں پیش خدمت ہیں:

> ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں، وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں، مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے، کبھی حکمی، فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحدِ حکمی ہے، حقیقی نہیں، تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ

کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اُس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں، مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے، کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے۔ وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے، اگر ایسا بھی ہوتا۔ جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا، مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں، بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخصِ واحدِ حقیقی کے حامی ہیں، اور تم شخصِ واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ ہے جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی، جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا، نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا، ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے، تم نے دس کا غلام بنا دیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا؟ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو، وہ اس سے بہتر ہے، جس پر دس بیس کی حکومت ہو، یہ حاصل ہے۔ جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اسے بھی انکار نہیں، مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔"

آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

"نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں، بعض متبوع ہوں، آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں اگر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعوی سے ہٹنا نہیں پڑتا، کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے۔ وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔

بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالے نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کیے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل اور قوم قبط کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے مگر دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے"

مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے۔ وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لیے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیے، بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیے میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے۔ بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنی ایجادات ہیں۔ وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین

کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے اب بتلایئے: اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا؟ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے سے فیصلہ ہوتا ہے۔ بادشاہ اپنی رائے سے فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے اور جمہوری میں اگر کثرت۔ رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں، سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر، اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لیے یہ قاعدہ کلی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جائے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔

مزید آگے ارشاد فرماتے ہیں :-

دوسرے جو لوگ کثرت۔ رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں، وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں، اور وہ نا اہل ہے، تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے۔ ان کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نا اہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل و عقد، اور اسے جماعت عقلاً بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ، جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی درایت نہ ہو، اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ اب بتلاؤ کہ   جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلے میں بھی اس کے رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو، وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لیے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زریں العقل، صائب الرائے

سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لیے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جس کے لیے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو۔ بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو، مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے، صائب العقل ذکی سمجھتے ہو۔ تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا، اور کامل العقل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ“ مگر یہ بالکل غلط ہے، ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا، اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے، اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: اے بریرہ! تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا، ان کے آقا نے کر دیا تھا، جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دے دیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا۔ اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں، اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی، وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا اور حضرت بریرہ سے آپ نے فرمایا کہ: اے بریرہ! کیا اچھا ہو کہ اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں: یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ یا مشورہ کی ایک فرد ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے۔ گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ حضرت بریرہ نے صاف عرض کر دیا اگر مشورہ ہے تو میں

اس کو قبول نہیں کرتی۔ سمجھئے! اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا، کہ اگر نبی اور خلیفہ بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں، بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ حضرت بریرہؓ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور ان سے ذرا بھی ناراض نہ ہوئے اور نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا۔ نہ ان پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں۔ تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکہ مجبور ہو جائے گا۔ کہ رعایا جو مشورہ دیں۔ اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔

پس شاورھم فِی الاَمر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں۔ اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔

اور جب تک یہ ثابت نہ ہو، اس وقت تک شاورھم فی الامر سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو؟ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حضرت بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں۔ تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے ہرگز مجبور نہیں ہیں۔ بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَاِذا عزمت فتوکل علی اللہ کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں۔ تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں۔ یہاں "اِذَا عَزَمْتَ" صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو "اذا عزمت"

نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے۔ اذا عزمتم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں۔ اس کا اخیر جزو خود ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے۔ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کرو۔ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں، اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں ” استیروا الحکام وھو حقکم علیہم کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں اور پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی، کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے، چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔“

(تقلیل الاختلاط مع الانام ص۳۱ و اشرف الجواب ص۳۰۱ تا ۳۱۰ مطبوعہ ملتان و معارف حکیم الامت ص ۶۲۰ تا ۶۲۴)

حکمرانی ایک ذمہ داری ہے نہ کہ حق

پھر غیر اسلامی شخصی حکومتوں میں اور اسلام کی شخصی حکومت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں ”شخصی حکومت“ ایک ”حق“ (PRINILEGE) یا ایک فائدہ (ADNANTAGE) ہے اسی لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق کس کو ملے؟ اور کس کو نہ ملے؟ اور اسی لیے لوگ از خود اس کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام میں یہ ایک ”امانت“ یا ایک ”ذمہ داری“ ہے جو حکمران کے لیے اسباب عیش فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ کندھے پر دنیا و آخرت کا ایک زبردست بوجھ سوار کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا یہ از خود کوشش کر کے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس سے انسان اپنی استطاعت کی حد تک جتنا بھاگ سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ اسی لیے اسلام میں اس شخص کو ”حکومت“ کے لیے نا اہل قرار دیا گیا ہے جو خود اس کا طلب گار ہو، چنانچہ اسلامی سیاست میں ”امیدواری“ (candidalure) کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

حکومت کے فرائض

لہٰذا جس شخص کو بھی یہ ذمہ داری سونپی جائے اُسے اِس نقطۂ نظر کے ساتھ اُسے سنبھالنا ہے کہ "حکومت" بذاتِ خود مقصود نہیں جس سے ہر حال میں چمٹے رہنا ضروری ہو، بلکہ اصل مقصود اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہے، لہٰذا اگر کبھی حکومت اور اللہ تعالےٰ کی خوشنودی میں تعارض ہوگا تو وہ بلا تامّل اپنی حکومت کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کردے گا۔ اس سلسلے میں حضرت حکیم الامتؒ ایک وعظ میں فرماتے ہیں:۔

"یاد رکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں، بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے، اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں! اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں۔ اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون، ہامان و نمرود و شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں، حالاں کہ وہ مردود ہیں، معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو، اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو، وہ وبالِ جان ہے۔ اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اُٹھانے پر راضی ہیں، اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔

آخر حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی، پھر کیوں چھوڑی؟ محض اس لیے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں، بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترکِ سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ہر فن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں، اور فقہاء میں فقیہ، اور صوفیاء میں تو امام ہیں، ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا، جو اُن کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا؟ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مُضرِ مقصود نہ تھی، تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصبِ خلافت کو قبول کریں، اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے مُضرِ مقصود تھی تو ان کے لیے حکم ہے لاتلینّ مال یتیم ولا تقضینّ بین اثنین۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں، بلکہ مقصود رضائے حق

ہے، اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔" (تقلیل الاختلاط مع الانام ص۶۰ تا ۶۲، اشرف الجواب ص۴۵۵، ۴۶۴)

لہٰذا اسلامی حکمران کا فریضہ ہے کہ وہ حکومت کو رضائے الٰہی کا وسیلہ بنانے کیلئے اسلامی احکام پر عمل اور ان کے نفاذ کے لیے اپنی جان توڑ کوشش صرف کرے، ورنہ اس کی حکومت بیکار محض اور اس کا حکومت سے چپٹا رہنا ناجائز و حرام ہے۔ لہٰذا اس کا یہ فرض ہے کہ انتہائی جزرسی کے ساتھ اپنے اقدامات کا جائزہ لیتا رہے، اور شریعت کے معاملے میں ادنیٰ غفلت کو گوارا نہ کرے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:۔

"سلطنتیں جو گئی ہیں، میرے نزدیک چھوٹی چیزوں کے اہتمام کی غفلت ہی سے گئی ہیں، کیونکہ چھوٹی چھوٹی جزئیات کی طرف سے جو غفلتیں ہوتی رہتی ہیں وہ سب مل کر ایک بہت بڑا مجموعہ غفلتوں کا ہو جاتا ہے جو آخر میں رنگ لاتا ہے اور زوالِ سلطنت کا موجب ہوتا ہے، نیز جب چھوٹی چھوٹی باتوں کا اہتمام نہیں ہوتا تو غفلت کی عادت پڑ جاتی ہے، پھر بڑے بڑے امور میں بھی غفلت ہونے لگتی ہے، اور وہ براہِ راست مخل ہیں سلطنت کی۔"

(اصلاح المسلمین ص۵۲۷ بحوالہ الافاضات ۷ ملفوظ ۲۵۹)

مسلمان حاکم کا فرض جس طرح یہ ہے کہ وہ خود انصاف کے خلاف کوئی کام نہ کرے، اسی طرح اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو بھی ظلم نہ کرنے دے، حضرتؒ فرماتے ہیں:۔

"حاکم تنہا اپنی احتیاط سے نجات نہیں پاسکتا، بلکہ اس کا انتظام بھی اس کے ذمے ہے کہ متعلقین بھی ظلم نہ کرنے پائیں، جس کی صورت یہ ہے کہ عام طور سے اشتہار دے دے کہ میرے یہاں رشوت کا بالکل کام نہیں، اس لیے اگر میرے عملے میں بھی کوئی شخص کسی سے رشوت مانگے تو ہرگز نہ دے، بلکہ ہم سے اس کی اطلاع کرے، پھر اطلاع کے بعد جس نے ایسی حرکت کی ہو اس سے رقم واپس کرائے اور کافی سزا دے۔۔۔ نیز حکام کو یہ بھی چاہیے کہ لوگوں کے تعلقات براہِ راست اپنے سے رکھیں، کسی شخص کو واسطہ نہ بنائیں، کیونکہ یہ واسطے بہت ستم ڈھاتے ہیں،

اگر کہو کہ صاحب یہ تو بڑا مشکل ہے، تو حضرت! حکومت کرنا آسان نہیں، یہ منہ کا نوالہ نہیں ہر وقت جہنم کے کنارے پر ہے“

(انفاسِ عیسیٰ صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵ جلد ۱ باب ۴)

اسلامی حکومت میں حکمران اور علماء کے درمیان تقسیمِ کار کیا ہونی چاہیئے؟ اس کے بارے میں حضرتؒ فرماتے ہیں:-

”حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں، شانِ نبوت اور شانِ سلطنت، اس کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی دونوں کے جامع تھے، مگر اب یہ دونوں شانیں دو گروہ پر تقسیم ہو گئیں، شانِ نبوت کے مظہر علماء ہیں، اور شانِ سلطنت کے مظہر سلاطینِ اسلام، اب اگر یہ سلاطین علماء سے استغناء کرتے ہیں تو حضورؐ کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اور اگر علماء سلاطین کی مخالفت کرتے ہیں تو اس سے بھی حضورؐ ہی کی ایک شان سے اعراض لازم آتا ہے، اب صورت دونوں کے جمع کرنے کی یہ ہے کہ سلاطین سے تو میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی حدود میں کوئی حکم اس وقت تک نافذ نہ کریں جب تک علماءِ حق سے استفتاء نہ کر لیں، اور علماء سے یہ کہتا ہوں کہ وہ نفاذ کے بعد اس پر کاربند ہوں، اگر یہ دونوں شانیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہیں، اس طرح جمع ہو جائیں تو مسلمانوں کی بہبود اور فلاح کی صورت نکل آئے، اور ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی ساحل پر جا لگے، ورنہ اللہ ہی حافظ ہے“ (اصلاح المسلمین ص ۵۳۶)

مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے حکمران کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ عقلمند اور تجربہ کار لوگوں سے مشورہ لیتا رہے، لیکن مشورے کے بعد جب کسی جانب رجحان ہو جائے اور اللہ کے بھروسے پر اس کے مطابق فیصلہ کر دے تو تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے، خواہ ان کی رائے کے خلاف ہو۔ حضرتؒ فرماتے ہیں:-

”سلطان کو چاہیئے کہ ہمیشہ عقلاء سے رائے لیتا رہے، بدون رائے لیے بہت سی باتیں نظر سے غائب رہتی ہیں، اور یہ مشورہ اور رائے تو مطلوب ہے، مگر یہ مخترعہ متعارفہ جمہوریت محض گھڑا ہوا ڈھکوسلہ ہے، بالخصوص ایسی

جمہوری سلطنت جو مسلم اور کافر ارکان سے مرکب ہو وہ تو غیر مسلم ہی سلطنت ہو گی، ایسی سلطنت اسلامی سلطنت نہ کہلائے گی۔"

اس پر ایک صاحب نے عرض کیا کہ اگر سلطان کے مشورہ لینے کے وقت اہلِ شوریٰ میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ سلطان کی رائے سے اختلاف کرنا مذموم تو نہیں، اس پر فرمایا کہ:-

> "جو اختلاف حکمت اور مصلحت اور تدین وخیر خواہی پر مبنی ہو وہ مذموم نہیں، مگر اس کی بھی ایک حد ہے یعنی یہ اختلاف اسی وقت تک جائز ہے جب تک مشورہ کا درجہ رہے، مگر بعد نفاذ اختلاف کرنا یا خلاف کرنا مذموم ہے انفاذ کے بعد تو اطاعت ہی واجب ہے۔" (الافاضات الیومیہ ص ۱۱۱، ۱۱۲ جلد۳ ملفوظ ۲۵۲)

یہ درحقیقت اس آیتِ قرآنی کی توضیح ہے جس میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ وَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (ترجمہ" اور ان سے معاملے میں مشورہ کرو، اور جب کوئی عزم کرلو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔"

③ اقامتِ دین کیلئے سیاسی جدوجہد کا شرعی مقام اور اس کی حدود

تیسرا موضوع جس پر اس مقالے میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ارشادات پیش کرنے مقصود ہیں یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے قیام اور غیر اسلامی طاقتوں کے شر سے دفاع کے لیے جدوجہد کریں؟ اگر ضروری ہے تو اس جدوجہد کی حدود کیا ہوتی چاہئیں؟ اس موضوع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ "الروضۃ الناضرۃ فی مسائل الحاضرۃ" کے نام سے تحریر فرمایا ہے جس میں اصولی طور پر سیاسی جدوجہد کی شرعی حیثیت کو بھی واضح فرمایا ہے اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے۔ یہ رسالہ مختصر مگر بہت پر مغز اور جامع ہے لیکن چونکہ اہلِ علم کے لیے لکھا گیا ہے، اس لیے اس میں علمی اور اصطلاحی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں حضرتؒ فرماتے ہیں:-

"مدافعت کفار کی مطلقاً اہلِ اسلام سے، اور خصوص سلطنتِ اسلامیہ سے جس میں خلافت و غیرِ خلافت، اور جس میں سلطنتِ اسلامیہ واقعیہ و سلطنتِ اسلامیہ مزعومۂ کفار سب داخل ہیں، پھر خصوص شعائرِ اسلام سے جن میں مقاماتِ مقدسہ، بالخصوص حرمین شریفین بھی داخل ہیں، سب مسلمانوں پر فرض ہے، کبھی علی العین، کبھی علی الکفایہ علی الاختلاف الاحوال، مگر اس کی فرضیت کے کچھ شرائط ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں، منجملہ ان کے ایک شرط استطاعت بھی ہے، اور استطاعت سے مراد استطاعتِ لغویہ نہیں، استطاعتِ شرعیہ ہے جس کو اس حدیث نے صاف کر دیا ہے: "عن ابی سعید الخدریؓ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال، من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبلسانہ ـــ الحدیث رواہ مسلم، مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف

ظاہر ہے کہ استطاعت باللسان ہر وقت حاصل ہے پھر اس کے انتفاء کی تقدیر کب متحقق ہو گی؟ اس سے ثابت ہوا کہ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس میں ایسا خطرہ نہ ہو جس کی مقاومت بظنِ غالب عادۃً ناممکن ہو۔ اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس دفاع کے بعد اس سے زیادہ شر میں مبتلا نہ ہو جائیں، مثلاً کفار کی جگہ کفار ہی مسلط ہوں یا مرکب کافر و مسلم سے کہ مجموعہ تابع اخس کے ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں غایت ہی مفقود ہے، اور وہ اخلاء الارض من الفساد ہے، اور قاعدہ ہے: الشیء اذا خلا عن الغایۃ انتفیٰ۔

اور اگر ایسا خطرہ ہو تو پھر وجوب تو ساقط ہو جائے گا، باقی جواز، اس میں تفصیل ہے، بعض صورتوں میں جواز بھی نہیں، بعض میں جواز بلکہ استحباب بھی ہے۔ اور مدار بناءِ جواز و عدمِ جواز یا استحباب کا اجتہاد اور رائے پر ہے۔ پس اس میں دو اختلاف کی گنجائش ہے۔ ایک علمی کہ واقعات سے ایک شخص کے نزدیک عدمِ جواز کی بنا متحقق ہے اور دوسرے کے نزدیک جواز یا استحباب کی۔ دوسرا عملی کہ باوجود بناءِ جواز یا استحباب پر متفق ہونے کے ایک نے بناء بر عدمِ وجوب

رخصت پر عمل کیا، دوسرے نے بنا بر استحباب عزیمت پر عمل کیا۔ ایک کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق نہیں۔ اور اگر کسی مقام پر تسلط مسلمان ہی کا ہو، مگر وہ مسلمان کافر سے مسالمت رکھتا ہو تو اس کو تسلطِ کافر کہنا محلِ تامل ہے۔"

(افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو اور کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ نہ ہو تو یہ جدوجہد واجب ہے، کبھی علی العین اور کبھی علی الکفایہ۔ لیکن اگر کسی بڑے مفسدے کا اندیشہ ہو یا استطاعت نہ ہو تو واجب نہیں، لیکن مختلف حالات میں جائز یا مستحب ہو سکتی ہے، اور اس کے تعین میں اہلِ علم کی آرا بھی مختلف ہو سکتی ہیں اور یہ اختلافِ آراء اگر اخلاص کے ساتھ ہو تو نہ مذموم ہے نہ اس میں کسی کو دوسرے پر ملامت کرنے کا حق ہے۔

لیکن چونکہ دین کا مقصودِ اصلی سیاست نہیں، بلکہ دیانات اور ان کے ذریعے رضائے حق کا حصول ہے، جیسا کہ مقالے کے آغاز میں حضرت حکیم الامتؒ ہی کے الفاظ میں اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ اس لیے ہر قسم کی سیاسی جدوجہد شرعی احکام کے دائرے میں رہ کر ہونی چاہیے۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے دین کے کسی معمولی سے معمولی حکم یا تقاضے کو بھی قربان کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب جدوجہد کرنے والا پورے اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ صرف دینِ حق کی سربلندی اور باری تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے یہ جدوجہد کر رہا ہو، اور محض جاہ و جلال کا حصول اس کا مطمحِ نظر نہ ہو، اور وہ شدید نفسانی تقاضوں کے باوجود اپنے آپ کو شریعت کے تابع رکھنے پر قادر ہو، ورنہ سیاست ایسا خارزار ہے جس میں قدم قدم پر نام و نمود اور جاہ و مال کے فتنے پیدا ہوتے ہیں، نفس و شیطان کی تاویلات انسان پر یلغار کرتی ہیں اور بسا اوقات وہ ان تمام محرکات سے مغلوب ہو کر اسی راستے پر چل پڑتا ہے جس پر دنیا جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی سیاست اسلامی سیاست کے بجائے لادینی سیاست ہو کر رہ جاتی ہے۔

(اس مضمون کی دوسری قسط حکیم الامت نمبر جلد دوم میں ملاحظہ فرمائیں)

پاکستان کا ابتدائی پانچ نکاتی خاکہ

جسے سب سے پہلے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے پیش کیا

منشی عبدالرحمٰن خان صاحب۔ ملتان

* * *

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قریباً ایک ہزار سال حکومت رہی۔ جس کے دوران دوسرے فرقوں کے مغرور برہمنوں یعنی ہندوؤں پر زر و جواہر اور انعام و اکرام کی بارشیں ہوتی رہیں، اکثر بادشاہوں اور صوبیداروں کے وزیر اعظم یعنی میر منشی اور مشیر مال برہمن ہوا کرتے تھے۔ اس اعزاز و اکرام کے باوجود سرزمین ہند پر اسلامی سلطنت کا وجود ہمیشہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت رہا اور وہ مارِ آستین بن کر ہندو راج کے قیام کے لئے کوشاں رہے۔

۱۸۵۷ء میں جب مسلمانوں نے جنگ آزادی شروع کی تو ہندو برہمن انگریزوں کے ففتھ کالم کا کردار ادا کرتے رہے اور اپنے رفقائے جنگ آزادی یعنی مسلمانوں کے خلاف مخبریاں کرتے رہے اور اپنی وفاداری کی آڑ میں انگریزوں کو بہکا کر مسلمانوں کو تختۂ مشق بناتے رہے۔ ہندو دھرم کے احیاء اور مسلمانوں کا صفحہ ہند سے نام و نشان مٹانے کے لئے ۱۸۸۷ء میں کانگرس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ۱۹۲۰-۲۱ء میں جب چند مسلمان کانگرس میں شامل ہو گئے تو انہیں پرکاہ جتنی بھی وقعت نہ دیتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو نے کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ کانگرس ہندو جماعت ہے چند مسلمانوں کے اس میں شرکت کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی مسلمانوں کو کسی گنتی میں شمار نہ کرتے ہوئے برملا کہہ دیا کہ عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں، کانگرسی لیڈر

لالہ لاجپت رائے نے حقیقت پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ کانگرس میں مسلمان اس لئے کرائے پر لائے گئے ہیں تاکہ ان کی شرکت سے ہندو کانگرس کو نیشنل کانگرس ظاہر کیا جائے اور اس کے ذریعہ ہندو راج کے قیام کی مہم جاری رکھی جائے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح کانگرس سے علیحدہ ہو گئے مگر کانگرسی علماء ہندوؤں کی چیرہ دستیوں اور مسلم کشیوں کو مقامی مناقشات کا نام دے کر ہندوؤں کے انسانیت سوز مظالم کی اہمیت گھٹاتے اور اپنی اہمیت بڑھاتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب بقول مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی:

> "ایک مردِ درویش ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا، مسلمانوں کے سارے احوال اور اُن کی زندگی کے ہر شعبے پر نظر ڈال کر حق و باطل، نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں، وہ ان کے درست کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے پوری زندگی اس امر میں صرف کر دی کہ مسلم کی تصویرِ حیات کو اس شبیہہ کے مطابق بنا دے۔ جو دینِ حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔"
>
> (جامع المجددین)

یہ ذاتِ گرامی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ جنہوں نے اس غرض کے لئے ۱۹۲۸ء کے آغاز میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "حیات المسلمین" شائع کی اور اس کے ساتھ ساتھ مطلوبہ پاکستان کا نقشہ بھی ذہناً تیار کرتے رہے۔

جون ۱۹۲۸ء میں جب حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور خلافتی رہنما مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمۃ اللہ علیہ دربارِ اشرفیہ میں تھانہ بھون پہنچے تو مولانا اشرف علی تھانوی نے بلا جھجک، صاف صاف ان زعماء کے سامنے اپنے مندرجہ ذیل پانچ نکات پیش کر دیئے:

① دل یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو۔

(۲) سارے قوانین وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو۔

(۳) بیت المال ہو۔

(۴) نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔

(۵) شرعی عدالتیں قائم ہوں، وغیرہ۔

دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے یہ نتائج کہاں حاصل ہو سکتے ہیں اس مقصد کے لئے تو صرف مسلمانوں ہی کی جماعت ہونی چاہیئے اور اسی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ (سیرت اشرف ص ۵۵۵)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس یادگار تاریخی ملاقات میں، سب سے پہلے پاکستان کا جو نقشہ پیش کیا۔ میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے اس کی مزید تفصیل چاہی تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۲، مئی ۱۹۵۵ء میں تحریر فرمایا کہ:

> "حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بعض معاصر علماء کی طرح "جنگِ آزادی" جنگِ حقوق۔ آزادی وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں۔ تمام تر دینی تھا۔ وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے، اور ۱۹۲۸ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو حضرت نے دارالسلام کی اسکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی۔ پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑیں، حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔"
>
> (سیرت اشرف، نقوش و تاثرات، اندازِ سخن)

گویا دربارِ اشرفیہ میں حصول و بقاء پاکستان کا لائحہ عمل اور نظامِ پاکستان کا مکمل نقشہ اس وقت منظرِ عام پر آیا۔ جبکہ پاکستان چاہنے والوں کو ابھی اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا، پھر لطف یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالاسلام یا پاکستان کا جو نقشہ جون ۱۹۲۸ء میں پیش کیا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کے اڑھائی سال بعد ۲۹، دسمبر ۱۹۳ء کو اپنے خطبہ الٰہ آباد میں اس کا مطالبہ صرف ان الفاظ میں کیا کہ:

„میں صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے لئے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

اس میں لفظ پاکستان یا اس کی تفصیل موجود نہ تھی۔

① حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جن متذکرہ بالا پانچ نکات پر دارالاسلام یا پاکستان چاہا تھا۔ انہی پانچ بنیادی نکات کے لئے قائداعظم نے پاکستان کی جنگ لڑی۔

② ان ہی اصولوں کی حکومت کے لئے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

③ ان ہی اصولوں کے مطابق دربار اشرفیہ کے فیض یافتہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی مساعی جمیلہ سے قرارداد مقاصد پاس ہوئی، جو اب قانونی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔

④ ان ہی اصولوں پر مجلس دستور ساز نے نظام مملکت کی بنیاد رکھی کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائیگا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

⑤ ان ہی اصولوں کی تعلیم مجلس دستور ساز نے مملکت پاکستان کے مسلمانوں کے لئے لازمی قرار دی۔ یہ شرف اولیت صرف اور صرف حضرت تھانویؒ کو حاصل ہے کہ ان کے پانچ بنیادی نکات آئینِ پاکستان کا جزو بن چکے ہیں اور بعض جنرل محمد ضیاء الحق کی مساعی سے قانونی شکل اختیار کر چکے ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بعض زعماء کی طرح صرف مسائل پیش کرنے کے عادی نہ تھے، بلکہ ان کا حل بھی ساتھ بیان فرما دیتے تھے اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں خود بھی سعی فرماتے رہتے تھے جیسے:

① متحدہ ہندوستان میں قاضیوں کے تقرر کی تحریک سب سے پہلے حضرت تھانویؒ نے شروع کی۔

② پنجاب میں شرعی نظامِ وراثت کی بجائے رواجِ عام کا قانون نافذ تھا۔ جس کی رُو سے بیٹی اور بہن کو میراث سے حصہ نہ ملتا تھا۔ جس کو منسوخ کرانے کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں بھی سبقت حاصل کرتے ہوئے اس غیر شرعی قانون کو منسوخ کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور تا زیست

اس مہم میں سر توڑ کوشش فرماتے رہے جو بالآخر ۱۹۴۵ء میں منسوخ ہو کر رہا۔

(۳) متحدہ ہندوستان میں بعض مقامات پر دینی تعلیم حکماً بند کر دی گئی۔ جبری تعلیم کی بدولت مسلمانوں پر قرآنی تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے، حضرت تھانویؒ نے اپنی دعا اور مالی امداد سے جبری تعلیم کے قانون کو منسوخ کرانے کی ایک تحریک چلائی جس کی بدولت تھوڑی مدت بعد بفضلہٖ تعالیٰ تمام دینی مدارس کھل گئے۔ اگر اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ پوری توجہ نہ فرماتے اور دوسرے رہنماؤں کی طرح منقار زیر پر رہتے تو یقیناً نتائج روح فرسا ہوتے۔

(۴) آپ کے عہد زندگی میں ہندوستان میں ایک ایسا قانون اوقاف نافذ تھا، جس کی رُو سے مسلمانوں کے اوقات کے انتظامی معاملات میں غیر مسلم حکومت دخیل تھی مسلمانوں پر مذہبی امور میں غیر مسلموں کے عمل دخل کے خلاف آپ نے جو تحریک چلائی۔ اس میں آپ نے دوسرے زعماء کی طرح صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس گوشہ نشین درویش نے چوٹی کے وکلاء سے بحث مباحثہ کے بعد اپنا موقف منوا لیا اور اس سلسلہ میں جس قدر اخراجات ہوئے ان کا ایک تہائی حصہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔ یہ مہم ۱۹۳۰ء سے شروع ہوئی، جب کہ پاکستان عالم خواب میں تھا اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دارالاسلام کے قیام کے لئے تن من دھن سے کوشاں تھے۔

(۵) دوسری جنگ عظیم کے موقع پر گورنمنٹ نے فوجی امداد دینے کے لئے ایک بل اسمبلی میں پیش کیا، جس کی کانگرس نے شدید مخالفت کرتے ہوئے قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف آسمان سر پر اُٹھا لیا اور مختلف ذرائع سے قائد اعظم کو بدنام کرنا شروع کر دیا جن کے واویلا کا اثر دربار اشرفیہ تک جا پہنچا۔ کانگرس زدہ حضرات نے آرمی بل کی آڑ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو قائد اعظم سے برگشتہ کرنے کی شدّت سے کوششیں کرنی اور چالیں چلنی شروع کر دیں جس پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً اپنا ایک وفد بغرض وضاحت قائد اعظم کی خدمت میں دہلی بھیجا، جسے ملاقات

کے لیۓ آدھ گھنٹہ دیا گیا۔ جب بات طول کھینچنے لگی تو قائدِ وفد نے قائدِ اعظم سے کہا کہ اگر آپ کا کچھ حرج ہوتا ہو تو ہمیں اجازت بخشیں۔ قائدِ اعظم نے فرمایا کہ:

”نہیں! دوسرے لوگ جو مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیا کہیں گے۔ لیکن آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ وہ میں نہیں جانتا۔ اس لیۓ آپ جس قدر چاہیں شوق سے گفتگو کریں۔ میں برابر سنوں گا“

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ قائدِ اعظم کی دینی تربیت فرما رہے تھے اور مسلم لیگ کی حمایت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کر رہے تھے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر حرف قائدِ اعظم کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا متذکرہ بالا وفد کو دیا ہوا آدھ گھنٹہ کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ پر ختم ہوا۔ جب اس وفد نے واپس جاکر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو تمام حالات سنائے تو انہوں نے ازراہِ مسرت قائدِ اعظم کے متعلق فرمایا کہ:

”قوم کے اس مخلص رہنما کی نظر صرف آج کے حالات پر ہی نہیں، بلکہ آج سے نو دس سال بعد ہونے والے واقعات کو بھی وہ اپنی چشمِ فراست سے برابر دیکھ رہے ہیں“

مسلم لیگ کے مخالفین نے جب حضرت تھانوی“ کو آر می بل کے سلسلہ میں قائدِ اعظم کی تائید میں پایا تو ان کے عزائم مشئومہ پر اوس پڑ گئی۔

اندازہ لگائیے اور انصاف کیجیے کہ ایک غیر معروف دُور اُفتادہ حصہ میں بیٹھا ہوا یہ دور بین مردِ درویش کس طرح ہندوستان میں پاکستان کی داغ بیل ڈالنے کے آئینی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ تنِ واحد ہے۔ کوئی جماعت نہیں، چندہ نہیں، جلسہ نہیں، جلوس نہیں، پریس نہیں، اخبار نہیں۔ ماحول سارے کا سارا مخالف ہے۔ حصول پاکستان کی جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے اس مقصد کے لئے مصروف جد و جہد ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد تحریک خلافت کے آغاز سے ہندوستان میں ایک ایسا بیپناہ سیاسی طوفان آیا کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر جن میں عالم بھی شامل تھے یہ کہتے

پھرتے تھے کہ بھائیو! تم ہندو بھائیوں کو راضی کرو۔ چاہے ہمارا دین ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے، مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔ وغیرہ۔ (مدینہ بجنور ۲۱، فروری ۱۹۲۰ء)

اور ایک ایسا فتنہ کھڑا ہو گیا۔ جس کے فرو کرنے کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو راہ راست پر لانے کی مساعی شروع کر دیں اور انہیں قرآن کریم کا یہ ارشادِ ربی سنانا شروع کیا کہ قیامت آجائے ہندو کبھی مسلمان کا خیر خواہ اور دوست نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ تم ان کا مذہب اختیار نہ کر لو۔ اس فتنہ کی پشت پناہی ہندو کانگرس کر رہی تھی۔ جس کے رہنما گاندھی تھے۔ جو قائد اعظم اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرسی علماء کی امداد سے شورش پیدا کر رہے تھے۔ جس پر حضرت تھانوی نے مسلم لیگ سے تعاون کرنے کے لئے فتوے صادر کر دیا۔ جو کانگرسی صفوں میں اسلامی بم بن کر پھٹا۔ جس کی پاداش میں حضرت تھانویؒ کو قتل کرنے کے لئے غنڈے بھیجے گئے۔ جو اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جس راستے حضرت تھانوی صبح کو نماز پڑھنے کے لئے مسجد جایا کرتے تھے۔ حضرت تھانوی کو قتل کی دھمکیاں اور خطوط کانگرسی تنخواہ خوار مسلمان پہلے دے چکے تھے۔ بلکہ مسلم لیگی صحافی مولانا مظہر الدین کو قتل کر چکے تھے۔ مگر ان سب باتوں کا علم ہونے کے باوجود حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی حمایت جاری رکھی اور نہ مسجد جانے کا راستہ بدلا۔ کانگرسی ٹولہ حضرت تھانوی کو آتے دیکھ کر ان کو قتل کرنے کیلئے جب آگے بڑھا تو ان پر ایسی ہیبت حق طاری ہوئی کہ انہوں نے قدموں پر زور دیا اور بھاگ گئے مگر حضرت تھانویؒ مسلم لیگ کی حمایت سے تادمِ آخر باز نہ آئے۔

حضرت تھانوی طبعاً درویش منش تھے۔ وہ سیاسی تحریکات میں حصہ نہ لیتے تھے مگر سیاسی تحریکات کے سلسلہ میں جب آپ کے پاس استفسار آئے تو اسوقت بحیثیت مجددؒ الملت حکیم الامت آپ کو ان کی شرعی حیثیت واضح کرنی پڑتی جو کانگرس جمیعۃ العلماءٗ احرار، مومن کانفرنس اور نیشلسٹ مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت ہوتی۔ یہ ایک ایسا دور تھا جس میں سب کو کچھ نہ کچھ اپنے مرکز سے سُننا پڑا۔ مگر حضرت تھانوی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مستحکم رہے اور اپنی رائے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے۔ اسی مسلکِ حق کی بدولت پر آڑے وقت میں ارباب مسلم لیگ آپ سے مشورہ لیتے رہے۔ اس پر عمل کرتے رہے۔ متذکرہ بالا پارٹیوں یا جماعتوں کی سعی و اتحاد کے باوجود حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعا، پُرخلوص اعانت مسلم لیگ تاریخ ساز الیکشن جیتتی رہی۔ جس پر قائداعظم کو بہت فخر تھا۔ اسی لیئے ایک دفعہ قائداعظم کی مجلس میں بمبئی کے چند تاجروں نے یہ کہا کہ کانگرس میں علماء زیادہ ہیں اور مسلم لیگ میں علماء کوئی نہیں۔ جس پر قائداعظم نے جوش کے لہجہ میں فرمایا کہ مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم و تقدس اور تقوےٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔ جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے، ہمیں پرواہ نہیں۔ (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی ص ۹۶)

ایسا ہی جوش اسوقت دیکھا گیا۔ جب حضرت تھانوی کا تبلیغی وفد قائداعظم کو نماز پڑھنے کی تلقین کر رہا تھا۔ قائد وفد مولانا شبیر علی تھانوی نے جب قائداعظم سے کہا کہ "خود آپ پر بھی تو نماز فرض ہے۔ آپ کیوں نہیں پڑھتے"؟ اسوقت قائداعظم کرسی پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے قائد وفد لکھتے ہیں کہ میری بات سُن کر وہ آگے کو جھک گئے اور نہایت ندامت کے لہجے میں یہ الفاظ فرمائے:

> "میں گنہگار ہوں۔ خطاوار ہوں۔ آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں۔ میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔"

امروز سے تا دمِ آخر وہ نماز پڑھتے رہے۔

منصوبہ پاکستان چونکہ اللہ والوں کا تیار کردہ تھا۔ اسلئے اُسے تائید ایزدی حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے ہر میدان میں دشمنانِ پاکستان کی سیاست اور ان کی تدابیر ناکام رہیں اور مٹھی بھر ——— مخلص علماء ربانی کامیاب و کامران رہے۔ صوبہ سرحد اور صوبہ سلہٹ میں ان ہی کی قربانیوں کی وجہ سے ریفرنڈم میں کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی قربانیوں نے ان دونوں صوبوں کو پاکستان میں شامل کرا کر اُسے دنیا کی پانچویں بڑی مملکت بنایا۔ اگر یہ دونوں صوبے پاکستان میں شامل نہ ہوتے تو پاکستان کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اس تاریخی اور شاندار فتح کی خوشی میں ۲۷، رمضان المبارک یعنی ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ المبارک جشنِ آزادی پاکستان کے موقع پر ملک کی سب سے بڑی مقتدر ہستی یعنی قائداعظم محمد علی جناح گورنر

جنرل پاکستان نے علماء ربانی کی تاریخی خدمات کے اعتراف کے طور پر پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کو بخشا۔ جنہوں نے اپنے متبرک ہاتھوں سے آزاد پاکستان کا آزاد فضا میں پرچم لہرا کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ مجدّد الملّت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دنیا کے سامنے پاکستان کا جو نقشہ جون ۱۹۲۸ء میں پیش کیا تھا۔ اس کی رسم افتتاح بھی دربارِ اشرفیہ کے خدام کے حصہ میں آئی۔

* * *

ملک کے معروف قانون دان جناب اے کے بروہی (مرحوم) کا حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے متعلق تاثر

جہاں تک مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تعلق ہے جنہیں عہدِ حاضر کا اُس دور کا جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں مجتہد سمجھا جاتا ہے، جو صحیح معنوں میں حکیم الامت ہیں اور جنہیں میں ایک عظیم اسکالر سمجھتا ہوں اور جو علم کے انتہائی بلند منصب پر فائز ہیں۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ

اور

انڈین نیشنل کانگرس

محترم پروفیسر احمد سعید صاحب

* * *

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جنگِ آزادی کے ختم ہوتے ہی دار و گیر کا وہ بازار گرم ہوا۔ جس میں رحم و انصاف کا کوئی نام نہ تھا۔ اگرچہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ لیکن جنگ کے بعد صرف مسلمان ہی انگریزوں کا ہدف بنے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرسید احمد خاں نے کہا تھا کہ:

> "وہ کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانے میں نہ ہوئی ہو گو وہ ماتا دین اور رام دین نے ہی کی ہو، یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ ان دنوں جو اخبارات میری نظر سے گزرے اور جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان۔ کوئی کانٹے دار درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا۔"[1]

۱۸۸۴ء میں انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ ممبر اے او ہیوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں ایک جماعت کا قیام اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کے دل کا غبار نکلتا رہے۔ ہیوم جو کہ برطانوی حکومت کا زبردست خیر خواہ تھا۔ برطانوی سلطنت کے

---

[1] سیاست ملیہ ص ۷

مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس بات کا خواہش مند تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات نہ دہرائے جائیں۔ یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ ہیوم کو یہ خیال سرسید کی کتاب رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند پڑھنے کے بعد پیدا ہوا اور اس بات کا تذکرہ اس نے خود صاحب زادہ آفتاب احمد خاں سے کیا تھا۔ ہیوم دراصل کوئی سیاسی جماعت قائم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اُسکے ذہن میں محض ایک سماجی تنظیم کا نقشہ تھا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ جس صوبہ میں اس مجوزہ جماعت کا اجلاس ہو۔ وہاں کا گورنر اس کی صدارت کیا کرے۔ لیکن جب یہ تجاویز گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کو پیش کی گئیں تو اس نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مجوزہ تنظیم کو سیاسی بنیادوں پر قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ لارڈ ڈفرن کا کہنا ہے کہ چونکہ ہندوستان میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں جو حکومت کو اسکی خامیوں سے آگاہ کرے اس لیے ہندوستان میں کوئی ایسی سیاسی جماعت ہونی چاہیے جو حکومت کو عوام کی مشکلات اور تکالیف سے آگاہ کرتی رہے۔ لے او ہیوم نے لارڈ ڈفرن کے مشوروں کو قبول کیا اور ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگرس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کر دی گئی۔

مسلمانوں میں سرسید احمد خان پہلے رہنما تھے۔ جنہوں نے کانگرس کی اعلانیہ طور پر مخالفت کی اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے اجتناب کریں۔ اپنے آپ کو صرف تعلیم کے لئے وقف کر دیں۔ کانگرس نے ابتداء ہی سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ ہندوستان میں لوکل باڈیز اور دوسرے اداروں میں انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔ سرسید احمد خان نے اس دور کے حالات کے پیشِ نظر کانگرس کے اس مطالبہ کی سختی سے مخالفت کی۔

سرسید کی مانند مولانا تھانوی نے بھی مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کانگرس کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ حضرت تھانوی کی رائے میں چونکہ کانگرس کے ارکان کی اکثریت غیر مسلمو پر مشتمل تھی اور تمام اعلےٰ واہم عہدے بھی انہی کے قبضے میں تھے۔ اس لئے اگر مسلمان چاہتے تب بھی وہ اس کی اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت ان کو نہ تو کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی اور نہ وہ اپنے مفاد کے خلاف پیش کی گئی کسی تجویز یا قرارداد کو مسترد کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ دوسری جانب آپ کے خیال میں اگرچہ مسلم لیگ بھی نقائص سے پاک نہیں تھی، لیکن چونکہ اس جماعت کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل

تھی۔ اس لئے اس کی اصلاح کے بہت زیادہ امکانات موجود تھے۔ اس لئے مولانا کا کہنا تھا کہ اس صورت حال میں مسلمانوں کا کانگرس سے علیحدہ رہنا اور مسلم لیگ میں اس کی اصلاح کی غرض سے شامل ہونا مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھا۔

مولانا تھانوی کا کانگرس کے بارے میں واضح رویہ سہارن پور کے ایک الیکشن کے دوران سامنے آیا۔ اس انتخاب میں مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے حصہ لیا۔ انتخابی مہم کے دوران میں کانگرسی حلقوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا ناجائز ہے۔ مسلم لیگ کے ایک ورکر نے مولانا سے اس صورتِ حال کے شرعی پہلو کی وضاحت چاہی کہ کیا آپ کے نزدیک کانگرس کو ووٹ دینا جائز ہے۔ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا تھانوی نے کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت کو "ناجائز" اور اس کے لئے کام کرنے کو اہل اسلام کے لئے مضر قرار دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے قرآن مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

> "کانگرس کے حالات کا معلوم ہونا کافی ہے، جو اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے"
>
> "یا ایھا الذین اٰمنو لا تتخذ وا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عَنِتُّم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر"
>
> ترجمہ: "اے ایمان والو! نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو۔ وہ کمی نہیں کرتے، تمہاری خرابی میں۔ ان کو خوشی ہے، تم کو جس قدر تکلیف پہنچے۔ ان کی بڑھتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے زیادہ ہے"

یہ آیت پیش کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے لکھا کہ:

> "موجودہ حالات میں حزم و یقین کے ساتھ میری یہ رائے ہے کہ جو شخص کانگرس کی موافقت میں سعی کا ساعی ہو، وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا اور اس کی موافقت اور اس کے لئے سعی کرنے کو اہل اسلام کے لئے مضر سمجھتا ہوں۔"[1]

---

[1] مفتی محمد شفیع، افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (دیوبند ۱۳۶۵ھ) ص: ۶۵۔۶۶

۱۹۳۷ء میں الہ آباد مسلم لیگ کے سیکرٹری احسان الحق نے مولانا تھانوی سے دریافت کیا کہ آیا مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ میں شمولیت کرنا مناسب ہے یا کانگرس میں۔ اس کے جواب میں مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ:

> ”میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیئے۔ باقی کانگرس کے حالات جو معلوم ہوئے ہیں۔ ان کی بناء پر تو اس میں ہرگز شامل نہ ہونا چاہیئے“۔[1]

۱۹۳۹ء میں جمیعۃ العلماء ہند کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا تھانوی کو بھی مدعو کیا گیا۔ مولانا نے اجلاس میں شریک نہ ہو سکنے پر اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اس دعوت نامے کے جواب میں جو کچھ لکھا، کانگرس کے متعلق آپ کے خیالات کے بارے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ساتھ ہی اس سے کانگرس کے متعلق آپ کے سخت رویے کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا کہ:

> ”اب تو واقعات (کانگرس کے دو سالہ دورِ اقتدار (۱۹۳۷ء ــــ ۱۹۳۹ء) کے دوران مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی طرف اشارہ ہے) نے مجھ کو اس رائے پر نہایت پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگرس میں شریک ہونا نہ صرف مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کا کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرانا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے“۔[2]

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ:

> ”علامہ اقبال اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں مسلمانوں کی کانگرس میں شمولیت کے بارے میں ہم خیال تھے۔ مولانا تھانوی کی مانند علامہ اقبال کی بھی یہی رائے تھی کہ کانگرس میں مسلمانوں کی غیر مشروط شمولیت اسلام اور مسلمانوں دونوں کو

---

[1] روزنامہ انقلاب، لاہور ۳، دسمبر ۱۹۳۷ء، ص ۲۔

[2] افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۸۸

کے لئے مضر ہے۔"[1]

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مسلمانوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس وقت تک یہ جماعت محض ایک کاغذی جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ تحریک کے دوران جب مسلمان اس کی کارروائیوں میں شریک ہوئے تو اس جماعت کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا تھانوی نے اپنی مجالس میں بارہا اس حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> "کانگرس کی مقبولیت کی وجہ محض یہ تھی کہ مسلمانوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ ہندوؤں کی پچاس سالہ مردہ کانگرس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے اس میں شرکت نہ کی تھی۔ کسی نے کانگرس کا نام تک بھی نہ سنا تھا۔"[2]

مشہور اچھوت راہنما ڈاکٹر امید کر نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> "کانگرس کو عظیم اور طاقت ور بنانے والے ہندو نہیں تھے۔"[3]

کانگرس میں پنڈت نہرو کو جو اثر رسوخ حاصل تھا۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی اور جو اشتراکی خیالات کو پھیلانا اپنے مذہب کا جزو سمجھتے تھے۔ مولانا تھانوی کے نزدیک یہی امر سب سے خطرناک تھا کہ کانگرسی عموماً مذہب کے حامی نہیں۔ اسی بناء پر آپ کانگرس کو بالشویک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا کہ:

> "جو آدمی بھی حدود شریعت سے گزر کر کام کرے گا۔ اس کا بُرا ہی حشر ہوگا۔ اس بناء پر ہم کانگرسیوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں کانگرسی اصل میں بالشویک ہیں۔ یہ کسی طرح بھی مذہب کی حامی جماعت نہیں، بلکہ محض

---

[1] بشیر احمد ڈار، انوار اقبال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۷ء ص ۲۲۳۔

[2] الافاضات الیومیہ۔ ج پنجم ص ۸۸ - ۸۷

[3] ایضاً ایضاً

سیاسی جماعت ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت برسرِاقتدار آگئی اور خدانہ کرے وہ دن بھی آئے تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کریں گے جو بالشویک کر رہے ہیں۔“[1]

مولانا تھانوی کی مجالس میں جب بھی کانگرس کا تذکرہ ہوا۔ آپ نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اس میں شمولیت سے گریز کریں۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ:

> ”کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنا ہے۔ مسلمانوں کی کانگرس میں شرکت، ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا یا ان کو ساتھ ملا کر کام کرنا، اسلام اور مسلمانوں، دونوں کے لئے نہایت خطرناک ہے۔“

مولانا تھانوی کی یہ پختہ رائے تھی کہ کانگرس انگریزوں کے ہندوستان سے اخراج میں مخلص نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انگریزوں سے مل کر اپنی قوم کو پروان چڑھاتی رہے۔ اسی سلسلے میں دورانِ گفتگو فرمایا کہ:

> ”کانگرس ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا نہیں چاہتی اور درحقیقت ان کی عافیت بھی اسی میں ہے کہ انگریز ہندوستان میں رہیں۔ ورنہ سارے ہندو اطمینان سے ہرگز حکومت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے انگریزوں کے زیرِ سایہ رہ کر اپنی قوم کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔“

ایک اور مجلس میں کانگرسی علماء کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> ”ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا نہیں چاہتے۔ ان کا نفع تو انگریزوں کے قیام ہی میں ہے۔“[2]

کانگرسی علماء

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مولانا تھانوی کے نزدیک کانگرس کی مقبولیت کا واحد سبب اس میں مسلمانوں کی شرکت تھی اور علماء کی شرکت نے تو اس کو اور بھی مقبول بنا دیا تھا۔ مولانا تھانوی نے کانگرسی علماء کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ علماء

---

[1] الافاضات الیومیہ، جلد چہارم ص ۱۴۱ - ۱۴۲

[2] ابرار الحق حقی، اسعد الابرار (بارہ بنکی ۱۹۳۸ء) ص ۱۳۶

کی ایک جماعت تو وہ تھی جو اپنی تقاریر اور مضمون نگاری کی وجہ سے عوام میں مولانا کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اگرچہ یہ لوگ باقاعدہ طور پر عالم نہیں تھے۔ علماء کی دوسری جماعت وہ تھی جو باقاعدہ دین کا علم رکھتی تھی اور بدقسمتی سے کانگرس کا ساتھ دے رہی تھی۔ مولانا تھانوی کو علماء کی اسی جماعت سے گلہ تھا کہ وہ فنائی الکانگرس ہو کر حدود شریعت سے تجاوز کر رہے تھے۔ مولانا تھانوی کو اس گروہ سے یہ شکوہ تھا کہ وہ انگریزوں کے بغض کی وجہ سے کانگرس کے ساتھ بوجوہ موافقت کر رہے تھے اور اس سلسلے میں شرعی حدود و قیود کو بھی نظر انداز کر رہے تھے۔ ایک مجلس میں کانگرسی علماء کے اس طبقے کے رویہ کے بارے میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> "یہ دوسری قسم کے لوگ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان سے انگریز نکل جائے تو تمام عالم کو سکون ہوگا۔ اس لئے ہم کو جان توڑ کوشش کرنی چاہیئے۔ خواہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایمان ہی کیوں نہ برباد ہو جائے"

یہ علماء کانگرس میں اپنی شمولیت کے جواز میں کہتے تھے کہ اس طرح کانگرس پر مسلمانوں کا قبضہ اور غلبہ ہو جائے گا۔ مولانا تھانوی ان کی اس دلیل سے متفق نہیں تھے اور جواباً یہ فرماتے تھے کہ:

> "اگر واقعی مقصود یہی ہے تو اس مقصد کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کے لئے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے بتایا کہ ہم حضرات علماء کی رائے کے اتباع کے لئے تیار ہیں اور کانگرسی تو خود اپنا تابع بناتے ہیں۔ ان پر غلبہ پانا مشکل ہے"[1]

علامہ اقبال بھی مولانا تھانوی کی اس رائے سے متفق تھے کہ علماء کو کانگرس اور ہندوؤں کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ مسلمانوں کو خود اپنی تنظیم کو مضبوط کرنا چاہیئے۔ ایک گفتگو کے دوران علامہ اقبال نے فرمایا کہ:

---

[1] اسعد الابرار ص: ۱۳۶

[2] سید نذیر نیازی اقبال کے حضور کراچی ۱۹۷۱ء ص: ۲۵۶

„کانگرسی خیال کے علماء، ہندوؤں کا ساتھ دیکر بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اگر قوم نے ان کا ساتھ دیا تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہوگا۔“

کانگرس کا دو سالہ دورِ استبداد ۱۹۳۷ — ۱۹۳۹

مولانا تھانوی کی نظر میں

دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب وقار الملک نے فرمایا تھا کہ:

> „اس وقت اپنی قوم پر وہ قوم حکمراں ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار گنا زیادہ ہے، اے صاحبو! ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری کیا حالت ہوگی۔ اس وقت ہمارا مذہب، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے۔ جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے دوستوں (ہندوؤں) سے پیش آتی رہتی ہیں۔ اس کے نظائر کم و بیش ہر صوبہ میں موجود ہیں۔ تو وائے اس وقت پر جب کہ ہم لوگوں کو ان لوگوں کا محکوم رہنا پڑے گا جو اورنگ زیب کا بدلہ ہم سے صدہا برس بعد لینا چاہتے ہیں“۔[1]

وقار الملک کی یہ پیشین گوئی کانگرس کے اسی دو سالہ دورِ اقتدار ۱۹۳۷ء — ۱۹۳۹ء میں صحیح ثابت ہوئی۔ جبکہ اس نے اس مختصر عرصے میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت زبان اور مذہب کو مسخ اور تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومتِ ہند کے تحت ۱۹۳۷ء میں منعقدہ انتخابات میں کانگرس چھ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ان صوبوں میں حکومت سنبھالنے کے بعد کانگرس

---

[1] اکرام اللہ ندوی وقار حیات مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۵ء، ص ۶۶۴، ۶۶۵

نے اُردو زبان کو مٹانے، ودیا مندر سکیم اور دیہات سدھار سکیم جیسی مسلم کش سکیموں کو رائج کیا اس دوران میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتا پیرپور رپورٹ، شریف رپورٹ، سی پی میں کانگرس راج اس کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ ان دو سالوں میں مسلمان کس حد تک کانگرسی اور ہندوؤں سے نالاں تھے۔ اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانگرسی وزارتوں کے استعفیٰ پر مسلمانوں نے قائداعظم کی زیرِ ہدایت یوم نجات (۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء) منا کر اس جابر حکومت کے خاتمہ پر اطمینان کا سانس لیا۔

اُردو زبان

مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی نے ہندوؤں کے بارے میں لکھا تھا کہ:

> "وہ ہر اس امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو انہیں مسلمانوں کے عہد کی یاد دلائے۔ کم از کم اُردو زبان کے متعلق تو ہندوؤں کا یہی رویہ تھا۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی، دونوں قوموں میں اس کی نشوونما میں برابر کا حصہ لیا۔ لیکن ہندو اپنی تنگ نظری کی بناء پر اس کو محض "مسلمانوں کی زبان" قرار دیتے رہے۔ انہوں نے ۱۸۶۷ء سے ہی اُردو کی بجائے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کو دفاتر اور عدالتوں میں رائج کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ ہندوؤں کے اس طرزِ عمل سے ہندو مسلم اتحاد کے داعی سرسید احمد خاں کو سخت صدمہ پہنچایا، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دِل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا، دیکھے گا۔"[1]

---

[1] الطاف حسین حالی حیاتِ جاوید (آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۶ء) ص ۱۶۴

۱۹۰۰ء میں ایک مرتبہ پھر ہندوؤں نے اُردو زبان کی بجائے ہندی زبان کو عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں رائج کرنے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں انہیں یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل کی آشیرباد اور سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے اپریل ۱۹۰۰ء میں سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں ہندی زبان رائج کرنے کا حکم دیدیا۔ اس موقع پر نواب محسن الملک نے اُردو زبان کی حفاظت کی غرض سے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے تحت مختلف مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ جن میں مسلمان زعماء حکومت کے اس غیر دانشمندانہ فیصلے پر نکتہ چینی کرتے رہے۔ اِسی سلسلے میں لکھنؤ میں بھی ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک نے نہایت جذباتی انداز میں تقریر کی۔ سر عبدالقادر جو اس جلسے میں موجود تھے۔ نواب صاحب کی اس تقریر کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ:

“محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش وخروش سے تقریر کی، اس کی نظیر پہلے میں نے نہیں دیکھی تھی۔ یوں کہیے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو اُبل اُبل کر پہاڑ سے نکل رہا تھا۔ آخر میں نواب محسن الملک نے کہا کہ اگر حکومت اُردو زبان کو مٹانے پر تُل ہی گئی ہے تو بہت اچھا ہم اُردو کی لاش کو گومتی میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور ایک والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔”

؎ چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے[1]

نواب محسن الملک اور دیگر زعماء کی کوششوں سے ہندوؤں کو اپنے مشن میں ناکامی ہوئی لیکن کانگرس کے اس دو سالہ دورِ اقتدار میں کانگرس اور ہندوؤں کو یہ سنہری موقع ہاتھ آیا کہ وہ اُردو کے خلاف نصف صدی سے جاری شدہ مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ یہ لسانی مسئلہ اب سراسر سیاسی نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ کانگرس نے اُردو زبان کی طرف نظرِ عنایت شروع کی اور ایک مردہ زبان میں دوبارہ جان ڈالنے کے درپے ہو گئے۔

---

[1] عاشق حسین بٹالوی چند یادیں چند تاثرات (آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء) ص ۴۳، ۴۴

اُردو زبان کا مسئلہ نہ صرف ایک لسانی اور سیاسی مسئلہ تھا بلکہ اب اس کی مذہبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہو چکی تھی، جس کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دینی لٹریچر کا ایک خاصا حصہ عربی اور فارسی سے ترجمہ ہو کر اُردو زبان میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس لئے اُردو زبان کو نقصان پہنچنے کی صورت میں دینی لٹریچر پر بھی زد پڑتی تھی۔ اسی امکان کے پیش نظر مولانا اشرف علی تھانوی نے اُردو زبان کی حمایت میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ مولانا تھانوی نے اپنے اس فتویٰ میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ:

> ”اگر خدانخواستہ یہ زبان (اُردو) ضائع ہو گئی تو مسلمانوں کا تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا، وہ تمام دینی کتابیں جو تمام دینی کتابیں جو فارسی یا عربی میں تھیں۔ اب ان کا اُردو میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر یہ زبان ضائع ہو گئی تو مسلمانوں خاص طور پر عوام مسلمین کے لئے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہے گا تو کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے۔“

مولانا نے اپنے فتویٰ میں اُردو زبان کی حفاظت کو دین کی حفاظت کے مترادف قرار دیا اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

> ”اُردو زبان کی حفاظت حسب استطاعت واجب ہو گی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا موجب مواخذہ آخرت ہو گا۔“[۱]

۱۹۳۸ء میں مولانا تھانوی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیغام لکھ کر بھیجا تھا۔ اس پیغام میں بھی آپ نے مسلمانوں اور بالخصوص مسلم لیگ پر زور دیا کہ:

> ”وہ اُردو زبان کے تحفظ کے لئے بھرپور کوشش کریں۔ مولانا کے نزدیک کانگرس کا مقصد اُردو زبان کو فنا کر کے ہندی زبان کو رائج کرنا تھا اور اس کی تہ میں وہی جذبہ کام کر رہا تھا۔ جس کی بناء پر انگریزوں نے ہندوستان میں انگریزی زبان کو رائج کرنا چاہا تھا۔“

---

[۱] مولانا اشرف علی تھانوی امداد الفتاویٰ (ادارہ اشرف العلوم کراچی) جلد چہارم ص ۶۰۷-۶۱۱

مولانا کی رائے میں کانگرس کی یہ چال مسلمانوں میں "ذہنی انقلاب" پیدا کرنے کے لئے چلائی گئی تھی تاکہ ان کو متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اپنے بیان میں مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

> "اردو ہندی کا جھگڑا محض مسلمانوں کو فنا کرنے اور ان میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لئے اُٹھایا گیا ہے۔"[1]

اس طرح کانگرس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف مولانا کے فتوے مسلمانوں کو ذہنی طور پر پیدا کرنے میں بہت ممد ثابت ہوئے۔

پرارتھنا اور دیگر غیر اسلامی رسومات

کانگرس نے چھ صوبوں میں حکومت سنبھالنے کے بعد یہ سمجھا کہ ہندو راج قائم کرنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اس لئے اس نے بہت سے ایسے اقدامات کیے، جنکا مقصد محض مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچانا تھا۔ بندے ماترم کا ترانہ جو کہ مسلم دشمنی کی علامت اور مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ کانگرس کا قومی ترانہ قرار پایا۔ اسمبلیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائی کا آغاز اس رسوائے زمانہ ترانے سے کیا جانے لگا۔ مسلمان بچوں کے لئے گاندھی کی تصویر کے سامنے پرارتھنا کرنا لازمی قرار پایا۔ چونکہ یہ معاملات براہِ راست مسلمانوں کے مذہبی عقائد سے متعلق تھے۔ اس لئے ان صوبوں کے مسلمانوں نے مولانا تھانوی کی طرف رجوع کیا اور آپ سے ان مسائل پر شرعی رائے طلب کی۔ بلند شہر کے چند مسلمانوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا تھانوی کو ایک خط لکھا۔ جس میں پرارتھنا کی شرعی حیثیت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی گئی۔ اس خط میں کہا گیا کہ:

> "جلسہ بورڈ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۷ء کو چند ممبر صاحبان بورڈ نے یہ تحریک پیش کی کہ جملہ مدارس زیر اہتمام بورڈ میں منسلکہ پرارتھنا متعلق قومی ترنگا جھنڈا روزانہ مدارس کے شروع کئے جانے پر کی جائے۔ اس پر جملہ مسلمان ممبران نے اعتراض کیا کہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ سوائے خداوند کریم کے کسی دوسرے

---

[1] مولانا اشرف علی تھانوی - خطاب بہ مسلم لیگ - بھارت الیکٹرک پریس، سہارنپور، ۱۳۵۷ھ ص ۱۲

شخص کے روبرو پرارتھنا کی جائے اور اگر بورڈ کثرت رائے سے پرارتھنا کرنی منظور کرتا ہے تو مسلمان طلبہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ اس پر بذریعہ رزولیوشن نمبر ۲۱۳ میں یہ طے کیا ہے کہ اس مسئلہ پر آپ کی رائے لی جائے لہٰذا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلے پر جلد از جلد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں کہ آیا جھنڈے کے سامنے پرارتھنا کرنی جائز ہے یا نہیں۔"

مولانا تھانوی نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس مسئلے سے متعلق شرعی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان مسلمان ممبران کے اعتراض کو صحیح اور جائز قرار دیا۔ مولانا نے فتویٰ جاری کیا کہ:

"واقعی مذہب اسلام اس قسم کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ تو اس جھنڈے کی تعظیم شرعاً جائز ہے اور نہ اس ترانہ کی اور نہ ایسے جلسوں میں شرکت کی اجازت ہے"[1]

واردھا سکیم

کانگرس شروع ہی سے اس بات پر زور دیتی چلی آتی تھی کہ ہندوستان میں صرف قوم آباد ہے اور وہی تمام ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ادھر مسلمانوں نے ہمیشہ کانگرس کے اس بے بنیاد دعویٰ کو چیلنج کیا اور مختلف اوقات میں اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد کانگرس نے تعلیم کے لبادے میں مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے دھارے میں ڈھالنے کی چال چلی چنانچہ اس نے حکومت سنبھالنے کے بعد ایک تعلیمی سکیم تیار کی۔ جس کو "واردھا تعلیمی سکیم" کا نام دیا گیا۔ یہ سکیم گاندھی کی براہ راست راہنمائی اور زیر ہدایت مرتب کی گئی تھی۔[2] یہ سکیم جو کانگرس کے سیاسی پروگرام کا ایک حصہ تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو تہس نہس کرنے کی غرض سے تیار کی گئی تھی۔ کانگرس کا مدعا تھا کہ اس سکیم کے ذریعے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو اسلامی تہذیب و تمدن، ثقافت، مذہب اور اپنے مذہبی شعار سے بالکل بیگانہ ہو۔ معصوم بیگانہ ہو۔ معصوم بچوں کے ذہنوں میں یہ بات نقش کر دی جائے کہ مسلم ثقافت، ہندو ثقافت سے

---

[1] امداد الفتاویٰ۔ جلد چہارم ص ۶۰۱ - ۶۰۲

[2] خورشید مصطفےٰ رضوی۔ حیات ذاکر حسین مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۹ء ص ۸۸

آگے ہیچ ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ایسی نصابی کتب تیار کرائی گئیں۔ جن میں مسلم ثقافت کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ یہ کتابیں اسلامی تعلیمات کے منافی عقائد مثلاً عدم تشدد، وطن پرستی، اور موسیقی سے متعلق موضوعات سے پُر تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دیگر زعماء کی زندگی اور تعلیمات کو ان کتابوں میں اس انداز سے پیش کیا گیا تھا کہ طلباء کے دلوں سے ان کی عظمت، وقار اور احترام ختم ہو جائے۔ مسلم ثقافت کو جان بوجھ کر معمولی انداز میں پیش کیا گیا۔ غرض کہ یہ سیاسی سکیم جس کو تعلیم کا لبادہ پہنایا گیا تھا مسلمانوں کو محض متحدہ قومیت کے جال میں اتار کر ان کے ملی تشخص کو ختم کرنے کی ایک سازش کے سوا کچھ نہ تھا۔

مسلمان ہندوؤں کی اس چال سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لئے انھوں نے پورے شد و مد کے ساتھ اس نام نہاد تعلیمی سکیم کی نہ صرف مذمت بلکہ مخالفت کی۔ مسلمانوں کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں آل انڈیا مسلم لیگ، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور جمعیتہ العلماء ہند وغیرہ نے اس سکیم کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ۲، جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں قائدعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت واردھا سکیم سے متعلق ایک قرارداد منظور کی۔ جس کے ذریعے مسلم لیگ نے اس سکیم کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ کے نزدیک اس سکیم کا مقصد مسلم کلچر کو بتدریج تباہ کر کے اس پر ہندو کلچر کو غالب کرنا تھا۔[1]

علامہ سید سلیمان ندوی نے کانگرس کی اس نام نہاد تعلیمی سکیم کو "اقلیتوں پر اکثریت کو رو غن چڑھانے کی ایک کوشش قرار دیا"۔[2]

کانگرس کی حامی جمعیتہ العلماء ہند نے بھی اس سکیم کو نہ صرف مسترد کر دیا۔ بلکہ مولانا احمد سعید نے تو مارچ ۱۹۳۹ء کو دہلی میں جمعیتہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ اگر کانگرس نے اسکیم کو مکمل طور پر نافذ کیا تو جمعیتہ سول نافرمانی سے بھی گریز نہیں کرے گی جمعیتہ کے نزدیک اگرچہ اس اسکیم میں بہت سی قابلِ اعتراض باتیں موجود تھیں، لیکن اُسکے

---

[1] Liaqat Ali Khan: Resolution of the All India Muslim League Dec. 1938-March 1940 pages 14-15.

[2] ہندی اُردو تنازع، ص: ۳۸۲

نزدیک سب سے زیادہ قابلِ اعتراض جزو عدم تشدد کے اصول کو تسلیم کرنے پر زور دینا تھا۔ جمعیتہ نے سکیم کے اس پہلو کو بھی غیر اسلامی قرار دیا۔ جس کے تحت تمام مذاہب کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا تھا[1]

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی تعلیمی سکیم کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس سکیم کو مسلمانوں کیلئے نہایت مضر اور ان کی " رہی سہی مذہبی زندگی " کے لیے سم قاتل قرار دیا۔ آپ نے مغربی تعلیم اور واردھا سکیم کے موازنہ کے بعد واردھا تعلیمی سکیم کو مسلمانوں کے لئے مغربی تعلیم سے زیادہ مہلک اور مضر بتلایا۔ جس کے پردے میں ہندو مت کی تعلیم و اشاعت کی صاف جھلک نظر آ رہی تھی۔ اس سکیم پر تنقید سے قبل مولانا نے ایک اصولی نکتہ کی وضاحت کی کہ:

> " مسلمان فطرتاً اور مذہباً مروت، رواداری اور حسنِ معاشرت پر مجبور ہے وہ غیر مسلم کے ساتھ صلح و آشتی، پابندی عہد اور حسن معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے، لیکن اپنے امتیازی نشانات اور خصوصی تعلیم کو مٹا کر غیر مسلموں میں خلط ملط اور اس طرح گڈ مڈ نہیں ہو سکتا کہ ان کا ہم خیال و ہم رنگ ہو جائے نہ اس کو مذہب اس کی اجازت دیتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جب تک کسی قوم میں یہ مذہبی احساس باقی ہے ایسی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی
>
> اس اصولی بحث کے بعد مولانا تھانوی نے اس سکیم کے چند اہم نکات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عدم تشدد یا اہنسا اس سکیم کا بنیادی اصول تھا۔ مولانا نے عدم تشدد کے فلسفہ کو " گاندھی فلسفہ " قرار دیتے ہوئے اس طرز فکر کی سخت مذمت کی اور کہا کہ اس سے زیادہ فرقہ پرستی کیا ہو سکتی ہے کہ تمام ملک کے بچوں کو گاندھوی فلسفہ پر مجبور کیا جائے۔ "

اس سکیم کے تحت تعلیمی کتب اس نہج پر تیار کی گئی تھیں کہ طلباء کے ذہن پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام آسمانی مذاہب سچے ہیں۔ مولانا کے خیال میں ایسا کرنا خود کو لامذہبیت کے گڑھے میں گرانے کے مترادف ہو گا۔ اس لیے کہ انسان تمام مذاہب کی عزت اسی وقت کر سکتا

---

[1] روزنامہ انقلاب لاہور ۹ مارچ ۱۹۳۹ء، ص ۵

ہے۔ جب کہ سب کو سچا سمجھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بالکل لامذہب ہو جائے گا۔ مولانا نے اس طرزِ فکر کی مذمت کی اور ساتھ ہی اس بات کی سفارش کی کہ ملک کی اجتماعی زندگی کو خوشگوار اور پُرامن بنانے کے لئے باہمی رواداری، ہمسایہ قوموں کے حقوق اور انسانی حقوق کی تعلیم دی جائے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے غلط قصوں کو اپنانا بند کیا جائے۔ جس میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا گیا ہو۔ آخر میں موسیقی کی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے اس کو مذہب کے منافی قرار دیا اور مسلمانوں کے بچوں کو موسیقی کی جبری تعلیم کو ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔

بندے ماترم کا ترانہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گویا ایک قسم کا اعلانِ جنگ تھا۔ دوسری طرف یہ ترانہ "شرکیات" پر مشتمل تھا۔ اس لئے مسلمانوں کی جانب سے اس کو برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مولانا تھانوی نے اس ترانہ پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔[1]

مسلم لیگ کے نام پیغام میں بھی مولانا تھانوی نے واردھا تعلیمی سکیم کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرہ قرار دیتے ہوئے مسلم لیگ کے زعماء کو متنبہ کیا کہ وہ اس سکیم کی جانب سے غفلت نہ برتیں۔ مولانا کی رائے میں یہ سکیم اپنی ظاہری صورت میں جس قدر بے ضرر نظر آتی تھی۔ اندرونی طور پر اسی قدر مسموم اور زہر آلود تھی۔ مولانا کے نزدیک یہ سکیم متحدہ قومیت کے علمبرداروں کی ایک چال تھی، جس کے ذریعے وہ مسلمانوں میں سے مذہبی رُوح نکالنا چاہتے تھے۔

اس سکیم کی تیاری کے وقت اس کے مرتبین کے ذہنوں پر ایک بات سوار تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سچائی تمام سماوی مذاہب میں موجود ہے اور اصولی اعتبار سے ہر مذہب سچا ہے اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ مولانا نے اپنے بیان میں اس نظریہ پر کڑی نکتہ چینی کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ سچائی تمام مذاہب میں موجود ہے اور یہی ذریعۂ نجات ہے اور نجات ہی کے واسطے مذہب کو اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے لئے خاص مذہب کی ضرورت نہیں۔ مسلمان رہو یا ہندو ہو جاؤ یا عیسائی ہو جاؤ۔ مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے

---

[1] روزنامہ عصرِ جدید کلکتہ ۲۶، دسمبر ۱۹۳۸ء - ص ۱

اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر واردھا سکیم ہندوستان میں رائج کر دی گئی تو مسلمانوں کا مذہب باقی نہیں رہے گا۔ مولانا نے قائدین لیگ سے اس سکیم کی پُرزور مخالفت کی اپیل کی۔[1]

۱۸، ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا نے کانگرس کی بدنظمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مجلس میں فرمایا کہ:

> "انگریزوں کو حکومت کرتے ہوئے مدت گزر گئی ہے، تحمل اور دور اندیشی کی عادت ہو گئی ہے، وہ ہوش سے کام لیتے ہیں اور چونکہ کانگرس کی حکومت نئی نئی ہی ہے اس لئے جوش زائد ہے اور تشدد اور سختی سے کام لے رہے ہیں۔ ان کی وہی حالت ہے، جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ:
>
> "واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیہا ویہلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد"
>
> یعنی جب منافق کو حکومت مل جاتی ہے تو وہ اس دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے کہ دنیا میں فساد کرے اور زراعت اور مویشی ہلاک کرے۔
>
> تولّٰی کے دو معنی ہیں ایک پیٹھ پھیرنے کے دوسرے حاکم بننے کے۔ میں نے دوسرے ہی معنی کے لحاظ سے تشبیہ دی ہے۔ کانگرس کو چاہیئے تھا کہ اتفاق سے جو موقع ہاتھ آگیا تھا۔ اس کو غنیمت سمجھتی اور دل جوئی اور مراعات سے حکومت کرتی مگر اس سے ایسا نہ ہو سکا حتیٰ کہ خود اس کے حامی بھی اس کی موجودہ روش کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔"[2]

مولانا تھانوی نے کانگرس کے دورِ حکومت کے بارے میں جو رائے قائم کی خود گاندھی نے حرف بحرف اس کی تائید کرتے ہوئے اخبار ہریجن ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء میں لکھا کہ:

> "میں کانگرس کے موجودہ دورِ حکومت میں سوائے طوائف الملوکی اور انقلابی تباہی کے کچھ نہیں دیکھتا۔"[3]

---

[1] پیام مسلم لیگ، ص ۱۳، ۱۴ [2] اسعد الابرار ص ۱۳۹

[3] نواب صدیق علی خاں بے تیغ سپاہی الائیڈ بک کارپوریشن کراچی ۱۹۷۱ء ص ۱۳۵۔

آفتاب تھانہ بھون

کی

چند کرنیں

حضرت مولانا صوفی محمد سرور صاحب

* * *

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین اما بعد۔

۱۴۰۸ھ ہے ربیع الاول کے مبارک مہینہ کی چھ تاریخ جمعۃ المبارک کی مبارک رات شروع ہو چکی ہے گویا آفتاب تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کو غروب ہوئے تقریباً چھیالیس سال گذر چکے ہیں لیکن اس آفتاب کی کرنیں اب تک عالم اسلام کے بہت سے خوش قسمت طالبین حق اور تقوے کے ٹیلوں اور پہاڑوں اور علم کے چشموں اور دریاؤں اور سمندروں کو منور و معطر کر رہی ہیں کیوں نہ ہو اہل حق علماء و صلحاء کا اتفاق ہے کہ چودھویں صدی کے مجدد حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں نبی کریم سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ان اللہ یبعث لہذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے کنارہ پر ایسے بزرگوں کو مقرر فرمائیں گے جو اس امت کے لیے دین کی تجدید کریں گے۔ یعنی لوگوں نے جو میل کچیل بدعات اور بے دینی کی اس پاک دین میں ڈالنے کی کوشش کی ہوگی ان سب کو دور کر کے اصل دین کو دھوبی کی طرح نکھار کر امت کے سامنے رکھ دیا کریں گے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا کریں گے کہ جو طالب حق اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے اس پاک دین پر چلنا چاہے وہ بلا تکلف اپنے مولا کی طرف بھاگتا چلا جائے اور دنیا اور آخرت کی راحتیں اور لذتیں

اور کامیابیاں حاصل کرتا چلا جائے۔ مولائے کریم کے سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کو پورا ہوتے ہوئے پوری دنیا نے ایک دو سال نہیں چودہ سو سال کھلی آنکھوں سے دیکھا چنانچہ پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ ہوئے دوسری صدی کے امام شافعی رحمہ اللہ تعالےٰ ہوئے تیسری کے دو مجدد ہوئے امام اشعری اور امام ابن شریح رحمہ اللہ تعالیٰ چوتھی صدی کے امام باقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ مجدد بنے پانچویں کے امام غزالی رحمہ اللہ تعالےٰ ہوئے چھٹی کے امام رافعی اور امام ساتویں میں ابن دقیق العید رحمہ اللہ تعالےٰ کو یہ سعادت نصیب ہوئی آٹھویں میں حافظ زین الدین عراقی اور حضرت بجیر بلقی رحمہما اللہ تعالےٰ کو یہ مقام نصیب ہوا نویں میں علامہ جلال الدین سیوطی اس منصب پر فائز ہوئے دسویں میں ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالےٰ کو اس درجہ تک پہنچایا گیا گیارہویں صدی کے مجدد تو مجدد الف ثانی کے نام سے ہی مشہور ہو گئے یعنی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ بارہویں صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ شمار کیے گئے۔ تیرھویں صدی میں حضرت سید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور چودھویں صدی میں ہمارے محبوب حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالےٰ کو یہ نعمت ملی۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

زیر تحریر مضمون میں اس آفتاب ہدایت کی چند کرنیں اور اس مجسمہ ہدایت کے چند کمالات نہایت مختصر عنوان کے ساتھ احقر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ سب سے پہلے احقر کے لیے اور پھر معزز ناظرین کرام کے لیے مشعل راہ بن سکیں یا اللہ امداد فرما بحرمت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

کمال علم

ایک شیخ کامل کے لیے اور مصلح عالم کے لیے بہت قوی علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ غیر عالم کے لیے وعظ کہنا جائز نہیں ہے نہ ہی لوگوں کی اصلاح باطن کرنا جائز ہے کم از کم اپنی مادری زبان ہی میں ضروری مسائل کی پوری پوری واقفیت نہایت ضروری ہے حضرت والا نے دار العلوم دیوبند میں مکمل درس نظامی سات سال میں مکمل فرمایا اور پھر پانچ سال تک کانپور میں آگے پڑھایا اور ساتھ ساتھ علوم باطنہ کا استفادہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ سے فرمایا جنہوں نے یہاں تک فرما دیا کہ میرے نزدیک ان کا مقام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح

وحضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی اونچا ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے اکابر کے زہد و تقویٰ و عبادت کو بہت بڑھ چڑھ کر پایا لیکن جتنا فیض حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا دیکھا دوسروں کا نہ دیکھا غور کرنے سے وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ حضرت کا علمی مقام بہت اونچا تھا یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضرت کے مواعظ کو آیات کی ترتیب تلاوت کے لحاظ سے جلد کرا رکھا ہے تاکہ تفسیری مباحث تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اھ۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا علم تو حضرت کی تصانیف و مواعظ سے ہی اظہر من الشمس ہے کہ تقریباً تیرہ سو تصانیف مع المواعظ شمار کی گئی ہیں ساڑھے تین سو کے قریب مواعظ ہیں باقی تصانیف ہیں جن میں بعض بڑی بڑی تصانیف بھی ہیں جیسے بیان القرآن۔ التکشف امداد الفتاویٰ۔ بوادر النوادر۔ تربیت السالک۔ بہشتی زیور۔ الانتباہات المفیدہ۔ اصلاح انقلاب وغیرہ اور الافاضات الیومیہ کے نام سے حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ خود ایک علم کا پہاڑ ہے۔ جس کو شبہ ہو ان کتابوں کا مطالعہ کر کے دیکھ لے ؎

اولئک آبائی فجئنی بمثلہم　　　　اذا جمعتنا یا جریر المجامع

لیکن ہم صرف بطور شکر کے یہ سب کچھ ذکر کرتے ہیں فخر نہیں کرتے کیونکہ فخر کی اجازت نہیں ہے۔

کمال تقویٰ

ایک مسجد میں ایک طالب علم عشاء کے بعد مطالعہ کر رہا تھا کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد اس نے مسجد کا چراغ بجھا دیا اور اپنے سامان میں سے چراغ نکال کر جلایا اس وجہ سے کہ مسجد کی ضرورت کا وقت ختم ہو گیا تھا اب مسجد کا چراغ استعمال کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے اپنا ذاتی چراغ جلایا اور مطالعہ کیا۔ ایک عالم نے فرمایا کہ اتنی احتیاط کرنے والے کا تعلق ضرور تھانہ بھون سے ہوگا۔ تحقیق کی گئی تو یہی بات نکلی حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ حضرت تھانوی رح نے مجھے ایک رقعہ دیا تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ اس رقعہ میں کچھ لکھائی رنگین سیاہی سے ہے اس میں احتمال نجاست کا ہوتا ہے اس لیے نماز کے وقت جیب میں نہ رکھیں۔ حضرت والا کے پاس ایک دفعہ ریل گاڑی کا سفر شروع کرتے وقت سامان حکومت کی اجازت سے زائد تھا۔ ریلوے کے ایک افسر نے کہا کہ آپ وزن کرائیں میں گارڈ کو کہہ دوں گا فرمایا وہ گارڈ کہاں تک جائے گا کہا فلاں اسٹیشن تک فرمایا آگے کیا ہوگا وہ اگلے گارڈ کو کہہ دے گا فرمایا آگے کیا ہوگا۔ کہا پھر آپ کا اسٹیشن آجائے گا فرمایا کہ نہیں پھر قبر میں بھی جانا ہے

وہاں کون بچائے گا۔ ایک دفعہ حضرت والا پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار فرما رہے تھے ہندو اسٹیشن ماسٹر نے کہا آپ میرے کمرے میں تشریف رکھیں۔ حضرت تشریف لے گئے پھر اندھیرے کی وجہ سے اسٹیشن ماسٹر نے اپنے ملازم سے کہا کہ بتی لاؤ اب حضرت گھبرائے کہ سرکاری لالٹین میں سرکاری تیل جلے گا جو جائز نہیں لیکن ہندو اسٹیشن ماسٹر کو کیسے سمجھائیں دعا فرمائی کہ یا اللہ آپ ہی دستگیری فرما دیں حق تعالےٰ نے دعا قبول فرمائی اس اسٹیشن ماسٹر نے پھر آواز دی کہ دیکھو اسٹیشن کی لالٹین نہ لانا میرے گھر سے لانا جب جا کر حضرت کو سکون ہوا۔

تواضع

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت میں بہت زیادہ تواضع تھی حتیٰ کہ اس کا اثر اہل مجلس پر بھی تھا کہ مجلس میں شریک ہونے والا ہر شخص اپنے آپ کو سب سے گھٹیا سمجھتا تھا اگر آواز آتی کہ تم میں سب سے گھٹیا کون ہے تو سب سے پہلے حضرت فرماتے کہ میں سب سے گھٹیا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ہی فرمایا کہ حضرت فرماتے تھے کہ درجات تو بڑے لوگوں کو ملیں گے۔ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ عذاب سے بچا لیں پھر چاہے اہل جنت کی جوتیوں میں ہی جگہ دے دیں وہ بھی اس لئے نہیں کہ عذاب کا مستحق نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ عذاب کی برداشت نہیں۔ انتہا۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہم نے فرمایا کہ میں نے وفات کے بعد حضرت کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ حضرت کیا حال ہوا تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ آیتیں جواب میں پڑھ دیں ان لمتقین فی جنت ونھر فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر انتہا گویا کمال تواضع کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اپنا خصوصی قرب عطا فرمایا۔

دونوں بیویوں سے برابری

حضرت مولانا شبیر محمد صاحبؒ گھوٹکی والوں نے فرمایا کہ میں ایک دفعہ اپنے وطن کا تحفہ دو میٹھی روٹیاں بطور ہدیہ کے لے کر حاضر خدمت ہوا دیکھ کر فرمایا کہ ایک چھوٹی ہے ایک بڑی ہے میں اپنی دو بیویوں میں کیسے تقسیم کر سکتا ہوں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم خود ایک ایک روٹی اپنی طرف سے دونوں کو ہدیہ دیدو تمہارے ذمہ برابری نہیں ہے۔ انتہا۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہم نے نقل فرمایا کہ ایک دیہاتی حضرت تھانویؒ کی خدمت میں دو تربوز لایا ہدیہ دینے کے لیے فرمایا دو کیوں لائے عرض کیا آپ کی بیویاں جو دو ہیں فرمایا شاید وزن برابر نہ ہو عرض کیا تُلوا کر برابر لایا ہوں فرمایا کہ ایک میٹھا ہو ایک پھیکا ہو عرض

کیا اس کی تو مجھے خبر نہیں۔ ——— درمیان سے ہر ایک کو چیرا ہر ایک کا آدھا آدھا تول کر دونوں گھروں میں دیا۔ انتہا۔ خود فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ دو نکاح کر کے سب کو دو نکاحوں کی کھلی چھٹی دیدی فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ روک دیا کیونکہ جتنی میں احتیاط کرتا ہوں وہ نہ کر سکیں گے اس لیے ڈر کے مارے دوسرا نکاح نہ کریں گے۔

میزبان پر بوجھ نہ ڈالنا

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ نے نقل فرمایا کہ اخیر زمانہ میں حضرت تھانویؒ نے جب دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے لاہور کا سفر فرمایا اور دانتوں کے ڈاکٹر عزیز جلال الدین صاحب مرحوم کے ہاں پہنچے تو اپنے چند ساتھیوں کو جو ساتھ آئے تھے جمع فرما کر ہر ایک سے پوچھا کہ بتاؤ تم کہاں رہو گے تم کہاں رہو گے ہر ایک نے اپنی اپنی رہائش کی تفصیل ذکر کر دی تو اطمینان کا اظہار فرمایا پھر میزبان ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بہت زیادہ اصرار فرمایا اور اطمینان ہو گیا کہ ان کو کچھ بوجھ نہ ہو گا تو ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ انتہا آج کل کے عام پیروں کا طرز نہ تھا کہ پیر صاحب کے ساتھ بیس تیس ساتھی بھی زبردستی مہمان بن جاتے ہیں۔

حقوق العباد کا اہتمام

حضرت حاجی محمد شریف، نواں شہر ملتان والے فرماتے تھے کہ مجھ سے حضرت نے کچھ عبارت نقل کروائی تو اس کی اجرت دی اور فرمایا کہ اس کے بغیر میں کام نہ کراؤں گا۔ انتہا اخیر وقت میں امانت رکھی ہوئی رقم کی جو وصیت لکھی ہوئی تھی اس کی مزید وضاحت حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ سے فرما رہے تھے کہ وصال ہو گیا۔ حضرت تھانویؒ کو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ تعالیٰ کے بارے میں عام دستور کی وجہ سے معمولی شبہ ہوا کہ شاید مہر ادا نہ فرمایا ہو تو بہت اہتمام سے وارثوں کی تفصیل معلوم فرمائی اور جب تک سب کو ان کا حصہ نہ پہنچا دیا چین نہ آیا۔

شان تربیت

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ کسی معاملہ میں حضرت تھانویؒ نے مجھے سخت تنبیہ فرمائی میں اپنے حجرہ میں جو خانقاہ امدادیہ میں مجھے رہنے کے لیے ملا ہوا تھا اس میں آ کر بہت فکر مند تھا کہ اب کیا ہو گا کہ حضرت کا خادم آیا میں ڈر گیا کہ اب خانقاہ سے نکلنے کا حکم ہو گا لیکن خادم نے اجازت بیعت کی اور خلافت کی اطلاع کی کہ حضرت نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت دیدی ہے انتہا۔ یہ اس لیے کیا کہ اس اجازت کی وجہ سے کسی قسم کی خود بینی پیدا نہ ہو جائے۔ حضرت تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ سائل کے پوچھنے پر میں فوری جواب دینے کی بجائے

اُس پر سوال کر دیتا ہوں کہ دماغ پر کچھ بوجھ پڑے تاکہ جواب جب مشقت کے بعد ملے تو قدر ہو اور خوب ذہن نشین ہو جائے۔

احباب پر شفقت

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ نے فرمایا کہ لاہور کے سفر میں حضرت بہت کم ملتے تھے لیکن میں نے لاہور سے امرتسر تشریف لاکر ایک وقت کے کھانے کی دعوت کی درخواست کی تو قبول فرمالی کیسی شفقت فرمائی حضرت حاجی محمد شریفؒ نے فرمایا کہ اہلیہ کی بیماری کی اطلاع کے بعد صحت کی اطلاع دی تو خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ بہت اچھا کیا جو اطلاع کر دی دل اُدھر لگا ہوا تھا۔

حضرت کے بے شمار کمالات میں سے صرف چند مختصراً لکھ سکا حضرت کا حال تو یہ ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

حق تعالٰے حضرت کے درجات بلند فرمادیں اور ہمیں حضرت کے مسلک اعتدال پر جو اسلام کا اس زمانہ میں اعلےٰ مصداق ہے چلنے کی توفیق نصیب فرمادیں۔ واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد والٰہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

◆

حضرت تھانویؒ کے شیخِ طریقت
شیخ العرب والعجم
حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمہ اللہ

حضرت سید نفیس الحسینی صاحب

* * *

خودی جب تک رہی اُس کو نہ پایا
جب اُس کو ڈھونڈ پایا خود عدم تھے
تمہاری کیا حقیقت تھی میاں آہ
یہ سب امداد کے لطف و کرم تھے

(حضرت حکیم الامتؒ)

* * *

یہ ۱۲۳۴ھ کے اواخر کی بات ہے۔ امام المجاہدین حضرت سید احمد[1] شہیدؒ دہلی سے دوآبے کے دورے پر روانہ ہوئے۔ "مرشدِ وقت حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ[2] قدس سرہٗ (۱۲۳۹ھ) نے اپنے جواں سال مسترشد و خلیفۂ اعظم کو اپنا لباسِ خاص پہنایا اور بڑی خوشی سے رخصت کیا۔" (سیرۃ سید احمد شہیدؒ ص ۱۲۳)

---

[1] ولادتِ باسعادت، صفر ۱۲۰۱ھ بمقام تکیہ رائے بریلی، شہید بالاکوٹ (علاقہ ہزارہ) ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ از اولادِ سید شاہ علم اللہ نقشبندیؒ (م ۱۰۹۶ھ) خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ (خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ)

[2] حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے فرزند و جانشین

غازی الدین نگر، مُرادنگر، میرٹھ اور اُس کے نواح و اطراف، سردھنہ، بُڈھانہ، پھلت، مظفرنگر، دیوبند، سہارنپور، اور اُس کے نواح، انبیٹھہ، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون اور کاندھلہ وغیرہ مقامات و قصبات میں جگہ جگہ قیام ہُوا۔ سیکڑوں خاندانوں اور ہزاروں آدمیوں نے حضرت سید صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور شرک و بدعت اور قدیمی خلافِ شرع رُسوم سے توبہ کی۔ حضرت سید صاحبؒ کا یہ سفر بارانِ رحمت کی طرح تھا کہ جہاں سے گزرتا، سرسبزی، شادابی، بہار اور برکت چھوڑ جاتا ہے۔"

(سیرتِ سید احمد شہید ص ۱۲۴ تا ۱۲۲)

اِس مبارک سفر میں غالباً تھانہ بھون یا نانوتہ کے مقام پر ایک کمسن بچّہ بھی حصولِ برکت و سعادت کے لیے حضرت سید صاحبؒ کی گود میں دیا گیا۔ آپ نے اسے بیعتِ تبرک میں قبول فرمایا۔ اقبال و فیروزمندی نے اس سعید بچے کے قدم چُومے۔ وہ اپنے سنِ شعور کی منزلیں طے کرتا ہُوا عالمِ شباب میں آیا تو مقتدائے عُلماء و صُلحاء بن گیا۔ رحمتِ خداوندی نے اُس کے سرِ مبارک پر سروری و سرداری کی کُلاہِ افتخار رکھی اور "شیخ العرب والعجم" بنا دیا۔ یہ طالع وارجمند اور رفیع و بالا بلند شخصیت تاریخ میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مُہاجر مکی کے نامِ نامی سے زندہ جاوید ہے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

حضرت حاجی صاحبؒ بچپن کے اس مُتبرک واقعے کو اپنی مجلس میں بیان فرمایا کرتے تھے۔ مولانا صادق الیقین راوی ہیں:

"فرمایا، میں تین[عہ] سال کا تھا کہ سید صاحبؒ کی آغوش میں دیا گیا اور اُنھوں نے مُجھ کو بیعتِ تبرک میں قبول فرمایا۔"[1]

(شمائم امدادیہ ص ۵۳، امداد المشتاق ص ۱۲)

نام و نسب

حضرت حاجی امداد اللہ[2] صاحب بن حافظ مُحمد امین بن شیخ بُڈھا بن حافظ شیخ بُلاقی صاحب رحمہم اللہ تعالےٰ نسباً فارُوقی تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۲۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ کو بمقام نانوتہ ضلع سہارنپور ہُوئی جو آپ کی ننھیال

---

[1] حضرت حاجی صاحبؒ کے ایک پیر بھائی حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی سفر میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہُوئے۔ حضرت شیخ محمد تھانویؒ اپنے رسالہ "الہامات الوجود" میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر یاد دارد کہ عُمرم ہفت سال باشد کہ در مسجد پیروالی واقع وطنِ فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور بشرفِ بیعتِ جنابِ سید صاحب قبلہ ممدوح قدس سرہٗ مشرف شد۔ اگرچہ در ایامِ طفلی بود، اما پرتوِ بزرگان کافی است۔" (حیاتِ امداد ص ۱۲ بحوالہ الہامات الوجود)

[2] حضرت کا نام بچپن میں امداد حسین تھا۔ حضرت شاہ مُحمد اسحٰق محدث دہلوی قدس سرہٗ (م ۱۲۶۲ھ) نے بدل کر امداد اللہ کردیا۔

[عہ] بچپن کی عمر کے تخمینے میں کچھ کمی بیشی ہو ہی جاتی ہے۔ (حیاتِ امدادؒ)

تھی۔ آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر ہے۔

دہلی میں تعلیم

حضرت کا سنِ مبارک ابھی صرف سات سال کا تھا کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے انتقال فرمایا۔ تائیدِ ربانی ابتدائے خلقت ہی سے آپ کی مربی تھی کہ زمانۂ صغر سنی میں بھی آپ کبھی خلافِ شرع لہو ولعب میں مشغول نہ ہوتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں آپ حضرت مولانا مملوک العلی صاحب[1] نانوتویؒ کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں چند مختصرات فارسی اور کچھ صرف ونحو کی تعلیم بعض اساتذہ سے حاصل کی۔ نیز حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی تالیف تکمیل الایمان مولانا رحمت علیؒ صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ سے پڑھی۔

مُرشدِ مجاہد کی بیعت

ابھی علومِ ظاہری کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ ولولۂ خدا طلبی حضرت کے دلِ اخلاص منزل میں جوش زن ہُوا۔ اور آپ نے سرحلقۂ مجاہدین حضرت مولانا سید نصیر الدینؒ[2] غازی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مُبارک پر طریقہ نقشبندیہ

---

[1] حضرت مولانا مملوک علیؒ ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں نانوتہ (ضلع سہارنپور) میں پیدا ہوئے۔ نسباً صدیقی تھے۔ علوم وفنونِ عربیہ حضرت علامہ مولانا رشید الدین دہلوی تلمیذ رشید سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاصل کیے۔ دہلی میں اپنے زمانے کے استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ کے تلامذہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب محدث پانی پتی، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی رحمہم اللہ تعالیٰ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس دار العلوم دیوبند آپ ہی کے فرزندِ ارجمند اور تلمیذ رشید تھے۔

حضرت مولانا مملوک علی نہایت عابد وزاہد، خوش اخلاق، منکسر مزاج اور سادہ طبیعت تھے۔ ۱۱ ذوالحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء کو دہلی میں وفات پائی۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے خاندانی قبرستان مہندیاں میں حضرت شیخ عبد العزیز شکر بار کے پائیں میں مدفون ہیں۔
("سیرتِ یعقوب ومملوک" ص ۲۹ تا ۳۵)

[2] حضرت مولانا سید نصیر الدین دہلویؒ جامع کمالات بزرگ تھے۔ انھیں مجد وشرف کی متعدد نسبتیں حاصل تھیں۔ آپ حضرت سید ناصر الدین تھانیسری ثم سونی پتی کی اولاد سے تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) کے شاگرد عزیز، حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ (م ۱۲۳۳ھ) کے نواسے، حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ (م ۱۲۶۲ھ) کے داماد، حضرت شاہ محمد آفاق مجددیؒ (م ۱۲۵۱ھ) کے مرید وخلیفہ اور حضرت سید احمد شہید (م ۱۲۴۶ھ) کی تحریکِ جہاد کے رکنِ رکین تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

مجددیہ میں بیعت کرلی۔ اُس وقت عمرِ عزیز اٹھارہ برس تھی۔ (شمائم امدادیہ ص۸، امداد المشتاق ص۹)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت باطنی

بیعت سے پہلے حضرت حاجی صاحبؒ کو خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہُوا۔ حضرت سید صاحبؒ نے حاجی صاحبؒ کا ہاتھ پکڑ کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں دے دیا۔ مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ، حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے اس خواب کی روایت کرتے ہیں:

> "آپ نے فرمایا کہ ظاہر میں اوّل بیعت میری طریقۂ نقشبندیہ میں حضرت مولانا نصیر الدین دہلویؒ خلیفۂ حضرت شاہ محمد آفاق صاحبؒ سے ہُوئی اور باطن میں بلاواسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہُوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضورؐ ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ کا ہاتھ آپ کے دستِ مبارک میں ہے اور مَیں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب کے دُور کھڑا ہُوں۔ حضرت سید صاحبؒ نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضورؐ کے ہاتھ میں دے دیا۔ خُدا نے مجھ کو کچھ اور بھی دکھایا ہے۔ اگر ظاہر کروں تم لوگ کچھ کا کچھ کہو گے (پھر وہ کیفیت مجھ سے خفیہ بیان فرمائی) فرمایا کہ بیعت باطنی پہلے ہے، اور ظاہری اُسی روز ہے یا ایک دو روز بعد۔" (امداد المشتاق ص۱۵۲)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> "مَیں حضرت مولانا نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہت کم رہا۔ میرے والد ماجد بیمار ہو گئے تھے۔ انھوں نے دہلی سے اپنی تیمارداری کے لیے طلب کیا۔ مَیں حضرت سے رخصت لینے گیا۔ حضرتؒ نے مجھے سینۂ مبارک سے لگا کر بہت دُعا دی اور طریقۂ نقشبندیہ کی اجازت فرما کر رخصت کیا۔ میرے والد ماجد کئی مہینے مریض رہے، بہت علاج ہوئے کچھ مفید نہ ہُوا اور دُنیا سے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسی وجہ سے مَیں اپنے پیر و مُرشد کی خدمت میں دوبارہ حاضر نہ ہو سکا۔ اور اس درمیان میں حضرت بغرضِ جہاد افغانستان کو چلے گئے[1] میرا ارادہ تھا کہ مَیں بھی حاضرِ حضور ہُوں گا

---

[1] سرحلقۂ مجاہدین حضرت مولانا سید نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ۳ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ کو دہلی سے جہاد کے لیے ہجرت فرمائی۔ اُس وقت حضرت مولانا محمد اسحٰق محدث دہلویؒ (م ۱۲۶۲ھ) اور آپ کے پیر و مُرشد حضرت شاہ محمد آفاق مجددیؒ (م ۱۲۵۱ھ) دہلی میں موجود تھے۔ ظاہر ہے ان بزرگوں کی اجازت و ایما سے ہجرت فرمائی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مگر اس مابین میں شہر غزنی سے حضرت کے رحلت فرمانے کی خبر آئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں اُن کی خدمت شریف میں بہت قلیل مُدت حاضر رہا۔ کچھ لطائف جاری ہوگئے تھے۔"

(امداد المشتاق صـ۱۵۲)

پھر استفادہ علوم

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے حضرت مولانا سید نصیر الدین صاحبؒ کی خدمت میں بیعت ہونے سے پیشتر کچھ علومِ ظاہری حاصل کیے تھے۔ بعد ازاں الہامِ غیبی کی بنا پر اور لذتِ کلامِ نبویؐ کے جذبے سے مشکوٰۃ شریف کا ایک رُبع جناب رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق زار حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادیؒ کی خدمت میں پڑھا، نیز حصن حصین اور فقہ اکبر حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب نانوتویؒ سے پڑھیں۔ یہ دونوں بزرگ عارفِ مستغرق حضرت مولانا مفتی؎ الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ کے ارشد تلامذہ تھے۔ حضرت مفتی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

حضرت مولانا نصیر الدین صاحبؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ کی میراث کے حامل تھے۔ حضرت سید صاحبؒ اور اُن کے بلند منزلت رُفقاء کی بالاکوٹ میں شہادت (۱۲۴۶ھ) کے بعد آپ نے جب دیکھا کہ تحریک کا جوش و خروش ختم ہو رہا ہے، تو جوانمردانہ میدان میں آگئے اور اپنی ذات کو بے تامل قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ آپ نے سید صاحبؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ دعوتِ جہاد سے ایک جماعت تیار کی اور سید صاحبؒ کی طرح وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے کاروبارِ جہاد کی تجدید کا انتظام فرمایا۔ (سرگذشت مجاہدین صـ۱۲۹۔)

سندھ اور افغانستان میں سکھوں اور انگریزوں سے بہت معرکہ آرائیوں کے بعد حضرت مولانا سید نصیر الدینؒ نے مرکزِ مجاہدین ستھانہ (علاقۂ سرحد) میں ۱۸ شعبان ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً

(سرگذشت مجاہدین صـ۱۹۶)

؎ حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ (۱۲۴۵ھ) حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۳۹ھ) کے مایۂ ناز شاگرد اور مُرید تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے دورہ دوآبہ میں ۱۷ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ کو اُن کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے۔ اُس وقت مفتی صاحبؒ کی عمر ۱۰ سال کی تھی۔ سیرۃ سید احمد شہیدؒ میں ہے:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قدس سرہٗ کے شاگرد تھے۔

استفاضۂ مثنوی

حضرت حاجی صاحبؒ نے مثنوی مولانا رومؒ مولانا شاہ عبد الرزاقؒ سے پڑھی۔ انھوں نے حضرت مولانا شیخ ابو الحسن سے اور شیخ ابو الحسن نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (خاتم دفتر ششم) سے سماعۃً و قراءۃً مثنوی شریف پڑھی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ ممدوح نے عالم رؤیا میں مولانا رومؒ سے مثنوی معنوی پڑھی تھی۔ مثنوی کے دفتر ششم کا خاتمہ بھی مفتی صاحبؒ نے مولانا رومؒ کے ارشاد پر لکھا۔

تکمیل سلوک کا داعیہ

الحاصل، حضرت حاجی صاحبؒ نے مطالعۂ مثنوی کو بطور ورد کے معمول فرمالیا جس سے خاطر اقدس کو ایک حرکتِ بلیغ پیدا ہوتی تھی اور جوش و خروش باطنی چہرۂ مبارک سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔ چنانچہ تکمیل سلوک کا داعیہ رہ رہ کے تڑپانے لگا۔

حضرت میانجیو چشتی کے سپرد

حتیٰ کہ اس درمیان میں ایک دن آپ نے خواب میں دیکھا کہ مجلس اعلیٰ و اقدس حضرت سرور عالم، مرشد اتم،

"کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش صاحب جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد اور مرید تھے بیعت ہوئے اور ان کے خاندان اور قصبے کے اکثر اہل علم اور شرفاء بیعت میں داخل ہوئے۔" ص ۴۱

حضرت مفتی صاحبؒ کے دو نواسے مولانا محمد صابر صاحب اور مولانا محمد مصطفیٰ صاحب جو مفتی صاحبؒ کے شاگرد رشید اور زیر تربیت بھی تھے، حضرت سید صاحبؒ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوئے۔ مولانا محمد مصطفیٰؒ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

(سفینۂ رحمانی، ص ۸۲)

حضرت مفتی صاحبؒ کے تیسرے نواسے حضرت مولانا شاہ عبد الرزاق جھنجھانویؒ (م ۱۲۹۲ھ) سے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مثنوی شریف پڑھی تھی۔ حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں:

"میں نے مثنوی تین بار حضرت مولانا عبد الرزاق جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر عرض کی اور بعض مقامات کی تحقیق مولوی ابو الحسن کاندھلوی (فرزند حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ) سے کی۔" (امداد المشتاق ص ۶۳)

حضرت مولانا محمد قلندر محدثؒ (م ۱۲۶۰ھ) حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگرد اور خلیفہ مجاز تھے۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ وسلم میں حاضر ہوں، غایت رعب سے قدم آگے نہیں پڑتا ہے۔ کہ ناگاہ میرے جدِ امجد حضرت حافظ بلاقی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور میرا ہاتھ پکڑ کر حضور حضرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچا دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ لے کر حضرت میانجیو[1] صاحب چشتی قدس سرہٗ کے حوالے کر دیا، اس وقت

---

[1] قطب ربانی حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ قطب وقت حضرت حاجی شاہ عبد الرحیم صاحب شہیدؒ ولایتی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم و جانشین تھے۔ حضرت ولایتی شہیدؒ، سہارنپور میں مسجد اُونچی میں اقامت رکھتے تھے۔ انھیں تین بزرگوں سے انتساب بیعت و اجازت حاصل تھا۔ اوّل سلسلۂ عالیہ قادریہ قمیصیہ میں قطب زمانہ حضرت سید رحم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۱۴ھ) سے مرید و مجاز ہوئے۔ پھر حضرت شاہ عبد الباری چشتی امروہویؒ (م ۱۲۲۴ھ) سے بیعت ہو کر نسبت و خلافت چشتیہ حاصل کی۔ آخر میں ماہ ذی الحجہ ۱۲۳۳ھ میں امیر المومنین امام المجاہدین مجددِ مأۃ سیزدہم حضرت سید احمد شہیدؒ (م ۱۲۴۶ھ) کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور مجاز ہوئے بلکہ حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی کو بھی لوہاری سے سہارنپور بلا کر حضرت سید صاحبؒ سے بیعت کرا دیا، حضرت میانجیو کو سید صاحبؒ نے اجازت طریقہ سے بھی سرفراز فرمایا۔

(سیرۃ سید احمد شہیدؒ ص $\frac{۱۴۱}{۱}$)

حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب ولایتیؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ کی محبت میں ایسے وارفتہ ہوئے کہ اپنی مسند ارشاد چھوڑ چھاڑ، حضرت سید صاحبؒ کی معیت اختیار کر لی اور سفر و حضر و جہاد میں ہمیشہ ساتھ رہے، حتیٰ کہ سید صاحبؒ کے ہمراہ جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہو کر سرفرازی حاصل کی ؎

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

انوارِ محمدی میں ہے:

حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب ولایتی مجاہد غازی شہید کردر لشکر ظفر پیکر حضرت سید احمد صاحب قبلہ در ولایت خراسان شربت شہادت نوشیدند قدس اللہ سرہ العزیز" ص ۳۰

انوار العاشقین میں ہے: "آپ نے ہمراہ حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ بمقابلہ سکھاں ۱۲۴۶ھ میں ماہ ذی قعدہ کی ستائیس کو درجۂ شہادت کبریٰ سے سرفرازی حاصل کی۔ رحمۃ اللہ علیہ" ص ۸۴

تک بعالمِ ظاہر میانجیو صاحبؒ سے کسی طرح کا تعارف نہ تھا۔ بیان فرماتے ہیں کہ جب میں بیدار ہُوا عجیب انتشار و حیرت میں مُبتلا ہُوا کہ یا رب، یہ کون بزرگ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا اور خود مجھ کو اُن کے سپُرد فرمایا۔ اسی طرح ایک عرصہ گذر گیا۔ ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میانجیو صاحبؒ سے مُلاقات کرو، شاید مقصودِ دلی کو پہنچو اور اس حیص و بیص سے نجات پاؤ۔ حضرت حاجی صاحب بیان فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت مولانا سے میں نے یہ سُنا، متفکر ہُوا اور دل میں سوچنے لگا کہ کیا کروں آخر بلا لحاظ سواری وغیرہ میں نے فوراً راہ لوہاری کی لی اور شدتِ سفر سے حیران و پریشان چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ نہایت درجہ کشش و کوشش سے آستانہ شریف پر حاضر ہُوا اور جیسے ہی دُور سے حضرت میانجیو صاحبؒ کا جمالِ باکمال ملاحظہ کیا تو صُورتِ انور کو کہ خواب میں دیکھا تھا، بخوبی پہچانا اور محوِ خود رفتگی ہو گیا اور آپے سے گذر گیا، اور اُفتاں و خیزاں اُن کے حضور میں پہنچ کر قدموں پر گر پڑا۔ حضرت میانجیو صاحب قدس سرہٗ نے میرے سر کو اُٹھایا اور اپنے سینۂ نور گنجینہ سے لگایا اور بکمالِ رحمت و عنایت فرمایا کہ تم کو اپنے خواب پر کامل وثوق و یقین ہے۔ یہ پہلی کرامت منجملۂ کراماتِ حضرت میانجیو صاحبؒ کی ظاہر ہُوئی اور دل کو بکمال استحکام مائل بخود کیا۔ الحاصل ایک عرصہ حضرت میانجیو صاحبؒ کی خدمتِ بابرکت میں حلقہ نشین رہے اور سلاسلِ اربعہ عموماً اور سلوکِ طریقۂ چشتیہ صابریہ کی خصوصاً تکمیل کی، اور خرقۂ خلافتِ تامّہ و اجازتِ خاصہ و عامہ سے مشرف ہُوئے۔ (شمائم امدادیہ ص ۷ تا ۱۰۔ امداد المشتاق ۔ ص ۶ تا ۹)

اجازتِ غیبی کا انتظار

ابتدائی زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؒ لوگوں کو بیعت کرنے میں تامّل بلکہ انکار فرماتے تھے۔ ۱۲۶۲ھ میں جب حج اوّل سے وطن کو واپس ہُوئے تو لوگوں نے بیعت کے لیے اصرار و کوشش سے کام لینا شروع کیا۔

اوّلاً حضرتِ حاجی صاحبؒ نے انکار فرما دیا اور کچھ اس پر اقدام نہ فرمایا کیونکہ اجازتِ غیبی و حکمِ الٰہی کا انتظار تھا۔

حاجی صاحبؒ کے مہمان عُلماء ہیں

مؤلف شمائم امدادیہ کا بیان ہے :

"ایک بار حضرت حاجی صاحبؒ نے تھانہ بھون میں خواب دیکھا کہ جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مع خُلفاء

راشدین و دیگر اصحاب کرام رضی اللہ عنہم تشریف رکھتے ہیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت و شفقت بے نہایت اپنے حال پر مبذول دیکھی اور نیز دیکھا کہ زوجۂ[1] شیخ فدا حسین، والدہ حافظ احمد حسینؒ (مہاجر و امین حجاج مقیم مکہ معظمہ، زادھا اللہ شرفاً و کرامۃً) حضرت کے لیے اپنے مکان میں کھانا پکا رہی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مرحومہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تو اُٹھ، تاکہ میں امداد اللہ کے مہمانوں کے واسطے کھانا پکاؤں کہ اُن کے مہمان عُلماء ہیں۔ یہ خواب بیعت لینے کی اجازت اور بشارت تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس دن سے عُلماء و طلباء کا ہجُوم زیادہ سے زیادہ ہُوا۔ پھر دوبارہ اشارتِ غیبی اس بشارتِ غیبی کی تائید میں ہُوئی اور اربابِ معارف کی فرمائش عموماً اور آپ کے دینی و عرفانی بھائی جناب حافظ محمد ضامن[2] صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی فرمائش خصوصاً اس پر موکد تر ہُوئی۔ چار و ناچار بیعت لینا شروع فرمایا۔ اوّلاً چند آدمیوں نے جو عوام سے تھے بیعت کی۔ بعد ازاں عُلماء میں سے جس شخص نے سب سے پہلے بیعت کی، وہ جامع فضل و کمال مُمکنہ افرادِ انسانی حضرت ابی الحکیم مولانا رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تھے اور حضرت کے تمام خلفاء سے کمالاتِ باطنیہ میں گوئے سبقت لے گئے۔ بعد ازاں وارثِ علُومِ دینی، مستفیض بفیضانِ حضرت الحاج مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کہ کشفِ اسرار و دقائق علُومِ الٰہیہ میں آیۃٌ من آیات اللہ تھے، سلسلۂ بیعت میں منسلک ہُوئے۔"

(شمائم امدادیہ، ص ۱۵-۱۶۔ امداد المشتاق، ص ۲۴، ۲۵)

جذبۂ جہاد

یہ امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہید قدس سرہٗ ہی کی نسبتِ باطنی کا اثر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مُہاجر مکی اور ان کے شیُوخ و خُلفاء کرام کے سینوں میں جذبۂ جہاد موجزن رہا۔ اُوپر گزر چکا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ اپنے مُرشدِ اوّل مولانا سیّد نصیر الدین دہلویؒ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن والد ماجد کی بیماری اور وفات اور اسی دوران میں پیر و مُرشد کی شہادت سے ارادہ موقوف ہو گیا۔

---

[1] حضرت حاجی صاحبؒ کے حقیقی بھائی فدا حسین صاحبؒ کی اہلیہ اور حافظ احمد حسین صاحبؒ (م ۱۳۱۲ھ) کی والدہ۔

[2] امام العاشقین حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ (م ۱۲۷۴ھ) خلیفہ ارشد حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۵۹ھ)، حضرت حاجی صاحبؒ کے مُربی اور پیر بھائی۔

میدانِ جہاد میں

آخر جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت رنگ لایا اور اسلافِ کرام و پیرانِ عظام کی سُنّت ادا کرنے کا وقت آ گیا ــــ قدرتِ الٰہی نے ایک اور موقع فراہم کر دیا، چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں فرنگی فوج سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؒ اور دُوسرے جانثارانِ اسلام نے تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر کو دارالاسلام قرار دے کر متوازی حکومت قائم کر لی اور جہاد کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

حاجی صاحبؒ : امامُ المجاہدین

"نقشِ حیات" میں ہے :

> "اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد مُنیر صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانویؒ کو میمنہ اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔" ص۲۲

فرنگی حُکّام کو نکال باہر کیا

"حیاتِ امداد" میں ہے :

> "چونکہ مذکورہ بالا حضرات نے جہاد کا فیصلہ کر لیا اور یہ صاحبان اپنی بزرگی، پرہیزگاری اور شخصیت کے اعتبار سے با اثر تھے، اس لیے چاروں طرف سے لوگ جہاد کے لیے آ کر تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔ یہ اجتماع ان ہی امیر المومنین حاجی امداد اللہ صاحب کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان حضرات نے تھانہ بھون اور اطراف و جوانب میں اپنی حکومت قائم کر لی اور انگریزی حاکموں کو نکال باہر کیا۔" ص۲۳

ایک دن معلوم ہُوا کہ شاملی ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون کے قریب ہے اور سہارنپور سے تھانہ بھون کو چھوٹی لائن پر واقع ہے جو ان دنوں انگریزوں کا فوجی مرکزی مقام بھی تھا۔ انگریز اپنا توپ خانہ بھیج رہے ہیں۔ اس خبر سے مجاہدین کو تشویش لاحق ہُوئی اور ان کے استیصال کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو مقرر کیا گیا۔

حضرت گنگوہیؒ کا چھاپہ

"نقشِ حیات" میں ہے:

> "لشکر ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ جب مولانا رشید احمد صاحبؒ کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی صاحبؒ نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا۔ چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کتنے آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے لا کر ڈال دیا۔" ص۴۲

معرکۂ شاملی ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء

اس فتح سے مجاہدین کے حوصلے بلند ہو گئے اور انھوں نے شاملی کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے ایک لشکر کے ساتھ وہاں سخت حملے کیے اور تحصیل کے دروازے کو آگ لگا دی۔ مسلمانوں نے انگریزی فوج کے چھکّے چھڑا دیے۔ مجاہدین میدانِ جنگ میں غالب تھے کہ تقدیر نے پانسا پلٹ دیا۔

حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی شہادت

"حیاتِ امداد" میں ہے:

> "ناگاہ ایسا پانسا پلٹا کہ حضرت حافظ محمد ضامن[1] صاحبؒ کی ناف کے نیچے گولی لگی اور وہ شہید

---

[1] امام المتقین حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کو یقین تھا کہ مجھے آج شہادت کا جام پینا ہے۔ انھوں نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ بوقتِ شہادت یعنی نزع کے وقت میرے پاس رہنا۔ چنانچہ حضرت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب انگریزوں کی فوج کا پلّہ بھاری ہُوا اور مجاہدین کی پسپائی ہُوئی۔ کمپنی کی قوت بہت زیادہ تھی۔ انگریزوں نے شاملی کے بعد تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا اور جو بھی ہاتھ لگا، اُس کو قتل کرا دیا اور اُن کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ خانقاہِ امدادیہ جہاں بزرگوں کا اجتماع رہتا تھا اُس کو بھی آگ لگا دی گئی:" ص۹۵

وارنٹ گرفتاری

"مجاہدین کے وارنٹ جاری ہُوئے۔ حاجی صاحبؒ تین دن گنگوہ، پھر انبالہ، ہگری، پنجلاسہ میں مقیم رہے یہیں راؤ عبداللہ صاحب کے اصطبل میں آپ کو تلاش کیا گیا لیکن آپ کرامت سے پکڑے نہ گئے۔ پھر وہاں سے سندھ کو

گنگوہیؒ آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے زانو پر حافظ صاحبؒ کا سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہیدِ اُلفت اپنے حقیقی محبوب سے جا ملا۔ یہ ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۳ھ کا واقعہ ہے۔ (حیات امداد ص۷)

مولانا عبدالسمیع صاحب بیدل رامپوری، مؤلف انوارِ ساطعہ (م ۱۹۰۱ء) نے قطعہ تاریخ وفات لکھا:

شہید ہو گئے ضامن علی پاک نہاد   جواب جن کا نہ تھا کوئی نسلِ آدم میں
ہُوئے شہید مگر اک تماشہ دکھلا کر   لہو لہان کیا دشمنوں کو اک دم میں
نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی   گلو بریدہ ہے سکّہ بھی اُن کا درہم میں
جو مارے تیر تو لگتے ہی جا لیا گوشہ   ہزاروں کافرِ بدکیش نے جہنّم میں
خدا کو پیارے ہُوئے آخرش شہید ہُوئے   نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں
جو پُوچھا سنِ شہادت کا فلک نے کہا ہے   "ہُوئے شہید وہ شاہِ جری محرّم میں"
۱ ۲ ۵ ۷ ۳

مولانا بیدل نے ایک اور تاریخ بھی نکالی:

بیدل آں وقت کہ حافظ ضامن   رفت و آراست بجنّت مسند
شاد رضواں شد و گفت ایں تاریخ   "حافظِ مصحفِ ایزد آمد"
۱ ۲ ۵ ۷ ۳

حیات امداد ص۸ بحوالہ "مونس مہجوراں" (نسخۂ قلمی در مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ)

ہوتے ہوئے کراچی پہنچے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ تین دن تو گھر میں چھپے رہے، پھر باہر نکلے لیکن حکومت کے ہاتھ نہ آئے۔ مولانا گنگوہیؒ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری منہاران ضلع سہارنپور کے مکان سے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے۔ آخر ثبوت نہ ملنے کے باعث چھ ماہ کے بعد رہا ہوئے۔" ص ۶۵

مولانا رشید احمدؒ کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا

مولانا ولایت حسین صاحب کی روایت ہے کہ "ایک حکیم صاحب جو اعلیٰحضرت (حاجی امداد اللہ صاحبؒ) کے مرید انبالہ کے رہنے والے بندہ کے ساتھ سفرِ حج میں شریک تھے۔ فرمایا جس زمانہ میں مولانا گنگوہی جیل خانہ میں تھے۔ اعلیٰحضرت حاجی صاحبؒ ایک دن فرمانے لگے کہ میاں کچھ سُنا، کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہوگیا؟ خُدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں، ابھی تو کوئی خبر آئی نہیں۔ فرمایا، ہاں حُکم ہوگیا، چلو۔ یہ فرما کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ برسات کا زمانہ تھا، مغرب کے بعد اعلیٰحضرت اور میں، غالباً مولانا مظفر حسینؒ صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے۔ شہر سے باہر نکل کر تھوڑی دُور جاکر اعلیٰحضرت گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اُوپر اُٹھائی اور فرمایا، چلو، مولوی رشید احمد کو کوئی پھانسی نہیں دے سکتا، خدا تعالیٰ کو ابھی ان سے بہت کام لینا ہے چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہوگیا۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک"۔ (امداد المشتاق ص ۱۶۲، ۱۶۳، تذکرۃ الرشید ص ۸۵)

باطنی تصرّفات

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حُسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

"یہ سب باطنی تصرّفات تھے، ورنہ ظاہری حیثیت سے کسی صاحب کی ان میں سے بچنے کی کوئی صُورت نہیں تھی مگر قدرت کو اُن سے کام لینا تھا۔" (نقش حیات ص ۱/۲)

راؤ عبداللہ خاں صاحب کا کشف

جن دنوں حضرت حاجی صاحبؒ پنجلاسہ میں روپوش تھے، راؤ عبداللہ خاں صاحب (مُرید حضرت شاہ عبدالرحیم

لہ التوفی ۱۰ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ / ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء مدینہ منورہ

صاحب ولایتی شہیدؒ) کے مہمان تھے۔ وہ ایک صاحب کشف بزرگ تھے۔ حضرت حاجی صاحبؒ ان کا ایک کشف بیان فرماتے ہیں : راوی مولانا احمد حسن کانپوری ہیں :

"فرمایا کہ راؤ عبداللہ خان مغرب کی نماز پڑھتے تھے، اپنے بیٹے امیر خاں کو پکارنے لگے : امیر علی، امیر علی! میرے خاوند نے آج مجھ کو دکھایا ہے کہ حاجی میاں کو مسجد میں بند کرکے قفل لگا دیا ہے اور مولوی رشید احمد کے ہاتھ میں کتاب دے کر درس کو کہہ دیا ہے۔ یہ بات حاجی میاں کو کہہ دو کہ وہ اس کا مطلب سمجھ لیں گے، مینوں (بزبان پنجابی بمعنی مجھے) کچھ خبر نیں ہے۔ اُن کا کشف پُورا نکلا کہ مجھے تو مکہ مکرمہ میں کہ اشرف المساجد ہے، مقید کر دیا، ہند کا خیال بھی نہیں آتا، مولوی رشید احمد صاحبؒ کو کتاب دے کر مدرس بنا دیا، ہمیشہ احادیث نبویہ کا درس دیتے ہیں۔ فرمایا کہ راؤ عبداللہ خان اپنے پیر حاجی عبدالرحیم صاحب کو خاوند سے تعبیر کرتے تھے اور زبان پنجابی بولتے تھے۔"

(شمائم امدادیہ ص ۹۲)

دارالعلوم دیوبند : سحرگاہی دُعاؤں کا ثمرہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اکابر علماء دیوبند نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اب فرنگی قوت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کھلی جنگ میں اُس کا مقابلہ مشکل ہے تو انھوں نے زیر زمین (UNDER GROUND) کام کا فیصلہ کر لیا۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام اُسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

قیام دارالعلوم ۱۲۸۲ھ کے بعد حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیدنا حضرت حاجی امداد اللہؒ سے عرض کیا: "ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے اس کیلئے دُعا فرمائیے" حضرت حاجی صاحبؒ نے دلچسپ انداز میں فرمایا :

"سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا، ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ انہی سحرگاہی دُعاؤں کا ثمرہ ہے یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانقدر کو یہ سرزمین لے اُڑی۔"

(عُلمائے حق ج ۱)

"فقیر اسے اپنا ہی مدرسہ سمجھتا ہے"

۱۲۹۷ھ میں قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی وفات سے دارالعلوم کو غیر معمولی نقصان پہنچا تو شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ نے اپنے مسترشدین کے نام ایک ہدایت نامہ جاری فرمایا۔ حضرت حاجی صاحبؒ قدس سرہٗ کی یہ تحریر گرامی دارالاہتمام دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے۔ ہدایت نامہ کا متن یہ ہے:

"بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ، اُن کی خدمت میں جو صاحب اس فقیر سے علاقہ محبت اور ارادت اور قرابت رکھتے ہیں، خواہ قرابت حسبی ہو یا نسبی۔ عرض ہے کہ مدرسہ عربیہ دیوبند جو اس وقت میں اپنی خوبی سے نہایت رونق اور شہرت پر ہے۔ فقیر کو اس سے ایک علاقہ خاص ہے بلکہ یہ مدرسہ اپنا ہی مدرسہ سمجھتا ہے۔ اس جہت سے سب صاحب اس مدرسہ کو اپنا ہی مدرسہ سمجھیں اور جو کچھ اعانت اس مدرسہ کی اپنی ذات سے ہو سکے یا سعی اور سفارش سے ممکن ہو، اس میں ہمیشہ ساعی رہیں اور نگرانی اس مدرسہ کی اپنے ذمہ ضروری سمجھیں، کیونکہ اس آخری زمانے میں جو مقبولیت بارگاہ الٰہی میں کارخانۂ علم کو ہے اور امر کو نہیں اور سب صاحب اس مدرسہ کے باب میں بلکہ ہر امر میں متفق و یکدل و یک جہت ہو کر ہمت فرمائیں کیونکہ اتفاق اللہ جل شانہ کے نزدیک نہایت مقبول اور ہر کام میں مُوجب انجام نیک ہے۔ فقط" (تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی صـ۱۹۲)

ایک عالم کو رنگ دیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کو بے پناہ مقبولیت سے نوازا۔ اطرافِ عالم سے خلق خدا انبوہ در انبوہ ان کے حلقے میں داخل ہُوئی۔

"انوار العاشقین" میں ہے:

"حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایسا فیضان جاری ہُوا کہ اکثر ممالکِ اسلامیہ ہندوستانؒ عربستان و ترکستان وغیرہ میں آپ کے خُلفا پہنچے اور ارشادِ طریقت اور اشاعتِ اسلام و تعلیم سلوک سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ میں مصروف ہُوئے، ایک عالم کو رنگ دیا۔" (صـ۱۴۳)

حرمین شریفین میں تو اُن کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا — مولانا مشتاق احمد صاحب انبٹھوی فرماتے ہیں :

> "حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء بیشمار ہر دیار و امصار میں ہیں۔ متاخرین چشتیہ صابریہ میں (باوجود قیام مکہ معظمہ کے کہ وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا نادر ہے) حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں سے کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی۔ منجملہ آپ کے خلفاء کے حضرت بقیۃ السلف حجۃ الخلف مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ مسلّم علماء اور صلحاء سے گزرے ہیں۔" (انوار العاشقین، ص۹۶)

حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ چاچڑوی فرماتے ہیں :

> "حاجی امداد اللہ صاحب کہ بزرگے ست کامل، زندہ است۔ بعد ازاں فرمودند کہ اکثر علمائے جیّد از دیوبند و دہلی و سہارنپور و گنگوہ از مریدان حاجی صاحب ہستند و مولوی رشید احمد گنگوہیؒ نیز مرید و خلیفۂ اکبر مولوی موصوف است و دیگر خلفاء وے ہم بسیار اند چنانچہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ و محمد یعقوب صاحبؒ۔" (مقابیس المجالس : ج ۲ ص ۴۳)

وصال

حیاتِ عزیز کے تقریباً چالیس برس مکہ معظمہ میں گزارنے کے بعد شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲ یا ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء کو بروز بدھ صبح کی اذان کے وقت ۸۴ سال کی عمر میں رحلت فرمائی اور اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ جنۃ المعلیٰ مقبرۂ اہل مکہ میں (جہاں اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مزارِ مبارک ہے) مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکیؒ (م ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ یکم مئی ۱۸۹۱ء) کے پہلو میں سپردِ خاک کیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

تصانیف

حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ نے چند مختصر کتابیں اور رسالے بھی تحریر فرمائے تھے۔ جن میں سلوک و تصوف کا رنگ غالب ہے۔ یہ سب آپ کے خاص اہتمام سے طبع ہوئیں۔

(۱) مثنوی مولانا رُوم کا حاشیہ فارسی زبان میں
(۲) غذائے رُوح : اُردو مثنوی ۱۲۶۴ھ
(۳) جہادِ اکبر : اُردو مثنوی ۱۲۶۸ھ
(۴) دردنامۂ غمناک : " "
(۵) تحفۃ العشاق : " " ۱۲۸۱ھ
(۶) ضیاء القلوب : فارسی ۱۲۸۲ھ
(۷) ارشادِ مُرشد : اُردو ۱۲۹۳ھ
(۸) وحدۃ الوجود : فارسی ۱۲۹۹ھ
(۹) فیصلہ ہفت مسئلہ : اُردو ۱۳۱۲ھ
(۱۰) گلزارِ معرفت : اُردو کلام
(۱۱) مکتوبات فارسی و اُردو

"ضیاء القلوب" سلاسل طریقت چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ کے اذکار و مراقبات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب طالبانِ سلوک کے لیے خضرِ راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ کتاب کے آخر میں حضرت حاجی صاحبؒ نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو خلافتِ عظمیٰ سے سرفراز کر کے اپنا جانشین نامزد فرمایا ہے اور بہت دُعائیں دی ہیں نیز اپنے تمام مُریدین و مسترشدین اور متوسلین و منتسبین کو تاکیداً ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اس سلوک کو اُن کی خدمتِ بابرکت میں حاصل کریں جو اس کتاب میں مندرج ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ کی وہ الہامی تحریر ملاحظہ ہو :

ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت و ارادت	جو صاحب اس فقیر سے محبت و عقیدت و ارادت
دارد، مولوی رشید احمد سلمہٗ و مولوی محمد قاسم	رکھتے ہیں وُہ مولوی رشید احمد صاحب سلمہٗ اور مولوی

سلمہٗ را، کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من راقم اوراق، بلکہ بمدارج فوق از من شمارند، اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من و من بمقام اوشان شدم و صحبت اوشان را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زماں نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند و طریق سلوک کہ دریں رسالہ (ضیاء القلوب) نوشتہ شد در نظر شاں تحصیل نمایند۔ انشاء اللہ بے بہرہ نخواہند ماند۔ اللہ تعالیٰ در عمر شاں برکت دہاد و از تمامی نعمائے عرفانی و کمالات قربیت خود مشرف گرداناد، و بمراتب عالیات رساناد، و از نور ہدایت شاں عالم را منور گرداناد، و تا قیامت فیض اوشاں جاری داراد، وبحرمۃ النبی وآلہ الامجاد۔[۱]

(ص۴۰)

محمد قاسم صاحب سلمہٗ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہیں، میری جگہ بلکہ مدارج میں مجھ سے فوق سمجھیں، اگرچہ ظاہر میں معاملہ برعکس ہوا کہ میں اُن کی جگہ پر اور وہ میری جگہ پر ہیں، اُن کی صحبت کو غنیمت سمجھیں کہ اُن جیسے لوگ اس زمانے میں نایاب ہیں اور اُن کی خدمت بابرکت سے فیضیاب ہوتے رہیں اور سلوک کے جو طریقے اس رسالہ (ضیاء القلوب) میں لکھے گئے ہیں، اُن کی خدمت میں حاصل کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی عمر میں برکت دے اور معرفت کی تمام نعمتوں اور اپنی قربیت کے کمالات سے مشرف فرمائے اور مراتب عالیہ تک پہنچائے اور اُن کے نورِ ہدایت سے عالم کو منور فرمائے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں قیامت تک اُن کا فیض جاری رکھے۔

فیصلۂ ہفت مسئلہ (تالیف ۱۳۱۲ھ) کے آخر میں بھی حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ عامۃ المسلمین اور خصوصاً اپنے متوسلین کو ارشاد فرماتے ہیں:

"اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں خصوصاً عزیزی جناب مولوی رشید احمد صاحب کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمتِ کبریٰ و نعمتِ عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض و برکات حاصل کریں"۔ ص۱۳

---

[۱] حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ ضیاء القلوب کی تالیف (۱۲۸۲ھ) کے پچیس سال بعد اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲ ذی الحجہ، ۱۳۰۷ھ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کو تحریر فرماتے ہیں،

"مولانا، ضیاء القلوب میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے، وہ آپ سے نہیں لکھا گیا جیسا القاء ہوا ہے ویسا ہی ظاہر کر دیا گیا ہے"۔

(مکتوبات ہدایت ص۱۸: شائع کردہ مدرسہ عربیہ نور محمدیہ جھنجھانہ شریف)

خُلفاءِ کرام

اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحبؒ کو بے پناہ مقبولیت و محبوبیت عطا فرمائی۔ اکثر ممالکِ اسلامیہ میں آپ کے خُلفاءِ کرام پائے جاتے ہیں، جن کا احاطہ و شمار مشکل ہے۔ ذیل میں صرف برِ صغیر پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے خُلفاءِ کرام کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ اوّل دو خلفاءِ اعظم کے بعد اسماءِ گرامی بلحاظ حرُوفِ تہجّی مندرج ہیں:

○ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہیؒ۔ م ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/ ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء مدفن گنگوہ شریف

○ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ م ۴ جمادی الثانی ۱۲۹۷ھ دیوبند

○ حضرت مولانا سید ابوالقاسم ہنسوی فتحپوریؒ (نیز فیضیافتہ حضرت گنگوہیؒ) م ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ/ ۱۲ مارچ ۱۹۱۱ء

○ حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہیؒ (تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ)۔ م ۲۸، ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ امروہہ

○ حضرت مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ (۱۰ سال تک مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس رہے پھر کانپور تشریف لے گئے) م ۱۳۲۲ھ کانپور

○ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ/ ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء تھانہ بھون

○ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندیؒ (نیز مُرید و خلیفہ حضرت میاں جی مُنّے شاہؒ) م ۲۲ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ راندیر (گجرات)

○ حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (استاذ نظام دکن) م ۱۳۳۶ھ حیدرآباد دکن

○ حضرت مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ م ۱۶ صفر ۱۳۴۳ھ/ ستمبر ۱۹۲۴ء پھلواری

○ حضرت مولانا جلیل احمد صاحب

○ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ (نیز مُرید و خلیفہ حضرت محدث گنگوہیؒ) م ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ/ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء دیوبند

○ حضرت مولانا سید حمزہ دہلوی (تلمیذ حضرت محدث گنگوہیؒ) م ۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ

○ حضرت مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ (شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنو) م ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ ٹونک

○ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (نیز مُرید و خلیفہ حضرت محدث گنگوہیؒ) م ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ مدینہ منورہ

○ حضرت مولانا سخاوت علی صاحب انبہٹویؒ۔ ۱۲۸۳ تا ۱۲۸۹ھ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس رہے۔

○ حضرت مولانا شفیع الدین صاحب نگینوی مہاجر مکیؒ (حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ آپ سے ۱۳۵۷ھ میں بیعت و مجاز ہوئے)

○ حضرت مولانا شرف الحق صدیقی دہلویؒ (تلمیذ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ) م ۳ ذیقعدہ ۱۳۵۴ھ/ ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء دہلی

○ حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوریؒ (سابق مرید و خلیفہ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ) ۲۸ رمضان ۱۳۱۲ھ رامپور منہاران ضلع سہارنپور

○ حضرت مولانا سید عبدالحی چاٹگامیؒ (تلمیذ حضرت محدث گنگوہیؒ) م ۱۷ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ چاٹگام

○ حضرت مولانا سید عبدالرحمن صاحب کاندھلویؒ۔ ۲۹ ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ کو ہجرت کی، مکہ معظمہ میں حضرت حاجی صاحبؒ کی حیات میں وفات پائی۔

○ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امروہویؒ (تلمیذ حضرت مولانا سید احمد حسن امروہیؒ) م ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ امروہہ

○ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوریؒ (سابقاً مرید و خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوریؒ) م ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ/۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء۔ رائپور
نیز مرید و خلیفہ ارشد حضرت اقدس گنگوہیؒ

○ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب بیدلؔ رامپوری رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۱۹۰۱ء میرٹھ

○ حضرت مولانا عبداللہ صاحب انصاری انبہٹویؒ (داماد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) ۱۳۲۲ھ میں زندہ تھے۔

○ حضرت مولانا شاہ عبداللہ صاحب جلال آبادیؒ (سابقاً مرید و خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم سہارنپوریؒ) م ۲۱ شوال ۱۳۴۳ھ/۱۵ مئی ۱۹۲۴ء

○ حضرت مولانا عبدالواحد صاحب بنگالی رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندیؒ (سابقاً مرید و خلیفہ حضرت مولانا رفیع الدین مہتمم دارالعلوم دیوبند) م ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء دیوبند

○ حضرت مولانا عنایت اللہ صاحب مالوی رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۱۳۰۵ھ بمبئی

○ حضرت مولانا فتح محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ) م ۱۳۲۲ھ تھانہ بھون

○ حضرت مولانا سید فدا حسین صاحب دربھنگویؒ (نیز فیضیافتہ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ)

○ حضرت مولانا قادر بخش صاحب سہرامیؒ (تلمیذ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی) م ۱۳۳۷ھ

○ حضرت مولانا کرامت اللہ خاں صاحب دہلویؒ (تلمیذ قاسم العلوم نانوتویؒ) م ۱۹۲۸ء دہلی

○ حضرت مولانا کرامت علی صاحب انبالوی رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت مولانا محب الدین صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (حضرت حاجی صاحبؒ کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہے) مکہ معظمہ

○ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب اجراوری رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت مولانا حافظ محمد احمد بن قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ م ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء حیدرآباد دکن

○ حضرت مولانا قاضی محمد اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت مولانا محمد فضل صاحب بخاری مقیم آگرہ رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۱۹۳۲ء اکبرآباد

○ حضرت مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۸ رجب ۱۳۲۲ھ اجمیر شریف

○ حضرت مولانا محمد خلیل الرحمن رڑکوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۱۷ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ جنۃ البقیع۔ مدینہ منورہ

○ حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب پھلواروی (سابقاً مرید و خلیفہ شیخ علی حبیب پھلواروی) م ۳ صفر ۱۳۵۴ھ/۲۱ مئی ۱۹۳۵ء پھلواری (بہار)

○ حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب قاسمی مرادآبادیؒ (نیز خلیفہ حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ و حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ) م ۲ شوال ۱۳۴۴ھ مراد آباد

○ حضرت مولانا محمد عابد حسین صاحب دیوبندیؒ (سابقاً مرید و خلیفہ میاں جی کریم بخش رامپوریؒ) م ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء دیوبند

○ حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ (بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ، سابقاً خلیفہ و مرید حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ) م ۹ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ / ۱۳ ستمبر ۱۹۲۷ء خانقاہ مونگیر (بہار)

○ حضرت مولانا منشی محمد قاسم نیانگری (مرید و خلیفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ)

○ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ۔ م ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ / ۲۱ دسمبر ۱۸۸۴ء نانوتہ ضلع سہارنپور

○ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب تھانوی ابن حضرت حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہما

○ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ (نیز خلیفہ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ) م ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء دیوبند

○ حضرت مولانا نواب محی الدین احمد خاں صاحب فاروقی مرادآبادیؒ (تلمیذ حضرت اقدس نانوتویؒ) م ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ مراد آباد

○ حضرت مولانا محی الدین صاحب خاطر میسوری رحمۃ اللہ علیہ ○ حضرت مولانا منظور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ (سابقاً مرید و خلیفہ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ) م $\frac{\text{۱۳۵۶ھ}}{\text{۱۹۳۷ء}}$ گولڑہ

○ حضرت مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

○ حضرت شاہ نیاز احمد صاحب مکیؒ۔ شوال ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کو دارالعلوم کے لیے چھ ہزار روپے مکہ مکرمہ میں عطا فرمائے۔

○ حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب لکھنویؒ (نیز مرید و خلیفہ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ) ۱۶ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ۔ کوڑہ جہان آباد لکھنؤ

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ بلاشبہ شیخ العرب والعجم تھے اور بالاجماع امامِ وقت اور سرآمدِ روزگار شیخ طریقت تسلیم کیے گئے۔ آپ کے خلفاء کرام بھی رجالِ عظیم اور اپنی اپنی جگہ مقبولِ عام تھے۔ انھوں نے برصغیر پاک و ہند کو شریعتِ محمدیہ اور سنتِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انوار و برکات سے معمور کر دیا۔ بالخصوص آپ کے خلفاء عظام قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہما کے ذریعے اس سلسلے کے فیوض برصغیر کے حدود سے نکل کر دنیا کے کونے کونے تک پہنچے۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور سعادتِ دُنیوی و نجاتِ اُخروی کی راہ پائی۔

حضرت حاجی صاحبؒ اور اُن کے خلفاء کرام کا طغرۂ امتیاز اُن کا مسلکِ حق و اعتدال ہے۔ انھوں نے مسلمانوں میں فرقہ بندی کے تصورات کو ہمیشہ نفرت کی نظر سے دیکھا اور اتحاد بین المسلمین کے لیے عمر بھر کوشاں رہے۔ ان کا نصب العین کافر گری نہیں مومن گری تھا۔ انھوں نے اُمتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عشق و محبت اور باہمی اُلفت و یگانگت کا درس دیا۔ لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا نے اُن سے خشیتِ الٰہی اور حُبِ نبوی کی نعمت بے بہا اور دولتِ لازوال پائی۔ بلاشبہ ان مقبولانِ بارگاہِ خداوندی نے اس دور میں اپنے علم و عمل سے صوفیائے متقدمین اور علماء سلف صالحین کی یاد تازہ کر دی۔ رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

اختر نفیس الحسینی
یکم صفر ۱۴۰۰ھ

مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

سلسلۂ چشتیہ صابریہ

"ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدیدِ دین کا عالمگیر کام لیا"

"اہلِ بصیرت کا اس سلسلہ کی مقبولیت پر اتفاق اور عالم میں اس کے فیوض و برکات و آثار شاہد ہیں کہ بانیٔ سلسلہ حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۹۰ھ) نہایت عالی مقام، عالی نسبت اور عند اللہ مقبول تھے۔

اس سلسلہ (صابریہ چشتیہ) میں بڑے نامور مشائخ، عارف و محقق و مصلح پیدا ہوئے۔ مثلاً حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی ذاتِ بابرکات کو بعض اہلِ نظر نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت شیخ محب اللہ الٰہ آبادیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (بانیٔ دارالعلوم دیوبند) حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائپوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مدظلہٗ۔ ہمارے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ سے حفاظت و تجدیدِ دین کا عالمگیر کام لیا اور اس وقت سب سے زیادہ وسیع، متحرک و فعال یہی سلسلہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم کی تعلیمی خدمت اور مولانا تھانویؒ کی تصنیفات و مواعظ سے اور پھر آخر میں مولانا محمد الیاسؒ کی تحریکِ دعوت و تبلیغ سے اس سلسلہ کے فیوض عالمگیر ہوئے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی (مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) نے "تاریخ مشائخ چشت" میں صحیح لکھا ہے کہ،

"گذشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا، جس طرح مولانا محمد الیاسؒ نے کیا تھا۔" ص ۲۳۴

آج بھی رائپور میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب[1] کی خانقاہ سلسلۂ چشتیہ کی قدیم خانقاہوں کی یکسوئی، سرگرمی، یادِ حق کی مشغولی اور درد و محبت کی گرم بازاری کی یاد تازہ کرتی ہے ع

عالم نشود ویران تا میکدہ آباد است"

(تاریخ دعوت و عزیمت، حصہ سوم: ص ۳۸-۴۹۰)

---

[1] المتوفی ۱۴ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ، ۱۴ اگست ۱۹۶۲ء

سلسلۂ عالیہ چشتیہ امدادیہ

سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری قدس سرہٗ م ۶۳۲ھ

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ م ۶۳۳ھ

شیخ الاسلام حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ م ۶۶۴ھ

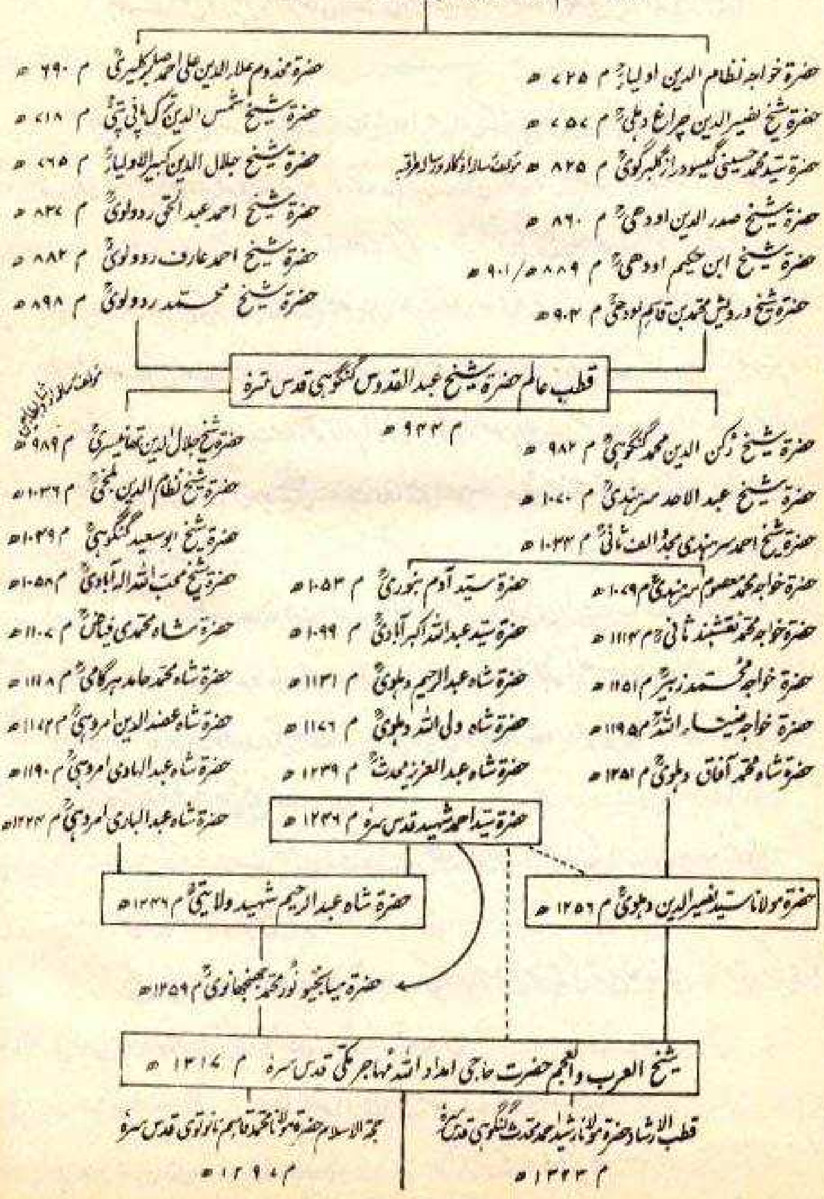

حضرۃ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ م ۷۲۵ھ
حضرۃ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ م ۷۵۷ھ
حضرۃ سید محمد حسینی گیسودراز گلبرگویؒ م ۸۲۵ھ مؤلف رسالہ اذکار [illegible]
حضرۃ شیخ صدر الدین اودھیؒ م ۸۶۰ھ
حضرۃ شیخ ابن حکیم اودھیؒ م ۸۸۹ھ/۹۰۱ھ
حضرۃ شیخ درویش محمد بن قاسم اودھیؒ م ۹۰۴ھ

حضرۃ مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیریؒ م ۶۹۰ھ
حضرۃ شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ م ۷۱۸ھ
حضرۃ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ م ۷۶۵ھ
حضرۃ شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ م ۸۳۷ھ
حضرۃ شیخ احمد عارف ردولویؒ م ۸۸۴ھ
حضرۃ شیخ محمد ردولویؒ م ۸۹۸ھ

قطب عالم حضرۃ شیخ عبد القدوس گنگوہی قدس سرہٗ
م ۹۴۴ھ

حضرۃ شیخ رکن الدین محمد گنگوہیؒ م ۹۸۴ھ
حضرۃ شیخ عبد الاحد سرہندیؒ م ۱۰۰۷ھ
حضرۃ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ م ۱۰۳۴ھ

حضرۃ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ م ۱۰۷۹ھ
حضرۃ خواجہ محمد نقشبند ثانیؒ م ۱۱۱۴ھ
حضرۃ خواجہ محمد زبیرؒ م ۱۱۵۱ھ
حضرۃ خواجہ ضیاء اللہؒ م ۱۱۹۵ھ
حضرۃ شاہ محمد آفاق دہلویؒ م ۱۲۵۱ھ

حضرۃ سید آدم بنوریؒ م ۱۰۵۳ھ
حضرۃ سید عبد اللہ اکبر آبادیؒ م ۱۰۹۹ھ
حضرۃ شاہ عبد الرحیم دہلویؒ م ۱۱۳۱ھ
حضرۃ شاہ ولی اللہ دہلویؒ م ۱۱۷۶ھ
حضرۃ شاہ عبد العزیز محدثؒ م ۱۲۳۹ھ

مؤلف رسالہ ارشاد الطالبین
حضرۃ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ م ۹۸۹ھ
حضرۃ شیخ نظام الدین بلخیؒ م ۱۰۳۶ھ
حضرۃ شیخ ابو سعید گنگوہیؒ م ۱۰۴۹ھ
حضرۃ شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ م ۱۰۵۸ھ
حضرۃ شاہ محمدی فیاضؒ م ۱۱۰۷ھ
حضرۃ شاہ محمد حامد ہرگامیؒ م ۱۱۱۸ھ
حضرۃ شاہ عضد الدین امروہیؒ م ۱۱۷۲ھ
حضرۃ شاہ عبد الہادی امروہیؒ م ۱۱۹۰ھ
حضرۃ شاہ عبد الباری امروہیؒ م ۱۲۲۴ھ

حضرۃ سید احمد شہید قدس سرہٗ م ۱۲۴۶ھ

حضرۃ شاہ عبد الرحیم شہید ولایتیؒ م ۱۲۴۶ھ

حضرۃ مولانا سید نصیر الدین دہلویؒ م ۱۲۵۶ھ

حضرۃ میانجیو نور محمد جھنجھانویؒ م ۱۲۵۹ھ

شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ م ۱۳۱۷ھ

قطب الارشاد حضرۃ مولانا رشید احمد محدث گنگوہی قدس سرہٗ
م ۱۳۲۳ھ

حجۃ الاسلام حضرۃ مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ
م ۱۲۹۷ھ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور دیگر مشائخ دیوبندؒ کے فراق پر حسرت کے چند آنسو

حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی۔ استاد جامعہ اشرفیہ لاہور

۱ أَهْلًا وَسَهْلًا يَا نَسِيمُ. وَمَرْحَبًا ذَكَّرْتَنِي عَهْدَ الصَّبَابَةِ وَالصِّبَا
اہلاً و سہلاً و مرحبا۔ اے باد صبا تو نے مجھے محبت اور بچپن کا زمانہ یاد دلا دیا

۲ حَمَلَ الشَّذَا مِنْ دِيُوبَنْدَ وَأَهْلِهَا وَأَتَى إِلَيْنَا بِالسَّلَامِ وَأَطْرَبَا
باد صبا دیوبند والوں کی خوشبو لے آئی ہے اور اُن کا سلام پہنچا کر ہمیں خوش کیا

۳ فَعَرَفْتُ عَرْفَهُمُ الشَّذِيَّ وَبَعْدَهُ أَنْكَرْتُ صَبْرًا عَنْ فُؤَادِي نُكِّبَا
میں ان کی بے نظیر مہک پہچان گیا لیکن افسوس کہ اس کے بعد ان کی یاد کی وجہ سے میرے دل سے صبر نکل گیا

۴ أَرْضٌ بِهَا أَشْيَاخُنَا قَدْ خَيَّمُوا قَدْ زُرْتُهُمْ مُذْ حُقْبَةٍ مُتَصَحِّبَا
سرزمین دیوبند میں ہمارے بزرگ خیمہ زن ہیں۔ مدت ہوئی کہ میں ان کی زیارت و رفاقت سے متمتع ہوا تھا

۵ جَنْجُوهُ. دِلِّي. دِيُوبَنْدُ وَتَانَبُنْ سَرْهَنْدُ وَالْأَجْمِيرُ كَانَتْ أَقْرَبَا
گنگوہ، دلی، دیوبند، تھانہ بھون سرہند اور اجمیر پہلے بہت قریب تھے

۶ وَالْيَوْمَ قَدْ حَالَتْ جِبَالٌ بَيْنَنَا حَيْرَانَ أَبْكِي دُونَهَا مُكْتَئِبَا
لیکن آج ہمارے اور اُن کے درمیان چند پہاڑ حائل ہیں حیران و سرگرداں ان کی جدائی کی وجہ سے رو رہا ہوں

۷ يَا لَهْفَ نَفْسِي. هَلْ أَزُورَنْ سَاعَةً دَارَ الْعُلُومِ وَهَلْ أَزُورَنْ عُصَبَا
واحسرتا۔ کیا زندگی میں میں ایک لمحہ دار العلوم دیوبند اور وہاں کے بزرگوں کی زیارت کا موقع پا سکوں گا۔

وَاحِنُّ مِنْ بُعْدٍ اِلَيْهِمْ لَيْتَنِيْ ۔۔۔ اَجِدُ السَّبِيْلَ اِلَيْهِمْ كَيْ اَذْهَبَا
آہ۔ دور سے میں ان کی طرف مشتاق ہوں، کاش کہ کوئی راستہ مل جائے، اگر میں ان کے پاس چلا جاؤں

لَوْ كُنْتُ طَيْرًا طِرْتُ نَحْوَ رِيَاضِهِمْ ۔۔۔ وَسَجَعْتُ عِنْدَهُمْ عَلٰى بَانِ الرُّبَا
اگر میں پرندہ ہوتا تو اُڑ کر اُن کے علمی باغوں میں پہنچ جاتا اور ان کے پاس نغمہ سنجی کرتا بلند مقامات کے بان درختوں پر بیٹھ کر

۱۰ اِنِّيْ هُنَا وَهُمْ هُنَاكَ وَبَيْنَنَا ۔۔۔ قُلَلُ الْجِبَالِ وَصَارَ اَمْرِيْ اَصْعَبَا
افسوس میں یہاں ہوں اور وہ وہاں ہیں اور درمیان میں ۔۔۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں ہیں، میری آرزو کا پورا ہونا مشکل ہے

۱۱ يَا عَاذِلِيْ دَعْنِيْ وَذِكْرَ مَشَايِخِيْ ۔۔۔ اِذْ لَمْ اَجِدْ لِلتَّسَلِّيْ عَنْهُمْ مَذْهَبَا
اے ملامت کنندہ۔ مجھے مشائخ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑ دیجئے اور معذور سمجھیں کیونکہ ان کو چھوڑ کر مجھے اور راستہ مل نہیں سکتا

۱۲ لَا تَلْحُوْنَ فِيْهِمْ لِمَا جَرَّبْتَنَا ۔۔۔ نَجِدُ الْغَرَامَ بِهِمْ لَذِيْذًا طَيِّبَا
ان کی محبت میں ملامت کرنا چھوڑ دینا کیونکہ تو نے آزمایا ۔۔۔ کہ ہمیں اُن کی محبت بڑی عزیز ہے۔

۱۳ سَلْ عَنْ اَحِبَّتِنَا بِدِيُوْبَنْدٍ. اَلَا ۔۔۔ دَعْ عَنْكَ سَلْمٰى وَالرَّبَابَ وَزَيْنَبَا
اے دوست۔ ہمارے اسلاف علماء دیوبند ہی کا حال پوچھیے۔ خبردار۔ دنیا دار بے فائدہ دوستوں کو چھوڑ دیجیے

۱۴ قِفْ بَيْنَ هَاتِيْكَ الْمَغَانِيْ اِذْ بِهَا ۔۔۔ رَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَرَاحٌ طَرَبَا
ان مبارک مقامات میں ٹھہریئے۔ کیونکہ ان میں ۔۔۔ روح و ریحان اور جنتی روحانی شراب طرب فزا ہیں

۱۵ وَاَنِخْ مَطِيَّتَكَ بِالدِّيَارِ فَاِنَّهَا ۔۔۔ دَارٌ مُّبَارَكَةٌ وَرَوْضٌ اَخْصَبَا
اور ان مقامات میں سواری ٹھہرایئے۔ کیونکہ وہ ۔۔۔ مبارک مقام ہیں اور ایسے باغ جو شاداب ہوں

۱۶ هَلْ كُنْتَ يَا جَنْجُوْهُ اِلَّا رَوْضَنَا ۔۔۔ مُتَنَزَّهِيْنَ بِهٖ فَصَارَ مُحَجَّبَا
اے شہر گنگوہ۔ آپ ہمارے وہ بوستاں تھے ۔۔۔ جس میں ہم سیر کیا کرتے تھے مگر آہ وہ اب پوشیدہ ہو

۱۷ يَا حَسْرَتَا. بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَشَايِخِيْ ۔۔۔ بِيْدٌ وَّسَيْلُ الشَّوْقِ قَدْ بَلَغَ الزُّبٰى
وائے حسرت۔ اُدھر تو میرے اور میرے مشائخ کے مابین ۔۔۔ وسیع صحرائیں حائل ہیں اور اُدھر شوق زیارت کا سیل حد سے بڑھ گیا

۱۸ یالیت نفسی۔ هل اری دار العلو ‌‌ ام ار نظام الدین ماوی النجبا
اے افسوس۔ کیا میں کسی دن دار العلوم دیوبند ‌‌ یا نظام الدین دہلی جو بزرگوں کے مرکز ہیں دیکھ سکوں گا

۱۹ ارض الاحبة ضاء فیها انجم ‌‌ منها اهتدی من جاءها متوهبا
یہ اسلاف کی زمین ہے۔ اس میں ایسے ستارے ضو فشاں ہیں ‌‌ کہ جنہیں کی برکت سے ہدایت یافتہ ہوا جو بھی طلب ہدایت کیلئے آیا

۲۰ منهم رشید احمد و منهم انور ‌‌ والقاسم۔ المحمود کانوا شهبا
ان اسلاف میں سے ہیں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا انور شاہ، مولانا محمد قاسم، مولانا محمود حسن، یہ سب ہدایت کے ستارے تھے

۲۱ ومن المشایخ شیخنا اشرف علی ‌‌ هادی البرایا ذو السناء المجتبی
ان بزرگوں میں سے ہیں مولانا اشرف علی تھانوی ‌‌ تمام مسلمانوں کے ہادی بلندی والے اور برگزیدہ ہیں

۲۲ هو ذو التصانیف الکثیرة قد هدت ‌‌ اهل العلوم العجم ثم العربا
مولانا تھانوی زیادہ تصانیف والے ہیں۔ ان کی کتب نے حق کا راستہ دکھایا عجم و عرب اہل علم کو

۲۳ وهو الحبیب حکیم امة احمد ‌‌ ولهم بخیر الهدی کان مهذبا
حضرت تھانوی سب کے محبوب۔ اور امت محمدیہ کے حکیم ہیں اور اعلیٰ سیرت سے امت کی اصلاح فرمائی

۲۴ کالنجم بل کالبدر بل شمس الضحی ‌‌ کالنهر بل کالبحر اعلی حسبا
مولانا تھانوی کا علمی مقام ستارے بلکہ چاند کی مانند ہے اور مثل آفتاب ہے آپکا فیض دریا کی طرح بلکہ سمندر کی طرح ہے بلند [illegible]

۲۵ وهو الامام المقتدی بفعاله ‌‌ وجعلته لرضاء ربی سببا
مولانا اشرف علی تھانوی ہمارے لیے امام و پیشوا ہیں میرے لیے انکی محبت خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ۔

۲۶ قد کان للاسلام حصنا محکما ‌‌ وربیع دین محمد لو اجدبا
مولانا تھانویؒ اسلام کے مضبوط قلعہ تھے۔ ‌‌ دین کیلئے بہار کی مانند تھے بوقت فرض قحط

۲۷ وسقی ریاض الدین اذهی صوحت ‌‌ فتزاهرت وربت وقاسی نصبا
مولانا تھانویؒ نے گلشن اسلام جو سوکھنے والا تھا کی آبیاری کی ‌‌ پس یہ گلشن مزین و شاداب ہوا مولانا نے اس سلسلہ میں تکلیفیں اٹھائیں

۲۸ وَاَضَاءَ اَفْئِدَةَ الْاَنَامِ مُؤَدِّبًا   بِعَفَافِهٖ وَبِوَرْعِهٖ مُتَاَدِّبَا
مولانا تھانوی نے لوگوں کے دلوں کو روشن کر دیا اصلاح کرتے ہوئے وہ پاکیزہ اخلاق و تقویٰ سے خود بھی آراستہ تھے ۔

۲۹ ذُوْ نَهْضَةٍ جَيَّاشَةٍ مَوَّاجَةٍ   رَبَطَتْ قُلُوْبَ النَّاسِ اِلَّا مَنْ اَبٰى
مولانا تھانوی پُر جوش، موجزن، دعوت والے ہیں جس نے لوگوں کے دلوں کو مربوط کر دیا ہے مگر وہ جو شقی ہیں

۳۰ اِنْ زُرْتُهُمْ رَحَّبْتُهُمْ وَاَقُوْلُ لَهُمْ   اَهْلًا عَلٰى رَغْمِ الْوُشَاةِ وَمَرْحَبَا
اگر میری ان سے ملاقات ہو جائے تو خوش آمدید اور مرحبا کہوں گا اُنھیں۔ اگرچہ چغلخور دشمنان دین نہ چاہیں

۳۱ اَنْتُمْ كَمَا اَنْتُمْ فَلَنْ نَسْتَطِيْعَ اَنْ   نُحْصِيَ مَدَائِحَكُمْ فَفُقْتُمْ حَسَبَا
تمھاری شان وہی ہے جو ہے۔ ہم میں یہ طاقت کہاں کہ تمھاری مدح کا حق ادا کریں، تم بلند ہو نیک کردار کے سبب

۳۲ غِبْتُمْ وَاَنْتُمْ حَاضِرُوْنَ بِمُهْجَتِيْ   فَبِمُهْجَتِيْ اَفْدِي الْحُضُوْرَ الْغُيَّبَا
تم بظاہر غائب ہو لیکن میرے دل میں حاضر ہو۔ میری رُوح قربان ہو ان حاضرین و غائبین پر

۳۳ يَا رَبِّ. اَلْحِقْنِيْ بِهِمْ لِمَحَبَّتِيْ   وَالْمَرْءُ مَعَ مَنْ وَدَّهٗ وَاصْطَحَبَا
اے اللہ۔ مجھے آخرت میں ان سے ملا دیجئے کیونکہ از روئے حدیث پاک ہر شخص آخرت میں اپنے دوست اور مصاحب کے ساتھ ہوگا

حضرت تھانوی ؒ کے ماہ و سال

پیدائش	بدھ ۵ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ	۱۸۶۳ء
والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا	۱۲۸۵ھ	۱۸۶۸ء
تکمیل حفظِ قرآن مجید	۱۲۹۰ھ	۱۸۷۳ء
تہجد کے معمول کی ابتداء	۱۲۹۲ھ	۱۸۷۵ء
دینی علوم کی ابتداء	۱۲۹۲ھ	۱۸۷۵ء
ابتدائی تعلیم کی تکمیل	۱۲۹۴ھ	۱۸۷۷ء
دارالعلوم دیوبند میں داخلہ	۱۲۹۵ھ	۱۸۷۸ء
پہلا وعظ	۱۲۹۸ھ	۱۸۸۱ء
مثنوی زیروبم تحریر فرمائی	۱۲۹۸ھ	۱۸۸۱ء
دارالعلوم دیوبند سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سندِ فراغ حاصل کی	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۴ء
مدرسہ فیضِ عام کانپور میں صدر مدرس مقرر ہوئے	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۴ء
پہلا سفرِ حج اپنے والد ماجد کے ساتھ	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۴ء
حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ سے بیعت	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۴ء
ترکِ ملازمت کے بعد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں قیام	۱۳۱۵ھ	
تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی	۱۳۲۰ھ	۱۹۰۲ء
دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے	۱۳۲۰ھ	۱۹۰۲ء
بیان القرآن کی پہلی بار طباعت	۱۳۲۶ھ	۱۹۰۸ء
دوسری شادی	۱۳۳۴ھ	۱۹۱۶ء

تحریکِ خلافت کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت	سنہ ۱۳۳۹ھ	سنہ ۱۹۲۰ء
تحریکِ خلافت کے بارے میں رسالہ الروضۃ الناظرہ فی المسائل الحاضرہ لکھ کر اپنے موقف کی مزید وضاحت فرمائی	سنہ ۱۳۴۰ھ	سنہ ۱۹۲۱ء
اطرافِ آگرہ میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کے لیے مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلوی اور مولانا عبدالمجید صاحب بچھڑایونی کو روانہ کیا	سنہ ۱۳۴۱ھ	سنہ ۱۹۲۲ء
دارالعلوم دیوبند کے سرپرست منتخب ہوئے	سنہ ۱۳۴۴ھ	سنہ ۱۹۲۵ء
پاکستان کا ابتدائی خاکہ پیش کیا	— — —	جون سنہ ۱۹۲۸ء
الور میں جب مدارسِ دینیہ پر پابندی لگائی گئی تو آپ نے اس کے خلاف رٹ کروائی اور پابندی اٹھوائی	سنہ ۱۳۴۶ھ	سنہ ۱۹۲۸ء
مجلس صیانۃ المسلمین کا قیام	سنہ ۱۳۴۹ھ	سنہ ۱۹۳۰ء
جب وقف کا خلافِ شریعت قانون بنانے کی کوشش کی گئی تو آپ کی زیرِ نگرانی ایک مسودہ شریعت کے مطابق تیار کیا گیا جس کو اکابر علماء نے بالاتفاق منظور کر لیا	سنہ ۱۳۵۲ھ	سنہ ۱۹۳۳ء
قیامِ لاہور کے دوران حضرت علی ہجویریؒ اور جہانگیرؒ کے مقبرے گئے اور فاتحہ پڑھی	سنہ ۱۳۵۷ھ	سنہ ۱۹۳۸ء
رحلت، تھانہ بھون	۱۶ رجب سنہ ۱۳۶۲ھ	۱۹ جولائی سنہ ۱۹۴۳ء
آپ کی وفات پر مسلم لیگ کونسل نے تعزیتی اجلاس کی قرارداد منظور کی		۱۴ نومبر سنہ ۱۹۴۳ء

پیغام

قائدِ شریعت حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ ایم۔ این۔ اے

شیخ الحدیث دارالعلومِ حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ و برّد اللہ مضجعہ کا وجود اور ان کے علم و فضل کے واقعات تاریخ اسلامی کے وہ درخشندہ ابواب ہیں کہ جن کا نہ تو ایک مجلس و مضمون و رسالہ میں بالاستیعاب احاطہ ممکن ہے اور نہ ہر کسی میں وہ صلاحیت و استطاعت موجود ہے کہ حضرتؒ کے کارہائے نمایاں اور ان کی زندگی کے ہر گوشہ و پہلو پر سیر حاصل بحث کر سکے۔ کیونکہ حضرتؒ اپنے عصر و صدی میں فرزندانِ دارالعلوم دیوبند میں ایک ایسے عظیم فرزند کی حیثیت سے ابھرے کہ رشد و ہدایت کے ہر محاذ و میدان میں انہوں نے دین سے بھٹکے اور گمراہیوں میں دھنسے ہوئے مسلمانوں کی راہنمائی کر کے لاکھوں اشخاص کے عقائد و قلوب بدل کر ان کو صراطِ مستقیم کا گرویدہ بنا دیا

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد طویل عرصہ تک انگریز کے تسلط میں رہنے اور ہندوؤں کی کافرانہ تہذیب کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے اپنے اسلامی شعائر و احکامات سے منہ موڑ کر شرک و بدعت اور اخلاقی و تہذیبی بگاڑ کا شکار ہو چکی تھی۔ ایسے پُرفتن دور میں حضرت حکیم الامت کا ورود مسعود مسلمانوں کے لئے مینارہ رحمت و نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ حضرتؒ کے علوم ظاہری و باطنی کے اعداء بھی قائل ہے۔ ان کی تحریروں اور تقاریر کی حقانیت سے منکرین دین بھی انکار نہ کر سکے۔ کسی بھی وقتی مصلحت کی پرواہ کئے بغیر برملا جو حق سمجھتے اس کا اظہار فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی خانقاہ بڑے بڑے رؤسا و اصحاب علم و فضل کا مرجع رہی ہے۔ اپنے عقیدہ و مسلک سے دنیا کی کوئی طاقت سر مو برابر منحرف نہ کر سکی۔ حضرتؒ کی اس حقانیت و روحانیت ہی سے متاثر ہو کر برصغیر پاک و ہند اور دیگر ممالک کے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دین سے بے راہ رو اشخاص نے پاک و صاف ہو کر روحانی امراض سے نجات و چھٹکارا حاصل کر لیا۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ دینی درد و سوز رکھنے والے ادارے و ذرائع نشر و اشاعت اس بطل جلیل و امام العصر کے اوصاف جلیلہ و فضائل عمدہ اور ان کے مواعظ و تصانیف کو اجاگر کریں۔ تاکہ موجودہ دور کے مغرب زدہ و مادہ پرست طبقہ کے لئے سرمایۂ عبرت و درس موعظت بن سکے۔

میں ادارہ صیانۃ المسلمین کے جملہ منتظمین کو اس روحانی کانفرنس کے انعقاد پہ دل کی گہرائیوں سے ہدیہ تبریک پیش کر رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ رب ذوالمنن امت مسلمہ کو حضرت حکیم الامتؒ کے تقویٰ، علوم شرعیہ میں کمالات و اسرار اور زہد و انابت الی اللہ جیسے اوصاف پر متصف فرمائے۔ والسلام

عبدالحق غفرلہٗ

پیغام

ترجمان اہلِ سُنّت حضرت مولانا محمّد سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہ
شیخ الحدیث نصرت العلوم، گوجرانوالہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانویؒ کو علومِ ظاہرہ و باطنہ میں وہ کمال اور ذوق و شوق عطا فرمایا تھا جو اپنے جملہ اقران میں بفضلہٖ تعالیٰ انہیں کا حصہ اور بخت تھا۔ علومِ دینیہ کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں جس میں انہوں نے خواص و عوام کی رہنمائی نہ فرمائی ہو، اور بحمد اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی تفسیر، حدیث شریف کی تشریح، فقہ اسلامی کی تعبیر، علم کلام و تصوف کی باریکیوں کی عقدہ کشائی تو اہلِ علم و فہم پر بخوبی واضح ہے، فرقِ ضالّہ اور باطلہ کی دسیسہ کاریوں کو ایسے انداز میں اُجاگر کیا ہے کہ اُن کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دی ہیں کہ سارے مل کر بھی رفو نہ کر سکیں، بیک وقت علم و عرفان کی روحانی بارشیں ان کے حلقۂ درس سے برستی رہیں اور طلبِ حق کے مُتلاشی ان سے مُستفید ہوتے رہے۔ پاک و ہند وغیرہ مسلمان ملکوں کا شاید ہی کوئی خطہ ایسا ہو گا جہاں حضرت تھانویؒ سے ظاہری اور باطنی اکتسابِ فیض کرنے والے موجود نہ ہوں اور اب اُن کے تلامذہ اور خلفاء سے استفادہ کرنے والے نہ پائے جاتے ہوں۔

پاکستان کے بنانے میں حضرت تھانویؒ نے جو کردار ادا کیا اور ان کے فتوے اور تلقین سے علماءِ کرام نے اس کے لیے جو کوشش اور کاوش کی وہ کسی بھی باضمیر سیاسی سے اوجھل نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعد کو برسرِ اقتدار طبقہ کی اکثریت اسلامی احکام کے نفاذ کے لیے مخلص ثابت نہ ہوئی جس کے نتیجہ میں مشرقی بنگال پاکستان سے کٹ گیا اور پاکستان کے مسلمان ابھی تک نفاذِ شریعت کی برکات سے محروم ہیں مگر اکابر اس کے بنانے میں مخلص تھے۔

حضرت تھانویؒ پر بعض بتدعین کی طرف سے ان کی بعض عبارات کو اپنی طرف سے معانی پہنا کر اور اُن کے مطالب تراش تراش کر بدنام کرنے کی مذموم اور بے جا سعی بھی کی گئی ہے، مگر مشہور ہے کہ سورج پر تھوکا مُنہ پر ہی آتا ہے۔ کسی دیانتدار اور سمجھدار نے اس قبیح کارروائی سے کوئی غلط تاثر نہیں لیا اور ایسی بے جا حرکات سے حضرت تھانویؒ کا مقام اور شان بڑھی ہے کم نہیں ہوئی، بقول شاعر ؎

تُندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اڑانے کے لیے

اہلِ علم حضرات کے لیے تو ان کی سبھی تصانیف جو تقریباً تیرہ ۱۳۰۰ سو کے لگ بھگ ہیں مفید ہی مفید ہیں، عوام کم از کم ان کی بہشتی زیور، تعلیم الدین اور دعوات عبدیت وغیرہ کتابیں ضرور پڑھیں، جن سے عقائد و اعمال، اخلاق و عبادات اور صحیح تصوف کی واضح جزئیات معلوم ہوں گی جن سے وہ دُنیا و آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ ہمیں حضرت تھانویؒ اور دیگر اکابر علماء دیوبند کثر اللہ تعالیٰ جماعتہم پر علمی مسائل میں اعتماد کرنے کی توفیق بخشے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ وسلّم علیٰ رسولہٖ خیر خلقہٖ خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ وذرّیّتہٖ واتباعہٖ إلیٰ یوم الدین۔ امین۔

احقر ابوالزاہد محمد سرفراز
خطیب جامع مسجد گکھڑ و صدر مدرس مدرسہ نُصرۃ العلوم گوجرانوالہ
۲۷ صفر ۱۴۰۶ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۶ء

بقیہ از صـ ۴۴۳

بنا کردہ تحریک کو ایک مرکز فراہم کر دیا ہے۔ اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ دین کی اشاعت کا یہ مرکز پھلتا پھُولتا رہے، دیئے سے دیا روشن ہوتا رہے تاکہ مسلمان عوام مرد اور عورتیں دینِ حق کی حقیقی تعلیمات سے روشناس ہوں، جہالت اور بدعات کے اندھیرے چھٹ جائیں اور علم کی روشنی سے سارا جہان منور ہو۔ (آمین)

قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی پاکستان

پیغام

جناب محترم قاضی حسین احمد صاحب

امیر جماعت اسلامی پاکستان

حضرت تھانویؒ کی تعلیمات و ملفوظات ان کے خلفاء، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور اُن کی تصنیفات کے ذریعے سے اب تک کروڑوں عوام تک پہنچ چکی ہیں۔

بہشتی زیور جیسی کتاب تصنیف کرنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرتؒ مسلمان عوام کو اسلامی آداب سکھانے اور ان کے عقائد کی اصلاح کے بارے میں حد درجہ فکر مند تھے۔

میرے بعض بزرگوں نے براہ راست حضرتؒ سے علمی اور روحانی تربیت حاصل کی تھی۔ میرے ایک چچازاد بھائی قاضی عبدالسلام صاحب حضرتؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ میرے بڑے بھائی مولانا عبدالقدوس صاحب حضرتؒ کی مجلس میں حاضری دیتے رہے ہیں۔ بچپن میں ان بزرگوں کی مجالس میں حضرتؒ کے بارے میں جو کچھ سنا اس سے حضرت تھانویؒ کی شخصیت کا یہ نقشہ ذہن میں بیٹھ گیا ہے کہ حضرتؒ نے اپنے اوقات کو انتہائی درجہ تک منظم کر لیا تھا، ان کے ہاں وقت کی بڑی قدر تھی اور معمولات کی پابندی تھی۔ اپنی ڈاک خود دیکھتے تھے۔ خط بھیجنے والوں کو ہدایت تھی کہ جوابی لفافہ بھیجا کریں، اسی وقت اس کاغذ پر خط کا جواب لکھ کر جوابی لفافے میں ڈال دیتے تھے اور حوالہ ڈاک کر لیتے تھے۔ اس کے لیے ایک وقت متعین تھا اور مقررہ وقت میں ہندوستان اور دنیا بھر کے کونے کونے سے آنے والے خطوط کا جواب دے کر اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے اور ان کی راہنمائی کرتے تھے اور یوں وہ اپنی ذات میں ایک ہمہ گیر تحریک تھے۔

مجلس میں حاضری دینے والوں کے سوالات کے نہ صرف جوابات دیتے تھے بلکہ انتہائی بے تکلفی سے انہیں نشست و برخاست کے آداب بھی سکھاتے تھے اور غلطیوں پر ملاقاتیوں کو بھی ایک مربی کے انداز میں ٹوک دیتے تھے۔ مربی ہونے کا یہ انداز ان کے ملفوظات اور تصانیف میں جھلکتا ہے۔ ان کے شاگردوں اور ان کے خلفاء نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان کے آثار کو جمع کر کے شائع کیا ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں ——— جامعہ اشرفیہ لاہور نے ان کی

(باقی حاشیہ پر)

پیغام

جناب محترم سیّد سجّاد حیدر صاحب وفاقی وزیرِ تعلیم حکومت پاکستان

ماہنامہ "الحسن" کی طرف سے "حکیم الامتؒ نمبر" کی اشاعت پر مبارکباد قبول کیجئے، واقعی یہ جامعہ اشرفیہ ہی کا کام تھا کہ وہ ایک ایسی عبقری اور عظیم المرتبت شخصیت پر ایسا عظیم الشان کام کرے۔

کیا حکیم الامتؒ کا یہ کوئی کم احسان ہے کہ انہوں نے ہمارے دین کو ہندوانہ اور جاہلانہ رسومات کی آمیزش سے پاک وصاف فرما کر شیشہ کی طرح پیش فرمادیا۔ بدعات کی نشاندہی اور اصلاح فرمائی، لیکن اس مردِ درویش نے اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی اسلامی اور فلاحی مملکت کے قیام میں بھی انتھک محنت اور کوشش کی۔ مشہور عالم دین اور مفسرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ کی "حکیم الامتؒ" کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حکیم الامتؒ ہی کی وہ شخصیت تھی جس نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کے لیے شرعی نظام پیش فرمایا۔ اس لیے ایسی شخصیت کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے اتنا ہی کم ہے۔ مولانا تھانویؒ کی یہ خدمات جو انہوں نے مسلم لیگ کی حمایت، تحریکِ پاکستان کی سرپرستی اور دو قومی نظریئے کا تعارف کروا کر انجام دی ہیں ہمیشہ یاد رہیں گی اور آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ راہنما بنیں گی۔

یوں تو مولانا تھانویؒ کی بے شمار تصانیف و تالیفات ہیں جن کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے، آپ کا کثیر التصانیف و تالیف ہونا مسلّم ہے مگر آپ کی مشہور تصنیف بہشتی زیور ہی ایک ایسی کتاب ہے جو بحمدہٖ تعالے دینی و مذہبی لحاظ سے ہر فرد کی ضرورت پوری کر رہی ہے۔ اس وقت مشکل ہی سے کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں آپ کی یہ شاہکار تصنیف موجود نہ ہو۔ اپنے پرائے سب ہی اس سے مستفید و مستفیض ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ مولانا تھانویؒ اپنی ان خدمات کی وجہ سے تاقیامِ قیامت زندہ رہیں گے۔ علم ہمیشہ اہلِ علم کو زندہ رکھتا ہے۔

(باقی صـ ۷۷۳ پر)